سُلطان محمدُ فاتح

ادریس آزاد

ایک عظیم جرنیل کی عظیم داستان

سُلطان محمد فاتح

ادریس آزاد

اسٹاکسٹ:۔
مکتبہ القریش ◎ سرکلر روڈ
اردو بازار، لاہور۲۔ فون: ۷۶۶۸۹۵۸

عرضِ مصنف

بالآخر فتح قسطنطنیہ کی سعادت ساتویں عثمانی فرمانروا ''سلطان محمد فاتح'' کے حصہ میں آئی۔

دراصل سرکارِ دو عالم، رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بشارت تھی:۔

''تم ضرور قسطنطنیہ فتح کر لو گے..... پس بہتر امیر، اُس کا امیر ہو گا۔

اور بہترین لشکر وہ لشکر ہو گا۔'' (مسند امام احمد، جلد 4، صفحہ نمبر 335)

یہی فرمانِ رسالت تھا..... جس نے ہر دور کے مسلمان فاتحین کو قسطنطنیہ کا پروانہ بنائے رکھا۔ لیکن پے درپے کئی حملوں کا سامنا کرنے کے باوجود بھی..... اس قدیم شہر کے دروازے کسی مسلمان فاتح کے لئے نہ کھل سکے۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بنے تو آپ نے اپنے بیٹے یزید کی سرکردگی میں قسطنطنیہ پر پہلا باقاعدہ حملہ کرنے کے لئے فوج بھیجی۔ اس حملے میں بہت سے جلیل القدر صحابہؓ جن میں حضرت ابو ایوب انصاریؓ بھی شامل تھے، شریک ہوئے۔ دورانِ محاصرہ حضرت ابو ایوب انصاریؓ بیمار ہو کر شہید ہو گئے اور قسطنطنیہ کی فصیل کے نیچے مدفون ہوئے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، ہشام بن عبدالملک، مہدی عباسی اور ہارون الرشید جیسے پُرجلال خلفاء نے بھی اس شہر کو تسخیر کرنے کے لئے زبردست حملے کئے لیکن قسطنطنیہ کسی سے فتح نہ ہو سکا۔

قسطنطنیہ ایک ناقابل تسخیر شہر تھا۔ اس کے تین اطراف میں سمندر تھا۔ اور ایک جانب خشکی تھی۔ شہر کے گرد چودہ (14) میل کے قطاع دائرے میں ایک مضبوط فصیل تھی۔ جس پر ایک سو ستر فٹ کے فاصلے پر مضبوط برج بنے ہوئے تھے۔ فصیل کے اندر پھر ایک اور فصیل تھی..... ان دونوں فصیلوں کے بیچوں بیچ ایک ناقابل عبور خندق تھی۔ جس کی چوڑائی 60 فٹ اور گہرائی 100 فٹ تھی۔ ایک تیسری فصیل نے شہر کی ایک لاکھ سے زیادہ آبادی کو اپنے دامن میں پناہ دے رکھی تھی۔ اور یوں یہ شہر فتح کرنا قریب قریب ناممکن ہو گیا تھا۔ قسطنطنیہ عیسائی دنیا کا روحانی مرکز تھا۔ چنانچہ مسلمان فاتحین کے بیسیوں لشکر اس شہر پر یلغار کرنے کے لئے پورے ساز و سامان کے ساتھ آتے..... لیکن ہر مرتبہ ناکامیاب لوٹ

جاتے۔ اور پھر رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بشارت کا مستحق، دولت عثمانیہ کا ساتواں فرمانروا ''سلطان محمد فاتح'' ٹھہرا۔

''عثمانی ترک''..... جنہیں ہم ''خلافت عثمانیہ'' کے نام سے جانتے ہیں..... خراسانی خانہ بدوش ''طغرل'' کے بیٹے ''عثمان خان'' کی اولاد تھے۔ یہ ایشیائے کوچک میں داخل ہوئے تو انہوں نے ایک سلطنت کی بنیاد ڈالی جو صرف تین سو سال کے عرصہ میں دنیا کی سب سے بڑی طاقت بن گئی۔ اس کے عروج کا دور مشرق میں ''سلطان سلیم'' اور مغرب میں ''سلیمان اعظم'' پر ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن دولت عثمانیہ کا سب سے مشہور فرمانروا ''سلطان محمد فاتح'' ہے۔ جس کے ہاتھوں سرکار دو عالمؐ کی بشارت تکمیل کو پہنچی۔

''قسطنطین'' دوازدہم اور سلطان محمد فاتح کے درمیان ہونے والی یہ جنگ تحیر کن واقعات اور تاریخ پر مبنی ہے۔ خصوصاً سلطان نے جب اپنی بحریہ کو خشکی پر جہاز چلانے کا حکم دیا اور دس میل کا دشوار گزار پہاڑی راستہ عثمانی بحری بیڑے نے پتھریلی چٹانوں پر گھسٹ کر طے کیا۔

یہ عظیم اور لازوال معرکہ فی الحقیقت تاریخ کا ایک مہتم بالشان واقعہ ہے جسے میں نے اس مکمل ناول میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مغربی مؤرخین قسطنطنیہ کی فتح کو قرونِ وسطیٰ اور دورِ حاضر کے درمیان حد فاصل قرار دیتے ہیں۔ اور یہ ہے بھی حقیقت..... قدیم بازنطینی سلطنت کے پایۂ تخت اور پوری عیسائی دنیا کے روحانی مرکز کی تسخیر..... جہالت کے اندھیروں میں ڈوبے اہلِ مغرب کی آخری شکست اور مسلمانوں کی آخری فتح تھی۔

جب رومی بادشاہ ''قسطنطین'' نے تیسری صدی عیسوی میں عیسائی مذہب قبول کر کے اس شہر کو اپنا پایۂ تخت بنایا تھا اس وقت سے اس کا نام ''قسطنطنیہ'' ہو گیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس شہر پر جہاد کرنے والوں کو مغفرت کی بشارت عطا فرمائی تھی۔ قسطنطنیہ کے بادشاہ کو قیصر روم کہا جاتا تھا۔ سلطان محمد فاتح کے زمانہ میں قسطنطین نام کا بارھواں ''قیصر'' حکمران تھا۔ آخری قیصر قسطنطین اس معرکے میں ہلاک ہوا۔ اور قسطنطنیہ ہمیشہ کے لئے ..... ''اسلامبول'' یا ''استنبول'' بن گیا۔ یوں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک اور پیشین گوئی سچ ثابت ہوئی کہ:۔

"اذا ھلک قیصراً فلا قیصر بعدہٗ"

ترجمہ:۔ جب قیصر ہلاک ہو گیا تو پھر کوئی قیصر نہیں آئے گا۔''

میں نے اس ناول کی تاریخ کو ''افسانہ'' بنا کر پیش کرنے سے حتی الامکان پرہیز کیا

ہے۔ اور نہ میں نے اس افسانہ کو تاریخ بنانے کی کوشش کی ہے۔ میری خواہش تھی کہ ناول کی زیادہ تر کہانی حقیقی تاریخی کرداروں پر مشتمل ہو۔ اور میں اس میں بہت حد تک کامیاب بھی رہا ہوں۔ لیکن اس کے لئے مجھے بہت سا وقت صرف کر کے ''ایڈورڈ گبن، کریسی، دولت عثمانیہ، تاریخ اسلام اور جہان دیدہ'' کے علاوہ جغرافیہ اور صلیبی جنگوں کی تاریخ پر مشتمل کئی کتابوں کو کھنگالنا پڑا۔

اس ناول کے پیش نظر پندرھویں صدی عیسوی کا وسطی زمانہ تھا۔ یہ صدی اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس صدی کے وسط میں عیسائیوں کا مقدس شہر قسطنطنیہ مفتوح ہوا..... اور اسی صدی کے آخری عشرہ میں اندلس کے مسلمان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نابود کر دیئے گئے..... میری خواہش تھی کہ..... اور نہیں تو کم از کم میں آلِ عثمان کی مختصر تاریخ بھی کسی طرح اس ناول میں بیان کر دوں۔ لیکن کہانی کے انتہائی دلچسپ پلاٹ میں اس کی گنجائش نہ تھی۔ چنانچہ میں نے دوسرے حصہ کے آغاز پر ''اوراقِ گزشتہ'' کے عنوان سے ایک مختصر سا باب دے دیا ہے۔ جس میں ''طغرل'' سے لے کر سلطان محمد فاتح تک عثمانی فرمانرواؤں کی تاریخ کا خلاصہ پیش کر دیا۔ اور اس طرح یہ ناول صرف ایک ناول نہیں، بلکہ ایک مکمل تاریخی دستاویز بن گیا۔ مختصراً یہ کہ میں اس سچی کہانی کو اپنے قارئین کے سامنے پیش کرتے ہوئے مسرت کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے عثمانی تاریخ کو بزعم خود نہایت دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ لیکن اصل فیصلہ تو قارئین کے ہاتھ میں ہے۔

آخر میں، میں ..... منیر ایاز، ریاض امین، عبدالرحمٰن طاہر، محمد سلیم سنی اور خصوصاً قاسم یاد کا شکر گزار ہوں۔ کیونکہ ان احباب کے علمی تعاون کے بغیر میرے لئے یہ معرکہ سر کرنا آسان نہ تھا۔

آپ کی آراء کا منتظر.....

ادریس آزاد

P.O. Box No.1064

اسلام آباد

''فہرست ابواب''

حصہ اوّل ..... درویش بادشاہ

باب 1:	سکندر بیگ	9
باب 2:	پنج ہزاری سالار	27
باب 3:	شاہی سراغ رساں	59
باب 4:	قیصر کے جاسوس	97
باب 5:	معاہدۂ زبجیڈین	138
باب 6:	بوسنیا کی شہزادی	183

حصہ دوم ..... فتح قسطنطنیہ

باب 7:	اوراقِ گزشتہ	225
باب 8:	سلطان محمد خان	240
باب 9:	سنہری سینگ	270
باب 10:	آیا صوفیاء	310
باب 11:	روٹیوں کا اختلاف	356
باب 12:	قیصرِ روم	397
باب 13:	مقدس نقشہ	433
باب 14:	فاتح کی یلغار	463

سکندر بیگ

عربی نسل کا ''اَبلق گھوڑا'' اپنی پشت پر نقاب پوش سوار کو لئے پوری شان اور طمطراق کے ساتھ میدان میں داخل ہوا۔ یہ ''ادرنہ'' (اینڈریانوپل) کا میدانِ حواجز تھا۔ چاروں طرف کی نشستیں تماشائیوں سے پُر تھیں۔ نقاب پوش گھڑسوار کے داخل ہوتے ہی پنڈال پر سناٹا چھا گیا۔ آج ترکوں کا سالانہ تہوار تھا۔ اس اسٹیڈیم میں شمشیر زنی، نیزہ بازی اور دیگر کھیلوں کے مقابلے ہو رہے تھے۔ نقاب پوش گھڑسوار اپنی دو دھاری البانوی شمشیر کو لہراتا ہوا میدان کے وسط میں آ کر رُک گیا اور اگلے لمحے اُس نے اپنے چہرے سے نقاب اُلٹ دی۔ یہ ''سکندر بیگ'' تھا۔ سلطان مراد خان کا چہیتا منہ بولا بیٹا۔ اُس کے گھوڑے کی پشت پر ایک باریک چھڑی کے ساتھ ''سلطان بایزید یلدرم'' کا پرچم لہرا رہا تھا۔ سکندر بیگ نے میدان میں ایک طرف کھڑے ''ینی چری'' کے سالاروں کو مخاطب کیا۔ یہ سالار اس اسٹیڈیم میں ہونے والے مقابلوں کے منصفین تھے۔ سکندر بیگ نے کہا۔

''آلِ عثمان کے جاہ و جلال کی قسم! پوری سلطنت عثمانیہ میں کوئی جوان ایسا نہیں جس کے بازوؤں میں سکندر بیگ کو شکست دینے کی ہمت ہو..... اگر ایسا کوئی مردِ میدان اس میلے میں موجود ہے تو میں اُسے قوت آزمائی کی دعوت دیتا ہوں۔''

سلطنت عثمانیہ کے پُرجلال فرمانروا ''سلطان مراد خان ثانی'' کی چھتری دار نشستیں سکندر بیگ کے بالکل سامنے تھیں۔ سلطان نے سکندر بیگ کی للکار سنی تو فخر سے مسکرایا۔ لیکن سلطان سے چند نشستیں دُور بیٹھی ''مارسی'' کے ماتھے پر سلوٹیں پڑ گئیں۔ مارسی سکندر بیگ کی شان و شوکت پر بل کھا کر رہ گئی۔ یہ البانوی حسینہ سکندر کو ناپسند کرتی تھی۔ سکندر کی للکار سن کر ینی چری فوج کا ایک نوجوان سالار آغا حسن آگے بڑھا۔ آغا حسن کو دیکھتے ہی سکندر کے چہرے پر حقارت آمیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ آغا حسن ایک دراز قد ایرانی النسل گھوڑے پر سوار تھا اور اُس کے داہنے ہاتھ میں یمن کی بنی ہوئی بھاری بھرکم تلوار تھی۔ مقابلے کے دونوں شریک ایک دوسرے کے سامنے آئے تو پورے میدان میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ تماشائیوں کے چہروں پر جوش و جذبہ دکھائی دینے لگا اور مارسی اپنی نشست پر مچل کر رہ گئی۔ ایک منصف نے تکبیر بلند کر کے مقابلے کے آغاز کا اعلان کیا تو دونوں

سوار اپنے اپنے گھوڑوں کی لگامیں تھامے ایک دوسرے کے بالکل نزدیک آ گئے۔ سکندر بیگ نے رعونت آمیز لہجے میں کہا۔

"بہت خوب.....! نوجوان! مجھے تمہاری جرأت دیکھ کر حیرت ہوئی ہے۔ میں تمہیں حملے میں پہل کی اجازت دیتا ہوں۔"

آغا حسن، سکندر سے مرعوب ہوئے بغیر آگے بڑھا اور سکندر پر پوری طاقت سے وار کر دیا۔ سکندر نے بجلی کی طرح پہلو بدل کر خود کو بچایا اور مسکرا دیا۔ لیکن آغا حسن پھر تیزی کے ساتھ آگے بڑھا اور سکندر پر پوری قوت سے دوسرا وار کر دیا۔ سکندر کا گھوڑا اپنے مالک کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھا۔ گھوڑے نے آنِ واحد میں پینترا بدلا اور آغا حسن کا دوسرا وار بھی خالی چلا گیا۔ آغا حسن نے تیسری مرتبہ اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی لیکن اب سکندر اپنا ارادہ بدل چکا تھا۔ اُس نے جھکائی دینے کی بجائے اپنی تلوار پر آغا حسن کا وار روکا اور پھر دیکھنے والے حیرت زدہ رہ گئے کہ سکندر نے بجلی کی تیزی کے ساتھ پے در پے وار کرنے شروع کر دیئے۔ میدان میں تلواروں کی کھنکار دُور دُور تک گونجنے لگی۔ آغا حسن کو پسپا ہوتا دیکھ کر مارسی کا گلنار چہرہ یک لخت سفید ہو گیا۔ اُسے جو اُمید بندھی تھی وہ ٹوٹنے لگی۔ وہ سکندر کی شکست چاہتی تھی۔ جبکہ سلطان مراد خان فخر سے گردن تانے مسکرا رہا تھا۔ وہ سکندر کے ہر وار پر عش عش کر اٹھتا۔

تھوڑی ہی دیر میں مقابلے کا فیصلہ ہو گیا۔ آغا حسن کی بھاری بھرکم تلوار سکندر کے ایک آہنی وار سے دولخت ہو گئی۔ پورا سٹیڈیم تالیوں کی آواز سے گونج اُٹھا۔ سکندر نے حسب سابق پھر مقابلہ جیت لیا تھا۔ سلطان مراد خان کے پہلو میں بیٹھا نوعمر شہزادہ فرطِ جوش سے اپنی نشست پر اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے تالیاں پیٹ رہا تھا۔ لیکن مارسی بے حد مضمحل تھی۔ اُسے سکندر بیگ ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ کیونکہ سکندر اُس پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ مارسی کو سکندر کا کردار بھی ناپسند تھا..... اور اپنی ماں کا بھی۔ ادھیڑ عمر "مارتھا" مارسی کی ماں تھی۔ یہ عورت البانوی شہزادوں کے ساتھ "ادرنہ" میں داخل ہوئی تھی۔ سکندر بیگ بھی البانوی شہزادہ تھا۔ اس کا البانوی نام "جارج کسٹریاٹ" تھا۔ سلطان مراد خان ثانی نے بہت عرصہ پہلے "البانیہ" کے فرمانروا "جان کسٹریاٹ" کو بزورِ شمشیر اپنا مطیع کر لیا تھا۔ جان کسٹریاٹ نے سلطان سے منت کر کے اپنی ریاست کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ سلطان نے اُس کی درخواست منظور کر لی اور ضمانت کے طور پر البانیہ کے حکمران نے اپنے چار بیٹے سلطان مراد خان ثانی کے حوالے کر دیئے۔ ان شہزادوں کے

ہمراہ البانوی محل کی خاص کنیز "مارتھا" بھی روانہ کی گئی۔ مارتھا سلطنت عثمانیہ کے دارالخلافہ ادرنہ میں آئی تو اُس نے بہت جلد اشرافیہ کے طبقہ میں اپنا اثر و رسوخ پیدا کر لیا۔ مارسی، اپنی ماں مارتھا کی بیٹھی تھی اور جارج کسٹریاٹ یعنی سکندر بیگ اسی مارتھا کے گھر میں پل کر جوان ہوا تھا۔ سکندر بیگ نے بنی چری کی طبیعت کے مطابق مذہب عیسائیت ترک کر کے اسلام قبول کر لیا تھا۔ لیکن مارتھا ابھی تک اپنے مذہب پر قائم تھی۔ مارسی کے دل میں اگرچہ اسلام کے لئے بے حد نرم گوشہ تھا لیکن ماں کے خوف سے وہ ابھی تک عیسائی مذہب کی پیروکار تھی۔ مارتھا ایک کٹر مذہبی عورت تھی۔ اور اسلام کے خلاف بے پناہ تعصب رکھتی تھی۔ مارسی کو اس وقت بے حد حیرت ہوئی جب اُس کی ماں نے سکندر بیگ کو اسلام قبول کرنے پر کچھ نہ کہا۔ مارسی اپنی ماں کی طرف سے مشکوک تھی۔ مارسی کو شک تھا کہ اس کی ماں نے سکندر بیگ کو خود مذہب تبدیل کرنے پر آمادہ کیا ہے۔ وہ اپنی ماں اور اپنے ساتھ پل کر جوان ہونے والے جارج کسٹریاٹ کے طرزِ عمل میں عثمانی سلطنت کے خلاف سازش کی بو سونگھ رہی تھی۔

مارسی کے شک میں مبتلا ہونے کی سب سے بڑی وجہ "ابوجعفر" تھا۔ ابوجعفر ایک ادھیڑ عمر شخص تھا جس نے "ادرنہ" میں ایک مذہبی پیشوا یعنی امام مسجد کا رُوپ دھار رکھا تھا۔ یہ شخص درحقیقت "قیصرِ قسطنطنیہ" کا جاسوس تھا۔ اور یہاں "ادرنہ" میں ایک مسلمان مذہبی پیشوا کے رُوپ میں داخل ہوا تھا۔ یہ شخص "ادرنہ" میں مارتھا کی آمد سے پہلے ہی اپنی سازش کا جال پھیلا چکا تھا۔ مذہب پرست البانوی کنیز مارتھا سلطان کے محل میں وارد ہوئی تو ابوجعفر کی سرگرمیاں مزید تیز ہو گئیں۔ اُس نے پہلے پہل مارتا کو صلیب اعظم کا واسطہ دے کر اپنی سازش میں شریک کیا تھا۔ ابوجعفر خود قسطنطنیہ میں "آیا صوفیاء" کے چرچ سے منسلک تھا اور ایک پختہ کار راہب تھا۔ قیصر نے سلطان مراد خان ثانی کو سلطنت عثمانیہ کے تخت پر بیٹھے دیکھا تو ایک نئی چال کے تانے بنے بننے شروع کر دیئے۔ ابوجعفر جو درحقیقت "ڈیمونان" تھا۔ عظیم عیسائی سلطنت کے بادشاہ قیصرِ قسطنطنیہ کا خاص جاسوس تھا۔ قسطنطنیہ "مینوئل" کے پاس عثمانی سلطنت کے دارالخلافہ "ادرنہ" کی ایک ایک خبر ہر ماہ باقاعدگی کے ساتھ پہنچتی تھی۔ اور "ادرنہ" میں قیصر کی اس ساری سازش کا سرغنہ ابوجعفر خود ہی تھا۔ ابوجعفر پچھلے بارہ سال سے مارسی کی ماں کے مکان پر آیا جایا کرتا تھا۔ مارسی بچپن سے ہی اس سے متنفر تھی۔ وہ اس کی مکار صورت کو دیکھتے ہی کھول اُٹھتی۔ اُسے ابوجعفر کی حقیقت کا علم نہیں تھا لیکن وہ اُس کی عادات و اطوار سے اب تک بخوبی اندازہ لگا چکی تھی

کہ یہ مکار شخص یقیناً وہ نہیں جو اوپر سے نظر آتا ہے۔ ابوجعفر مارتھا کے گھر آتا تو وہ دونوں بند کمرے میں بیٹھ کر دیر تک باتیں کرتے رہتے۔ کبھی کبھی سکندر کو بھی بلا لیا جاتا۔ مارسی مسلمانوں کے اس مذہبی پیشوا کو اپنی عیسائی ماں کے پاس باقاعدگی سے آتا دیکھ کر شک میں مبتلا ہوگئی۔

ادھر سکندر بیگ جب سے مسلمان ہوا تھا پہلے سے بھی زیادہ بدتمیز اور واہیات ہو گیا تھا۔ وہ جتنی دیر گھر پر رہتا مارسی کو بری نظروں سے دیکھتا رہتا۔ مارسی بچپن سے ہی سکندر بیگ کی عادات کو ناپسند کرتی تھی۔ وہ بچپن سے ہی چڑچڑا، بدتمیز اور ہتھ چھٹ تھا۔ شاید اُس کے اس طرح بدمزاج ہونے کی وجہ یہ رہی ہو کہ اُس کے سامنے اُس کے باپ..... جان کسٹریاٹ کو سلطان مراد خان ثانی نے ذلت آمیز شکست دی اور اُسے اُس کے تین چھوٹے بھائیوں سمیت یرغمال بنا کر اتنی دُور ''ادرنہ'' آنا پڑا۔ اور اس پر مستزاد یہ تھا کہ اُس کے تینوں چھوٹے بھائی بچپن میں ہی اُس کی آنکھوں کے سامنے اس دیارِ غیر میں بیمار ہو کر مر گئے۔ یہ سب کچھ سکندر بیگ کے حالات کا تقاضہ تھا۔ اور کچھ مارتھا کا چرب زبان سازشی کردار کہ سکندر بیگ اس قدر منتقم مزاج اور مغرور واقع ہوا تھا۔

آج مارسی نے ایک مرتبہ پھر سکندر بیگ کو مقابلے کا میدان جیتتے دیکھا تو اُس کے رگ و پے میں مایوسی اور غصے کی لہر دوڑ گئی۔ آج خصوصی طور پر اُس کے غم و غصے کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ علی الصبح گھر سے نکلنے سے پہلے سکندر نے مارسی سے کہا تھا۔

''آج شمشیر زنی کے مقابلوں کا دن ہے۔ میں ایک بار پھر ادرنہ کا سب سے بڑا جنگجو تسلیم کیا جاؤں گا..... یہ حقیر ترک میرے مقابلے کی ہمت نہیں رکھتے۔ آج اگر میں پھر جیت کا تمغہ لے کر لوٹا تو چچی مارتھا سے تمہارا ہاتھ مانگ لوں گا۔''

سکندر بیگ، مارتھا کو چچی کہہ کر پکارتا تھا۔ مارسی نے اتنا سنا تو غصے سے چہرہ لال کرتے ہوئے کہا۔ ''اتنا تکبر مت کرو..... دراصل سلطان تم پر اعتماد کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاہی احترام میں تمہارے سامنے کوئی نہیں آتا۔ مجھے یقین ہے کہ ینی چری کا کوئی بھی سالار تمہیں آسانی سے شکست دے سکتا ہے۔''

سکندر بیگ مارسی کا زہر آلود جملہ سن کر غصے سے پیر پٹختا ہوا گھر سے نکل گیا۔ اور اب مارسی دیکھ رہی تھی کہ ینی چری کا ایک سالار سکندر بیگ سے بری طرح مات کھا چکا تھا۔ مارسی کی نظریں میدان سے ہٹ کر اپنے پیروں میں آ جھکیں۔ وہ آج صبح کا مکالمہ یاد کر رہی تھی جب سکندر نے اُس سے کہا تھا کہ۔

''میں تمہاری ماں سے تمہارا ہاتھ مانگ لوں گا۔''

مارسی شدید بے چین تھی اور آنے والے وقت سے ہراساں تھی۔ مارسی کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں کہ اچانک اُسے سٹیڈیم میں شور سنائی دیا..... زوردار تالیوں کا شور۔ مارسی نے چونک کر میدان میں دیکھا تو مارے حیرت کے اپنی نشست پر اُچھل کر رہ گئی۔ ایک اجنبی نوجوان جس کے جسم پر عربی لباس تھا، سٹیڈیم کی ایک جانب سے ایک سفید گھوڑے کو ایڑھ لگاتا ہوا داخل ہوا۔ نوجوان کے خدوخال بھی حجازی تھے۔ اُس کے نیچے ترکی نسل کا بہترین گھوڑا تھا اور اُس کے داہنے ہاتھ میں ایک بھاری اور چمکدار شمشیر تھی۔ اُس کے جسم پر نہ ہی زرہ تھی اور نہ ہی پیش قبض۔ اور اُس کے سر پر آہنی خود کی بجائے خالص حجازی طرز کا عمامہ تھا۔ نوجوان کی عمر زیادہ سے زیادہ سترہ برس رہی ہوگی۔ تماشائی پورے جوش سے تالیاں بجا رہے تھے۔

اجنبی نوجوان کو آتا دیکھ کر سکندر کے ماتھے پر شکنیں نظر آنے لگیں۔ اُسے اس عرب نوجوان کی آمد پر شدید حیرت تھی۔ سٹیڈیم کے اعلانچی نے با آواز بلند اعلان کیا اور لوگوں کو بتایا کہ اجنبی نوجوان کا نام ''قاسم بن ہشام'' ہے۔ یہ حجاز کے شہر ''مکہ'' کا رہنے والا ہے جہاں اسلام کا اولین سورج طلوع ہوا۔ اعلانچی نے بتایا کہ قاسم عثمانی تربیت گاہ کے شمشیر زنی کے استاد ''طاہر بن ہشام'' کا چھوٹا بھائی ہے..... اس اعلان کے ساتھ ہی سلطان مراد خان ثانی کے چہرے پر بھی حیرت و اشتیاق کی لہر دوڑ گئی۔ اور سلطان کے پہلو میں بیٹھا نو عمر شہزادہ ''محمد'' بھی حیرت سے چونک اٹھا۔ لیکن مارسی کی حالت سب سے عجیب تھی۔ وہ اپنی نشست پر بار بار پہلو بدلتی اور مٹھیاں بھینچ بھینچ کر اپنے جذبات کا اظہار کرتی۔

عرب شہسوار سکندر بیگ کے سامنے آیا تو سکندر نے مسکرانے کی کوشش کی۔ اُس نے عرب شہسوار کو حسب سابق حقارت کی نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''نوجوان! میں تمہارے چہرے پر جرأت اور بہادری کے نقش دیکھ رہا ہوں۔ لیکن افسوس! تمہارا تمام تر اعتماد سکندر بیگ کے پہلے وار سے ہی خاک میں مل جائے گا۔ یہ مکہ نہیں، ترکی سلطنت کا دارالخلافہ ادرنہ ہے۔ اور میں سلطان مراد خان ثانی کا سب سے مضبوط شمشیر زن ہوں۔''

قاسم، سکندر بیگ کے فرعونیت سے بھرپور لہجے کو محسوس کر کے عارفانہ انداز میں مسکرایا اور پھر انتہائی نپے تلے انداز میں مخاطب ہوا۔

''میں وقت سے پہلے بلند بانگ دعوؤں کا قائل نہیں۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ تمہارے بدن میں ''خالد بن ولیدؓ'' کا خون دوڑ رہا ہے۔ میری شدید خواہش ہے کہ میں

آج ایک ترک شہزادے کو حجازی شمشیر کا لوہا دکھا سکوں۔"

قاسم نے اتنا کہا اور اپنے گھوڑے کو ایڑھ لگا دی۔ سکندر پوری طرح تیار تھا۔ قاسم نے تلوار فضا میں بلند کی اور خالص عربی لہجے میں اللہ اکبر کہہ کر سکندر پر ٹوٹ پڑا۔ سورج کی شعاعیں قاسم کی چمکدار تلوار پر پڑیں اور تماشائیوں کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ یہ محض تلوار کی چمک چوند نہیں تھی بلکہ آسمانی صاعقہ کی لپک تھی..... قاسم کے تابڑ توڑ حملے سکندر کے لئے ہزیمت کا پیغام تھے۔ سکندر کی تمام چالیں دھری کی دھری رہ گئیں اور وہ مسلسل ہر وار کو اپنی تلوار پر روکنے لگا۔ بظاہر ایسا لگ رہا تھا کہ قاسم جلد تھک جائے گا۔ مارسی، قاسم کے ہر وار کے ساتھ اُچھل اُچھل جاتی۔ وہ اب اپنی نشست پر کھڑی ہو گئی تھی۔ تمام تماشائی چیخ چیخ کر قاسم کو داد دے رہے تھے۔ سلطان بے ساختہ مرحبا، مرحبا پکار رہا تھا۔ اور شہزادہ "محمد" اپنے شاہانہ مرتبے کو بھول کر بالکل بچگانہ انداز میں تالیاں بجا رہا تھا۔

یکلخت قاسم نے نئی چال چلی اور اپنے آپ کو تھکا ہوا ظاہر کرنا شروع کر دیا۔ سکندر نے قاسم کے وار میں کمزوری محسوس کی تو اپنے ڈوبتے ہوئے دل کو حوصلہ دیا اور بڑھ کر قاسم پر حملہ کر دیا۔ اب قاسم سکندر کے ہر وار سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتا ہوا محسوس ہوا۔ اُس کا گھوڑا مسلسل اُلٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگا اور اُس کی تلوار پے در پے سکندر کے وار سہنے لگی۔ سکندر بھی بری طرح تھک چکا تھا اور چاہتا تھا کہ کسی طرح جلد از جلد یہ مقابلہ ختم ہو۔ اچانک قاسم نے گھوڑے کی پشت پر اپنے پاؤں کھینچ لئے اور زین پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ اگلے لمحے تماشائی قاسم کا کرتب دیکھ کر حیران رہ گئے۔ قاسم نے اپنے بدن کا بوجھ اپنے پیروں پر ڈالا اور ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ پورا سٹیڈیم ایک ساتھ تالیوں سے گونج اُٹھا۔ اب دراز قد قاسم سکندر سے بلندی پر تھا اور حملہ کرنے میں اس کی پوزیشن کو فوقیت حاصل تھی۔ اس نے گھوڑے کی زین پر کھڑے ہو کر پہلا وار اس قدر بھرپور اور زوردار انداز میں کیا کہ سکندر کے چھکے چھوٹ گئے۔ فرطِ جذبات سے مارسی کی چیخ نکل گئی۔ سکندر بیگ دراز قامت قاسم کے پہلے وار کو ہی نہ سہہ سکا۔ قاسم کی شمشیر کسی آہنی گرز کی طرح سکندر پر گری۔ سکندر نے اپنی تلوار آگے کر کے قاسم کے وار کو روکنا چاہا۔ لیکن ضرب اتنی کاری تھی کہ سکندر گھوڑے کی پشت پر سنبھل نہ سکا اور نیچے گر گیا۔ قاسم نے کسی بازی گر کی طرح گھوڑے کی پشت سے چھلانگ لگائی اور سکندر کے سنبھلنے سے پہلے اُس کے سر پر سوار ہو گیا۔ سکندر کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمکتی دیکھ کر مارسی کھل اُٹھی۔ سلطان مارے اشتیاق کے خود تالی بجانے لگا۔

قاسم نے زمین پر قدم رکھتے ہی سکندر کو آڑے ہاتھوں لیا۔ سکندر ابھی پوری طرح سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ قاسم نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اُس پر حملہ کر دیا۔ اب سکندر کو اپنی شکست صاف نظر آ رہی تھی۔ قاسم نے یک لخت پہلو بدلا اور اچھل کر سکندر کے بائیں پہلو پر زوردار ضرب لگانے کا جھانسہ دیا۔ سکندر نے تیزی سے تلوار آگے کی لیکن وہ قاسم کی چال نہ سمجھ سکا۔ قاسم نے بائیں پہلو پر حملہ کرنے کی بجائے ہوا میں ہی اپنا ارادہ بدلا اور سکندر کے دائیں بازو پر تلوار کی زوردار ضرب لگائی۔ سکندر کے بازوؤں پر آہنی بازو بند چڑھے ہوئے تھے۔ قاسم کی تلوار نے لوہے کے بازو بند کو کاٹ کر سکندر کے بازو کو معمولی سا چیر ڈالا۔ خون کے قطرے زمین پر گرے تو یک دم سٹیڈیم میں موجود تماشائی خاموش ہو گئے۔ قاسم نے صورتِ حال کی نزاکت پر غور کیا اور یک لخت اپنے تابڑ توڑ حملوں کا سلسلہ روک دیا۔ وہ سکندر کو پیچ و تاب کھاتا چھوڑ کر چند قدم پیچھے ہٹ آیا۔ یہاں مقابلے کے صفین ایک قطار میں کھڑے تھے۔ تمام لوگوں کے چہروں پر حیرت اور اشتیاق کے جذبات ثبت تھے۔

قاسم بے خبر انداز میں سٹیڈیم کے تماشائیوں کی جانب دیکھ رہا تھا کہ سکندر بے اصولی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تیزی سے قاسم کی جانب لپکا۔ اگر مارسی اپنی نشست سے چیخ کر قاسم کو خبردار نہ کر دیتی تو سکندر یقیناً قاسم کی گردن کاٹ لیتا۔ قاسم نے مارسی کی چیخ سنی اور ایک لمحے میں صورتحال کا اندازہ کر لیا۔ اگلے لمحے وہ کسی چیتے کی طرح اپنی جگہ پر اُچھلا اور گھوم کر نہ صرف سکندر کے وار سے خود کو بچا لیا بلکہ پوری قوت سے سکندر پر حملہ بھی کر دیا۔ تلواروں کی چھن چھن انتہائی سرعت کے ساتھ سنائی دینے لگی۔ اور پھر تماشائیوں نے دیکھا کہ قاسم کے ایک عجیب و غریب وار سے سکندر کی تلوار اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور کسی چودھویں رات کے چکور کی طرح پھڑ پھڑاتی ہوئی اوپر کی طرف اُڑتی چلی گئی۔ اب سکندر خالی ہاتھ تھا۔ قاسم نے بھی تلوار پھینک دی اور سلطان مراد خان ثانی کی موجودگی کا خیال کئے بغیر سکندر پر عراقی فن پہلوانی کا ایک ایسا داؤ آزمایا کہ اُسے زمین سے چند فٹ اوپر اٹھا کر بری طرح پٹخ دیا۔ سلطان یہ دیکھ کر یک لخت اپنی نشست سے اُٹھ کھڑا ہوا اور حکم دیا کہ یہ مقابلہ بند کیا جائے۔

مقابلہ تو ویسے بھی ختم ہو چکا تھا۔ سکندر، قاسم سے ذلت آمیز شکست کھا کر زمین پر گرے منہ پڑا مٹی چاٹ رہا تھا۔ مارسی نے سکندر کو اس حالت میں دیکھا تو خوشی سے پاگل ہو گئی۔ کھیلوں کے اختتام پر سلطان مراد خان ثانی نے تمام شرکاء میں انعامات تقسیم

کیے۔ اور سب کو اپنی اپنی جگہ پر خوب داد دی۔ لیکن جب قاسم کی باری آئی تو سلطان نے قاسم کو شانوں سے پکڑ کر بڑے غور سے دیکھا اور مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''قاسم بن ہشام! تمہاری شمشیر زنی قابل داد ہے۔ تم جیسے نوجوانوں کی سلطنت عثمانیہ کو اشد ضرورت ہے۔ عیسائیوں کا سب سے بہادر جرنیل ''ہونیاڈے'' ڈیڑھ لاکھ کی فوج لئے ہماری سرحدوں پر پہنچ چکا ہے۔ ''ہونیاڈے'' کی شمشیر زنی کا مقابلہ تمہاری تلوار کر سکتی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم ہماری تربیت یافتہ فوج ینی چری میں شامل ہو جاؤ۔ ہم تمہیں ینی چری کا ''یک ہزاری سالار'' مقرر کرتے ہیں۔''

سلطان کا یہ فیصلہ قاسم کے لئے غیر متوقع تھا۔ وہ بری طرح سٹپٹا گیا۔ وہ تو محض چند دن گزارنے کے لئے ''ادرنہ'' آیا تھا، اپنے بھائی طاہر بن ہشام کے گھر۔ وگرنہ اپنے شہر مکہ میں اُس کی مصروفیات بہت زیادہ تھیں۔ بوڑھے ماں باپ کی دیکھ بھال، کھیتی باڑی اور مویشی..... یہ سب کچھ سنبھالنا اکیلے قاسم کی ذمہ داری تھی۔ اُس کا بڑا بھائی طاہر پہلے ہی سلطان مراد خان ثانی کا ملازم تھا۔ طاہر عثمانی تربیت گاہ میں شمشیر زنی کا استاد تھا۔ شمشیر زنی اور پہلوانی قاسم کے موروثی اور خاندانی کھیل تھے۔ اُس کا باپ ''ہشام'' حجاز کا نامی گرامی پہلوان رہ چکا تھا۔ قاسم یہاں اپنے بھائی سے ملنے کے لئے آیا تھا۔ وہ ابھی کل ہی یہاں ''ادرنہ'' میں وارد ہوا تھا۔ یہاں آ کر اُسے سالانہ تہوار کا علم ہوا تو وہ بہت خوش ہوا اور اپنے بھائی طاہر کے ساتھ علی الصبح یہاں سٹیڈیم چلا آیا۔ اور اب یہ اچانک افتاد جو اُس کے سر پر آ پڑی تھی، اُس سے سنبھالی نہ جا رہی تھی۔ اُس نے تو سکندر کو تکبر کی سزا دینے کے لئے اپنے بھائی کے مشورے سے اس مقابلے میں حصہ لیا تھا۔ لیکن اب سلطان اُسے مستقل طور پر یہاں ''ادرنہ'' میں قیام کرنے کے لئے مجبور کر رہا تھا۔ سلطان کی بات سن کر قاسم سکتے میں آ گیا۔ قاسم کو خاموش کھڑا دیکھ کر سلطان نے پھر کہا۔

''کیا تمہیں خوشی نہیں ہوئی نوجوان؟ ابھی تم کم عمر ہو۔ اس لئے ہم نے تمہیں یک ہزاری سالار بنایا ہے۔ لیکن اگر تم اس عہدے سے خوش نہیں تو ہم تمہاری کمان میں پانچ ہزار بہترین سپاہی دینے کے لئے بھی تیار ہیں۔''

اب تو جیسے قاسم گہرے خواب سے جاگ اُٹھا۔ اُس نے چونک کر سلطان کی جانب دیکھا اور پھر کسی قدر جھجکتے ہوئے کہنے لگا۔ ''نہیں سلطانِ معظم! میں کسی عہدے کے لالچ کی وجہ سے خاموش نہیں۔ بلکہ میری خاموشی کی وجہ میرے والدین ہیں۔ اپنے والدین اور مال مویشی کی دیکھ بھال کے لئے گھر پر میں اکیلا ہوں۔ جبکہ میرے بڑے بھائی ''طاہر بن

ہشام'' آپ کے معسکر میں شمشیر زنی کے استاد ہیں۔''

سلطان نے خاموشی سے قاسم کی بات سنی اور پھر بڑے نرم لہجے میں قاسم سے مخاطب ہوا۔ ''مال مویشی یا گھر بار دنیاوی زندگی کا سہارا ہیں۔ نوجوان! ایک سچے مسلمان اور سپاہی کے لئے دنیاوی زندگی سے زیادہ آنے والی زندگی کی قدر و قیمت ہے..... تم اپنے اندر کے سپاہی اور ماہر شمشیر زن کو مال مویشی اور کھیتی باڑی پر کیوں ضائع کرنا چاہتے ہو؟..... جہاں تک تمہارے والدین کا تعلق ہے ہم انہیں یہیں بلوا لیتے ہیں..... ہم تمہارے بھائی طاہر سے بھی بات کریں گے۔''

اب قاسم کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ اُس نے خاموشی سے سر تسلیم خم کیا۔ سلطان، قاسم کی رضامندی سے بہت خوش ہوا اور اپنی بہترین فوج ''ینی چری'' کے سپہ سالار کو بلا کر حکم دیا کہ وہ قاسم بن ہشام کی کمان میں پانچ ہزار سپاہیوں کا لشکر مقرر کر دے۔ قاسم کو حیرت تھی کہ سلطان نے محض اُس کی شمشیر زنی دیکھ کر اتنا بڑا فیصلہ صادر کر دیا۔ لیکن اس کے ساتھ وہ خوش بھی تھا۔ اس طرح وہ اپنی من پسند اور جنگجویانہ زندگی کا لطف اٹھا سکتا تھا۔

ماری خواتین کے حصے میں اپنی نشست پر بیٹھی سلطان اور قاسم کی کارگزاری دیکھ رہی تھی۔ اُس کے دل میں قاسم کے نام کا شرارہ پھوٹ چکا تھا۔ یہ دراز قد اور خوش شکل عرب نوجوان سکندر کی فرعونیت کے لئے پیغامِ اجل بن کر آیا تھا۔ چنانچہ ضروری تھا کہ ماری اس پر نثار ہوتی..... وہ میٹھی میٹھی نظروں سے قاسم بن ہشام کا گندمی چہرہ دیکھ رہی تھی۔ جب تک قاسم، سلطان کے پاس کھڑا رہا ماری اُن کی جانب متوجہ رہی۔ جونہی قاسم، سلطان سے الگ ہوا، ماری کی نظریں اُس کے قدموں کا تعاقب کرنے لگیں۔ وہ دُور معززین شہر کی نشستوں پر اپنے بھائی کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ اب ماری کے لئے اس اسٹیڈیم میں کوئی کام نہیں تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھی اور باہر کی طرف چل دی۔

گھر پر مارتھا نے ماری کو آڑے ہاتھوں لیا۔

''لڑکی! تمہارے اطوار بگڑتے جا رہے ہیں۔ آج صبح تم نے پھر سکندر بیگ کے ساتھ بداخلاقی کا مظاہرہ کیا۔''

مارتھا کے اس جملے پر ماری کا منہ لٹک گیا۔ وہ کسی قدر پھنکارتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''امی حضور! آپ دل سے یہ خیال نکال دیجئے کہ میں سکندر بیگ کی دُلہن بنوں گی مجھے آپ کا لاڈلا ایک آنکھ نہیں بھاتا۔''

مارتھا غصے سے بولی۔

''خبردار! اگر کوئی اُلٹی سیدھی بات منہ سے نکالی تو..... بدبخت لڑکی! تو اپنی اوقات کیوں بھول جاتی ہے۔ سکندر بیگ البانیہ کا شہزادہ ہے اور عنقریب ہونے والا بادشاہ..... جبکہ ہم محض اس کے غلام۔ سکندر بیگ سے زیادہ تمہیں کوئی خوش نہیں رکھ سکے گا۔''

''واہ! یہ کیا بات ہوئی؟ شہزادہ صاحب خود سلطان مراد خان ثانی کے یرغمالی ہیں۔ اور ان کے والد البانیہ کے بادشاہ ''جان کسٹریاٹ'' سلطان مراد خان کے باجگذار ہیں..... آپ ایک یرغمالی کے بارے میں کیسے کہہ سکتی ہیں کہ وہ البانیہ کا ہونے والا بادشاہ ہے؟''

مارسی نے طنزیہ لہجے میں اپنی ماں کو جواب دیا۔ لیکن مارتھا یک لخت خاموش ہوگئی۔ وہ دوسری مرتبہ یہ نہیں کہنا چاہتی تھی کہ سکندر بیگ البانیہ کا ہونے والا بادشاہ ہے۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی اور ابوجعفر کی بارہ سال پرانی سازش پوری ہونے میں بہت تھوڑے دن باقی رہ گئے ہیں۔ اور ایسے نازک موقع پر وہ پوری احتیاط کرنا چاہتی تھی۔ مارسی نے ماں کو خاموش کھڑے دیکھا تو غنیمت جانا اور تیز تیز قدموں سے اندر کی جانب دوڑتی چلی گئی۔ ادھر مارتھا ابھی تک اپنی سازش کے خیالوں میں گم تھی۔

مارتھا اور ابوجعفر نے سکندر بیگ کو پوری طرح اپنے جال میں پھانس رکھا تھا۔ مارتھا کی نظروں کے سامنے سکندر کا بچپن گزرنے لگا۔ اُسے وہ وقت اچھی طرح یاد تھا جب البانوی بادشاہ جان کسٹریاٹ کو سلطنت عثمانیہ کے سلطان مراد خان ثانی نے ذلت آمیز شکست سے دوچار کیا تھا..... اُس وقت مارتھا البانوی محل میں ایک کنیز کی حیثیت سے مقیم تھی۔ مارتھا جوان اور حسین ہونے کے ساتھ ساتھ ذہین اور متحرک لڑکی تھی۔ محل کی کنیز بننے سے پہلے وہ ایک البانوی امیر سے محبت کا دھوکہ کھا چکی تھی۔ اُس کی گود میں اپنے محبوب کی ایک سالہ بچی بھی تھی۔ البانوی امیر شروع شروع میں مارتھا کے ساتھ دل لگی کرتا رہا۔ لیکن جب مارتھا کی گود ہری ہوئی تو اُس نے مارتھا کو بے عزت کر کے نکال دیا۔ اب مارتھا کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ بادشاہ سے شکایت کرے۔ چنانچہ وہ جان کسٹریاٹ کے محل میں حاضر ہوئی اور بادشاہ کو اپنی روئیداد سنائی۔ لیکن جب بادشاہ نے البانوی امیر کا نام سنا تو اس خیال سے کہ صوبے میں بغاوت نہ پھیل جائے، امیر کو کچھ نہ کہا۔ البتہ مارتھا کو اپنے محل میں کنیز رکھ لیا۔

مارتھا حسین اور ذہین تھی۔ چنانچہ بہت جلد وہ بادشاہ کی منظورِ نظر ہوگئی۔ چاروں البانوی شہزادے جنہیں سلطان مراد خان بطور یرغمال اپنے ساتھ لے آیا، مارتھا کے ساتھ پہلے ہی سے مانوس تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جان کسٹریاٹ نے اپنے بیٹے سلطان مراد خان

کے سپرد کرتے وقت مارتھا کو بھی ان کے ہمراہ روانہ کر دیا۔ مارتھا اور چاروں البانوی شہزادے سلطانی محل میں ٹھہرائے گئے۔ مارتھا اپنی بچی اور ان چار بچوں کے ساتھ محل کے عقبی مکانوں میں آزادی کے ساتھ رہنے لگی۔ چاروں شہزادوں کو مکتب میں داخل کروا دیا گیا اور سلطانی خرچے پر ان کی تربیت ہونے لگی۔

مارتھا کو ''ادرنہ'' میں آئے ہوئے ابھی بہت کم وقت گزرا تھا کہ اُس نے اندرونِ محل اپنے راہ و رسم بڑھا لئے۔ وہ کٹر مذہب پرست تھی۔ ادھر ابوجعفر ''ادرنہ'' میں پہلے ہی سے موجود تھا۔ ابوجعفر ایک منجھا ہوا جاسوس تھا اور ادرنہ میں سلطان کے خلاف سازش کا مکمل جال بچھا چکا تھا۔ کوتوال شہر سے لے کر نئی چری کے بعض سالاروں تک ابوجعفر کی زیرِ زمین سرگرمیوں کا دائرۂ کار تھا۔ دربارِ سلطانی میں بھی اُس کے ہرکارے موجود تھے۔ گویا ادرنہ میں ابوجعفر کی بے تاج بادشاہی تھی۔ وہ بظاہر ایک مذہبی پیشوا تھا اور لوگ اُسے خطیب مغرب کے نام سے جانتے تھے۔ لیکن درحقیقت وہ قسطنطنیہ کے ''آرتھوڈکس چرچ'' آیا صوفیاء کا ایک آزمودہ کار پادری تھا۔ وہ ''ادرنہ'' میں پچھلے کئی سالوں سے مقیم تھا اور اُس کے ہرکارے قیصرِ قسطنطنیہ کو عثمانی سلطان کے پل پل کی خبر پہنچاتے تھے۔

البانیہ کی شکست کے بعد مارتھا اور البانوی شہزادے ''ادرنہ'' آئے تو ابوجعفر کے لئے اپنی سازش کا جال پھیلانا مزید آسان ہوگیا۔ اُس نے سب سے پہلے مارتھا کی فطری کمزوریاں معلوم کیں اور پھر مارتھا کو اپنے شکنجے میں جکڑنے کے لئے ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے۔ ایک مذہبی پیشوا کی حیثیت سے سلطانی محل کے عقبی محلے میں اُس کا آنا جانا کسی کو معیوب نہ لگا۔ پہلے پہل جب وہ مارتھا کے گھر آیا تو مارتھا نے اُسے مسلمانوں کا مذہبی پیشوا سمجھا اور کچھ خاص گھاس نہ ڈالی۔ لیکن مکار ابوجعفر نے پہلی نشست میں ہی مارتھا کو اپنے شیشے میں اتار لیا۔ شروع شروع میں مارتھا عیسائی سازش کا حصہ بننے سے خوفزدہ رہی۔ لیکن ابوجعفر کی چرب زبانی نے اُسے بہت جلد اپنے اشاروں پر نچانا شروع کر دیا۔ اب وہ ایک البانوی کنیز کی بجائے ''قیصر'' کی ایک اہم جاسوسہ تھی۔ مارتھا، ابوجعفر کے لئے سلطانی محل میں جا کر اہم معلومات حاصل کرتی اور اپنے تئیں دین یسوع مسیح کی خدمت سرانجام دیتی۔

اسی اثناء میں ایک اہم واقعہ یہ ہوا کہ شاہِ سربیہ ''لارڈ سٹیفن'' نے اپنی بیٹی شہزادی ''مارا برینا'' نوجوان سلطان مراد خان ثانی کے عقد میں دے دی۔ شاہِ سربیہ لارڈ سٹیفن اگرچہ مذہباً عیسائی تھا لیکن مراد خان ثانی کے دادا ''سلطان بایزید یلدرم'' کے زمانے سے

سلطنت عثمانیہ کا بہی خواہ اور وفادار تھا۔ بایزید یلدرم کے زمانے میں سٹیفن نے مسلمانوں کی طرف سے متعدد معرکوں میں شرکت کی اور ہر محاذ پر سلطان کے شانہ بشانہ رہا۔ خصوصاً اُس وقت جب ''جنگ انگورہ'' میں تاتاری فرمانروا ''امیر تیمور'' نے سلطان بایزید یلدرم کو عبرت ناک شکست دی..... سٹیفن بھی سلطان بایزید یلدرم کا ہمرکاب تھا۔ اُس زمانے میں سٹیفن نوجوان تھا۔ سٹیفن نے بایزید کو اپنی وفاداری کا ثبوت دینے کے لئے اپنی بہن اُس کے عقد میں دے دی تھی اور اب سلطان مراد خان ثانی کو جو بایزید یلدرم کا پوتا اور سلطان محمد خان اوّل کا بیٹا تھا، سٹیفن نے اپنی وفاداری کا یقین اس طرح دلایا کہ اپنی چہیتی بیٹی شہزادی ''سروین'' سلطان کو بیاہ دی۔ شہزادی سروین محل میں آئی تو مارتھا اور ابوجعفر کے کان کھڑے ہو گئے۔ ابوجعفر نے مارتھا سے کہا۔

''مارتھا! یہ شہزادی تمہاری پہنچ سے دور نہیں۔ اسے صلیب اعظم کا واسطہ دے کر اپنے ساتھ جہاد میں شریک کرو۔''

مارتھا نے شہزادی سروین کے پاس آنا جانا شروع کیا تو اُسے بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ لارڈ سٹیفن کی بیٹی اپنے باپ کی طرح سچے دل سے سلطنت عثمانیہ کی خیر خواہ ہے۔ مارتھا بہت جلد مایوس ہو گئی اور ابوجعفر کو بتایا کہ شہزادی سروین اتنا تر نوالہ بھی نہیں جتنا اس نے سمجھ لیا تھا۔ لیکن ابوجعفر مایوس نہیں تھا۔ اس نے شہزادی سروین کو ورغلانے کی کوششیں جاری رکھیں۔

ابوجعفر درحقیقت ایک سفاک اور گھناؤنا شخص تھا، اُس نے البانیہ کے بادشاہ ''جان کسٹریاٹ'' کو سلطان سے بدظن کرنے اور بغاوت پر اُکسانے کے لئے ایک انتہائی سنگین منصوبہ تیار کیا۔ اور جب اُس نے اپنے اس سنگین منصوبے میں مارتھا کو شامل کرنا چاہا تو وہ بری طرح بدک گئی۔ کیونکہ ابوجعفر کا منصوبہ بے پناہ سفاکانہ اور خوفناک تھا۔ ابوجعفر نے البانوی بادشاہ کو سلطان سے بدظن کرنے کے لئے سلطان کے محل میں موجود معصوم البانوی شہزادوں کے قتل کا پروگرام بنایا۔ مارتھا جو ایک طرح سے ان بچوں کی ماں بھی تھی ابوجعفر کی اس سازش میں قطعاً شریک نہ ہونا چاہتی تھی۔ ابوجعفر مسلسل کئی روز تک مارتھا کو معصوم بچوں کی جان لینے پر آمادہ کرتا رہا۔ لیکن جب مارتھا نہ مانی تو ابوجعفر نے ننھی مارتھا کو زبردستی ماں سے الگ کر دیا۔ مارتھا بری طرح پھنس چکی تھی۔ اب وہ ابوجعفر کے ساتھ زیر زمین سرگرمیوں میں اتنی آگے جا چکی تھی کہ اس کے لئے واپسی کا کوئی راستہ نہ تھا۔ بالآخر مارتھا نے ڈرتے کانپتے ابوجعفر کا حکم مان لیا اور البانوی بادشاہ جان کسٹریاٹ کے

تین ننھے یرغمالی شہزادوں کو کھانے میں زہر دے دیا۔ سکندر اپنے بھائیوں میں سب سے بڑا تھا اور کسی قدر چالاک اور ہوشیار بھی تھا۔ مارتھا نے ابوجعفر کے مشورے سے سکندر کو زندہ رہنے دیا اور باقی تین ننھے شہزادوں کو ایک ماں کی بجائے ڈائن بن کر دیارِ غیر میں زہر ملا کر کھانا کھلا دیا۔ اپنے ماں باپ سے دُور اس دیارِ غیر میں یہ معصوم بچے مارتھا کے رحم و کرم پر تھے۔ چنانچہ تینوں بچے کھیلتے کودتے کھانے کے وقت دسترخوان پر آئے تو کھانے کے برتنوں میں اُن کی موت اُن کا انتظار کر رہی تھی۔ زہر ابوجعفر لایا تھا جو آہستہ آہستہ اثر کرنے والا زہر تھا۔

بچے کھانا کھا کر دوبارہ کھیل میں مصروف ہو گئے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد سب سے چھوٹے شہزادے کو قے آئی۔ اور پھر کچھ ہی دیر میں اُس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ دوسرے دونوں بچے کسی قدر سخت جان ثابت ہوئے اور چند دن شدید بیمار رہ کر یکے بعد دیگرے وفات پا گئے۔

تین البانوی شہزادوں کے یکے بعد دیگرے انتقال نے قصرِ سلطانی کو ہلا کر رکھ دیا۔ سلطان مراد خان ثانی نے فوری طور پر دربار لگایا اور حاضرین دربار کے سامنے تازہ ترین صورتحال رکھی۔ سلطان خود بے حد غمگین اور دل گرفتہ تھا۔ کیونکہ اُس کے زیر سایہ پرورش پانے والے شاہ البانیہ کے معصوم بچے انتہائی پراسرار طور پر یکے بعد دیگرے وفات پا گئے تھے۔ صرف ایک شہزادہ ''جارج کسٹریاٹ'' زندہ بچا تھا۔ یہ دراصل ایک مسلمان سلطان کے لئے بہت زیادہ شرم اور ندامت کی بات تھی۔ سلطان کا اپنا بیٹا شہزادہ ''محمد'' ان البانوی شہزادوں کا ہم مکتب اور ہم عمر تھا۔ سلطان کے لئے مزید پریشانی کی بات یہ تھی کہ اب شاہ البانیہ کے بھڑک اٹھنے کا اندیشہ تھا اور سلطنت عثمانیہ کے شمالی صوبوں میں بغاوت پھیلنے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ حاضرین دربار دم بخود تھے۔ اور شہزادوں کی پراسرار موت کا بظاہر کوئی سراغ ملتا دکھائی نہ دیتا تھا۔ بالآخر سلطان نے خفیہ محکمے کے سربراہ کو ان پراسرار اموات کا کھوج لگانے پر مامور کیا اور شاہ البانیہ کی جانب ایک تعزیتی سفارت روانہ کرنے کا حکم دیا۔ جس میں یہ مؤقف اختیار کیا گیا تھا کہ معصوم شہزادے کسی نادیدہ بیماری کے سبب ہلاک ہو گئے ہیں۔ مزید سلطان مراد خان ثانی نے ایک یہ اقدام کیا کہ جارج کسٹریاٹ کو براہِ راست اپنی نگرانی میں لے لیا اور اُس کی تربیت اور دیکھ بھال کے لئے ماہر اور وفادار افراد کو مقرر کر دیا۔

اب ابوجعفر اور مارتھا کو شاہ البانیہ کی طرف سے بغاوت کا انتظار تھا۔ ابوجعفر نے

معصوم شہزادوں کے گھناؤنے قتل کے بعد قیصرِ قسطنطنیہ کو اپنی رپورٹ میں لکھا۔

''شہنشاہِ معظم! محافظ مسیحیت! جناب قیصرِ قسطنطنیہ!

میں نے تین عیسائی بچوں کے پاکیزہ خون سے سلطان مراد خان کے لئے عذابِ مسلسل کا نوشتہ لکھ دیا ہے۔ میں نے سلطنت عثمانیہ کی البانوی سرحدوں میں بغاوت کا بارود بھر دیا ہے۔ سلطان نے ہماری توقع کے مطابق چوتھے شہزادے کو اپنی خاص تحویل میں لے لیا ہے۔ اب میں چوتھے شہزادے جارج کسٹریاٹ کی دین مسیح کے مطابق ذہنی تربیت کر رہا ہوں۔ بہت جلد میں اس سلطان کے گھر میں اُس کا ایک طاقتور دشمن تیار کرلوں گا۔''

قیصر کا خیر اندیش

ڈیمونان۔''

اب ابوجعفر نے مارتھا کو یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ شہزادہ جارج کو سلطان کے خلاف پوری طرح بھڑکائے۔ تہرے قتل جیسا سنگین جرم سرانجام دینے کے بعد مارتھا سر سے پاؤں تک ابوجعفر کی گرفت میں آ چکی تھی۔ اُس کے لئے ابوجعفر کی بات ماننے کے سوا کوئی راستہ نہ تھا۔ چنانچہ مارتھا نے چپ چاپ وہی کچھ کرنا شروع کر دیا جس کا حکم قیصر کا شاطر جاسوس ابوجعفر یعنی ''ڈیمونان'' اُسے دیتا۔ مارتھا نے شہزادہ جارج کو یہ کہہ کر انتقام پر اکسایا کہ اس کے معصوم بھائیوں کو ''سلطان مراد خان ثانی'' نے زہر دے کر مروایا ہے۔ جارج دس گیارہ سال کا لڑکا تھا۔ اپنے بے یار و مددگار بھائیوں کی موت سے سخت دل گرفتہ تھا۔ اُسے مارتھا نے سلطان کے خلاف بھڑکایا اور اُس کے تن بدن میں انتقام کی آگ دوڑنے لگی۔ اُسے یکے بعد دیگرے سلطان کے تمام اقدامات ظلم محسوس ہونے لگے۔ اُس کی نگاہوں کے سامنے اپنے مفتوح وطن اور مغلوب باپ کا چہرہ گھومنے لگا۔ اُسے اپنی کسمپرسی کا وہ وقت بھی یاد آیا جب اس کا باپ اور شفیق ماں اس سے بچھڑ رہے تھے اور وہ صغیر سنی کے عالم میں اپنے بھائیوں سمیت ایک اجنبی دیس کی جانب قیدی کی حیثیت سے روانہ ہو رہا تھا۔ پھر اُسے اپنے کم سن بھائی تڑپتے، سسکتے اور بوجہ زہر قے کرتے یاد آئے۔ مارتھا نے نوعمر شہزادے کو اپنی چرب زبانی کے منحوس جال میں بری طرح سے جکڑ لیا تھا۔ البانوی شہزادہ جارج کسٹریاٹ براہ راست سلطان کی نگرانی میں چلا تو گیا۔ لیکن اس کے سینے میں غم و غصے کا ایک جہنم دہک رہا تھا۔ مارتھا نے اُسے بھڑکایا۔ لیکن ساتھ کے ساتھ اُسے فوری اشتعال سے باز رہنے پر آمادہ بھی کیا۔ مارتھا اُس سے کہتی۔

''جارج! جلد بازی میں کوئی ایسا کام نہ کر بیٹھنا جس سے تمہارا راز کھل جائے اور تم اپنا انتقام لینے سے محروم رہ جاؤ۔''

اب جارج براہِ راست شاہی مکتب میں تعلیم و تربیت حاصل کر رہا تھا۔ یہاں اُس کی ملاقات شہزادہ ''محمد'' سے ہوئی جو عمر میں جارج سے کافی چھوٹا تھا۔ جارج نے دل میں فیصلہ کیا کہ وہ بڑا ہو کر سلطان مراد خان ثانی کے فرزند شہزادہ محمد کو قتل کر کے اپنے انتقام کی پیاس بجھائے گا۔ جارج کا ناپختہ ذہن انہی خیالات کے ساتھ بتدریج پختہ ہوتا چلا گیا۔ نفرت اور غم و غصے کی کیفیت نے اُسے بدمزاج بنا دیا۔ شاہی تربیت نے جارج کی پوشیدہ صلاحیتوں کو چار چاند لگا دیئے اور جب وہ جوان ہوا تو ایک ضدی لیکن تجربہ کار شہزادے کی حیثیت سے جوان ہوا۔ شاہی مکتب سے فراغت کے بعد اُسے ینی چری کی تربیت گاہ میں سپاہیانہ جوہر دکھانے کا موقع ملا۔ بہت جلد اُس نے شمشیر زنی اور نیزہ بازی میں بھی کمال حاصل کرلیا۔ یہاں اُس کا استاد ''طاہر بن ہشام'' تھا۔

ینی چری کی تربیت گاہ جو فی الحقیقت عیسائی قیدیوں کو مسلمان کرنے اور تربیت دینے کے لئے قائم کی گئی تھی، جارج کا ذہن نہ بدل سکیں۔ جارج نے سلطان کے کہنے پر ظاہراً اپنا مذہب تو تبدیل کرلیا لیکن دل میں وہ عیسائی تھا۔ ابوجعفر اور مارتھا نے بھی جارج کو ظاہری طور پر مذہب بدل لینے کا مشورہ دیا۔ جارج نے مذہب تبدیل کر کے اسلام قبول کیا تو سلطان مراد خان بہت خوش ہوا۔ سلطان نے جارج کا اسلامی نام ''سکندر بیگ'' رکھا اور جارج کو اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا۔ سلطان کو معلوم نہیں تھا کہ اُس نے ایک سانپ کو اپنی آستین میں دودھ پلا پلا کر پال لیا ہے۔ ایک ایسا سانپ جس کے پس پشت ابوجعفر جیسا زہریلا ناگ اور مارتھا جیسی بھیانک ناگن تھی۔

یہ 1443ء کا آغاز تھا۔ بہار کا موسم تھا اور تخت نشینی کا سالانہ تہوار جاری تھا۔ آج سکندر بیگ کو پہلی مرتبہ دندان شکن شکست ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے مارتھا کی بیٹی مارسی بہت خوش تھی۔ لیکن مارتھا اور ابوجعفر، سکندر کی شکست کی وجہ سے خاصے ملول تھے۔ خود سلطان کو بھی سکندر کے ہار جانے کا افسوس ہوا تھا۔ لیکن سلطان نے اس مقابلہ کو تہوار کا کھیل سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔

سلطان نے کھیل تماشے ختم ہونے کے بعد رات کے وقت سکندر بیگ کو محل میں طلب کیا اور اُس کے بائیں بازو پر لگے گھاؤ کی بابت پوچھا۔ سکندر ابھی تک اپنی شکست کے اثر سے نکل نہیں پایا تھا۔ سلطان نے سکندر کو رنجور دیکھا تو کہا۔

"سکندر بیگ! ہم تمہاری بہادری اور طاقت کے قائل ہیں۔ تمہیں ملول اور پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں مغربی سرحدات کی جاگیر کا "والی" مقرر کر دیا جائے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ تمہیں حکمرانی کی ذمہ داری سونپی جائے۔ ہم تمہاری تعلیم و تربیت سے مطمئن ہیں اور تمہیں اپنا فرزند سمجھتے ہیں۔ تمہاری شکست کے دُکھ کو دُور کرنے کا یہی طریقہ ہمیں سوجھا ہے۔"

سلطان کا فیصلہ سن کر سکندر بیگ کی تمام حسیں بیدار ہوگئیں۔ اُسے یکلخت اپنی شکست کا دُکھ بھول گیا اور اُسے اچانک اپنی منزلِ انتقام نزدیک دکھائی دینے لگی۔ سکندر نے کمر تک جھک کر سلطانی فیصلے کو قبول کیا اور مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"سلطانِ معظم! ایک یرغمال شہزادے کو آپ نے اپنا بیٹا بنا کر اور پھر اعلیٰ تربیت دے کر جو عزت بخشی ہے اس کا بدلہ میں کبھی نہیں چکا سکتا۔ آپ کے احسانات کے عوض میں صرف وعدہ کر سکتا ہوں کہ سلطانِ معظم کی ہر خدمت دل و جان سے بجا لاؤں گا۔"

سلطان، سکندر کی بات سن کر پدرانہ انداز میں مسکرایا اور کہا۔

"ہمیں تم پر پورا بھروسہ ہے سکندر!..... تم کل ہی مغربی سرحدات کی جانب روانہ ہونے کی تیاری کرو۔ سرحدات کی جاگیر کے موجودہ والی کے پاس ہمارا شاہی حکم نامہ اپنے ہمراہ لیتے جانا۔ آج سے تم ہماری سلطنت کے ایک بڑے جاگیردار ہو اور ہمیں پوری اُمید ہے کہ تم اس فرض کو بخوبی نبھاؤ گے۔"

اور پھر تہوار سے تیسرے روز سکندر اپنے محافظ دستے سمیت مغربی سرحدات کی جانب روانہ ہو رہا تھا۔ جانے سے پہلے سکندر نے مارتھا کو پوری طرح مجبور کیا کہ وہ مارسی کو اُس کے ساتھ بیاہ کر روانہ کر دے۔ مارتھا بھی یہی چاہتی تھی۔ لیکن مارسی نے صاف انکار کر دیا۔ سکندر نے مزید زور دیا تو مارسی نے ایک عجیب چال چلی اور علی الاعلان کہہ دیا کہ وہ ایک مسلمان کے ساتھ شادی نہیں کر سکتی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اگر سکندر علی الاعلان پھر سے عیسائی ہو جائے تو وہ یہ شادی کرنے کے لئے تیار ہے۔ مارسی کا یہ فیصلہ سن کر سکندر، ابوجعفر اور مارتھا سٹپٹا گئے۔ اب مارتھا کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ مارسی کو اُس اصل حقیقت سے آگاہ کر دیتی۔ مارسی بھی آخر زمانہ شناس مارتھا کی بیٹی تھی۔ اُس نے ترپ کی چال چلی اور اپنی ماں سے اصل حقیقت اُگلوا لی۔ مارتھا، مارسی کو الگ کمرے میں لے گئی اور سچ سچ بتا دیا کہ سکندر بیگ درحقیقت مسلمان نہیں ہے بلکہ اس نے اپنا اور اپنے بھائیوں کا انتقام لینے کے لئے اسلام قبول کرنے کا ڈرامہ کیا ہے۔ مارتھا کی بات سن کر

مارسی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی اور اُسے یکلخت یہ احساس ہوا کہ وہ ایک بہت بڑے راز سے واقف ہوگئی ہے۔ اُس نے سنسنی زدہ لہجے میں ماں کو مزید کریدنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

"ماں! آج مجھے سچ سچ یہ بھی بتا دو کہ یہ شخص ابوجعفر فی الحقیقت کون ہے؟ کیونکہ یہ شخص اوپر سے جو کچھ نظر آتا ہے، حقیقت میں وہ نہیں۔"

مارسی کی بات سن کر مارتھا لرز گئی۔ وہ تو سکندر کا راز بھی فاش نہ کرنا چاہتی تھی اور مجبوراً اُسے ایسا کرنا پڑا تھا۔ لیکن ابوجعفر جیسے خطرناک جاسوس کے چہرے سے وہ کیسے نقاب اُلٹ سکتی تھی۔ اُس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ لیکن اُس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی اور مارسی سے کہا۔

"بیٹی! یہ وقت ان باتوں کا نہیں۔ تم نے شرط رکھی تھی کہ تم ایک عیسائی سے ہی شادی کرو گی۔ چنانچہ میں نے تمہیں سکندر بیگ کی حقیقت بتا دی۔ اب تم مزید وقت ضائع مت کرو اور جلدی سے اپنی شادی کی تیاری کرو۔"

مارسی کے ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ اُسے پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ اُس کی ماں کتنی بڑی سازش میں شامل ہے۔ اُس نے اپنی ماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور دلیری سے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ جس دن تم مجھے یہ بتا دو گی کہ یہ مکار شخص ابوجعفر فی الحقیقت کون ہے؟ میں اُس دن سکندر سے شادی کے لئے تیار ہو جاؤں گی۔"

مارسی کی بات سن کر مارتھا سکتے میں آ گئی۔ اب اُس کے لئے اپنی بیٹی کو سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ اُس کی بیٹی کا ضدی رویہ سکندر یا ابوجعفر کے سامنے آئے۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ ابوجعفر کتنا خطرناک شخص ہے۔ اگر وہ مارتھا کی بیٹی سے ایک بار بدظن ہو گیا تو یقیناً اُسے قتل کروا دے گا۔ مارتھا کے لئے ہر طرح کا فیصلہ مشکل ہو چکا تھا۔ وہ سر جھکائے کچھ دیر تک سوچتی رہی اور پھر بالآخر چپکے سے باہر نکل آئی۔ باہر سکندر اور جعفر اُس کے منتظر تھے۔ مارتھا ڈھیلے قدموں سے چلتی ہوئی اُن کے پاس آئی اور اپنے لب و لہجے کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"سکندر بیٹا! مارسی شادی کے لئے تیار ہے۔ لیکن اتنی جلدی میں شادی جیسے کام سے گھبرا رہی ہے۔ تم اطمینان سے جاؤ۔ میں بہت جلد مارسی کو لے کر تمہاری جاگیر میں آ پہنچوں گی۔ پھر ہم لوگ وہیں رہیں گے۔"

ابوجعفر، مارتھا کے چہرے پر بڑے عجیب انداز میں نظریں ٹکائے ہوئے تھا۔ اُس نے

بڑے غور سے مارتھا کی بات سنی اور پھر کسی قدر تشفی اور کسی قدر طنزیہ انداز میں سر ہلا دیا۔ مارتھا، ابو جعفر کے تیور دیکھ کر من ہی من میں کانپ گئی تھی۔ یہ خطرناک شخص یقیناً اصل بات کا اندازہ لگا چکا تھا۔ بہرحال مارتھا کی بات سن کر سکندر نے خلافِ توقع کسی قسم کے غصے کا اظہار نہ کیا بلکہ مارتھا سے کہنے لگا۔

"ٹھیک ہے آنٹی! میں وہاں کے ماحول کو دیکھنے کے بعد جلد ہی آپ لوگوں کو اپنے پاس بلوالوں گا۔"

سکندر کی بات سے کسی حد تک مارتھا کا خوف دُور ہوا۔ اتنے میں ابو جعفر بھی بول اُٹھا۔

"ہاں، ہاں! اس میں پریشان ہونے والی کون سی بات ہے۔ ماری اور سکندر ایک ہی گھر کے بچے تو ہیں۔ ہم لوگ جب چاہیں گے ان کی شادی کر دیں گے..... آخر ماری سکندر کے بغیر جا ہی کہاں سکتی ہے؟" ابو جعفر کا آخری جملہ ذومعنی تھا جسے غالباً سکندر سمجھا نہ سمجھا البتہ مارتھا ضرور سمجھ چکی تھی۔

خدا خدا کر کے سکندر روانہ ہوا اور ماری کی جان میں جان آئی۔ رات کو ماری نے دیکھا کہ اُس کی ماں بستر پر کروٹیں بدل رہی تھی۔ پھر تقریباً آدھی رات کے قریب مارتھا اپنے بستر سے اُٹھی اور بیٹی کے پاس آ گئی۔ وہ حد سے زیادہ بے چین تھی۔ ماری نے ماں کی حالت دیکھی تو بلا تامل دریافت کیا۔

"امی حضور! آپ کس وجہ سے مضطرب ہیں؟"

ماری نے ماں کے بیٹھتے ہی کہا۔ مارتھا نے ایک لمبی سی ٹھنڈی سانس لی اور انتہائی دھیمے لہجے میں کہا۔ "مری! میں تمہاری وجہ سے پریشان ہوں۔ تم جانتی ہو سکندر ضدی اور جھگڑالو ہے۔ تمہارے انکار سے وہ بدک جائے گا۔ یہ تو غنیمت ہے کہ وہ ابھی تک تمہیں اپنی کنیز کی بیٹی سمجھتا ہے اور جانتا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی۔ خداوند نہ کرے اگر اُسے یقین ہو گیا کہ تم اُسے نہیں چاہتی تو بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔"

مارتھا کی بات سن کر ماری اُٹھ کر بیٹھ گئی اور ماں کے کندھے سے سر ٹکا کر بولی۔

"ماں! تم فکر نہ کرو۔ کوئی گڑبڑ نہ ہو گی۔"

مارتھا اور ماری دیر تک اسی قسم کی باتیں کرتی رہیں۔ اور صبح سے کچھ دیر پہلے دونوں ماں بیٹی کی آنکھ لگ گئی۔

پنج ہزاری سالار

آج قاسم کو اپنے بھائی کے گھر آئے پانچواں دن تھا۔ تین دن پہلے شمشیر زنی کے مقابلے میں اُس نے جو کارنامہ سرانجام دیا تھا، اس پر اُس کا بھائی طاہر اور اُس کی بھابھی "سکینہ" بہت خوش تھے۔ اُس کے دونوں کم سن بھتیجے "عمر" اور "علی" خاص طور پر تیسرے دن سے اُس کے ساتھ چپکے پھر رہے تھے۔ وہ آج مکتب میں سارا دن اپنے ہم عمر دوستوں کو اپنے چاچو کے کارنامے بتاتے رہے۔

کل علی الصبح قاسم کو اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہونا تھا۔ اُس کی بھابھی نے آج اُس کے لئے زیتون کے تیل میں آلوؤں کا حلوہ بنایا تھا۔ ادھر شام کو طاہر گھر لوٹا تو اُس کے ہاتھ میں سمندری مچھلی کے پارچے تھے۔ گویا آج قاسم کی خاص دعوت تھی۔ رات کو دسترخوان پر بھابھی نے قاسم کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

"بس اب یہ وقت تمہاری شادی کے لئے بھی مناسب ہے۔ میں کوئی اچھی سی ترک لڑکی دیکھ کر تمہارے رشتے کی بات چلاتی ہوں۔"

اتنا سننا تھا کہ بچے خوشی سے اچھلنے لگے۔

"چاچو کی شادی ہو گی..... چاچو کی شادی ہو گی۔"

طاہر زیرِلب مسکرایا تھا۔ قاسم نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں بھابھی نہیں!! ابھی سے یہ ظلم مت کیجئے۔ ابھی تو میں نے دنیا دیکھنی ہے۔ سلطان "قیصر" کو سبق سکھانے کے لئے قسطنطنیہ کا محاصرہ کرنا چاہتا ہے۔ ادھر مغربی یورپ کا خطرناک سپہ سالار "ہونیاڈے" (ہنی ڈیز) صلیبی افواج کی قیادت سنبھالنے کے لئے اُمڈ آیا ہے۔ سلطنت عثمانیہ چاروں طرف سے خطرات میں گھری ہوئی ہے۔ ایسے عالم میں ینی چری کا ایک پنج ہزاری سالار شادی جیسے جھنجھٹ نہیں پال سکتا۔"

قاسم نے سنجیدگی سے شادی نہ کرنے کی معقول وجہ بتائی۔ سکینہ، قاسم کے جواب سے حیران رہ گئی۔

"ارے!..... ارے!..... ارے!! تم تو سنجیدہ ہونے لگے۔ ٹھیک ہے بھئی، ٹھیک ہے۔ پہلے قسطنطنیہ فتح کر لو، پھر شادی کر لینا۔ بلکہ وہیں سے لے آنا کوئی یورپی میم۔" سکینہ

نے ہنستے ہوئے بات بنائی۔

طاہر اپنے بھائی اور بیوی کی گفتگو سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

"سکینہ بیگم! سلطان، قاسم سے بہت متاثر ہوا ہے۔ کوئی بعید نہیں کہ وہ قاسم کے لئے کسی اچھے سے رشتے کا بھی بندوبست کر دے۔"

طاہر کی بات سے تینوں ہنس پڑے۔ اتنے میں مکان کے دروازے پر دستک ہوئی۔ سب لوگ یک لخت خاموش ہو گئے۔ طاہر کے ماتھے پر سوچ کی شکنیں نمودار ہوئیں اور اُس نے کسی قدر بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"اس وقت کون ہو سکتا ہے؟..... خیر! میں دیکھتا ہوں۔" وہ دروازے کی جانب جانے کے لئے اُٹھا۔ لیکن اس سے پہلے قاسم آگے بڑھ چکا تھا۔

"آپ بیٹھئے بھائی جان! میں دیکھتا ہوں۔"

قاسم نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک ادھیڑ عمر اجنبی کھڑا تھا۔ یہ ابوجعفر تھا۔ قاسم اُسے پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ ابوجعفر کی آنکھوں میں سانپ جیسی چمک تھی اور اُس کی کوہان جیسی ناک اُس کے مکار چہرے پر مزید پراسرار دکھائی دیتی تھی۔ ابوجعفر نے قاسم کو دیکھتے ہی مسکراتے ہوئے سلام کیا اور پھر کہنے لگا۔

"آپ مجھے نہیں جانتے۔ لیکن آپ کے بھائی میرے دوست ہیں۔ بہرحال آج تو میں آپ ہی کی زیارت کے لئے حاضر ہوا ہوں۔"

ابوجعفر کی بات سن کر قاسم نے مہمان خانے کا دروازہ کھولا اور ادھیڑ عمر ابوجعفر کو بیٹھنے کے لئے کہا۔ "آپ تشریف رکھئے! میں بھیا کو خبر کر کے حاضر ہوتا ہوں۔ براہِ کرم اپنا آ گرامی بتا دیجئے۔ تاکہ میں بھیا کو مطلع کر سکوں۔"

"جی میرا نام ابوجعفر ہے۔"

قاسم نے طاہر کو بتایا تو اُس کے ماتھے کی شکنیں مزید گہری ہو گئیں۔

"ابوجعفر؟..... خطیب مغرب! یہ شخص یہاں کیسے آ گیا؟ جہاں تک میری معلومات ہیں، یہ شخص تو شہر کے پرلے سرے پر "بغدادی دروازے" کی مسجد میں خطیب ہے۔"

طاہر نے سوچ کے عالم میں اُنگلی کی مدد سے اپنی پیشانی بجاتے ہوئے کہا۔

"وہ کہہ رہا تھا کہ مجھ سے ملنے کے لئے آیا ہے۔ غالباً آپ کا دوست ہے۔ بتایا ہے اُس نے۔"

"میرا دوست؟..... نہیں! میں تو اُسے صرف ایک آدھ بار ہی ملا ہوں۔ خیر! چلو، کر دیکھتے ہیں کیا معاملہ ہے۔"

دونوں بھائی ابوجعفر کے پاس مہمان خانے میں آ بیٹھے۔ ابوجعفر نے اپنے مخصوص چاپلوسانہ لہجے میں کہا۔

"شیخ طاہر!..... آپ کے بھائی تو بڑے جنگجو ہیں۔ تہوار والے دن ان کی کارکردگی سے سلطان بے حد متاثر ہوا اور انہیں ایک دم ینی چری کا "پنج ہزاری سالار" مقرر کر دیا..... میں اسی کامیابی کی مبارکباد دینے آیا ہوں۔"

طاہر نے حیرت سے ابوجعفر کی بات سنی اور پھر سلیقے سے کہا۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے زحمت کی..... واقعی میرے بھائی کا ینی چری میں بھرتی ہونا ہمارے لئے سعادت کی بات ہے۔"

قاسم اور طاہر کو معلوم نہیں تھا کہ ابوجعفر کتنا خطرناک شخص ہے۔ ابوجعفر، طاہر کے بارے میں سب کچھ جانتا تھا۔ اُسے اصل دلچسپی تھی قاسم کے ساتھ۔ کیونکہ ینی چری کے سالار اُس کی سازش کا خاص نشانہ تھے۔ وہ اب تک ینی چری کے تین اہم سالاروں کو اپنے دامِ فریب میں جکڑ چکا تھا۔ اُس کا طریقۂ کار یہ تھا کہ وہ غیر شادی شدہ اور کم عمر سالاروں کو نوجوان عیسائی لڑکیوں کا جھانسہ دے کر اپنے جال میں پھنساتا تھا..... ایک بار کوئی شخص اُس کا رازدار بن کر جرم کی راہ پر چل پڑتا تو پھر آسانی سے واپس نہ لوٹ سکتا۔ وہ ینی چری کے اہم سالاروں کو بغاوت کے لئے اکساتا رہتا۔ ینی چری، سلطنت عثمانیہ کی سب سے اہم اور جنگجو فوج تھی۔

یہ فوج سلطنت عثمانیہ کے بانی "عثمان خان" کے بیٹے "اُور خان" نے سب سے پہلے اپنے بھائی "علاؤ الدین" اور "قراء خلیل" کے مشورے سے بنائی تھی۔ "اُور خان" کے زمانے میں جب تمام ایشیائے کوچک عیسائی حکومتوں سے پاک ہو گیا تو عثمانی سلطنت کے فاتح کارندے پورے ملک کی جاگیرداریوں میں پھیل گئے۔ گزشتہ لڑائیوں میں بہت سے عیسائی قید ہو کر آئے تھے اور بہت سے عیسائی رعایا بن کر ذمیوں کی حیثیت سے ایشیائے کوچک میں زندگی بسر کرنے لگے تھے۔ وزیر اعظم "علاؤ الدین" نے اپنے بھائی "اُور خان" کو مشورہ دیا کہ بڑے بڑے جاگیردار جو بڑی بڑی فوج کے مالک ہوتے ہیں سلطنت کے لئے بعض اوقات خطرے کا موجب بھی بن جاتے ہیں۔

اس وقت تک ترکوں کی کوئی باقاعدہ فوج نہیں تھی اور وزیر اعظم "علاؤ الدین" کو اس بات کا خطرہ تھا کہ اُن کی جاگیردار عیسائی رعایا ہمسایہ عیسائی سلطنت کی ریشہ دوانیوں کا

شکار بن کر اُن کی مخالفت پر آمادہ ہو جانے کی استعداد بھی رکھتے تھے۔ اس لئے اُس نے مناسب سمجھا کہ عیسائی قیدیوں اور عیسائی رعایا میں سے نوجوان اور نو عمر لڑکوں کو لے کر سلطنت خود اُن کی پرورش اور تربیت کی ذمہ دار بنے اور اس طرح انہیں اسلامی تعلیم دے کر اور مسلمان بنا کر ان کی ایک فوج بنائی جائے۔ یہ فوج خاص شاہی فوج سمجھی جائے گی۔ ان لوگوں سے بغاوت کی توقع نہ ہوگی۔ اور ان نومسلم نوجوانوں کے عزیز و اقارب بھی سلطنت کی مخالفت نہیں کریں گے۔ اس کے برعکس ان کو مسلمان ہونے کی ترغیب ملے گی۔ چنانچہ اس تجویز پر عمل درآمد کیا گیا۔

پہلے سال ایک ہزار عیسائی لڑکوں کو منتخب کر کے انہیں فوجی تربیت دی گئی۔ دوسرے سال ایک ہزار لڑکے اور چنے گئے۔ شروع شروع میں جب دو ہزار نوجوان تربیت سے فارغ ہو کر سلطان کے باڈی گارڈ قرار دیئے گئے تو سلطان ان کو لے کر ایک بزرگ صوفی ''حاجی بکطاش'' کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُن سے دُعا کی درخواست کی۔ اس باخدا بزرگ نے ایک نوجوان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اس فوج کے لئے دُعائیہ کلمات کہے اور اسے ''ینی چری فوج'' کہہ کر پکارا۔

قاسم بن ہشام پہلا شخص تھا جو عیسائی نہیں تھا اور پھر بھی اسے ینی چری میں شامل کیا گیا تھا۔ عیسائی نوجوان اسلام قبول کرنے کے بعد سلطان کی نگرانی میں فن حرب کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے۔ ان کی فوجی تربیت میں حد درجہ سختی برتی جاتی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہر قسم کی تکلیف کو آسانی سے برداشت کر لیتے تھے۔ اپنے والدین، وطن اور مذہب چھوٹنے کے بعد اُن کی تمام اُمیدیں سلطان کے ساتھ وابستہ ہو جاتیں اور اسی لئے اسلام کی حمایت اُن کی زندگی کا نصب العین بن جاتی۔ سلطان ان پر بھرپور اعتماد کرتا تھا۔ یہ فوج جس طرح شان و شوکت کے ساتھ رہتی اور جس طرح سلطان کی منظورِ نظر تھی اس کو دیکھ دیکھ کر عیسائیوں کو خود ہی خواہش پیدا ہوتی کہ وہ اپنے بیٹوں کو سلطانی تربیت گاہ میں داخل کرا دیں۔ یہی وجہ تھی کہ سالانہ بھرتی کے موقع پر یہ تعداد خودبخود پوری ہو جاتی اور بعض اُمیدواروں کو واپس کرنا پڑتا۔

سلطان نے پہلی مرتبہ کسی مسلمان نوجوان کو خلافِ معمول ینی چری میں بھرتی کیا تھا۔ اور سلطان کے اس فیصلے کی حقیقی حکمت یہ تھی کہ نومسلم سپاہیوں کے اس لشکر میں ایک آدھ پختہ کار مسلمان کو اس لئے بھی شامل ہونا چاہئے کہ آئے دن اٹھتی ہوئی بغاوتوں اور سازشوں سے باخبر رہا جا سکے۔ ابوجعفر نے ینی چری کے بعض سالاروں کو ان کے سابقہ

مذہب عیسائیت پر لوٹانے میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ ابوجعفر کی سرگرمیوں سے ینی چری میں غداروں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔

ادھر سلطان کے باخبر کان اس صورتِ حال کی سن گن لے چکے تھے۔ چنانچہ سلطان نے قاسم کو نومسلموں کی فوج میں شامل کر کے حاکمانہ بصیرت کا ثبوت دیا۔ اور یہی بات ابوجعفر کے لئے کڑوا نوالہ ثابت ہو رہی تھی۔ وہ سلطان کے فیصلے سے بوکھلا گیا تھا۔ کیونکہ اب ایک پختہ کار عرب مسلمان کی موجودگی میں ابوجعفر کے لئے ینی چری کے اندر بغاوت کا منصوبہ بنانا مشکل ہو گیا تھا۔ ابوجعفر کے پیٹ کا یہی مروڑ تھا جو اُسے عثمانی تربیت گاہ کے استاد طاہر کے گھر کھینچ لایا تھا۔ اور اس وقت ابوجعفر قاسم کی شخصیت اور ایمان کو پرکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

لیکن قاسم بن ہشام کئی پشتوں سے مسلمان مجاہد اور جنگجو تھا۔ ابوجعفر کو قاسم اور طاہر کا اندازِ گفتگو دیکھ کر شدید مایوسی ہو رہی تھی۔ کیونکہ اُس کی مکار اور تجربہ کار نگاہیں یہ بھانپ چکی تھیں کہ ان دونوں عرب بھائیوں کو پھانسنا آسان کام نہیں۔

اُس نے اِدھر اُدھر کی بہت سی باتیں کرنے کے بعد براہِ راست قاسم سے سوال کر دیا۔

''اس کی کیا وجہ ہے کہ سلطان نے پہلی مرتبہ ینی چری میں کسی مسلمان سالار کو شامل کیا ہے؟''

قاسم پہلے ہی ابوجعفر کی سانپ جیسی تیز آنکھوں کو دیکھ کر چوکنا ہو گیا تھا۔ اب اُس نے یہ سوال کیا تو قاسم کو عجیب سا لگا۔ لیکن اس سے پہلے کہ قاسم بولتا، طاہر بول پڑا۔

''سنا ہے کہ ینی چری میں کوئی بغاوت پروان چڑھ رہی ہے۔ غالباً سلطان نے اسی کی حقیقت جاننے کے لئے میرے بھائی پر اعتماد کیا ہے۔''

طاہر کی بات سن کر ابوجعفر کا دل دھک سے رہ گیا۔ ینی چری میں پروان چڑھنے والی بغاوت کا سرغنہ وہ خود تھا۔ طاہر بن ہشام کی بات نے مہمان خانے کی فضا میں سنسنی بھر دی تھی۔ ابوجعفر سراسیمہ ہو گیا کیونکہ قاسم کی نظریں بدستور ابوجعفر کے چہرے پر تھیں۔ ابوجعفر نے ان ذہین عرب بھائیوں میں مزید رُکنا مناسب نہ سمجھا اور جلدی سے اجازت لے کر وہاں سے اُٹھ گیا۔

اگلے دن قاسم اپنی نئی وردی پہن کر اور اپنے من پسند گھوڑے پر سوار ہو کر ینی چری کے صدر مقام کی جانب چل دیا۔ یہاں اُس کی ملاقات سب سے پہلے ''آغا حسن'' کے ساتھ ہوئی۔ یہ وہی نوجوان تھا جس نے تہوار والے روز سکندر بیگ سے شکست کھائی تھی۔

قاسم کو اس نوجوان کے چہرے پر عجب سادگی اور خلوص دکھائی دیا۔ قاسم نے بہت جلد اندازہ لگا لیا کہ اس نوجوان کے ساتھ اس کی دوستی ہونے والی ہے۔ آغا حسن، قاسم سے عمر میں بڑا تھا اور ینی چری کا تجربہ کار سالار تھا۔ اپنے کارناموں اور شجاعت کی وجہ سے وہ ترقی کر کے دس ہزاری منصب تک پہنچ چکا تھا۔ آغا حسن، قاسم کو ینی چری کے احاطے میں داخل ہوتا دیکھ کر ٹھٹک گیا تھا۔ اُسے تہوار والے روز سے ہی قاسم بہت پسند آیا تھا۔ اُس نے قاسم کو دیکھا اور دوڑتا ہوا اُس کے پاس جا پہنچا۔ قاسم بھی فوراً گھوڑے سے نیچے اُتر آیا۔ ینی چری کے دونوں سالار آپس میں بغل گیر ہوئے اور باتیں کرتے ہوئے صدر دفتر کی طرف بڑھنے لگے۔ آغا حسن نے چلتے چلتے کہا۔

''میں آپ کے بڑے بھائی طاہر بن ہشام کو جانتا ہوں۔ وہ تربیت گاہ میں شمشیر زنی کی کلاس لیتے ہیں تو میں کبھی کبھار اپنے شوق سے اُن کا فن دیکھنے جاتا ہوں۔''

''بہت خوب!..... اس کا مطلب ہے بھائی جان بھی آپ کو جانتے ہوں گے..... اچھا ہوا سب سے پہلے آپ کے ساتھ ملاقات ہوگئی۔ اُس دن آپ نے بڑے ماہرانہ وار کئے تھے۔ آپ کی شمشیر نہ ٹوٹی ہوتی تو آپ یقیناً سکندر بیگ کو تھکا کر شکست دینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔''

آغا حسن قاسم کی ماہرانہ رائے سن کر حیران رہ گیا۔ یہ حقیقت تھی کہ اُس کی تلوار دھوکہ دے گئی تھی۔ ورنہ وہ ابھی کئی گھنٹے تک لڑنے کی ہمت رکھتا تھا۔

قاسم دن بھر آغا حسن کے ساتھ رہا۔ اُسے اُس کی کمان میں کام کرنے والے یک ہزاری، پنج صدی، یک صدی اور دس سپاہیوں کے سالاروں سے ملوایا گیا۔ ینی چری کی تمام فوج ایک بہت بڑی کالونی میں مقیم تھی۔ یہ سب لوگ اپنا گھر بار، وطن اور مذہب چھوڑ چکے تھے اور اس وقت اسلام کی سربلندی کی خاطر اپنی جانوں کا سودا کئے ہوئے تھے۔

شام کو گھر کی جانب واپس آتے ہوئے قاسم جب آغا حسن سے اجازت لینے لگا تو اُسے ایک دم ابوجعفر کا خیال آیا۔ اور پھر اُسے ینی چری میں مبینہ بغاوت کی بات یاد آئی۔ وہ دن بھر کی رفاقت میں جان چکا تھا کہ آغا حسن قابل اعتماد سپاہی ہے۔ چنانچہ اُس نے قدرے رازدارانہ لہجے میں آغا حسن سے دریافت کیا۔

''یہ بات کہاں تک صحیح ہے کہ ینی چری میں بعض لوگ سلطان کے خلاف سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ کیا آپ اس بارے میں کچھ جانتے ہیں؟''

آغا حسن نے چونک کر قاسم کی جانب دیکھا اور پھر محتاط لہجے میں جواب دیا۔

''نہیں! میں اس بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتا۔ میرے علم میں تو یہ بات آئی ہے کہ کچھ لوگ تنخواہ بڑھانے اور دیگر سہولیات میں اضافے کی ضد کر رہے ہیں۔''

قاسم نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور آغا حسن سے اجازت لے لی۔

جلد ہی قاسم ینی چری میں ایک محبوب و مقبول سالار بن گیا۔ اب اُس کے والدین بھی ''ادرنہ'' میں اُس کے بھائی کے گھر آ چکے تھے۔ روزانہ علی الصبح گھوڑے پر سوار ہو کر ینی چری کے معسکر جانا اور پھر شام کے بعد واپس لوٹنا قاسم کا معمول بن چکا تھا۔ کبھی کبھار وہ آغا حسن کے پاس رات کے کھانے کے لئے رُک جاتا اور دیر سے واپس آتا۔

اسی طرح کی ایک رات قاسم معسکر سے گھر آنے کے لئے روانہ ہوا۔ راستے میں زیتون کے چند باغات پڑتے تھے۔ دسویں رات کا چاند زیتون کے درختوں پر چاندنی کی چادر پھیلا چکا تھا۔ قریب ہی پہاڑی پانی کا ایک بڑا سا تالاب تھا جس کے چہار اطراف نرم سبزہ کسی قالین کی طرح بچھا ہوا تھا۔ قاسم تالاب کے قریب پہنچا تو ٹھٹک کر رُک گیا۔ کسی نے کہیں سے تالاب میں کنکر پھینک دیا تھا۔ پانی میں کنکر کا چھنا کا پیدا ہوا تو قاسم نے گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیں اور بجلی کی سی تیزی سے اپنی چمکدار شمشیر نیام سے باہر کر لی۔

''کون ہے یہاں؟ سامنے آؤ۔ ورنہ اگر میں نے خود ڈھونڈ لیا تو گردن اڑائے بغیر نہیں رُکوں گا۔''

زمستانی ہوا پتے پتے کو رقص پر مجبور کر رہی تھی۔ چاندنی کی وجہ سے درختوں کے سائے کسی طلسماتی شہر میں گم سم کھڑے سیاہ دیو محسوس ہو رہے تھے۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ گھوڑے کے سموں کے نیچے کڑکڑاتے ہوئے زیتون کے خشک پتے پورے ماحول میں دیو مالائی رنگ بھر رہے تھے۔ قاسم کے کان کھڑے تھے اور وہ اپنی تمام حسیات کو بیدار کئے کسی کی موجودگی کو محسوس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

یکلخت اُسے گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز انار کے چھوٹے درختوں کے عقب سے آ رہی تھی۔ قاسم نے تلوار کے دستے پر گرفت مضبوط کی اور گھوڑے کو اسی جانب موڑ لیا۔ قریب جانے پر اُس نے دیکھا کہ وہ ایک نہیں دو گھوڑے تھے جو ایک بگھی کے آگے جُتے ہوئے تھے۔ بگھی کو یہاں ویرانے میں دیکھ کر قاسم کو حیرت ہوئی۔ اس قسم کے رتھ یہاں ''ادرنہ'' میں طبقۂ اشرافیہ کی خواتین استعمال کرتی تھیں۔ قاسم کا ماتھا ٹھنکا، اُس نے سوچا ضرور کوئی ایسی ویسی بات ہے۔ وہ رتھ کے قریب گیا اور با آواز بلند پوچھا۔

''کون ہے یہاں؟..... میں پوچھتا ہوں کون ہے یہاں؟''

وہ کچھ دیر تک پکارتا رہا۔ جب اُسے جواب سنائی نہ دیا تو اُس نے رتھ کی پچھلی طرف جا کر عقبی پردے کو تلوار کی نوک سے اٹھا دیا۔ یہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ اب قاسم مزید محتاط اور مستعد ہو گیا۔ ابھی وہ صورتحال کی نزاکت پر غور ہی کر رہا تھا کہ اُسے انار کے ایک درخت کے پیچھے سے ایک ہیولا سا نکلتا دکھائی دیا۔ قاسم نے آنِ واحد میں تلوار میان میں ڈالی اور گھوڑے کی زین سے لٹکی کمان تان لی جس میں ایک تیز دھار تیر پہلے سے رکھا ہوا تھا۔ اُس نے حرکت کرتے ہوئے ہیولے کو حکم دیا۔

''خبردار! کون ہو تم؟ وہیں رک جاؤ۔ ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو تیر چھوڑ دوں گا۔''

ہیولا اپنی جگہ پر رُک گیا۔ اور پھر اگلے لمحے ایک خوبصورت نقرئی قہقہہ زیتون کے باغات میں گونجتا چلا گیا۔ یہ جان کر قاسم کے چھکے چھوٹ گئے کہ وہ ہیولا کسی عورت کا تھا۔ قاسم کو ایسے لگا جیسے اُس کا واسطہ کسی چڑیل سے پڑ گیا ہو۔ لیکن اُسے زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا۔ عورت کا ہیولا خود ہی بول اٹھا۔

''ڈر گئے!..... ینی چری کے پنج ہزاری سالار صاحب ڈر گئے!''

یہ مارسی کی آواز تھی۔ وہ درختوں کے سائے سے نکل کر سامنے آ گئی۔ قاسم مارسی سے متعلق قطعاً کچھ نہیں جانتا تھا۔ مارسی نرم قدموں کے ساتھ چلتی ہوئی قاسم کے بالکل قریب آ گئی۔ اب وہ صاف دکھائی دے رہی تھی۔ دسویں رات کی چاندنی اُس کے شگفتہ چہرے کو نوری شعاعوں کا غسل دے رہی تھی۔ اُس کی کٹورے جیسی آنکھیں کسی نیلی جھیل کی طرح جھلملا رہی تھیں۔ وہ مسکراتی ہوئی قاسم کے سامنے آئی اور انتہائی شائستہ لہجے میں کہنے لگی۔

''محترم سالار! میں اس انداز میں ملنے کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ میں اگر مزید دیر کرتی تو زیادہ تباہی پھیلنے کا اندیشہ تھا۔ چنانچہ میں نے یہی بہتر سمجھا کہ اس طرح راستے میں آپ سے مل لیا جائے..... میں کافی دیر سے آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔''

مارسی کی بات سے قاسم چونکا۔ لیکن ابھی تک وہ سرِ راہ ملنے والی اس دوشیزہ پر اعتماد نہیں کر سکتا تھا۔ اُس نے مارسی سے وہی سوال کیا جو اُسے کرنا چاہئے تھا۔

''آپ جو کچھ کہنا چاہتی ہیں، وہ بعد میں کہئے گا۔ پہلے یہ بتائیے کہ آپ کون ہیں؟''

مارسی نے اپنی گھنی اور لمبی پلکیں اٹھا کر دیکھا اور ہونٹوں پر موجود مسکراہٹ کو معدوم کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

''محترم سالار! آپ میری بابت جاننے کی بجائے اس اہم راز کو غور سے سنئے جو میں آپ کو بتانے جا رہی ہوں۔''

مارسی نے ساتھ ہی بتانا شروع کیا۔

''محترم سالار! آپ یقین کیجئے، سلطان مراد خان ثانی کا منہ بولا بیٹا سکندر بیگ دل سے مسلمان نہیں ہوا۔ بلکہ وہ عیسائیوں کی ایک گہری چال کے تحت جارج کسٹریاٹ سے سکندر بیگ بنا ہے۔ سلطان نے اُسے لاعلمی میں مغربی سرحدات کی جاگیر سونپ دی ہے۔ آپ کو یقیناً معلوم ہو گا کہ وہ ''البانیہ'' کے آنجہانی بادشاہ جان کسٹریاٹ کا بڑا بیٹا ہے۔ وہ بعض عیسائی جاگیرداروں اور فوج کے بعض سالاروں کی مدد سے بغاوت کرنا چاہتا ہے۔ وہ البانیہ کو سلطان کی باجگزاری سے آزاد کر کے سلطان سے انتقام لینا چاہتا ہے۔ کیونکہ اس کے خیال میں اس کے تین چھوٹے بھائیوں کو سلطان نے زہر دے کر مروایا تھا۔

محترم سالار! آپ میری بات کا یقین کیجئے! اس سازش میں ابوجعفر نامی ایک شخص بھی شریک ہے..... اس سے زیادہ میں آپ کو کچھ نہیں بتا سکتی۔''

مارسی نے اتنا کہا اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی بگھی کی طرف بڑھ گئی۔ قاسم ابھی تک حیرت کے مارے ساکت و جامد کھڑا تھا۔ اس نے دیکھا کہ درختوں کی اوٹ سے ایک نوعمر لڑکا نکلا۔ جس نے کوچوانوں جیسا لباس پہن رکھا تھا۔ وہ لڑکا تیزی سے بگھی پر سوار ہوا اور گھوڑوں کو چابک رسید کر دی۔ قاسم حیرت کے جھٹکے سے اُس وقت نکلا جب مارسی کی بگھی جا چکی تھی۔

اُسے اچانک اجنبی دوشیزہ کے نکل جانے کا افسوس ہوا اور اُس نے ایک دم فیصلہ کرتے ہوئے گھوڑے کی لگامیں ڈھیلی چھوڑ دیں۔ اب وہ مارسی کا تعاقب کر رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس لڑکی کا سراغ حاصل کرے، یہ کون ہے؟ اور اس نے جو کچھ بتایا ہے وہ کہاں تک درست ہے۔ پہلے پہل بگھی زیادہ تیز دوڑتی رہی۔ لیکن شہری آبادی کے قریب پہنچتے ہی اُس کی رفتار آہستہ ہونے لگی۔ ینی چری کی عسکری کالونی ''ادرنہ'' سے باہر یورپی سمت پر واقع تھی۔ وہاں سے شہر تک آتے ہوئے تین سے چار کوس فاصلہ طے کرنا پڑتا تھا۔ فصیلِ شہر کے قریب پہنچنے سے پہلے یکلخت مارسی کی بگھی رُک گئی۔ یہاں بھی چاندنی نے پورے ماحول کو منور کر رکھا تھا۔ قاسم کا گھوڑا بگھی کے قریب پہنچا تو مارسی نے بگھی کا عقبی پردہ اٹھا دیا۔ قاسم بگھی کے بالکل عقب میں جا کر رُک گیا۔ اب مارسی اور قاسم ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

دیکھا اور پھر نہ جانے کیوں مارسی نے پلکیں جھکا لیں۔ قاسم کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ مارسی کو اس سے پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہو۔ اُس نے ذہن پر زور دینے کی کوشش کی لیکن اُسے کچھ یاد نہ آیا۔ بالآخر قاسم نے پُراعتماد لہجے میں مارسی سے سوال کیا۔

''دیکھئے محترمہ! آپ نے جو کچھ مجھے بتایا ہے وہ نامکمل اور ناقابل یقین ہے۔ میں اسی لئے آپ کے پیچھے چل پڑا تھا تاکہ آپ سے مزید کچھ پوچھ سکوں۔ اس کے علاوہ میں یہ بھی پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ نے یہ سب کچھ بتانے کے لئے میرا انتخاب ہی کیوں کیا؟ آپ چاہتیں تو سلطان تک خود بھی پہنچ سکتی تھیں۔ سلطان کے علاوہ دیگر عمائدین سلطنت بھی بے شمار ہیں۔ لیکن آپ نے یہ سب کچھ بتانے کے لئے مجھے یعنی ایک بالکل نئے اور اجنبی شخص کو چنا ہے۔'' قاسم بات کرنے کے دوران گھوڑے سے اُتر آیا تھا۔

مارسی نے قاسم کو جواب دیا۔ ''محترم سالار! آپ ''اورنہ'' کے لئے اجنبی ہو سکتے ہیں لیکن میرے لئے آپ بالکل اجنبی نہیں ہیں۔ میں نے آپ کو اپنا تعاقب کرتے دیکھا تو از خود رُک گئی تاکہ شہر میں داخل ہونے سے پہلے آپ کو اپنی مجبوری سمجھا سکوں۔ اس وقت اورنہ میں آپ کے علاوہ کوئی ایسا شخص مجھے دکھائی نہیں دیا جس تک میری آسانی سے رسائی ہو یا میں اُس پر اعتماد کر سکوں۔ میں نے آپ کا انتخاب اس لئے بھی کیا کہ آپ تہوار والے روز سکندر کو شکست دے چکے ہیں اور ایک ہی مقابلے میں اُس کی شیطانی فطرت سے آگاہ ہو چکے ہیں..... میری آپ سے یہ درخواست ہے کہ خدارا! میرے بارے میں ابھی سے جاننے کی کوشش نہ کریں۔ کیونکہ میں مجبور ہوں۔ جس وقت بتانا مناسب ہوا میں خود ہی آپ کو بتا دوں گی کہ میں کون ہوں۔''

اب دراز قد قاسم مارسی کے بالکل نزدیک کھڑا تھا۔ اُس نے مارسی کی آنکھوں میں کے ستارے کی جھلمل بھی دیکھی تھی اور شفق کی اُداسی بھی۔ یہ لڑکی قاسم کے تصور سے زیا حسین تھی۔ اُس کی لمبی سیاہ پلکیں جھپ جھپکتی تھیں تو ایسے لگتا تھا جیسے چاندنی سحر کا جھٹپٹا آنکھ مچولی کھیل رہا ہو۔ مارسی کی شفاف اور چوڑی پیشانی اُس کی ذہانت ثبوت تھی۔ اُس کا جسم نازک بھی تھا اور سڈول بھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی یاقوت کی مور نے لباس پہن رکھا ہو۔ قاسم کا ذہن مارسی کا حسن دیکھ کر ڈگمگانے لگا تھا۔ اُس نے خود سنبھالا اور زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔

''آپ نے جو کچھ مجھے بتایا میں یہ سلطان کو نہیں بتا سکتا۔ کیونکہ بغیر کسی ثبوت سکندر جیسے سلطان کے مقرب شخص پر اُنگلی اٹھانا دانشمندی نہیں..... ہاں، میں اپنے طور

سکندر بیگ کی حقیقت جاننے کی کوشش کروں گا۔ آپ مجھے اپنے بارے میں نہیں بتانا چاہتیں تو نہ سہی..... لیکن میں چاہتا ہوں کہ میں اس سلسلے میں آپ سے پھر ملنا چاہوں تو مل سکوں۔ شاید آپ میری بات سمجھ رہی ہیں۔'' قاسم نے مارسی کی نیلگوں آنکھوں میں غوطہ لگاتے ہوئے کہا۔

مارسی، قاسم کی حالت سمجھ رہی تھی اور وہ دل ہی دل میں خوش بھی ہو رہی تھی۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ مارسی کو تو خود قاسم جیسے مضبوط شخص کی ضرورت تھی۔ وہ اگر قاسم کے ساتھ دل کا سودا کر لیتی اور قاسم بھی اُس کی محبت کا جواب محبت سے دے دیتا تو یہ مارسی کے لئے آنے والے خطرات سے بچنے کا واحد کامیاب راستہ تھا۔ مارسی نے قاسم کی بات سنی اور کچھ دیر سوچنے کے بعد مدھم آواز میں کہا۔

''ٹھیک ہے..... میں آپ سے خود ملاقات کر لوں گی..... آپ تکلیف مت کیجئے گا۔''

''لیکن آپ کو کیسے معلوم ہو گا کہ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں؟'' قاسم نے مارسی کی بات کاٹ کر کہا۔

''اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ میرا با اعتماد ملازم ''اکبر'' آپ کی خدمت میں گاہے بگاہے حاضر ہوتا رہے گا۔'' مارسی نے مسئلے کا حل بتایا۔

قاسم نے پھر کہا۔ ''کیا آپ کا ملازم یہی کوچوان تو نہیں جو اس وقت آپ کی بگھی چلا رہا ہے؟''

''جی ہاں..... یہی ہے۔ میں اسے اچھی طرح سے سمجھا دوں گی کہ اسے کیا کرنا ہے۔''

''اچھا! ایک آخری بات بتائیے۔ آپ نے ایک شخص کا نام لیا..... ابوجعفر!..... اس شخص کے بارے میں آپ کچھ اور بتا سکتی ہیں؟'' قاسم نے معاً ابوجعفر کا خیال آتے ہی کہا تو مارسی بولی۔

''فی الحال تو میں اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتی کہ یہ شخص سلطنت عثمانیہ کے خلاف ہونے والی ہر سازش میں شریک ہے۔ لیکن اس سے زیادہ میں اس لئے کچھ نہیں بتا سکتی کہ ابھی تک اس کے خلاف کوئی ثبوت میرے سامنے نہیں ہے۔ یہ شخص انتہائی مکار اور شاطر ہے اور میرا اندازہ ہے کہ اس نے ینی چری کے سپہ سالار اور سلطان کے بعض رشتہ داروں تک بھی رسائی حاصل کر رکھی ہے۔''

ابوجعفر کے بارے میں سن کر قاسم کو بہت زیادہ حیرت ہوئی۔ کیونکہ وہ ابوجعفر سے مل چکا تھا۔ ابوجعفر اُس کے بھائی کے گھر پر آیا تھا اور قاسم اُسی دن اُس کی سانپ جیسی تیز

آنکھوں سے محتاط ہو گیا تھا۔ قاسم ابھی مزید کوئی بات کرنا چاہ رہا تھا کہ ماری نے یکلخت
اجازت مانگ لی۔ ماری کے ہونٹوں پر ایک ملکوتی مسکراہٹ تھی اور وہ مکھن جیسے لہجے میں
کہہ رہی تھی۔

''اب مجھے اجازت دیجئے! مجھے دیر ہو رہی ہے۔''

قاسم نے بے دلی سے سر ہلایا اور ماری نے کوچوان لڑکے کو چلنے کا اشارہ دے دیا
اگلے لمحے بگھی حرکت میں آئی اور ہوا ہو گئی۔ قاسم ڈھیلے قدموں سے گھوڑے پر سوار ہوا
گھر کی جانب چل دیا۔

جب سے سکندر اور نہ چھوڑ کر گیا تھا ابوجعفر کی سرگرمیاں پہلے سے زیادہ تیز ہ
تھیں۔ کیونکہ اُس کا سب سے بہترین مہرہ اپنے ہدف کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ یہ
سکندر بیگ بہت سے خطرناک اور مذموم مقاصد لے کر مغربی سرحدات کی جانب جا
تھا۔ ابوجعفر نے ''ادرنہ'' میں بیٹھ کر دو بڑے منصوبے ترتیب دیئے تھے۔ ایک تھا سکن
بیگ کو البانیہ کے ملک میں بغاوت اور خود مختاری کا اعلان کرنے کے لئے تیار کرنا۔
دوسرا تھا نئی چری میں ایک تباہ کن بغاوت پروان چڑھانا۔ سکندر بیگ کے سلسلے میں تو
تک جو کچھ ابوجعفر نے چاہا تھا حرف بہ حرف پورا ہوا تھا۔ اور اب سکندر اپنی آخری ہدایا
لے کر اپنے مشن پر جا چکا تھا اور چند ہی دنوں میں البانیہ کی طرف سے سلطان مراد
ثانی کو ایک بہت بڑا صدمہ پہنچنے والا تھا۔ ادھر ابوجعفر کی نئی چری میں بغاوت پھیلانے
سازش بھی پایۂ تکمیل کو پہنچنے والی تھی۔ نئی چری میں بعض ایسے نو مسلم سپاہی بھی ہوا کر
تھے جن کے سچے دل سے اسلام قبول کرنے میں کچھ نہ کچھ کمی رہ جاتی۔ ابوجعفر کا
ایسے ہی نوجوان تھا اور اس نے بہت سے نوجوانوں کو مختلف طریقوں سے اپنی سازش
شامل کر لیا تھا۔

ابوجعفر بہت خوش تھا۔ کیونکہ اُس کا مشن کامیابی کے ساتھ انجام تک پہنچنے والا تھا
گزشتہ کئی سالوں سے ''ادرنہ'' میں تھا۔ لیکن وہ کبھی کسی کی نگاہوں میں نہ آیا۔ اور
ادرنہ میں اُس کا کام بھی قریب الاختتام تھا۔ اُسے سکندر بیگ کی بغاوت کا انتظا
''البانیہ'' سے خود مختاری کا اعلان ہونے کی دیر تھی کہ یہاں ''ادرنہ'' میں بھی نئی چری
بعض سالار ہتھیار اٹھا کر اہلیانِ شہر کو یرغمال کر لیتے۔ نئی چری کے بعض سالار اور
کے کچھ رشتہ دار محل کو سنبھالنے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ اس طرح ابوجعفر ''قیصرِ
کے حکم سے سلطنت عثمانیہ کی تباہی کا مکمل سامان کر چکا تھا۔ ادھر چند ہی دن ہوئے

گردش کر رہی تھی کہ سلطان کی بعض یورپی باجگذار ریاستیں بغاوت کا اعلان کر چکی ہیں۔ جبکہ بوسنیا، سربیہ اور ہنگری کی فوجیں ''ہونیاڈے'' کے پرچم تلے جمع ہونے لگی تھیں۔ دراصل سربیہ کا بادشاہ ''لارڈ سٹیفن'' جو سلطان مراد خان ثانی کا سسر بھی تھا جب سے فوت ہوا تھا، سربیہ نے سلطنت عثمانیہ سے علیحدگی اور اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ لارڈ سٹیفن کا جانشین ''جارج برنیک وچ'' تھا۔ یہ شخص اپنے پیش رو کی طرح مآل اندیش اور سنجیدہ مزاج نہ تھا۔ اس لئے قیصرِ قسطنطنیہ کو اس کی طرف ریشہ دوانیوں کا موقع مل گیا۔ قیصر اندر ہی اندر جارج برنیک اور ہنگری والوں کو سلطان مراد خان ثانی کے خلاف برانگیختہ کرنے میں مصروف رہا۔ ہنگری والے بھی اب چونکہ ''نکوپولس'' کی شکست کے تلخ تجربہ کو بھول چکے تھے لہٰذا وہ بھی عثمانی سلطنت کے خلاف تیاریاں کرنے لگے۔ اور کئی سال تک ان تیاریوں کے سلسلے کو جاری رکھا۔

اسی اثناء میں سلطان مراد خان ثانی نے 1430ء میں ''جزیرہ زانٹی'' اور ''یونان'' کے جنوبی حصہ سمیت ''سالونیکا'' تک کا علاقہ فتح کر کے وینس والوں کو شکست فاش دی۔ اور وینس کی ریاست نے نہایت ذلیل شرطوں کے ساتھ دب کر سلطان سے صلح کی۔ وینس چونکہ قیصرِ قسطنطنیہ کا طرفدار تھا اس لئے شاہِ قسطنطنیہ کو اور بھی زیادہ ملال ہوا۔ چنانچہ قیصر اپنے سازشی کاموں میں پہلے سے دُگنی توجہ کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ ایک طرف یہاں ادرنہ میں اُس کے جاسوس اب کامیابی کے قریب تھے اور دوسری طرف سربیہ، رومانیہ، ہنگری اور کروٹیا کے عیسائی سلطان کے خلاف علم بغاوت بلند کر چکے تھے۔ اگرچہ ان بغاوتوں کا سن کر ایک مرتبہ 1438ء میں سلطان ان کی سرکوبی کے لئے لشکر کشی کر چکا تھا اور سلطان نے اس حملے کے دوران ستر ہزار عیسائیوں کو میدانِ جنگ میں قید کر کے اپنی قوت وسطوت کی خوب دھاک بٹھائی تھی۔ لیکن جونہی سلطان ان محاذوں سے واپس لوٹا، ان علاقوں میں پھر بغاوت اُٹھ کھڑی ہوئی۔

انہی ایام میں مغربی یورپ کی لڑائیوں میں شریک رہنے والا تجربہ کار سپہ سالار ''جان ہونیاڈیز'' یعنی ''ہونیاڈے'' ہنگری لوٹ آیا تھا۔ ہونیاڈے ''شاہ سجمنڈ'' کا ناجائز بیٹا تھا اور اُس کی ماں ''ایلزبتھ ماری'' ایک حسین اور فاحشہ عورت تھی۔ ہونیاڈے نے ہنگری میں آ کر فوراً سپہ سالاری کا منصب سنبھال لیا تھا۔ اس نے آتے ہی ترکوں کے خلاف اعلانِ جنگ بلند کر دیا۔ اُس نے صوبہ ''ٹرانسلونیا'' سے ترکوں کو خارج کر دیا تھا۔ ترکی جرنیل ''گریبک'' جو سلطان کی طرف سے وہاں کا عامل اور منتظم تھا، ہونیاڈے کے ہاتھوں شہید

ہو چکا تھا۔ فرید بیگ کا جوان بیٹا اور تقریباً بیس ہزار عثمانی فوج ہونیاڈے کی تلواروں کا لقمہ بن چکی تھی۔ جو ترک فوجی زندہ قید کر لئے گئے تھے اُن کے ساتھ ہونیاڈے نے انتہائی وحشیانہ سلوک کیا تھا۔ اُس نے فتح کی خوشی میں ہنگری کے اندر ہونے والی تقریبات اور ضیافتوں میں ان مسلمان قیدیوں کو بے دردی سے وقتاً فوقتاً قتل کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح گویا خوشی کے جلسوں میں ان ترک قیدیوں کا قتل کرنا ایک دلچسپ سامانِ تفریح سمجھا جاتا تھا۔

سلطان مراد خان ثانی کے پاس سپہ سالار فرید بیگ، بیس ہزار سپاہیوں کی شہادت اور قیدیوں کے بے رحمانہ قتل کی خبریں پہنچیں تو اُس نے ہونیاڈے سے انتقام لینے کے لئے اسی ہزار کی فوج روانہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اسے یہ معلوم نہ تھا کہ اس مرتبہ عیسائی دنیا ایک بار پھر پوری طرح متحد ہو کر براعظم یورپ سے ترکوں کو نکالنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔

ترکوں کو شکست دینے اور براعظم یورپ سے نکالنے کے لئے یورپ میں اب کی مرتبہ ایسا جوش و خروش پیدا ہوا تھا کہ اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا گیا۔ ہنگری کا بادشاہ ''لاسلاس'' اور ہنگری کا سپہ سالار ''ہونیاڈے'' اس یلغار میں پیش پیش تھے۔ اور ''فرید بیگ'' کے قتل کے بعد اُن کی بہادری کے افسانے اس طرح یورپ میں پھیل گئے تھے کہ پورے یورپ کا ہر عیسائی نوجوان ان کی فوج میں شریک ہونے اور مجاہد کہلانے کے لئے بے تاب تھا۔ ادھر رومن کلیسا کے پوپ نے اس جنگ کو مقدس جنگ کہہ دیا تھا اور اپنے کارڈنیل ''جولین'' کو اس صلیبی جنگ کے لئے خصوصی طور پر روم سے روانہ کیا۔

کارڈنیل جولین نے مشرقی اور مغربی یورپ کا طوفانی دورہ کیا اور ہر شہر میں مسلمانوں اور ترکوں کے خلاف بڑے رُوح پرور وعظ کئے۔ وہ جہاں جاتا مسلمانوں کے مظالم کی جھوٹی کہانیاں لوگوں کو سناتا اور یورپ کے عیسائیوں کو خوابِ غفلت سے بیدار ہونے کی تلقین کرتا۔ کارڈنیل جولین نے گیارہویں صدی کے ''پطرس ہرکولیس'' کی زندگی کا مطالعہ کر رکھا تھا جس نے اولین صلیبی جنگوں کی بنیاد رکھی تھی اور ''سلطان صلاح الدین ایوبی'' کے مقابلہ میں پورے یورپ کی عظیم فوج اکٹھی کر کے لے آیا تھا۔ پطرس ہرکولیس پادری تھا اور مسلمانوں کا سخت دشمن تھا۔ وہ اپنی جوان بیٹی کو ننگے سر اور پھٹے کپڑوں میں گلیوں میں پھراتا..... اُس کے عقب میں عیسائی راہبوں کی ایک فوج ہوتی۔ ان سب لوگوں نے گردنوں میں بڑی بڑی صلیبیں لٹکا رکھی ہوتیں اور صلیب اعظم کو سب سے آگے رکھتے۔ وہ لوگوں کو بتاتے کہ مسلمانوں نے صلیب اعظم کو کوڑوں سے پیٹا ہے اور مذ

صلیب کی توہین کی ہے۔

پطرس ہرکولیس کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ''جولین'' نے بھی وہی انداز و اطوار اختیار کئے اور یورپ کے باشندوں کو بتایا کہ تمام عیسائی دنیا ترکوں کے ہاتھوں تباہ ہونے والی ہے اور اگر اس وقت بھی عیسائی نوجوان میدانِ جنگ میں نہ اترے تو مسیح کا نام لیوا کوئی بھی دنیا میں نہ بچے گا۔ چنانچہ بہت جلد ہنگری، سربیا، والیشیاء، پولینڈ، جرمنی، اٹلی، فرانس، آسٹریا اور بوسنیا کی فوجیں ہونیاڈے کے جھنڈے تلے جمع ہونا شروع ہو گئیں۔

ابوجعفر کا خاص مہرہ سکندر بیگ انہی حالات میں البانیہ کی طرف روانہ ہوا تھا۔

سکندر بیگ مختصر وقت کے لئے اپنی جاگیر میں رہا۔ اُسے ترکوں کے خلاف ہونیاڈے کی تیاری کا انتظار تھا۔ جونہی ہونیاڈے کا لشکر مکمل ہوتا سکندر، خاص البانیہ کی جانب چل پڑتا۔ اور پھر وہی ہوا.....

سلطان مراد خان ثانی کا منہ بولا بیٹا، اُس کے محل میں اولاد کی طرح پرورش پانے والا سکندر..... جس کے ساتھ سلطان کو بے حد محبت تھی اور جسے سلطان نے محض اٹھارہ سال کی عمر میں ایک ''سنجق'' کا حاکم مقرر کیا تھا اور سکندر بیگ کے لقب سے سرفراز کیا تھا..... غدار نکلا۔ سکندر نے اپنے کردار سے ثابت کر دیا کہ وہ اس سانپ کی طرح ہے جسے سلطان نے دودھ پلا پلا کر جوان کیا تھا۔ سکندر نے سلطان کے تمام احسانات یکسر فراموش کر دیئے اور اپنی سازش کے آخری مرحلے پر بھی پوری کامیابی سے عمل کر دیا۔

ہوا یوں..... کہ سکندر ادرنہ سے روانہ ہوا تو ماریا کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ لیکن ابوجعفر نے اُسے مشورہ دیا کہ ''ماریا کو ابھی ساتھ مت لے جاؤ..... البانیہ میں اپنی خاندانی بادشاہت بحال کرنے کے بعد تمہارے لئے محل کی کنیز مارتھا اور اس کی بیٹی کو بلا لینا مشکل نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ دونوں ماں بیٹی ابھی تک عیسائی مذہب پر قائم ہیں۔''

سکندر کو ابوجعفر کی بات معقول لگی۔ چنانچہ جب مارتھا اندر کمرے سے اپنی بیٹی کے ساتھ باتیں کر کے واپس آئی تو ابوجعفر اور سکندر پہلے سے ہی یہی فیصلہ کر چکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مارتھا کے بتانے پر کہ ماریا ابھی ساتھ نہیں چل سکتی، سکندر نے کچھ برا نہ منایا تھا۔

وہاں سے سکندر مغربی سرحدات کی جانب آیا اور چند ماہ مغربی سرحدات میں رہ کر ''ہونیاڈے'' کی افواج کے منظم ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ جونہی 1443ء میں ترکی فوج کو ہونیاڈے کے مقابلے میں شکست ہوئی، ''فرید بیگ'' اور اس کا بیٹا مارا گیا اور بیس ہزار ترک فوجی شہید کر دیئے گئے تو سکندر بھی اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر مغربی سرحدات کی

جاگیر سے نکلا۔ اس کے ہمراہ صرف ایک محافظ دستہ تھا۔ سکندر انتہائی تیز رفتاری سے سفر کرتا ہوا اور خفیہ راستوں کو اختیار کرتا ہوا سلطانی لشکر گاہ تک پہنچا۔ سکندر نے لشکر گاہ سے چند کوس پہلے شام ڈھلنے اور رات اترنے کا انتظار کیا۔

آدھی رات کے قریب سکندر اپنے ساتھیوں سمیت سلطانی لشکر کے خیموں تک آ پہنچا۔ یہاں سکندر نے اپنے دستے کو ایک حصار کی صورت میں اپنے گرد پھیلا دیا اور خود سلطان کے رئیس الآفندی (میر منشی) کے خیمے میں گھس گیا۔ رئیس الآفندی خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا کہ سکندر کی تلوار اُس کی گردن پر جا ٹکی۔ سکندر نے تلوار کی نوک سے اُس کی گردن پر ٹھوکہ دیا تو رئیس الآفندی اُچھل کر اٹھ بیٹھا۔ اس کی آنکھ کھلی تو اس نے موت کو اپنی گردن پر سوار دیکھا۔ رئیس الآفندی کو صورتحال کی سمجھ آئی تو اُسے سکندر کی پھنکار سنائی دی۔

"رئیس الآفندی! ہم تمہیں حکم دیتے ہیں کہ ابھی اور اسی وقت البانیہ کے صوبیدار کے نام شاہی مکتوب لکھو!..... اُسے لکھو کہ سکندر بیگ کو جو سلطان کی طرف سے بطور وائسرائے تمہارے پاس پہنچا ہے، البانیہ کے دارالسلطنت اور تمام علاقے کا چارج دے دو۔"

رئیس الآفندی کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سلطان چیتا سکندر بیگ اس حد تک جا سکتا ہے۔ رئیس الآفندی کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ چنانچہ اس نے ذرا سا تامل کیا۔ سکندر نے فوراً تلوار کی نوک پر زور بڑھا دیا۔ رئیس الآفندی کی گھگھی بندھ گئی۔ اُس نے فوراً حکم کی تعمیل کرنے کا اشارہ کیا۔ اور سکندر نے تلوار ہٹا لی۔

رئیس الآفندی ہانپتے کانپتے اٹھا اور جلدی جلدی سلطانی حکم نامہ لکھنے لگا۔ رئیس آفندی نے مکتوب کی تحریر مکمل کر کے اس پر سلطان مراد خان کی مُہر ثبت کی اور مکتوب سکندر کے حوالے کر دیا۔ سکندر نے بائیں ہاتھ سے مکتوب کو پکڑا اور دائیں ہاتھ سے ایک بھرپور وار کے کمزور رئیس آفندی کا سر دھڑ سے الگ کر دیا۔ اُس نے البانیہ کے شہر "کروطیہ" ترک صوبیدار کے نام حکم نامہ حاصل کیا تھا۔ اس فرمان کے ذریعے وہ البانیہ پر قبضہ چاہتا تھا۔

سکندر اپنی واردات کامیابی سے مکمل کرنے کے بعد خیمے سے نکلا۔ اُس کے ساتھی مستعدی سے پہرہ دے رہے تھے۔ سکندر اپنے دستے کو لے کر رات کے اندھیرے طوفانی رفتار سے البانیہ کی طرف چل دیا۔ وہ اپنے سفر کے تیسرے دن کروطیہ (آق حصار) میں تھا۔ سکندر نے شاہی فرمان کے ذریعے ترک صوبیدار سے اپنے باپ کا تخت حاصل

اور ترک دستوں کو فی الفور البانیہ سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ البانیہ پر قابض ہونے کے بعد اگلے دن اُس نے شہر میں منادی کروائی کہ وہ دین اسلام کو ترک کر کے دوبارہ دین عیسوی میں داخل ہو گیا ہے۔ البانوی عوام نے اپنے سابق بادشاہ کے بیٹے کو اس طرح شجاعت سے حکومت سنبھالتے دیکھا تو بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے سکندر بیگ کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور ذوق وشوق سے اس کی فوج میں بھرتی ہونے لگے۔

سلطان مراد خان ثانی کے لئے ترک سالار "فرید بیگ" کی شکست کے بعد یہ اطلاع ایک بہت بڑا صدمہ ثابت ہوئی۔ وہ چند دنوں میں ہی ٹوٹ پھوٹ گیا۔ سکندر بیگ کو اُس نے بڑے ناز ونعم سے پالا تھا۔ سکندر بیگ کی بے وفائی سے سلطان کو ایسا دھچکا لگا کہ وہ بیمار رہنے لگا۔ آج کل ابوجعفر کے چہرے پر بیک وقت خوشی بھی تھی اور سنسنی بھی۔ کیونکہ اُس کی تیار کردہ سازش بھرپور طریقے سے کامیاب ہوئی تھی۔ ابھی سلطان ان جھٹکوں سے ذہنی طور پر سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ سلطان کے پاس ایک اور بری خبر پہنچی۔ اُس کی سلطنت کے ایشیائی حصہ ایشیائے کوچک کے شہر "قونیا" میں قیصر کے جاسوسوں نے ایک بہت بڑی بغاوت کی سازش کو مکمل کر لیا تھا۔ قونیہ کے سرداروں نے اعلانِ بغاوت بلند کیا تو سلطان جیسے نیند سے بیدار ہو گیا۔ یہ تیسری بری خبر بیمار سلطان کے لئے پیغامِ موت کی بجائے نوید زندگی بن گئی۔ وہ آندھی اور طوفان کی طرح اٹھا اور اپنی تلوار نیام سے نکال کر سیدھا دربارِ سلطنت کی طرف بڑھا۔

اب اُس کا خون کھول رہا تھا۔ اُس نے مسند شاہی پر بیٹھتے ہی فوراً دربار طلب کیا..... خاصہ دار دوڑتے چلے گئے اور چند لمحوں بعد عثمانی دربار میں تمام بڑے بڑے وزیر، امراء اور سالار جمع ہو گئے۔ آج ہر شخص کے چہرے پر تجسس صاف دیکھا جا سکتا تھا۔ دربار میں اس قدر سناٹا تھا کہ سوئی گرنے کی آواز بھی سنی جا سکتی تھی۔ سلطان یک لخت اپنی تلوار زمین پر ٹکا کر اُٹھ کھڑا ہوا اور شیر کی طرح گرج کر بولا۔

"نمائندین سلطنت! وزراء! اُمراء اور سپاہیو.....!

ہمارے پاس پے درپے بری خبریں پہنچ رہی ہیں۔ سب سے پہلے شاہ سربیا نے بغاوت کی تھی۔ جس کی سزا ہم اُسے دے چکے ہیں اور میدانِ جنگ میں عیسائی لشکر کے ستر ہزار سپاہیوں کو قید کر کے انہیں نافرمانی کی سزا بھی دے چکے ہیں۔ یہ بات آپ سب لوگ جانتے ہیں، لیکن اب پھر صرف تین سال کے اندر اندر یورپ کے تمام عیسائی ہونیاڈے کے پرچم تلے جمع ہو چکے ہیں۔ انہوں نے ہمارا صوبہ "ٹرانسلونیا" ہم سے چھین

لیا ہے اور ہمارے بہادر جرنیل ''فرید بیگ'' اور اُس کے بیٹے کو شہید کر دیا ہے۔ کینہ پرور عیسائیوں نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ وہ اپنی ہر ضیافت میں ترک قیدیوں کی گردنیں کاٹ کر اپنی بزدلی اور بدفطرتی کا ثبوت دیتے رہے ہیں۔

اور پھر آپ سب جانتے ہیں کہ ہمارے لئے سکندر کی بے وفائی بھی ایک جانکاہ خبر تھی۔ لیکن یاد رکھئے! کہ سلطان معمولی حادثات سے دل گرفتہ نہیں ہوا کرتے۔ چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ان بغاتوں کا سر پوری طاقت سے کچل دیا جائے۔

پہلے ہم اپنے فیصلے پر عمل درآمد میں کسی قدر دیر کر رہے تھے۔ لیکن ہمیں ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ ایشیائے کوچک میں ہمارے شہر ''قونیا'' کے سرداروں نے سلطنت عثمانیہ کے خلاف بغاوت کر دی ہے۔ لہٰذا ہم نے فی الفور..... بہ یک وقت دو لشکروں کے کوچ کا فیصلہ کیا ہے۔ ایک اسّی ہزار افواج پر مشتمل لشکر ''شہاب الدین پاشا'' کی سرکردگی میں یورپ کی جانب روانہ ہوگا اور دوسرا لشکر لے کر میں خود ''قونیا'' کی بغاوت کا خاتمہ کرنے کے لئے ایشیائے کوچک کی طرف جاؤں گا۔ چنانچہ تمام سالاروں، سپاہیوں اور عمائدین سلطنت کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ ابھی اور اسی وقت سے ان دونوں لشکروں کی تیاری میں مصروف ہو جائیں۔''

سلطان مشتعل تھا۔ اُس نے جذبات میں پوری تقریر کر ڈالی۔ وہ اپنی بات ختم کر کے مسند شاہی پر بیٹھ گیا۔ دربار میں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سب لوگ سلطان کے اچانک فیصلے سے حیران تھے کیونکہ یہ بہت بڑا فیصلہ تھا۔ بیک وقت دُور دراز کے دو محاذوں پر دو بڑے لشکر روانہ کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔

دربار میں کچھ دیر تک خاموشی رہی۔ پھر ایک وزیر سلطنت نے اُٹھ کر ادب سے عرض کی۔ ''سلطانِ معظم کا فیصلہ یقیناً دور اندیشی پر مبنی ہے۔ لیکن اگر سلطانِ معظم پہلے ہونیاڈے کی بغاوت اور پھر ایشیائے کوچک کی بغاوت ختم کرنے پر توجہ فرمائیں تو شاید دونوں محاذ آسانی سے فتح کئے جا سکیں۔''

وزیر سلطنت نے کانپتے لرزتے اپنا مشورہ دیا تھا۔ سلطان مشورہ سن کر مسکرایا اور نرم لہجے میں کہنے لگا۔

''ہم ایسا ہی کریں گے۔ شہاب الدین پاشا کا لشکر ابھی صفیں درست نہ کر پائے گا کہ میں قونیا کی بغاوت فرو کر کے اس کے ساتھ آ ملوں گا۔''

وزیر سلطنت سلطان کا جواب سن کر مطمئن ہو گیا۔ اب سلطان کے چہرے کی سختی دور ہو چکی تھی اور دربار میں موجود لوگ حالاتِ حاضرہ پر کھسر پھسر کرنے لگے تھے۔ اتنے میں سلطان کی خاص فوج ینی چری کا سپہ سالار آگے بڑھا اور مؤدب لہجے میں سلطان سے مخاطب ہوا۔

''سلطانِ معظم!..... میرے لئے کیا حکم ہے؟''

سلطان نے جواب دیا۔

''تم بھی شہاب الدین پاشا کے پرچم تلے یورپ کی مہم پر جاؤ گے۔ میرے ہمراہ ینی چری کے صرف پانچ ہزار سپاہی چلیں گے۔ جبکہ باقی دوسری فوج ہو گی۔''

سلطان کی بات مکمل ہوئی تو سپہ سالار پھر بولا۔

''سلطانِ معظم کے ہمراہ ینی چری کے کون سے پنج ہزاری دستہ کو مقرر کیا جائے؟''

سلطان نے کچھ دیر خاموشی سے سوچا اور پھر اچانک اُس کے چہرے پر چونکنے کی سی کیفیت پیدا ہوئی۔ اُس نے حکم دیا۔

''وہ عرب نوجوان کہاں ہے جس نے تہوار والے روز سکندر بیگ کو شکست دی تھی۔ اُسے فوراً بلاؤ اور ہمارے ہمراہ تیاری کا حکم دو۔''

ینی چری کے سپہ سالار نے تعمیل کے انداز میں سر ہلایا اور پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے بعد کئی گھنٹے تک دربار میں لشکروں کی روانگی سے متعلق بات چیت ہوتی رہی۔ اس دوران قاسم بن ہشام کو بھی بلوا لیا گیا تھا۔ قاسم، سلطان کے سامنے نمودار ہوا تو اُس نے سلطان کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ سلطان نے قاسم کو اپنے سامنے طلب کیا اور کہا۔

''قاسم بن ہشام! تم ہمارے ساتھ پرسوں علی الصبح قونیا کی مہم پر روانہ ہو رہے ہو۔ تمہیں اس سلسلے میں کچھ کہنا ہو یا تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تامل کہہ سکتے ہو۔''

قاسم نے ادب سے سلطان کی بات سنی اور کہا۔

''سلطانِ معظم! آپ کے زیر سایہ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ آپ کی ہمرکابی میں جہاد کرنا میرے لئے زندگی کی سب سے بڑی سعادت ہے۔ آپ مجھے پرسوں علی الصبح ہمارے لشکر سے پہلے پائیں گے۔ البتہ.....''

قاسم نے کچھ کہنا چاہا لیکن جھجک گیا۔ وہ پہلی بار کسی سلطان کے دربار میں حاضر ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ الفاظ اُس کی زبان پر اٹک رہے تھے۔ سلطان نے فوراً کہا۔

''ہاں ہاں، کہو! تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

قاسم نے جھجکتے ہوئے زبان کھولی۔

"سلطانِ معظم! میں صرف ایک عاجزانہ سا مشورہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ سلطانِ معظم ایک لشکر سالار شہاب الدین پاشا کی سرکردگی میں یورپ کی جانب روانہ کر رہے ہیں اور خود ایشیائے کوچک کی مہم پر روانہ ہونا چاہتے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ "ادرنہ" کو خالی کر دینے سے قیصرِ قسطنطنیہ کو یہاں اپنی ریشہ دوانیوں کا کھلا موقع مل جائے گا۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ ادرنہ میں بعض خفیہ ہاتھ سلطانِ معظم کے خلاف سازش میں مصروف ہیں۔ یہ وہی ہاتھ ہیں جنہوں نے سکندر بیگ کو بغاوت کے لئے تیار کیا۔"

سلطان، قاسم کی بات سن کر چونک گیا۔ اُس کی آنکھوں میں چیتے جیسی چمک نظر آئی اور وہ اپنی مسند پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اُس کی آنکھیں قاسم پر جمی ہوئی تھیں اور وہ کوئی اہم بات سوچ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد سلطان نے کہا۔

"قاسم بن ہشام! ہم تمہاری بصیرت کی داد دیتے ہیں۔ یہاں ہمارے پرانے اور دانشمند ساتھی بھی موجود ہیں۔ لیکن تم نے ان سب سے زیادہ اپنی آنکھیں کھلی رکھیں۔ ہم نے ابھی ابھی فیصلہ کیا ہے کہ ہم تمہیں اپنے ہمراہ قونیا لے کر نہیں جائیں گے۔ ہم تمہیں اپنے پیچھے ادرنہ میں شاہی سراغ رساں مقرر کرتے ہیں..... ہمیں خود بھی شک تھا کہ سکندر بیگ کے پیچھے قیصرِ قسطنطنیہ کا ہاتھ ہے۔ لیکن ہمارا دھیان اس طرف نہ گیا کہ ادرنہ میں کی سازش پر نظر رکھی جائے۔ ہم تم سے بہت خوش ہیں اور تمام ذمہ دار افرادِ حکومت کو حکم دیتے ہیں کہ وہ ضرورت پڑنے پر تمہارے ساتھ بھرپور تعاون کریں۔"

قاسم کے لئے سلطان کا یہ فیصلہ بھی غیر متوقع تھا۔ پہلے روز قاسم کو پنج ہزاری سالار مقرر کرنے کا سلطانی فیصلہ بھی عجیب تھا۔ قاسم نے سوچا..... بادشاہ ایسے ہوتے ہیں۔ جو ہر آن غیر متوقع فیصلے کر سکتے ہیں۔ اب قاسم کے پاس سلطان سے کہنے کے لئے مزید کچھ نہ تھا۔ قاسم نے تعمیل میں سر جھکایا تو سلطان پھر بولا۔

"تم ہم سے دربار کے بعد تخلیے میں ملو..... ہم کچھ اور ضروری باتیں بھی تم سے کرنا چاہتے ہیں۔"

قاسم نے دوبارہ تعمیل میں سر جھکایا اور ایک طرف ہٹ گیا۔

دربار برخواست ہوا تو دربانِ خاص قاسم کو قصرِ سلطانی کے دروازے تک لے گیا۔ یہاں خادمۂ خاص نے قاسم کو وصول کیا اور اپنے ہمراہ لے کر سلطانی رہائش گاہ کی طرف چل دی۔ یہ "قصرِ یلدرم" تھا۔ لمبی لمبی راہداریاں شیشہ و سنگ سے آراستہ و پیراستہ تھیں۔ گلستانِ شاہی میں رنگ برنگے فوارے نصب تھے۔ قاسم دیوانِ خاص میں داخل ہوا

سامنے شاہی لباس میں ملبوس ایک خوبصورت نوعمر لڑکا کھڑا تھا۔ یہ "شہزادہ محمد" تھا۔ سلطانِ معظم کا فرزند دوئم۔ سلطان کے بڑے بیٹے کا نام شہزادہ "علاؤ الدین" تھا۔ شہزادہ محمد نے مسکراتے ہوئے قاسم کا استقبال کیا تو خادمۂ خاص ایک طرف ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ شہزادہ محمد بے تکلفی کے ساتھ قاسم سے بغل گیر ہوا اور پھر ہنستے ہوئے کہنے لگا۔

"میں تہوار والے روز آپ کی شمشیر زنی سے بہت متاثر ہوا۔ اور میں اُسی روز سے آپ کی ملاقات کا خواہاں تھا۔ آج آپ کے آنے کا سنا تو میں آپ سے ملنے کے لئے چلا آیا..... آپ سلطانِ معظم سے ملنے کے بعد میرے پاس ضرور تشریف لائیے گا۔ میں اپنے کمرۂ خاص میں آپ کا انتظار کروں گا۔"

قاسم کو شہزادہ محمد بہت پسند آیا۔ قاسم نے شہزادہ محمد کے ساتھ وعدہ کیا کہ وہ واپسی پر اس سے ضرور ملے گا۔ اور پھر قاسم، خادمۂ خاص کی رہنمائی میں سلطان مراد خان ثانی کے سامنے حاضر ہوا۔ سلطان نے قاسم کو شفقت سے اپنے قریب نشست پر بٹھایا اور خادمۂ خاص کو قاسم کی تواضع کرنے کا حکم دیا۔ یہ سلطان کا کمرۂ ملاقات تھا۔ چاروں طرف اونچی پشت والی نشستیں رکھی تھیں۔ کمرے کی دیواروں پر سلطنت عثمانیہ کے بہترین خطاطوں اور مصوروں کے فن پارے آویزاں تھے۔ درمیان میں کمرے کی چھت سے ایک قرمزی فانوس لٹک رہا تھا۔ کمرے کے فرش میں یونان کا "سنگ احمر" چمک رہا تھا اور کھڑکیوں کے ساتھ محرابوں کے رنگین پردے لٹک رہے تھے۔ سلطان نے قاسم سے پہلا سوال کیا۔

"تمہیں کیسے اندازہ ہوا کہ ادرنہ میں قیصر کے جاسوس سرگرم ہیں؟"

"سلطانِ معظم! مجھے کالونی کے راستے پر ایک اجنبی دوشیزہ نے روکا اور اپنا نام و پتہ بتاتے ہوئے یہ بتایا کہ سکندر بیگ، سلطانِ معظم کے خلاف بغاوت کا ارادہ رکھتا ہے۔ میں نے اُس لڑکی سے اُس کے ذریعہ معلومات اور نام و پتہ پوچھنے کی بے حد کوشش کی لیکن وہ لڑکی دیکھتے ہی دیکھتے اپنی بگھی میں سوار ہو کر میری نظروں سے اوجھل ہو گئی..... سکندر آپ کا عزیز فرزند تھا۔ چنانچہ میں نے اُس دوشیزہ کی بات کو جھوٹ سمجھا اور نظر انداز کر دیا۔" قاسم نے اپنی کوتاہی پر شرمندہ ہونے والے لہجے میں کہا۔

سلطان کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ اُس نے بڑی بے صبری کے ساتھ قاسم کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کب کی بات ہے؟ سکندر کے روانہ ہونے سے پہلے کی یا بعد کی؟"

"یہ سکندر بیگ کے روانہ ہونے سے بعد کی بات ہے۔"

"ہوں ہوں!....." سلطان نے قاسم کی بات سن کر تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور پھر کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ واقعی سکندر بیگ پہلے سے غدار تھا۔ اور یہ بھی یقینی ہے کہ یہاں
اور نہ میں قیصر کے جاسوس موجود ہیں..... اچھا! اس کے علاوہ تم اور کیا جانتے ہو؟"
قاسم نے کسی قدر جھجکتے ہوئے جواب دیا۔ "اس کے علاوہ میری نظر یمنی چڑی کے چڑ
سالاروں پر بھی ہے جن کے بارے میں مجھے شک ہے کہ وہ باغیانہ خیالات کے مالک
ہیں۔ اور چند دیگر اشخاص بھی میرے خیال میں مشکوک ہیں..... لیکن ابھی تک میرے
سامنے صحیح صورتحال واضح نہیں۔ اب جبکہ آپ نے میری ذمہ داری ہی یہی مقرر کر دی ہے
تو میں انشاء اللہ سر دھڑ کی بازی لگا کر بھی اس سازش کا کھوج نکال لوں گا۔"
"بہت خوب! ہمیں تم سے یہی توقع ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ قونیا سے واپس آئیں تو
ہمیں قیصر کے جاسوسوں کے پکڑے جانے کی خوشخبری سناؤ۔ پہلے ہم قونیا سے سیدھا یور
روانہ ہونے کا ارادہ رکھتے تھے، لیکن اب ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم ایک بار قونیا سے اور
واپس آئیں گے۔ اور غداروں کو عبرت ناک سزا دیں گے۔ ہم تمہارے تعاون کے لئے
اپنے خفیہ محکمے کے سربراہ "بہرام" کو بھی مقرر کر دیں گے۔ اور کوتوالِ شہر کو بھی ہدایات
جاری کر دیں گے۔"
قاسم نے کچھ سوچتے ہوئے سلطان سے کہا۔
"سلطانِ معظم!..... آپ نے سرِ دربار مجھے شاہی سراغ رساں مقرر فرمایا ہے، اس
یقیناً اور نہ میں مصروف جاسوسوں کو میرے بارے میں خبر ہو جائے گی اور وہ محتاط ہو جا
گے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ "بہرام خان" اور کوتوالِ شہر کو میرے بارے میں ہدا
جاری نہ کریں۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں کو بے خبری کے عالم میں پکڑوں۔"
سلطان مراد خان ثانی درویش فطرت انسان تھا اور ایک بہادر سپاہی تھا۔ اُسے
طرح گھناؤنی سازشیں نہ آتی تھیں۔ لیکن سلطنت کے علماء اور دانشور سلطانی بصیر
تدبیر کے قائل تھے۔ سلطان نے غالباً اپنی دُور اندیشی کا ثبوت دیتے ہوئے بہرام
کوتوالِ شہر کو بتانا چاہا لیکن قاسم نے اُسے منع کر دیا۔ اُس نے قاسم کے مشورے کو فو
لیا۔ اس کے بعد دیر تک قاسم اور سلطان غداروں کی چھان بین کے موضوع پر بات
کرتے رہے۔ کافی دیر بعد جب قاسم سلطان سے ملاقات کر کے لوٹا تو شہزادہ محمد
کمرے میں اُس کا منتظر تھا۔ وہ قاسم کو دیکھتے ہی اُس کا استقبال کرنے کے لئے
اُسے اپنے قریب مسہری پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
"محترم قاسم بن ہشام! اُس دن مقابلے کے دوران اگر ہماری کنیز کی بیٹی

بروقت خبردار نہ کر دیتی تو سکندر آپ کا سر قلم کر چکا تھا۔"
شہزادہ محمد کی بات سن کر قاسم حیرت سے اُچھلا۔
"کنیز؟؟ کون کنیز؟ اور کون سی بیٹی؟..... میں آپ کی بات سمجھا نہیں شہزادہ حضور!"
شہزادہ محمد، قاسم کی بات سن کر مسکرا دیا اور ہنس کر کہنے لگا۔ "کیا آپ کو یاد نہیں کہ
مقابلے کے دوران آپ جب منصفین کے پاس کھڑے تھے اور تماشائیوں کی جانب دیکھ
رہے تھے تو آپ کے عقب سے سکندر نے خطرناک وار کیا تھا۔ اُس وقت آپ کو خبردار
کرنے والی آواز سکندر بیگ کی البانوی کنیز کی بیٹی "مارسی" کی تھی۔"
قاسم حیرت کے سمندر میں غوطے کھا رہا تھا۔ اُس نے کسی قدر معصومیت سے کہا۔
"آواز تو نہیں تھی البتہ ایک چیخ سی میں نے سنی تھی۔ لیکن مجھے یہ انداز نہ ہو سکا کہ وہ
چیخ کس طرف سے بلند ہوئی۔"
شہزادہ محمد اب مزے لے لے کر مسکرا رہا تھا۔ اُس نے پھر کہا۔ "جی ہاں جناب! وہ
چیخ مارسی کی تھی..... خیر چھوڑیئے، ہم بھی ملتے ہی کیا گفتگو لے بیٹھے ہیں..... سنا ہے آپ کو
شاہی سراغ رساں مقرر کیا گیا ہے۔ برادرِ محترم، براہِ کرم! ہمارے لئے بھی ایک دو سراغ
ضرور ڈھونڈیئے گا۔" شہزادہ محمد نے ذومعنی جملہ کہا اور دونوں کھلکھلا کر ہنس دیئے۔ لیکن
قاسم کا ذہن متواتر اس چیخ پر لگا ہوا تھا۔ وہ ابھی تک سوچ رہا تھا کہ ایک لڑکی نے انتہائی
نازک وقت میں اُس کی جان بچا کر اُس پر احسان کر دیا ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اُسے
البانوی کنیز کی بیٹی سے مل کر اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔
معاً کسی خیال کے تحت قاسم نے شہزادہ محمد سے کہہ دیا۔ "شہزادہ حضور!..... حق تو یہ
ہے کہ میں اُس لڑکی کا شکریہ ادا کروں۔ لیکن سوچتا ہوں اُس کو کہاں تلاش کروں؟"
قاسم کے ذہن میں کچھ اور ہی خیالات گردش کر رہے تھے۔ غالباً اُس کے اندر کا سراغ
رساں حرکت میں آ چکا تھا۔ ورنہ اس طرح پہلی ملاقات میں شہزادہ محمد کے ساتھ وہ یوں
بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کرتا۔ شہزادہ محمد نے قاسم کی بات سنی تو اُس کا قہقہہ نکل گیا۔
"اچھا!..... چند لمحوں میں نوبت بہ ایں جا رسید؟ کہیں ہمارے سراغ رساں صاحب
عاشقانہ عشق تو نہیں فرمانے لگے؟" نوعمر شہزادے نے اپنا قیافہ قائم کرتے ہوئے کہا۔
"نہیں شہزادہ حضور ایسی بات نہیں!..... میں تو بس ویسے ہی اخلاقی لحاظ سے کہہ رہا
تھا۔ آخر اُس لڑکی نے میری جان بچائی ہے۔"
شہزادہ محمد پھر ہنس دیا۔ "برادرِ محترم!..... آپ کی اخلاقیات اپنی جگہ بجا۔ لیکن یاد رکھئے

کہ آپ مسلمان ہیں اور وہ ایک عیسائی ماں کی بیٹی ہے۔"

قاسم کے لئے یہ بات پھر چونکا دینے والی تھی۔ وہ اپنے مقدر پر رشک کرنے لگا کہ سراغ رسانی کی ذمہ داری سنبھالتے ہی پہلے قدم پر اُسے سراغ ملنا شروع ہو گئے تھے۔ اُس کا ذہن ایک عیسائی لڑکی کے بارے میں سوچ رہا تھا جس نے تہوار والے روز قاسم کی جان بچائی۔ اور جو سکندر کی البانوی کنیز کی بیٹی ہے۔ یہ یقیناً ایک عجیب اتفاق تھا۔ اس قدر عجیب کہ اسے جان کر قاسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اُس نے بے صبری سے بات کرتے ہوئے پوچھا۔

"لیکن شہزادہ حضور! اُس لڑکی کا پتہ بھی تو عنایت فرمایئے، تاکہ ہم اُس کا شکریہ ادا کرنے کے لئے جا سکیں۔"

"بہت خوب!..... سبحان اللہ..... تو ہمارے پنج ہزاری سالار اور شاہی سراغ رساں جناب قاسم بن ہشام صاحب ایک عیسائی لڑکی کے دامِ حسن میں گرفتار ہو ہی گئے۔" شہزادہ محمد خوب ہنس رہا تھا۔ قاسم نے بھی اُس کی ہنسی میں شامل ہو کر ہنسی مزاح کا ماحول بنانے کی اداکاری کی۔ شہزادہ محمد نے پھر کہا۔

"ٹھیک ہے، ہم آپ کو ماری کا پتہ بتا دیتے ہیں۔ لیکن اس کی ایک شرط ہے، پہلے وہ پوری کیجئے۔"

قاسم نے چونک کر پوچھا۔ "بے شک!..... فرمایئے، کون سی شرط ہے؟"

شہزادہ محمد نے ہنستے ہنستے کہا۔ "ہماری شرط یہ ہے کہ آپ ہمارے دوست بننے کا وعدہ کیجئے!..... آپ ہمارے ساتھ وعدہ کیجئے کہ آپ ہمارے ہمراہ شکار کے لئے بھی جایا کریں گے اور ہمیں ملنے کے لئے یہاں قصرِ سلطانی میں بھی تشریف لایا کریں گے۔"

قاسم نے اطمینان کی سانس لی اور فوراً کہا۔ "آپ کی دوستی؟..... زہے نصیب! آپ کی شرط منظور ہے۔"

قاسم کی بات کے ساتھ ہی دونوں ہنس دیئے۔ قاسم نے نوعمر شہزادے کے ساتھ وعدے کا ہاتھ ملایا اور کہا۔ "ٹھیک ہے حضور! اب آپ فرمایئے سکندر بیگ کی البانوی کنیز کا پتہ"

شہزادہ محمد نے قاسم کو مزید تنگ نہ کیا اور بتا دیا کہ شاہی محل کی عقبی کالونی میں البانوی کنیز مارتھا کا گھر ہے۔ اب قاسم کے لئے شہزادے کے پاس مزید رُکنا ممکن نہ تھا۔ اپنے مشن کا پہلا سراغ مل چکا تھا۔ چنانچہ کچھ دیر بعد اُس نے جانے کی اجازت چاہی۔ نوعمر شہزادے نے مسکرا کر اُسے جانے کی اجازت دے دی۔ شہزادہ محمد، قاسم کو دیوان

کے دروازے تک چھوڑنے آیا۔ اور جب قاسم روانہ ہونے لگا تو شہزادے نے ایک عجیب بات کر دی۔

"دوست! ہم اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ آپ البانوی کنیز کے گھر شکریہ ادا کرنے سے زیادہ سکندر بیگ کی سازش کا سراغ ڈھونڈنے جا رہے ہیں۔ لیکن ہم آپ کو روکیں گے نہیں۔"

قاسم نے خفیف نظروں سے شہزادے کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں اُس کی بصیرت کی داد دی۔ قاسم نے سوچا کہ سلطان مراد خان ثانی کی نسبت اُس کا بیٹا "محمد" زیادہ ذہین اور صاحب بصیرت تھا..... پھر قاسم نے شہزادے کو سلام کیا اور محل سے نکل کر چلا گیا۔

اب اُس کے دماغ میں سنسنی کے گھوڑے دوڑ رہے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ جلد سے جلد ماری سے مل لے۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا، اُس کا یہ یقین پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ ماری ہی وہی لڑکی ہے جو اُسے زیتون کے باغات میں ملنے کے لئے آئی تھی۔ ابھی شام ہونے میں کچھ دیر تھی اور وہ رات کے اندھیرے میں مارتھا کے گھر جانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اُس نے وقت گزارنے کے لئے اپنے گھوڑے کا رُخ گھر کی جانب موڑ دیا۔ گھر پر اُس کا بھائی طاہر موجود تھا۔ قاسم گھر میں داخل ہوا تو بچے دوڑ کر آئے اور اُس کی ٹانگوں سے لپٹ گئے۔ اب اُس کے بھتیجے اُس کے ساتھ پوری طرح مانوس ہو چکے تھے۔ وہ گھر آتا تو اُس کے ساتھ اُچھلنے کودنے لگتے۔ اُس کے والدین بھی اندر نہ کی زندگی سے مطمئن تھے۔ کیونکہ یہاں وہ اپنے دونوں بیٹوں، بہو اور پوتوں کے ساتھ تھے۔ قاسم کی ماں زیادہ بوڑھی نہ تھی۔ وہ ایک دیندار عورت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اُس کے دونوں بیٹے مذہبی خیالات کے مالک تھے۔ قاسم اپنے کمرے میں بچوں کے ساتھ کھیلنے میں مصروف تھا کہ طاہر داخل ہوا۔

"سنا ہے آج سلطان نے بلوایا تھا تمہیں؟"

"آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ میں نے تو کسی سے ذکر نہیں کیا۔" قاسم نے کسی قدر حیرت سے کہا۔

"مجھے تمہارے دوست دس ہزاری سالار آغا حسن نے بتایا ہے۔" طاہر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور قاسم کے قریب ہی فرش پر بیٹھ گیا۔

"جی ہاں! سلطان بیک وقت دو لشکر روانہ کر رہا ہے۔ ایک "ہونیاڈے" کے مقابلے کے لئے ہنگری کی جانب اور دوسرا "قونیا" کی بغاوت فرو کرنے کے لئے۔" قاسم نے بتایا۔

"تمہیں کون سے لشکر میں شامل کیا گیا ہے؟"

"مجھے سلطان نے حکم دیا ہے کہ میں یہیں رہ کر قیصر کے جاسوسوں کا کھوج لگاؤں۔ اُس نے مجھے شاہی سراغ رساں مقرر کیا ہے۔" قاسم نے کسی قدر جھجکتے ہوئے بتایا۔

"یہ کیا بات ہوئی؟ شاہی سراغ رساں؟ کیا تم اب پنج ہزاری سالار نہیں رہے؟" طاہر نے حیرت سے پوچھا۔

قاسم بولا۔ "نہیں، ایسی بات نہیں۔ دراصل میں نے خود سلطان کو بتایا تھا کہ ادرنہ میں قیصر کے جاسوس موجود ہیں۔"

معاً قاسم کو ایک خیال آیا اور اُس نے اپنے بھائی سے سوال کر دیا۔ "بھائی جان! ابوجعفر کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ وہی ابوجعفر جو ایک بار ہمارے گھر آیا تھا۔"

طاہر نے سنسنی زدہ نظروں سے قاسم کی جانب دیکھا اور کچھ دیر سوچنے کے بعد دھیمے لہجے میں کہنے لگا۔ "میں تو یہی جانتا ہوں کہ وہ "بغدادی دروازہ" کی مسجد کا خطیب ہے۔ ہاں! البتہ یہ بھی سنا ہے کہ اُس کے تعلقات دربارِ شاہی تک پھیلے ہوئے ہیں۔"

طاہر کی بات سن کر قاسم درمیان میں بول پڑا۔

"نہیں، کیا آپ یہ جانتے ہیں کہ وہ ادرنہ میں کہاں سے آیا ہے؟ اُس کا حدود اربعہ کیا ہے؟ اور یہ کہ کیا ادرنہ میں اُس کا کوئی اور رشتہ دار بھی ہے؟"

طاہر کچھ سوچنے لگا۔ اب اُس کے ماتھے پر سوچ کی شکنوں کا بسیرا تھا۔ اُس نے چند ثانیے خاموش رہنے کے بعد کہا۔ "جہاں تک مجھے معلوم ہے ادرنہ میں ابوجعفر کا کوئی رشتہ دار نہیں۔ یہ شخص عرب کا باشندہ ہے اور پچھلے کئی سال سے یہاں ادرنہ میں مقیم ہے۔"

یہ جان کر کہ ابوجعفر کا کوئی رشتہ دار ادرنہ میں نہیں، قاسم کی آنکھوں میں چمک سی ہوئی۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور طاہر سے کہنے لگا۔ "بھائی جان! آپ نے غور سے ابوجعفر کا چہرہ دیکھا ہے..... آپ یاد کریں وہ عربوں کی طرح گورا چٹا اور صحت مند ضرور ہے لیکن اُس کی آنکھیں عربوں سے مشابہہ نہیں ہیں۔ اُس کی آنکھوں کی نیلی رنگت لاطینی اقوام جیسی ہے۔"

قاسم کی بات سن کر طاہر ہنس دیا۔ "ارے بھائی! تم تو سچ مچ جاسوس بن گئے..... اتنی دُور دُور کی کوڑیاں لانے لگے..... تمہیں وہم ہو رہا ہے۔ ابوجعفر یہاں بیس سال سے مقیم ہے۔ آج تک تو کسی نے اُس پر شک نہیں کیا۔ اب تم ہو کہ اُسے عرب ماننے کے لئے بھی تیار نہیں ہو..... حالانکہ وہ عمدہ لہجے میں عربی بولتا ہے۔"

قاسم نے بھائی کی بات سنی لیکن خاموش رہا۔ اُس کا دماغ کہیں اور تھا۔ قاسم کو خلاؤں میں گھورتا دیکھ کر طاہر بولا۔

"اچھا چھوڑو یہ سراغ رسانی۔ چلو، چل کر کھانا کھاتے ہیں۔"

قاسم دسترخوان پر بھی خاموش رہا۔ جب سے سلطان نے اُسے سراغ رسانی کی ذمہ داری سونپی تھی اُس کا دماغ فعال ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی وہ قیصرِ قسطنطنیہ اور ابوجعفر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اُسے محسوس ہوا کہ جو ذمہ داری اُسے سونپی گئی ہے اس کی بجا آوری کے لئے ضروری ہے کہ اُسے قیصرِ قسطنطنیہ کی ریشہ دوانیوں سے متعلق پوری معلومات ہوں۔ اسی خیال کے تحت اُس نے طاہر سے سوال کیا۔

"بھائی جان! قسطنطین کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ جنگ سے زیادہ سازش کے ذریعے اپنے دشمنوں کو مات کرتا ہے..... کیا یہ سچ ہے؟"

طاہر نے قاسم کی بات دلچسپی سے سنی اور کہا۔ "یہ سچ ہے..... قیصر زیرِ زمین سرگرمیوں میں مہارتِ تامہ رکھتا ہے۔ ہمارے سلطان کے دادا "سلطان بایزید یلدرم" اور مشہور ایشیائی فاتح "امیر تیمور" کے مابین اسلامی تاریخ کی رُسوا کن لڑائی فی الحقیقت قیصر کی خفیہ سرگرمیوں کی وجہ سے ہوئی تھی۔ میں نے تربیت گاہ کی لائبریری میں اُس مکتوب کی نقل دیکھی ہے جو قیصر نے بایزید یلدرم کے خلاف امیر تیمور کو لکھا تھا۔ اُس نے لکھا تھا.....

میری سلطنت بہت پرانی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں بھی قسطنطنیہ کے اندر ہماری سلطنت موجود تھی۔ اس کے بعد "بنو اُمیہ" اور "بنو عباس" کے زمانے میں بھی خلفاء سے بارہا ہماری صلح ہوئی اور کسی نے قسطنطنیہ لینے کا قصد نہیں فرمایا۔ لیکن اب عثمانی سلطان نے ہمارے اکثر مقبوضہ چھین لئے ہیں اور ہمارے دارالسلطنت قسطنطنیہ پر اُس کا دانت ہے۔ ایسی حالت میں سخت مجبور ہو کر ہم آپ سے امداد کے خواہاں ہیں اور ظاہر ہے کہ آپ کے سوا ہم اور کسی سے خواہانِ امداد ہو بھی نہیں سکتے۔ اگر آپ بایزید خان یلدرم کے مسلمان اور ہمارے عیسائی ہونے کا خیال کرتے ہیں تو آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ بایزید خان کو اس طرف یورپ میں مسلسل فتوحات ہو رہی ہیں اور اس کی طاقت بڑی تیز رفتاری سے ترقی پذیر ہے۔ وہ بہت جلد اس طرف سے مطمئن اور فارغ ہو کر آپ کے مقبوضہ ممالک پر حملہ آور ہو گا اور اس وقت آپ کو اس کے زیر کرنے میں مشکلات کا سامنا ہو گا۔ بایزید خان نے "سلطان احمد جلائر" اور "قراء یوسف ترکمان" کو جو آپ کے مفرور باغی ہیں اپنے یہاں عزت کے ساتھ مہمان رکھ چھوڑا ہے

اور یہ دونوں باغی اُس کو آپ کے خلاف جنگ کرنے اور مشورہ دینے میں برابر مصروف ہیں۔ یہ بات بھی آپ کے لئے کچھ کم بے عزتی کی نہیں کہ آپ کے باغی، سلطان بایزید کے پاس اس طرح عزت و احترام کے ساتھ رہیں اور آپ اُن کو واپس طلب نہ کر سکیں۔ بس مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایشیائے کوچک پر حملہ کر دیں۔ کیونکہ اس ملک کو قدرتی طور پر آپ کے قبضے میں رہنا چاہئے.....

اور قاسم! امیر تیمور اتنا بڑا بادشاہ ہو کر بھی قیصر کی چال میں آ گیا۔ قیصر کے خط نے اسلامی دنیا میں بارود کا کام کیا اور اسلامی دنیا کے دو عظیم بادشاہوں کے درمیان ''انگورہ'' کے مقام پر ایک ایسی دردناک لڑائی ہوئی کہ رزم گاہ میں مسلمانوں کو گرتا دیکھ کر آسمان کی بھی سسکیاں نکل گئی ہوں گی۔ اُس جنگ میں تیمور نے بایزید کو عبرت ناک شکست دی..... اور سلطان بایزید کو لوہے کے پنجرے میں بند کر کے گلی گلی پھرایا اور رُسوا کیا۔

قیصر ہمیشہ گھٹیا حربے استعمال کرتا رہا ہے۔ یہ جب کمزور ہوتا ہے تو دب کر مسلمانوں کے تلوے چاٹنے لگتا ہے۔ لیکن جب ذرا اسے موقع ملتا ہے یہ کوئی بھی گری ہوئی حرکت کرنے سے باز نہیں آتا۔ تم شاید نہیں جانتے ''سلطان مراد خان اوّل'' سے ڈر کر قیصر نے اپنی تین خوبصورت لڑکیاں مراد خان اوّل کو پیش کر دیں۔ ایک اُس کے لئے اور دو اُس کے بیٹوں کے لئے۔ اس کے باوجود قیصر، سلطان مراد خان اوّل کے خلاف سازشوں میں مصروف رہا۔ 782 ہجری میں قیصرِ قسطنطنیہ ''پلیولوگس'' نے پہلے سلطان کے خلاف گھناؤنی سازشیں کیں اور پھر جب سلطان کے غضب سے خوفزدہ ہوا تو اپنے بیٹے ''تھیوڈورس'' کو سلطان کی خدمت میں بھیج کر درخواست کی کہ اس کو نئی چری فوج میں بھرتی ہونے کی عزت دی جائے۔

قیصر مسلمان سلاطین کے حرم میں اپنی بیٹیاں اور بہنیں بھیجنے سے بھی باز نہیں رہتا۔ سلاطین کے محل میں بھی قیصر کی شہزادیاں ہر دور میں خطرناک سازشوں کا حصہ رہی ہیں۔''

طاہر نے پوری تفصیل کے ساتھ قاسم کو قیصر کے بارے میں بتایا۔ اس طرح تفصیل کے ساتھ بیان کرنا اُس کا پیشہ تھا۔ آخر وہ ایک تجربہ کار معلم تھا۔ قاسم اپنے بھائی کی گفتگو سننے میں اس قدر محو تھا کہ اُسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ اچانک اُسے خیال آیا کہ اُسے مارسی سے ملنے جانا ہے تو وہ چونک گیا۔ وہ اس قدر اہم گفتگو کو چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا لیکن اُس نے فرض کو دلچسپی پر ترجیح دیتے ہوئے مارسی کے گھر جانے کا فیصلہ کیا۔ کھانا ختم کرنے کے بعد ہاتھ صاف کرتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

طاہر نے قاسم کو اُٹھتے دیکھا تو سوال کیا۔ ''کیا بات ہے؟ کیا تم کہیں جانا چاہتے ہو؟''

''جی ہاں! مجھے ضروری جانا ہے۔ آپ نے سلسلۂ معلومات جہاں پر چھوڑا ہے یہیں سے آگے میں آپ سے پھر سنوں گا۔ آپ کی بتائی ہوئی تفصیل بہت دلچسپ اور جامع ہے۔ اچھا! اب میں اجازت چاہتا ہوں۔''

کھانا کھا کر بچے اونگھتے ہوئے سونے کے لئے چلے گئے۔ قاسم نے اپنا گھوڑا نکالا اور گھر سے باہر نکل آیا۔ رات ہو چکی تھی۔ فضا میں خنکی بڑھتی جا رہی تھی۔ اور آسمان پر جھلملاتے تارے ٹھٹھرتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ قاسم کا گھوڑا دُلکی چال سے ''ادرنہ'' کی گلیوں میں مٹرگشت کرنے لگا۔ اُسے زیادہ جلدی نہیں تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ وقت گزر جائے۔ سردیوں کی آمد آمد تھی اور خزاں اپنے پورے عروج پر تھی۔ ادرنہ کے بازار بند ہو چکے تھے اور گلیوں میں اِکا دُکا لوگ آ جا رہے تھے۔ قاسم کا گھوڑا دُلکی چال چلتا ہوا قصرِ سلطانی کے عقبی محلے میں داخل ہوا۔ یہاں دو دو اور تین تین منزلہ مکانات تھے۔ یہاں شہر کے اشرافیہ، اُمراء، وزراء، سالار اور غیر ملکی سفیروں کی قیام گاہیں تھیں۔ قاسم، شہزادہ محمد کے بتائے ہوئے مکان کی تلاش میں تھا۔ وہ ایک گلی مڑا تو اُسے اپنی مطلوبہ نشانی نظر آ گئی۔ اور پھر چند لمحوں بعد وہ مارسی کے مکان کے سامنے تھا۔ تجسس اور سنسنی کی وجہ سے اُس کے اعصاب تن گئے اور دل کی دھڑکن کسی قدر تیز ہو گئی۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر دروازے کی زنجیر کھٹکھٹائی اور پھر کسی کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ چند لمحے بعد اندر سے دروازہ کھولنے کی آواز آئی تو قاسم کی سنسنی اور بڑھ گئی۔ دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر خادمہ نے سر باہر نکال کر گلی میں جھانکا۔ قاسم فوراً دو قدم آگے بڑھا اور خادمہ کے سامنے آتے ہوئے کہا۔

''جی..... مجھے محترمہ مارسی سے ملنا ہے۔''

قاسم نے جھجکتے ہوئے مارسی کا نام لیا تو خادمہ کے چہرے پر حیرت کی لہر نظر آئی۔ اب وہ مکمل طور پر دروازے سے باہر نکل آئی تھی۔

''مارسی؟؟..... جی، کیا کہا آپ نے، میں سمجھی نہیں؟''

''مجھے مارسی صاحبہ سے ملنا ہے۔'' قاسم نے اپنی بات دہرائی۔ اب ادھیڑ عمر خادمہ قاسم کو گھور رہی تھی۔

''آپ کی تعریف؟..... تاکہ میں مارسی کو بتا سکوں۔'' خادمہ نے استفہامیہ لہجے میں کہا۔

''بی بی! آپ اُن سے کہہ دیجئے..... شہزادہ محمد کا دوست آیا ہے۔'' قاسم نے گول مول

تعارف کروایا۔

ادھیڑ عمر خادمہ چند ثانیے کچھ سوچتی رہی، پھر گھر میں داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا۔ قاسم حیرت کے عالم میں کھڑا رہا۔ ابھی وہ کچھ سمجھ نہ پایا تھا کہ دوبارہ دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ اس مرتبہ ادھیڑ عمر خادمہ کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر معزز خاتون تھی۔ یہ مارتھا تھی۔ مارتھا نے قاسم کو سلام کا جواب دینے کے بعد اندر آنے کے لئے کہا اور خود اُس کے آگے آگے چل دی۔ مکان میں داخل ہو کر قاسم نے دیکھا کہ مارتھا کے ساتھ ساتھ ایک حبشی غلام بھی مستعدی سے چلتا ہوا آ رہا تھا جس کی دو دھاری تلوار نیام سے باہر تھی۔

قاسم بے پرواہی سے چلتا ہوا مارتھا کے مہمان خانے میں داخل ہوا۔ مہمان خانہ سادہ لیکن عمدہ سامان سے آراستہ تھا۔ اس کمرے میں مسلمانوں کی روایات کے خلاف لکڑی کی کرسیاں رکھی تھیں۔ سامنے کی دیوار پر حضرت عیسیٰؑ کا مجسمہ صلیب کے ساتھ لٹکا ہوا تھا۔

مارتھا قاسم کے ساتھ کرسی پر بیٹھنے کی بجائے کھڑی رہی اور کھڑے کھڑے قاسم سے سوال کیا۔ ”محترم نوجوان! کیا تم بتا سکتے ہو کہ تم میری بیٹی سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟“ اُس کے لہجے میں ہلکی سی چبھن تھی۔

قاسم نے شرمیلے انداز میں سر جھکا کر جواب دیا۔ ”میں محترمہ مارسی کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں..... کیونکہ انہوں نے میری جان بچا کر مجھے ممنونِ احسان کیا ہے۔“

قاسم نے جواب دیا تو مارتھا کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔

”جان؟..... مارسی نے تمہاری جان بچائی..... کب؟ کیسے؟ کہاں؟“ مارتھا کے لہجے میں حیرت تھی۔

قاسم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”دراصل میرا سکندر بیگ کے ساتھ شمشیر زنی کا مقابلہ ہوا تھا اور عین اُس وقت جب بے خبری میں سکندر مجھ پر وار کرنے لگا تھا، مارسی نے با آواز بلند مجھے پکارا اور.....“

جملہ ابھی قاسم کی زبان پر تھا کہ اچانک مارسی کمرے میں داخل ہوئی۔ اُس کی آنکھوں میں حیرت کے سفینے تیر رہے تھے۔ اُس کا ملکوتی چہرہ اعصابی دباؤ کی وجہ سے تن کر ہوئے غنچے جیسا لگ رہا تھا۔ مارسی غالباً کمرے میں داخل ہونے سے پہلے قاسم کی باتیں سنتی رہی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھیں لئے اندر داخل ہوئی اور قاسم کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ قاسم بھی مارسی کے احترام میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مارسی نے پلکیں پٹپٹاتے ہوئے قاسم سے کہا۔

”آ آ آپ..... غالباً وہی نوجوان ہیں جنہوں نے تہوار والے روز سکندر بیگ کو شکست دی تھی..... میں نے آپ کو وہاں دیکھا تھا۔“

مارسی نے اپنی ماں اور غلام کی موجودگی میں قاسم کو نہ پہچاننے کی اداکاری کی۔ قاسم بھی مارسی کا مدعا سمجھ چکا تھا، چنانچہ کسی قدر مسکراتے ہوئے انتہائی شائستہ لہجے میں کہنے لگا۔

”جی ہاں! میں اُسی روز کے احسان کا شکریہ ادا کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ آپ نے اُس روز مجھے بروقت خبردار کر کے اور میری جان بچا کر مجھے دوسری زندگی بخشی ہے جس کے لئے میں آپ کا ممنونِ احسان ہوں اور آپ کے لئے کوئی بھی خدمت بجا لانا سعادت سمجھتا ہوں۔“

قاسم کی بات سن کر مارسی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ”اجی واہ!..... کیا بات ہے۔ آپ اتنی طویل مدت بعد میرے احسان کا شکریہ ادا کرنے آئے ہیں..... بہت خوب۔“

مارسی نے کہا تو قاسم خفیف سا ہو گیا۔ ”جی دراصل مجھے آپ کے نام اور رہائش کا پتہ آج ہی مل سکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اتنی دیر کے بعد حاضر ہوا ہوں۔“

اس اثناء میں مارتھا وہیں کھڑی قاسم کے حدودِ اربعہ کا جائزہ لیتی رہی۔ لیکن اب اُس کا ہر طرح کا وہم دُور ہونے لگا۔ گویا قاسم اور مارسی کی کامیاب اداکاری نے رنگ دکھانا شروع کر دیا تھا۔ مارتھا نے جب دیکھا کہ قاسم سچ مچ سیدھا سادا سپاہی ہے تو مسکرا کر بولی۔

”ٹھیک ہے، کوئی بات نہیں۔ ہم اتنی دیر بعد بھی آپ کا شکریہ قبول کرتے ہیں۔ آپ تشریف رکھئے، میں آپ کی تواضع کے لئے پھل اور مشروب بھیجتی ہوں۔“

مارتھا نے اطمینان بھرے لہجے میں قاسم سے کہا۔ اور پھر حبشی غلام کو ساتھ لے کر کمرے سے نکل گئی۔ مارتھا چلی تو گئی لیکن قاسم کو تسلی نہ ہوئی۔ چنانچہ اُس نے اپنی اداکاری برقرار رکھی اور مارسی سے مخاطب ہوا۔

”دیکھئے! آپ مجھے اپنا خادم سمجھئے۔ میں اگر زندگی میں کسی موقع پر آپ کے کام آ سکوں تو مجھے فخر ہو گا۔“

مارسی نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے قاسم کی بات سنی اور پھر انتہائی مدھم آواز میں قاسم سے کہا۔

”آپ نے وعدہ خلافی کی ہے۔ کیونکہ آپ نے میرے منع کرنے کے باوجود میرا سُراغ لگایا ہے۔ لیکن میں حیران ہوں کہ آپ کو میرا اتا پتہ کس نے بتایا؟“

”میں آپ کی والدہ کو بتا چکا ہوں کہ میں شہزادہ محمد کا دوست ہوں۔ اور شہزادے سے

ہی میں نے آپ کا پتہ حاصل کیا۔ دراصل ایک مرتبہ آپ کے گھر آنا ضروری تھا۔ میں آپ کی والدہ سے ملنا اور انہیں دیکھنا چاہتا تھا۔"

قاسم نے مارسی کے نزدیک چہرہ لاتے ہوئے اُس کے کان میں سرگوشی کی۔ قاسم کے الفاظ مارسی کے رخساروں پر گدگدی کرتے ہوئے اُس کے کان میں اُتر گئے۔ قاسم کے لئے مارسی کے اس قدر قریب آنا انوکھی بات تھی۔ مارسی نے بھی اپنے بدن میں سردی کی لہر دوڑتی ہوئی محسوس کی۔ اُس کی لانبی پلکیں جھک گئیں اور چہرہ سرخ ہونے لگا۔ قاسم نے ایک مرتبہ پھر کہا۔

"اور آپ سے ملاقات بھی ضروری ہے۔ آپ کسی طرح کل دن میں مجھے تھوڑا سا وقت عنایت کریں..... کچھ ضروری باتیں ہیں جن کا تذکرہ آپ کے ساتھ ناگزیر ہے۔"

"وقت؟..... دن میں؟..... لیکن کہاں؟" مارسی نے موم کی طرح پگھلتے ہوئے پوچھا۔

وہ دونوں کسی حد تک سرگوشیوں میں بات کر رہے تھے۔ قاسم نے جواب دیا۔ "میرے خیال میں آپ لالہ شاہین کی یادگار پر آ جائیے۔ وہیں پرانا قبرستان بھی ہے۔ میں لالہ شاہین کی یادگار پر شہتوت کے ایک بڑے درخت کے نیچے آپ کا انتظار کروں گا۔"

اتنے میں باہر آہٹ سنائی دی اور قاسم نے بات بدل لی۔ اب وہ بلند آواز میں بول رہا تھا۔ "آپ کی والدہ خاصی سلیقہ مند خاتون دکھائی دیتی ہیں۔ میں آپ کی والدہ سے بہت متاثر ہوا ہوں۔"

قاسم کی بات مکمل ہوتے ہی خادمہ مہمان خانے میں داخل ہوئی۔ اُس کے ہاتھ میں سامانِ مدارت کی طشتری تھی۔ خادمہ کے پیچھے کچھ ہی دیر بعد مارتھا بھی کمرے میں آ گئی۔ اب قاسم کا کام یہاں مکمل ہو چکا تھا اور اُسے مزید رُکنے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ اُس نے مارسی کی ماں کو بغور دیکھ لیا تھا اور وہ صرف اُسی کو دیکھنے کے لئے مارسی کے گھر آیا تھا۔ وہ شاہی سراغ رساں تھا اور سکندر بیگ کو پرورش دینے والی البانوی کنیز مارتھا کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اب اُس نے مارتھا کا گھر اور اس کے اطوار کا بغور جائزہ لے لیا تھا۔ اور اب وہ مارتھا کے بارے میں کسی حد تک رائے قائم کر سکتا تھا۔

اس کے بعد کچھ دیر قاسم ان لوگوں سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا اور پھر اُن سے اجازت لے کر چلا آیا۔

شاہی سراغ رساں

لالہ شاہین کی یادگار شہر کے جنوبی دروازے سے باہر فصیل شہر کے پہلو میں واقع تھی۔ یہ کسی زمانے میں شاہی پارک تھا لیکن آج کل یہاں قبرستان بن چکا تھا۔ خصوصاً طبقہ امراء اور سلطان کے خاندان کی قبریں اسی قبرستان میں بنائی جاتی تھیں۔ یہاں درختوں پر اُلو بولتے تھے۔ اور شاہی باغ کی ساری نشانیاں مٹی میں مل چکی تھیں۔ یہاں دن میں بھی آسیبوں کا بسیرا رہتا اور کبھی کبھار ہی کوئی شخص اس جانب سے گزرتا تھا۔

مارسی کی بگھی باغ کے اندر داخل ہوتی چلی گئی۔ نوعمر ترک کوچوان اپنے قد سے زیادہ ہوشیار تھا۔ وہ بگھی کو آبنوس کے درختوں کے سائے میں لے گیا اور گھنی جھاڑیوں کے عقب میں کھڑا کر دیا۔ مارسی بگھی سے اُتری اور یادگار میں موجود بارہ دری کی عمارت کی جانب چل دی۔ اُس کی بھاری بھرکم چادر میں خراسان کا دو دھاری خنجر چھپا ہوا تھا۔ مارسی..... مارتھا کی بیٹی تھی، اور اپنی ماں کی طرح ہوشیار..... اور بہادر تھی۔ وہ اتنی ویران جگہ پر آتے ہوئے ذرا بھی نہ گھبرائی۔ مارسی بوسیدہ بارہ دری کی سیڑھیوں پر پہنچی۔ اور پھر بارہ دری میں داخل ہونے سے پہلے کسی قدر محتاط لہجے میں پکارا۔

"سالار!..... محترم سالار!..... کیا آپ یہاں ہیں؟"

مارسی اگرچہ قاسم کے نام سے واقف تھی لیکن وہ قاسم کو سالار ہی کہا کرتی تھی۔ مارسی کے پکارنے پر کوئی جواب نہ آیا تو وہ یہ جان کر ٹھٹک گئی کہ قاسم ابھی تک نہیں پہنچا۔ مارسی نے قاسم کا گھوڑا ڈھونڈنے کے لئے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی لیکن شاید قاسم ابھی تک نہ آیا تھا، حالانکہ اُسے مارسی سے پہلے پہنچنا تھا۔ مارسی کو تشویش لاحق ہوئی اور اُس کی گرفت اپنے خنجر پر مضبوط ہو گئی۔ لیکن اگلے لمحے مارسی کے عقب میں موجود جھاڑیوں کی اوٹ سے ایک لمبا تڑنگا نقاب پوش برآمد ہوا۔ یہ قاسم ہی تھا۔ قاسم نے آتے ہی مارسی سے کہا۔

"میں معذرت چاہتا ہوں۔ دراصل میں کچھ دیر آپ کے ممکنہ تعاقب کا شک مٹاتا رہا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ کوئی آپ کے تعاقب میں ہے تو سامنے آ جائے۔"

مارسی نے ایک لمبی اور ٹھنڈی سانس لی۔ لیکن اُسے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ قاسم ایک خلوص ہے۔ اب قاسم اور مارسی بارہ دری کی سیڑھیاں چڑھ کر نیم تاریک اور بوسیدہ

چھت کے نیچے آ گئے۔ بارہ دری کے فرش پر جگہ جگہ گھاس اُگی ہوئی تھی۔ خزاں کا عروج تھا اور خشک پتے ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے بیٹھنے کے لئے جگہ منتخب کی۔ اور وہ دونوں بارہ دری کے فرش پر ایک دوسرے کے نزدیک بیٹھ گئے۔ یہ ماری اور قاسم کی پہلی باقاعدہ ملاقات تھی۔ دونوں ہی خاموش تھے۔

کافی دیر وہ ایک دوسرے کے قریب بیٹھے رہے۔ اُن کی نظریں سامنے یادگار کی کھنڈر بنی ہوئی چار دیواری پر تھیں۔ دونوں کے دل کی کیفیت عجیب سی تھی۔ وہ ایک دوسرے سے کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن الفاظ کی تلاش میں ان کا ضرورت سے زیادہ وقت صرف ہو رہا تھا۔ بالآخر ماری نے سکوت توڑا۔

''غالباً آپ نے مجھے یہاں کسی کام کے سلسلے میں بلایا ہے۔'' ماری کے لہجے میں ہلکا سا طنز بھی تھا۔ قاسم چونکا۔

''ہوں ں ں!.... کام؟.... ہاں، واقعی میں نے آپ کو کام ہی کے سلسلے میں بلایا ہے۔''

قاسم نے کسی قدر اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا واقعی اُس نے ماری کو کسی کام کے سلسلے میں بلایا ہے؟ پھر کام بھی کیسا؟ اُس کے سامنے ساری صورتحال واضح تھی۔ مثلاً اُسے ابوجعفر پر شک تھا۔ ابوجعفر ماری کی ماں مارتھا کے گھر آتا جاتا تھا۔ مارتھا راسخ العقیدہ عیسائن تھی۔ سکندر بیگ مارتھا کے زیر سایہ جوان ہوا تھا۔ لامحالہ سکندر بیگ ابوجعفر کے بھی قریب تھا۔ ماری اپنی ماں، ابوجعفر اور سکندر بیگ کے حالات سے واقف تھی لیکن خود کسی وجہ سے سکندر کو پسند نہ کرتی تھی۔ ہوسکتا ہے یہ وجہ سکندر کا مزاج ہو۔ بہرحال یہ طے ہے کہ ماری سکندر کے خلاف تھی۔

قاسم اسی طرح کی باتیں سوچتا رہا۔ اب قاسم، ماری سے مزید کیا پوچھتا۔ کیا صرف یہی کہ وہ ابوجعفر کے بارے میں اور کیا جانتی ہے۔ اور اگر صرف یہی بات تھی تو ماری سے پوچھنے کی بجائے وہ ابوجعفر کے بارے میں براہِ راست زیادہ بہتر کھوج لگا سکتا تھا۔ قاسم من ہی من میں سٹپٹا گیا..... تو آخر کس بات کے لئے اُس نے ماری کو یہاں بلوایا تھا۔ بالآخر وہ زیرلب مسکرایا اور اتمامِ حجت کے لئے اُس نے وہی سوال کر دیا۔

''میں دراصل آپ سے ابوجعفر کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔''

نہ جانے قاسم کے لہجے میں کیا تھا کہ یکلخت ماری کا قہقہہ نکل گیا..... قاسم نے سوچا قہقہہ تو نہیں ہوسکتا۔ ایسے لگتا ہے جیسے کسی ہندوستانی مندر میں نقرئی گھنٹی بج اٹھی ہو۔ ماری صرف حسین ہی نہ تھی بلکہ بڑی بھرپور اور پُرکشش شخصیت کی مالک تھی۔ مارتھا جیسی

کار ماں نے اُسے بہادری سے بات کرنے اور تنقیدی نگاہ سے زمانے کو پرکھنے کا فن بھی سکھایا تھا۔ ماری بھانپ گئی کہ قاسم کے دل میں چور ہے۔ غالباً محبت کا چور۔ لیکن وہ قاسم جیسے وجیہہ مرد کی وضع داری اور شرمیلے پن پر حیران تھی۔ اُس نے شریر آنکھوں سے قاسم کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں تو ابوجعفر کے بارے میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ وہ مسلمانوں کا مذہبی پیشوا ہے۔ بغدادی دروازے کی مسجد میں خطیب اور پچھلے دو عشروں سے یہاں اندرنہ میں مقیم ہے۔ مزید یہ کہ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے میں اُسے اپنے گھر آتا جاتا دیکھتی ہوں۔ وہ میری ماں کے ساتھ گھنٹوں اکیلے کمرے میں بیٹھ کر یقیناً کسی خفیہ سرگرمی پر بات کرتا ہے۔ میری ماں کٹر مذہبی عورت ہے اور مسلمانوں کے خلاف کچھ بھی کرنے سے دریغ نہیں کرتی۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے، سکندر کو میری ماں اور ابوجعفر نے سلطان کے ساتھ بے وفائی کے لئے تیار کیا ہے۔ مجھے سکندر قطعی طور پر پسند نہیں۔ وہ بچپن میں میرے ساتھ پل کر جوان ہوا ہے۔ لیکن وہ فطرتاً کمینہ اور بدمزاج ہے..... بس یہی چند باتیں ہیں جو میں جانتی ہوں۔''

ماری کے بیان پر قاسم دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ اُس نے جو کچھ سوچا تھا، ماری نے لفظ بہ لفظ وہی سب کچھ بتا دیا۔ اب اُسے یقین ہونے لگا کہ اُس نے ماری کو محض اس لئے نہیں بلایا۔ بلکہ اس ملاقات کے پیچھے کوئی اور جذبہ بھی ہے جو شروع شروع میں کافی دن تک بے نام سا رہتا ہے۔ اور پھر جب اسے دھیرے دھیرے نام ملتے ہیں تو وہ محبت کہلاتا ہے۔ قاسم کو یکلخت خود پر غصہ سا آنے لگا۔ اُس نے اپنے آپ سے کہا..... قاسم میاں! ہوش میں آؤ۔ تم ایک سپاہی ہو۔ تمہاری زندگی تمہارے دین کے لئے وقف ہے۔ تم کسی کے ساتھ عمر بھر ساتھ نبھانے کا پیمان کیسے باندھ سکتے ہو..... اور پھر ماری تو مسلمان بھی نہیں، ایک عیسائی لڑکی ہے۔

معاً اُسے خیال آیا اور اُس نے ماری سے ایک عجیب سوال کر دیا۔ ''اچھا ماری!..... آپ کی کہانی سے تو ایسے لگتا ہے جیسے آپ سلطنت عثمانیہ اور اسلام کے لئے اپنے مذہب عیسائیت کی نسبت ہمدردانہ جذبات رکھتی ہیں۔ کیا آپ کے دل میں کبھی اسلام کو سمجھنے کا خیال بھی آیا ہے؟''

قاسم کا سوال بہت عجیب تھا۔ ماری نے چونک کر قاسم کو دیکھا اور یکلخت سنجیدہ ہوگئی۔

''قاسم صاحب!..... میں نے اسلامی تعلیمات کے مطابق تعلیم حاصل کی اور پرورش

پائی ہے۔ میرے رہن سہن، عادات و اطوار اور رگ و پے میں اسلام جاری ہے۔ البتہ میں نے اسلام قبول کرنے کا رسمی اعلان کبھی نہیں کیا۔"

"مگر کیوں؟ جب آپ اسلام سے اس قدر متاثر ہیں تو پھر وہ کیا رُکاوٹ ہے جو آپ کو اس روشنی میں داخل نہیں ہونے دیتی؟" قاسم کو ماری کے جواب سے مزید تجسس پیدا ہو گیا تھا۔ اس کے دوسرے سوال پر ماری نے کہا۔

"کیا اعلان کرنا ضروری ہے؟ میں نے تو اب تک جو کچھ سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ ہر اچھی بات اور متوازن عمل اسلام ہے۔ اور جو کچھ متوازن نہیں وہ غیر اسلامی ہے..... میں کوئی غیر متوازن کام نہیں کرتی اور ہر اچھی بات کو پسند کرتی ہوں..... تو کیا اب میرا مسجد میں جا کر ابوجعفر جیسے پیشواؤں کے ہاتھوں پر رسماً اسلام قبول کرنا اور ماری کی بجائے سکینہ نام رکھ لینا بھی بہت ضروری ہے؟"

ماری کی بات سن کر قاسم کے چھکے چھوٹ گئے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک غیر عیسائی ماں کی بیٹی اس قدر صاحبِ علم اور سمجھدار ہو سکتی ہے۔ وہ ماری کی معقول بات سے لاجواب سا ہو گیا اور کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگا۔

"تمہاری بات ٹھیک ہے۔ لیکن کیا یہ درست نہیں کہ ظاہراً بھی اسلام اختیار کر کے آپ کے لئے معاشرتی طور پر بہتر زندگی کے مواقع ہیں۔ مثلاً آپ کلمہ پڑھ لیں تو لوگوں کی نظر میں آپ کی عزت و تکریم اور حیثیت بڑھ جائے گی۔"

قاسم محسوس کر رہا تھا جیسے اُس نے پھر کچھ غلط کہہ دیا ہے۔ ماری نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "ہاں! میں ایسا کرتی تو یقیناً بہتری کے مواقع بڑھ جاتے۔ اور سب سے بہتر یہ ہوتا کہ سلطان اپنے منہ بولے مسلمان بیٹے سکندر کے ساتھ میرا نکاح کروا دیتا جبکہ میں اُسے ناپسند کرتی تھی۔ اور رہ گئی یہ بات کہ اسلام قبول کرنے سے لوگوں کی نظر میں ہماری عزت بڑھ جائے گی، اسلامی اعتبار سے بھی غیر معقول ہے۔ عزت تو بڑھنی چاہئے لیکن اللہ کی نظر میں۔ اور میں سمجھتی ہوں وہ محض اخلاصِ نیت سے بھی بڑھ جاتی ہے۔"

قاسم سوچ رہا تھا جیسے وہ کسی عام لڑکی کی بجائے کسی عالمہ فاضلہ کے پاس بیٹھا ہے۔ اب وہ دل سے ماری پر مرمٹا تھا۔ وہ حسین تو تھی ہی لیکن اُس کی ذہانت اور اندازِ گفتگو اُس کی شخصیت کو مزید نکھار رہے تھے۔ اسی خیال کے تحت قاسم نے پھر کہا۔

"لیکن ماری، آپ ظاہراً اسلام قبول نہیں کریں گی تو آپ کی آئندہ زندگی کسی مسلمان جیون ساتھی کے ساتھ کیسے منسلک ہو گی؟ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ عیسائی مذہب پر

گی تو شاید آپ کی شادی بھی کسی عیسائی نوجوان کے ساتھ ہی ہو گی۔"

قاسم نے سادہ سے انداز میں ماری پر ایک اہم سوال کر دیا۔ اس قدر دانائی سے باتیں کرنے والی ماری کی پلکیں حیا سے جھک گئیں اور اُس کے چہرے پر سرخ سرخ بجلیاں سی دوڑنے لگیں۔ شادی کے ذکر سے ماری جز بز ہو کر رہ گئی۔ قاسم نے ماری کے چہرے کو دیکھا تو اُس کے دل میں خیال آیا..... ہو نہ ہو یہ لڑکی بھی مجھے چاہتی ہے۔ قاسم کو طمانیت سی محسوس ہوئی۔ ماری نے قاسم کے سوال پر صرف اتنا کہا۔

"مجھے ظاہری طور پر اسلام قبول کرنے پر کوئی اعتراض نہیں۔ میں تو اپنی ماں کے رویئے کی وجہ سے خاموش ہوں۔"

ماری خاموش ہو گئی۔ قاسم اُس کی بات سن کر خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ آج گویا ماری نے صرف مسلمان ہونے کا اعتراف ہی نہیں کیا تھا بلکہ ایک طرح سے پیغامِ محبت بھی قبول کر لیا تھا۔ اب قاسم کسی قدر کھل کر کہنے لگا۔

"ماری! آپ کی سحر انگیز شخصیت نے مجھ پر جادو سا کر دیا ہے۔ آپ ایک خاتون ہو کر مردوں سے زیادہ عقل و شعور کی باتیں کر لیتی ہیں۔ اور آپ کی آنکھوں سے تو مجھے ڈر لگتا ہے۔" آخری جملہ ادا کرتے ہوئے قاسم ذومعنی انداز میں مسکرا دیا۔

ماری نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "ڈر؟ کیا اتنی بدصورت ہیں میری آنکھیں؟" ساتھ ہی ماری نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں پٹپٹائیں۔

قاسم نے ماری کی حسین آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "مجھے ڈر لگتا ہے کہ میں کہیں ان جھیلوں میں ڈوب ہی نہ جاؤں۔"

یہ کھلی شرارت تھی۔ ماری چھوئی موئی سی ہو گئی۔ اُس کا چہرہ گلنار ہو چکا تھا۔ وہ زبان سے کچھ نہ بولی، بس ایک بار کسمسائی اور پھر زیرِ لب مسکرا دی۔ قاسم نے لوہا گرم دیکھا تو اور مخاطب ہوا۔

"ماری! اگر مجھے زندگی میں آپ کے مشوروں کا ساتھ ہو تو میں شاید دنیا کا آدھا فساد مٹانے کی جرأت کر سکوں۔"

ماری، قاسم کے تراشیدہ جملے پر دل ہی دل میں عش عش کر اٹھی۔ اب وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن تھوڑی دیر بعد اُس نے الفاظ کا سہارا لیا۔

"میرے مشورے آپ کی بصیرت سے زیادہ نہیں ہو سکتے۔ میرے لئے اس سے بڑا اعزاز کیا ہو گا کہ میں آپ جیسے سچے اور شجاع سالار کی مشیر کہلا سکوں۔"

قاسم کا دل بلیوں اُچھل رہا تھا۔ گویا مارسی نے اُس کا اقرارِ وفا تسلیم کر لیا تھا۔ اچانک مارسی کو شرارت سوجھی اور وہ کہنے لگی۔

''سالار صاحب! کیا آپ نے اسی قسم کی گفتگو کے لئے مجھے یہاں بلایا تھا..... میں سمجھی تھی کہ ملک وملت کا کوئی فریضہ آپ کو یہاں اس کھنڈر میں کھینچ لایا ہے۔''

قاسم ایک دم خفیف سا ہو گیا۔ اُس نے جھینپے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''دراصل محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔''

قاسم نے محاورے کا سہارا لیا تھا۔ لیکن مارسی نے یک لخت ایک نئے رنگ میں بات کی۔ ''نہیں حضور! یہ بالکل غلط فلسفہ ہے۔ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز نہیں ہوتا۔ بہت کچھ ایسا ہے جو نہ محبت میں جائز ہے نہ جنگ میں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ جائز اور ناجائز قرار دینے کا فیصلہ انسانی نقطۂ نظر کے خیال سے کیا جائے۔ یہ محاورہ تو حیوانات پر منطبق ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز سمجھتے ہیں۔''

اب قاسم کو اپنی کم مائیگی کا احساس ہونے لگا۔ اس قدر قابل اور دانا لڑکی اُس کے اعصاب پر سوار ہو رہی تھی۔ اُس نے اپنے اندر کے خوابیدہ انسان کو آواز دی۔ اور اگلے لمحے مارسی کو حیران کر دیا۔

''مارسی! اس میں کچھ شک نہیں کہ آپ کی نظر گہری باتیں بھی پرکھ لیتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ محبت بھی جنگ ہی کا دوسرا نام ہے، یا جنگ محبت کا۔ میں ایک سپاہی ہوں۔ ملک وملت کی بقاء کے لئے جنگ لڑنا میرا فریضہ ہے لیکن محبت میرے لئے فرض کی تکمیل کا راستہ..... اس لحاظ سے میں نے محبت کے لئے بلایا ہو یا ملک وملت کے لئے، ایک ہی بات ہے۔''

قاسم کی خوبصورت بات سے مارسی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اب وہ لاجواب ہو چکی تھی۔ چنانچہ خفت آمیز انداز میں محض ہنس کر خاموش ہو گئی۔

وقت کافی گزر چکا تھا۔ اچانک ایک چمگادڑ کہیں سے اُڑی اور چھپاک سے مارسی اور قاسم کے سامنے آ گری۔ یک لخت مارسی کی ہذیانی اندلذ میں چیخ نکلی اور وہ بے ساختہ قاسم کی جانب سمٹ گئی۔ اُس کے دائیں بازو نے قاسم کے بائیں بازو کو چھوا تو اُس کے تن بدن میں بجلی سی کوند گئی۔ مارسی کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اور قاسم کے سینے میں ایک لذت کے شگوفے پھوٹ رہے تھے۔ لیکن یہ سب کچھ صرف دو ثانیے کے لئے تھا۔ اگلے لمحے مارسی، قاسم سے الگ ہو کر بیٹھ گئی۔ اُس کا چہرہ شرم و حیاء کی شدت سے انار ہو

تھا۔ اب مارسی نے واپس چلنے میں ہی بہتری سمجھی۔ کیونکہ اس طرح قاسم کے بدن سے مس ہونے کے بعد اُس کے بدن میں کپکپی طاری ہو چکی تھی اور وہ کوئی بات کرنے کی ہمت نہ کر پا رہی تھی.....

وہ کانپتے قدموں کے ساتھ اُٹھی اور زمین پر پڑے خشک پتوں کو گھورتے ہوئے کہنے لگی۔ ''اب ہمیں چلنا چاہئے۔''

قاسم کے لئے آج کی ملاقات بائیس سالہ زندگی کا سب سے حسین تجربہ تھی۔ قاسم بہت خوش تھا۔ اُسے مارسی کے ساتھ مل کر یوں لگا جیسے اُس نے ہفت اقلیم کی شہنشاہیت حاصل کر لی ہو۔ قاسم بھی اُٹھ کر مارسی کے ہمراہ قدم بقدم چلنے لگا تھا۔ راستے میں اُس نے مارسی سے سوال کیا۔

''سنا ہے ابوجعفر سے تعلقات سلطان کے رشتے داروں تک بھی ہیں۔ کیا یہ سچ ہے؟''

مارسی نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں نے بھی سن رکھا ہے۔ میری ماں بتا رہی تھی کہ ابوجعفر کے بہت گہرے مراسم ''شہزادہ علاؤ الدین'' کے ساتھ ہیں۔''

''شہزادہ علاؤ الدین کے ساتھ؟..... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟..... تو کیا شہزادہ علاؤ الدین یعنی سلطان کا بڑا بیٹا بھی غداروں کا ساتھی ہے؟'' قاسم نے حیرت کی شدت سے کسی قدر بلند آواز میں کہا تو مارسی فوراً بول اُٹھی۔

''نہیں! یقیناً ایسا نہیں۔ شہزادہ علاؤ الدین کو میں ذاتی طور پر جانتی ہوں۔ وہ ایسے نہیں ہو سکتے۔ ابوجعفر یقیناً کسی چال بازی سے ان پر اثر انداز ہوتا ہوگا۔''

قاسم نے اطمینان کی سانس لی۔ لیکن وہ اس نئی بات کو معلوم کر کے خوش تھا کہ ابوجعفر کا آنا جانا شہزادہ علاؤ الدین کے پاس بھی تھا۔ گویا اُسے ایک نیا سراغ بھی مل گیا تھا۔

قاسم اور مارسی باتیں کرتے ہوئے آبنوس کے درختوں تک پہنچے تو نوعمر کوچوان ''اکبر'' بگھی تیار کئے سامنے کھڑا تھا۔ مارسی اور قاسم رُک گئے۔ مارسی نے قاسم سے جانے کی اجازت لینے کے انداز میں کہا۔

''آپ تو یتی چری کے سالار ہیں۔ اُمید ہے آپ بھی کل روانہ ہونے والے لشکر کے ہمراہ محاذِ جنگ کی طرف چلے جائیں گے۔ میں چاہتی تھی کہ کبھی آپ کے دولت کدے پر حاضر ہو سکوں اور آپ کے اہل خانہ سے مل سکوں۔'' مارسی نے پُرتکلف لہجے میں بات کی۔

قاسم مسکرا دیا۔ ''اتفاق سے میں دونوں لشکروں میں سے کسی کے ہمراہ جانے کے لئے منتخب نہیں کیا گیا۔ مجھے اس دوران یہیں اندرنہ میں رہ کر رسد و کمک کے کام کی نگرانی کرنی

ہے۔'' قاسم نے مارسی سے اپنا نیا عہدہ چھپایا اور اپنے نہ جانے کی گول مول وجہ بیان کی۔
مارسی قاسم کے جواب سے کسی حد تک حیران ہوئی۔ اُسے توقع نہ تھی کہ قاسم جیسا سپاہی فریضۂ جہاد میں پیچھے رہ جائے گا۔ اُس نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔

''تو کیا ایک مایہ ناز شمشیر زن کو سلطان نے اناج ڈھونے کے کام پر لگا دیا ہے؟''

مارسی کا جملہ سن کر قاسم کی رُوح کانپ گئی۔ اُس نے ذرا سی دیر کئے بغیر کہا۔ ''نہیں، سلطان نے مجھے جس کام پر لگایا ہے اس کا بیان نہ کرنا ہی میری ذمہ داری کا اولین تقاضا ہے۔ میں پیچھے رہنے والا سپاہی نہیں ہوں..... ابھی شاید رزم گاہ میں جوہر دکھانے کا میرا وقت نہیں آیا۔ مجھے اُمید ہے کہ سلطان قونیا سے واپسی پر صلیبیوں کے خلاف بڑے معرکے میں مجھے ضرور لے کر جائے گا۔''

مارسی، قاسم کی بات سمجھ گئی۔ اُس نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور اپنے کہے پر معذرت کرنے لگی۔ قاسم بھی مسکرا دیا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد مارسی، قاسم کی آنکھوں سے آنکھیں نکال کر مڑی اور تیز قدموں سے چلتی ہوئی بگھی میں سوار ہو گئی۔

دوسرے دن سلطانی لشکر کوچ کر چکا تھا۔ جبکہ شہاب الدین پاشا چند دنوں میں ہی روانہ ہونے والا تھا۔ قاسم کے دل میں میدانِ جنگ سے دُور رہنے کا کچھ ملال تو پہلے ہی تھا۔ لیکن مارسی کی بات اُس کے دماغ میں نشتر کی طرح اتر گئی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ میدانِ جنگ میں صلیبی پہلوانوں کے پنجہ سے پنجہ لڑائے۔ لوہے سے لوہا ٹکرائے اور صلیبی بزدلوں پر یہ واضح کر دے کہ مکہ کے عرب آج بھی خالد بن ولیدؓ جیسی شجاعت اور قوت و جبروت کے مالک ہیں۔ لیکن اُسے ادرنہ میں رہنے کا حکم مل چکا تھا۔ وہ انہی خیالوں میں گم ینی چری کی خیام گاہ (کیمپ) کی روش پر چل رہا تھا۔ اُس کا ذہن ساتھ کے ساتھ اپنے اگلے منصوبوں پر بھی سوچ رہا تھا۔

اگلے چوک پر وہ رُک گیا اور ایک ثانیے کے توقف کے بعد بائیں جانب کی روش پر مُڑ گیا۔ وہ آغا حسن سے ملنے کے لئے جا رہا تھا۔ آغا حسن ینی چری کا دس ہزاری سالار تھا۔ تھا تو وہ بھی نومسلم لیکن ایمان کا پکا اور قول کا دھنی تھا۔ اب قاسم کا رُخ اُن فوجی بارکوں کی جانب تھا جو اینٹ اور گارے سے افسروں کے لئے بنوائی گئی تھی۔

قاسم، آغا حسن کے کمرے کے قریب پہنچا تو اُسے اندر سے قہقہوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ لگتا تھا اندر خوب گپ شپ ہو رہی تھی۔ قاسم رُکے بغیر آغا حسن کے کمرے میں داخل ہوتا چلا گیا۔ آغا حسن کا کمرہ ینی چری کے نوجوان افسروں سے بھرا پڑا تھا۔ یہاں

فرش پر سرکنڈوں کی صف بچھی ہوئی تھی اور دیواروں کے ساتھ تکیے رکھے تھے۔ قاسم داخل ہوا تو سب خاموش ہو گئے اور قاسم کے استقبال کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ قاسم نے سب سے بغل گیر ہونے کے دوران ہی کہا۔

''آج تو محفل کشت زعفران بنی ہوئی ہے۔ لگتا ہے آپ لوگوں کو تنخواہیں مل چکی ہیں۔''

قاسم کی بات سے سب قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ لیکن سالار ''امیر خان'' نے برجستہ جواب دیا۔ ''بھئی! اپنا تو یہی معسکر گھر بھی ہے اور دنیا بھی۔ اور یہاں تو ہمارا ہر روز روزِ عید ہے، ہر شب شبِ برات۔''

سب ایک بار پھر ہنس پڑے۔

امیر خان، ینی چری کے افسروں میں سب سے زیادہ ہنس مکھ اور برجستہ گو تھا۔ قاسم نے اندازہ لگایا کہ امیر خان کی بدولت ہی آج کی محفل گلنار رہی ہو گی۔ سب بیٹھ گئے تو کماندار اسلم خان نے کسی قدر خشک لہجے میں کہا۔

''حضور! تنخواہوں کی کیا بات آپ نے۔ سنا ہے بایزید یلدرم کے زمانے تک ینی چری کو خوب خوب تنخواہیں ملتی تھیں۔ اور ادرنہ کی عوام کے سامنے ینی چری کا بہت زیادہ مقام اور دبدبہ تھا۔ اب تو ینی چری کو نہریں کھودنے اور پُل تعمیر کرنے کے گھٹیا کام پر لگا دیا گیا ہے۔''

اسلم خان کی بات سے ایک دم محفل کا رنگ بدل گیا۔ آغا حسن سمیت کچھ افسروں کو یہ بات ناگوار لگی اور کچھ نے اسلم خان کی ہاں میں ہاں ملائی۔ قاسم اب تک ایک ماہر جاسوس ثابت ہو رہا تھا۔ اُس نے آتے ہی محفل سے ایسا سوال کیا تھا جس سے وہ ینی چری میں پھیلنے والی ممکنہ بغاوت کے بارے میں ابتدائی معلومات حاصل کر سکتا تھا۔ اسلم خان کی بات سے قاسم کا ماتھا ٹھنکا۔ اُس نے سادہ سے انداز میں دوسرا تیر پھینکا۔

''ارے دوستو! یہ تو بتاؤ، سلطان کے ہمراہ کون کون گیا ہے۔ اور شہاب الدین پاشا کے ہمراہ کون کون جا رہا ہے؟''

آغا حسن نے فوراً جواب دیا۔ ''سلطان کے ہمراہ صرف ینی چری کے پانچ ہزار سپاہی روانہ ہوئے ہیں۔ باقی تمام فوج جاگیردار سرداروں پر مشتمل ہے۔ اس پانچ ہزار کے لشکر کی کمان اپنا دوست ''ریاض بیگ'' کر رہا ہے۔ البتہ شہاب الدین کے ہمراہ ینی چری کے تیرہ سو دستے روانہ ہو رہے ہیں۔ ہراول میں، میں اور کماندار امیر خان جائیں گے۔ باقی سب لوگ جو یہاں بیٹھے ہیں، سوائے اسلم خان کے، قلب میں رہیں گے۔ میمنہ اور میسرہ

پر جاگیرداروں، سرداروں کو مقرر کیا گیا ہے۔ اور تیس ہزار پیدل سپاہیوں کی کمان سلطان کے بہنوئی ''محمد چلپی'' کے سپرد کی گئی ہے..... یہ تو ہے ہماری کیفیت۔ لیکن حیرت ہے کہ تمہارا نام کہیں دکھائی نہیں دیا۔''

آغا حسن نے شہاب الدین پاشا کی تفصیل بتائی اور آخر میں قاسم سے وہی سوال کر دیا جو مارسی نے کیا تھا۔ قاسم نے آغا حسن کے سوال کو نظر انداز کر دیا اور اسلم خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''لیکن اسلم خان کو کیوں روک دیا گیا یہاں؟''

اس سوال سے اسلم خان بوکھلا گیا۔ اُس نے کسی قدر ہکلاتے ہوئے کہا۔

''آ آ آپ..... اپنی بات گول کر گئے اور میری بات پوچھ رہے ہیں۔ پہلے آپ بتایئے کہ آپ کیوں رہ گئے ہیں ساتھ جانے سے؟''

اس سے پہلے کہ قاسم بولتا، سالار عبدالرحمٰن بول اُٹھا۔ ''میں بتاتا ہوں کہ قاسم بن ہشام کس لئے لشکروں کے ساتھ نہ جا سکا۔''

ساری محفل کونے میں بیٹھے ادھیڑ عمر سالار ''عبدالرحمٰن'' کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''سلطان نے قاسم کو ادرنہ میں رہ کر جنگ لڑنے کا حکم دیا ہے۔ سنا ہے یہاں قیصر کی کوئی خفیہ فوج موجود ہے۔''

عبدالرحمٰن کی بات سے اسلم خان اپنی جگہ پر پہلو بدل کر رہ گیا۔ اب اُس کی آنکھوں میں خفت تھی۔ اُس نے سمجھا تھا کہ قاسم نے ازخود کوچ سے جان چرائی ہوگی۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی اُلٹ تھا۔ عبدالرحمٰن کی اطلاع سے ساری محفل میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔

''خفیہ فوج؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ادرنہ سلطنت عثمانیہ کا دل ہے اور اگر یہاں بھی خفیہ فوج موجود ہے تو ہونیاڈے کے خلاف جا کے لڑنے کی کیا ضرورت ہے؟'' امیر خان نے ماتھے پر شکنیں ڈالتے ہوئے سوال کیا۔

اسلم نے فوراً امیر خان کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ''جی ہاں! اگر یہاں فوج ہے تو ہم سلطنت عثمانیہ کو سخت خطرات لاحق ہیں۔ ایسے عالم میں ادرنہ سے سلطان کی روانگی کیونکر درست ہوسکتی ہے۔''

اسلم کی بات کے دوران قاسم پوری طرح اسلم خان کی جانب متوجہ تھا۔ اسلم خان کی بات کے اختتام پر قاسم نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

''ہاں! تو آپ بتانے والے تھے کہ آپ لشکروں کے ساتھ کیوں روانہ نہ ہو سکے؟''

اب قاسم کے لہجے میں ہلکی سی چبھن بھی تھی جسے اسلم خان محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ گڑبڑا گیا اور ہچکچاتے ہوئے کہنے لگا۔

''دراصل میرے گھر میں بچہ ہونے والا ہے۔ جبکہ میرے گھر کی دیکھ بھال کرنے والا میرے سوا اور کوئی نہیں۔''

قاسم نے اسلم کی بات حیرت سے سنی اور فوراً کہا۔ ''تو کیا آپ معسکر کی اقامت گاہ میں نہیں رہتے جس طرح کہ دوسرے سالار رہتے ہیں؟ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ آپ شادی شدہ ہیں۔''

قاسم کی بات کا جواب ادھیڑ عمر عبدالرحمٰن نے دیا۔ ''دراصل ینی چری کے جو سپاہی یا سالار شادی کر لیتے ہیں تو انہیں چھاؤنی کے علاقے میں سلطان کی طرف سے مکان فراہم کیا جاتا ہے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ ہم سب پہلے غیر مسلم تھے۔ اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ ینی چری کے سپاہی زیادہ تر وہ قیدی ہیں جو سلطنت عثمانیہ نے مختلف صلیبی جنگوں میں قید کئے۔ اس لئے نہ یہاں ہمارا کوئی خاندان ہوتا ہے نہ ماں باپ اور بہن بھائی وغیرہ۔ تمہاری بات الگ ہے۔ ینی چری کی تاریخ میں تم پہلے شخص ہو جو نومسلم نہیں، بلکہ پیدائشی مسلمان ہو۔''

اس قدر معلومات تو قاسم کے پاس بھی نہیں تھیں۔ وہ تو کسی شک کی بناء پر اسلم کے بارے میں تحقیق کرنا چاہتا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ ینی چری کے بعض سالار ابوجعفر جیسے غداروں کے اشاروں پر ناچ رہے ہیں۔ اچانک قاسم کو کوئی خیال آیا اور اُس نے مصنوعی سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''اجی چھوڑیئے! آپ لوگ ایک رنگین محفل سجا کر بیٹھے ہیں۔ میں نے خواہ مخواہ آپ کے رنگ میں بھنگ ڈال دی۔ چھوڑیئے یہ باریک بینیاں اور مجھے بھی بتایئے کہ میرے آنے سے پہلے آپ لوگ کس بات پر ہنس رہے تھے؟''

قاسم نہیں چاہتا تھا کہ اسلم خان اُس کی جانب سے محتاط ہو۔ اور وہ اپنے شک کے سراغ پر مزید کام نہ کر سکے۔ قاسم کی بات سنتے ہی آغا حسن نے مسکرا کر کہا۔

''آپ کے آنے سے پہلے یہاں محفل مشاعرہ برپا تھی اور کماندار امیر خان اپنا چٹکلے دار شاعری کلام سنا رہے تھے۔''

قاسم نے سنا تو حیرت سے امیر خان کی جانب دیکھا اور شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اچھا! تو جناب شاعری بھی فرماتے ہیں۔ کچھ ہم بھی تو سنیں کہ آپ نے کیا کچھ لکھا

ہے۔"

امیر خان نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔ "اجی، شاعری کے کیا کہنے۔ ہمیں تو اُندلس میں ہونا چاہئے تھا۔ "الحمرا" کے دربار میں ہم اپنا کلام سناتے اور دیوانِ خاص کی شہزادیاں بالکونیوں سے ہم پر پھول نچھاور کرتیں۔"

امیر خان کی بات سے ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا اور کمرے کی فضا یکسر بدل گئی۔ اسی میں عبدالرحمٰن نے قاسم سے مخاطب ہو کر کہا۔

"قاسم بن ہشام! آپ تو عرب ہیں۔ کیا فارسی شاعری آپ کی سمجھ میں آئے گی؟"

"آپ سمجھ میں آنے کی بات کرتے ہیں۔ میں آپ کو فارسی کا شعر سناتا ہوں۔"

ساری محفل یک دم ہمہ تن گوش ہو گئی۔ قاسم زیرِ لب مسکرا رہا تھا۔ اُس نے کچھ دیر توقف کے بعد انتہائی خوبصورت ترنم سے اسلم خان کی جانب دیکھتے ہوئے فارسی کا ایک شعر سنایا۔

آں نہ من باشم کہ روزِ جنگ بینی پشتِ من
آں منم کاں درمیانِ خاک و خوں بینی سری

ترجمہ:۔ میں وہ نہیں کہ تو جنگ کے روز میری پشت دیکھے۔ میں تو وہ ہوں کہ تو میدانِ جنگ میں خاک و خون کے درمیان پڑا ہوا میرا سر دیکھے گا۔

قاسم کا شعر اس قدر خوبصورت تھا کہ آغا حسن کے کمرے میں واہ واہ کا شور مچ گیا شعر پڑھنے کے دوران قاسم کی نظریں اسلم خان پر جمی ہوئی تھیں۔ چنانچہ وہ بری طر جھینپ گیا۔ آغا حسن اور امیر خان، قاسم کا شعر سن کر وجد میں آ گئے تھے۔ انہوں نے قا سے پھر فرمائش کی کہ وہ اپنے شعر کو مکرر ارشاد کرے۔ قاسم نے مسکراتے ہوئے دوبارہ سنایا اور سب نے دوبارہ داد دی۔ اس مرتبہ داد دینے والوں میں اسلم خان بھی شامل تھا۔

ینی چری کے افسروں کی یہ محفل ابھی خوب گرم تھی کہ کمرے میں ایک ادھیڑ عمر شخ داخل ہوا۔ اس شخص کے چہرے پر موجود وقار اور دبدبہ دیکھ کر قاسم نے اندازہ لگایا کہ یقیناً ینی چری کا کوئی اعلیٰ سالار تھا۔ "یہ محمد چلپی" تھا۔ سلطان مراد خان کا بہنوئی اور شہا الدین پاشا کے لشکر میں تیس ہزار کی پیدل فوج کا سالار..... کمرے میں موجود ینی چ کے تمام افسر محمد چلپی کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ محمد چلپی مسکراتا ہوا کمرے میں دا ہوا اور سب کے ساتھ مصافحہ کرنے کے بعد آغا حسن کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ اُس نے ز پر بیٹھتے ہی تمام سالاروں اور کمانداروں سے مخاطب ہو کر کہا۔

"سپہ سالار شہاب الدین پاشا نے حکم دیا ہے کہ نئے مہینے کا چاند نظر آتے ہی دو شنبے کے روز ہمارے لشکر کو یورپ کی مہم کے لئے کوچ کرنا ہے۔ اُمید ہے آپ سب لوگ تیار ہوں گے۔ ہمارے کوچ میں صرف پانچ دن باقی ہیں۔ اس مرتبہ جو مہم ہمیں درپیش ہے یہ پچھلے تمام معرکوں سے مختلف ہے۔ ہم ہونیاڈے کی فوج کے خلاف لڑنے جا رہے ہیں، آپ کو معلوم ہو گا کہ پچھلے دنوں صوبہ ٹرانسلونیا میں "ہرمان اسٹاٹ" کے مقام پر ہونیاڈے نے ہمارے سالار "فرید پاشا" کو ناقابلِ فراموش شکست دی ہے۔ اُس نے درندگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ترک قیدیوں کو ہنگری کی دعوتوں اور ضیافتوں میں گاجر مولی کی طرح کاٹا اور قیدیوں کا ناروا خون بہایا ہے۔ ہمیں ہونیاڈے سے اپنے شہید سپاہیوں کا انتقام لینا ہے۔

ہونیاڈے کی شاندار کامیابی اور ہمارے دستوں کی پے در پے شکست نے پورے یورپ میں خوش فہمی کی لہر دوڑا دی ہے۔ اس وقت یورپ سے ترکوں کو نکالنے کے لئے ایک زبردست اتحاد قائم ہو چکا ہے۔ "شاہ لارڈ سلاس" جو اس وقت ہنگری اور پولینڈ دونوں مملکتوں کا فرمانروا ہے، اس تحریک کا روحِ رواں ہے۔ اس اتحاد میں ہنگری، پولینڈ، لاچیا اور بوسنیا کی حکومتیں اپنی پوری قوت کے ساتھ شریک ہیں۔ سربیا بھی جو لارڈ سٹیفن کے عہد میں عثمانیوں کا نہایت وفادار حلیف تھا اب اُس کے جانشین "جارج برنیک وچ" کی سرکردگی میں اتحادیوں کی صف میں شامل ہو گیا ہے۔ فرانس اور جرمنی نے بھی مبارزین کی ایک کثیر فوج بھیجی ہے۔ ان کے علاوہ عیسائی لشکر میں یورپ کے ہر ملک سے سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد خود آ کر شریک ہوئی ہے۔ اور اہم بات یہ ہے کہ عیسائی اس لشکر کو مقدس صلیبی لشکر قرار دے رہے ہیں۔ روما کے پوپ نے سب سے زیادہ جوش دکھایا ہے۔ اُس نے اپنے نمائندہ کارڈنیل "جولین سیزرانی" کو ایک مسلح فوج کے ساتھ روانہ کیا ہے۔ اور یورپ کے ہر حصہ سے اس جنگ کے لئے ایک کثیر رقم فراہم کر کے بھیجی ہے۔ حقیقتاً یہ ایک صلیبی جنگ ہے اور یاد رکھئے! یہ جنگ عیسائیت کے مذہبی جوش نے اسلام کے خلاف چھیڑی ہے۔ جمہوریہ وینس اور جمہوریہ جنیوا کے بحری بیڑے بھی عیسائی لشکر کی مدد کو آ پہنچے..... جبکہ بدقسمتی سے ابھی تک سلطنت عثمانیہ کے پاس بحری طاقت نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس لئے ہونیاڈے کا خیال ہے کہ ہمارے سلطان کی فوجیں ایشیائے کوچک سے جہاں وہ قونیا کے مقام پر "امیر کرمانیا" سے جنگ میں مصروف ہوں گی، یورپ میں منتقل نہ کی جا سکیں گی..... اتحادی افواج بظاہر شاہ لارڈ سلاس کے زیرِ کمان ہیں۔ لیکن درحقیقت ان کا سردار ہنگری کے سابقہ بادشاہ "سجمنڈ" کا ناجائز بیٹا "ہونیاڈے" ہے۔ جو اس وقت

مسیحی دنیا کا سب سے بڑا ہیرو خیال کیا جاتا ہے۔"

محمد چلپی کی زبان میں ایسی تاثیر تھی کہ کمرے میں موجود تمام سالار گم سم ہو گئے۔ محمد چلپی نے ہونیاڈے کے لشکر کا ایسا نقشہ کھینچا تھا کہ قاسم کو اُس کی عسکری مہارت اور قابلیت کا قائل ہونا پڑا۔ اس دوران اُسے معلوم ہو چکا تھا کہ جنگ کے موضوع پر گفتگو کرنے والا یہ جہاندیدہ اور باوقار شخص سلطان کا بہنوئی ہے۔

قاسم نے مؤدب لہجے میں محمد چلپی سے سوال کیا۔

"سالارِ محترم! اگر محاذ کی صورتحال اس قدر سنگین ہے تو سلطانِ معظم کو اسلامی افواج کی قیادت خود کرنا چاہئے تھی۔"

محمد چلپی نے چونک کر قاسم کی جانب دیکھا اور مشفقانہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ غالباً قاسم بن ہشام ہیں۔ آپ کی ذہانت اور شجاعت کا شہرہ قصرِ سلطانی میں پھیلا ہوا ہے۔ خیر بہرحال! آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ سلطانِ معظم خود لڑائی کی قیادت کریں گے۔ ہمارا اسّی ہزار کا لشکر تو محض ہراول دستے کی صورت میں آگے جا رہا ہے۔"

لیکن قاسم نے ایک خیال کے تحت پھر کہا۔ "سالارِ محترم! اگر سلطانِ معظم کی واپسی سے پہلے ہمارے لشکر کی ہونیاڈے کی افواج کے ساتھ مڈبھیڑ ہو گئی تو کیا ہماری افواج سلطانی لشکر کا انتظار کریں گی؟"

"نہیں! اگر ایسا ہوا تو ہم ڈٹ کر مقابلہ کریں گے اور انشاء اللہ سلطانِ معظم کے پہنچنے سے پہلے دشمن کا صفایا کر دیں گے۔" محمد چلپی کے لہجے میں عزم تھا۔ اُس نے گردن تان کر جواب دیا۔

اتنے میں آغا حسن نے سوال کیا۔ "سالارِ محترم! سنا ہے اندرنہ میں قیصر کے خطرناک جاسوس موجود ہیں جو سلطانِ معظم کے خلاف سازش کر رہے ہیں۔"

آغا حسن نے کہا تو سب سالار ہمہ تن گوش ہو گئے۔ محمد چلپی نے جواب دیا۔ "اس قسم کی اطلاعات میرے پاس بھی ہیں۔ لیکن ابھی کسی شخص پر گرفت نہیں کی جا سکتی۔ جہاں تک قیصر کا تعلق ہے تو قیصرِ قسطنطنیہ کو شروع دن سے مینڈھے لڑانے، ریچھ کتے اور تیتر بٹیر لڑانے کا بڑا شوق ہے۔ ظاہر ہے اس قسم کا شخص میدانِ جنگ میں سامنے آنے کی بجائے سازشوں کا سہارا ہی لے سکتا ہے..... ہم افواہوں پر قابو پا رہے ہیں اور سلطانِ معظم نے اس کی چھان بین کے لئے ماہر افراد مقرر کر دیئے ہیں۔"

غالباً محمد چلپی، قاسم کا فرضِ منصبی جانتا تھا۔ لیکن اُس نے سرِ محفل ذکر کرنا مناسب

سمجھا۔

آغا حسن کے کمرے میں دیر تک مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ نمازِ ظہر کا وقت ہو گیا۔ سلطان کا بہنوئی محمد چلپی اپنے سالاروں سے اجازت لے کر کسی جانب چل دیا۔ اور آغا حسن کے کمرے میں موجود تمام سالار نماز کی تیاری کے لئے نکل گئے۔ اب کمرے میں صرف آغا حسن اور قاسم موجود تھے۔ قاسم نے سالاروں کے نکل جانے کے بعد کچھ دیر توقف کیا اور پھر اُٹھ کر کمرے کے دروازے کو اندر سے بند کر کے کنڈی لگا دی۔ آغا حسن نے حیرت سے قاسم کو دروازہ بند کرتے دیکھا اور متجسسانہ انداز میں پوچھا۔

"کیا بات ہے قاسم! کافی سنجیدہ دکھائی دے رہے ہو؟"

قاسم نے آغا حسن کو اپنے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا اور کسی قدر مدھم آواز میں اُس کے ہمراہ مخاطب ہوا۔ "آغا!..... تمہیں اندازہ ہوا، کماندار اسلم نے میری تنخواہ والی بات پر کس قسم کا تبصرہ کیا تھا؟"

آغا حسن نے جواب دیا۔ "کیسا اندازہ؟ مجھے تو وہ بات بہت بری لگی تھی۔ ینی چری کے تمام سپاہی سلطان کے بیٹے ہیں۔ ہمیں تنخواہوں اور مال و دولت سے کچھ غرض نہیں۔ اسلم خان نے گھٹیا بات کی تھی جو میرے خیال میں سب کو بری لگی ہو گی۔ لیکن تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

آغا حسن صرف سپاہی تھا، سراغ رساں نہ تھا۔ اُس نے اسلم خان کی بات کو صرف سرسری طور پر لیا تھا۔ جبکہ قاسم، اسلم خان سے متعلق شک میں مبتلا تھا۔ اُسے ینی چری میں افواہیں پھیلانے والوں کی تلاش تھی۔ سلطان مراد خان ثانی واقعی ایک تجربہ کار سلطان تھا۔ اس نے شاہی سراغ رساں کے لئے قاسم بن ہشام کا انتخاب کر کے دانشمندی کا ثبوت دیا تھا۔ قاسم پہلے دن سے ہی ہر کسی شخص کو شک کی نگاہ سے دیکھنے لگا۔ اُس نے آغا حسن کی بات سنی اور منہ بسور لیا۔ اور تادیبی انداز میں کہنے لگا۔

"آغا! عقل کے ناخن لو۔ یہ بھی تو دیکھو کہ اسلم خان نے لشکروں کے ساتھ روانہ ہونے سے معذرت کر لی ہے۔ جبکہ سلطان کے خفیہ محکمے کا یہ کہنا ہے کہ سلطنت کے غدار سلطان کی عدم موجودگی میں اندرنہ کے اندر دنگا فساد کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بھی خبریں ہیں کہ ینی چری کے بعض سالار غداروں کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔"

قاسم نے آغا حسن کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ آغا حسن نے پُرتجسس نگاہوں سے قاسم کی

جانب دیکھا اور کہا۔

"یہ تو مجھے معلوم ہے کہ ہماری فوج میں کالی بھیڑیں موجود ہیں۔ لیکن اسلم خان کے بارے میں اس سے پہلے میں نے کبھی نہ سوچا تھا۔ تمہاری بات دل کو لگتی ہے۔ کیونکہ جہاں تک میرے علم میں ہے، اسلم خان کے گھر میں ابھی بچہ ہونے میں دیر ہے۔ وہ میرا دوست ہے۔ چند دن پہلے تک اُس نے مجھے بتایا تھا کہ اللہ رب العزت اُسے ماہِ شوال میں پہلے بچے کا باپ بنانے والا ہے۔ آج جب اُس نے اپنا عذر بتایا تو مجھے بھی قدرے حیرت ہوئی۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ایک سپاہی کو میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہونے سے کبھی معذور نہ ہونا چاہئے، چاہے وجہ کچھ بھی ہو۔"

قاسم نے اطمینان کا سانس لیا۔ گویا اسلم خان پر اُس کا شک درست تھا۔ اُس نے کہنے کے لئے منہ کھولا لیکن یکلخت کسی وجہ سے خاموش ہو گیا۔ اُس کی نگاہیں تیزی سے کمرے کے بند دروازے کی طرف اُٹھیں۔ اُس کی چھٹی حس بیدار ہو چکی تھیں۔ قاسم کی نگاہوں کی چمک دیکھ کر آغا حسن بھی متجسس ہو گیا۔ قاسم نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر آغا حسن کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اب وہ دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ دروازے کے قریب پہنچا اور اُس نے بے آواز طریقے سے دروازے کی کنڈی ہٹا دی۔ اگلے لمحے اُس نے یکلخت دروازے کے دونوں پٹ جھٹکے سے کھول دیئے۔ دروازہ کھلنے کے ساتھ ہی دھڑام کی آواز سنائی دی اور نئی چڑی کا ایک نوجوان سپاہی اندر کمرے میں آ گرا۔ وہ غالباً دروازے کے ساتھ کان ٹکا کر آغا حسن اور قاسم کی باتیں سننے کی کوشش کر رہا تھا۔

قاسم اور آغا حسن نے بجلی کی تیزی سے اپنی شمشیریں بے نیام کر لیں۔ قاسم نے ہوا میں لہرائی اور آگے بڑھ کر دروازے کی کنڈی پھر لگا دی۔ یہ ایک سراغ رساں کی حیثیت سے اُس کا پہلا معرکہ تھا۔ نئی چڑی کا نوجوان سپاہی قاسم اور آغا حسن کی تلوار دیکھ کر بوکھلا گیا تھا۔ اُس کے چہرے پر موت کی زردی چھانے لگی اور وہ گڑگڑانے لگا۔ قاسم نے تلوار کی نوک اُس کی گردن پر رکھ دی اور اُسے پیچھے کی طرف دھکیل کر دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ قاسم نے شیش ناگ کی طرح پھنکارتے ہوئے اس نوجوان سے سوال کیا۔

"تم ہماری باتیں کیوں سن رہے تھے؟..... کون ہو تم؟ اور کس کے کہنے پر جاسوسی کر رہے ہو؟"

نوجوان کا حلق خشک ہو چکا تھا۔ اُس نے ایک خشک گھونٹ لے کر زبان تر کرنے کی

کوشش کی۔ اتنے میں آغا حسن جو نوجوان کو غور سے دیکھ رہا تھا، بول اُٹھا۔ "یہ نئی چڑی کے بائیسویں دستے کا ایک نیا سپاہی ہے۔ اور اسلم خان کی کمان میں لڑتا ہے۔"

آغا حسن کی بات پر قاسم نے معنی خیز نظروں سے آغا حسن کی جانب دیکھا اور پھر نوجوان سے سوال کیا۔ "کیا نام ہے تمہارا؟"

"ت..... تر..... ترک با..... ترکباز....." نوجوان نے خوف سے ہکلاتے ہوئے نام بتایا۔

"تمہیں ہماری باتیں سننے کے لئے کس نے بھیجا ہے؟" قاسم نے پوچھا۔

لیکن وہ خاموش رہا۔ قاسم نے تلوار کا دباؤ بڑھا دیا۔ ترک باز کی آنکھیں اُبلنے لگیں۔ اُس کی نرغٹ سے ذبح ہوتے بکرے جیسی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔

قاسم نے اپنا سوال دہرایا۔ "بتاؤ، تمہیں کس نے بھیجا ہے؟ اگر نہیں بتاؤ گے تو یاد رکھو! میں تمہارے ہاتھ پیر کاٹ کر تمہیں شہر کے چوراہے پر پھینک دوں گا۔"

مارے دہشت کے ترک باز کا رنگ خزاں رسیدہ پتے جیسا ہو چکا تھا۔ وہ پھر بھی کچھ نہ بولا۔ وہ شاید کسی کا نام نہ لینا چاہتا تھا۔ قاسم نے جب دیکھا کہ ترک باز سیدھی طرح نہیں بتائے گا تو اُس نے آغا حسن کو ترک باز کے ہاتھ پیر باندھنے کے لئے کہا۔

آغا حسن نے اپنی تلوار رکھی اور کمرے میں رکھے صندوق سے رسّی نکال لایا۔ کچھ دیر بعد ترک باز ہاتھوں پیروں سے بندھا کمرے کے فرش پر پڑا کانپ رہا تھا۔ اب آغا حسن اور قاسم اُس کے قریب بیٹھے تھے اور قاسم نے کہا۔

"دیکھو، تم سیدھی طرح سے بتا دو کہ تمہیں کس نے بھیجا ہے، ورنہ تم جانتے ہو کہ ہم تمہاری ایک ایک بوٹی الگ کر دیں گے۔"

اتنا کہنے کے ساتھ ہی قاسم نے اپنی تلوار سے اُس کے کندھے پر چرکہ لگایا۔ اُس کی قمیض پھٹ گئی اور اُس کے کندھے سے فرفر خون بہنے لگا۔ اب وہ پوری طرح خوفزدہ ہو چکا تھا۔ اُس نے موت کے خوف سے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

"م..... مجھے..... اُس..... اُس..... وَدی..... اُس وَدی نے بھے..... بھے بھیجا ہے، ر..... میں....."

اچانک کمرے کے روشندان سے ایک تیر آیا اور ترک باز کے حلق میں اُتر گیا.....!

کچھ لمحے تو آغا حسن اور قاسم کو سمجھ ہی نہ آئی کہ کیا ہوا۔ ترک باز خون میں لت پت ہو رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے اور آنکھیں اپنے حلقوں سے ابھر رہی تھیں..... وہ مر رہا تھا۔ تیر اُس کی گردن پر حلق کے مقام پر پیوست ہوا تھا۔

جونہی معاملہ قاسم کی سمجھ میں آیا، اُس نے بجلی کی رفتار سے جست لگائی اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلتا چلا گیا۔ اب وہ بیرکوں کے آگے بنے برآمدے میں دوڑ رہا تھا۔ اُس کا رُخ عمارت کے آخری کونے کی جانب تھا جہاں چھت پر جانے کے لئے مٹی کے زینے بنائے گئے تھے۔ قاسم برق رفتاری سے زینے پھلانگتا چلا گیا۔ اُس کے عقب میں آغا حسن کے دوڑنے کی آواز بھی آ رہی تھی۔ لیکن اُس نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ وہ چند ثانیے بعد عمارت کی چھت پر تھا۔ لیکن یہاں آ کر اُسے مایوسی ہوئی۔ ترک باز کو قتل کرنے والا چھلاوہ دوسری جانب سے چھلانگ لگا کر غالباً چھت سے کود گیا تھا۔ قاسم نے آغا حسن کو چھت پر آتے دیکھا تو چیخ کر کہا۔

''بھاگو! یہاں نہیں ہے..... پرلی طرف..... جھاڑیوں کی طرف دیکھو۔ وہ چھت سے کود گیا ہے۔''

قاسم خود بھی اُلٹے پاؤں بھاگا اور کسی آندھی کی طرح عمارت کی شمالی سمت میں دوڑا دی۔ لیکن یہاں آ کر بھی آغا حسن اور قاسم کو مایوسی ہوئی۔ دشمن نکل چکا تھا۔ قاسم اور آغا حسن ایک پورے دستے کے ہمراہ شام تک معسکر کا سارا علاقہ چھانتے رہے لیکن ترک باز کا قاتل ایسے غائب ہو چکا تھا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ وہ مغرب کے بعد کمرے میں لوٹے تو قاسم نے کہا۔

''ترک باز کی لاش کا کیا، کیا ہے؟''

''اُسے خفیہ محکمے کا سربراہ بہرام خان اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ ہم جس وقت قاتل کو تلاش کر رہے تھے، بہرام خان یہاں اپنی کارروائی مکمل کر رہا تھا۔'' آغا حسن نے جواب دیا۔ اور قاسم نے ایک لمبی .....ہوں کی۔

قاسم نے پھر پوچھا۔ ''اچھا یہ بتاؤ، تمہاری سمجھ میں کچھ آیا کہ یہ ''اَسودی'' کون ہے؟ ترک باز نے مرنے سے پہلے اسودی کا نام لیا تھا۔''

''نہیں! مجھے بھی معلوم نہیں۔ وہ جب اٹک اٹک کر..... اَس، اَس کہہ رہا تھا تو میں سمجھا تھا کہ اسلم خان کہنا چاہتا ہے۔ لیکن اس نے اَسودی کہہ دیا..... معلوم نہیں یہ اَسودی کون ہے؟'' آغا حسن کے چہرے پر گہرے غور و فکر کا تاثر تھا۔ قاسم نے کسی خیال کے تحت آغا حسن سے کہا۔

''آغا! تم اسلم کی کمان میں کام کرنے والے کسی اور سپاہی کو بلاؤ۔ ہوسکتا ہے اسلم کے ماتحت اُسے اَسودی کہہ کر پکارتے ہوں۔ کیونکہ عموماً فوج کے سپاہی اپنے سالاروں کے

ی من پسند نام رکھ لیتے ہیں۔ اسلم کے چہرے کی رنگت سیاہ ہے۔ ہوسکتا ہے اُس کے ماتحت اُس کو سیاہ رنگ کی وجہ سے اسودی کہہ کر پکارتے ہوں۔''

قاسم کی بات سے آغا حسن چونک گیا اور اُس نے تحسین آمیز انداز میں قاسم کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''بخدا! تم بہت زیادہ ذہین ہو۔ تمہیں تو خفیہ محکمے کا سربراہ یا پھر شاہی سراغ رساں ہونا چاہئے۔ تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ اسلم خان کا نام اُس کے ماتحتوں نے نہیں رکھا بلکہ ایک موقع پر سلطان نے اُسے اسودی کہہ کر پکارا تھا۔ تب سے اسلم اپنے نام کے ساتھ کبھی کبھی اسودی کا لقب لکھ دیتا ہے۔ لیکن کمال ہے مجھے پہلے یہ بات کیوں نہ یاد آئی۔ دراصل قاتل کے تعاقب نے میرا دماغ ماؤف کر رکھا تھا۔'' آغا حسن نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے پُرجوش لہجے میں بات کی۔ قاسم کی حالت بھی عجیب تھی۔ ایک بہت اہم سراغ اُس کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ اُس نے کسی قدر ٹھہرے ہوئے لہجے میں آغا حسن سے کہا۔

''آغا!..... دھیان رہے ابھی اسلم خان کو خبر نہ ہونے پائے۔ میں اُس پر کسی خاص ترتیب سے ہاتھ ڈالنا چاہتا ہوں۔'' قاسم نے کہا تو آغا حسن کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔

''ہاتھ ڈالنا چاہتے ہو؟ کیا مطلب؟ تم کس حیثیت سے ہاتھ ڈالو گے؟''

اب قاسم کو احساس ہوا کہ اُسے آغا حسن کے سامنے اسلم خان پر ہاتھ ڈالنے کی بات نہ کرنا چاہئے تھی۔ لیکن اب وہ کر چکا تھا چنانچہ اُس نے جھوٹ پہ جھوٹ بولنے کی بجائے آغا حسن جیسے مجاہد سپاہی کو اعتماد میں لینا مناسب سمجھا اور کہا۔

''دراصل سلطان نے مجھے وقتی طور پر سراغ رسانی کے کام پر متعین کیا ہے۔ مجھے اس سلسلے میں تمہارا تعاون درکار ہے۔ میری نظر پہلے سے کچھ لوگوں پر ہے، لیکن کوئی واضح ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے میں ابھی تک کسی پر ہاتھ نہیں ڈال سکا۔ اب پہلی مرتبہ میرے ہاتھ اس سازش کا ایک سرا آیا ہے۔ میں اسلم خان اسودی کو بے خبری میں گرفتار کرنا چاہتا ہوں۔''

قاسم کے نئے فرائض سن کر آغا حسن کو کچھ زیادہ حیرت نہ ہوئی، بلکہ وہ کسی حد تک مطمئن لگا ہوا۔ اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اسلم خان اسودی کو تو پتہ چل چکا ہوگا کہ اس کے بھیجے ہوئے سپاہی نے مرتے وقت اسودی کا لفظ ادا کر لیا تھا۔''

آغا حسن کی بات بالکل ٹھیک تھی۔ قاسم نے ایک لمحے کے لئے سوچا اور پھر کہا۔ ''میرا خیال ہے جب تک اسلم خان کو یہ یقین ہے کہ ہمارے ہاتھ اُسے پکڑنے کے لئے کوئی

ثبوت نہیں آیا وہ فرار ہونے کی کوشش نہیں کرے گا اور اس سے پہلے کہ وہ فرار ہو، میں اُس
کی گردن دبوچ لوں گا۔"
معاً کسی خیال کے تحت قاسم نے پھر کہا۔ "آغا! کیا تمہیں اسلم خان اسودی کی رہائش
کا پتہ معلوم ہے؟"
"کیا مطلب؟..... تم کہیں آج رات ہی اُسے پکڑنا تو نہیں چاہتے؟" آغا حسن نے
تجسس سے کہا۔
قاسم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "بے شک! میں نیکی کے کام میں دیر کرنے کا قائل
نہیں ہوں۔ میں آج ہی اُس غدار پر صاعقہ بن کر ٹوٹ پڑوں گا۔ مجھے اُس دشمن ملک
ملت سے قیصر کے تمام جاسوسوں کے نام اُگلوانے ہیں۔"
آغا حسن پورے تجسس اور دلچسپی سے قاسم کی بات سن رہا تھا۔ اُس نے فوراً کہا۔
"ٹھیک ہے۔ میں بھی تمہارے ہمراہ چلوں گا۔"
"صرف تم ہی نہیں، ہم کماندار امیر خان کو بھی لے چلیں گے۔ ہوسکتا ہے اسلم
مدافعت کرے یا اُس کے کچھ سپاہی اُس کی حفاظت پر مامور ہوں۔"
اس کے بعد دیر تک قاسم اور آغا حسن اپنے آئندہ لائحہ عمل پر بات چیت کرتے رہے
یہاں تک کہ رات ہوگئی۔ قاسم نے اٹھتے ہوئے کہا۔
"ہم آدھی رات کے وقت اپنے منصوبے پر عمل درآمد کے لئے روانہ ہوں گے۔
اچھا ہوا کہ تمہیں اسلم خان کے گھر کا پتہ معلوم ہے..... اب تمہارے ذمے صرف یہ
ہے کہ امیر خان کو واردات کا لائحہ عمل سمجھا کر رات کے پہلے پہر فوجی چھاؤنی
دروازے پر لے آؤ۔"
قاسم نے آغا حسن کو اُس کی ذمہ داری سمجھائی۔ قاسم کی ہر بات پر آغا حسن
میں سر ہلاتا رہا۔ تمام معاملات طے کرنے کے بعد قاسم، آغا حسن سے اجازت لے
کی جانب چل دیا۔
رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ اور نہ کی فوجی چھاؤنی کے علاقہ میں افسر
رہائش گاہوں کے نزدیک تین گھڑ سوار سائے دکھائی دیئے۔ یہ اُن افسروں کی رہائش
تھیں جو شادی شدہ تھے۔ ان رہائش گاہوں کی پچھلی جانب شہتوت کے بہت سے
درخت تھے جہاں دن بھر افسروں کے بچے شہتوت چنتے نظر آتے۔ تینوں گھڑ سوار
شہتوت کے درختوں کے پاس پہنچ کر رُک گئے۔ یہاں تاریکی اور زیادہ گہری تھی۔

گھوڑوں سے اُترے اور گھوڑوں کو شہتوت کے درختوں کے ساتھ باندھ دیا۔ اب تینوں
سائے عمارتوں کی جانب بڑھ رہے تھے۔
عمارتوں کی تیسری رو میں پہلا مکان اسلم خان کا تھا۔ تینوں سائے اُسی جانب جاتے
ئے نظر آئے۔ وہ اسلم خان کے مکان کے قریب پہنچے تو رُک گئے۔ یہ پکی اینٹوں کا بنا
چھوٹا سا مکان تھا جس کا بیرونی دروازہ گلی کی جانب سے چودہ فٹ بلند تھا۔ عقبی
ب مکان کے کمروں کی پچھلی دیوار تھی۔ امیر خان کا سایہ مکان کی عقبی جانب چلا گیا۔
احسن اور قاسم دروازے کی جانب بڑھ گئے۔ یخی چڑی کے ان تینوں افسروں نے اپنے
ہوں پر ڈھاٹے باندھ رکھے تھے۔ وہ چیتے کی طرح چالاکی سے چلتے ہوئے مکان کے
ازے کے قریب آئے اور دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔ اب وہ مکان
اندر کسی قسم کی آہٹ سننے کی کوشش کر رہے تھے۔ کافی دیر تک دروازے سے کان
ئے رکھنے کے بعد قاسم کو یقین ہوگیا کہ اسلم خان اور اُس کے اہل خانہ خواب خرگوش
مزے لے رہے ہیں۔ اگلے لمحے وہ چھپکلی کی طرح دروازے سے چپک کر اوپر چڑھنے
کوشش کر رہا تھا۔ قاسم آہٹ پیدا کئے بغیر دیوار کے سرے پر پہنچ گیا۔ اُس کے بدن پر
ے رنگ کا لباس تھا۔ کمر پر باندھی ہوئی کپڑے کی پٹی میں دو عدد خطرناک خنجر اُڑسے
ئے تھے۔ دائیں کولہے کے ساتھ خالی نیام لٹک رہا تھا۔ کیونکہ تلوار قاسم کے دانتوں میں
ہوئی تھی۔ اُس کی پشت پر تیروں سے بھرا ترکش اور میان جھول رہی تھی۔ قاسم خاموشی
پرلی جانب اترنے لگا۔ آغا حسن باہر گلی میں کھڑا اسلم خان کے گھر کا دروازہ کھلنے کا
کر رہا تھا۔ قاسم نے انتہائی احتیاط سے آواز پیدا کئے بغیر اندر سے دروازہ کھولا اور آغا
کو بھی اندر بلا لیا۔
اُدھر امیر خان نے کمال پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ مکان کی عقبی دیوار میں موجود
لاخ کے رخنوں میں ہاتھ اور پاؤں کی اُنگلیاں پھنساتا کسی چھپکلی کی طرح مکان کی چھت
گیا۔ چھت پر پہنچ کر امیر خان درمیان میں چلنے کی بجائے ایک طرف دیوار ہی
ملی کی سی چال چلتا ہوا صحن میں اترتے ہوئے زینوں تک جا پہنچا۔ یہاں سے گھر
یک صحن نظر آ رہا تھا۔ امیر خان سب سے اوپر والے زینے پر دیوار کی اوٹ میں
رہ گیا۔ یہاں سے اُسے آغا حسن اور قاسم کی کارروائی پر نظر رکھنا تھی۔
م اور آغا حسن بیرونی دروازے سے اندر داخل ہوئے تو سب سے پہلے مکان کا
مکان کے صحن میں شہتوت کا ایک بہت بڑا درخت لگا ہوا تھا جس کا سایہ رات کی

تاریکی میں کسی بھوت کی طرح دیواروں پر پڑ رہا تھا۔ آج چاندنی رات تو تھی لیکن چاند
کئی منزلیں طے کرتا ہوا سورج کے تعاقب میں شفق پار چھلانگ لگانے والا تھا۔ قاسم
آغا حسن بڑھ کر برآمدے میں داخل ہو گئے۔ یہاں تاریکی تھی اور مکان کے دونوں کمر
کے دروازے اندر سے بند تھے۔ قاسم اور آغا حسن نے الگ الگ دروازوں پر کان لگا
اور اندر کسی قسم کی آہٹ محسوس کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن کمروں میں بلا کی خام
تھی۔ قاسم کو کچھ غیر قدرتی سا لگا۔ لیکن وہ نہ سمجھ سکا۔ بالآخر اُس نے دروازے پر دباؤ
تو یہ جان کر اُس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ دروازہ کھلا تھا۔ اُس نے چونک کر ہاتھ ہٹا
اور آغا حسن کو ہاتھ کے اشارے سے اپنے قریب بلا لیا۔ دونوں بے حد احتیاط کر
تھے۔ آغا حسن قریب آیا تو قاسم نے اُسے باہر رُکنے کا اشارہ کیا اور خود تاریک کمرے
داخل ہونے کے لئے دروازے کو یکلخت چوپٹ کھول دیا۔

اگلے لمحے وہ کمرے کے اندر تھا۔ لیکن اپنے اندر داخل ہوتے ہی گویا اُس پر
ٹوٹ پڑی۔ کسی نے تلوار کا بھرپور وار کر کے اُس کی گردن تن سے جدا کر دینا چاہی۔
نہ جانے وہ کون سی طاقت تھی جس نے دل سے قاسم کو چھلانگ لگا دینے پر آمادہ کیا۔
اُچھل کر ایک جانب ہوا اور اندھیرے میں موجود دشمن کا وار خالی چلا گیا۔

اب قاسم سنبھل چکا تھا۔ لہٰذا اُس نے دشمن کا دوسرا وار تلوار کی چمک کو دیکھ کر اپنی
پر روکا۔ لوہے سے لوہا ٹکرایا اور ٹن کی آواز پیدا ہوئی۔ لیکن اُسے یہ جان کر بے پناہ
ہوئی کہ برآمدے سے بھی ٹن ٹن کی آواز آ رہی تھی۔ گویا دشمن صرف اکیلا نہیں تھا بلکہ
کوئی ساتھی بھی باہر کہیں چھپا ہوا تھا جو آغا حسن پر حملہ آور ہوا تھا۔ اس کا مطلب
کہ اسلم خان اور اُس کے ساتھی پہلے سے گھات لگا کر بیٹھے تھے۔ قاسم اندھیرے
ان دیکھے دشمن کے وار روکتا رہا۔ اور پھر اچانک اُس نے ایک زبردست داؤ کھیلا۔
ایک دم اپنا پیر پھسلایا اور زمین پر گر گیا۔ اگلے لمحے وہ پھسلتا ہوا مدمقابل کی ٹانگوں
ٹکرایا تھا۔ مدمقابل اوندھے منہ نیچے آ رہا۔ قاسم نے لیٹے لیٹے اپنی تلوار کا رُخ
جانب کر دیا۔ مدمقابل تلوار پر گرا اور تلوار اُس کے پیٹ سے آر پار ہو گئی۔ فضا ایک
چیخ سے گونجی اور مدمقابل کے پیٹ سے خون کے فوارے چھوٹ پڑے۔ قاسم
کر تیزی سے اٹھا اور باہر کی جانب تیزی سے لپکا۔ لیکن یہاں آغا حسن پہلے ہی
گردن کاٹ چکا تھا۔ آغا حسن اور قاسم کو اچانک سیڑھیوں پر دوڑتے ہوئے قد
آواز سنائی دی۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد دو تلواریں ٹکرانے کی آواز آنے لگی۔ گویا امیر

بھیڑ بھی دشمن سے ہو چکی تھی۔ آغا حسن اور قاسم زینے کی جانب دوڑے، لیکن اس سے
پہلے کہ وہ زینے پھلانگتے، اوپر سے کوئی گٹھڑی سی لڑھکتی ہوئی نیچے آنے لگی۔ گٹھڑی قاسم
کے پیروں میں آ کر رُکنے کی بجائے ایک دم اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ آغا حسن نے چاند کی
روشنی میں پہچانا، یہ اسلم خان تھا۔ اُس کی تلوار گر چکی تھی اور وہ زینوں سے لڑھک کر صحیح
سالم بچ گیا تھا۔ قاسم نے اپنی تلوار سیدھی کی اور اسلم خان کی ٹھوڑی پر ٹکا دی۔ اسلم نے
جرأت کر کے خاصی بلند آواز میں کہا۔

"کک..... کون ہو تم لوگ؟ اور کیا چاہتے ہو مجھ سے؟"

اسلم نے آواز نکالی تو قاسم نے تلوار کا دباؤ بڑھا دیا اور سانپ کی طرح پھنکارتے
ہوئے کہا۔

"تم ہمیں اچھی طرح پہچانتے ہو اسلم خان! ہم اسلام کے غداروں کی موت ہیں۔ تم
اگر کچھ رعایت چاہتے ہو تو یاد رکھو کہ تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ تم سب کچھ اُگل دو۔"

"کک..... کیا اُگل دوں؟..... مم..... مجھے کچھ معلوم نہیں۔ تم لوگوں نے مجھے کچھ کہا تو
خود بھی بچ نہ سکو گے۔ تم بنی چری کے ایک سالار پر ہاتھ اٹھا رہے ہو۔" اب اسلم خان کا
حوصلہ بحال ہو رہا تھا۔

اچانک قاسم نے اسلم کی ٹھوڑی سے تلوار پیچھے ہٹا لی۔ اسلم نے حیرت سے قاسم کی
جانب دیکھا۔ لیکن اگلے لمحے اُس کی دردناک چیخ نے پوری فضا کو چیر دیا۔ قاسم نے پوری
کی پوری تلوار اُس کی دائیں ران میں گھونپ دی تھی۔ تکلیف کی شدت سے اُس کی چیخ
بہت بلند آواز میں پیدا ہوئی۔ یقیناً آس پاس کے مکانوں میں سنی گئی ہو گی۔ اب قاسم اور
آغا حسن کو جو کچھ بھی کرنا تھا، آناً فاناً کرنا تھا۔ امیر خان ابھی تک چھت پر ہی تھا۔ اُس
نے ایک اچھے سپاہی کی طرح اپنی طے شدہ جگہ نہ چھوڑی تھی۔ قاسم نے اسلم کی ران میں
تلوار گھونپی، لیکن واپس نہ کھینچی۔ اسلم تکلیف کی شدت سے زمین پر گر چکا تھا۔ وہ اور بھی
چیختا، لیکن آغا حسن نے آگے بڑھ کر اُس کا منہ ہاتھ سے بھینچ کر بند کر دیا تھا۔ قاسم خونخوار
انداز سے اسلم کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

"اسلم خان! زندگی سے زیادہ قیمتی کوئی چیز نہیں، خصوصاً تمہارے جیسے غداروں کے
لئے۔ تم اگر جینا چاہتے ہو تو سچ سچ بتاؤ کہ تمہارا آدمی ہماری باتیں کیوں سن رہا تھا؟..... یہ
بھی بتاؤ کہ ابوجعفر کے ساتھ تمہارا کیا تعلق ہے؟ اور بنی چری میں تمہارے علاوہ اور کون
کون سے لوگ قیصر کے جاسوس ہیں؟..... اور یاد رکھو، کہ اب چیختا مت ورنہ اب کی بار

میں تمہارے کان کاٹ دُوں گا۔"

قاسم کے لہجے میں بے پناہ سفاکی اور بے رحمی تھی۔ اسلم تو درکنار، قاسم کی آواز سے آغا حسن بھی کانپ اٹھا۔ آغا حسن قاسم کے اشارے پر اسلم کے منہ پر سے ہاتھ ہٹا چکا تھا۔ اسلم قاسم کی سفاکی سے اس قدر خوفزدہ ہوا کہ بے پناہ درد کے باوجود زبان سے خاموش رہا۔ قاسم کے دوبارہ پوچھنے پر وہ طوطے کی طرح بولنے لگا۔ اُس نے بتایا کہ ابوجعفر درحقیقت قیصر کا جاسوس ہے اور سلطنت عثمانیہ کی تباہی کے غرض سے ادرنہ میں مقیم ہے۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ ابوجعفر نے نئی چری میں اپنی سازش کا جال بچھا رکھا ہے۔ لیکن وہ نئی چری میں موجود قیصر کے جاسوسوں کے مکمل نام نہ بتا سکا۔ اُس نے ایک سالار کا نام لیا ہی تھا کہ اُس کی گردن ڈھلک گئی۔ وہ شاید بے ہوش ہو چکا تھا۔ اتنے میں چھت پر سے امیر خان نے تیز سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

"ساتھ کے مکان میں ہلچل سی دکھائی دے رہی ہے۔ آپ لوگ جلدی سے اپنا کام نمٹانے کی کوشش کیجئے۔"

قاسم نے مایوسی سے بے ہوش اسلم کی جانب دیکھا اور اگلے لمحے بے رحمی سے اپنی تلوار واپس کھینچ لی۔ اسلم بے ہوشی کے عالم میں تڑپا، لیکن اُس نے آنکھیں نہ کھولیں۔ قاسم نے اسلم کو وہیں پڑے ہوئے چھوڑا اور آغا حسن کو اوپر امیر خان کے پاس جانے کی ہدایت کرتا ہوا خود مکان کے دوسرے بند دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ قاسم کے اندازے کے مطابق یہاں اسلم کی بیوی بند تھی۔ وہ کمرے کے دروازے پر پہنچا اور دروازے کو دھکیل کر کھولنے کی کوشش کی۔ قاسم نے دیا سلائی جلائی اور برآمدے کی دیوار میں لٹکی مشعل کو روشن کر دیا۔ اب مشعل قاسم کے ہاتھ میں تھی۔ اُس نے بائیں کندھے کے زور سے دروازے کو توڑنے کی کوشش کی۔ اور کچھ ہی دیر میں کڑاک کی آواز سے دروازہ ٹوٹ گیا۔ لیکن اُسے کمرے میں داخل ہونا نصیب نہ ہوا۔ نہ جانے زینوں کے پاس بے ہوش لیٹا ہوا اسلم خان کب ہوش میں آیا اور زمین پر گھسٹتے ہوئے کب قاسم کے عقب میں پہنچ گیا۔ اب اُس کے ہاتھ میں ایک لمبا خنجر چمک رہا تھا۔ قاسم نے جونہی دروازے کے پٹ کو توڑا اسلم نے آدھا دھڑ اوپر اٹھاتے ہوئے قاسم کی پشت پر خنجر کا وار کر دیا۔ بالکل آخری وقت میں قاسم کو اپنے پیچھے حرکت کی آواز سنائی دی اور وہ تیزی سے مڑا۔ لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ اسلم خان کا خنجر قاسم کے دائیں پہلو پر پڑا اور اُس کے کولہے کا گوشت چیرتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔ اس طرح گویا اسلم خان نے اپنے زخم کا بدلہ لے لیا تھا۔ قاسم کی

زوردار سسکی بلند ہوئی۔ لیکن وہ اپنی جگہ پر ثابت قدم رہا۔ اُس کے ہاتھ سے مشعل گر چکی تھی۔ لیکن مشعل کی روشنی بدستور قاسم اور اسلم پر پڑ رہی تھی۔ قاسم نے اپنے زخم کی پرواہ نہ کرتے ہوئے پوری قوت سے تلوار گھمائی اور اسلم خان کا سر کٹ کر کمرے کے اندر جا گرا۔ مشعل کی روشنی اندر تک جا رہی تھی۔ اسلم کا کٹا ہوا سر کمرے میں لڑھکتا ہوا چلا گیا۔ اور پھر اگلے کمرے سے ایک نسوانی چیخ بلند ہوئی۔ یہ اسلم کی بیوی کی چیخ تھی۔

قاسم نے گری ہوئی مشعل اٹھائی اور کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔ مشعل کی روشنی میں اُس نے دیکھا کہ کمرے میں ایک خاتون موجود تھی جس کا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا اور اُس کے پیروں میں ایک ہلکی سی تلوار پڑی تھی۔ غالباً یہ تلوار اسلم نے اپنی بیوی کو حفاظت کے لئے دی تھی۔ لیکن وہ کمزور دل خاتون اُسے استعمال نہ کر سکی اور مارے ڈر کے نیچے پھینک دی۔ اسلم کی بیوی نے اپنے خاوند کا کٹا ہوا سر دیکھا تو اُس کا دماغی توازن ٹھکانے نہ رہا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کچھ دیر نقاب پوش قاسم کی جانب دیکھتی رہی اور پھر یکلخت اُس نے اپنے سامنے پڑی تلوار دونوں ہاتھوں سے اٹھا لی اور کسی پاگل درندے کی طرح قاسم پر حملہ کرنے کے لئے دوڑی۔ قاسم نے دو قدم پیچھے ہٹ کر اُس اناڑی خاتون کی تلوار پر اپنی تلوار سے وار کیا تو اُس کی تلوار اُس کے ہاتھ سے نکل کر دیوار سے جا ٹکرائی۔ اتنی دیر میں باہر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ یہ آغا حسن تھا جو قاسم کو یہ بتانے کے لئے آیا تھا کہ کچھ مسلح افراد مکان کو سامنے کی جانب سے گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ قاسم نے سنا تو بجلی کی تیزی سے باہر کی جانب جست لگائی اور کسی چھلاوے کی طرح تین تین زینے پھلانگتا مکان کی چھت پر جا پہنچا۔ آغا حسن بھی اُس کے عقب میں تھا۔ چھت پر امیر خان پہلے سے موجود تھا اور اس نے سمجھداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے واپسی کے لئے چھت کے ساتھ کمند پہلے سے لٹکا رکھی تھی۔ کمند کا آنکڑا چھت کے ساتھ چپکا ہوا تھا اور کمند کی مضبوط رسّی نیچے زمین تک چلی گئی تھی۔ سب سے پہلے آغا حسن نیچے اُترا..... پھر قاسم اور سب سے آخر میں امیر خان بھی نیچے اُتر آیا۔ اب وہ محفوظ تھے۔ تینوں دُبکی چال سے چلتے ہوئے شہتوت کے درختوں تک آئے اور اس سے پہلے کہ مسلح افراد مکان میں داخل ہوتے، نئی چری کے یہ تینوں سالار اپنا کام کر کے چھاؤنی کے علاقے سے نکل گئے تھے۔

صبح ہوئی تو ادرنہ کے لوگوں نے عجیب عجیب خبریں سنیں۔ ہر طرف سنسنی پھیلی ہوئی تھی اور جگہ جگہ کل کے واقعات پر تبصرے کر رہے تھے۔ ایک ہی دن میں نئی چری کے

معسکر اور چھاؤنی میں قتل کی چار سنسنی خیز وارداتیں ہوئی تھیں۔ ہر شخص کی زبان پر یہ بات تھی کہ قیصر کے جاسوس ادرنہ میں پھیل چکے ہیں۔

لیکن قاسم کسی اور ہی فکر میں تھا۔ اُس کے پاس وقت کم تھا۔ اور ابھی اُسے بہت سے کام نمٹانے تھے۔ اس وقت وہ بغدادی دروازے کے قریب منڈلا رہا تھا۔ ابوجعفر کی رہائش اسی علاقے میں تھی۔ یہ دن کا وقت تھا اور قاسم اکیلا تھا۔ وہ غالباً یہاں کوئی کارروائی کرنے کی بجائے محض موقع کا جائزہ لینے کے لئے آیا تھا۔ آج بازار میں خوب گہما گہمی تھی۔ لوک ترکی ٹوپیاں پہنے اور بھاری بھرکم لباس زیب تن کئے کاروبارِ زندگی میں مصروف تھے۔ قاسم آہستہ قدموں سے چلتا ہوا بازار سے گزرنے لگا۔ یہاں جگہ جگہ دو یا چار آدمی کل کے واقعات پر زور وشور سے محوِ گفتگو تھے۔ قاسم کے بدن پر ڈھیلا ڈھالا عربی لباس جس کی قمیض گھٹنوں سے نیچے تک تھی۔ اُس نے سر پر بھی حجازی طرز کا عمامہ باندھ رکھا تھا۔ وہ بازار کی چہل پہل سے بے پرواہ بغدادی دروازے کی طرف چلتا چلا گیا۔ اُسے بغدادی دروازے کی جامعہ مسجد میں جانا تھا۔ وہ ابھی جامعہ مسجد کی طرف مڑنے ہی والا تھا کہ اُس کی نظر مارسی کے کوچوان پر پڑی۔ مارسی کا کوچوان بازار میں کچھ خریداری کرتا رہا تھا۔ اچانک قاسم کو مارسی کے کوچوان اکبر سے ملنے کا خیال آیا اور وہ ڈھیلے قدموں سے عمر لڑکے کی جانب چل دیا۔ جونہی وہ اکبر کے قریب پہنچا تو اکبر نے فوراً قاسم کو پہچان لیا۔

''ارے! صاحب جی، آپ!..... آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟..... مالکن آپ کی بڑی تعریفیں کرتی ہیں۔ آج تو ہمارے گھر میں وہ آیا ہوا ہے۔ وہ بڑی مالکن کا دوست کا۔ چونے والا پیشوا۔''

اکبر نے گویا قاسم کی ساری مشکل ہی آسان کر دی۔ اُسے جس کی تلاش تھی، اس کا خود بخود چل کر قاسم کے پاس آ گیا تھا۔ قاسم نے اکبر سے فوراً سوال کیا۔

''کون؟ ابوجعفر؟''

''جی ہاں، وہی ابوجعفر..... نیلی آنکھوں والا۔''

اکبر نے نیلی آنکھوں والا کہا تو قاسم کا ذہن پھر گھومنے لگا۔ نیلی آنکھوں والا باشندہ ابوجعفر ہمیشہ قاسم کے دل میں کھٹکتا تھا۔ قاسم نے فوراً فیصلہ کیا کہ وہ مارسی کے نام پیغام بھیجے گا۔ چنانچہ اُس نے اکبر سے کہا۔

''میں تمہیں ایک خط لکھ کر دیتا ہوں۔ کیا تم اسے صحیح سلامت اپنی چھوٹی مالکن تک پہنچا دو گے؟''

''جی بالکل! میں وہ خط صرف چھوٹی مالکن کو دوں گا۔''

مارسی کا کوچوان اپنی عمر سے زیادہ چالاک تھا۔ اب قاسم کے لئے مسئلہ تھا اس بازار میں خط لکھنے کا اہتمام کرنا۔ اُس نے سوچا کسی سرائے کے منشی کا قلم اور روشنائی ہی اس وقت کام آ سکتے ہیں۔ وہ مارسی کے کوچوان اکبر کو لے کر کسی سرائے کی تلاش میں چل کھڑا ہوا۔ بازار میں کافی رش تھا۔ زیادہ تر لوگ پیدل آ جا رہے تھے اور کچھ لوگ گدھوں اور گھوڑوں پر بازار سے گزر رہے تھے۔ انواع واقسام کی دُکانیں سجی ہوئی تھیں اور زن ومرد خرید وفروخت میں مصروف تھے۔ یہ ادرنہ کا سب سے بڑا بازار تھا۔ یہ بغدادی دروازے سے شروع ہو کر بیچ شہر تک چلا جاتا تھا۔ قاسم اور اکبر سرائے کی تلاش میں بغدادی چوک پر آئے اور اکبر کے بتانے پر قاسم ایک جگہ رُک گیا۔ یہ ایک بڑی اور شاندار سرائے تھی۔ قاسم، اکبر کو لئے اندر داخل ہوا تو سرائے کی عمارت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ پتھروں سے بنائی گئی ایک خوشنما عمارت تھی۔ قاسم عمارت کا صحن پار کر کے استقبالیہ چبوترے پر پہنچا۔ وہاں ایک ادھیڑ عمر شخص نے مسکرا کر اُس کا استقبال کیا۔ قاسم نے بیٹھتے ہی اپنا مدعا بیان کیا۔ ادھیڑ عمر شخص نے فوراً ایک کاغذ اور قلم قاسم کی جانب بڑھا دیا۔ ساتھ ہی لکڑی کے صندوق پر روشنائی رکھی تھی۔ قاسم نے مارسی کو لکھا۔

''آج پھر چیل تمہارے چمن میں موجود ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ تمہارے نشیمن کو نقصان پہنچائے اس کے عزائم معلوم کر لو۔ ستاروں کی چال کے مطابق آج کا دن ہم سب کے لئے بہتر ہے۔ پرندگانِ چمن کے لئے چیل کا خطرہ کم ہوتا جا رہا ہے۔ اُمید ہے شاہین کے آنے تک چیل کسی شکاری کے تیر کا نشانہ بن جائے گی۔ لیکن اس کی نقل وحرکت پر خصوصاً آج کے دن نظر رکھنا تمہاری ذمہ داری ہے۔ والسلام۔''

یہ ایک طرح سے خفیہ تحریر تھی۔ لیکن مارسی جیسی ذہین لڑکی کے لئے اسے سمجھنا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ قاسم نے مارسی کے نام لکھی چٹھی کو تہہ کیا اور چٹھی اکبر کو تھما دی۔ اکبر نے جانا کہ کام مکمل ہو چکا ہے۔ چنانچہ وہ جانے کے لئے مڑا لیکن قاسم نے اُسے روک لیا۔ چبوترے پر بیٹھا ادھیڑ عمر شخص جو کنکھیوں سے قاسم کا خط پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا، سٹپٹا گیا۔ قاسم کے خط کا مضمون ہی انتہائی عجیب تھا۔ اگر خط مارتھا یا ابوجعفر کے ہاتھ لگ جاتا تو بھی راز نہ کھل سکتا۔ قاسم نے اب تک ایک دانشمند سراغ رساں ہونے کا ثبوت دیا تھا۔ اکبر نے اکبر سے کہا۔

''دیکھو اکبر..... اپنی مالکن سے کہنا کہ اس خط کا جواب آج ہی دے۔ اور وہ بھی جلد سے جلد..... اکبر! تم خود اپنی مالکن کا جواب لے کر آنا۔ میں سہ پہر کے بعد تمہارا انتظار کروں گا۔ لالہ شاہین کی یادگار پر۔''

قاسم کی ہدایات سن کر اکبر نے سر ہلا دیا۔ اب وہ جانے لگا تو قاسم نے اُسے جانے دیا۔ ادھر قاسم نے اُس کو مارسی کے گھر کی جانب روانہ کیا اور اُدھر خود اُس نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ ابوجعفر کی نگرانی کے لئے مارتھا کے گھر جائے گا۔ بظاہر وہ اکبر کے جانے کا انتظار کرتا رہا۔ اکبر سرائے کی عمارت سے نکل گیا تو قاسم بھی سرائے کے منشی کا شکریہ ادا کر کے باہر نکلنے کے لئے اٹھا۔ وہ ابھی سرائے کی راہداری میں ہی تھا کہ سرائے میں داخل ہونے والے ایک اجنبی کو دیکھ کر چونک اٹھا۔ یہ شخص اپنی شکل وصورت اور حلیے سے ہنگری کا عیسائی باشندہ دکھائی دیتا تھا اور یہی بات قاسم کے چونکنے کا باعث تھی۔ اجنبی مسافر تھا اور اُس کی پیٹھ پر لدا سامان اس بات کا گواہ تھا کہ وہ ابھی ابھی ادرنہ میں وارد ہوا ہے۔ اس سے پہلے کہ قاسم اُس کے بارے میں کچھ اور سوچتا، اجنبی بالکل قاسم کے قریب سے گزرنے لگا تو رُک گیا اور انتہائی معصومیت سے دریافت کرنے لگا۔

''کیا یہ سرائے ہے؟''

اجنبی کے لب ولہجہ کو دیکھ کر قاسم کا شک یقین میں بدل گیا۔ یہ واقعی ہنگری کا یورپی باشندہ تھا۔ قاسم جیسے سراغ رساں نے مشکوک اجنبی کا سوال کرنا غنیمت جانا اور پوری طرح سے اجنبی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''جی! آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟..... کیا آپ کو سرائے کی تلاش ہے؟'' قاسم نے اجنبی کو جواب دینے کی بجائے عام سے انداز میں سوال کر دیا۔

''جی، میں ہنگری سے آیا ہوں۔ اور ابھی ابھی اس شہر میں وارد ہوا ہوں۔'' اجنبی کے لہجے میں بلا کی سادگی تھی۔ وہ شکل وشباہت سے قیصر کا جاسوس یا کسی عیسائی فوج کا سپاہی نہ لگتا تھا۔ اُس کے چہرے پر ایک سادہ سی مسکراہٹ تھی اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے۔ اُس کی آنکھوں کی رنگت بھی یورپی باشندوں کی طرح نیلی تھی۔ اب قاسم کے اعصاب ڈھیلے ہونے لگے۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ شخص خطرناک نہیں ہو سکتا۔ اُس کا لہجہ اور چہرہ کسی جاسوس کا سا نہیں، یہ کوئی سوداگر یا بیوپاری ہی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ قاسم نے دل جانے کا فیصلہ کر لیا اور ویسے ہی ازراہِ معلومات اجنبی سے آخری سوال کر دیا۔ لیکن سے پہلے اُس نے اجنبی کو بتایا کہ۔

''ہاں، یہ سرائے ہے اور بہت اچھی سرائے ہے..... آپ غالباً سوداگر ہیں؟'' قاسم کا لہجہ استفہامیہ تھا۔

وہ شخص بھولپن سے ہنس دیا اور زور زور سے نفی میں سر ہلانے لگا۔ ''نہیں نہیں، مجھے سوداگر مت کہئے۔ میں دنیا کو خریدنے کے لئے نہیں نکلا اور نہ ہی بیچنے کے لئے۔ میں تو لوگوں کو یہ بتانے کے لئے نکلا ہوں کہ دنیا کی خرید وفروخت بند کر دو۔ زندگی بہت مختصر ہے، جسے خرید وفروخت میں نہیں گزار دینا چاہئے۔''

ایک دم سے قاسم کی دلچسپی اجنبی میں پھر بڑھ گئی۔ اُس نے اجنبی کو ٹٹولنے کے لئے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''آپ کی سوداگر والی بات ٹھیک ہے۔ لیکن زندگی کے مختصر ہونے والی بات غلط ہے۔ زندگی کہاں مختصر ہے۔ زندگی تو بہت طویل ہے۔ پہلے اِس دنیا میں جینا پڑتا ہے، پھر اُس دنیا میں۔ موت کا فرشتہ تو صرف انسان کا بدن چھوتا ہے..... وہ رُوح کے مرکز سے دُور رہتا ہے۔''

اجنبی نے کچھ دیر کے لئے حیرت سے پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ قاسم کی بات سنی اور پھر تیزی سے اپنی پیٹھ کا سامان اتارنے لگا۔ اگلے لمحے وہ قاسم سے بغل گیر ہو رہا تھا۔

''واہ! میں کتنا خوش نصیب ہوں۔ ادرنہ میں پہلے قدم پر ہی میری ملاقات ایک مناسب آدمی سے ہو گئی۔ آپ نے زندگی کی بات خوب کہی..... یہ بہت بڑی بات ہے۔ کیا آپ حکیم ہیں؟''

اجنبی کی بات سے قاسم ہنس دیا اور کہنے لگا۔ ''نہیں حضور، یہ بڑی بات نہیں بالکل عام سی بات ہے۔ یہ بات تو آپ کو مسلمانوں کا کوئی چھوٹا سا بچہ بھی بتا سکتا ہے۔''

اب اجنبی پہلے سے بھی زیادہ حیران ہو رہا تھا۔

''کیا واقعی، مسلمانوں کا کوئی چھوٹا سا بچہ بھی یہ بات بتا سکتا ہے؟''

''جی ہاں!..... چھوٹا سا بچہ بھی۔'' قاسم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اب وہ اجنبی کو کوئی خبطی سمجھ رہا تھا۔ کیونکہ اُس نے دیکھا کہ اجنبی اب خلاء میں گھورتے ہوئے اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔ اجنبی کہہ رہا تھا۔

''اس کا مطلب ہے، مذہب کے پاس بھی کائنات کے مشکل سوالوں کا جواب ہے۔ میں تو سمجھتا تھا کہ مذہب ایسے ہی کچھ سمجھدار لوگوں کی چکر بازی ہے..... اگر مسلمان موت کے فلسفے کو سمجھتے نہیں تو یقیناً ان کے پاس انسان کی مقصدیت کا اعلیٰ اور برتر شعور موجود ہے.....

اس کا مطلب ہے کہ میں ٹھیک جگہ پر آ گیا ہوں..... ہاں، میں ٹھیک جگہ پر آ گیا ہوں۔ اب میں پیاسا نہیں رہوں گا۔ اے اربان! سنا تم نے میں ٹھیک جگہ پر آ گیا ہوں۔''

اجنبی کی باتیں سن کر قاسم کی دلچسپی ایک بار پھر بڑھنے لگی۔ لیکن اُس کے پاس وقت کم تھا۔ اُسے ابوجعفر پر ہاتھ ڈالنے کے لئے منصوبہ بندی کرنا تھی۔ وہ مزید نہیں رُک سکتا تھا۔ چنانچہ وہ اجنبی سے اجازت لے کے جانے لگا تو اجنبی نے اُس کا بازو پکڑ لیا۔

''آپ کہاں چل دیئے..... چلئے میرے ساتھ۔ میں اجنبی ہوں۔ میری رہنمائی کیجئے۔ آپ مجھے اچھے انسان دکھائی دیتے ہیں۔''

قاسم رُک گیا اور انتہائی متانت کے ساتھ اجنبی سے مخاطب ہوا۔ ''محترم! میں آپ کے ساتھ ابھی تو نہیں چل سکتا۔ البتہ آپ سرائے میں ٹھہریئے۔ میں آپ سے ملنے کے لئے پھر حاضر ہو جاؤں گا..... لیکن آپ نے اپنا نام اور ادرنہ میں آنے کا مقصد تو بتایا نہیں۔ آپ کچھ نہیں بتائیں گے تو آپ کی ہمارے ساتھ اجنبیت کیسے دُور ہو گی؟''

اجنبی کسی قدر خفت آمیز لہجے میں بولا۔ ''میں معذرت چاہتا ہوں کہ میں نے نام نہیں بتایا۔ میرا نام ''اُربان'' ہے۔ میں ہنگری کا رہنے والا ہوں اور ابھی ابھی قسطنطنیہ سے یہاں وارد ہوا ہوں۔ میں کوئی باقاعدہ کام تو نہیں کرتا البتہ لوہا ڈھالنے کا کام میں بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں..... میرے ہاتھ میں آ کر لوہا پگھلنے لگتا ہے۔ آپ پیشہ کے لحاظ سے مجھے اس دور کا داؤد کہہ سکتے ہیں۔''

اب قاسم پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُربان کو دیکھ رہا تھا۔ قاسم نے پُرجوش انداز میں اُربان کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور انتہائی محبت بھرے لہجے میں کہا۔

''محترم اُربان! آپ ہمارے معزز مہمان ہیں۔ آپ سرائے میں قیام کیجئے، آپ کے اخراجات میں برداشت کروں گا۔ اس وقت مجھے جلدی ہے میں کل کسی وقت آپ کی خدمت میں حاضری دوں گا۔''

قاسم نے معذرت خواہانہ انداز میں اُربان سے اجازت لی اور سرائے سے باہر نکل آیا۔ اب اُس کا رُخ قصرِ سلطانی کی جانب تھا جہاں طبقہ امراء کی رہائش گاہیں تھیں۔ وہ قصرِ سلطانی کے عقبی محلے میں ابوجعفر پر نظر رکھنے کے لئے جا رہا تھا۔ اُسے مارتھا کے دروازے تک پہنچنا تھا اور پھر نگرانی کے لئے کسی ایسی جگہ کا انتخاب کرنا تھا جہاں سے ابوجعفر کی نقل و حرکت پر نظر رکھ سکتا۔ لیکن اُسے مارتھا کے دروازے تک جانے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ اُسے دُور سے مارسی کا کوچوان دکھائی دیا۔ ابھی کچھ وقت پہلے بغداد

دروازے کی ایک سرائے میں قاسم اس لڑکے کو مارسی کے نام ایک خط دے چکا تھا۔ قاسم سوچنے لگا کہ وہ گلی میں سرِ راہ اکبر کو آواز دے کر بلائے یا نہ بلائے..... پھر اُس نے ایک فیصلہ کیا اور اُسی جانب چل دیا جس جانب اکبر جا رہا تھا۔ وہ چند گلیوں میں اکبر کا تعاقب کرتے ہوئے مڑتا چلا گیا۔ بالآخر اُس نے اکبر کو دیکھا کہ وہ اندرون شہر جانے والی سڑک پر مڑنے لگا تھا۔ چنانچہ اُس نے آواز دے کر اکبر کو روک لیا۔ لڑکے نے مڑ کر دیکھا تو حیرت سے اُس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا قاسم کے قریب آیا۔ قاسم نے اُسے کسی غیر معمولی انداز میں ملنے کی بجائے اپنی دُھن میں چلتے رہنا مناسب سمجھا۔ کچھ ہی دیر بعد اکبر، قاسم کے ہمراہ قدم سے قدم ملا کر چل رہا تھا اور کسی طوطے کی طرح بولتا چلا جا رہا تھا۔

''آج مالکن بہت خوش تھی صاحب! آپ کا خط ملنے پر وہ مسرت سے اُچھل گئی۔ پھر جانے کیوں مالکن نے بڑی مالکن اور اُس کے مہمان کی باتیں سننے کے لئے اُس کمرے کی کھڑکی پر کان لگا دیئے جہاں وہ دونوں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ مالکن نے مجھے بھی کہا کہ میں بھی اُن کی باتیں سننے کی کوشش کروں..... آج مالکن بہت خوش ہیں صاحب! وہ اس سے پہلے اتنی خوش کبھی نظر نہیں آئی۔''

اکبر ابھی بولتا جا رہا تھا کہ قاسم نے درمیان میں اُس کی بات کاٹ دی اور کہنے لگا۔ ''تو کیا تم نے بھی ابوجعفر اور مارتھا کی باتیں سنی تھیں؟''

''جی ہاں!'' اکبر نے مختصر جواب دیا۔

قاسم نے پھر کہا۔ ''کیا باتیں سنی تم نے؟''

اکبر نے ماتھے پر شکنیں ڈال کر کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ''وہ دونوں ینی چری کی فوج ہونے والے واقعات پر باتیں کر رہے تھے۔ ابوجعفر کہہ رہا تھا کہ یہ کارروائی سلطان کی شاہی سراغ رساں کی لگتی ہے۔ اور مارتھا..... یاد رکھنا! یہ شاہی سراغ رساں انتہائی چالاک اور چالاک شخص ہے۔ میں اس سے مل چکا ہوں۔ اس نے گھوڑے جیسا بدن، چیتے جیسی آنکھیں اور لومڑی کا دماغ پایا ہے۔''

اکبر اتنا بتا کر خاموش ہو گیا تو قاسم نے پُرتجسس لہجے میں پھر کہا۔

''بس!..... کیا یہی کچھ سنا تم نے یا کچھ اور بھی؟''

اکبر پھر کہنے لگا۔ ''ابوجعفر، شہزادہ علاؤ الدین سے ملنے کی بات بھی کر رہا تھا۔ وہ مارتھا کو بتا رہا تھا کہ شہزادہ اُس کے ہاتھ میں ہے اور مارتھا کو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ وہ بہت

دھیمی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ کوئی کوئی جملہ سنائی دیتا تھا۔ اور کوئی کوئی جملہ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ میں نے صرف اتنی باتیں سنیں۔ البتہ مالکن تمام وقت وہیں کھڑی رہی اور وقت ابوجعفر اور بڑی مالکن باتیں کرتے رہے۔''

قاسم کے لئے اتنا ہی بہت تھا۔ اُس نے چلتے چلتے آخری سوال کیا۔ ''کیا ابوجعفر ابھی تک وہیں ہے؟''

''نہیں۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی وہاں سے چلا گیا ہے۔ البتہ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کس جانب گیا ہے۔ شاید مالکن کو معلوم ہو۔''

قاسم چلتے چلتے یکدم رُک گیا۔ اُسے اکبر سے جو کچھ پوچھنا تھا، اُس نے پوچھ لیا تو اب اُسے اکبر کے ساتھ مزید گلیوں میں بھٹکنے کی ضرورت نہ تھی۔ اُس نے پیار بھرے انداز میں اکبر کو دو تین اشرفیاں تھمائیں۔ اور اُس کے کندھے کو تھپتھپاتا ہوا ایک جانب چل دیا۔ وہ راستے میں سوچ رہا تھا کہ ابوجعفر کے غدار ہونے میں اب کوئی شک باقی نہیں رہا۔ اُس کے ذہن میں ایک بار پھر ابوجعفر کی نیلی آنکھیں کھٹکنے لگیں۔ اُسے یہ تو یقین تھا کہ ابوجعفر سلطنت عثمانیہ کے خلاف ایک خطرناک سازش کا اہم مہرہ ہے۔ لیکن اُس کے ذہن میں پیدا ہونے والا یہ خیال ابھی شک ہی تھا کہ ابوجعفر عرب ہونے کی بجائے یورپی باشندہ ہے۔ وہ چاہتا تو یہی تھا کہ ابوجعفر کی اصل حقیقت کو آشکارا کرے۔ لیکن اس خطرے کو بغاوت کسی بھی وقت سر اٹھا سکتی ہے، اُس نے اپنی تفتیش کو مزید طول دینا مناسب نہ سمجھا اور فیصلہ کیا کہ وہ ابوجعفر کو موقع دیئے بغیر گرفتار کرے گا۔ چنانچہ وہ انتہائی تیز قدموں کے ساتھ چلتا ہوا خفیہ محکمے کے سربراہ بہرام کے دفتر کی جانب بڑھنے لگا۔ اب اُسے سپاہیوں کے ایک دستے کی ضرورت تھی تاکہ وہ سلطان کے عطا کردہ خصوصی اختیارات استعمال کرتا ہوا ابوجعفر کو دن دہاڑے حراست میں لے سکتا۔

آج اُس کا دن بہت مصروف تھا۔ اُسے سہ پہر کے بعد مارسی کا پیغام وصول کرنے کے لئے لالہ شاہین کی یادگار تک بھی جانا تھا اور اُسے آج کے دن میں ہی ابوجعفر جیسے رسوخ رکھنے والے شخص کو گرفتار کر کے سازش کے تانے بانے تلاش کرنے تھے۔ وہ صبح سے ابھی تک پیدل چل رہا تھا۔ لیکن اب اُسے ایک مسلح دستے کی ضرورت تھی اور ایک بہتر گھوڑے کی بھی۔ اس کام کے لئے اُس نے بہرام خان کو ملوث کرنا مناسب سمجھا۔ سیدھا قصرِ سلطانی کے قریب واقع سرکاری محکموں کی عمارت کی جانب جا رہا تھا۔ بہرام خان یہیں مل سکتا تھا۔

بہرام خان کے پاس پہنچ کر اُس نے اپنا مدعا بیان کیا تو بہرام خان یوں اُچھلا جیسے اُسے بچھو نے ڈس لیا ہو۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ ہم ابوجعفر کو کیسے گرفتار کر سکتے ہیں؟ وہ طبقۂ امراء میں سے ہے اور اُس کا تعلق براہِ راست قصرِ سلطانی تک ہے۔''

قاسم نے بہرام کی بات سنی اور منہ بسور لیا۔ پھر کسی قدر غصے سے کہنے لگا۔ ''اُس کا تعلق قصرِ سلطانی سے ہے تو کیا ہوا۔ خود سلطانِ معظم کا حکم ہے کہ ہر اُس شخص کو بلا جھجک گرفتار کر لو جس کا ذرا سا بھی تعلق غداروں کے ساتھ محسوس ہو۔ میں ابوجعفر کو گرفتار کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ سراسر فرض سے کوتاہی ہو گی۔ قیصر کا جاسوس ہماری آنکھوں کے سامنے گھومتا رہے اور ہم کچھ نہ کر سکیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

بہرام، ابوجعفر کو گرفتار کرنے میں حائل تھا۔ وہ اتنا بڑا خطرہ مول لینے سے گھبراتا تھا۔ ناظر ابوجعفر نے اپنی خوشامد پسندی کی بدولت شہزادہ علاؤ الدین سمیت بہت سے عمائدین سلطنت کو اپنا گرویدہ کر رکھا تھا۔ بہرام سوچتا تھا ابوجعفر پر ہاتھ ڈالا تو بڑے بڑے وزراء اور شہزادے اُس کی حمایت میں دوڑے چلے آئیں گے۔ اُس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد قاسم سے کہا۔

''قاسم بن ہشام! میں تمہارے ہمراہ چل کر ابوجعفر جیسے شخص کو حراست میں نہیں لے سکتا۔ اب اگر میں نے ابوجعفر کو پکڑا تو شہزادہ علاؤ الدین مجھے زنجیریں پہنا دے گا۔''

اب قاسم پچھتا رہا تھا کہ اُس نے سلطان کو ہدایات دینے سے منع کیوں کر دیا تھا۔ اُسے سلطانی دماغ کی باریک بینی اور دُور اندیشی اب دکھائی دینے لگی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ بہرام محض سپاہی ہے، لیکن اب اُسے یقین ہونے لگا کہ سلطان صرف سپاہی نہیں بلکہ ایک دانا مدبر بھی ہے۔ اُسے اپنی عاقبت نا اندیشی کا احساس ہوا۔ آج اگر سلطان نے بہرام کو حکم دے رکھا ہوتا تو اُسے یہ مشکل پیش نہ آتی۔ اُس نے آخری کوشش کے طور پر بہرام سے پھر کہا۔

''بہرام خان! سلطان نے تمہاری موجودگی میں سرِ دربار مجھے شاہی سراغ رساں مقرر کیا ہے۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ ابوجعفر کو گرفتار کرنے کے لئے میری مدد کرو۔''

اب بہرام بغلیں جھانکنے لگا۔ یہ سچ تھا کہ سلطان نے جب قاسم کو شاہی سراغ رساں مقرر کیا تھا تو بہرام خان بھی دربار میں موجود تھا۔ بہرام خان اس وقت محض اس لئے پس و پیش سے کام لے رہا تھا کہ سلطان نے اُسے خصوصیت کے ساتھ محکمہ جاتی حکم جاری نہیں

کیا تھا۔ جونہی قاسم نے دربار میں سلطان کا زبانی حکم بہرام کو یاد دلایا تو اُس کے سارے کل پُرزے درست ہو گئے۔ اُس نے بجھے بجھے سے لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے قاسم بن ہشام!..... میں تمہاری ذمہ داری پر یہ کام کرنے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن یاد رکھو! اگر شہزادہ علاؤ الدین نے مجھے حکم دیا تو میں ابوجعفر کو فی الفور چھوڑ دوں گا۔''

قاسم نے بہرام خان کی اس قدر آمادگی بھی غنیمت جانی اور فوراً کہا۔

''ٹھیک ہے، شہزادہ علاؤ الدین کے کہنے پر تم بے شک ابوجعفر کو رہا کر دینا۔''

اس کے بعد قاسم نے بہرام خان کے ساتھ ابوجعفر پر دھاوا بولنے کے باقی معاملات اور وقت کے تعین پر خاصی دیر بات چیت کی۔ یہاں تک کہ سہ پہر ڈھلنے لگی۔ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد قاسم بجلی کی رفتار سے کرائے کے اصطبل پہنچا اور لالہ شاہین کی یادگار جانے کے لئے گھوڑا حاصل کیا۔ سہ پہر ڈھلنے سے پہلے وہ یادگار کے دروازے پر تھا۔ وہ طے شدہ وقت سے قدرے تاخیر سے پہنچا تھا۔ اُسے توقع تھی کہ اکبر ماری کا پیغام لے کر پہنچ چکا ہو گا۔ وہ دروازے میں داخل ہوا تو اُس کی نظر اکبر پر پڑی جو آبنوس کے درختوں کے نزدیک ایک ٹوٹی ہوئی دیوار پر چڑھ کر بیٹھا تھا۔ اکبر کی نظریں دروازے پر ہی گ تھیں۔ جونہی قاسم یادگار میں داخل ہوا وہ کود کر نیچے اترا اور قاسم کی طرف بڑھنے لگا۔ اتنے میں قاسم کی نظریں جھاڑیوں کے عقب میں چھپی بگھی پر پڑیں تو وہ چونک اُٹھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ماری خود یہاں چلی آئی تھی۔ وہ ماری کی جرأت پر حیران ہوا۔ آج کل مارتھ اور ابوجعفر اپنی سازش کے آخری مراحل میں تھے اور ابوجعفر آج ہی مارتھا کے گھر سے اُٹھ کر گیا تھا۔ ماری کو احتیاط کرنی چاہئے تھی۔ یقیناً مارتھا اور ابوجعفر کو ماری پر شک تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ابوجعفر کے خفیہ آدمی ماری کی نگرانی کرتے ہوں۔ قاسم یہی باتیں سوچتا تیز تیز قدموں سے بارہ دری کی طرف بڑھنے لگا۔ اب اکبر بھی اُس کے نزدیک آ پہنچا تھا۔ قاسم نے اکبر کو مسکرا کر دیکھا اور کہا۔

''لگتا ہے تمہاری مالکن خود آئی ہے۔ بارہ دری میں ہے شاید!''

اکبر نے پُرجوش انداز میں سر ہلایا اور قاسم سے ہاتھ ملانے کے بعد کہا۔

''مالکن بارہ دری میں نہیں ہیں۔ وہ بگھی میں بیٹھی ہیں۔ آپ بھی وہیں چلئے۔ آج ہمیں اپنے تعاقب کا خطرہ تھا اس لئے ہم مختلف راستوں سے چھپ چھپا کر آئے ہیں۔''

قاسم ماری کی دانشمندی پر حیران رہ گیا۔ گویا جو کچھ اُس نے سوچا تھا، ماری کو بھی اس

کا احساس تھا۔ ماری کے ساتھ اپنے خیالات کی ہم آہنگی دیکھ کر قاسم کے دل میں انجانی سی خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ بگھی کے قریب پہنچا اور بگھی کا عقبی پردہ اٹھا کر بگھی کے اندر بیٹھی ماری کو سلام کیا۔ ماری نے مسکرا کر قاسم کے سلام کا جواب دیا اور اُسے اندر بلا لیا۔ اکبر دوڑ کر دوبارہ ٹوٹی ہوئی دیوار پر جا چڑھا۔ اب وہ ایک ہوشیار چیتے کی طرح چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔

ماری اور قاسم بگھی میں نصب لکڑی کی نشستوں پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ یہ ایک چار ضرب دس فٹ کا چھوٹا سا کمرہ تھا۔ ماری اور قاسم ایک دوسرے کے اس قدر نزدیک تھے کہ اُن کے گھٹنے ایک دوسرے کو چھو سکتے تھے۔ آج ماری سادہ لباس میں تھی اور پہلے سے بھی زیادہ حسین دکھائی دے رہی تھی۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھوں میں تجسس کی رمق تھی۔ یکلخت اُس کی سرسراتی زلف اُس کے سر سے پھسل کر شانے پر آ گری۔ اُس نے بائیں ہاتھ سے زلف کو سلجھایا اور مسکرا دی۔ قاسم کو یوں لگا جیسے کلیاں کھل اٹھی ہوں۔ ایک لمحے کے لئے تو اُسے اپنی تمام ذمہ داریاں اور ضروریات بھول گئیں۔ وہ سوچنے لگا اس لڑکی کا حسن پہلے دن سے اس کے اعصاب پر سوار ہو جاتا ہے۔ اُس نے سر کو جھٹکا اور چہرے پر سنجیدگی لاتے ہوئے کہا۔

''آج ابوجعفر آپ کے گھر آیا تھا۔''

ماری، قاسم کی بات سن کر شرارت سے مسکرا دی اور زور زور سے سر ہلاتے ہوئے کہنے لگی۔ ''آپ نے مجھے ابوجعفر کی جاسوسی کرنے کے لئے کہا۔ لیکن اس طرح مجھے آپ کی اصلیت معلوم ہو گئی..... جناب شاہی سراغ رساں صاحب!''

قاسم پہلے تو کچھ نہ سمجھا، لیکن پھر فوراً سمجھ گیا اور شرمندگی سے مسکرا دیا۔

''اچھا، چلو اگر تمہیں پتہ چل گیا ہے تو تم یہ سمجھو کہ میں نے تمہیں سلطنت کی طرف سے ایک نیک فریضہ سونپا ہے۔ اور اب یہ بتاؤ کہ ابوجعفر اور تمہاری ماں کے درمیان کیا باتیں ہوئیں؟''

ماری فوراً سنجیدہ ہو گئی، کہنے لگی۔ ''مجھے آج حد سے زیادہ حیرت ہوئی جب یہ معلوم ہوا کہ میری ماں اور ابوجعفر قیصرِ قسطنطنیہ کے لئے کام کر رہے ہیں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میری ماں اس قدر خطرناک سازش میں حصہ لے سکتی ہے..... ہاں! وہ لوگ سازش کر رہے ہیں۔ کل ینی چری کا جو سالار قتل کیا گیا ہے، ابوجعفر کا یہ خیال ہے کہ وہ قتل شاہی اغا رساں قاسم بن ہشام یعنی آپ نے کیا ہے۔ ینی چری کا سالار اسلم خان، ابوجعفر کا

آدمی تھا۔ ابوجعفر کو اس کی موت کا بہت افسوس ہوا۔ وہ آپ کو نقصان پہنچانے کی بات کر رہا تھا۔ جہاں تک میں اپنی ماں اور ابوجعفر کی باتیں سمجھی ہوں تو میرا یہ خیال ہے کہ سلطان کی واپسی سے پہلے اور نہ میں کوئی خطرناک کھیل کھیلنا چاہتے ہیں۔ اس لئے میں حقیقت حال بتانے کے لئے خط لکھنے کی بجائے خود آنا مناسب سمجھا۔"

مارسی کی بات سن کر قاسم کو ذرا بھر حیرت نہ ہوئی۔ یہ سب باتیں اُسے پہلے سے معلوم تھیں، البتہ اُس کا رہا سہا شک بھی جاتا رہا تھا اور اُسے یقین ہو چکا تھا کہ اور نہ ابوجعفر اور اُس کے ساتھی سلطان کی آمد سے پہلے پہلے بغاوت پھیلانا چاہتے ہیں۔ اُ نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد پُرعزم لہجے میں مارسی سے کہا۔

"تم فکر نہ کرو۔ آج رات میں ابوجعفر کو گرفتار کر لوں گا۔ اور وہ خود اپنی سازش سارے تانے بانے اُگل دے گا۔"

مارسی نے چونک کر دیکھا اور پُرجوش لہجے میں بولی۔ "کیا واقعی! تم ایسا کر سکتے ہ میں نے تو سنا ہے کہ ابوجعفر کا اثر و رسوخ دربارِ شاہی تک ہے۔ وہ میری ماں کو تسلی د رہا تھا کہ شاہی سراغ رساں ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا کیونکہ وہ شہزادہ علاؤ الدین کو اعتماد میں لے چکا ہے۔"

شہزادے کا ذکر سن کر قاسم کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ اُسے ہر جگہ سے ایک ہی بات پڑ رہی تھی۔ اب اُس کے دل میں یہ کھٹکا پیدا ہوا کہ کہیں سچ مچ سلطان کا بڑا بیٹا ابوجعفر گرفتاری میں رُکاوٹ نہ بن جائے۔ وہ اسی خیال میں محو ہو گیا کہ کسی طرح شہزادے ابوجعفر کی حمایت سے باز رکھا جا سکے۔ مارسی نے اُسے گم دیکھا تو اپنی نازک اُنگلی سے اُ کے گھٹنے پر ٹھوکہ دیا۔ مارسی کے لمس میں برقی رو دوڑ رہی تھی۔ قاسم کو جیسے شاک لگا۔ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ مارسی اُس کی حالت سے محظوظ ہوئی اور شرارت سے مسکرائی اور کہنے لگی۔

"بخدا! آپ خالص عرب مسلمان ہیں۔ آپ کے انداز و اطوار آپ کے شریف ہونے کی دلیل ہیں..... آپ کو دیکھتی ہوں تو دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ آپ سے ایک لمحے کے لئے بھی دُور نہ ہو جاؤں۔" آخری بات کہتے ہوئے مارسی کی آنکھیں جھک گئیں۔

اب محظوظ ہونے کی باری قاسم کی تھی۔ اُس نے کچھ شرارت اور کچھ پیار کے لہجے میں مارسی سے کہا۔ "دُور جانے کا خوف ہے تو ایک ہی بار نزدیک کیوں نہیں آ جاتیں۔ میری والدہ محترمہ اور بھابھی آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔ آپ کسی وقت ہمارے

آئیے۔" قاسم کا پہلا جملہ انتہائی واشگاف تھا۔ مارسی کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا اور اپنی جگہ پر چھوئی موئی کی طرح سمٹ گئی۔ قاسم کو احساس ہوا کہ اُس نے بہت جلد بہت بڑی بات کہہ دی ہے۔ اُس نے فوراً بات بنانے کی کوشش کی۔

"میرا خیال ہے آپ کو ہمارے گھر آنا اچھا نہیں لگا۔ شاید اسی لئے آپ خاموش ہیں۔"

مارسی، قاسم کی بات سن کر سٹپٹا گئی۔ اُس نے فوراً سر اٹھا لیا اور وضاحت کرنے لگی۔

"نہیں نہیں، ایسے مت کہیئے۔ میرے لئے تو آپ کا نام ہی اب زندگی کا سہارا ہے۔ آپ کو معلوم نہیں، سکندر نے مجھے کس قدر تنگ کیا ہے۔ سکندر اور میں ایک ساتھ پل کر جوان ہوئے۔ میری ماں اُس کے باپ کی کنیز تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مجھے اپنے باپ کی جاگیر سمجھتا ہے..... اُس نے جانے سے پہلے مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہا لیکن میں نے یہ کہہ کر کہ میں ایک عیسائی ہوں اور وہ ایک مسلمان ہے، اس لئے میں اُس سے شادی نہیں کر سکتی، وقتی طور پر اپنی جان چھڑا لی ہے۔ لیکن اب تو وہ اسلام سے پھر چکا ہے اور دوبارہ عیسائی بن گیا ہے۔ میں ہر لمحہ احساسِ عدم تحفظ کا شکار ہوں۔ کیونکہ میری ماں بھی یہی چاہتی ہے کہ میں سکندر سے شادی کر لوں۔ سکندر نے جاتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ وہ مجھے جلد اپنے پاس بلوا لے گا۔ ایسی صورت میں آپ کا وجود میرے لئے ایک پناہ گاہ کی طرح ہے۔"

مارسی کی بات سے قاسم کے تن بدن میں سکندر کے خلاف غصے کی لہر دوڑ گئی۔ اس سے پہلے اُسے مارسی کا دُکھ معلوم نہیں تھا۔ اُسے احساس ہوا کہ مارسی ٹھیک کہتی ہے۔ سکندر جیسے خود پرور انسان سے کچھ بھی بعید نہیں۔ اب قاسم، مارسی کو اپنے دل کے اور بھی قریب محسوس کر رہا تھا۔ اُس نے ایک نئے عزم کے ساتھ کہا۔

"مارسی! آپ نے بہت اچھا کیا مجھے سکندر کے عزائم سے آگاہ کر دیا۔ اب میں آپ کے معاملے میں بھی خبردار رہنے کی کوشش کروں گا۔ آپ کچھ فکر مت کیجئے۔ آج میں نے اگر حراست میں لے لیا تو امید ہے اور نہ میں موجود اُس کے اور سکندر کے تمام ساتھی نظر میں آ جائیں گے۔ اور پھر جلد ہی سارے دھر لئے جائیں گے۔ اس کے بعد آپ کو ویسے بھی پریشانی نہیں رہے گی....."

بات ابھی قاسم کے منہ میں تھی کہ بگھی کے باہر دھپ کی آواز سنائی دی۔ قاسم کسی چیتے کی طرح چوکنا ہو گیا اور فوراً بگھی کا عقبی پردہ اُٹھا کر دیکھا۔ اکبر تیز قدموں سے بگھی کی طرف آ رہا تھا۔ قاسم کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔ ضرور کوئی ایسی ویسی بات تھی۔ وہ ذرا سی

دیر کیے بغیر بگھی سے نکل آیا۔ اتنے میں اکبر بھی پہنچ چکا تھا۔ اکبر نے آتے ہی کہا۔

"میں نے ایک گھڑ سوار کو یادگار کے گرد چکر لگاتے دیکھا ہے۔ وہ کھڑکیوں سے باہر کے اندر کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہا تھا۔"

ایک دم قاسم کے اعصاب تن گئے۔ اُس کا ہاتھ اپنی تلوار کے قبضے میں چلا گیا۔ اس نے اکبر سے کہا۔ "تم بگھی میں تیار بیٹھو، میں باہر کا جائزہ لیتا ہوں۔ اب ہمیں چلنا ہوگا۔"

قاسم یہ کہتا ہوا اپنے گھوڑے کی جانب بڑھ گیا۔ مارسی نے بھی اکبر کی بات سن لی تھی۔ اُس کا دل نئی صورتحال پر زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اور اُس نے بھی اپنی چادر میں چھپا ہوا خنجر نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ قاسم گھوڑے پر سوار ہو کر یادگار کے دروازے سے باہر نکلا۔ اکبر وہ گھوڑے کی پشت پر ہر قسم کی صورتحال کے لئے مستعد بیٹھا تھا۔ اُس کا ایک ہاتھ تلوار کے قبضے پر تھا اور دوسرے میں لگام تھی۔ وہ اپنے گھوڑے کو دُلکی چال سے چلاتا ہوا یادگار کے گرد چکرانے لگا۔ اُس کی آنکھیں انتہائی باریکی سے گرد و پیش کا جائزہ لے رہی تھیں۔ کان ہر قسم کی آہٹ سننے کے لئے تیار تھا۔ اُس نے پے در پے یادگار کے تین چکر لگائے۔ وہ چاروں طرف کچھ دُور تک بھی گیا لیکن اُسے کہیں بھی کوئی انسان نظر نہ آیا۔ بالآخر دیر بعد وہ واپس لوٹا اور اکبر کے سامنے آ کر اُسے بگھی نکال لانے کا اشارہ کیا۔ اکبر گھوڑے پر سوار تھا۔ بگھی اُس کے قریب سے گزری تو ساتھ ساتھ ہو لیا۔ مارسی نے پردہ اُٹھا کر استفہامیہ لہجے میں قاسم کی جانب دیکھا اور آنکھوں کے اشارے سے صورتحال کے بارے میں دریافت کیا۔ قاسم نے قدرے ہلکی آواز میں کہا۔

"پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اکبر کو غلط فہمی ہوئی ہو۔ بہرحال اب لوگوں کو چلنا چاہئے۔ راستے میں کوئی خطرہ نہیں۔ تھوڑی دیر میں شام ہونے والی، اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے آپ گھر پہنچ جائیں گی۔"

وہ یادگار کے قریب پہنچے تو اکبر نے بگھی کے گھوڑوں کو چابک رسید کر دی۔ اگلے بگھی دھول اُڑاتی ہوئی شہر کی جانب بڑھ رہی تھی۔

قاسم نے ابوجعفر کے گرد دھاوا بولنے کا وقت نصف شب کے بعد کا طے کیا تھا۔ سارا دن قاسم کے لئے انتہائی مصروفیت کا رہا تھا۔ اب اُس کے پاس رات تک کا وقت تھا۔ چنانچہ وہ شہر میں کرائے کے اصطبل سے فارغ ہو کر گھر کی جانب چل دیا۔

قیصر کے جاسوس

آدھی رات کے قریب خفیہ محکمے کے تربیت یافتہ سپاہیوں کا دستہ بہرام خان اور قاسم کی سرکردگی میں ابوجعفر کی رہائش گاہ کے گرد گھیرا ڈالے کھڑا تھا۔ چند ہی لمحوں میں کارروائی شروع ہونے والی تھی۔ سب لوگ اپنے اپنے مقام پر کھڑے ہو گئے تو بہرام اور قاسم نے آگے بڑھ کر مکان کے دروازے پر دستک دی۔ یہ ایک بڑا مکان تھا۔ دستک کی آواز رات کے سناٹے میں دُور تک گونجتی چلی گئی۔ بہرام خان کے چہرے کی ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ اُسے خدشہ تھا کہ خطیب مغرب پر ہاتھ ڈالنے سے شہر کی عوام میں ناراضگی پھیل سکتی تھی۔ بہرام یہ ماننے کے لئے تیار نہیں تھا کہ ابوجعفر قیصر کا جاسوس ہے۔ ابوجعفر بہرام کے خفیہ محکمے میں آنے سے پہلے بھی یہیں مقیم تھا۔ پھر آج یکایک وہ قیصر کا جاسوس کیسے بن گیا۔ وہ اپنے دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ سلطان نے قاسم کو شاہی سراغ رساں بنا کر غلطی کی ہے۔ وہ خود خفیہ محکمے کا سربراہ تھا اور اپنے سے بڑا سراغ رساں کسی کو نہ سمجھتا تھا۔ وہ قاسم کو ایک اناڑی اور جذباتی نوجوان تصور کرتا تھا۔ یہی باتیں سوچ سوچ کر اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ اتنے میں مکان کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ بہرام نے چونک کر دروازے کی جانب دیکھا۔ دروازہ غالباً ابوجعفر کے غلام چوکیدار نے کھولا تھا۔ اُس نے دروازہ کھولتے ہی کرخت لہجے میں پوچھا۔

"کون ہے؟..... جانتے نہیں کہ آدھی رات کا وقت ہے۔ کس غرض سے آئے ہو؟"

دستے کے باقی سپاہی اطراف میں تھے۔ سامنے صرف بہرام اور قاسم ہی تھے۔ قاسم نے آگے بڑھ کر چوکیدار سے بات کی۔

"ہمیں خطیب مغرب سے ملنا ہے..... ہم قونیا سے سلطان کا خاص پیغام لے کر آئے ہیں۔ ابوجعفر سے کہو سپہ سالار ریاض بیگ قونیا سے سلطان کا خصوصی پیغام لایا ہے۔"

قاسم کی بات سن کر چوکیدار کے چھکے چھوٹ گئے۔ وہ اگلے لمحے اُلٹے پاؤں بھاگا۔ وہ ابوجعفر کو اطلاع دینے گیا تھا۔ قاسم نے اس مہلت سے فائدہ اٹھایا اور سپاہیوں کو پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے مکان میں داخل ہو گیا۔ اب ننگی تلوار اُس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ آندھی اور طوفان کی طرح مکان کی اندرونی عمارت کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اُس

نے چوکیدار کو دیکھ لیا تھا کہ وہ کس طرف گیا ہے۔ قاسم، بہرام خان اور دیگر سپاہیوں کے ہمراہ عمارت کی پہلی راہداری میں داخل ہوا اور راہداری کے آخری کونے میں بنے کمرے کی طرف لپکا۔ قاسم سے پہلے چوکیدار اسی کمرے میں داخل ہوا تھا۔ قاسم کمرے کے قریب پہنچا تو رُک گیا۔ اندر کسی قسم کی کوئی آہٹ سنائی نہ دے رہی تھی۔ قاسم نے کمرے کے دروازے کو تھوڑا سا دھکیلا تو اُسے ایک دیوار کے ساتھ جلتی ہوئی مشعل لٹکتی ہوئی نظر آئی۔ کمرہ خالی تھا۔ وہ دبے قدموں اندر داخل ہوا اور حیرت سے چاروں جانب دیکھنے لگا۔ یہ دراصل وسطی کمرہ تھا۔ اس کے عقب میں یقیناً مکان کا باقی حصہ ہوسکتا تھا۔ کیونکہ کمرے کے اندر کی دیوار میں موجود دروازہ اُسی جانب کھلتا تھا..... یہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ غالباً چوکیدار ابھی ابھی اسی راستے سے گزرا تھا۔ قاسم نے کسی قدر احتیاط کے ساتھ اس دروازے کو پار کرنا چاہا۔ لیکن دوسری طرف آہٹ پا کر ٹھٹک گیا۔ پرلی طرف سے شاید کوئی آ رہا تھا۔ قاسم ایک دم پیچھے ہٹا اور اپنے عقب میں موجود سپاہیوں کو دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہونے کا اشارہ کیا۔ وہ خود بھی دروازے کے قریب ہی دیوار کے ساتھ چپک گیا تھا۔

کچھ دیر بعد چلتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی اور پھر کسی نے دروازے کو پرلی طرف سے دھکیلا۔ قاسم کا ہاتھ اپنی تلوار کے دستے پر مضبوطی سے جما ہوا تھا۔ بہرام اور اُس کے سپاہی سانس روکے کھڑے تھے۔ اس کمرے میں صرف چار سپاہی ساتھ آئے تھے۔ باقی دستہ باہر ہی اپنے اپنے مقام پر متعین تھا۔ جونہی دروازہ کھلا سب سے پہلے ابوجعفر کمرے میں داخل ہوا۔ اُس نے رات کا لباس پہن رکھا تھا اور اُس کی آنکھیں نیند سے لبریز تھیں۔ اُس نے کمرے میں قدم رکھا اور اگلے لمحے اُس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ کمرے میں چھ عدد مسلح افراد کو دیکھ کر اُس کی گھگی بندھ گئی۔ لیکن آخر وہ ابوجعفر تھا، اُس نے سنبھلنے میں مطلق دیر نہ لگائی اور آن کی آن میں چہرے پر غضبناکی کو طاری کر لیا اور حد آتش ناک لہجے میں بہرام خان سے مخاطب ہوا۔

''بہرام خان!..... یہ کیا بدتمیزی ہے؟ تمہیں میرے گھر میں بغیر اجازت داخل ہونے کی جرأت کیسے ہوئی؟''

ابوجعفر کی بات سے بہرام کی ٹانگیں کانپ گئیں۔ اُس نے منمناتے ہوئے لہجے میں کچھ کہنا چاہا، لیکن قاسم نے آگے بڑھ کر اپنی برہنہ شمشیر ابوجعفر کے سینے پر رکھ دی اور سانپ کی طرف پھنکارتے ہوئے کہا۔

''نیلی آنکھوں والے نقلی عرب اور قیصرِ قسطنطنیہ کے خطرناک جاسوس کو مسلمان سپاہیوں

پر آنکھیں نکالنے سے پہلے اپنے گریبان میں جھانکنا چاہئے۔''

یہ قاسم کا ایک نفسیاتی حربہ تھا۔ جس میں اُسے بہت کم کامیابی ہوئی۔ ابوجعفر ایک منجھا ہوا جاسوس تھا، اُس کی آنکھوں میں قاسم کی بات سے صرف ایک لمحے کے لئے خوف کی جھلک نظر آئی اور پھر اگلے لمحے اُس نے پوری طرح اپنے آپ پر قابو پا لیا اور انتہائی غصے سے کہا۔

''یہ کیا بکواس ہے؟ تم کس قسم کی اوٹ پٹانگ باتیں کر رہے ہو، کیا چاہتے ہو تم؟''

بہرام جو خود کو ایک ماہر سراغ رساں سمجھتا تھا، ابوجعفر کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے دل ہی دل میں کہا..... قاسم بن ہشام نے ابوجعفر پر ہاتھ ڈال کر غلطی کی ہے۔ یہ شخص وہ نہیں جو قاسم سمجھ رہا ہے..... قاسم کو بھی ابوجعفر کے جواب سے مایوسی ہوئی۔ لیکن اُس نے کوئی پرواہ کئے بغیر اپنے ساتھ آئے سپاہیوں کو حکم دیا۔

''گرفتار کر لو اسے۔ اور لے جا کر خفیہ محکمے کے تہہ خانے میں پھینک دو۔''

قاسم کے الفاظ مکمل ہونے کی دیر تھی کہ سپاہیوں نے آگے بڑھ کر ابوجعفر کو تلواروں کے نرغے میں لے لیا۔ ابوجعفر بظاہر خوفزدہ نہ ہونے کی اداکاری کر رہا تھا۔ لیکن درحقیقت وہ اندر سے لرز گیا تھا۔ سپاہیوں نے اُس کے ہاتھ پیچھے کی طرف کر کے زنجیر پہنا دی۔ بہرام کے چہرے پر خوف کی جھلک تھی۔ جسے قاسم محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا اور بہرام کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''بہرام خان! تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم میرے ساتھ چلو۔ میں تمہارے سامنے اس سے اُگلواتا ہوں کہ اس کا اصل نام کیا ہے؟ تم یہ مت سوچو کہ یہ بیس سال سے یہاں مقیم ہے۔ کیا تمہیں قیصر کے سازشی کردار اور طویل منصوبہ بندی کا علم نہیں۔ چلو میرے ساتھ!''

بہرام، قاسم کا فیصلہ سن کر کانپ گیا۔ قاسم شہر کے ایک مذہبی پیشوا کو خفیہ محکمے کے تہہ خانے میں اذیتیں دینا چاہتا تھا۔ یہ بات بہرام کے لئے پریشان کن تھی۔ وہ ادرنہ کے لوگوں کا مزاج جانتا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ قاسم نے اگر خطیب مغرب سے پوچھ گچھ کی تو شہر میں ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا۔ اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ قاسم کو اذیت کے خیال سے باز رکھے گا۔ یہی سوچتا ہوا وہ قاسم کے ہمراہ ابوجعفر سمیت باہر آیا۔ معاً اُس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی اور باہر پہنچتے ہی سپاہیوں سے کہنے لگا۔

''تم فی الحال ابوجعفر کو کوتوالِ شہر کے زندان میں لے جاؤ۔ تفتیش کا کام صبح ہوگا۔ اس

وقت ابوجعفر کو لے کر خفیہ محکمے کی جانب جانا مناسب نہیں۔"

قاسم نے کچھ کہنے کے لئے ہونٹ کھولے تو بہرام نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے روک دیا اور کہا۔

"کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں اتنے اہم شخص کو بغیر سرکاری اندراجات کے خفیہ محکمے کے تہہ خانے میں نہیں رکھ سکتا۔ کوتوالِ شہر کے زندان میں ایک مرتبہ اس کا اندراج ہو جائے تو تم اسے اپنی ذمہ داری پر تفتیش کے لئے لے جا سکتے ہو۔"

گویا بہرام نے عین وقت پر کام خراب کر دیا تھا۔ ظاہر ہے دستے کے سپاہی بہرام خان کے ماتحت تھے۔ قاسم کو ایک لمحے کے لئے ایسے لگا جیسے ہاتھ آیا ہوا شکار ہاتھ سے نکل رہا ہے۔

سپاہی، ابوجعفر کو لے کر ایک طرف چل دیئے۔ خفیہ محکمے کا پورا دستہ چلا گیا تو بہرام خان نے قاسم سے کہا۔

"تم نے بہت غلطی کی ہے۔ اب دُعا کرو کہ ابوجعفر کی گرفتاری کی خبر شہر میں نہ پھیلے۔ پرسوں جمعۃ المبارک ہے اور جمعہ کے اجتماعات میں ابوجعفر کی گرفتاری پر ہنگاموں کا خدشہ ہے۔ ایسی صورت میں ہم دونوں کے لئے بہت مشکل پیدا ہو جائے گی۔ سلطان کے بیٹے ہم پر چڑھ دوڑیں گے۔"

بہرام کے منہ سے سلطان کے بیٹے کا لفظ نکلا تو پہلی مرتبہ قاسم کی توجہ شہزادہ محمد کی جانب مبذول ہوگئی۔ اُسے یاد آیا کہ شہزادہ محمد نے قاسم سے دوستی کا وعدہ لیا تھا۔ اُس کے ذہن میں خیال آیا کہ وہ صبح ہوتے ہی ابوجعفر کے سلسلے میں شہزادہ محمد سے بات کرے گا۔ یہی سوچ کر اُس نے اطمینان کی سانس لی اور اپنے گھوڑے کی طرف بڑھ گیا۔ بہرام بھی اپنے گھوڑے پر سوار ہو چکا تھا۔ وہ کچھ دیر تک ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ پھر قاسم نے بہرام سے اجازت لی اور گھوڑے کا رُخ گھر کی طرف موڑ دیا۔

آج قاسم بری طرح تھک چکا تھا۔ اُسے سارا دن اور ساری رات بہ یک وقت ذہنی، جسمانی اور اعصابی جنگ لڑنی پڑی۔ وہ بستر پر لیٹا تو اُسے احساس ہوا کہ اُس کا بدن پھوڑے کی طرح دُکھ رہا ہے۔ اُس نے اپنے جسم پر کمبل تانا اور چند لمحوں بعد وہ نیند کی وادی میں اُتر چکا تھا۔

وہ دیر تک سوچتا رہا۔ اُس کی بھابھی اور بھائی یہ سوچ کر کہ وہ تھکا ہوا تھا، اُسے ناشتے کے وقت بھی نہ جگایا۔ اُس کا بھائی اور بھتیجے اپنے اپنے مکتب کی جانب چلے گئے اور دن

پوری طرح چڑھ آیا۔

دن چڑھے اُس کی آنکھ دستک پر کھلی۔ طاہر کے مکان کا بیرونی دروازہ زور زور کی دستک سے بج رہا تھا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا اُٹھا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وقت بہت زیادہ گزر چکا ہے۔ وہ بستر سے نکلا اور پیروں میں جوتے ڈال کر سیدھا بیرونی دروازے کی جانب بڑھا۔ دروازہ کھولتے ہی اُس کے چودہ طبق روشن ہو گئے.....

سامنے ابوجعفر کھڑا تھا۔ اُس کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔ اور اُس کے ہمراہ چار سپاہی اور دو سرکاری گماشتے تھے۔ ابوجعفر کو دیکھتے ہی قاسم کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"تم؟؟؟"

اُس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی جا رہی تھیں۔ اُسے یقین نہ آ رہا تھا کہ جس ابوجعفر کو اُس نے چند گھنٹے قبل کوتوالِ شہر کے زندان میں بھجوایا تھا، وہ دن دہاڑے اس قدر آزادی کے ساتھ قاسم کے سامنے موجود تھا۔ ابوجعفر نے قاسم کو ہکا بکا دیکھا اور اپنی سانپ جیسی آنکھوں کو چمکاتے ہوئے زہرخند لہجے میں بولا۔

"قاسم بن ہشام! میں بیس سال سے اور نہ میں انتہائی عزت کے ساتھ رہ رہا ہوں۔ جبکہ تمہیں ابھی یہاں آئے گنتی کے چند دن گزرے ہیں..... تم نے میرے ساتھ جو کچھ کیا اُس کا حساب دینے کا وقت بہت جلد آنے والا ہے۔ اس وقت میرے ہمراہ موجود سرکاری گماشتے تمہیں شہزادہ علاؤ الدین کے حضور پیش کرنے کے لئے آئے ہیں۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ شہزادہ علاؤ الدین کے خصوصی حکم سے مجھے رہا کیا گیا ہے۔"

ابوجعفر کی بات سے قاسم کے تن بدن میں غصے کی آگ دوڑ گئی۔ اُس نے ابوجعفر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آتش ناک لہجے میں کہا۔

"ابوجعفر! تم میری گرفت سے بچ نہیں سکتے۔ تمہارا ہر کھیل میری نظروں کے سامنے ہے۔ میں شہزادہ علاؤ الدین کے سامنے تمہارے چہرے کا نقاب اتار دوں گا۔ اور یاد رکھنا! اب جب میں تمہیں گرفتار کروں گا تو تمہیں میرے غضب سے بچانے والا کوئی نہ ہوگا۔"

ابوجعفر، قاسم کی بات پر قہقہہ مار کر ہنس دیا۔ اُس کے چہرے پر شیطنیت صاف دکھائی دیتی تھی۔ ابوجعفر نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"اب تم مجھے گرفتار نہیں کر سکتے۔ تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں جسے شاہی دربار میں پیش کر سکو۔ میں نے تمہارے بارے میں شہزادے کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ اب تم نئی چری کے ایک جانباز کماندار اسلم خان کے قتل کیس میں خود جیل جاؤ گے۔"

ابوجعفر کا مکروہ قہقہہ پھر فضا میں گونجا۔ قاسم کے لئے ابوجعفر کا اندازِ گفتگو برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔ لیکن اُس نے دماغ کو ٹھنڈا رکھنے کی کوشش کی اور ایک سرکاری گماشتے کی طرف متوجہ ہوا۔

''جی فرمایئے! آپ لوگ کس مقصد سے آئے ہیں؟'' قاسم کے لہجہ میں ہلکا سا طنز بھی تھا۔ سرکاری گماشتہ جو ایک خوش شکل نوجوان تھا کسی قدر سخت لہجے میں بولا۔

''ہم آپ کو اپنے ہمراہ لے جانے کے لئے آئے ہیں..... ہم شاہی محافظ دستے کے سپاہی ہیں اور ہمیں شہزادہ علاؤ الدین بن سلطان مراد خان ثانی نے بھیجا ہے۔''

قاسم اس صورتحال کے لئے تیار تھا۔ اُس نے نوجوان سے چند لمحوں کے لئے گھر تک جانے کی اجازت لی اور اندر چلا گیا۔ اُس کی بھابھی، ماں اور بوڑھے باپ کو کچھ خبر نہ تھی کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ قاسم کچھ بتائے بغیر گھر میں ضروری معاملات سے فارغ ہوا اور اپنی بھابھی کو یہ بتا کر کہ وہ قصرِ سلطانی کی طرف جا رہا ہے، باہر آ گیا۔

شہزادہ علاؤ الدین کے ساتھ یہ قاسم کی پہلی ملاقات تھی۔ وہ کسی قدر بے پرواہی سے شہزادے کے سامنے جا کر کھڑا ہوا تو شہزادے نے انتہائی غصے سے قاسم کو مخاطب کیا۔

''سنا ہے تم کو سلطانِ معظم نے شاہی سراغ رساں مقرر کیا ہے۔ لگتا ہے سلطانِ معظم بوڑھے ہو گئے ہیں۔ ادرنہ میں کون سی قیامت آنے والی تھی کہ شاہی سراغ رساں مقرر کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ تم نے ہمارے معزز مشیرِ سلطنت کو حراست میں لینے کی کوشش کر کے ہماری توہین کی ہے۔ ہم سلطانِ معظم سے تمہاری گستاخی کی شکایت کریں گے۔ جب تک سلطانِ معظم قونیا سے واپس لوٹتے ہیں تب تک ہم تمہیں نظر بند کرتے ہیں۔ تمہاری بے باکی اور بیوقوفی کی سزا سلطانِ معظم خود آ کر تمہیں دیں گے۔''

شہزادے کی بات سن کر قاسم کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ ابوجعفر نے جو کھیل کی بساط بالکل اُلٹ چکی تھی۔ شہزادے کا لب و لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ قاسم کی کوئی بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔ لیکن پھر بھی قاسم نے جرأت کر کے کہا۔

''شہزادہ حضور! آپ مجھے نظر بند کرنے میں جلدی نہ کریں..... پہلے.....''

شہزادے نے قاسم کی بات درمیان میں کاٹ دی۔

''خاموش! کچھ بولنے کی ضرورت نہیں۔ تمہیں اگر سلطانِ معظم نے عزت نہ بخشی ہوتی تو ہم ابھی اور اسی وقت تمہارا سر قلم کروا دیتے۔''

اب قاسم کے لئے بولنے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ شہزادے کے دربان ننگی تلواریں

لئے قاسم کے منتظر کھڑے تھے۔ قاسم نے مایوسی سے شہزادے کی جانب دیکھا اور بے بسی سے سر جھکا لیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ابوجعفر کی چال کامیاب رہی اور قاسم، ادرنہ کو قیصر کے جاسوسوں سے نہ بچا سکا۔ شہزادے کے حکم پر دربانوں نے قاسم کو حراست میں لے لیا اور شاہی محل میں موجود خصوصی زندان میں قاسم کو لے جا کر بند کر دیا۔ یہاں سلاخوں والا زندان نہیں تھا۔ یہ محض ایک وسیع کمرہ تھا جس میں دونوں طرف چار چار کھڑکیاں تھیں۔ ہر کھڑکی میں باریک لیکن مضبوط سلاخیں لگی تھیں اور باہر مسلح پہرے دار موجود تھے۔

اب قاسم ادرنہ کے بچاؤ کے لئے کچھ نہ کر سکتا تھا۔ حتیٰ کہ شاہی زندان میں اُس کے پاس کوئی دوسرا قیدی بھی نہ تھا جس کے ساتھ وہ ذرا سی بات کر لیتا۔ اُسے بے حد فکر تھی کہ کسی طرح ادرنہ کو پیش آمدہ بغاوت کے خطرے سے بچایا جا سکے۔

لیکن خوش قسمتی سے ابوجعفر نے خود ہی وقتی طور پر ینی چری میں بغاوت پیدا کرنے کا خیال ترک کر دیا تھا۔ وہ انتہائی شاطر اور چال باز شخص تھا۔ چنانچہ اُس نے سوچا کہ اس وقت جب اس کا حریف قاسم، شہزادہ علاؤ الدین کے سامنے یہ کہہ دے گا کہ عنقریب ینی چری میں بغاوت اُٹھنے والی ہے..... اس بغاوت کا اُٹھنا مناسب نہیں۔ اس طرح شہزادے کو مجھ پر شک ہو سکتا ہے۔ اُس نے اپنے مخصوص طریقوں سے اپنی سازش کے تمام مہروں کو خبر کر دی کہ طے شدہ بغاوت مختصر وقت کے لئے مؤخر کی جاتی ہے..... وہ نہیں چاہتا تھا کہ بہرام اور شہزادہ علاؤ الدین کے سامنے قاسم نے جن خدشات کا اظہار کیا ہے وہ متوقع وقت پر ظاہر ہوں۔ چنانچہ اُس نے قاسم کو جھوٹا دکھانے کے لئے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں تاخیر کر دی۔ ادھر قاسم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زیادہ سے زیادہ بے چین ہوتا جا رہا تھا۔

کئی روز گزر گئے۔ ماریا اپنی جگہ بے چین اور پریشان تھی اور قاسم کے اہل خانہ اپنی جگہ تڑپ رہے تھے۔ قاسم کا کوئی سراغ نہ ملتا تھا۔ اُس کے بھائی طاہر نے شہر کا کونہ کونہ چھان مارا۔ اُس نے کوتوالِ شہر کے سپاہیوں کے ہمراہ بہت سی جگہوں کی تلاشی لی لیکن قاسم کا سراغ نہ ملا۔ قاسم کیسے ملتا وہ تو قصرِ سلطانی کے شاہی زندان میں قید تھا۔

ماریا ہر روز اکبر کو قاسم کی تلاش میں دوڑاتی۔ لیکن وہ شام کو مایوس لوٹ آتا۔ وہ اُسے کئی بار لالہ شاہین کی یادگار بھی بھیج چکی تھی۔ اور دو تین مرتبہ اکبر، قاسم کے گھر سے بھی ہو آیا تھا۔

ایک روز ماریا کو خیال آیا کہ ابوجعفر کے بارے میں معلوم کیا جائے۔ کیونکہ آخری

ملاقات میں قاسم نے ابوجعفر کو گرفتار کرنے کا منصوبہ بتایا تھا۔ جبکہ اکبر اب تک ماری کو اپ
بتا چکا تھا کہ ابوجعفر شہر میں صحیح سلامت موجود ہے۔ ماری یہ سمجھی تھی کہ ابوجعفر کو بالکل گرفت
نہیں کیا گیا۔ اُسے اس بات پر بھی حیرت تھی کہ اس دوران ایک مرتبہ بھی اُس کی ماں
پاس نہ آیا تھا۔ البتہ اس کی ماں اس عرصے میں دو ایک مرتبہ گھر سے باہر کہیں گئی تھی
ماری نے ماں کو بہت ٹٹولنے کی کوشش کی لیکن مارتھا پختہ کار اور چالاک تھی۔ ماری کے
دام میں نہ آئی۔ ماری نے اکبر کو یہ ہدایات دے کر ابوجعفر کی جانب روانہ کیا کہ وہ
کے خادموں سے مل کر کسی طرح اُس رات کے بارے میں تفصیل معلوم کرنے کی کوشش
کرے جس رات قاسم ابوجعفر کے گھر پر دھاوا بولنے والا تھا..... لیکن اکبر بھی کوئی خاص
نہ لا سکا۔ اسی طرح کئی روز گزر گئے لیکن قاسم کی کوئی خبر نہ ملی۔ قاسم کی خبر کیسے ملتی۔
نادان شہزادے کی قید میں تھا۔

اور پھر ایک روز یہ خبر ملی کہ شہاب الدین پاشا کی سرکردگی میں جانے والا ترکوں کا
''نیش'' کے مقام پر ''ہونیاڈے'' کی افواج سے بری طرح شکست کھا چکا ہے۔

واقعہ یوں تھا کہ سلطان مراد خان ثانی ایشیائے کوچک کے شہر قونیا میں ''امیر کرما
کے ساتھ برسر پیکار تھا۔ جبکہ اِدھر عثمانی لشکر شہاب الدین پاشا اور محمد چلپی کی زیر قیا
ہونیاڈے کی کثیر افواج کے تیروں کی زد میں تھا۔ عیسائی لشکر ''دریائے ڈینوب'' عبو
کے ''نیش'' کے مقام پر عثمانی فوج کے سامنے خیمہ زن ہوا تھا۔ ہونیاڈے کے جھنڈ
تلے پوری عیسائی دنیا کے نامور سپاہی تھے۔ جبکہ شہاب الدین پاشا کے ہمراہ اسّی ہزار
تجربہ کار سپاہ تھی۔ علی الصبح دونوں لشکروں کے درمیان معرکے کا آغاز ہوا۔ یہ 1443
سال تھا۔ دوپہر تک ''نیش'' کی زمین پر گھمسان کا رن پڑا۔ محمد چلپی کی پیدل سپاہ
وار لڑ رہی تھی جبکہ محمد چلپی خود گھوڑے پر سوار اپنے پیادوں کو رہنمائی دے رہا تھا۔

دوپہر کے قریب جب رزم گاہ میں ہر طرف سر اُچھل رہے تھے اور لاشیں گر رہی تھ
اچانک اُس وقت مسلمانوں کا پلّہ بھاری ہونے لگا جب سالار امیر خان اپنے پانچ ہزار
محفوظ دستے کو اچانک قریبی پہاڑی سے لے کر اُترا اور اللہ اکبر کی صدائیں بلند کرتا
دشمن کے میسرہ کو چیرتا چلا گیا۔ امیر خان میسرہ کی جانب سے یلغار کرتا ہوا دشمن کے قل
تک جا پہنچا۔ اُس نے پہلے سے سوچ رکھا تھا کہ وہ دشمن کے سپہ سالار ہونیاڈے پر
کرے گا۔ وہ پوری قوت سے لڑتا ہوا اور دشمن کے بہادروں کو گاجر مولی کی طرح کا
ہونیاڈے کے بہت نزدیک پہنچ گیا۔ یکلخت اُس نے اپنے دائیں بائیں دیکھا تو

احساس ہوا کہ وہ دشمن کی تلواروں کے درمیان بری طرح گھر چکا ہے۔ لیکن امیر خان نے گھبرانے کی بجائے اپنے بازو کی حرکت کو مزید تیز کر دیا اور ہونیاڈے کے محافظ دستہ کو چیرنے لگا۔ اب ہونیاڈے کا گھوڑا اُس کے بالکل سامنے تھا۔ وہ کافی دیر سے مسلسل تلوار چلا رہا تھا۔ اچانک اُس نے محسوس کیا کہ اُس کا بازو شل ہو چکا ہے۔ امیر خان کو ایسا لگا کہ اُس کا وقت شہادت آ پہنچا ہے۔ اسی لمحے اُس کے ذہن میں ایک عجیب خیال آیا اور اُس نے نشانہ تاک کر پوری قوت سے اپنی تلوار نیزے کے سے انداز میں ہونیاڈے کی جانب پھینکی۔ تلوار تیر کی طرح ہوا کو چیرتی چلی گئی اور سیدھی ہونیاڈے کی پشت میں جا کر پیوست ہو گئی۔ ہونیاڈے فوراً اپنے گھوڑے پر سے گر پڑا۔ امیر خان جونہی غیر مسلح ہوا ان گنت تلواریں ایک ساتھ اُس کی جانب لپکیں اور اُس کے جسم کو کئی ٹکڑوں میں کاٹ دیا..... اُدھر ہونیاڈے گھوڑے سے گر تو پڑا تھا لیکن فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ تلوار پھینکتے وقت امیر خان کے بازو میں زیادہ طاقت نہ تھی۔ چنانچہ تلوار کی محض نوک ہونیاڈے کی مضبوط چربی میں اُتری اور جونہی ہونیاڈے نیچے گرا، تلوار خود بخود باہر نکل کر گر پڑی۔ گو کہ ہونیاڈے زخمی ہو چکا تھا لیکن وہ بڑی بہادری سے دوبارہ گھوڑے پر سوار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

آغا حسن اور ینی چری کے بہت سے دوسرے سالار بھی اس معرکے میں شریک تھے۔ جبکہ محمد چلپی سب سے زیادہ سرگرم تھا۔ وہ اپنے پیادوں کو لے کر دشمن کے قلب میں بہت آگے تک گھس گیا۔ اُس کے سپاہی دشمن کے لشکر میں گھس کر کشتوں کے پشتے لگا رہے تھے۔ محمد چلپی کا گھوڑا بجلی کی رفتار سے دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں دوڑتا پھر رہا تھا۔ یکلخت محمد چلپی کی جانب دشمن کے کسی سپاہی کا نیزہ لپکا اور اُس کے گھوڑے کا پیٹ پھاڑتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔ محمد چلپی گھوڑے کے زمین بوس ہونے سے پہلے چھلانگ لگا کر نیچے اُتر آیا۔ اب وہ بھی پا پیادہ ہو چکا تھا۔ اُس کی تلوار رعد و صاعقہ کی طرح دشمن کے سر پر کھڑک رہی تھی۔ اُس نے پے در پے کئی سپاہیوں کے سر اُن کے دھڑوں سے الگ کر دیئے۔ لیکن اچانک کسی جانب سے ایک ناگہانی آفت خود اُس پر آ پڑی۔ ایک مضبوط رسّی جس کے سرے پر پھندا بنا ہوا تھا ہوا میں تیرتی ہوئی محمد چلپی کی جانب لپکی۔ اور اس سے پہلے کہ وہ کوئی مدافعت کرتا، پھندا اُس کی گردن میں آ پڑا۔ اگلے لمحے وہ ایک زوردار جھٹکے سے زمین پر اوندھے منہ جا گرا۔ کیونکہ رسّی کا پھندا پھینکنے والا دشمن کا سوار اپنے گھوڑے کو ایڑھ لگا چکا تھا۔ محمد چلپی گھوڑے کے ساتھ گھسٹتا چلا گیا۔

محمد چلپی کی گرفتاری کی خبر آناً فاناً ترک لشکر میں پھیل گئی۔ اور سپاہ کے حوصلے ایک د
پست ہونے لگے۔ شام سے پہلے جنگ کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ ترک لشکر بری طرح ہزیمت ا
چکا تھا۔ چار ہزار ترک فوجی گرفتار کر لئے گئے تھے اور بہت سے شہید کر دیئے گئے تھے
اور اس طرح شہاب الدین پاشا کے بہادر لشکر کو ہونیاڈے کی کثیر الملکی فوج کے ہاتھ
ایک عبرتناک شکست ہوئی تھی۔

ہونیاڈے نے ترک لشکر کو شکست دی تو اُس کے حوصلے مزید بڑھ گئے اور اُس
ترکوں کا تعاقب کرتے ہوئے سلطنت عثمانیہ کے شہر ''صوفیا'' پر قبضہ کر لیا۔ چند دن بع
کوہِ بلقان کو عبور کر کے 'فلپوپولس' پر حملہ کرنے کے لئے تیار ہوا تو ترکوں نے کوہِ با
کے دامن میں ایک مرتبہ پھر مقابلہ کیا۔ لیکن اس مرتبہ بھی اُن کو شکست ہوئی۔ عیسا
کے لئے اب میدان خالی تھا۔ مسلسل فتوحات سے اُن کی ہمتیں بڑھی ہوئی تھیں۔

سلطان مراد خان ابھی تک قونیا کی مہم سے واپس نہ لوٹا تھا۔ اُس نے اپنے لشکر
شکست، اپنے علاقوں کی تباہی کا حال ایشیائے کوچک میں سنا اور جلد از جلد واپس لوٹنے
تیاری کرنے لگا۔ ہونیاڈے ''رومیلیا'' اور ''وادیٔ بلقان'' کو تاخت و تاراج کرنے کے
سلطنت عثمانیہ کے دارالخلافہ ادرنہ کی جانب آسانی سے بڑھ سکتا تھا۔ سلطان ادرنہ
نہیں تھا اور ہونیاڈے کی طاقت ورفوج کے لئے ادرنہ پر قبضہ کرنا چنداں مشکل نہیں
لیکن وہ اپنے کارناموں کی داد لینا چاہتا تھا۔ چنانچہ اُس نے اتحادی افواج کے ذر
ادرنہ پر قبضہ کرنے کی بجائے واپسی کا قصد کیا۔ اور ''بودا'' کے مقام پر عیش و مستی
محفلوں میں ڈوب گیا۔

قاسم ان حالات سے بالکل بے خبر تھا۔ جبکہ مارسی اور قاسم کے اہل خانہ کی حا
بہت پتلی تھی۔ طاہر، قاسم کی گمشدگی سے اس قدر پریشان ہوا کہ بالآخر ایک روز
سلطانی تک جا پہنچا۔ وہ شہزادہ محمد سے ملنا چاہتا تھا۔ کیونکہ قاسم نے اُسے شہزادہ محم
ساتھ اپنے تعلق کی بابت بتا دیا تھا۔ آج اُس نے سوچا کہ شہزادہ محمد سے ملاقات کر
قاسم کی گمشدگی کے بارے میں آگاہ کیا جائے۔ ہوسکتا ہے شہزادہ اُس کی بازیابی کے
میں کچھ مدد کرے۔ کیونکہ شہزادے نے قاسم کو اپنا دوست بنانے کی خواہش ظاہر کی
طاہر نہایت بے دلی سے شہزادے کو ملنے چلا آیا۔ کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ شہزادہ ابھی
چودہ سال کا نوعمر لڑکا ہے اور اُس سے کسی پختہ فیصلے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ لیکن
طاہر چلا آیا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا چاہئے..... اسی تنکے کا سہارا لینے کے لئے طا

شام، شہزادہ محمد سے ملنے کے لئے آج قصرِ سلطانی میں حاضر ہوا تھا۔ وہ محل میں داخل ہوا
محل کے منتظم اعلیٰ نے اُسے اپنے کمرے میں بٹھا کر شہزادہ محمد کے پاس پیغام بھیجا۔ شہزادہ
کو جونہی معلوم ہوا کہ قاسم بن ہشام کا بڑا بھائی طاہر بن ہشام اُس سے ملنے کے لئے
آیا ہے تو اُس نے دربانوں یا خواجہ سراؤں کو بھیجنے کی بجائے خود چل کر اُس کا استقبال
کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ طاہر کے پاس انتظار گاہ میں پہنچا تو محل کا منتظم اعلیٰ اور دیگر لوگ
شہزادے کے احترام میں اُٹھ کھڑے ہوئے۔

شہزادہ، طاہر سے بغلگیر ہو کر ملا اور چھوٹتے ہی پوچھا۔

''قاسم بن ہشام کہاں ہیں؟..... انہوں نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ وہ وقتاً فوقتاً ہم
سے ملنے کے لئے قصرِ سلطانی میں تشریف لایا کریں گے۔ لیکن جب سے وہ گئے ہیں ایک
دفعہ بھی لوٹ کر نہیں دیکھا۔ ہم چاہتے تو اُنہیں بلوا سکتے تھے۔ لیکن ہم نے سوچا وہ اپنے
کام میں مصروف ہوں گے۔''

شہزادہ جس وقت بات کر رہا تھا، محل کا منتظم اعلیٰ چونک کر شہزادے کی جانب دیکھ رہا
تھا لیکن منتظم اعلیٰ کی طرف طاہر اور شہزادہ محمد دونوں کی توجہ نہ تھی۔ کچھ ہی دیر بعد شہزادے
نے طاہر سے قاسم بن ہشام کی گمشدگی کے بارے میں سنا تو ہکا بکا رہ گیا اور مزید کچھ کہے
بغیر طاہر کو اپنے ہمراہ لے کر اپنے کمرۂ خاص کی جانب چل دیا۔ اُس کے دماغ میں بے
شمار سنسنی بھر چکی تھی۔ قاسم کا ادرنہ میں اس طرح اچانک کھو جانا اس بات کی علامت تھا کہ
ادرنہ میں کوئی گہری اور خطرناک سازش یقیناً پروان چڑھ رہی ہے۔ اب اُسے ان سنی سنائی
باتوں پر یقین ہونے لگا کہ ادرنہ میں قیصر کے جاسوس موجود ہیں۔ اُس نے اپنے کمرے
میں پہنچتے ہی طاہر سے سوال کیا۔

''قاسم آج سے کتنے روز قبل غائب ہوا؟ اور یہ بھی بتایئے کہ آخری مرتبہ وہ کس طرف
جانے کے لئے گھر سے نکلا تھا؟''

طاہر نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کسی قدر جھجکتے ہوئے کہا۔

''آخری مرتبہ قاسم اپنی بھابھی کو یہ بتا کر روانہ ہوا تھا کہ وہ قصرِ سلطانی کی جانب جا
رہا ہے۔ آج اُسے گھر سے نکلے ہوئے تیسرا ہفتہ ختم ہونے کو آیا ہے۔ پہلے پہل تو ہم یہ
سمجھے کہ اپنے کام کی نوعیت کی وجہ سے وہ گھر نہ آ سکا ہوگا۔ اور پھر ہمارے گھر میں ایک
نامعلوم شخص یہ پیغام چھوڑ گیا کہ قاسم، سلطان سے ملنے کے لئے قونیا کی جانب جا چکا ہے۔
لیکن کل جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ قاسم قونیا کی جانب نہیں گیا بلکہ وہ ادرنہ سے باہر نکلا

ہی نہیں تو مجھے تشویش ہوئی۔ تب میں نے سوچا کہ قصرِ سلطانی میں حاضر ہو کر شہزادہ
سے مدد کی درخواست کی جائے۔"

نوعمر شہزادہ پورے انہماک سے طاہر کی باتیں سن رہا تھا اور ہر جملے کے ساتھ اُ
حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ خصوصاً جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ قاسم آخری مرتبہ قصرِ سلطا
جانب آیا تھا تو شہزادے کو اور بھی زیادہ حیرت ہوئی۔ اُسے یوں لگا جیسے قاسم اُسی سے
کے لئے آ رہا تھا۔ معاً اُس کے ذہن میں ایک خیال آیا اور اگلے لمحے اُس نے
کمرے کے دروازے پر موجود خادم کی وساطت سے محل کے منتظم اعلیٰ کو بلوا بھیجا۔
طاہر سے کوئی بات نہ کر رہا تھا بلکہ پریشانی کے عالم میں کمرے کے فرش پر ٹہل رہا تھا
ہی دیر بعد محل کا منتظم اعلیٰ اجازت لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ اُس کے چہرے
قدر تجسس کی رمق تھی۔ وہ اندر داخل ہوا اور مؤدب انداز میں ایک جانب کھڑا
شہزادہ محمد نے منتظم اعلیٰ سے دریافت کیا۔

"علی خان!..... آج سے تین ہفتے قبل شاہی سراغ رساں قاسم بن ہشام ہم سے
کے لئے محل میں حاضر ہوئے تھے۔ لیکن وہ ہم تک نہیں پہنچے۔ آپ اس سلسلے میں ہ
بتا سکتے ہیں؟"

شہزادے کی بات سن کر علی خان کے چہرے پر خوف کے سائے نظر آنے لگے
نے کانپتی ہوئی آواز کے ساتھ جواب دیا۔ "شہزادہ حضور! آج سے تین ہفتے قبل قا
ہشام یہاں آئے تھے۔ لیکن آپ سے ملنے کی بجائے شہزادہ علاؤ الدین کی خد
حاضر ہوئے تھے۔ اور شہزادہ علاؤ الدین....."

محل کا منتظم اعلیٰ کچھ بتاتے بتاتے رُک گیا۔ اُس کے اندازِ گفتگو نے شہزاد
ساتھ ساتھ طاہر کو بھی چونکا دیا۔ ضرور کوئی بات تھی جسے بتاتے ہوئے علی خان ڈر
اچانک شہزادہ محمد گرجا۔

"علی خان! رُک کیوں گئے؟ ہمیں بتاؤ کہ قاسم بن ہشام، بھائی جان سے
بعد کہاں گئے؟ ڈرو مت۔ تمہیں جو کچھ معلوم ہے سچ سچ بتا دو۔"

اب طاہر کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ خدا جانے علی خان کیا بتانے والا تھا
محمد اور طاہر کی نگاہیں علی خان کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ اچانک علی خان نے
کیا کہ شہزادہ علاؤ الدین نے قاسم بن ہشام کو اور نہ میں نقص امن پیدا ہو جائے
سے سلطانِ معظم کی آمد تک شاہی زندان میں نظر بند کر رکھا ہے۔ شہزادہ محمد کے

توقع تھی۔ اُسے یہ تو معلوم تھا کہ اُس کا بڑا بھائی ولی عہد سلطنت ہے اور سلطان کی
موجودگی میں احکام جاری کر سکتا ہے۔ لیکن اُسے یہ توقع نہ تھی کہ اُس کا بڑا بھائی قاسم
ہشام جیسے کھرے اور مخلص مردِ مجاہد کو نظر بند کر دے گا۔ اُسے کچھ سمجھ نہ آ رہی تھی کہ کیا
ے۔ طاہر ہے شہزادہ علاؤ الدین، شہزادہ محمد سے بڑا بھی تھا اور با اختیار بھی۔ طاہر بن
م کی حالت بھی غیر تھی۔ اُسے تو سرے سے کچھ معلوم ہی نہ تھا کہ شہزادہ علاؤ الدین
کون سے نقص امن کا خطرہ ظاہر کیا۔ طاہر اور شہزادہ محمد ایک ہی انداز میں سوچ رہے
قصرِ سلطانی کے منتظم اعلیٰ علی خان نے انہیں چونکا دیا۔

"شہزادہ حضور! دراصل شاہی سراغ رساں قاسم بن ہشام نے خطیب مغرب ابوجعفر کو
گرفتار کر لیا تھا اور یہ شک ظاہر کیا تھا کہ یہ شخص اندرنہ میں قیصر کے جاسوسوں کا
ہے..... اور آپ تو جانتے ہیں کہ شہزادہ علاؤ الدین، خطیب مغرب ابوجعفر کی بہت
عزت کرتے ہیں۔ شہزادہ علاؤالدین کا خیال تھا کہ قاسم بن ہشام نے ایک معزز
کو گرفتار کر کے اندرنہ میں نقصِ امن کا خطرہ پیدا کر دیا ہے..... یہی وجہ ہے کہ انہوں
م بن ہشام کو نظر بند کر دیا۔"

اب شہزادے نے اطمینان کی سانس لی۔ کیونکہ اُسے واقعہ کی حقیقت معلوم ہو چکی تھی۔
نے اُسی وقت اپنے بڑے بھائی کو ملنے کا فیصلہ کیا اور علی خان کو جانے کی اجازت
دی۔ اب وہ شہزادہ علاؤ الدین کے پاس جانا چاہتا تھا۔ اُس نے طاہر بن ہشام کو
انے میں انتظار کرنے کے لئے بٹھایا اور خود شہزادہ علاؤ الدین کے کمرۂ خاص کی
بڑھ گیا۔

زادہ علاؤ الدین کے لئے محمد کی بات بچگانہ تھی۔ اُس نے شہزادہ محمد کی بات سن کر
"سلطانِ معظم کی واپسی سے پہلے میں اُس نالائق سراغ رساں کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اگر
اندرنہ سلطان کی عدم موجودگی میں اندرنہ کے اندر بغاوت اُٹھ کھڑی ہوئی تو اس کا ذمہ
ہو گا؟"

لیکن شہزادہ محمد اس بات سے مطمئن نہ ہوا۔ اُس نے احتجاج سے بھرپور لہجے میں کہا۔
"برادرِ ذی وقار!..... آپ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ اُس نوجوان کو خود سلطانِ معظم نے
ہونے والی سازش کا سراغ لگانے کے لئے شاہی سراغ رساں مقرر فرمایا ہے۔
آپ کی وجہ سے اس کا کام تعطل کا شکار ہو گیا تو اس کی ذمہ داری کس پر ہو گی؟"
محمد کی بات علاؤ الدین پر ذرا بھر بھی اثر انداز نہ ہوئی۔ بلکہ اُس نے پہلے سے

بھی زیادہ سخت لہجے میں کہا۔

''محمد! تم ابھی بچے ہو۔ تمہیں کیا معلوم یہ شخص قاسم بن ہشام حقیقت میں کون ہے۔ ہمیں خطیب مغرب ابوجعفر نے بتایا ہے کہ یہ شخص گزشتہ تہوار میں اچانک نمودار ہوا اور اس کی آن میں سلطانِ معظم کا دل جیت لیا۔ اور پھر جب سلطانی لشکر قونیا کے لئے روانہ ہوا تھا اور سلطانِ معظم نے خود اس شخص کو اپنے ہمراہ چلنے کا حکم دیا تھا تو اُس نے بہانے بنا سے کام لے کر یہیں دارالسلطنت میں رہنے اور کسی ان دیکھی سازش کا قلع قمع کرنے بات کر دی۔ اس پر سادہ لوح سلطانِ معظم نے اس مشتبہ شخص کی بات مان لی اور اپنے ہمراہ میدانِ جنگ میں لے جانے کی بجائے یہیں اور نہ میں چھوڑ دیا..... تم جانتے کہ ابوجعفر ہماری سلطنت کے پرانے وفادار ہیں۔ یہی بات قاسم بن ہشام کو کھٹکی اور نے ہمارے وفادار ابوجعفر کو گرفتار کر لیا۔ ہمیں جونہی بہرام خان نے اس گرفتاری کی اطلاع دی ہم نے ابوجعفر کو رہا کرنے اور قاسم کو گرفتار کرنے کا حکم دے دیا..... تم مطمئن رہو نے جو کچھ بھی کیا ہے سلطنت کے لئے کیا ہے۔ چند ہی دنوں میں سلطانِ معظم کی ہونے والی ہے۔ سلطانِ معظم کے آتے ہی ہم تمام حقیقت حال اُن کے سامنے دیں گے۔''

شہزادہ محمد نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ابوجعفر اُس کے بھائی کو پوری طرح اپنے شیشے اتار چکا ہے۔ اس نے سوچا کہ شہزادہ علاؤ الدین اُس کی کوئی بات نہ مانے گا اور سلطان کی آمد سے پہلے کبھی رہا نہ کرے گا۔ یہی سوچ کر وہ خاموش رہا اور اپنے بھائی اجازت لے کر چلا آیا۔ اب اُس کے ذہن نے کچھ اور سوچ لیا تھا۔ وہ تیز تیز قدموں چلتا ہوا مہمان خانے کی جانب آیا اور آتے ہی قاسم کے بھائی طاہر کو اپنے نئے سے آگاہ کیا۔ اُس نے طاہر سے کہا۔

''شہزادہ علاؤ الدین کو ابوجعفر اپنے شیشے میں اتار چکا ہے۔ لہٰذا اُن سے کوئی توقع کہ وہ آپ کے بھائی اور ہمارے دوست قاسم بن ہشام کو سلطان کی آمد سے قبل دیں۔ لیکن ہمیں اندیشہ ہے کہ قاسم بن ہشام کی نظر بندی کے دوران سلطنت کے کام کر جائیں گے..... آپ ایک تکلیف کیجئے! اپنے لئے بھی، سلطنت کے لئے ہمارے لئے بھی۔''

شہزادہ محمد اتنا کچھ کہہ کر خاموش ہو گیا تو طاہر نے کہا۔ ''آپ جو کچھ فرمانا چاہیں بے فکر ہو کر فرما دیجئے! میں آپ کے ہر مشورے کو بسر و چشم قبول کروں گا۔''

طاہر کی بات سے شہزادہ محمد خوش ہوا اور دوبارہ کہنے لگا۔ ''آپ یوں کیجئے کہ کل صبح ہی ہمارا خط لے کر انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ ایشیائے کوچک کی جانب چل دیجئے اور خود سلطانِ معظم کو ساری صورتحال سے مطلع کیجئے۔ مجھے یقین ہے کہ سلطانِ معظم شہزادہ علاؤ الدین کی جانب فی الفور کوئی سخت پیغام روانہ فرمائیں گے۔''

طاہر نے فوراً حامی بھر لی اور پُرجوش لہجے میں کہا۔

''آپ کا مکتوب کس وقت مجھے ملے گا؟''

''آپ ابھی جا کر سفر کی تیاری کیجئے۔ کل علی الصبح روانہ ہونے سے پہلے آپ کے پاس ہمارا خط پہنچ جائے گا۔''

شہزادہ محمد اور طاہر کے درمیان کچھ دیر باقی معاملات کی تفصیلات طے ہوتی رہیں۔ اور پھر طاہر اجازت لے کر قصرِ سلطانی سے نکل آیا۔ اب اُس کی کیفیت عجیب تھی۔ وہ کسی حد تک مطمئن بھی تھا۔ کیونکہ اُسے معلوم ہو چکا تھا کہ اُس کا بھائی کہاں ہے؟ اور کس حال میں ہے؟ وہ تیز تیز قدموں سے ملاقاتیوں کے اصطبل کی جانب آیا اور اپنا گھوڑا کھول کر اپنے گھر کی جانب چل دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اُس کے بچے کتنے خوش ہوں گے جب انہیں معلوم ہو گا کہ اُن کا پیارا چچا خیر خیریت سے صحیح سلامت قصرِ سلطانی میں موجود ہے۔ وہ اگلے روز کے سفر کے متعلق سوچتا ہوا جونہی اپنے مکان کے دروازے پر پہنچا تو یہ دیکھ کر اُس کے ماتھے پر بل پڑ گئے کہ مکان کے دروازے سے باہر ایک چھوٹی بگھی کھڑی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے کوئی مہمان خاتون اندر موجود ہو۔ طاہر سوچنے لگا کہ ایسی مہمان کون ہو سکتی ہے؟ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اندرنہ میں اُس کے ملنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ سوائے اُس کے گھریلو تعلقات تو کسی ایسے شخص کے ساتھ نہیں جن کی خواتین بگھیوں میں سفر کرتی ہیں۔ یہ ضرور طبقۂ امراء کی کوئی خاتون ہو سکتی ہے۔ بہرحال اسی قسم کی باتیں سوچتا ہوا طاہر بن ہشام اپنے گھر میں داخل ہوا۔ اُس کے بچے صحن میں کھیل رہے تھے۔ انہوں نے بھاگتے ہوئے طاہر کے پاس آئے اور اپنے باپ سے کہنے لگے۔

''ابو! گھر میں ایک عورت آئی ہے..... وہ چچا قاسم کے بارے میں پوچھتی ہے۔ امی اندر اُس کے ساتھ باتیں کر رہی ہیں۔''

طاہر کے ماتھے کی شکنیں مزید گہری ہو گئیں۔ یہ کون ہو سکتی ہے؟ اُس کا تجسس بہت بڑھ گیا۔ گویا جو خاتون ملنے آئی تھی وہ قاسم کو جانتی تھی۔ یہ اور بھی حیرت کی بات تھی۔ قاسم کو تو چند ہی مہینے قبل اندرنہ میں وارد ہوا تھا۔ اتنی جلدی ایک خاتون کے ساتھ اُس کے

مراسم کیسے بن گئے؟ اسی خیال میں گم وہ مکان کے دوسرے کمرے میں داخل ہوا۔ دونوں بچے اُس کے دائیں بائیں تھے اور مسلسل بول رہے تھے۔ طاہر نے اُن کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اُن سے کہا۔

''جاؤ بیٹا! اپنی امی کو یہاں بلا لاؤ..... شاباش!''

دونوں بچے فوراً بھاگ کھڑے ہوئے۔ چند لمحے بعد طاہر کی بیوی کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر طاہر کی حیرت دوچند ہوگئی۔ اُس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''کیا بات ہے، کون خاتون مہمان آئی ہے؟ اور قاسم کے بارے میں کیا پوچھتی ہے؟''

طاہر کی بیوی سکینہ کے چہرے پر شرارت آمیز مسکراہٹ مزید گہری ہوگئی۔

''آپ بس اب قاسم کو ڈھونڈ لائیے۔ اللہ نے ہمیں چاندسی دُلہن عنایت کر دی ہے''

طاہر مسکرانے کی بجائے اور زیادہ سنجیدہ ہوگیا اور کہنے لگا۔ ''سکینہ! ہوش سے کام لو۔ تم کیا کہہ رہی ہو؟ ایک اجنبی لڑکی سے پہلی ملاقات میں اس قدر بے تکلفی اچھی نہیں پہلے یہ بتاؤ کہ یہ ہے کون؟''

اب سکینہ بھی سنجیدہ ہوگئی۔ اُسے اپنے شوہر کا مزاج بدلا ہوا نظر آیا اور وہ مدھم سے میں کہنے لگی۔ ''یہ مارسی ہے..... وہی لڑکی جس نے تہوار کے مقابلہ میں قاسم کی جان بچا تھی۔ یہ لڑکی قاسم کے بارے میں اتنا کچھ جانتی ہے کہ اتنا آپ اور ہم بھی نہیں جانتے میں عورت ہوں اور محبت کے معاملے میں میری نظر کبھی دھوکہ نہیں کھا سکتی۔ میں نے لڑکی کی آنکھوں میں قاسم کے لئے محبت کا سمندر موجزن دیکھا ہے۔ یہ پچھلے چند دن اُس کی جدائی میں حد سے زیادہ پریشان رہنے کے بعد آج مجبور ہو کر یہاں چلی آئی۔ وہ پہلے یہاں آنے سے شرماتی رہی۔''

سکینہ کی بات جہاں طاہر کو اچھی لگی وہاں وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ اس لڑکی کا مارسی مسلمانوں جیسا نہیں..... تو کیا قاسم نے کسی عیسائی لڑکی کے ساتھ محبت کا پودا چڑھایا ہے؟ وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ ہوسکتا ہے یہ لڑکی ابوجعفر کی جاسوسہ ہو اور قاسم بارے میں اُس کے بھائی کا آئندہ لائحہ عمل جاننے کے لئے یہاں آ ٹپکی ہو۔ اُس ذہن میں یہ بات آسانی سے نہ اُتر رہی تھی کہ مارسی اُس کے بھائی کی محبت ہوسکتی لیکن وہ جب جب یہ سوچتا تھا کہ مارسی اُس کے لاڈلے بھائی کا پیار ہے تو اُس کے میں خوشی کی گھنٹیاں بجنے لگتیں۔ سکینہ نے اُسے سوچوں میں گم دیکھا تو کہا۔

''صرف میں ہی نہیں آپ کے والد محترم اور والدہ حضور بھی مارسی کی ملاقات سے بہت خوش ہوئے ہیں۔ یہ لڑکی کافی دیر سے موجود ہے اور ہم نے اُسے اس لئے روک لیا تھا کہ آپ قصرِ سلطانی سے قاسم کے متعلق خبر لے کر لوٹیں گے تو مارسی کو بھی قاسم کی خبر مل جائے گی۔''

طاہر نے ایک دم سوچا کہ اگر یہ لڑکی ابوجعفر کی جاسوسہ ہے تو اس سے تو نیا روانگی کی بات چھپانا بہت ضروری ہے۔ البتہ قاسم کی قید سے متعلق چونکہ ابوجعفر خود بھی واقف ہے اس لئے قاسم کی اسیری کا ذکر اپنے اہل خانہ سمیت اس لڑکی کے سامنے کر دینا بھی غلط نہ ہوگا بلکہ ایک لحاظ سے بہتر ہی ہوگا۔ کیونکہ ابوجعفر کو جب یہ معلوم ہوگا کہ قاسم بن ہشام کا بھائی طاہر بن ہشام شاہی زندان میں قید اپنے بھائی تک پہنچ چکا ہے تو وہ محتاط ہو جائے گا اور اور نہ میں کسی سازش کا خیال وقتی طور پر ترک کر دے گا۔ یہی سوچ کر طاہر نے فیصلہ کیا کہ وہ اس مہمان لڑکی مارسی کے سامنے قاسم کی قید کا ذکر کر دے گا۔ چنانچہ اُس نے اپنی بیوی سکینہ سے کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ تم اُس لڑکی کو یہاں بلاؤ۔ میں اُس کو ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔''

سکینہ نے خوشی سے چونک کر اپنے شوہر کی جانب دیکھا اور پھر اگلے لمحے وہ تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل گئی۔ بچے پہلے ہی کمرے سے جا چکے تھے۔ وہ معمول کے مطابق صحن کے اندر کھیلنے میں مصروف تھے۔ کچھ دیر گزری تو طاہر کو مہمان لڑکی کا چہرہ دکھائی دیا۔ اُس کی نظریں مارسی پر پڑیں تو وہ مبہوت ہو کر رہ گیا۔ کیا اس قدر حسین چہرے بھی ہو سکتے ہیں؟ یہ بڑی بڑی آنکھیں جن پر لمبی لمبی پلکیں یوں حرکت کر رہی تھیں جیسے دو عدد سیاہ کبوتر پھڑپھڑا رہے ہوں۔ طاہر نے دیکھا سڈول جسم کی مالک اس لڑکی کا گورا بدن نیشا پور کے سنگ سفید کی طرح شفاف تھا۔ مارسی جھجکتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی اور طاہر کے سامنے ایک لکڑی کی چوکی پر بیٹھ گئی۔ طاہر کی بیوی اور ماں بھی مارسی کے پیچھے کمرے میں داخل ہوئیں اور مارسی کے دائیں بائیں چوکیوں پر بیٹھ گئیں۔ ابھی طاہر کچھ بات نہ کر پایا تھا کہ طاہر کے والد بھی کمزور قدموں سے چلتے ہوئے کمرے میں آئے اور طاہر کے پہلو میں چارپائی پر بیٹھ گئے۔ طاہر ابھی تک مارسی کا جائزہ لے رہا تھا۔ اُسے اس لڑکی کے چہرے پر حوروں جیسی معصومیت دکھائی دی۔ یوں لگتا تھا جیسے ان گلابی ہونٹوں نے کبھی جھوٹ نہ بولا ہو۔ طاہر کوئی سراغ رساں یا جاسوس نہ تھا۔ درحقیقت وہ سیدھا سادا شمشیر زن استاد تھا چنانچہ بہت جلد اُس کے ذہن سے نکلنے لگا کہ مارسی کسی غلط ارادے سے اُس کے گھر آئی

ہو گی۔ ایک دم اُس نے ماری کی جانب سے اپنی نظریں ہٹائیں اور اپنی بزرگ والدہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''امی حضور! قاسم کا پتہ چل گیا ہے۔''

اُس کے اتنا کہنے کی دیر تھی کہ کمرے میں موجود ہر شخص حیرت سے اُچھلا۔ ماری کی حالت دیدنی تھی۔ اُس نے تجسس، جوش، محبت اور تڑپ کے ملے جلے جذبات سے طاہر کو نظر بھر کر دیکھا اور سب سے پہلے بولی۔

''کک..... کیا آپ سچ کہتے ہیں؟'' اُس کے لہجے میں شرم و حیاء کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس کے فوراً بعد قاسم کی ماں جیسے تڑپ کر بول اُٹھی۔

''کہاں ہے میرا بچہ؟..... تم نے تو کہا تھا کہ میں اُسے ساتھ لاؤں گا۔''

طاہر کی بیوی نے بھی اسی قسم کی بات کی اور کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ ہماری بہو ماری کا پیر ہمارے گھر میں خوش بختی کی علامت ہے۔ آج ہی ماری ہمارے گھر آئی اور آج ہی قاسم کی اطلاع مل گئی۔''

سب سے آخر میں قاسم کے والد نے سنجیدگی سے پوچھا۔ ''کیسے پتہ چلا ہے؟..... کہاں ہے قاسم؟ کیا سلطان نے اُسے کسی مہم پر بھیجا ہے؟'' یہ ہشام کی آواز تھی۔ اپنے دور کا مایہ ناز پہلوان ہشام بن عدی.....

طاہر سب کی بات سننے کے بعد کسی قدر ڈھیلے انداز میں کہنے لگا۔ ''نہیں ابا حضور!..... سلطان نے تو قاسم کو بہت اہم مہم سونپی تھی لیکن سلطان کے بڑے بیٹے شہزادہ علاؤ الدین نے قاسم کو خطیب مغرب کے کہنے پر پچھلے تین ہفتوں سے نظر بند کر رکھا ہے۔''

طاہر کی بات سن کر ماری اپنی جگہ پر ہل کر رہ گئی۔ تو گویا ابوجعفر نے اپنا کام کر دکھایا تھا۔ ماری کو تسلیم کرنا پڑا کہ ابوجعفر ایک منجھا ہوا اور جہاں دیدہ شخص ہے۔ اُس نے مارتھا سے کہا تھا کہ وہ بہت جلد قاسم کو اپنے راستے سے ہٹا دے گا۔ ماری یہی سوچ رہی تھی کہ ابوجعفر نے اپنا قول پورا کر دکھایا۔ اُدھر طاہر اپنے والدہ کو واقعہ کی تفصیل بتا رہا تھا۔ اچانک طاہر کے ذہن میں کچھ خیال آیا اور قاسم کا واقعہ ادھورا چھوڑ کر ماری کی جانب متوجہ ہوا۔

''محترمہ!..... آپ کے بارے میں میری بیوی سکینہ نے مجھے جو کچھ بتایا ہے وہ میرے لئے ناکافی ہے۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو ازراہِ مہربانی اپنا اور اپنے خاندان کا تفصیلی تعارف کروا دیں تو میرے ذہن سے کبیدگی دُور ہو جائے گی۔''

ماری کے لئے یہ کوئی غیر متوقع سوال نہ تھا۔ لیکن اُس کا ذہن چونکہ قاسم کی طرف لگا

ہوا تھا چنانچہ وہ طاہر کے سوال سے چونک سی گئی اور پھر تھوڑی دیر سر جھکا کر خاموش رہنے کے بعد کہا۔

''میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گی۔ اس دنیا میں آپ سب لوگ ہی میرے اپنے ہیں۔ میں آپ کو اپنی زندگی کا ایک ایک ورق کھول کر دکھا دوں گی۔''

اور اس کے بعد ماری نے تفصیل کے ساتھ اپنے بارے میں قاسم کے اہل خانہ کو بتانا شروع کر دیا۔ اُس نے البانوی محل سے لے کر قصرِ سلطانی تک اور پھر قصرِ سلطانی سے قاسم کی ملاقات تک سب کچھ بتا دیا۔ اُس کی کہانی میں سکندر بیگ کا بھی تفصیل کے ساتھ ذکر آیا اور ابوجعفر کا بھی۔ اُس نے قاسم کی ملاقاتوں کی تفصیل بھی بتائی اور مارتھا کی ریشہ دوانیوں کا ذکر بھی کیا۔ ماری کی کہانی مکمل ہوئی تو طاہر کی ماں اور بیوی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ طاہر اور اُس کا باپ اپنی جگہ پیار بھری نظروں سے ماری کو دیکھ رہے تھے۔ طاہر کی ماں اپنی جگہ سے اُٹھی اور آگے بڑھ کر ماری کو سینے سے لگا لیا۔ ماری کی موٹی موٹی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ سکینہ نے بھی آگے بڑھ کر ماری کو پیار دیا اور کہا۔

''میں تو کہتی ہوں تم اب یہیں رہو۔ کیونکہ تم اپنے گھر میں اپنی ماں مارتھا کے پاس بھی محفوظ نہیں ہو۔ خدانخواستہ تمہیں اگر کچھ ہو گیا تو ہم قاسم کو کیا منہ دکھائیں گے؟''

سکینہ کی بات ابھی پوری نہ ہوئی تھی کہ ہشام بول اُٹھا۔ ''دیکھو بیٹی! تم نے سب کچھ سچ سچ بتا کر ہمارے دل میں اپنے لئے بہت زیادہ جگہ پیدا کر لی ہے۔ یہ جان کر تو مجھے اور بھی زیادہ خوشی ہوئی کہ تم اسلام بھی قبول کر چکی ہو۔ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم اپنا نام بھی مسلمانوں والا رکھ لو۔''

ماری نے چونک کر قاسم کے والد کی بات سنی اور پھر شرمیلے سے لہجے میں کہا۔

''تو پھر آپ ہی میرے لئے کوئی اچھا سا نام تجویز کر دیجئے۔ آپ جو نام تجویز کریں گے، میں وہی اپنا لوں گی۔''

اب ہشام اپنی ہونے والی بہو کے لئے نام سوچ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ہشام نے کہا۔

''ٹھیک ہے بیٹی! ہم نے تمہارے لئے ایک نام تجویز کر لیا ہے۔''

سب نے چونک کر ہشام کی جانب دیکھا تو اُس نے مسکرا کر ماری کا نیا نام پکارا۔

''..... غزالہ.....''

ہشام کے منہ سے ماری کا نیا نام سن کر ماری سمیت سب لوگ بہت خوش ہوئے۔ یہ

بالکل صحیح نام تھا۔ مارسی کی غزال جیسی خوبصورت آنکھوں کے لئے یہی نام مناسب تھا۔ جب سکینہ نے مارسی کو غزالہ کا مطلب بتایا تو شرم سے اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ عرب نوجوان قاسم بن ہشام کتنے پیار سے اُس کا یہ نام پکارے گا۔

قاسم کے گھر میں مارسی کئی گھنٹے تک رہی۔ شروع شروع میں اُس کا رازدار کوچوان اکبر مکان سے باہر موجود رہا۔ لیکن بعد ازاں مارسی نے اُسے یہ کہہ کر روانہ کر دیا کہ وہ سہ پہر کے بعد آ کر اُسے لے جائے۔ اب وہ مارسی نہیں تھی بلکہ ایک مسلمان دوشیزہ غزالہ تھی۔ لیکن ابھی اُسے اپنا یہ نام اپنی ماں اور ابوجعفر سے چھپانا تھا۔

سہ پہر کے بعد اکبر، مارسی کو لینے کے لئے آ گیا۔ اور مارسی قاسم کے تمام اہل خانہ کے ساتھ پیار اور محبت کی بے تکلفی میں بہت سا وقت گزارنے کے بعد اپنے گھر لوٹ گئی۔

اگلی صبح طاہر قونیا کے لئے روانہ ہو چکا تھا۔ اُس نے صرف اپنی بیوی کو اتنا بتایا تھا کہ وہ ایشیائے کوچک سلطان سے ملنے کے لئے جا رہا ہے تاکہ قاسم کی رہائی کے لئے کچھ کر سکے۔ اُس نے ساتھ ہی اپنی بیوی کو ہدایت کی کہ فی الحال اُس کی روانگی سب سے پوشیدہ رکھی جائے۔ سکینہ نے اُسے نمازِ فجر کے بعد پوری تیاری کے ساتھ روانہ کیا۔

اُدھر مارسی قاسم سے ملنے کے لئے بے چین تھی۔ آج صبح ہی اُس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ قصرِ سلطانی جا کر کسی نہ کسی طرح قاسم سے ملنے کی کوشش کرے۔ قصرِ سلطانی میں مارتھا کا آنا جانا کوئی نئی بات نہ تھی۔ وہ البانوی کنیز مارتھا کی بیٹی تھی اور سکندر کی پسند..... لیکن آج صبح وہ گھر سے روانہ ہونے لگی تو اُس کی ماں نے اُسے روک لیا۔

''اے لڑکی!..... یہ تو پھر کہاں چل دی، پوچھے بتائے بغیر؟''

مارسی کو ماں کا روکنا بہت برا لگا۔ اُس نے مُڑ کر ماں سے کہا۔ ''یہیں نزدیک ہی رہی ہوں، قصرِ سلطانی تک۔''

مارسی نے غالباً محل میں موجود اپنی کسی سہیلی کا ذکر بھی کیا۔ لیکن آج مارتھا کے تیور ہی کچھ اور تھے۔ وہ انتہائی سخت لہجے میں بولی۔

''خبردار! تو کہیں نہیں جائے گی۔ تجھے معلوم ہے کہ تو البانیہ کی ہونے والی ملکہ ہے۔ کل تو سکندر کے ساتھ البانیہ کے تخت پر بیٹھے گی۔ کچھ اپنی حیثیت کا خیال کر۔ یہ تو کہاں گھومتی رہتی ہے دن بھر؟ میں نے آج صبح ہی اکبر کو ایک دو دن کی چھٹی پر بھیج دیا ہے۔''

مارسی اپنی ماں کے جملے سے ٹھٹک کر رُک گئی اور کسی انجانے خوف سے اُس کا دل دھڑکنے لگا۔ اُسے ایسے لگا جیسے یہ باتیں اُس کی ماں نے نہ کی ہوں بلکہ اُس کی ماں کی

زبان میں ابوجعفر بول رہا تھا۔ اُس نے سوچا کہ اُس کی ماں ایسے تو نہ تھی۔ اُس کی ماں نے اُسے بہت لاڈ پیار اور ناز و نعم سے پالا تھا۔ ایک دم اُس کے دل میں غصے کی کیفیت پیدا ہونے لگی۔ اُسے ابوجعفر پر غصہ آ رہا تھا۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ قصرِ سلطانی ضرور جائے گی۔ چنانچہ اُس نے کہا۔

''ماں! اب ایسا بھی کیا اندھیر ہے..... میں محل تک ہی تو جا رہی ہوں..... پیدل بھی جا سکتی ہوں۔ مجھے ملکہ سروین سے بھی ملنا ہے اور سربیائی کنیزوں سے بھی۔ بہت دن سے اُدھر جانا ہی نہیں ہوا۔''

مارسی نے ماں کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔ سربیائی شہزادی سروین اور اُس کی کنیزیں مارتھا کے لئے بہت اہم تھیں۔ خصوصاً ملکہ سروین کی کنیزیں عیسائی ہونے کے ناطے مارتھا کو بہت عزیز تھیں۔ مارتھا نے مارسی کی زبانی اُن کا ذکر سنا تو خاموش ہو گئی اور مارسی کو جانے کی اجازت دے دی۔

مارسی گھر سے نکلی اور پیدل ہی قصرِ سلطانی کی جانب چل دی۔ وہ راستے میں سوچ رہی تھی کہ ملکہ سروین سے ملنا بھی قاسم کی رہائی کے سلسلے میں مفید ہو سکتا ہے۔ حالانکہ پہلے اُس کے ذہن میں یہ خیال تھا کہ وہ اپنی سہیلیوں کی وساطت سے براہِ راست شہزادہ علاؤ الدین کے ساتھ بات کرے گی۔ لیکن اب وہ سوچ رہی تھی کہ سربیائی شہزادی سروین جو اب سلطان مراد خان ثانی کی ملکہ تھی، قاسم کی رہائی کے سلسلے میں زیادہ بہتر کردار ادا کر سکتی ہے۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ دونوں شہزادے یعنی شہزادہ علاؤ الدین اور شہزادہ محمد ملکہ سروین کی ایک ماں کی طرح عزت کیا کرتے تھے۔

ملکہ سروین سربیا کے بادشاہ لارڈ سٹیفن کی بیٹی تھی۔ سربیا کا بادشاہ سلطان مراد خان ثانی کا دیرینہ اور وفادار دوست تھا۔ اُس نے سلطان مراد خان ثانی کے ساتھ اپنی وفاداری کا اظہار کرنے کے لئے اپنی بیٹی شہزادی سروین اُس کے عقد میں دے دی تھی۔ شہزادی سروین اپنی کئی کنیزوں کے ہمراہ ''ادرنہ'' میں دُلہن بن کر آئی تھی۔

مارسی محل میں داخل ہوئی تو سیدھی محل سرا کی جانب چلی گئی۔ محل سرا میں اُس کی ملاقات سب سے پہلے ملکہ سروین کے خاص خواجہ سرا سے ہوئی۔ خواجہ سرا سے اُسے معلوم ہوا کہ ملکہ اس وقت عقبی باغ میں شاہی پرندوں کو دانہ ڈالنے میں مصروف ہیں۔ مارسی ملکہ سروین سے گاہے بگاہے ملتی رہتی تھی۔ چنانچہ وہ بے دھڑک عقبی باغ کی جانب بڑھنے لگی۔ ملکہ نے مارسی کو آتے دیکھا تو مسکرائی۔

"خوش آمدید!..... آج تو ہماری البانوی بہن آئی ہے۔"

ملکہ کی زبان میں شکر جیسی حلاوت تھی۔ ملکہ کے لہجے سے ماری کا حوصلہ بلند ہوا اور اُس نے کہا۔ "ملکہ معظمہ!..... آپ کی محبت کبھی کبھی محلات میں کھینچ لاتی ہے۔ ورنہ بزمِ شاہی میں غریبوں کا گزر کیا معنی....."

ملکہ نے چونک کر ماری کی جانب دیکھا اور مزہ لیتے ہوئے کہا۔ "سبحان اللہ! آج تو مشک عنبر میں لپٹی باتیں کر رہی ہو۔ لگتا ہے کوئی چوٹ کھا کر آئی ہو۔"

ماری زیرِ لب مسکرا دی اور سر کو جھٹکتے ہوئے کہا۔ "ملکہ معظمہ کی پاکیزہ زبان سے سبحان اللہ کا لفظ سن کر لگتا ہے کہ ملکہ معظمہ اسلامی معمولات میں دلچسپی لے رہی ہیں۔"

ملکہ نے بلا جھجک کہا۔ "کیوں نہیں..... اسلام کے ساتھ ہماری دلچسپی روزِ اوّل سے ہے۔ ہمارے والدِ محترم لارڈ سٹیفن بھی دل سے مسلمان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ترک سلاطین کی تین نسلوں تک سلطنت عثمانیہ کے دست راست رہے۔"

اب ماری بہت ہی پیار بھری نظروں سے اُس باوقار اور حسین ملکہ کو دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد ملکہ نے دریافت کیا۔ "سناؤ ماری! کیسے آنا ہوا؟ لگتا ہے آج تم ہم سے کچھ مانگنے آئی ہو۔"

ماری نے حیرت سے پلکیں پٹپٹائیں اور پھر مسرت بھرے لہجے میں کہا۔ "عجیب..... ملکہ معظمہ! بہت عجیب..... آپ تو دلوں کے حال جان لیتی ہیں۔"

"دلوں کے حال صرف اللہ جانتا ہے..... ہم نے صرف تمہارے چہرے کی تحریر پڑھی ہے۔ وہ تم نے سنا نہیں کہ چہرے کھلی کتاب ہوا کرتے ہیں۔" ملکہ نے ایک نرم مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ اب ماری نے مدعا بیان کرنا چاہا۔

"ملکہ معظمہ! آپ نے غالباً سنا ہو گا کہ سلطانِ معظم نے ایک عرب نوجوان کو شاہی سراغ رساں مقرر کیا ہے....."

"لگتا ہے اُس سراغ رساں نے تمہارے دل کا سراغ لگا لیا ہے..... کیوں؟..... دل تو نہیں دے بیٹھی اُس عرب نوجوان کو؟"

ماری کا چہرہ حیاء سے تمتما اٹھا۔ اُس نے پلکیں جھکا لیں اور کچھ دیر توقف کے بعد کہا۔ "ملکہ معظمہ کی نگاہیں سب کچھ دیکھ لیتی ہیں..... لیکن اس وقت میں سلطنت عثمانیہ کی بقاء کا سوال لے کر آئی ہوں۔"

ماری کی بات پر ملکہ چونک اُٹھی اور فوراً کہا۔ "خدا نہ کرے سلطنت عثمانیہ کو کچھ ہو۔

کون سا مسئلہ لے کر آئی ہو؟"

ماری نے کسی قدر جھجکتے ہوئے عرض کی۔ "ملکہ معظمہ! وہ عرب نوجوان جسے سلطانِ معظم نے ادرنہ میں ہونے والی سازش کا سراغ لگانے کے لئے بطورِ خاص مقرر فرمایا تھا اس وقت ایک غدار کے بہکاوے پر شہزادہ علاؤ الدین کی قید میں ہے..... جبکہ وہ غدار سلطنت کے خلاف کسی خطرناک سازش میں مصروف ہے۔"

ملکہ کی تیوری پر بل پڑ گئے اور اُس نے بے حد سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "کون ہے وہ غدار جس نے شہزادہ علاؤ الدین کو بہکا دیا؟..... ماری! تم ہوش میں تو ہو۔ تمہیں معلوم ہے تم کیا کہہ رہی ہو؟ تم ایک ترک شہزادے اور ولی عہد پر الزام لگا رہی ہو۔"

ملکہ کی بات مکمل ہوئی تو ماری نے ایک نئے عزم کے ساتھ کہا۔ "ملکہ معظمہ! میں صرف الزام نہیں لگا رہی ہوں بلکہ یہ کہہ رہی ہوں کہ شہزادہ علاؤ الدین نے قاسم بن ہشام کو شاہی زندان میں بند کر رکھا ہے۔ ملکہ معظمہ! اس وقت ادرنہ کو قاسم بن ہشام کی ضرورت ہے۔ آپ خدارا کچھ کیجئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سلطانِ معظم کی عدم موجودگی میں ابوجعفر ادرنہ کی گلیوں میں بغاوت پھیلا دے۔"

اب ملکہ کی آنکھیں حیرت سے پھٹنے لگیں۔ اُس نے کسی قدر تیز لہجے میں کہا۔

"ابوجعفر؟..... کیا یہ وہی شخص تو نہیں جس کی آنکھوں کی رنگت لاطینی اقوام کی طرح نیلی ہے؟ اور جو خطیب مغرب کے نام سے مشہور ہے..... ارے ماری! اس شخص کا آنا جانا تو تمہاری ماں کے پاس بہت تھا۔ ہے نا!"

ملکہ ایک دم خلاؤں میں گھورتے ہوئے کچھ سوچنے لگی۔ اُسے یاد آیا کہ ایک زمانے میں مارتھا اور ابوجعفر شہزادی سروین پر جذباتی ڈورے ڈالنے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ اُس وقت سروین نئی نویلی دُلہن تھی۔ چنانچہ اجنبیت کے دباؤ میں خاموش رہی۔ آج ماری نے ابوجعفر کی سازش کا ذکر کیا تو ملکہ سروین کی آنکھیں جیسے کھل گئیں۔ اُس نے گہری سوچ میں ماری کی بات بھی نہ سنی۔ ماری کہہ رہی تھی۔

"ملکہ معظمہ! ابوجعفر ہمارے گھر آتا ہے..... اسی وجہ سے تو میں اُس کی سازش کے بارے میں جانتی ہوں۔ تین ہفتے پہلے قاسم بن ہشام قیصر کے جاسوسوں کا سراغ لگاتے ہوئے ابوجعفر کی گردن تک پہنچ چکا تھا۔ لیکن شہزادہ علاؤ الدین نے سارا معاملہ ہی اُلٹا دیا..... آپ کچھ کیجئے ناں!"

اب ملکہ صورتحال کو سمجھنے لگی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ شہزادہ علاؤ الدین کے ساتھ کس

طریقے سے بات کی جائے؟ اُسے ماری کی بات کا یقین تھا کیونکہ وہ خود ابوجعفر کے کردار سے واقف تھی۔ اُس نے سوچا کہ صرف قاسم بن ہشام کو چھڑایا ہی نہ جائے بلکہ کسی طرح ابوجعفر کو بھی بروقت دبوچ لیا جائے۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ اُس کے کندھوں پر بہت بڑی ذمہ داری آ پڑی ہے۔ اُس نے ماری سے کہا۔

''ماری! تمہارا بہت بہت شکریہ کہ تم نے ہمیں ان نازک حالات سے آگاہ کیا۔ ہم آ ہی کچھ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

ملکہ کی بات سن کر ماری نے اطمینان کی سانس لی اور پھر جھجکتے جھجکتے کہنے لگی۔

''ملکہ معظمہ! ایک درخواست ہے.....''

ملکہ نے ماری کی جانب دیکھ کر پوچھا۔ ''ہاں ہاں، کہو!''

''ملکہ معظمہ! میں قاسم بن ہشام سے ملنا چاہتی ہوں۔ وہ یہیں قصر سلطانی کے شاہی زندان میں قید ہیں۔ اگر ملکہ معظمہ چاہیں تو داروغۂ زندان کو حکم دے سکتی ہیں کہ وہ مجھے روکے۔''

ملکہ پھر چونک اُٹھی۔ اُس نے چند لمحے کے لئے کچھ سوچا اور پھر ایک نئے عزم کے ساتھ بولی۔ ''چلو ہمارے ساتھ! ہم ابھی شاہی زندان میں جان کر قاسم بن ہشام سے بات کریں گے۔'' ملکہ نے پورے جوش کے ساتھ قدم بڑھایا اور ماری کے دل میں خوشی کے لڈو پھوٹنے لگے۔

شاہی زندان کے داروغہ نے ملکہ سروین کو آتے دیکھا تو اُس کی ٹانگیں کانپ گئیں۔ محل کا شمال مغربی احاطہ تھا۔ اس جانب عموماً محل سرا کی عورتیں نہ آتی تھیں۔ زیادہ تر ملازم پیشہ لوگ محل کی اس جانب رہائش پذیر تھے۔ یہاں شاہی اصطبل بھی تھا اور محل کا اسلحہ خانہ بھی۔ ایک بڑی سی عمارت کے وسط میں ایک بڑا سا کمرہ شاہی زندان تھا۔ ملکہ، داروغہ کے قریب پہنچی تو اُس نے کمر تک جھک کر ملکہ کو سلام کیا۔ ملکہ بھی وہیں رُک گئی اور تحکمانہ لہجے میں پوچھا۔

''شاہی زندان میں کتنے قیدی نظر بند ہیں؟'' ملکہ کا انداز شاہانہ تھا۔ داروغہ لرز گیا۔ ہکلاتے ہوئے کہنے لگا۔

''مم..... ملکہ معظمہ! صرف ایک قیدی موجود ہے۔''

ملکہ نے پھر کہا۔ ''کیا نام ہے اُس کا؟''

داروغۂ زندان منمناتے ہوئے بولا۔ ''قاسم بن ہشام۔''

ملکہ نے قاسم کا نام سنا اور ایک بار ماری کی جانب مڑ کر دیکھا۔ ماری کے چہرے پر جوش تھا۔ ملکہ داروغہ کی جانب متوجہ ہوئی اور بولی۔ ''ہم ابھی اور اسی وقت قاسم بن ہشام کو ملنا چاہتے ہیں۔ جاؤ، اُسے بے حد احترام کے ساتھ ہمارے پاس لے آؤ۔''

داروغۂ زندان فوراً دُم دبا کر بھاگا اور زندان کے دروازے کی جانب بڑھتا چلا گیا۔

کچھ دیر بعد قاسم، ماری اور ملکہ کے سامنے موجود تھا۔ تین ہفتوں میں قاسم کی صحت بہت گر چکی تھی۔ اُس کے چہرے پر ہلکی سی زردی تھی۔ لیکن اُس کی آنکھیں ابھی بھی پوری طرح روشن اور بے چین تھیں۔ ماری نے اُسے دیکھا تو اُس کا کلیجہ کٹ کر رہ گیا۔ وہ ملکہ اور داروغۂ زندان کی موجودگی میں قاسم کو بے تکلفی کے ساتھ نہ مل سکتی تھی۔ چنانچہ وہ ایک طرف کھڑی درد بھری نظروں سے قاسم کو دیکھتی رہی۔ قاسم نے آگے بڑھ کر ملکہ کو سلام کیا تو ملکہ نے مسکرا کر جواب دیا اور کہا۔

''قاسم بن ہشام! ہم سلطنت عثمانیہ کے تاجدار سلطان مراد خان ثانی کی ملکہ ثانی ہیں۔ ہمیں آج ماری نے تمہاری حقیقت حال بتائی تو ہم خود تم سے ملنے کے لئے یہاں چلے آئے..... تم فکر مت کرو۔ ہم آج ہی شہزادہ علاؤ الدین سے بات کر کے تمہیں زندان سے نکلوا لیں گے۔''

قاسم جو پہلے ہی پہچان چکا تھا کہ اُس سے ملنے کے لئے آنے والی شاہی گھرانے کی خاتون ہی ہو سکتی ہے، ملکہ کی بات سن کر اور زیادہ مؤدب ہو گیا۔ اُس نے ملکہ کے احترام میں پلکیں جھکا لیں اور دھیمے لہجے میں کہا۔

''ملکہ معظمہ کا اقبال بلند ہو!..... مجھے اپنی قید کی کوئی فکر نہیں۔ میں تو اس لئے فکر مند ہوا کہ حکم شاہی کی کوئی لاج نہ رکھ سکا۔ خدا جانے سلطنت کے غدار کس حد تک آگے جا چکے ہیں۔ مجھے تو اتنا بھی معلوم نہیں کہ ہمارے جو لشکر محاذِ جنگ پر روانہ ہوئے تھے اُن کی کیا کارگزاری ہے۔''

ملکہ نے پورے اطمینان کے ساتھ قاسم کی بات سنی اور پھر کسی قدر غمزدہ لہجے میں کہا۔

''کروسیڈ کی مہم پر جانے والا ہمارا لشکر صلیبی افواج کے ہاتھوں بہت بڑی شکست کھا چکا ہے۔ ہمارے سلطانِ معظم کی ہمشیرہ اور ہماری نند جی کے خاوند سپہ سالار محمد چلپی، ہونیاڈے کے ہاتھوں گرفتار ہو چکے ہیں۔ صوفیا کا شہر ہمارے ہاتھوں سے نکل چکا ہے اور ہماری سپاہ اولڑ بلقان میں بھی دشمن سے نقصان اٹھا چکی ہے۔ البتہ ایک خوشخبری بھی ہے کہ سلطانِ معظم نے امیر کرمانیا کو شکست دے کر قونیا کی بغاوت پر قابو پا لیا ہے اور سلطانِ معظم چند

ہی دنوں میں ادرنہ پہنچنے والے ہیں۔ سلطانِ معظم ادرنہ سے جلد یورپ کی جانب ہونیوالی سے انتقام لینے کے لئے روانہ ہو جائیں گے۔"

ملکہ نے مختصر الفاظ میں تمام حالات سے آگاہ کر دیا۔ لشکروں کی تفصیل سنتے ہو قاسم جذباتی ہو رہا تھا۔ خصوصاً سلطان کے بہنوئی محمد چلپی کی گرفتاری کا سن کر اُسے دھچکا تھا۔ اُسے محمد چلپی کی ملاقات یاد آئی جب آغا حسن کے کمرے میں فوجی افسروں کے سامنے اُس نے ایک مختصر سی تقریر کی تھی۔ اُس نے بڑے خلوص کے ساتھ ملکہ سے کہا۔

"محترم سالار! محمد چلپی کا سن کر دلی افسوس ہوا۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ ایسے حالات میں سلطنت کو میری ضرورت تھی۔"

ملکہ نے قاسم کی بات پر سر ہلایا اور دلاسہ دینے والے لہجے میں کہنے لگی۔ "بس آج ہی رہا کر دیئے جاؤ گے۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔ اچھا! اب ہم چلتے ہیں....."

ملکہ نے جانے سے پہلے مارسی کی طرف دیکھا اور پھر زیرِ لب مسکرائی۔ مارسی حیا پلکیں جھکائے ہوئے تھی۔ ملکہ واپسی کے لئے مڑی تو مارسی بھی ایک حسرت بھری نگاہ پر ڈالتے ہوئے ملکہ کے ہمراہ روانہ ہونے لگی۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں اور آن کی میں انہوں نے ایک دوسرے سے بہت کچھ کہہ دیا۔ قاسم نے قدرے ہلکی آواز میں مار نام پکارا تو مارسی ایک لمحے کے لئے ٹھٹکی اور پھر جاتے جاتے مسکرا کر قاسم سے کہا۔

"مارسی نہیں..... غزالہ۔ یہ آپ کے والدِ محترم کا دیا ہوا نام ہے۔"

اتنا کہہ کر مارسی بھی ملکہ کے پیچھے لپکی اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی باہر چلی گئی۔ کے آخری الفاظ ابھی تک قاسم کے کانوں میں گونج رہے تھے..... مارسی نہیں، غزالہ آپ کے والدِ محترم کا دیا ہوا نام ہے..... تو گویا مارسی قاسم کے اہلِ خانہ سے مل چکی قاسم کے دل میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔

اُدھر طاہر بن ہشام آندھی اور طوفان کی طرح سفر کرتا ہوا لشکر سلطانی کی طرف چلا جا رہا تھا۔ لیکن ابھی وہ راستے میں ہی تھا کہ اُسے سلطانی لشکر کی واپسی کی خبر ملی پھر بھی تیز رفتاری سے سفر کرتا رہا۔ اُس کے پاس شہزادہ محمد کا خط تھا اور اُسے اپنے قاسم کو شہزادہ علاؤالدین کی قید سے آزاد کروانا تھا۔ وہ دریائے دانیال عبور کر کے ایشیائے میں داخل ہوا تو اُسے سلطانی لشکر کی واپسی کے آثار نظر آنے لگے۔ اگلے روز وہ لشکر گاہ کے سامنے تھا۔ وہ اپنے تھکے ہوئے گھوڑے پر سوار لشکر کے پڑاؤ میں داخل ہو کچھ ہی دیر بعد وہ سلطان کی خدمت میں شہزادہ محمد کا خط پیش کر رہا تھا۔

سلطان جوں جوں شہزادے کا خط پڑھتا گیا، اُس کی بھنویں سکڑتی گئیں اور چہرے پر کے آثار نظر آتے گئے۔ سلطان نے خط پڑھ کر کچھ دیر کے لئے خاموشی اختیار کر لی چند لمحوں بعد طاہر سے مخاطب ہوا۔

"تم نے بہت اچھا کیا جو ہم کو خبر کر دی۔ ہم خود بہت جلد ادرنہ پہنچنے والے ہیں۔ لیکن میں پہنچتے پہنچتے ابھی اتنا وقت لگ جائے گا کہ دشمن ادرنہ میں کوئی بغاوت پھیلا سکے۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ اپنے تیز رفتار قاصد کو تمہارے ہمراہ روانہ کر دیں تاکہ قاسم بن ہشام کو شاہی زندان سے رہائی دلائی جا سکے۔"

طاہر بھی یہی چاہتا تھا۔ چنانچہ اُس نے آرام کرنا بھی مناسب نہ سمجھا اور اُسی دن شام سے پہلے وہ سلطانی قاصد کے ہمراہ ایشیائے کوچک کی خاک اُڑاتا دوبارہ ادرنہ کی جانب روانہ ہو چکا تھا۔

لیکن اس سے پہلے کہ طاہر ادرنہ پہنچتا، ملکہ معظمہ کے کہنے پر شہزادہ علاؤ الدین نے قاسم بن ہشام کو آزاد کر دیا تھا۔ اور جس روز طاہر ادرنہ واپس پہنچا، قاسم گھر میں موجود تھا۔ طاہر قصرِ سلطانی سے فارغ ہو کر لوٹا تو اُس نے قاسم اور مارسی کو گھر کے صحن میں بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے پایا۔ اُس کی نظر قاسم پر پڑی اور یکلخت اُس کی ساری تھکاوٹ دُور ہو گئی۔ قاسم نے بھی طاہر کو آتے دیکھ لیا تھا چنانچہ اُس نے بھاگ کر طاہر کا استقبال کیا اور اپنے بڑے بھائی کے ساتھ بغلگیر ہو گیا۔ عمر اور علی نے اپنے باپ طاہر کو آتے دیکھا تو چیخ مار کر آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ وہ..... ابو آ گئے، ابو آ گئے کی رٹ لگاتے ہوئے باپ کی طرف دوڑے اور اُس کی ٹانگوں سے لپٹ گئے۔ بچوں کا شور سن کر سکینہ اور طاہر کے والدین بھی کمروں سے باہر نکل آئے۔ مارسی کے چہرے پر بھی مسرت کی لہر تھی۔ طاہر نے اپنے سارے کنبہ کو مسرت سے لبریز دیکھا اور دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔

لیکن ابوجعفر ابھی تک آزاد تھا۔ شہزادہ علاؤ الدین نے قاسم کو رہا تو کر دیا تھا، لیکن اس بات پر کہ وہ ابوجعفر پر ہاتھ نہیں ڈالے گا۔ چنانچہ اُس نے ابوجعفر اور اُس کے ایک دو ساتھیوں کی محض نگرانی کرنے پر اکتفا کیا اور ینی چری میں اپنے دستے کو بھی کسی قسم کے حالات سے نمٹنے کے لئے ذہنی طور پر تیار کر لیا۔ اب وہ سازشی کرداروں کو گرفتار کرنے کے بجائے سلطان کا انتظار کر رہا تھا۔ اُس نے شہر میں جگہ جگہ اپنے ماتحت کام کرنے والے ینی چری کے بعض سمجھدار سپاہی پھیلا دیئے اور کسی بھی قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کا عزم کر لیا۔ اُسے بے چینی سے سلطان کی واپسی کا انتظار تھا۔

چند ہی دن بعد سلطان مراد خان ثانی کے لوٹنے کی خبر سارے اورنہ میں پھیل گئی۔ وشور کے ساتھ شہر کی صفائیاں ہونے لگیں اور دربارِ شاہی سے منسلک لوگ ذہنی طور پر ہونے لگے۔ ابوجعفر کے دل میں بے حد کھٹکا تھا۔ خصوصاً جب سے قاسم کو آزاد کیا گیا اُسے اپنے بھیانک انجام کا ڈر سا رہنے لگا تھا۔ اس دوران اُسے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا مارتھا کی بیٹی مارسی، قاسم بن ہشام کے گھر آتی جاتی رہتی ہے۔ وہ مارسی پر تاؤ کھا کر جاتا۔ کیونکہ اب وہ مارسی کو قاسم کے گھر جانے سے روکنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس طرح قاسم کو مزید ثبوت ہاتھ آنے کا اندیشہ تھا۔ ابھی تک وہ اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لیتا کہ سلطان بغیر ثبوت کے کبھی اُس پر ہاتھ نہیں ڈالے گا۔ لیکن پھر بھی اُس کے دل سلطان مراد خان ثانی کا خوف گھر کر چکا تھا۔ وہ اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے آنے وقت کے بارے میں سوچتا رہتا۔ اُس نے اپنے ماتحت کام کرنے والے شہر بھر میں قیصر کے جاسوسوں کو چوکنا کر دیا تھا۔ اُس کا منصوبہ یہ تھا کہ اگر سلطان نے اُسے میں لیا تو قیصر کے جاسوس چہروں پر ڈھاٹے باندھ کر شہر میں جگہ جگہ مختلف عمارات لگا دیں، نئی چڑی میں موجود غداروں کو بھی اُس نے اس کام کے لئے تیار کر رکھا اِدھر شہر میں جگہ جگہ آگ لگے اور اُدھر وہ شہر میں گھس کر عوام کو لوٹنا اور قتل کرنا شروع دیں۔ وہ خود ایک پرانا جاسوس تھا اور اُس نے کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ یہی وجہ اُس نے اپنے فرار کا منصوبہ بھی مکمل طور پر سوچ رہا تھا۔ جونہی شاہی دستہ اُسے گرفتار کے قصرِ سلطانی کی طرف لے جانے لگتا، نئی چڑی کے غدار سپاہیوں کا ایک خونخوار اچانک کسی جانب سے شاہی سپاہیوں پر حملہ کر دیتا اور ابوجعفر کو چھڑا لیتا۔ اُس نے قاسم ہشام کو ختم کرنے کے لئے بھی اپنے خفیہ آدمی لگا رکھے تھے جو ہر وقت قاسم پر نظر ہوئے تھے اور موقع پاتے ہی اُسے قتل کر دینا چاہتے تھے۔

یوں ابوجعفر، سلطان کی واپسی کے ساتھ ہی اپنی سازش کے آخری مرحلے پر عمل کے لئے تیار بیٹھا تھا۔ اب صرف اُس کے لئے ایک کام کی منصوبہ بندی باقی رہ گئی تھی وہ تھا مارتھا کی بیٹی مارسی کو اُس کے گھر سے اغوا کرنا اور صحیح سلامت البانیہ کے بادشاہ بیگ تک پہنچانا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مارسی کو قاسم کے گھر آتا جاتا دیکھتا تو سانپ کی بل کھا کر رہ جاتا۔

سکندر بیگ جب سے اورنہ چھوڑ کر گیا تھا، ابوجعفر اُس کے ساتھ رابطے میں تھا چند دن قبل ہی سکندر نے ابوجعفر کو پیغام بھیجا تھا کہ وہ اُس کی امانت یعنی مارسی کو

پہنچا دے۔ اور اب ابوجعفر یہ چاہتا تھا کہ سلطان کی آمد سے پہلے پہلے وہ اس قضیے کو بھی نمٹا دے۔ چنانچہ ایک دن اُس نے مارسی کو اغوا کرنے کی منصوبہ بندی مکمل کر لی۔

یہ ایک سرد رات تھی۔ ستاروں کا کارواں مشرق سے مغرب کی جانب محوِ سفر تھا۔ اورنہ کے لوگ بند کمرے میں خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے تھے اور ویران گلیوں میں آوارہ مزاج آوارہ داری کر رہے تھے۔ اتنے میں قصرِ سلطانی کے عقبی محلہ میں چار گھڑ سوار نمودار ہوئے۔ ابوجعفر سب سے آگے تھا۔ یہ چاروں گھڑ سوار نقاب پوش تھے۔ ابوجعفر اپنے نقاب پوش ساتھیوں کو لے کر مارتھا کے دروازے پر آیا..... وہ گھوڑے سے اُترا اور اپنے خنجر کے دستے سے گھر کے دروازے پر دستک دی۔ اس دوران اُس کے ساتھی نقاب پوش بھی اپنے گھوڑوں سے اُتر چکے تھے۔ دو نقاب پوشوں نے اپنے گھوڑوں کی لگامیں تیسرے نقاب پوش کو تھما دیں۔ اُسی تیسرے نقاب پوش نے ابوجعفر کے گھوڑے کی لگام بھی تھام لی اور تینوں گھوڑوں کو لے کر ایک جانب اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ ابوجعفر کے ساتھ موجود دونوں نقاب پوش مکان کی ایک دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑے ہو گئے تاکہ دروازہ کھلنے پر دکھائی نہ دیں۔ ابوجعفر کی تلوار نیام میں تھی اور اُس نے دروازہ کھٹکھٹانے سے پہلے اپنے چہرے سے نقاب ہٹا لیا تھا۔ جونہی دروازے کی پرلی جانب سے مارتھا کے بوڑھے خادم نے سوال کیا..... کون ہے؟..... تو ابوجعفر نے کہا۔

"یہ میں ہوں، ابوجعفر! دروازہ کھولو اور اپنی مالکن مارتھا کو میرے آنے کی اطلاع کرو۔"

مارتھا کے خادم نے ابوجعفر کی آواز پہچان لی اور کھٹاک کی آواز کے ساتھ دروازہ کھول اگلے لمحے بوڑھے خادم کا سر دھڑ سے جدا ہو کر ڈیوڑھی میں لڑھک رہا تھا ..... ابوجعفر تلوار نکالنے اور خادم کا سر کاٹنے میں بہت پھرتی دکھائی دی۔ اس کام سے فارغ ہو کر اُس نے اپنے دونوں ساتھیوں کو اندر آنے کا اشارہ کیا اور وہ تینوں مارتھا کے مکان میں چلے گئے۔ یہاں کل پانچ افراد مقیم تھے۔ ایک مارتھا، ایک مارسی، ایک مارسی کا جوان اکبر، ایک مارتھا کی خادمہ اور ایک اُن کا یہ بوڑھا خادم جو ابھی ابھی ابوجعفر کے مہارت کا ذائقہ چکھ چکا تھا۔ ابوجعفر کو کسی مزاحمت کا اندیشہ نہ تھا چنانچہ وہ بے دھڑک اور اُس کی بیٹی کے کمرے تک پہنچ گیا۔ اب اُسے یہ کوشش کرنی تھی کہ مارتھا کسی قسم مزاحمت کئے بغیر اپنی بیٹی کو ان کے حوالے کر دے۔ وہ جانتا تھا کہ مارتھا اپنی بیٹی کے دیوانہ وار محبت کرتی ہے۔ جبکہ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ مارتھا خود مارسی کو سکندر بیگ تک پہنچانا چاہتی ہے۔ وہ یہ بھی کر سکتا تھا کہ سیدھے طریقے سے مارتھا سے کہتا کہ وہ

مارسی کو اس کے آدمیوں کے ہمراہ سکندر بیگ کی جانب روانہ کر دے۔ لیکن اُسے یقین
کہ مارسی کبھی اُن کے ساتھ چلنے کے لئے تیار نہ ہوگی۔ چنانچہ اُس نے مارسی کو اغواء کر
کا فیصلہ کیا اور سوچا کہ اس طرح وہ ایک تیر سے دو شکار بھی کر سکتا تھا۔ لیکن یہاں
نتیجہ اُس کی توقع کے برعکس نکلا۔ مارسی اُس کے لئے تر نوالہ ثابت نہ ہوئی۔ بلکہ حلق
چبھتا ہوا کانٹا بن گئی۔ اُس نے جونہی مارتھا کو اپنی آواز کا دھوکہ دے کر دروازہ کھلوا
اندر داخل ہوا تو مارسی کو شمشیر بکف دیکھ کر اُس کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ مارسی کے
میں تلوار تھی اور وہ مرنے مارنے کے لئے پوری طرح تیار تھی۔ ابوجعفر نے اپنی تلوار
میں ڈالتے ہوئے انتہائی مکاری سے کہا۔

''مارتھا دیکھو! میں تمہاری بیٹی کو لینے آیا ہوں۔ اسے دُعا دو۔ یہ سکندر بیگ کی ملکہ
جا رہی ہے.....''

ابوجعفر کی بات ابھی مکمل نہ ہوئی تھی کہ مارسی خونخوار لہجے میں بول اُٹھی۔ ''خبردار
ایک قدم بھی میری جانب بڑھایا تو ٹکڑے ٹکڑے کر دُوں گی۔''

مارتھا کے لئے یہ منظر بالکل غیر متوقع تھا۔ وہ اپنی بیٹی کو ملکہ تو بنانا چاہتی تھی لیکن
ہو کر نہیں۔ اُسے مارسی سے بے حد محبت تھی۔ اُس نے ابوجعفر کو اس طرح آدھی رات
وقت ننگی تلوار لئے اپنے گھر میں داخل ہوتے دیکھا تو دہل گئی۔ اب وہ یہ بھول چکی
مارسی کے لئے سکندر بیگ سے اچھا کوئی رشتہ نہیں۔ اُسے محسوس ہوا کہ اُس کی
لٹیروں کے ہمراہ محفوظ نہیں ہوگی۔ چنانچہ اُس نے پوری ہمت سے کہا۔

''ابوجعفر! مجھے تم سے یہ اُمید نہ تھی..... آج تم نے ثابت کر دیا کہ تم ایک اچھے
نہیں بلکہ ایک بدفطرت انسان ہو..... تم مارسی کو اغواء کر کے ہی کیوں لے جانا چا
جب میں نے تم سے وعدہ کیا ہے کہ میں مارسی کو سکندر بیگ کے ساتھ شادی کرنے
کر لوں گی۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ میں صلیبؑ کے لئے اب تک تمہارا بہ
ساتھ دیتی آئی ہوں۔ لیکن یاد رکھو! کہ میں اپنی بیٹی کو اپنی آنکھوں کے سامنے اغوا
نہیں دیکھ سکتی۔''

مارتھا کی بات مکمل ہوئی ہی تھی کہ یکلخت کمرہ ابوجعفر کے قہقہے سے گونج اُٹھا۔
چہرے پر دنیا جہان کی تمام تر شیطنیت رقص کر رہی تھی۔ اُس نے صرف ایک قہقہہ
بلکہ وہ اپنی انتہائی مکروہ آواز میں ہنستا ہی چلا گیا۔ اور پھر بڑی مشکل سے اپنی ہنسی
ہوئے کہنے لگا۔

''واہ مارتھا بیگم! تم کیا سمجھتی ہو کہ میں تمہاری نک چڑھی بیٹی کو پالکی میں بٹھا کر لے
وں گا یا اس کے راستوں میں پھول بچھاؤں گا۔ مارتھا بیگم! تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ
جعفر کا دماغ کہاں تک کام کرتا ہے۔ اب سنو! میں تمہاری بیٹی کو رات کی اس تاریکی میں
کرنے کے لئے کیوں آیا ہوں۔

مارتھا! تم قاسم بن ہشام اور بہت سے دیگر لوگوں کی نظروں میں آ چکی ہو۔ اور یوں تم
لئے ایک کمزوری بن چکی ہو۔ میں جانتا ہوں کہ تم ایک کمزور عورت ہو۔ قاسم بن
کی نشاندہی پر سلطان نے تمہیں گرفتار کروایا تو تم خفیہ محکمے کے جلادوں کا تشدد
نہیں کر پاؤ گی۔ مجھے یقین ہے کہ البانوی شہزادوں کے قتل سے لے کر اب تک
ام داستان اُگل دو گی۔ تم جانتی ہو کہ میں اپنے خلاف کوئی ثبوت نہیں چھوڑتا..... اب
آ گیا ہے کہ تمہیں تمہاری خدمات کا صلہ دے دیا جائے۔''

ابوجعفر کی بات نے یکلخت مارتھا کا خون نچوڑ لیا۔ اب وہ سمجھ چکی تھی کہ آدھی رات
وقت ابوجعفر اُس کے گھر کیوں داخل ہوا تھا۔ ابوجعفر بات مکمل کر کے ایک بار پھر اپنے
ہ انداز میں ہنسا۔ اُس کی تلوار نیام میں تھی اور وہ قہقہہ ابھی اُس کے حلق میں تھا کہ
غیر متوقع طور پر مارسی نے اپنی تلوار سے اُس پر حملہ کر دیا۔ ابوجعفر اگر یک دم جھکائی
کر ایک طرف نہ ہٹ گیا ہوتا تو مارسی کی تلوار اُس کے کندھے کو چیرتی ہوئی اُس کے
میں اُتر جاتی۔ لیکن اب نہ صرف اُس نے خود کو بچا لیا تھا بلکہ بیک وقت اپنی تلوار بھی
نیام کر لی تھی اور اپنے دونوں ساتھیوں کو بھی آواز دے کر اندر بلا لیا تھا۔ دونوں نقاب
کمرے میں داخل ہوتے ہی مارسی پر ٹوٹ پڑے۔ لیکن یہ دیکھ کر ابوجعفر کی حیرت کی
انتہا نہ رہی کہ مارسی ایک ماہر شمشیر زن کی طرح اُن دونوں نقاب پوشوں کا مقابلہ کر رہی
ہے اور مارسی اُن کا مقابلہ کیوں نہ کرتی۔ جب سے قاسم رہا ہو کر آیا تھا، وہ قاسم سے
شمشیر زنی سیکھتی رہی تھی۔ اور اب تو وہ ایک ماہر شمشیر زن کی طرح لڑ سکتی تھی۔

ابوجعفر اور مارتھا ایک طرف کھڑے دو نقاب پوشوں کے ساتھ مارسی کا مردانہ وار مقابلہ
رہے۔ مارتھا کی آنکھیں حیرت سے پھٹی جا رہی تھیں۔ اُس کی بیٹی کسی بہادر سپاہی
طرح گھر میں آئے ڈاکوؤں کا ہر وار تلوار پر روکتی اور پھر آگے بڑھ کر اُن دونوں
پر انتہائی خطرناک وار کرتی۔ رات کے اندھیرے میں تلواروں کی چھنکار دُور تک
رہی تھی۔ بوڑھی خادمہ اور اکبر اپنے اپنے کمروں میں جاگ اُٹھے۔ خادمہ کے
خوف اور اکبر کے چہرے پر سنسنی تھی۔ اکبر اُچھل کر اپنے بستر سے اُترا اور بھاگ

کر دیوار پر لٹکا برچھا اتار لیا۔ اُس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا اور وہ سوچ رہا تھا
یقیناً کسی دشمن نے مارسی پر حملہ کر دیا ہے۔ وہ بجلی کی تیزی سے اپنے کمرے سے باہر
اور اپنی مالکن کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ کمرے کے قریب پہنچ کر جب اُس
دیکھا کہ مارسی دو نقاب پوشوں کے ساتھ تن تنہا بھرپور مقابلہ کر رہی ہے اور مکروہ صو
ابوجعفر اپنی تلوار بے نیام کئے آہستہ آہستہ مارتھا کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے
ہکا بکا رہ گیا۔ اُسے یقین نہ آ رہا تھا کہ ابوجعفر، مارتھا کو قتل کر دے گا۔ یہی وجہ تھی
مارتھا کو چھوڑ کر مارسی کی مدد کو پہنچا اور عین اُسی وقت ایک نقاب پوش کی پشت میں اپ
دھار برچھا گھونپ دیا جب مارسی تھک کر نڈھال ہو چکی تھی۔ اِدھر نقاب پوش کسی بلا
طرح ڈکراتا ہوا پیوند زمین ہونے لگا اور اُدھر مارسی اور اکبر، مارتھا کی دلدوز چیخ سن کر
گئے۔ اکبر کی آنکھیں حیرت کی شدت سے اُبل رہی تھیں۔ اُسے قطعاً توقع نہیں تھی کہ
کا دیرینہ دوست ابوجعفر یوں مارتھا کو قتل کر دے گا۔ مارسی نے ماں کو گرتے دیکھا تو
کچھ بھول کر ماں کی طرف دوڑی۔ وہ تلوار کو ایک طرف پھینک چکی تھی۔ اُسے ایسے لگا
اُس کی ماں اب ہمیشہ کے لئے اُسے چھوڑ کر جانے والی ہے۔ وہ دوڑ کر ماں سے لپ
اور چیخ چیخ کر ماں کو پکارنے لگی۔ مارتھا کے پیٹ میں ابوجعفر کی تلوار گڑی ہوئی تھی
آخری ہچکیاں لے رہی تھی۔ مارسی نے اپنی ماں کا سر اٹھا کر اپنے زانوں پر رکھ لیا اور
کو زور زور سے ہلا کر ملک عدم جانے سے روکنے لگی۔

کمرے کا دوسرا منظر بھی قابل دید تھا۔ مارسی کی پھینکی ہوئی تلوار اکبر کے ہاتھ
اور اکبر دوسرے بچ جانے والے نقاب پوش کے ساتھ برسر پیکار تھا۔ ابوجعفر خالی
اور غالباً اس انتظار میں تھا کہ موقع ملے تو مرنے والے نقاب پوش کی تلوار اُٹھا کر
سکے۔ کیونکہ اُس کی اپنی شمشیر مارتھا کے پیٹ میں پیوست تھی۔ اور مارتھا کے پاس غ
سے پاگل ہوتی ہوئی مارسی موجود تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ابوجعفر، مارسی کے قریب آنے
رہا تھا۔ اکبر شمشیر زنی کے فن سے ناواقف تھا۔ پھر بھی نقاب پوش کا ہر وار اپنی تلوار
ہوا پوری ہمت سے اُس کا مقابلہ کر رہا تھا..... لیکن کب تک۔ یہ تیرہ چودہ سالہ لڑکا
کے تجربہ کار سپاہی کو کب تک روک سکتا تھا؟ اور پھر وہی ہوا۔ جنگجو نقاب پوش نے
ساتھ میدانِ مبارزت کا ایک خطرناک داؤ کھیلا اور ناتجربہ کار اکبر اُس کے دھوکے
گیا۔ نقاب پوش نے ایک دم پیچھے ہٹنے کی اداکاری کی اور یوں ظاہر کیا جیسے دا
گرنے والا ہے۔ اکبر دھوکے میں آ گیا اور پوری قوت سے تابڑ توڑ حملے شروع

نقاب پوش نے جب دیکھا کہ نوعمر اکبر اب تھک چکا ہے تو اُس نے آگے بڑھ کر ایک
بھرپور ضرب اکبر کی شمشیر پر لگائی۔ اور اگلے لمحے اکبر کی شمشیر اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر
رش پر پھسلتی ہوئی مارسی کے قریب جا کر رُک گئی۔ مارسی ابھی تک اپنی ماں کو مرنے سے
روک رہی تھی۔ مارتھا کی آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر اُبل آئی تھیں اور اُس کا بدن زور
زور سے جھٹکے لے رہا تھا۔ اچانک مارتھا کے جھٹکے رُک گئے اور اُس نے اپنی آنکھوں کے
پیالے گھمانے شروع کر دیئے۔ اب وہ اپنی بیٹی کے چہرے پر نظریں ٹکائے اُسے غور سے
دیکھ رہی تھی۔ مارسی نے چیخ کر ماں سے کہا۔

"ماں!..... ماں!..... خدا کے لئے مجھے اکیلا چھوڑ کر مت جاؤ۔"

مارتھا کے چہرے پر موت کا کرب پوری طرح طاری ہو چکا تھا۔ اُس نے مارسی کو نظر
بھر کے دیکھا اور کچھ کہنے کی کوشش کی۔ یہ اُس کے آخری الفاظ تھے۔ اُس کے ہونٹ ہلے۔

"مم..... مم..... مار..... سی!..... اَب..... بو..... جا..... فر..... قیصر کا جاسوس ہے۔ مم..... مم.....
نے اَل..... بان وی..... شاہ زادوں کو..... زہر..... اَخ..... ہوخ..... ہووو....."

مارتھا مر چکی تھی۔ ماں کی آنکھوں کو بے نور ہوتے دیکھا تو مارسی کے حلق سے فلک
گاف چیخ بلند ہوئی۔ اب وہ دنیا میں اکیلی تھی۔ بلکہ ابوجعفر جیسے درندے کے رحم و کرم پر
گی۔ اس سے پہلے کہ وہ ماں کے بارے میں کچھ اور سوچتی اُسے اپنے عقب میں نوعمر اکبر
کی دردناک چیخ سنائی دی۔ مارسی جیسے یکلخت کسی خواب سے بیدار ہو گئی۔ نقاب پوش کی
تلوار اکبر کے سینے میں ترازو ہو چکی تھی..... مارسی نے اپنے وفادار خادم اکبر کو اس طرح
گرتے دیکھا تو اُس کے رگ و پے میں غم و غصے کی آگ دوڑ گئی۔ اکبر کی تلوار اُس کے
نزدیک ہی پڑی تھی۔ وہ آگ کے شعلے کی طرح لپکی اور اکبر کی تلوار اٹھا لی۔ اگلے لمحے وہ
کسی زخمی درندے کی طرح غضب ناک ہو کر نقاب پوش پر ٹوٹ چکی تھی۔ مارسی کو حملہ آور
ہوتے دیکھا تو نہ صرف نقاب پوش نے اکبر کے سینے سے اپنی تلوار کھینچ لی بلکہ ابوجعفر نے
بھی دوسرے نقاب پوش کی شمشیر اٹھا کر خود کو مسلح کر لیا۔ مارسی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ انتقام
کی آگ میں اندھی ہو کر دونوں پر پل پڑی۔ اور یہی اُس کی غلطی تھی۔ ابوجعفر نے اندازہ
لگا لیا کہ مارسی غصے سے پاگل ہو چکی ہے۔ چنانچہ اُس نے انتہائی تحمل کے ساتھ مارسی کے
وار کو اپنی تلوار پر روکنا شروع کر دیا۔ مارسی اس قدر غصے میں تھی کہ اُس کے حلق سے
عجیب آوازیں برآمد ہو رہی تھیں۔ ادھر نقاب پوش بھی سنبھل سنبھل کر مارسی کے
وار کا سامنا کر رہا تھا۔ ابوجعفر مارسی کو قتل نہ کرنا چاہتا تھا بلکہ وہ تو اُسے اغواء کرنے کے

لئے آیا تھا۔ چنانچہ اُس نے اپنے نقاب پوش کو ہدایت کی کہ اس پاگل لڑکی کو زندہ گرفتار کرنے کی کوشش کرو۔

اُدھر مارسی تھی کہ رعد و صاعقہ بن چکی تھی۔ وہ اُچھل اُچھل کر ان دونوں پر حملہ آور ہوتی اور اتنی تیزی سے وار کرتی کہ ابوجعفر اور نقاب پوش کے لئے مارسی کی شمشیر کے روکنا مشکل ہو جاتے۔ نہ جانے مارسی کی تلوار سے ابوجعفر اور نقاب پوش کے جسموں پر قدر کاری زخم آ چکے تھے۔ لیکن وہ اب بھی مارسی کو زندہ گرفتار کرنا چاہتے تھے۔ ابوجعفر کے لئے بہت اہم تھی۔ اگر وہ ابوجعفر کے ہاتھ سے نکل جاتی تو ابوجعفر، سکندریہ سے قیصرِ قسطنطنیہ کے لئے مزید کام کیسے لیتا۔ یہی سوچتے ہوئے ابوجعفر، مارسی کے ہر تحمل کے ساتھ روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور پھر اچانک مارسی کو محسوس ہوا کہ جیسے وہ طرح تھک چکی ہو۔ اُس کے نازک بازو تھک چکے تھے اور اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ اُس تیزی سے دھڑکتا ہوا دل کچھ ہی دیر میں پھٹ جائے گا اور وہ زمین پر گر جائے گی۔

مارسی کے حملوں کی شدت میں کمی آئی تو ابوجعفر اور نقاب پوش نے مل کر اُسے تھکانے کے لئے اُس پر پوری قوت سے حملہ کر دیا۔ اب مارسی کی ہمت جواب دے تھی۔ ابوجعفر اور نقاب پوش دونوں طاقتور مرد تھے۔ جبکہ مارسی اُن کے مقابلے میں نازک اور نفیس لڑکی تھی جس کا خوبصورت بدن قاسم کو کانچ کی شاخ سے بھی زیادہ نا اندام دکھائی دیتا تھا۔ آج مارسی نے اپنی ہمت سے بڑھ کر مقابلہ کیا تھا اور اُس نے اور اُس کے ساتھی کے چھکے چھڑا دیئے تھے۔ لیکن اب مارسی جان چکی تھی کہ وہ مزید مکروہ ڈاکوؤں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ چنانچہ اُس نے آنِ واحد میں ایک عجیب و فیصلہ کیا۔ اور اپنی عزت و آبرو کو ابوجعفر جیسے بدمعاشوں سے بچانے کے لئے اُس آخری ترکیب یہی جانی کہ خود کو ختم کر لیا جائے۔ وہ چاہتی تھی کہ اُس کا زندہ وجود کے ہاتھ نہ لگے۔ یہی سوچ کر اُس نے یکلخت خود کو زمین پر گرا لیا اور اگلے لمحے پلک جھپکنے کی تیزی سے اپنے ہی پیٹ میں گھونپ لی.....

مارسی کو اس طرح ہاتھ سے جاتے دیکھ کر ابوجعفر کے اوسان خطا ہو گئے۔ ایک دم ایسے لگا جیسے سب کئے کرائے پر پانی پھر چکا ہے۔ اُس نے تیزی سے آگے بڑھ کر ہوئی مارسی کے پیٹ سے شمشیر باہر کھینچ لی اور انتہائی گھبراہٹ کے عالم میں اپنے پوش کو حکم دیا کہ وہ فی الفور مارسی کو کندھے پر اُٹھا کر یہاں سے لے چلے۔ اس اثنا مارسی بے ہوش ہو چکی تھی۔ نقاب پوش نے آگے بڑھ کر بے ہوش مارسی کو اپنے

اٹھا لیا اور انتہائی تیزی کے ساتھ باہر جانے لگا۔ ابوجعفر بھی تیزی سے اُس کے عقب میں لپکا۔ اب ابوجعفر کے لئے مارسی کو بچانا بہت اہم تھا۔ جلد سے جلد مارسی کو ابتدائی طبی امداد فراہم کرنا چاہتا تھا۔ جونہی ابوجعفر اور نقاب پوش، مارسی کو لے کر آنجہانی مارتھا کے گھر سے نکلے، بوڑھی خادمہ نے انتہائی خاموشی سے آہٹ پیدا کئے بغیر گھر کا دروازہ بند کر دیا۔ بوڑھی خادمہ اب اس واردات کی واحد چشم دید گواہ تھی۔

ابوجعفر بے ہوش مارسی کو لے کر اپنے ایک خاص کارندے اور ماہر جراح سلیم پاشا کے گھر پہنچا۔ سلیم پاشا ادرنہ کا مشہور طبیب اور جراح تھا۔ جبکہ درحقیقت یہ بھی قیصر کا جاسوس تھا۔ اُس نے جراحت اور طب کی باقاعدہ تعلیم حاصل کر رکھی تھی اور اپنی ذہانت و تجربے کی بدولت قصرِ سلطانی تک رسائی رکھتا تھا۔ سلطان مراد خان ثانی کے شاہی طبیبوں کی تعداد بہت سے زیادہ تھی اور سلیم پاشا بھی ان میں شامل تھا۔ گزشتہ کئی دنوں سے سلیم پاشا کا آنا جانا شہزادہ علاؤ الدین کے پاس بے حد بڑھ گیا تھا۔ کیونکہ شہزادہ علاؤ الدین کافی دنوں سے عارضۂ جگر میں مبتلا تھا۔ شہزادہ علاؤ الدین نے جب اپنی بیماری کا ذکر ابوجعفر سے کیا تو ابوجعفر نے اُسے سلیم پاشا سے علاج کروانے کی ہدایت کی۔ خود شہزادہ علاؤ الدین کو عارضۂ جگر میں مبتلا کرنے والا ابوجعفر ہی تھا۔ اُس نے گزشتہ کئی ماہ سے شہزادہ علاؤ الدین کو انتہائی آہستہ رفتار سے اثر کرنے والا زہر مختلف کھانوں میں دینا شروع کر دیا تھا۔

چند ماہ قبل جب ابوجعفر نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اب اُس کا کام ادرنہ میں مکمل ہونے والا ہے تو اُس نے سلطنت عثمانیہ کے اس بہادر اور فعال شہزادے کو بھی ختم کرنے کا ارادہ کر لیا۔ کیونکہ سلطان مراد خان ثانی کے بعد یہ شہزادہ تھا جو اسلامی افواج کی قیادت کر سکتا تھا۔ دوسرے شہزادے کی طرف سے ابوجعفر کو کوئی فکر نہ تھی۔ کیونکہ ایک تو وہ ابھی کم عمر تھا۔ اور دوسرے ابوجعفر کا خیال تھا کہ شہزادہ محمد سلطانی کی اہلیت نہیں رکھتا۔ یہی وجہ تھی کہ ابوجعفر نے شہزادہ علاؤ الدین کے ساتھ تعلقات پیدا کر کے اپنے مختلف مذموم مقاصد پورے کئے تھے۔ اور اب جب ابوجعفر کا کام ادرنہ میں قریب الاختتام تھا، اُس نے شہزادے کو سست اثر زہر کے ذریعے مارنا شروع کر دیا۔ سلیم پاشا، شہزادہ علاؤ الدین کا طبیب تھا جبکہ درحقیقت یہ شخص ابوجعفر کے بعد ادرنہ میں قیصر کے جاسوسوں کا سرغنہ تھا۔ اور اہم بات یہ تھی کہ سلیم پاشا ابھی تک قاسم بن ہشام کی نظروں سے بھی بچا ہوا تھا۔

جونہی ابوجعفر، مارسی کو لے کر رات کی تاریکی میں سلیم پاشا کے گھر پہنچا، سلیم پاشا نے ذرا سی دیر کئے بغیر مارسی کا علاج شروع کر دیا۔ مارسی کا بہت زیادہ خون بہہ چکا تھا اور اُس

کے خوبصورت چہرے کا رنگ خزاں کے پتے جیسا زرد ہو چکا تھا۔ وہ کافی دیر سے بے
ہوش تھی اور اُس کی خوبصورت لمبی لمبی پلکیں اُس کی موٹی موٹی آنکھوں کو ایسے چھپائے
ہوئے تھیں جیسے وہ اطمینان کے ساتھ سو رہی ہو.....

بقیہ تمام رات سلیم پاشا، مارسی کے زخموں کی بخیہ کاری اور مرمت کرتا رہا۔ صبح کے
قریب جب اُس نے ابوجعفر کو بتایا کہ البانیہ کی ہونے والی ملکہ خطرے سے باہر ہے
ابوجعفر کے چہرے پر پہلی بار اُس کی مخصوص مکروہ مسکراہٹ نظر آئی۔ اب ابوجعفر کا منصو
مکمل ہو چکا تھا۔ اُس نے ایک نظر مارسی کے چہرے پر ڈالی اور اُسے نیند کی حالت
دیکھ کر مطمئن ہوا۔ ابوجعفر کمرے سے باہر نکل آیا۔ اُس کے عقب میں سلیم پاشا بھی باہر
آیا۔ ابوجعفر نے سلیم پاشا سے کہا۔

''اچھا طبیب! اب میں چلتا ہوں۔ یہ لڑکی اب کچھ دن تمہارے پاس ہی رہے گی
اس کی حفاظت اور نگرانی تمہاری ذمہ داری ہے۔ خداوند یسوع مسیح نے چاہا تو ہم اسے
بہت جلد سکندر بیگ کے پاس پہنچا کر اپنا وعدہ پورا کر دیں گے اور ہمارے اس کارنامے
سے خوش ہو کر بہادر سکندر بیگ بھی اپنی افواج سمیت ہونیاڈے کے پرچم لئے چلا آئے
گا۔ سلیم پاشا! مجھے یقین ہے کہ یہ لڑکی تمہارے پاس کئی دن تک محفوظ رہ سکتی ہے۔''

سلیم پاشا نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا۔ ''مقدس باپ! آپ فکر مت کیجئے۔ اب
لڑکی میرے پاس محفوظ ہے۔''

ابوجعفر نے پھر کہا۔ ''سناؤ! شہزادہ علاؤ الدین کا علاج کہاں تک پہنچا؟'' یہ جملہ کہتے
ہوئے ابوجعفر کے چہرے پر انتہائی شیطانی مسکراہٹ دکھائی دے رہی تھی۔

سلیم پاشا نے بھی اسی انداز میں مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''مقدس باپ! شہزادہ علا
الدین بہت جلد دنیا کے دُکھ درد سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آزاد ہونے والا ہے۔ میں
اُس کا علاج انتہائی احتیاط کے ساتھ کیا ہے۔''

ابوجعفر، سلیم پاشا کی بات سن کر اطمینان بھرے انداز میں سر ہلانے لگا۔ وہ سوچ رہا
کہ وہ کتنا بڑا جاسوس ہے جس نے ادرنہ میں سلطان مراد خان ثانی کے خلاف ایک ہ
پہلو سازش کا آغاز کیا۔ اور اب وہ سازش انتہائی کامیابی کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچنے وا
ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب وہ سلطان کے شاہی سراغ رساں اور بعض دیگر لوگوں کی نظرو
میں آ چکا ہے، لہٰذا اب اُسے ادرنہ کو چھوڑنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہنا چاہئے۔ اس
سوچا کہ اس کا نائب طبیب سلیم پاشا ابھی تک کسی کی نظروں میں نہیں آیا لہٰذا باقی ماندہ

کی ذمہ داری سلیم پاشا کے سپرد کر دی جائے تو بہتر ہے۔ یہی سوچ کر وہ سلیم سے کہنے لگا۔

''سلیم! میں سوچ رہا ہوں کہ اب ادرنہ میں میرا کام مکمل ہو چکا ہے۔ میری بات غور سے سنو۔ یہ لڑکی جونہی چلنے کے قابل ہوتی ہے، میں اسے لے کر البانیہ کی جانب روانہ ہو جاؤں گا۔ پیچھے ادرنہ میں بغاوت، شہزادہ علاؤ الدین اور قاسم بن ہشام کا قتل اور سلطان کا تخت اُلٹنے کا کام تمہیں سنبھالنا ہوگا۔ تم ینی چری کے تمام عیسائی مجاہدوں سے واقف ہو اور ہماری سازش کے ساتھ متعلقہ تمام لوگوں کے ساتھ تمہارا رابطہ رہے گا۔ اس لئے تمہیں کوئی مشکل پیش نہ آئے گی۔''

یہ سلیم پاشا کے لئے بہت بڑا اعزاز تھا۔ اور ایک نازک ذمہ داری بھی۔ اُس نے مؤدبانہ انداز میں سر ہلا کر ابوجعفر کو تسلی دی اور کہا۔ ''مقدس باپ! آپ نے مجھے صلیب اعظم کی خدمت کا جو موقع دیا ہے میں اس سے بھرپور فائدہ اٹھاؤں گا اور ثابت کر دوں گا کہ آپ کا فیصلہ کس قدر درست تھا۔''

اب ابوجعفر واپس جانے کے لئے مڑا۔ رات بھر کی مشقت نے اُسے تھکا دیا تھا۔ اب وہ جا کر آرام کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے طبیب سلیم پاشا سے اجازت لی اور وہاں سے نکل آیا۔ اُس کے دونوں نقاب پوش ساتھی تو اُسی وقت اپنے ٹھکانوں کی طرف چلے گئے تھے جب انہوں نے مارسی کو طبیب سلیم پاشا کے گھر پہنچا دیا تھا۔

سلیم پاشا بھی درحقیقت سلیم پاشا نہیں تھا۔ یہ ''لوگان'' تھا، ہنگری کا باشندہ۔ گزشتہ چند سالوں سے ادرنہ میں مقیم تھا اور اپنے قد و قامت کا فائدہ اٹھا کر خود کو ترک ظاہر کرتا تھا۔ اس نے ادرنہ میں داخل ہو کر لوگوں کو یہ بتایا کہ وہ ایک مایہ ناز طبیب ہے اور تاتاری علاقوں سے سلطنت عثمانیہ میں داخل ہوا ہے۔ اُس نے لوگوں کو یہ بھی بتایا کہ اُس کا باپ امیر تیمور کے دربار میں شاہی طبیب اور جراح تھا۔ یہی وجہ تھی کہ طبقۂ اُمراء کے لوگ بہت جلد اُس سے متاثر ہوئے اور اُسے اپنا خاص طبیب بنا لیا۔ مارسی، سلیم پاشا کے پاس پہنچ چکی تھی اور ابھی تک نیند کی حالت میں تھی۔ چنانچہ سلیم پاشا اپنی ادھیڑ عمر خادمہ کو مارسی کے بارے میں ہدایات دے کر خود بھی آرام کرنے کے لئے چلا گیا۔

صبح قاسم کی آنکھ کھلی تو اُسے محسوس ہوا کہ رات اُس نے بہت بھیانک خواب دیکھا ہے۔ اُس کے جسم میں کسلمندی تھی اور دل کو کوئی انجانا سا دھڑکا لگا ہوا تھا۔ لیکن اُسے کچھ یاد نہ آئی کہ یہ کس قسم کا خواب تھا۔ وہ خواب کے بارے میں سوچتا ہوا بستر سے اُٹھا اور نماز فجر کی ادائیگی کے لئے مسجد کی جانب چل دیا۔ نماز سے فارغ ہو کر وہ گھر آیا تو بچے

جاگ چکے تھے۔ عمر اور علی اب علی الترتیب پانچ اور تین سال کے تھے۔ عمر بالکل اپنے باپ پر گیا تھا جبکہ علی کی شکل سکینہ سے بہت ملتی تھی۔ لیکن یہ دونوں بچے اپنے والدین سے زیادہ قاسم اور مارسی کے ساتھ مانوس تھے۔ گزشتہ کئی دنوں سے مارسی روزانہ قاسم کے گھر رہی تھی۔ اب وہ اس گھر کے ہر فرد کے ساتھ پوری طرح بے تکلف ہو چکی تھی۔ مارسی ایک شوخ اور چنچل لڑکی تھی یہی وجہ تھی کہ وہ چند ہی دنوں میں سارے گھر کی آنکھ کا تارا بن گئی تھی۔ قاسم کی ماں نے صبح ناشتے کے دسترخوان پر قاسم سے کہا۔

''اب دیر کس بات کی ہے۔ ہماری بیٹی غزالہ کو اب اس گھر میں آ جانا چاہئے۔''

وہاں اپنی عیسائی ماں کے پاس بے چین اور غیر محفوظ ہے۔''

ماں کی بات نے قاسم کو چونکا دیا۔ اُسے یوں لگا جیسے علی الصبح اُس کی ماں کے اس جملے اور اس کے گزشتہ رات کے خواب میں کوئی نہ کوئی مماثلت ضرور ہے۔ اُسے اچانک مارسی کا وہ جملہ بھی یاد آیا جب بہت عرصہ پہلے اُس نے قاسم سے کہا تھا..... میں ہر وقت احساسِ عدم تحفظ کا شکار ہوں..... نہ جانے کیا ہوا کہ قاسم کا دل ناشتے سے اچاٹ ہو گیا۔ اُس نے کسی قدر ڈھیلے لہجے میں اپنی ماں کو جواب دیا۔

''ماں! سچ تو یہ ہے کہ میں خود غزالہ کی طرف سے فکرمند ہوں۔ لیکن سلطان کی واپسی سے پہلے میں اس قسم کا کوئی اقدام نہیں کر سکتا۔ سلطان نے مجھے اپنی عدم موجودگی میں اور نہ کا نگران مقرر کیا ہے۔ اگر میں دشمن پر نظر رکھنے کی بجائے شادی جیسے کام میں مصروف ہو جاؤں تو مجھے سلطان کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے گا..... بس کچھ ہی دنوں کی بات ہے۔ جونہی سلطان اپنی مہم سے واپس آتا ہے، ہم غزالہ کو لے آئیں گے۔''

قاسم کا ذہن کہیں اور تھا۔ اُس نے جو کچھ کہا اُسے خود بھی اچھی طرح سنائی نہ دیا۔ اب اُس کے دماغ میں گزشتہ رات کا خواب پھر سے ہنجے گاڑنے لگا تھا۔ اُسے بے حد بے چینی ہو رہی تھی۔ اسی اثناء میں دروازے پر دستک ہوئی۔ قاسم کے گھر مارسی کے علاوہ اور کوئی کم ہی آتا تھا۔ دروازے کی پہلی دستک پر ہی قاسم کھل اٹھا۔ لیکن ایک دم اُسے سوچ کر حیرت ہوئی کہ اتنی صبح مارسی کو آنے کی کیا ضرورت پڑ گئی۔ وہ اُچھل کر اٹھا اور تیزی سے بیرونی دروازے کی طرف لپکا۔ لیکن یہاں اُسے خفیہ محکمے کے سربراہ بہرام خان کو دیکھ کر جھٹکا سا لگا۔ اُسے مارسی بھول گئی اور اُس کے ذہن میں یہ خیال گھومنے لگا کہ شہر میں کہیں ابوجعفر کی بغاوت اُٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ اُس نے اپنے پیچھے دروازہ بند کیا اور باہر نکل کر بہرام خان سے کہنے لگا۔

''خیریت ہے بہرام خان! تم؟..... اتنی صبح؟''

لیکن بہرام خان کا چہرہ لٹکا ہوا تھا۔ قاسم کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور اُس کے اعصاب تن گئے۔ وہ اپنے آپ کو ہر قسم کی خبر سننے کے لئے تیار کرنے لگا۔ بالآخر اُس نے دوبارہ پوچھا۔

''تم کچھ بولے نہیں بہرام خان؟ کیسے آنا ہوا اس وقت؟''

بہرام خان نے کسی قدر جھجکتے ہوئے ہونٹ کھولے۔ ''آپ کے لئے اچھی خبر نہیں ہے قاسم بن ہشام!..... میں آپ کو تھوڑی سی زحمت دینے آیا ہوں۔''

بہرام خان کے لہجے سے قاسم کا ماتھا ٹھنکا۔ ضرور کوئی ایسی ویسی بات تھی۔ اُس نے بہرام کے لہجے میں نہ صرف ہلکا سا طنز محسوس کیا بلکہ اس تحکمانہ انداز کو بھی نظر انداز نہ کر سکا۔ لیکن اُس نے بے جھجک سوال کیا۔

''کیا مطلب؟..... تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ کون سی خبر میرے لئے بری ہے؟''

''قاسم بن ہشام! البانوی کنیز کے گھر کسی نے شب خون مارا ہے۔ اُسے حملہ آوروں نے پیٹ میں شمشیر گھونپ دی ہے۔ جبکہ اُس کے ایک بوڑھے ملازم اور ایک نوعمر لڑکے کو بھی قتل کر دیا گیا ہے۔ اُس کی جوان بیٹی کو حملہ آور اُٹھا کر لے گئے ہیں۔ اور تمام تر حالات و شواہد پر غور کرنے کے بعد اس ہولناک واردات کی تفتیش کا رُخ ایک شخص کی طرف بڑھ جاتا ہے۔''

اتنا کہہ کر بہرام خاموش ہو گیا۔ ادھر اس ہولناک خبر سے قاسم کی دنیا گھومنے لگی تھی۔ اسے اپنے پیروں تلے زمین ہلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ مارتھا، اکبر اور بوڑھے خادم کے قتل کی خبر فی الحقیقت قاسم کے لئے لرزا دینے والی تھی۔ اب اُسے بہرام خان کا تحکمانہ لہجہ بھول گیا تھا۔ اُس نے یہ بھی نہ دیکھا کہ بہرام خان کے ہمراہ خفیہ محکمے کے چند سپاہی بھی تھے۔ وہ ابھی واقعے کی سنگینی کے سحر سے نکل بھی نہ پایا تھا کہ اُسے چونکنا پڑا۔ بہرام خان کہہ رہا تھا۔ ''قاسم بن ہشام! گزشتہ کچھ دنوں سے البانوی کنیز کی بیٹی مارسی کا آنا جانا تمہارے گھر رہا ہے۔ بہرام خان کی نگاہیں اس سے بے خبر نہیں..... جبکہ یہ بھی مجھے معلوم ہے کہ تم اور تمہاری ساتھی لڑکی البانوی کنیز مارتھا کو ناپسند کرتے تھے۔ اُس لڑکی کا زندہ غائب ہو جانا اور مارتھا کا بے رحمی سے قتل ہو جانا صرف اسی طرف اشارہ کرتا ہے کہ میں تمہیں فی الفور حراست میں لے لوں۔''

اب قاسم کی کنپٹیاں تمتما اُٹھیں۔ اُس کے بدن کی لوئیں کھڑی ہو گئیں۔ اور ایک لمحے

کے لئے گھبرائے بغیر اُس نے سخت غصے سے کہا۔

''کیا؟..... تم کیا بکواس کر رہے ہو؟ تم اصل جاسوسوں کو چھوڑ کر میری نگرانی کر
پھر رہے ہو۔ اس قدر سنگین حادثہ ہو چکا ہے۔ میں سلطنت کا شاہی سراغ رساں ہو۔ ا
یہی وقت ہے کہ میں مجرموں کی گردن تک پہنچوں..... تم اس وقت مجھے حراست میں لے
کی بات کر رہے ہو۔''

قاسم کی زبان سے شعلے برس رہے تھے۔ لیکن بہرام خان نے آنِ واحد میں اپنی شر
برہنہ کر لی اور بجلی کی طرح کڑک کر کہا۔ ''قاسم بن ہشام! تم بہرام کی آنکھوں میں دُھ
نہیں جھونک سکتے۔ میں تمہاری گرفتاری کا مکمل بندوبست کر کے آیا ہوں۔ میں
واردات کی تفتیش مکمل کر لینے کے بعد سب سے پہلے شہزادہ علاؤ الدین سے رجوع کیا
شہزادہ حضور نے ذاتی طور پر مجھے حکم دیا کہ تمہیں فی الفور گرفتار کر لوں۔ میں سیدھا قص
سلطانی سے یہاں پہنچا ہوں۔''

اب قاسم کے ہوش ٹھکانے آئے۔ اُسے احساس ہوا کہ وہ بری طرح پھنس چکا ہے
اُس نے سوچا اس مرتبہ پھر گرفتار ہونا سلطنت کے لئے بے حد نقصان دہ ہے۔ حالا
بتاتے ہیں کہ دشمن اپنی سازش کے آخری مرحلے تک پہنچ چکا ہے۔ اُس نے یہ بھی سوچا
اب شہزادہ علاؤ الدین اُسے باعزت طریقے سے نظر بند نہیں کرے گا۔ بلکہ ہو سکتا
اُسے تہرے قتل کے الزام میں جلاد کے حوالے کر دے۔ چنانچہ اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ
حالات میں کسی قیمت پر بہرام خان کے ہاتھ نہیں آئے گا۔ اب وہ کچھ سوچ ہی رہا تھا
اُسے اپنے عقب میں دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ یہ طاہر تھا، اُس کا بھائی۔ جو بہرا
خان کی گونجدار آواز سن کر باہر نکلا تھا۔ طاہر نے کسی ممکنہ خطرے کے پیش نظر نکلتے وق
برہنہ شمشیر بھی اٹھا لی تھی۔ جونہی وہ دروازے سے باہر نکلا، اُس کی نظر تیغ بکف بہرام خا
پر پڑی۔ ابھی وہ کچھ سمجھ ہی نہ پایا تھا کہ بہرام خان نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا۔

''اس شخص کو غیر مسلح کر کے گرفتار کر لو۔''

سپاہی آگے بڑھے۔ لیکن طاہر ذرا بھی نہ جھجکا۔ وہ وادیٔ حجاز کا مانا ہوا شمشیر زن
اور سلطنت عثمانیہ کی سب سے بڑی تربیت گاہ میں تیغ زنی کا استاد بھی تھا۔ اس
سپاہیوں کو آڑے ہاتھوں لیا۔ حالانکہ وہ بہرام خان کو ذاتی طور پر جانتا تھا۔ چاہئے تو
کہ وہ خفیہ محکمے کے سربراہ بہرام خان سے حقیقت حال معلوم کرتا۔ لیکن وہ بہرام خان
تیور دیکھ چکا تھا۔ اُسے توقع نہ تھی کہ بہرام خان سیدھی طرح سے کوئی بات سنے گا۔ چنا

اس نے بیک وقت خفیہ محکمے کے سپاہیوں کے سامنے نہ صرف اپنی تلوار لہرائی بلکہ چھلانگ
کر اُن چاروں سپاہیوں پر حملہ کر دیا۔ طاہر کی تلوار سے تلواریں ٹکرائیں اور جنگی دُھن بجنے
لگی۔ یہ چھن چھن کی چھنکار تھی۔ طاہر نے چاروں سپاہیوں کو اپنی ایک تلوار کے زور پر تگنی
کا ناچ نچا دیا۔ اب چاروں سپاہی محسوس کرنے لگے کہ وہ اس نوجوان سے شمشیر زنی میں
کبھی بھی نہیں جیت سکتے..... بہرام، قاسم کو اپنی تلوار کی زد میں لئے کھڑا تھا۔ اُس کی
آنکھوں میں حیرت بھی تھی اور غصہ بھی۔ اُس کے چاروں بہادر سپاہی طاہر بن ہشام کے
سامنے کٹھ پتلی کی طرح ناچ رہے تھے۔ بالآخر اُس نے گرج کر کہا۔

''طاہر بن ہشام! میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تلوار پھینک دو۔ تمہارے بھائی کی گرفتاری
کا حکم براہِ راست شہزادہ علاؤ الدین نے جاری کیا ہے۔ تم نے اگر تلوار نہ پھینکی تو میں شاہی
کام میں مداخلت کے جرم میں تمہیں قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔''

طاہر بن ہشام کی تلوار جادو کی چھڑی کی طرح رقص کر رہی تھی۔ وہ خود آندھی اور
طوفان بن کر چاروں سپاہیوں کو بھگا بھگا کر چور چور کر چکا تھا۔ اُس نے تلوار چلاتے
ہوئے کسی سرفروش کی طرح مسکرا کر کہا۔

''بہرام خان! تم اگر چاہتے ہو کہ میں تلوار پھینک دوں تو تم خود پہلے میرے بھائی کے
سر سے تلوار ہٹاؤ۔ ورنہ میں تمہارے ان ہرکاروں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ دوں گا۔''

بہرام خان کو یہ توقع نہ تھی کہ طاہر، شہزادے کا نام سن کر بھی لڑنے سے باز نہیں آئے
گا۔ اُس نے تھوڑی دیر کے لئے کچھ سوچا اور پھر قاسم کے سر سے تلوار ہٹا لی۔ قاسم کے
لئے یہ بہترین موقع تھا۔ وہ کسی چھلاوے کی طرح اپنی جگہ سے اُچھلا اور بجلی کی تیزی سے
ایک جانب دوڑتا چلا گیا۔ بہرام کے لئے یہ انتہائی غیر متوقع صورتحال تھی۔ اُس نے قاسم
کے ہاتھ سے نکلتے دیکھا تو سب کچھ بھول کر اُس کے پیچھے لپکا۔ چاروں سپاہی جو طاہر کے
خوفناک پیکار تھے، بہرام کے بھاگتے ہی فوراً پیچھے ہٹ گئے۔ وہ تو پہلے ہی دعائیں کر
رہے تھے کہ کسی طرح اس مصیبت سے چھٹکارا مل جائے۔ طاہر کی شمشیر ان پر عذابِ الٰہی
کی طرح برس رہی تھی۔ انہیں جیسے ہی اس عذاب سے بچنے کا موقع ملا وہ پیچھے ہٹے اور دُم
دبا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اب بظاہر بہرام اور چاروں سپاہی قاسم کا تعاقب کر رہے
تھے۔ لیکن درحقیقت وہ قاسم کو کھو چکے تھے.....!

معاہدۂ زیجیڈین

قاسم بہرام خان اور اُس کے ساتھیوں کے سامنے سے ایسے غائب ہوا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ لیکن درحقیقت وہ صرف پہلی بغلی گلی میں مڑتے ہی پاس کے ایک مکان کی ڈیوڑھی میں داخل ہو چکا تھا۔ جبکہ بہرام اور اُس کے ساتھی یہ سمجھے تھے کہ وہ دُور نکل گیا ہے۔ چنانچہ وہ ایک جانب منہ اٹھائے بھاگتے چلے گئے۔ جونہی قاسم نے بہرام اور اُس کے ساتھیوں کو آنکھ سے اوجھل ہوتے دیکھا، وہ بجلی کی تیزی سے واپس لپکا اور چند لمحے بعد وہ اپنے گھر کے سامنے کھڑا تھا۔ یہاں اُس کا بھائی ابھی تک شمشیر بکف، حیران پریشان کھڑا تھا۔ قاسم نے انتہائی تیز لہجے میں طاہر سے کہا۔

"بھائی جان! غزالہ کو اغواء کر لیا گیا ہے۔ اُس کی ماں اور اُن کے دو ملازم جس میں ایک اکبر تھا، قتل کر دیئے گئے ہیں۔ جبکہ بہرام نے اس واردات کا سارا شک مجھ پر ظاہر کر کے شہزادہ علاؤ الدین سے ایک بار پھر میری گرفتاری کا اجازت نامہ حاصل کر لیا ہے۔ میں فی الفور غزالہ کو بازیاب کرنا چاہتا ہوں۔ جبکہ شہزادہ اور بہرام مجھے ایسا نہیں کرنے دیں گے۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں ابھی اور اسی وقت ازخود البانیہ کے راستے پر غزالہ کی بازیابی کے لئے جاؤں گا۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ غزالہ کو ابوجعفر کے آدمیوں نے سکندر بیگ کے لئے اغواء کیا ہے۔ واردات نصف شب کی ہے اور اغواء کنندگان اتنی زیادہ دُور نہیں گئے ہوں گے۔"

قاسم نے اپنی بات شروع کی تھی تو اس وقت وہ گھر کے دروازے سے باہر گلی میں تھا لیکن جب اُس نے بات ختم کی تو اُس وقت وہ انتہائی عجلت سے چلتا ہوا گھر کے اصطبل تک پہنچ چکا تھا۔ طاہر اُس کی بات سنتا اور اُس کے ساتھ چلتا ہوا اصطبل تک چلا آیا۔ قاسم کو گھوڑے کی زین درست کرتے ہوئے دیکھا تو کہا۔

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔"

"نہیں۔ آپ میرے ساتھ نہیں چلیں گے۔ ادرنہ میں ہر لمحہ بغاوت کا خطرہ ہے۔ آپ ابھی اور اسی وقت شہزادہ محمد اور ملکہ سروین سے مل کر ابوجعفر کی گرفتاری کا حکم نامہ حاصل کیجئے۔ مجھے سو فیصد یقین ہے کہ مارتھا کو ابوجعفر کے آدمیوں نے قتل کیا ہے۔"

قاسم گھوڑا تیار کر چکا تھا اور گھر میں کسی سے ملے بغیر باہر نکل آیا تھا۔ طاہر اب بھی اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا باہر گلی میں آ چکا تھا۔ طاہر نے اچانک چونک کر قاسم کی زین سے بندھے اسلحہ کو دیکھا اور کہا۔

"ارے، تمہارے ترکش میں تو بہت کم تیر ہیں..... ٹھہرو! میں ترکش بھر دیتا ہوں۔"

"نہیں۔ اب میں مزید وقت ضائع نہیں کر سکتا۔ بہرام ابھی چند لمحوں میں پھر واپس آنے والا ہے۔ آپ کوشش کیجئے کہ اُس کے اُلٹے سیدھے سوالات کا جواب دینے کی بجائے جلد سے جلد قصرِ سلطانی کی جانب چل پڑیں۔"

طاہر نے وقت کی نزاکت کا احساس کیا اور زور زور سے اثبات میں سر ہلانے لگا۔ اگلے لمحے قاسم اپنے گھوڑے کو ایڑھ لگا چکا تھا۔ اُس نے اپنے چہرے کو عمامے کے پلو سے چھپا لیا تھا اور اُس کا گھوڑا ہوا سے باتیں کرتا ہوا شہر سے باہر کی جانب سرپٹ دوڑتا چلا جا رہا تھا۔

اُسے بہت تیزی کے ساتھ بہت زیادہ سفر کرنا تھا۔ اُس کے اندازے کے مطابق مارتھا کے اغواء کنندگان ادرنہ سے صبح کاذب کے وقت روانہ ہوئے تھے۔ وہ جلد سے جلد پچاس میل سے زیادہ سفر طے کرنا چاہتا تھا۔ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ اغواء کنندگان کم و بیش پچاس میل سفر کرنے کے بعد تھک کر سست ہو چکے ہوں گے۔ اُس کا طاقتور گھوڑا ادرنہ کے فضا کی دُھول اڑاتا ہوا البانیہ کی جانب اُڑا چلا جا رہا تھا۔

اُدھر طاہر قصرِ سلطانی میں پہنچا۔ اُس نے شہزادہ محمد اور ملکہ سروین کو مارتھا کے قتل اور غزالہ کے اغواء کے متعلق بتایا۔ ملکہ کے لئے یہ ایک دردناک خبر تھی۔ وہ مارتھا کو بہت عزیز رکھتی تھی اور مارتھا کے بارے میں کسی بھی حد تک جانتی تھی۔ جب طاہر نے ملکہ سے ابوجعفر کی گرفتاری کی بات کی تو ملکہ بری طرح چونک اُٹھی اور اُس نے فی الفور کہا۔

"بے شک۔ اُس شخص کو ابھی اور اسی وقت گرفتار کر لیا جائے۔"

جبکہ شہزادہ محمد نے اُسے بتایا کہ ابوجعفر، شہزادہ علاؤ الدین کا منظورِ نظر ہے اور شہزادہ علاؤ الدین ابوجعفر کی بجائے قاسم بن ہشام کی گرفتاری کا حکم دے چکا ہے۔ شہزادہ محمد نے یہ بھی بتایا کہ قاسم، مارتھا کی بازیابی کے لئے بہرام خان کے چنگل سے جان چھڑا کر البانیہ کے راستے پر روانہ ہو چکا ہے..... اب صورتحال کی نزاکت ملکہ کی سمجھ میں آئی اور وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔

"ٹھیک ہے..... تو پھر ہمیں شہزادہ علاؤ الدین سے بات کرنی ہو گی..... چلئے آپ

دونوں بھی میرے ہمراہ چلئے۔ میں ابھی شہزادے سے بات کرتی ہوں۔"

طاہر اور شہزادہ محمد، ملکہ کے ہمراہ شہزادہ علاؤ الدین کے کمرۂ خاص میں آئے۔ ملکہ سب سے آگے آگے چل رہی تھی۔ اُس کی دو خادمائیں اُس کے دائیں بائیں تھیں۔ اور طاہر شہزادہ محمد کے ہمراہ ملکہ کے عقب میں چل رہا تھا۔ جونہی ملکہ، علاؤ الدین کے کمرۂ خاص میں داخل ہوئی یہ دیکھ کر چونک اُٹھی کہ شہزادہ صاحب فراش تھا۔ وہ بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اُس کے نزدیک شہرۂ آفاق طبیب سلیم پاشا موجود تھا۔ شہزادے نے ملکہ کو دیکھا تو اپنے باپ کی اس سربیائی بیوی کے استقبال کے لئے اُٹھنے کی کوشش کی۔ اُس نے کہنی بستر پر ٹکائی اور اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ لیکن اگلے لمحے اُسے شدید کھانسی آنے لگی۔ اب شہزادہ محمد اور ملکہ دونوں پریشان ہو گئے۔ انہیں تو معلوم ہی نہ تھا کہ علاؤ الدین اس قدر بیمار ہے۔ شہزادہ چند دن قبل اپنے بھائی کی عیادت کے لئے آیا تھا۔ لیکن اس وقت تو علاؤ الدین اچھا خاصا چلتا پھرتا تھا اور اُسے صرف بخار کی تکلیف تھی۔ لیکن آج بھائی کو یوں صاحب فراش دیکھ کر محمد کا کلیجہ کانپ گیا۔ شہزادہ علاؤ الدین سلطنت کا ولی عہد تھا۔ سلطان مراد خان ثانی کا بیٹا ہونے کے ناطے سلطان کا لاڈلا اور منظورِ نظر تھا۔ شہزادہ علاؤ الدین سے سلطان کو بے محبت تھی۔ محمد نے سوچا کہ اگر اُس کے باپ کو اپنے لاڈلے بیٹے کی اس قدر شدید بیمار کا پتہ چلے تو وہ دیوانہ ہو جائے۔ محمد غمزدہ قدموں سے آگے بڑھا اور بھائی سے کہنے لگا۔

"بھائی جان! آپ اس قدر بیمار ہیں..... اور آپ نے ایک پیغام تک نہیں بھیجا۔"

محمد بھائی کا جواب سنے بغیر طبیب کی طرف مڑا اور بولا۔ "طبیب! یہ آپ کی ذمہ داری تھی۔ بھائی جان تو علیل ہیں۔ آپ ہی ان کے معالج ہیں۔ آپ کو چاہئے تھا کہ ہمیں اطلاع کرتے۔"

ملکہ اپنی شاہانہ شان و شوکت کو بھول کر شہزادہ علاؤ الدین کے پاس تخت پوش پر بیٹھ گئی اور شہزادے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ "علاؤ الدین! کیا آپ ہم سے ناراض ہیں کہ آپ اس قدر علیل ہیں اور آپ نے کسی کو بتایا تک نہیں۔"

"نہیں ملکہ معظمہ! ایسی بات نہیں۔ ہم کل تک بالکل ٹھیک تھے۔ بس آج اچانک صحت زیادہ گر گئی ہے۔ بخار اور کمزوری تو تھی لیکن آج صبح ایک بری خبر نے صحت پر بہت زیادہ منفی اثر ڈالا ہے۔"

"مزاجِ دشمناں!..... خدا نہ کرے کہ آپ کے نزدیک کوئی بری خبر آئے۔ ایسی کون سی خبر ہے جس نے آپ کو اس قدر مضمحل کر دیا؟" ملکہ نے انتہائی محبت سے علاؤ

ہاتھ دباتے ہوئے پوچھا تو علاؤ الدین نے کہا۔

"دراصل ہم سے چند دن پہلے یہ غلطی ہوئی کہ ہم نے آپ کے بہت زیادہ اصرار پر سلطنت کے ایک خطرناک دشمن کو آزاد کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہم نے اس بری خبر کا بہت زیادہ اثر لیا ہے۔ ہم نے آپ کے کہنے پر قاسم بن ہشام کو رہا تو کر دیا تھا لیکن اس نے گزشتہ شب ہماری سلطنت کی دیرینہ مہمان مارتھا بیگم کا قتل کر کے اُس کی نوجوان بیٹی کو اغواء کر لیا ہے..... اسی خبر نے ہمیں..... ہماری غلطی کا اس قدر شدید احساس دلایا کہ ہم صاحب فراش ہو گئے۔ ہم نے بہرام خان کو قاسم بن ہشام کی زندہ یا مُردہ گرفتاری کا حکم دے کر روانہ کر دیا ہے۔ آپ فکر مت کیجئے، یہ نوجوان گرفتار ہو گیا تو ہماری صحت خود بخود ٹھیک ہو جائے گی۔"

کمرے میں موجود تمام افراد شہزادہ علاؤ الدین کی بات سے اپنی اپنی جگہ چونک کر رہ گئے۔ طبیب سلیم پاشا کے بدن میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ شہزادہ محمد اور ملکہ اس لئے چونکے کہ وہ جس بات کے لئے آئے تھے یہاں اس کا ذکر کرنے کی بھی گنجائش نہ تھی۔ اور طاہر شہزادے کے ارادے جان کر کانپ گیا تھا۔

ملکہ سوچنے لگی کہ اب کیا، کیا جائے؟ بیمار شہزادہ جو سلطنت کا وارث تھا قاسم کے حق میں کوئی بات سننے کے لئے تیار نہ ہوگا۔ ایسے عالم میں ابوجعفر کی گرفتاری کا پروانہ حاصل کرنا کیونکر ممکن ہو سکتا ہے۔ وہ دل ہی دل میں دُعا کرنے لگی کہ کاش آج اچانک سلطان مراد کا کوئی پیغام ہی آ جائے۔ شہزادہ بیمار تھا اور ملکہ اُس کو پریشان نہ کرنا چاہتی تھی۔ یہی معاملہ محمد کا تھا۔ لیکن طاہر اپنی جگہ کھڑا یہ سوچ سوچ کر کانپ رہا تھا کہ اُس کا بھائی شہزادے کے عتاب کا شکار ہونے والا ہے۔ وہ اُس دن کو کوس رہا تھا جب سلطان نے قاسم کو شاہی اتالیق رساں مقرر کر کے ایک خطرناک کام پر لگا دیا تھا۔ سب لوگ اپنی اپنی جگہ یہی کچھ سوچ رہے تھے کہ دربان نے کمرۂ خاص میں داخل ہونے کی اجازت چاہی۔ شہزادہ علاؤ الدین نے پُرتجسس نظروں سے دربان کو دیکھا اور اُسے اندر بلا لیا۔

دربان نے بتایا کہ خفیہ محکمے کا سربراہ بہرام خان ملاقات کی اجازت چاہتا ہے۔ شہزادہ بہرام کا نام سنتے ہی ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور اُس نے بہرام خان کو فوراً حاضر ہونے کی اجازت دے دی۔ بہرام خان کمرے میں داخل ہوا تو سب لوگ اُس کی حالت دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ بہرام خان کے بال گرد و غبار سے اٹے ہوئے تھے اور اُس کے چہرے پر حد سے زیادہ یتیمی برس رہی تھی۔ شہزادے نے کسی قدر کرخت لہجے میں پوچھا۔

"بہرام خان! معلوم ہوتا ہے تم سلطنت کے غدار کو نہیں لا سکے۔"

لیکن بہرام شہزادے کو کوئی جواب دینے کی بجائے یکلخت پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ طاہر کو دیکھنے لگا۔ اور پھر کسی بچے کی طرح آدابِ شاہی کی پرواہ کئے بغیر چیخ کر کہنے لگا۔

"یہی ہے..... یہی ہے شہزادہ حضور! یہی ہے وہ شخص جس نے قاسم بن ہشام کو فرار ہونے کا موقع دیا۔ یہ قاسم بن ہشام کا بڑا بھائی طاہر بن ہشام ہے۔ اسے فوراً گرفتار کرنے کا حکم دیجئے شہزادہ حضور! اس شخص نے عین اُس وقت جب میں قاسم بن ہشام کے ہاتھ میں زنجیر ڈالنے والا تھا میرے سپاہیوں پر حملہ کر کے بساط کو اُلٹ دیا۔ شہزادہ حضور! یہ قاسم بن ہشام کا بھائی ہے اور انتہائی خطرناک تلوار باز ہے۔ یقیناً یہ بھی بھائی کی سازش میں شریک ہوگا۔"

طاہر تو کیا یہ صورتحال شہزادہ محمد اور ملکہ حتیٰ کہ سلیم پاشا کے لئے بھی غیر متوقع تھی اور شہزادہ محمد کی اُمیدوں پر اوس پڑنے لگی۔ طاہر بری طرح سٹپٹا گیا تھا۔ اُس نے لمحے کے لئے بھی نہ سوچا تھا کہ یک دم ایسے حالات کا سامنا بھی ہو سکتا ہے۔ جبکہ علاؤالدین اپنی بڑی بڑی کمزور آنکھیں پوری طرح کھول کر طاہر کو گھور رہا تھا۔ طاہر زور زور سے دھڑکنے لگا۔ لیکن نہ جانے ملکہ نے کہاں سے ہمت پا کر شہزادہ علاؤالدین کو اپنی طرف متوجہ کیا اور کہا۔

"بالکل غلط!..... بہرام خان کی تفتیش بالکل غلط ہے۔ ہم پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ البانوی کنیز مارتھا کا قتل اور اس کی بیٹی کا اغواء قاسم بن ہشام نے نہیں کیا۔ قیصر کے ان جاسوسوں نے کیا ہے جو نہ صرف ادرنہ میں بغاوت برپا کرنا چاہتے ہیں۔ علاؤ اپنے سب سے بڑے دشمن قاسم بن ہشام کو بھی راستے سے ہٹانا چاہتے ہیں۔ علاؤ آپ جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہ کیجئے۔ سلطان معظم نے کچھ دیکھ کر ہی قاسم بن شاہی سراغ رساں مقرر کیا تھا۔"

شہزادے کو ملکہ کی بات ناگوار گزری اور اُس کی بھنوئیں سکڑ گئیں۔ اُس نے خشک لہجے میں کہا۔ "ملکہ معظمہ! امورِ سلطنت میں ہماری نگاہیں اُس جگہ تک دیکھ سکتی ہیں جہاں تک محل کی معزز خواتین نہیں دیکھ سکتیں۔ آپ قاسم بن ہشام کی اس قدر وجوہات کی بناء پر کرتی ہیں؟ جبکہ ہمارے پاس اُس کے جرم کے ناقابل تردید ہیں۔" شہزادے کے لہجے سے ملکہ اپنی جگہ پر کانپ گئی۔

اچانک کمرے میں موجود طبیب سلیم پاشا نے آگے بڑھ کر مؤدب انداز میں

ے کہا۔

"شہزادہ حضور! ملکہ معظمہ کی ہمدردی قاسم بن ہشام کے ساتھ نہیں بلکہ مارتھا بیگم کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ کیونکہ ملکہ معظمہ یقیناً البانوی کنیز مارتھا بیگم کے ساتھ علاقائی اُنس رکھتی ہیں۔ چنانچہ ملکہ معظمہ کی بات نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔"

ملکہ، سلیم پاشا کی بات سے من ہی من میں لرز گئی۔ یہ بظاہر ملکہ کی طرفداری کا جملہ تھا۔ لیکن فی الحقیقت یہ گہرا طنز تھا۔ شہزادہ محمد بھی یہ طنز محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا اور شہزادہ علاؤالدین تو سلیم پاشا کی بات سے بری طرح برافروختہ ہو گیا۔ اُس نے سلیم پاشا کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"طبیب! تم جانتے ہو تم ملکہ معظمہ کی طرفداری کے پیرائے میں کس قدر غلط بات کہہ رہے ہو۔ ملکہ معظمہ کو کسی البانوی کنیز کے ساتھ ہم سے زیادہ علاقائی اُنس نہیں۔ ہم تمہاری زبان سے بے حد مشتعل ہوئے ہیں۔" بیمار شہزادے نے سلیم پاشا پر آنکھیں نکالتے ہوئے کہا تو سلیم پاشا کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ وہ کسی مکار خوشامد پرست کی طرح گڑگڑاتے ہوئے ملکہ معظمہ کے حضور کمر تک جھک گیا اور منمناتی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔

"ملکہ معظمہ! یہ حقیر اور کم تر شخص اپنی کج گفتی پر بے حد نادم اور شرمسار ہے۔ میرا کہنے کا مطلب ہرگز یہ نہ تھا جو میرے الفاظ سے ظاہر ہوا۔ میں دل و جان سے معافی کا طلبگار ہوں۔"

ملکہ نے سلیم پاشا کی گڑگڑاہٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے شہزادہ علاؤالدین سے کہا۔

"علاؤالدین! اس وقت ادرنہ کو دشمنوں کا خطرہ درپیش ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ تیز رفتار قاصد کے ذریعے سلطانِ معظم سے براہِ راست ہدایات حاصل کریں۔ ہم مارتھا بیگم کو اچھی طرح جانتے تھے اور اُس کے پاس آنے جانے والے خطیب مغرب ابوجعفر کے بارے میں بھی کافی خبر رکھتے ہیں۔ ہمارا اب بھی یہی خیال ہے کہ آپ قاسم پر گرفت کی بجائے ابوجعفر پر گرفت فرمائیے۔"

ملکہ نے شہزادے کے پہلے لب و لہجے کو بھلا کر دوبارہ اپنے مطلب کی بات کر دی۔ حتیٰ ابوجعفر کی گرفتاری کا مشورہ بھی دے دیا۔ اب شہزادہ محمد نے ملکہ کو سہارا دینا چاہا اور علاؤالدین سے کہا۔

"بھائی جان! ہم قاسم بن ہشام کے دوست کی حیثیت سے دعوے کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ ہم جیسا سرفروش مجاہد اسلامی سلطنت کا دشمن نہیں ہو سکتا۔"

شہزادہ محمد کی بات سے سلیم پاشا جز بز ہو کر رہ گیا۔ اب طاہر کی بھی کسی حد تک ڈھ
بندھی۔ لیکن شہزادہ علاؤ الدین کسی کی کوئی بات ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ اُس نے ر
نظر انداز کر کے براہِ راست بہرام خان سے قاسم کی گرفتاری اور فرار کا واقعہ دریافت
بہرام خان اب بھی طاہر بن ہشام کو آتش ناک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے
بڑھ کر شہزادے کے سامنے مؤدب لہجے میں کہا۔

''شہزادہ حضور! ہم نے قاسم بن ہشام کو گرفتار کر لیا تھا۔ لیکن اُس کے بھائی طاہر
عین وقت پر شمشیر بکف ہو کر میرے سپاہیوں پر حملہ کر دیا۔ اور اسی موقع سے فائدہ ا
قاسم بن ہشام فرار ہو گیا۔''

''لیکن بہرام خان!..... وہ لڑکی کہاں ہے جسے تمہارے بقول قاسم نے اغواء کیا
کیا قاسم کے پاس سے وہ لڑکی یا واردات کی کوئی اور نشانی برآمد ہوئی؟''

شہزادہ علاؤ الدین نے بہرام خان سے یہ سوال کیا تو سلیم پاشا اپنی جگہ پر دل
گیا۔ مارسی اُسی کے گھر میں تھی۔ لیکن کسی کی توجہ اُس کی جانب مبذول نہ ہوئی۔
شہزادے کے سوال پر بہرام خان بغلیں جھانکنے لگا۔ مارسی کو قاسم نے اغواء کیا ہوتا
ملتی۔ بہرام نے بہت تلاش کیا لیکن مارسی کو نہ ملنا تھا اور نہ ملی۔ لیکن اب بہرام خان
شہزادے نے مارسی کے بارے میں پوچھ لیا تو بہرام خان نے شکست خوردہ لہجے میں کہا

''شہزادہ حضور! میں شرمندہ ہوں کہ لڑکی بھی بازیاب نہیں ہو سکی۔''

کمرے کی فضا بڑی عجیب تھی۔ شہزادہ بیمار اور نحیف تھا، یہی وجہ تھی کہ ملکہ اور محمد
کچھ نہ کہنا چاہتے تھے۔ بالآخر شہزادے نے دوبارہ لیٹتے ہوئے بہرام خان سے کہا۔

''بہرام خان! وہ لڑکی ملنی چاہئے۔ ادرنہ کا کونہ کونہ چھان مارو۔ قاسم گنہگار ہے!
گناہ اُسے آج شام تک ہمارے سامنے پیش کرو۔ ہم بے چینی کے ساتھ تمہاری خبر کا
کریں گے۔''

شہزادہ تھک چکا تھا۔ ابوجعفر کے سست اثر زہر نے شہزادے کو کھوکھلا کر دیا تھا۔ ملکہ
محسوس کیا کہ شہزادہ مزید باتیں کرنے کی ہمت نہیں پا رہا تو وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور اُن
جانے کی اجازت لیتے ہوئے کہا۔

''علاؤ الدین! آپ ان واقعات کا کچھ اثر نہ لیجئے۔ اس طرح کے واقعات شہ
کی صحت و زندگی پر اثر انداز نہیں ہوا کرتے۔ آپ ہمارے مشورے پر سلطان
جانب قاصد بھیجئے۔ انشاء اللہ تمام معاملات درست ہو جائیں گے۔''

شہزادہ محمد، طاہر اور ملکہ معظمہ علاؤ الدین کے کمرے سے جانے لگے تو شہزادے نے
ایک دم طاہر کو اپنی جانب متوجہ کر لیا۔

''طاہر بن ہشام! سلطنت کے مجرم کو فرار کروانا بہت بڑا جرم ہے۔ لیکن ہم تمہیں ملکہ
معظمہ کے ہمراہ دیکھ کر معاف کرتے ہیں۔ اب تمہارا فرض ہے کہ تم بہرام خان کے ساتھ
قاسم اور اُس لڑکی کی بازیابی میں مدد کرو۔''

شہزادے کی بات سن کر طاہر نے پھیکے سے انداز میں سر ہلایا اور ملکہ کے عقب میں
واپسی کے لئے چل دیا۔

طاہر قصرِ سلطانی سے فارغ ہو کر سیدھا گھر آیا۔ وہ بے حد پریشان تھا۔ گھر آیا تو سب
نے قاسم کی بابت پوچھا۔ طاہر نے مختصراً بتایا کہ قاسم سلامت ہے اور جلد آ جائے گا۔ لیکن
درحقیقت وہ خود مطمئن نہیں تھا۔ وہ باقی تمام دن قاسم کے سفر اور اُس کے حالات کے
بارے میں سوچتا رہا۔ رات ہوئی تو طاہر کی بے چینی اور بڑھ گئی۔ اپنے اہل خانہ کو تو اُس
نے کسی نہ کسی طرح مطمئن کر دیا تھا لیکن وہ خود بستر پر لیٹا کروٹوں پر کروٹیں بدلتا جا رہا
تھا۔ اُس کی تمام رات اسی حالت میں کٹ گئی۔ لیکن قاسم تو اگلے دن بھی لوٹ کر نہ آیا۔

آج قاسم کو غزالہ کی بازیابی کے لئے البانیہ کے راستے پر روانہ ہوئے کئی دن گزر چکے
تھے..... آج صبح ہی طاہر کو خبر مل چکی تھی کہ سلطان لوٹ آیا ہے۔ یہ خبر طاہر کے لئے انتہائی
دل کن اور حوصلہ افزا تھی۔ لیکن قاسم کی گمشدگی اُس کے لئے متواتر پریشانی کا باعث بنی
ہوئی تھی۔ اُس نے سوچا کہ اُسے آج ہی سلطان سے مل کر تمام حالات بیان کر دینے
چاہئیں تاکہ قاسم اور غزالہ کی تلاش کے سلسلے میں کوئی خاطر خواہ قدم اٹھایا جا سکے۔

وہ سلطان سے ملا۔ سلطان نے اُس کی تمام باتیں غور سے سنیں لیکن کچھ خاص دلچسپی کا
مظاہرہ نہ کیا۔ بس اتنا کہا۔ ''طاہر بن ہشام! تم اطمینان سے اپنے گھر میں رہو۔ ہماری نظر
حالات پر ہے۔ ہم وعدہ کرتے ہیں تمہارے بھائی کو کچھ نہ ہو گا۔ تمہیں مزید فکرمند
ہونے کی ضرورت نہیں۔''

طاہر کے لئے سلطان کی بات بظاہر گول مول تھی لیکن پھر بھی طاہر کو ایک بے نام سا
اطمینان محسوس ہونے لگا۔ اس بار وہ گھر لوٹا تو اُس کی پریشانی آدھی سے زیادہ کم ہو چکی تھی۔
سلطان، قونیا کی بغاوت کا کامیابی کے ساتھ سر کچلنے کے بعد لوٹا تھا۔ امیر کرمانیا نے
ان کے لشکر کا سامنا کسی ایک جگہ پر جم کر نہ کیا بلکہ سلطان کو ایشیائے کوچک کے مختلف
علاقوں میں دوڑاتا رہا اور خود آگے آگے بھاگتا رہا۔ سلطان نے بالآخر امیر کرمانیا کو سخت

شکست دی اور واپس ادرنہ لوٹ آیا۔ اُسے طے شدہ منصوبے کے تحت "قونیا" کی مہم سر
کے بہت جلد شہاب الدین پاشا کی مدد کو روانہ ہونا تھا۔ لیکن امیر کرمانیا کے ساتھ معر
لڑتے لڑتے اُسے اس قدر دیر ہوگئی کہ شہاب الدین پاشا "وازاگ" کے مقام سے لے
وادیٔ بلقان تک شکست کھاتا چلا گیا۔ سلطان کو شہاب الدین پاشا کے لشکر کی شکست کی
ایشیائے کوچک میں ہی مل چکی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بہت تیزی کے ساتھ ادرنہ لوٹ
تھا۔ ہونیاڈے سے جنگ کے دوران سلطان کا بہنوئی محمد چلپی بھی گرفتار ہو چکا تھا۔ سلطا
ادرنہ کے محل میں لوٹ آیا تو اُس کی مغموم بہن روتی ہوئی اُس کے سامنے آئی اور اپ
بچوں کا واسطہ دے کر سلطان سے کہا کہ وہ جس طرح بھی ہو محمد چلپی کو دشمن کی قید
آزاد کروائے۔ ادھر سلطان کا بڑا بیٹا علاؤ الدین بستر علالت پر تھا جس کی وجہ سے سلطان
کے پیروں میں شفقت پدری کی زنجیر پڑ چکی تھی۔ اُسے محل میں لوٹنے سے پہلے بلکہ ادر
میں پہنچنے سے بھی پہلے ادرنہ کے تمام حالات معلوم ہو چکے تھے۔ وہ محل میں لوٹا تو اُ
شہزادہ علاؤالدین کی حالت دیکھ کر تمام مسائل بھول گئے۔ سلطان محسوس کر رہا تھا کہ ا
تعالیٰ نے اُسے بڑی بڑی آزمائشوں میں ڈال دیا ہے۔ اُس نے بیمار شہزادے سے قا
ابوجعفر کے بارے میں کوئی سوال نہ کیا۔ وہ ان مشکل حالات سے عہدہ برا ہونے کے
بالآخر راتوں کو جاگ جاگ کر رب العالمین کے حضور جھکنے لگا۔ صوم وصلوٰۃ کا تو وہ پہلے
سے پابند تھا لیکن اب تو اُس نے اپنا زیادہ تر وقت اللہ رب العزت کے حضور گڑگڑا
میں گزارنا شروع کر دیا۔

ایک حیرت کی بات یہ تھی کہ اُس نے ابھی تک ابوجعفر یا بہرام خان سے کچھ تعرض
کیا تھا۔ خود ابوجعفر کو سلطان کے اس رویئے پر حیرت تھی۔ حالانکہ شہزادہ علاؤالدین
طبیب سلیم پاشا نے اُسے بتا دیا تھا کہ سلطان سب کچھ جان چکا ہے۔ سلیم پاشا
حیرت تھی کہ سلطان کو محل میں آنے سے پہلے تمام باتوں کی خبر کیسے ہوگئی۔ اب ابو
پہلے سے بھی زیادہ محتاط تھا۔ وہ ایک انتہائی چالاک اور کایاں شخص تھا۔ اُس کی چھٹی حس
پہلے ہی بیدار رہتی تھی لیکن اب تو اُس کے رونگٹے اور کان بھی ہمہ وقت ایستادہ رہنے
تھے۔ اُسے ہر آن اپنی گرفتاری کا خطرہ تھا۔ قاسم کی گمشدگی اور سلطان کی پراسرار خا
کسی بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ تھی۔ اب ابوجعفر سوچنے لگا کہ وہ منصوبہ بندی جو
نے پہلے سے کر رکھی تھی اب شاید مکمل طور پر کارگر ثابت نہ ہو۔ اُس نے سوچا شاید
دیا کہ اُسے فوری طور پر اپنے منصوبہ پر عمل کر دینا چاہئے..... اُس کی سمجھ سے

ہوشی بالاتر تھی۔ قصرِ سلطانی میں موجود اُس کے کارندے اُسے پل پل کی خبر دیتے رہتے
ے جن میں سرفہرست سلیم پاشا تھا۔

ایک روز سلیم پاشا نے ابوجعفر کو بتایا کہ سلطان نے اپنے بہنوئی محمد چلپی کی رہائی کے
لیے میں صلیبی افواج کے سپہ سالار ہونیاڈے کے ساتھ خط و کتابت شروع کر دی ہے.....
یہ خبر ابوجعفر کے لئے غیر متوقع نہیں تھی۔ اُسے پہلے ہی اندازہ تھا کہ سلطان کی بہن سلطان
کو مجبور کر دے گی کہ وہ ہونیاڈے سے محمد چلپی کی رہائی کی بات چیت کرے۔ چنانچہ اُس
نے حیرت کا اظہار کئے بغیر کہا۔

"لیکن کیا سلطان نے ہونیاڈے سے انتقام لینے اور ہنگری پر لشکر کشی کا ارادہ ترک کر
دیا ہے؟"

ابوجعفر کی بات پر طبیب سلیم پاشا نے کہا۔ "نہیں۔ سلطان صلیبی لشکر کے خلاف ہمہ
وقت تیاریوں میں مصروف ہے۔ اپنے بہنوئی کی رہائی اُس نے صرف سفارتی سطح پر چاہی
ہے۔ آج کل سلطان چاروں طرف سے مصیبتوں میں گھر چکا ہے۔ اُس کا بیٹا علاؤالدین
اب بہت جلد اُس کی جانشینی کے قابل نہیں رہے گا۔ ان حالات میں اگر کسی طرح
ان کو ہلاک کر دیا جائے تو یوں سمجھئے! سلطنت عثمانیہ کا باب مکمل طور پر بند ہو جائے گا۔"

سلیم پاشا کی بات سننے کے دوران ابوجعفر مسلسل زہریلے انداز میں مسکراتا رہا۔ اور پھر
اُس نے کہا۔ "یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟ سلطان کا چھوٹا بیٹا شہزادہ محمد خان بھی تو عنقریب
جوان ہونے والا ہے۔"

"نہیں مقدس باپ! محمد خان ایک تو ابھی بہت چھوٹا ہے۔ سلطان کی ہلاکت کے بعد
وہ تخت حکومت نہ سنبھال سکے گا۔ اور دوسری بات یہ کہ وہ نا اہل اور کم عقل ہے۔ اصل
خطرہ تو ہمیں شہزادہ علاؤالدین سے تھا جو اب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ٹل چکا ہے۔"

ابوجعفر بہت مسرور تھا۔ سلیم پاشا کی باتوں سے اُسے یوں لگتا تھا جیسے ادرنہ کا کھیل
اب مکمل طور پر اُسی کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن اچانک اُسے سلطان کی پراسرار خاموشی یاد آئی اور
وہ الجھن ہوگیا۔ اُس نے سلیم پاشا سے کہا۔

"لقمان! میری چھٹی حس سلطان کی طرف سے مطمئن نہیں۔ مجھے ہر گھڑی یوں لگتا
ہے جیسے سلطان کے آدمیوں کی خفیہ نگاہیں میری نگرانی کر رہی ہیں۔ مجھے یوں بھی لگتا ہے
کہ ابن ہشام میرے آس پاس ہی کہیں موجود ہے..... آج میں نے تمہیں اس لئے
بلایا کہ تم سے مارسی کی صحت کے بارے میں دریافت کر سکوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب

مجھے ادرنہ میں مزید نہیں رُکنا چاہئے۔"

سلیم پاشا نے پورے غور سے ابوجعفر کی بات سنی اور یہ سوچ کر کہ ابوجعفر جانا چاہتا ہے اُسے گھبراہٹ ہونے لگی۔ وہ جانتا تھا کہ ابوجعفر کے چلے جانے کے بعد ادرنہ میں قیصر کے کام کی تمام تر ذمہ داری اُسی پر عائد ہو جائے گی۔ اُس نے متفکر لہجے میں ابوجعفر سے کہا۔

"مقدس باپ! مارسی اب بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ البتہ طویل سفر اور گھوڑے کی سواری سے ہوسکتا ہے اس کے زخم کھل جائیں۔ بہتر تو یہ ہوتا کہ آپ اُسے کسی آرام دہ سواری پر البانیہ کی جانب لے چلتے..... آپ تو چلے جائیں گے لیکن میں سوچتا ہوں کہ ادرنہ میں آگ کے شعلے بھڑکانے کا کام کس وقت شروع کیا جائے گا"

"لوگان! تم فکر مت کرو۔ ابوجعفر کچی گولیاں نہیں کھیلتا۔ میں نے تمام بندوبست کر لیا ہے۔ مجھے تو سلطان کے ردِعمل کا انتظار تھا۔ یاد رکھو! ادرنہ میں بغاوت پھیلانے کا مقصد یہ ہے کہ سلطان، مقدس صلیبی لشکروں کے خلاف کوچ کرنے کی ہمت ہی نہ کر سکے۔ اُسے اپنے دارالسلطنت میں اتنے مسائل پیش آ جائیں کہ وہ ہونیاڈے سے انتقام لینے کا خیال ہی ترک کر دے۔ اگر ہمیں یہ مقاصد شہر میں ہنگامہ اٹھائے بغیر پورے ہوتے نظر آتے ہیں تو ہمیں وقتی طور پر بغاوت پھیلانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کے برعکس اگر سلطان ہونیاڈے کو زہر دے کر ہلاک کرنے کی منصوبہ بندی پر غور کرو..... لیکن اگر سلطان ہونیاڈے کے خلاف اپنا ناقابل تسخیر لشکر لے کر روانہ ہونے کی کوشش کرے تو تمہاری ذمہ داری ہوگی کہ تم ینی چری میں موجود اپنے عیسائی بھائیوں کو بلوے اور فسادات کا آخری اشارہ دو گے۔ شہر میں جگہ جگہ آگ کے شعلے اُٹھ کھڑے ہوئے تو سلطان کا کوچ کرتا ہوا لشکر خود بخود رُک جائے گا۔"

سلیم پاشا حیرت زدہ آنکھوں کے ساتھ قیصر کے اس جاسوس کی باتیں سن رہا تھا۔ ابوجعفر کی منصوبہ بندی اور حکمت عملی کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ اب اُس کے سامنے صورتحال واضح تھی۔ ابوجعفر کے چلے جانے کے بعد اُسے سلطان کے ارادوں پر نظر رکھنی تھی۔ اگر سلطان صلیبی لشکروں کے خلاف کوچ سے باز رہتا تو ینی چری کی بغاوت کو طور پر روکنا سلیم پاشا کی ذمہ داری تھی۔ اور اگر سلطان کوچ کا ارادہ کرتا تو ادرنہ کو آگ اور خون ریزی کے حوالے کرنا بھی سلیم پاشا کا کام تھا۔ اُس کے سامنے سب سے اہم کام سلطان کے قتل کی منصوبہ بندی تھی۔

ابوجعفر اور سلیم پاشا دیر تک اپنے آئندہ لائحہ عمل کی منصوبہ بندی کرتے رہے۔

طے پایا کہ فی الفور ابوجعفر کا ادرنہ سے روانہ ہو جانا ہی سب سے بہتر ہے۔ کیونکہ قاسم کی آمد کی اور سلطان کی پراسرار خاموشی درحقیقت ابوجعفر کے خلاف خطرے کا اعلان تھی۔ چنانچہ ابوجعفر کے فرار سے لے کر سلطان کے قتل تک تمام معاملے طے کر چکنے کے بعد سلیم پاشا نے ابوجعفر سے اجازت لی اور اپنے گھر چل دیا۔

اگلے دن جمعۃ المبارک تھا۔ ابوجعفر، ادرنہ کا مشہور خطیب تھا اور وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ ادرنہ کے لوگ اُسے خطبہ جمعہ میں غیر حاضر پائیں۔ چنانچہ اُس نے خطبہ جمعہ کے بعد ہفتہ کی شب رات کی تاریکی میں مارسی کو لے کر البانیہ کی جانب روانہ ہونے کی حکمت عملی تیار کر لی۔ کسی بھی قسم کے ہنگامی حالات کے لئے متبادل لائحہ عمل میں بھی سوچا گیا۔ اور وہ یہ تھا کہ اگر ابوجعفر کو اس دوران اچانک گرفتار کر لیا جاتا ہے تو ینی چری میں موجود اُس کا جانثار دستہ اُسے پہلی منصوبہ بندی کے تحت بزورِ شمشیر فوری آزادی دلائے گا اور اُسے برق رفتاری سے شہر سے باہر ایک خفیہ مقام پر پہنچا دیا جائے گا جہاں اُس کے تجربہ کار ساتھی سواری کو لئے ہوئے موجود ہوں گے۔ اور اس طرح یہ لوگ بجلی کی تیزی کے ساتھ فرار ہو جائیں گے۔

شاید ابوجعفر کے نصیب میں متبادل لائحہ عمل کے ذریعے فرار ہونا ہی لکھا تھا۔ کیونکہ عین اُس وقت جب وہ سینکڑوں لوگوں کے سامنے خطبہ جمعہ ادا کر رہا تھا، ایک انتہائی عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔

ہوا یوں کہ خطبہ جمعہ جاری تھا۔ لوگ باادب ہو کر مسجد میں بیٹھے تھے کہ اتنے میں منبر کی طاقت کے قریب سے ایک لمبا تڑنگا شخص اٹھا جس نے اپنے چہرے کو اپنے عمامہ کے پلو سے چھپا رکھا تھا۔ ابوجعفر منبر پر بیٹھا خطبہ پڑھ رہا تھا کہ وہ شخص چلتا ہوا منبر کے پاس آ کر ٹھہر گیا۔ یکلخت پورے مجمع کی نظریں اُس لمبے تڑنگے شخص پر جا پڑیں۔ مسجد میں موجود ہزاروں افراد حیرت و استعجاب سے اس اجنبی کی جانب دیکھنے لگے۔ ابوجعفر نے اس شخص کو اپنے پاس آتے دیکھا تو اُس کا خون خشک ہو گیا۔ اُسے کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ پہلے پہل اُس کی زبان لڑکھڑانے لگی اور پھر وہ یکلخت خاموش ہو گیا اور کڑک آواز میں اجنبی سے پوچھا۔

"کون ہو تم؟ اور خطبہ جمعہ کے دوران اُٹھنے کی جرأت تم نے کیسے کی؟"

مجمع میں موجود ہر شخص کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اُس شخص نے ابوجعفر کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور اپنے چہرے کو پھیر کر عوام کی جانب کر لیا۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ

حاضرین محفل سے کچھ کہنے والا ہے۔ اور پھر چند لمحوں بعد اُس نے با آواز بلند کہا۔

"معزز حاضرین جمعہ!..... یہ شخص جسے آپ خطیب مغرب کے نام سے جانتے ہیں، جو آپ کے سامنے پچھلے بیس برس سے خطبہ جمعہ پڑھ رہا ہے..... مسلمان نہیں..... بلکہ راسخ العقیدہ عیسائی ہے۔ یہ اور نہ میں قیصرِ قسطنطنیہ کے جاسوسوں کا سرغنہ ہے۔

حاضرین کرام! محض آپ لوگوں کی وجہ سے اب تک سلطانِ معظم اس شخص کو گرفتار کرنے سے معذور رہے۔ سلطانِ معظم کو یہ خطرہ تھا کہ آپ لوگ ابوجعفر کی گرفتاری پر ہنگامہ برپا کر دیں گے۔ چنانچہ انہوں نے طویل انتظار اور منصوبہ بندی کے بعد یہ فرمان صادر کیا کہ ابوجعفر کو بھرے مجمع میں گرفتار کیا جائے۔"

ابوجعفر کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ وہ شخص جو اپنے جذبات پر کسی گرگٹ کی طرح قابو پا لیا کرتا تھا آج اُس کی تمام مہارت اور تجربہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔ سخت سردی کا موسم تھا لیکن اُس کا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔ اُس کا چہرہ دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے کسی نے اُس کی کلائی کاٹ کر اُس کا سارا خون نکال لیا ہو۔

اب اُسے سلطان کی پراسرار خاموشی اور قاسم کی گمشدگی کی صحیح وجہ سمجھ آئی۔ تو سلطان نے یہ چال کھیلی تھی۔ ابوجعفر کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ اُسے گرفتار کرنے کے لئے خطبہ جمعہ کا انتخاب کیا جائے گا۔ یہاں تو نہ اُسے کوئی بچانے والا تھا اور نہ ہی اُس کی کوئی محافظ دستہ۔ مجمع میں صرف ایک شخص ایسا موجود تھا جو ابوجعفر کی خفیہ تنظیم کا رکن تھا۔ اُس شخص نے ابوجعفر کو یوں سرِ بزم بری طرح پھنستے دیکھا تو ہمت کر کے اُٹھا اور منبر کے قریب لمبے تڑنگے شخص سے کہنے لگا۔

"تم جھوٹ بکتے ہو۔ خطیب مسجد پر اس قدر سنگین الزام لگا کر تم نے اپنی موت کو آواز دی ہے۔ یہ مجمع تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اگر تمہاری بات میں سچائی ہے تو تم نے اپنا چہرے کو کیوں چھپا رکھا ہے؟..... تم کسی کو کوئی ثبوت نہیں دکھا سکتے۔ ہم خطیب مغرب کے مرید اور مقتدی ہیں۔ تمہاری اس گستاخی پر تمہیں معاف نہیں کر سکتے۔"

وہ شخص انتہائی جذباتی انداز میں بات کر رہا تھا۔ ابوجعفر نے اپنے کارندے کو پاس کھڑے ہوتے دیکھا تو اُس کی ڈھارس بندھی۔ اب وہ کسی قدر سنبھل چکا تھا۔ اُس کے دماغ نے فوراً کام کیا اور اُس نے گرجدار آواز کے ساتھ مجمع سے مخاطب ہو کر کہا۔

"پکڑ لو اس ناہنجار کو! جس نے اسلام کے ایک پرانے خادم کو بھرے مجمع میں یہ کہہ کر اسلام اور سلطنت عثمانیہ کی توہین کی ہے۔"

لوگ پہلے ہی سنسنی کی شدت سے چہ مے گوئیوں اور کھسر پھسر میں مصروف تھے۔ بعض من چلے اور جوشیلے نوجوان اپنی جگہ پر بار بار پہلو بدل رہے تھے۔ جونہی خطیب مغرب نے حکم دیا، وہ جوشیلے نوجوان اٹھے اور منبر کے پاس کھڑے نقاب پوش کو پکڑنا چاہا۔ ابھی وہ ایک قدم بھی نہ بڑھا پائے تھے کہ پوری مسجد ایک گونجدار آواز سے گونج اُٹھی..... یہ گرجدار آواز کس کی تھی..... یہ گرجدار آواز سلطان مراد خان ثانی کے محافظ دستے کے سپہ سالار "طغرل بیگ" کی تھی۔ طغرل بیگ نے شیر کی طرح دھاڑتے ہوئے کہا۔

"خبردار! کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے۔"

طغرل بیگ کے ہاتھ میں ننگی تلوار لہرا رہی تھی اور اُس کی پشت پر شاہی محافظ دستے کے تین سپاہی برہنہ شمشیریں لئے کھڑے تھے۔ مجمع میں جو کوئی جہاں کہیں تھا، بیٹھ گیا۔ اب منبر کے پاس کھڑے نقاب پوش کو کوئی خطرہ نہ تھا۔ چنانچہ اُس نے اپنے چہرے سے نقاب کا پلو ہٹا لیا۔

یہ قاسم بن ہشام تھا۔ جو آج سے کئی روز قبل مارسی کی بازیابی کے لئے البانیہ کے راستے پر روانہ ہوا تھا۔ اُس نے انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ ایک دن اور ایک رات اپنا سفر جاری رکھا۔ لیکن اُسے پورے راستے میں اس قسم کے کوئی آثار دکھائی نہ دیئے کہ مارسی کے اغواء کنندگان اس راستے پر آئے ہوں۔ اُس نے جگہ جگہ مختلف لوگوں اور دہقانوں سے بھی دریافت کیا لیکن اُسے کوئی سراغ نہ ملا۔ اب اُسے اندازہ ہو چکا تھا کہ مارسی کو ابھی تک ادرنہ سے کہیں اور منتقل نہیں کیا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ ادرنہ سے صرف دو ہی راستے نکلتے تھے۔ ایک وہ جو ایشیائے کوچک کی طرف جاتا ہے۔ اور دوسرا وہ جو یورپ کی طرف۔

ایشیائے کوچک کی جانب مارسی کے لے جائے جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ چنانچہ اُس نے ایشیائے کوچک کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف یورپ کی جانب سفر جاری رکھا۔ اور جب اُسے یقین ہو گیا کہ مارسی کو ابھی تک ادرنہ سے نکالا ہی نہیں گیا تو اُس نے ادرنہ لوٹنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن وہ یہ سوچ کر مایوس ہوا کہ اب ادرنہ میں اُس کی واپسی کے تمام دروازے بند کر دیئے گئے تھے۔ شہزادہ علاؤالدین غلط فہمی میں مبتلا ہو چکا تھا جبکہ شہزادہ خلیل خان اور اُس کے گماشتے شکاری کتوں کی طرح جگہ جگہ قاسم کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ چنانچہ اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ ادرنہ میں داخل نہیں ہو گا بلکہ شہر سے پانچ کوس دُور ہی راستہ بدل کر سلطانی لشکر کی جانب چل پڑے گا۔ وہ چاہتا تھا کہ سلطان کو تمام حالات سے آگاہ کر کے نئے سرے سے منصوبہ بندی کرے۔ لہٰذا یہی ہوا۔ وہ اپنے سفر کے

گیارہویں روز سلطان مراد خان ثانی کے سامنے تھا۔

سلطان اُسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ لیکن جب قاسم بن ہشام نے سلطان کو ادرنہ میں ہونے والے واقعات کی تفصیلات بتائیں تو سلطان ہکا بکا رہ گیا اور اُس نے کوئی پائیدار حکمت عملی سوچنے کی غرض سے قاسم کو اپنے ہمراہ لشکر میں روک لیا۔ اُس نے اپنے شاہی دستے کے با اعتماد سالار طغرل بیگ کو بھی طلب کیا اور ادرنہ میں سازشیوں کا قلع قمع کرنے کے لئے نئے سرے سے منصوبہ بندی کی۔ چنانچہ قاسم بہترین سپاہیوں کا ایک دستہ لے کر ادرنہ میں خفیہ طریقے سے داخل ہوا اور بھیس بدل کر ابوجعفر کی سازش کے تانے بانے تلاش کرنے شروع کر دیئے۔ لیکن اُس نے ابھی تک کسی پر ہاتھ نہ ڈالا تھا۔ اسی اثنا میں سلطان ادرنہ لوٹ آیا۔ قاسم خفیہ طریقے سے سلطان کے ساتھ ملتا رہا اور باہمی مشاورت سے یہ طے ہوا کہ ابوجعفر کی سازش میں شامل افراد کو گرفتار کرنے سے پہلے ابوجعفر پر ہاتھ ڈالا جائے۔ چنانچہ آج قاسم جمعۃ المبارک کے بھرے مجمع میں ابوجعفر پر ہاتھ ڈالنے کے لئے آ پہنچا۔

اب ابوجعفر کے لئے بھاگنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ ابوجعفر کو بھرے مجمع میں گرفتار کرنے کی وجہ یہی تھی کہ عامۃ الناس کو اُس کا اصل چہرہ دکھا کر اُسے گرفتار کیا جا سکے۔ تاکہ بعد میں کسی قسم کے ہنگامے یا فسادات کا خطرہ باقی نہ رہے۔

ابوجعفر کی حالت غیر تھی۔ اُس نے جونہی قاسم کو دیکھا، اُس کی سٹی گم ہو گئی۔ اب اُس وقت کوسنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا جب اُس نے خطرات پیدا ہو جانے کے باوجود ادرنہ میں رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ سلطان اور قاسم اُس کی توقع سے زیادہ ہوشیار اور ذہین ثابت ہوئے تھے۔ قاسم نے چہرے سے نقاب ہٹایا تو مجمع میں سے بہت سے لوگوں نے اُسے پہچان لیا۔ چنانچہ ایک مرتبہ پھر مجمع پر سناٹا طاری ہو گیا۔ لوگ قاسم کو ایک اچھے اور بہادر انسان کی حیثیت سے جانتے تھے۔ قاسم نے لوگوں کو پُرسکون ہوتے دیکھا تو پھر کہنے لگا۔

”حاضرین کرام! مجھے تو یہ بھی شک ہے کہ آپ کا خطیب مغرب ابوجعفر نسلاً بھی عرب نہیں بلکہ لاطینی ہے..... لیکن میرے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہیں۔ البتہ آپ نے یہ بات یاد رکھا ہو گا کہ ینی چری کے نومسلم سپاہیوں میں کسی نے بغاوت کا بیج بو دیا ہے۔ تو جان لیجئے! کہ یہی ہے وہ شخص۔

آپ نے یہ بھی سن رکھا ہو گا کہ قصرِ سلطانی کے پاس ہی ایک البانوی مہمان کنیز اور اُس کی بیٹی کو اغواء کر لیا گیا ہے۔ تو جان لیجئے! کہ یہی ہے وہ شخص جس نے یہ

کام کیا۔

معزز حضرات گرامی! آپ جانتے ہیں کہ شہاب الدین پاشا کی سرکردگی میں جانے والی ہماری فوجوں کو شکست ہو چکی ہے۔ ہمارے بہترین سپاہی شہید کر دیئے گئے ہیں۔ جبکہ سلطانِ معظم کے بہنوئی محمد چلپی اور چار ہزار ترک سپاہی قید کر لئے گئے ہیں۔ ہمیں اپنی اس شکست کا انتقام لینا ہے..... اور ینی چری ہی ہماری قوت ہے۔ جبکہ ابوجعفر وہ شخص ہے جس نے ینی چری کے بعض سالاروں کو، بہت سے نومسلم سپاہیوں کو ان کے سابقہ مذہب عیسائیت کی طرف گہری سازش کر کے لوٹا دیا ہے۔ اِدھر ادرنہ شہر میں بغاوت کا خطرہ بھی بڑھ چکا ہے۔ چنانچہ سلطانِ معظم کے خصوصی حکم سے آج اس بھرے مجمع میں ابوجعفر غدار کو گرفتار کیا جاتا ہے۔“

قاسم کے آخری جملے ادا ہونے کی دیر تھی کہ مجمع نے چیخ چیخ کر ابوجعفر پر لعنت بھیجنی شروع کر دی۔ اگر شاہی دستے کی ننگی تلواروں کا خوف نہ ہوتا تو بعض جوشیلے نوجوان ابوجعفر کو مارنے کے لئے بھی دوڑ پڑتے۔ اب ابوجعفر کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ چند لمحوں اندر شاہی دستے کے مسلح سپاہیوں نے ابوجعفر کو اپنی حراست میں لے لیا۔

یہ مسجد تھی۔ یہاں ابوجعفر کا حفاظتی دستہ کہیں بھی موجود نہ تھا۔ چنانچہ اُس کی حکمت عملی اُس کے کام نہ آئی اور شاہی دستے کے سپاہیوں نے اُس کے ہاتھ پیر باندھ کر اُسے گاڑی رتھ میں ڈال دیا۔ قاسم بن ہشام، طغرل بیگ اور شاہی دستے کے باقی سپاہی رتھ کے دائیں بائیں گھوڑوں پر سوار قلعہ ادرنہ کی زندان کی جانب چل دیئے۔

ابوجعفر کا نظامِ جاسوسی دھرے کا دھرا رہ گیا۔ اور اُس کو چھڑوانے والے دستے کو جس وقت ابوجعفر کی گرفتاری کی خبر ملی اُس وقت ابوجعفر شاہی قلعے کے تہہ خانے میں ہاتھوں اور پاؤں سے بندھا بے بس پڑا تھا۔ قاسم نے پوچھ گچھ کی غرض سے ابھی تک ابوجعفر کے ہاتھ پیر بندھے رہنے دیئے۔ باقی سپاہی جا چکے تھے۔ یہاں صرف قلعے کے چند محافظ اور تہہ خانے میں قاسم اور طغرل بیگ موجود تھے۔ قاسم نے اپنی پوچھ گچھ کا آغاز کیا تو ابوجعفر نے دیر اپنی زبان بند نہ رکھ سکا۔ اُس نے اذیت کے دوسرے مرحلے میں ہی اپنی سازش کا تقریباً تمام تانے بانے اُگل دیئے۔ لیکن پھر بھی وہ ابوجعفر تھا۔ ایک تجربہ کار اور کایاں شخص۔ اُس نے نہ تو اس دستے کے بارے میں قاسم کو کچھ بتایا جو ابوجعفر کی مدد کے لئے تیار رہتا تھا اور نہ ہی طبیب سلیم پاشا کا کچھ ذکر کیا۔

اب قاسم کے لئے پوچھ گچھ کے سلسلے میں سب سے اہم سوال کی باری تھی۔ اُس نے

ابوجعفر کے بازوؤں کو پیچھے کی طرف کر کے باندھ رکھا تھا اور اُس کی دونوں کہنیوں پر
لکڑی کا ڈنڈا ڈال کر ڈنڈے کے دونوں سروں کو رسّی کے ذریعے تہہ خانے کی چھت
ساتھ لٹکا دیا تھا۔ ابوجعفر کے پیروں تلے ایک عجیب وغریب میز رکھا تھا جس کے تختے
ہینڈل کے ذریعے اوپر اور نیچے ہونے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ قاسم چکر دار ہینڈل
گھماتے ہوئے میز کے تختے نیچے کرتا تو ابوجعفر اپنی بغلوں کے بل پر فضا میں معلق
جاتا۔ ابوجعفر کے پیروں میں موجود رسّی میز کے تختوں کے ساتھ منسلک تھی۔ تختے جب
نیچے کی طرف سفر کرتے، اُس کے پیروں کے ساتھ بندھی رسّی بھی اُسے نیچے کھینچتی اور
وہ چھت اور فرش کے درمیان تن جاتا۔ قاسم کا ہاتھ پہیہ نما ہینڈل پر تھا۔ وہ جونہی تختے
کرنے کے لئے ذرا سا ہینڈل گھماتا تو ابوجعفر کی فلک شگاف چیخیں نکلنے لگتیں۔

قاسم نے ابوجعفر کے سامنے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور اُس سے کہا۔

"ابوجعفر! ایک ہی بار بتا دو کہ مارتھا بیگم کی بیٹی ماری کہاں ہے؟"

یہ سوال اگر قاسم کے لئے اہم تھا تو ابوجعفر کے لئے بھی کم اہم نہیں تھا۔ وہ اگر
کے بارے میں بتا دیتا تو طبیب سلیم پاشا کا راز کھل جاتا اور اُس کا راز کھلتے ہی
علاؤالدین کے بچ نکلنے کی اُمید پیدا ہو جاتی۔ ابوجعفر نے پوری قوت سے دانت بھینچ
اور کوئی جواب نہ دیا۔ قاسم نے ہینڈل کو پورے زور کے ساتھ گھما دیا۔ ابوجعفر کو ایسے لگا
اُس کا جسم ٹوٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ اُس نے چیخ چیخ کر کہنا شروع کیا۔

"ماری یہاں نہیں ہے..... ماری یہاں نہیں ہے..... ماری یہاں نہیں ہے.....
مجھے چھوڑ دو۔"

ابوجعفر شدید تکلیف میں مبتلا تھا۔ قاسم نے ہینڈل واپس گھمائے بغیر پوچھا۔

"یہاں نہیں ہے تو کہاں ہے؟"

"وہ..... وہ..... اونہہ..... البانیہ جا چکی ہے۔"

قاسم کے لئے یہ خبر ناقابل یقین تھی۔ وہ خود البانیہ کے راستے پر سفر کر چکا تھا۔
اُس نے انتہائی کرخت لہجے میں ابوجعفر سے کہا۔

"تم جھوٹ بکتے ہو..... ماری یہیں ہے، اور نہ میں۔ میں نے البانیہ کا سارا
چھان مارا ہے۔ کیا وہ ہوا میں اُڑ کر البانیہ گئی ہے؟"

"نن..... نہیں..... اونہہ..... مم..... مجھے چھوڑ دو۔ اُسے پہلے ایشیائے کوچک
راستے پر سوکوس روانہ کیا گیا۔ پھر وہ سمندری راستے سے دردانیال کو عبور کرتی ہوئی

پہنچی۔"

قاسم کے لئے یہ خبر رُوح فرسا تھی۔ اُس کا منہ لٹک گیا۔ اُسے یقین ہونے لگا کہ
ابوجعفر اُس سے زیادہ شاطر ہے۔ ابوجعفر نے ماری کو روانہ کرنے کے لئے کیسی چال کھیلی
تھی۔ اب تو بظاہر قاسم اُس کی گرد کو بھی نہ پا سکتا تھا۔ قاسم، ابوجعفر سے اپنی محبت اور
ہونے والی بیوی کو تو حاصل نہ کر سکا۔ لیکن اس کے باوجود بھی قاسم سمجھ رہا تھا کہ ابوجعفر
نے اُس کی توقع سے بڑھ کر معلومات اُگل دی ہیں۔ چنانچہ وہ شام تک ابوجعفر کے سر پر
سوار رہنے کے بعد بعد از نمازِ مغرب پوری طرح مطمئن ہو کر اور ابوجعفر سے اُگلوائی گئی
معلومات کو کئی کاغذوں پر تفصیل کے ساتھ لکھنے کے بعد قلعہ ادرنہ سے واپسی پر آمادہ ہوا۔
اُس نے ابوجعفر کے ہاتھ پاؤں کھلوا دیئے اور اُسے تہہ خانے میں قید کرنے کے بعد قلعے
کی بیرونی عمارت سے نکل آیا۔ یہاں آ کر اُس نے قلعہ دار سے پوچھا۔

"اس قلعے کی حفاظت پر کتنے آدمی مامور ہیں؟"

"مجھ سمیت دس۔"

قاسم نے اطمینان سے سر ہلایا۔ اُسے قطعاً توقع نہ تھی کہ اس چھوٹے سے قلعے پر
ابوجعفر کو چھڑوانے کے لئے کوئی حملہ آور ہو سکتا ہے۔ یہ درحقیقت ایک بہت چھوٹا سا جنگی
قلعہ تھا جو شہر کی فصیل میں شمال مغربی کونے پر واقع تھا۔ یہ صرف ان دنوں میں استعمال
میں آتا جب کبھی وہ شہر محاصرے کی زد میں آ جاتا۔ اس قلعے کے دو ہی برج تھے اور دونوں
شہر پناہ سے خاصے بلند ہونے کی وجہ سے شہر سے باہر دُور تک نگرانی کرنے اور حملہ
کرنے کے کام آتے تھے۔

قاسم نے قلعہ دار کو ابوجعفر کے طعام و لباس کے بارے میں ہدایات جاری کیں اور
یہ کہہ کر کہ یہاں ابوجعفر کی اسیری انتہائی خفیہ راز ہے..... وہاں سے نکل آیا۔ طغرل
اُس کے ہمراہ تھا۔ آج قاسم نے ایک بہت بڑی مہم سر کی تھی۔ کیونکہ اُس نے اپنے
سے بڑے شکار ابوجعفر کی گردن دبوچ لی تھی اور اُس سے اُس کی پوری سازش کا تمام
بھید اُگلوا لیا تھا۔ اب ادرنہ کو داخلی طور پر کوئی خطرہ درپیش نہ تھا۔ قاسم نے سلطان کو
شہر سے اُگلوائی گئی معلومات پر مشتمل دستاویزات دکھائیں اور سلطان سے ان تمام
کی گرفتاری کا حکم حاصل کر لیا جو اس سازش میں ملوث تھے۔ ان میں بعض بڑے
افراد بھی تھے، ینی چری کے بعض سالار اور سپاہی بھی تھے اور شہر میں مختلف حلیوں میں
اپنے قیصر کے دو چار اہم جاسوس بھی تھے۔ ان میں اگر نہیں تھا تو سلیم پاشا کا نام

نہیں تھا۔ اور اگر نہیں تھا تو ابوجعفر کے اُس خصوصی دستے کا ذکر نہیں تھا جو آج رات ابوجعفر کو شمالی قلعہ کی قید سے چھڑانے والا تھا۔

سلطان نے ان تمام افراد کو ایک ہی رات میں گرفتار کرنے کے لئے شاہی دستے سپہ سالار طغرل بیگ کو مقرر کیا۔ شاہی دستے کو کئی حصوں میں تقسیم کیا گیا اور مختلف مقامات پر چھاپے مارنے کے لئے دس دس اور پندرہ پندرہ سپاہیوں پر مشتمل مختلف ٹولیاں تجویز کی گئیں۔

آج دن بھر ادرنہ میں ابوجعفر کی گرفتاری سے متعلق چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ ایک جگہ بعض شر پسندوں نے جو یقیناً ابوجعفر کے ساتھی رہے ہوں گے، بلوے بھی کئے لیکن آج دن بھر سلطان کی وفادار فوج نئی چری کا ایک بڑا حصہ شہر کی ہر سڑک اور ہر میں گشت کرتا رہا تھا۔ آج صبح سے ہی شہر کی ناکہ بندی کر دی گئی تھی اور فصیل میں ہر دروازہ مکمل طور پر بند کر دیا گیا تھا تاکہ ابوجعفر کا کوئی ساتھی اُس کی ممکنہ گرفتاری کے فرار نہ ہونے پائے۔ آج کا دن ادرنہ کی تاریخ میں اہمیت کا حامل تھا۔ اور سلطان خود راست تمام حالات کی کمان کر رہا تھا۔

لیکن قاسم یہ سب کچھ کرنے کے باجود بھی اُداس تھا۔ اُسے توقع تھی کہ وہ ابوجعفر پوچھ گچھ کرنے کے بعد ماری کو بھی برآمد کر لے گا۔ لیکن اُس کی توقع پوری نہ ہو سکی۔ ماری کو جس قدر نزدیک محسوس کر رہا تھا، ماری اُس سے اتنی ہی دُور ہوتی جا رہی تھی۔

سلطان نے ابوجعفر کی گرفتاری سے پہلے ادرنہ میں باقاعدہ منادی بھی کرائی تھی۔

''بعض شر پسندوں کو جو ادرنہ میں چھپ چکے ہیں، گرفتار کرنے کے لئے شہر بھر ہنگامی حالات نافذ ہونے کا اعلان کیا جاتا ہے۔ کسی بھی شخص کو دو روز تک ادرنہ سے جانے کی اجازت نہیں۔ کوئی بھی شخص کسی اجنبی کو مہمان نہ بنائے اور نہ ہی پناہ دے میں موجود تمام غیر ملکیوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ کوتوالِ شہر کے پاس اپنی موجودگی ظاہر کے لئے حاضری لگوائیں۔''

اس قدر اہتمام کے بعد ابوجعفر اور قیصر کے دیگر جاسوسوں پر ہاتھ ڈالنے کا آغاز کر دیا گیا۔

قاسم دن بھر بے حد مصروف رہا۔ شہر کے مختلف علاقوں میں یکے بعد دیگرے چھاپے مارے گئے۔ بہت سے اہم مقامات پر قاسم نے خود چھاپے مارے۔ رات گئے تک ترسازشی کرداروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ کچھ اہم مجرم شہر کے اندر ہی روپوش ہو گئے

سراغ لگانے کے لئے بہرام خان کا خفیہ محکمہ، کوتوالِ شہر کے سپاہی، نئی چری کے وفادار دستے اور شاہی دستے کے سپاہی ابھی تک ان تھک محنت کر رہے تھے۔

قاسم رات گئے اُس وقت گھر لوٹا جب وہ تھک کر چور ہو چکا تھا۔ لیکن اب بھی نیند اُس کی آنکھوں سے دُور تھی۔ وہ بستر پر دراز ہو کر چھت کو گھورنے لگا۔ اُس کا دماغ تو نہیں تھا لیکن اُس کا دل البانیہ میں تھا۔ بہت دیر تک وہ جاگتا رہا۔ لیکن پھر نہ جانے کس وقت اُس کی آنکھ لگ گئی۔

اگلی صبح قاسم کی آنکھ کھلی تو اُس کے لئے سب سے پہلی خبر انتہائی سنسنی خیز اور پریشان کن تھی۔ اُسے صبح ہی صبح اُس کے ایک اپنے آدمی نے اطلاع پہنچائی کہ..... گزشتہ شب شمالی قلعے پر کسی گروہ نے شب خون مارا ہے اور حملہ آور قیصر کے خطرناک جاسوس، ابوجعفر کو چھڑا کر لے گئے ہیں۔ واقعے کی تفصیل کچھ یوں تھی۔

نصف شب کے بعد شمالی قلعے پر کسی مسلح دستے نے اندھا دھند یلغار کر کے قلعہ دار اور اس کے تمام سپاہیوں کو تہہ تیغ کر دیا اور تہہ خانے میں موجود ابوجعفر کو چھڑا کر لے گئے۔ ابتدائی تفتیش سے معلوم ہوا کہ حملہ آوروں کے کئی ساتھی بھی اس حملے میں مارے گئے۔ لیکن حملہ آور جاتے وقت اپنے ساتھیوں کی لاشوں کو ساتھ لے گئے۔

یہ خبر قاسم کو لرزا دینے کے لئے کافی تھی۔ اُس نے کل سے اب تک سو سے زیادہ غدار اور باغی گرفتار کر لئے تھے لیکن اصل مجرم اُس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ اُسے حیرت تھی کہ ابوجعفر کو شمالی قلعے میں منتقل کرتے وقت بہت احتیاط کی گئی تھی اور بہت خاص خاص لوگوں کو علم تھا۔ یہ بات کہ..... ''ابوجعفر کو شمالی قلعے میں رکھا جائے گا''..... انتہائی خفیہ طریقے سے پہلے ہی طے کر لی گئی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یقیناً ابھی تک ابوجعفر کا کوئی خاص مُہرہ پکڑے جانے سے رہ گیا تھا جس نے نہ صرف شمالی قلعے کا پتہ چلا لیا تھا بلکہ پہلی رات ہی ابوجعفر کو چھڑا کر لے گیا تھا۔

اُدھر..... ابوجعفر اس وقت ماری اور اپنے چھ ساتھیوں کے ہمراہ ایک پہاڑی درّے سے گزر رہا تھا۔ اُس کی منزل تھی البانیہ کا محل۔ ماری ایک رتھ میں سوار تھی جس میں تین گھوڑے جتے ہوئے تھے۔ روانگی سے قبل طبیب سلیم پاشا نے ماری کو نیند کی دوا پلا دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ماری ابھی تک سو رہی تھی۔ شہر میں ناکہ بندی کے باوجود وہ کامیابی کے ساتھ اس لئے نکل آئے تھے کہ ابوجعفر کو چھڑانے والے حملہ آور ابوجعفر کے ہمراہ فصیل پھاند کر دوسری جانب اُترے تھے اور ماری کو سلیم پاشا نے اپنا اثر و رسوخ استعمال

کرتے ہوئے شہر سے باہر لالہ شاہین کی یادگار تک پہنچایا۔ ماری کو سرِ شام ہی شہر سے نکال
لیا گیا تھا۔ قاسم بن ہشام نے ابوجعفر کی بیس سالہ محنت کو ایک ہی دن میں سبوتاژ کر د
تھا۔ اُس نے بغاوت کے سارے بخیے اُدھیڑ کر رکھ دیئے تھے۔ ابوجعفر کو اس بات کا بے حد
قلق تھا۔ لیکن وہ یہ سوچ سوچ کر اپنے غصے کو ٹھنڈا کر رہا تھا کہ اُس نے قاسم کی محبت تو
ماری کو اُس سے چھین لیا تھا۔

اُسی دن سلطان کے قاصد شاہِ ہنگری لارڈ سلاس کا پیغام لے کر پہنچے۔ شاہِ ہنگری نے
مطالبہ کیا کہ سلطان مراد خان ثانی اپنے بہنوئی محمد چلپی کی رہائی کے عوض سربیا کی آزادی
تسلیم کرے اور اس ملک سے اپنے حقوقِ شہنشاہی اُٹھا لے۔ ''والیشیا'' کا صوبہ ہنگری کو
دے دیا جائے اور سلطان زرِ فدیہ میں ساٹھ ہزار ڈاکٹ ادا کرے۔

سلطان کے لئے یہ بہت مشکل شرائط تھیں۔ اس کا مطلب تو یہ تھا کہ سلطان اپنے ایک
شخص کے بدلہ شاہِ ہنگری کو اپنی آدھی یورپی سلطنت دے دے۔ سلطان نے لارڈ سلاس
کے جواب کا بہت برا منایا۔ اور اُسے یہ دھمکی دینا چاہی کہ وہ بزورِ شمشیر اپنے قیدی کو آزاد
کرائے گا۔ لیکن اس مرتبہ بھی سلطان کی بہن اور بھانجے آڑے آئے اور سلطان کو مجبور
کہ وہ شاہِ ہنگری کے مطالبات کا اس قدر سخت جواب نہ دیں۔ چنانچہ سلطان نے
ہنگری کو لکھا کہ وہ اپنی شرائط کو کچھ نرم کرے۔ کیونکہ کسی قیدی کو اس قدر مہنگا فروخت
بادشاہوں کو زیب نہیں دیتا۔

چند دن بعد ماری البانیہ پہنچ چکی تھی۔ قاسم ابھی تک ادرنہ میں ہی تھا۔ وہ شب و
اسی تگ و دو میں تھا کہ کسی طرح اُسے چند دن کی اجازت ملے اور وہ سکندر بیگ کے مح
حملہ آور ہونے کے لئے البانیہ روانہ ہو سکے۔ اس دوران سلطان نے ابوجعفر کی سازش
ملوث لوگوں کو قرار واقعی سزا دی۔ سنگین مجرموں کو جلاد کے حوالے کر دیا اور معمولی مجرموں
زندان میں ڈال دیا۔

سلطان کی خط و کتابت شاہِ ہنگری کے ساتھ چل پڑی۔ یہ سلسلہ اس قدر طویل ہوا
بالآخر صلیبیوں اور مسلمانوں کے مابین ایک تاریخی صلح پر منتج ہوا۔ سلطان کو اُس کی بہن
دوسرے عزیزوں نے ہونیاڈے سے انتقام لینے کی بجائے صلح پر مجبور کر دیا۔ خط و کتابت
نے ایسی صورت اختیار کی کہ سلطان مراد خان اور شاہ ہنگری کو ایک معاہدے پر دستخط
کرنے کے لئے ''زجیڈین'' کے مقام پر اکٹھا ہونا پڑا۔ پاپائے روم کا خاص نمائندہ
''کارڈنیل جولین'' مسلمانوں کے ساتھ صلح کا سخت مخالف تھا۔ اُس نے ہونیاڈے اور

سلاس کو سلطان کے ساتھ صلح سے باز رکھنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ لیکن اس
رتبہ لارڈ سلاس اور سلطان کے درمیان صلح ہونی تھی۔ چنانچہ 26 ربیع الاول 848ھ
طابق 12 جولائی 1444ء کے روز دونوں فرمانرواؤں نے زجیڈین کے مقام پر ایک صلح
ے پر دستخط کئے۔ جس کی رو سے سربیا کو سلطنت عثمانیہ سے آزاد کر دیا گیا۔ ''والیشیا'' کا
وبہ شاہِ ہنگری کی سلطنت میں چلا گیا۔ اور سلطان نے عثمانی جنرل محمد چلپی کو آزاد کروانے
ے لئے ساٹھ ہزار ڈاکٹ فدیہ میں دیئے۔ یہ معاہدہ ہنگری اور ترکی دونوں زبانوں میں
لھا گیا اور دونوں بادشاہوں نے اس پر دستخط کرنے کے بعد قسمیں کھائیں کہ اس عہد نامہ
ی پابندی کو مذہبی احکام کی طرح ضروری سمجھیں گے۔ اس عہد نامہ کی رو سے ''دریائے
یوب'' کو سلطان کی عمل داری کی حد قرار دیا گیا۔ یہ معاہدہ دس برس کے لئے تھا۔ اور
ں دس برس کے لئے مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان صلح قرار پا گئی۔ لارڈ سلاس نے
ل پر قسم کھائی اور سلطان مراد نے قرآن کو ہاتھ میں لے کر حلف دیا۔

اب سلطان مطمئن تھا۔ محمد چلپی رہا ہو کر ادرنہ واپس آ چکا تھا۔ ایشیائے کوچک میں
ن پہلے ہی قائم ہو چکا تھا۔ اس صلح نامہ سے یورپ کی جنگ کا بھی بظاہر خاتمہ ہو گیا اور
راخان ثانی کو پہلی بار سکون کا سانس نصیب ہوا۔ بیس بائیس سال کی مسلسل لڑائیوں نے
ں کو امورِ سلطنت سے دلبرداشتہ کر دیا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ بقیہ زندگی آرام اور سکون کے
اھ یادِ الٰہی میں گزارے۔ چنانچہ صلح نامہ سے فارغ ہونے کے بعد وہ تبدیلی آب و ہوا
ں سے ایشیائے کوچک کے بعض پُر فضا مقامات کی جانب چلا گیا۔

ہزادہ علاؤالدین جو گزشتہ دنوں بتدریج بیمار ہوتا چلا جا رہا تھا، سلطان کی واپسی کے
طان کے شاہی طبیبوں کی خصوصی توجہ سے چند دن قبل صحت یاب ہونے لگا تھا۔ وہ
الت سے اُٹھ کر چل پھر لیتا تھا۔ حتیٰ کہ محل کے اندر ہی گھڑ سواری اور بعض دوسرے
امیں بھی شریک ہونے لگا تھا۔ لیکن ایک روز اچانک شہزادہ بہت زیادہ بیمار ہو گیا
ر گھنٹے شدید علیل رہنے کے بعد انتہائی غیر متوقع طور پر اس دارِ فانی سے کوچ کر گیا۔
ہزادہ علاؤالدین سلطان کو بہت عزیز تھا۔ جونہی شہزادے کی وفات کی خبر سلطان کو
سلطان کو بہت زیادہ صدمہ پہنچا۔ اُس نے سوچا تک نہیں تھا کہ بیمار شہزادہ یوں اُس
ہوا ہو جائے گا۔ جوان بیٹے کی ناگہانی موت سلطان کے جگر پر ایسا چرکہ لگا گئی کہ اُس
لئے سنبھلنا مشکل ہو گیا۔ وہ بیٹے کی تدفین کے لئے انتہائی سرعت کے ساتھ ادرنہ آیا۔
ی آخری رسومات ادا کرتے وقت یوں لگتا تھا جیسے سلطان یکلخت بوڑھا ہو گیا ہو۔

اُس کے چہرے پر کچھ ایسے تاثرات تھے جیسے اُس ملاح کے چہرے پر ثبت ہوتے ہیں
اپنا سفینہ غرق ہوتے دیکھتا ہے لیکن خود بچ جاتا ہے۔ شہزادہ، سلطان کا لاڈلا ہی نہ
سلطنت کا ولی عہد بھی تھا۔ اُس کی موت نے سلطان کو اُدھیڑ کر رکھ دیا۔ اب سلطان کو ا
سلطنت، حکمرانی، لشکر کشی اور دربارِ حکومت سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ چنانچہ سلطان
علاؤالدین کی وفات کے تیسرے روز سلطنت سے مستقل طور پر کنارہ کش ہو جانے کا
کیا۔ اگرچہ سلطان کے اس فیصلے سے مخلص عمائدین سلطنت اور وفادار سپہ سالاروں کو
حد رنج اور قلق ہوا۔ انہوں نے سلطانی فیصلے کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے سلطان کو
حد مجبور کرنے کی کوشش کی کہ وہ سلطنت عثمانیہ کو اس طرح بے یار و مددگار چھوڑ کر کہیں
جائے۔ سلطان نے کسی کی ایک نہ سنی اور اپنی علیحدگی کے فیصلے کو برقرار رکھا۔

تخت سلطنت پر شہزادہ علاؤالدین کے بعد شہزادہ محمد کا ہی حق تھا۔ چنانچہ سلطان
شہزادہ محمد کو نوعمری میں ہی تاجِ عثمانی پہنا دیا۔ اُس وقت شہزادہ محمد کی عمر صرف چودہ
تھی۔ اور بعض لوگوں کا یہ خیال تھا کہ نوعمر شہزادہ امورِ سلطنت کو احسن طریقے سے
سکے گا۔ چنانچہ سلطان نے اپنے بہترین تجربہ کار اور بہادر وزیروں اور سپہ سالاروں کو
شہزادے کا دست راست مقرر کیا۔ خصوصاً قاسم بن ہشام کو سلطان نے تخلیے میں
حکم دیا۔

"قاسم! ہمیں تم پر بے حد اعتماد ہے۔ تم نے ابوجعفر کی سازش کو بے نقاب کر
سلطنت عثمانیہ پر جو احسان کیا ہے اس کا اجر ہم نہیں دے سکتے۔ ہم نے تمہاری صلاح
اور اخلاص کو دیکھ کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں جانے سے پہلے شہزادہ محمد کا مشیر خاص مقر
جائیں۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ تم اس ذمہ داری کو بہ حسن و خوبی نبھاؤ گے۔ تم پر
بہت ذمہ داریاں ہیں۔ چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں سراغ رسانی کے محکمے سے
کر دیا جائے۔ ویسے بھی ہم نے تمہیں شاہی سراغ رساں اور نہ میں قیصر کی سازش کا
لگانے کے لئے مقرر کیا تھا..... اب چونکہ سازش اور بغاوت کا خطرہ نہیں رہا، چنا
تمہیں اس ذمہ داری سے آزاد کر کے شہزادہ محمد کی دیکھ بھال کا فریضہ سونپتے ہیں۔
شہزادہ محمد نہیں بلکہ "سلطان محمد خان" ہے۔

قاسم پہلے ہی تمام حالات سے واقف تھا۔ اور اُسے یہی توقع تھی کہ سلطان
شہزادے کی بابت ہی کچھ کہے گا۔ لیکن اُسے یہ توقع نہ تھی کہ اُسے شاہی سراغ رسا
عہدے سے الگ کر دیا جائے گا۔ اُس نے کسی قدر استعجاب سے پوچھا۔

"لیکن سلطانِ معظم! ابوجعفر کے چند ایک جاسوس ابھی تک ہماری گرفت میں نہیں آ
سکے۔ میں پوری تگ و دو کر رہا ہوں کہ انہیں گرفتار کروں۔"

"اس کام کے لئے بہرام خان ہی کافی ہے۔ ویسے بھی ہم نے تمہیں عارضی طور پر
شاہی سراغ رساں مقرر کیا تھا۔ تم درحقیقت محاذِ جنگ کے آدمی ہو۔ ہم تمہیں انتظامی امور
میں ضائع نہیں کر سکتے۔"

قاسم کو شاہی سراغ رسانی کے عہدے سے ہٹا دیا گیا تھا۔ اب وہ نوعمر شہزادے کا مشیر
مقرر کیا گیا تھا۔ جہاں تک ینی چری میں قاسم کی ذمہ داریوں کا تعلق تھا تو فی الحقیقت وہی
اُس کی مستقل ملازمت تھی۔

سلطان، شہزادہ محمد کو نوعمری میں ہی تخت پر بٹھا کر خود ایشیائے کوچک کی ریاست
"ایدین" میں چلا گیا۔ یہ نہ صرف ایک پُر فضا مقام تھا بلکہ یہاں ایک خانقاہ بھی تھی جس
میں ہمہ وقت ذکر و فکر اور زہد و عبادت کی مجلسیں جاری رہتی تھیں۔ "ایدین" میں شہری
زندگی کے ہنگامے نہیں تھے بلکہ یہاں کی آب و ہوا اور خاموش ماحول سلطان کو تخت
سلطنت سے ہزاروں گنا بڑھ کر محسوس ہوا۔ سلطان یہاں شب و روز ذکر و فکر اور عبادات
میں مشغول ہو گیا۔ سلطان مراد خان ثانی درحقیقت ایک درویش اور فلسفی مزاج شخص تھا۔
اُسے مادہ پرستی سے سخت نفرت تھی۔ وہ شہروں میں رہنے والے اور دولت اکٹھی کرنے
والے لوگوں کو جہنم کے باشندے کہا کرتا تھا۔ اُس کے نزدیک دنیا کی دولت کے لئے تگ
و دو کرنے والے شیطان کے پیروکار تھے۔ وہ جانتا تھا کہ حقیقی زندگی کا راز معرفت الٰہی
میں پوشیدہ ہے۔ چنانچہ اُس نے تختِ سلطنت سے الگ ہونے کا فیصلہ کیا تو اُسے زر و
جواہرات چھوڑنے کا ایک لمحے کے لئے بھی ملال نہ ہوا۔

سلطان اورنہ چھوڑ کر چلا گیا۔ سلطان مراد خان ثانی کی تخت سلطنت سے دست برداری
اور ایک نوعمر شہزادے محمد خان کی تخت نشینی کا حال سن کر عیسائیوں کے منہ میں پانی بھر آیا
اور انہوں نے اس موقع کو بہت ہی مناسب اور غنیمت سمجھ کر معاہدہ شکنی کا ارادہ کیا۔ ہنگری
کی مجلس قومی نے ترکوں کو یورپ سے نکالنے کے لئے ان حالات کو سنہری موقع قرار دیا۔
اس غداری کا اصل محرک یورپ کا نمائندہ "کارڈنیل جولین" تھا۔ جو پوپ کی پوری تائید
کے ساتھ معاہدہ شکنی پر زور دے رہا تھا۔ پوپ یعنی پاپائے روم، روما کے رومن کیتھولک
چرچ کا سربراہ تھا۔ چنانچہ جونہی پوپ نے یہ فتویٰ دیا کہ مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ توڑنا
گناہ نہیں تو سارے یورپ میں جوش و جذبے کی لہر دوڑ گئی۔ قیصرِ قسطنطنیہ بھی اس تحریک

میں پیش پیش تھا۔ حالانکہ قیصر آرتھوڈکس کلیسا کا پیروکار تھا۔ آرتھوڈکس کلیسا، رومن کلیسا شدید مخالف تھا۔ اس کے باوجود قیصرِ قسطنطنیہ مسلمانوں کے خلاف کارڈنیل جولین ہنگری والوں کے ساتھ قدم بقدم چل رہا تھا۔ عیسائیوں کے لئے یہ حالات بے حد امید افزاء تھے۔ سلطنت عثمانیہ کی زمامِ حکومت ایک نوعمر لڑکے کے ہاتھ میں تھی۔ اور یہی خبر سن کر ایشیائے کوچک میں امیر کرمانیا نے پھر بغاوت شروع کر دی تھی۔ عثمانی فوجیں امیر کرمانیا کو سبق سکھانے کے لئے ایشیائے کوچک کی جانب روانہ ہو چکی تھیں۔

ادھر درِ دانیال پر ''جنیوا''، ''وینس'' اور ''برگنڈی'' کے بحری بیڑوں کا قبضہ تھا۔ جن کی موجودگی میں عثمانی فوجوں کے لئے درِ دانیال کو عبور کرنا بہت مشکل تھا۔ تمام حالات عثمانی سلطنت کے خلاف اور صلیبیوں کے حق میں تھے۔ لیکن اس کے باوجود ہنگری کا بادشاہ لاڈ سلاس، سلطان کے ساتھ کئے گئے معاہدہ کی خلاف ورزی نہ کرنا چاہتا تھا۔ ہنگری کی مجلس قومی کے بعض دیگر ارکان بھی اس معاہدہ شکنی کو غیر اخلاقی حرکت قرار دے رہے تھے۔ حتیٰ کہ خود ہونیاڈے بھی عہد شکنی کے حق میں نہ تھا۔ لیکن کارڈنیل جولین نے اپنے مذہبی اثر سے کام لیا اور پاپائے روم کے فتوے سے بادشاہ کے ضمیر کو مطمئن کر دیا کہ غیر عیسائیوں کے ساتھ معاہدہ کی پابندی نہ کرنی چاہئے۔ ہنگری کی مجلس قومی کے ارکان کی مخالفت اس فتویٰ سے دبا دی گئی اور جولین نے مجلس میں اعلان کیا کہ اس فتویٰ میں خود پوپ کی تائید بھی شامل ہے۔ اُس نے مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''کیا تم اس موقع پر اُن اُمیدوں کو توڑ دو گے جو لوگوں نے تمہارے ساتھ قائم کر رکھی ہیں۔ اس خوش بختی سے فائدہ نہیں اٹھاؤ گے جو تمہیں نصیب ہوئی ہے۔ تمہارا عہد و پیمان تمہارے خدا اور تمہارے مسیحی بھائیوں کے ساتھ ہے۔ اور وہ سابق معاہدہ اُس عاقبت نااندیشانہ اور مخالفِ مذہب کو ساقط کر دیتا ہے جو مسیح کے دشمنوں سے باندھا گیا ہو۔ دنیا میں مسیح کا نائب پاپائے رومہ ہے۔ جس کی اجازت کے بغیر تم نہ تو کوئی وعدہ کر سکتے ہو اور نہ اُس کو پورا کر سکتے ہو۔ اس کی طرف سے میں تم کو دروغِ حلفی سے بری الذمہ کرتا ہوں اور تمہاری فوج کو برکت دیتا ہوں۔ شہرت اور نجات کی راہ پر تم میرے پیچھے پیچھے چلو اور اگر اب بھی تمہیں کچھ پس و پیش ہے تو میں اس گناہ کا وبال اپنے سر لیتا ہوں۔''

(دولت عثمانیہ، جلد اول، بحوالہ گبن، جلد 4 صفحہ 464)

ہونیاڈے ابھی تک کارڈنیل جولین کی باتوں میں نہ آ سکا تھا۔ اور وہ ترکوں کے ساتھ معاہدہ شکنی کو برا خیال کرتا تھا۔ لیکن جب ہونیاڈے کے ساتھ یہ وعدہ کیا گیا کہ بلغاریہ کو ترکوں سے چھیننے کے بعد ہونیاڈے کے حوالے کر دیا جائے گا اور ہونیاڈے کو وہاں کا بادشاہ بنا دیا جائے گا تو وہ بھی راضی ہو گیا۔

ہونیاڈے کے راضی ہونے کی دیر تھی کہ صلیبی افواج جنہوں نے دس سال کے لئے مسلمانوں کے ساتھ جنگ نہ کرنے کا وعدہ کیا تھا، آن کی آن میں تیار ہونے لگیں۔ ہونیاڈے نے تجویز پیش کی کہ معاہدہ شکنی کا اعلان یکم ستمبر 1444ء کے دن تک خفیہ رکھا جائے۔ اُس کا خیال تھا کہ عیسائیوں کی اتحادی افواج یکم ستمبر تک صلح نامہ سے پورا پورا فائدہ اٹھا لیں گی۔ اور ان تمام علاقوں پر قابض ہو جائیں گی جنہیں معاہدہ کی وجہ سے ترک بڑی دیانتداری کے ساتھ خالی کر رہے تھے۔ سربیا کے بادشاہ جارج برنیک وچ کو سلطنت میں اضافے کا لالچ دیا گیا۔ چنانچہ وہ بھی معاہدہ شکن اتحادیوں کے ساتھ شامل ہو گیا۔

''جس طریقہ سے یہ غداری عمل میں لائی گئی، اس سے زیادہ معیوب بات یورپ کے بورماؤں اور ایک بڑے سپہ سالار کی شہرت کے لئے تصور میں بھی نہیں آ سکتی۔''

(بقول لین پول)

ابھی صلح نامے کو لکھے ہوئے ایک مہینہ بھی نہ گزرا تھا کہ اُس کے توڑنے پر عیسائی متفق ہو گئے۔ جس وقت عثمانی دستے سربیا، والیشیا (ولاچیا) اور دریائے ڈینوب کے ساحل پر واقع قلعے خالی کر کے نکل آئے اور اتحادیوں نے صلح نامے سے پوری طرح فائدہ اٹھا لیا تو کنگ لاڈ سلاس، کارڈنیل جولین اور ہونیاڈے یکم ستمبر کو 20 ہزار کی فوج لے کر سلطنت عثمانیہ پر حملہ کرنے کی غرض سے روانہ ہوئے۔ ترک اس فریب سے بالکل بے خبر تھے۔ انہیں متعدد قلعے اُن کے ہاتھوں سے نکل گئے۔ قلعوں میں موجود ترکی دستے یا قتل کر دیئے گئے یا چٹانوں سے گرا کر ہلاک کر دیئے گئے۔ ہنگری کی فوجیں بے خبر ترکی سرحدات کو تاخت و تاراج کرتی ہوئی بلغاریہ کے راستے بحر اسود کے کنارے پہنچیں اور وہاں سے جنوب کا رُخ کیا۔ اس طرح وہ کئی اہم مقامات کو فتح کرتے ہوئے ''وارنا'' پہنچیں اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ یہاں بھی ترک اس اچانک حملہ کے لئے بالکل تیار نہ تھے۔ مجبوراً انہیں ہتھیار ڈالنے پڑے اور ''وارنا'' پر بھی عیسائیوں کا قبضہ ہو گیا۔ اس سے پہلے راستے میں جو ترکی فوجیں آئیں، مقتول و مغلوب ہوتی رہیں۔ اور تمام علاقے میں عیسائیوں نے بے رحمی اور سفاکی کے ساتھ مسلمانوں کا قتل عام کیا۔

صلیبیوں کی معاہدہ شکنی کی خبر جس وقت نوعمر سلطان محمد خان کے پاس پہنچی، اُس وقت تک وارنا شہر فتح ہو چکا تھا۔ نوعمر شہزادہ اس قدر سنگین حالات کا سن کر گھبرا گیا۔ اُس نے فوری طور پر دربارِ سلطنت لگایا اور اپنے سپہ سالاروں اور مشیروں، وزیروں سے مشورہ کرنے لگا۔ دربار میں موجود ہر شخص پر غم و غصے کی کیفیت طاری تھی۔ ینی چری کا بوڑھا سالار ''خواجہ خیری'' دربار میں سب سے زیادہ پُرجوش دکھائی دیتا تھا۔ نوعمر سلطان نے دربار کی کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے اپنے عمائدین سلطنت سے کہا۔

''محترم وفادارانِ سلطنت! جیسا کہ آپ کے علم میں آ چکا ہے کہ یورپ کے بدفطرت عیسائیوں نے ہمارے سلطانِ معظم کے ساتھ کیا ہوا معاہدہ توڑ دیا ہے اور ہمارے بہت سے قلعوں اور شہروں کو تاخت و تاراج کرنے کے بعد ہمارے شہر ''وارنا'' پر قابض ہو چکے ہیں۔ عیسائی لشکر یورپ سے ترکوں کو نکال دینا چاہتے ہیں۔ انہوں نے معاہدہ شکنی کر کے تاریخ انسانی میں اپنے بدترین کردار کا ثبوت دیا ہے۔

یہ ہیں وہ حالات جن سے نمٹنے کے لئے میں نے یہ مجلس مشاورت منعقد کی ہے۔ ہماری زیادہ تر افواج امیر کرمانیا کے خلاف ایشیائے کوچک کی بغاوتیں کچلنے میں مصروف ہیں۔ یہاں ہمارے پاس ینی چری کے بعض بہترین دستوں سمیت لگ بھگ پینتیس ہزار کی ایسی سپاہ موجود ہے جسے لے کر ہم ہونیاڈے کے مقابلے پر نکل سکتے ہیں۔ لیکن گزشتہ کئی دنوں سے محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے بعض پرانے سپہ سالار اور وزراء عیسائیوں کے ساتھ پنجہ آزمائی کرتے ہوئے کتراتے ہیں۔ ایسے عالم میں، میں آپ لوگوں سے سلطنت کی بہتری کا مخلصانہ مشورہ طلب کرتا ہوں۔''

نوعمر سلطان نے اپنی عمر سے بڑھ کر سنجیدگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حاضرین دربار سے بات کی۔ سب لوگ اپنی اپنی نشستوں پر براجمان شہزادے کی باتیں غور سے سن رہے تھے۔ ینی چری کے پرانے وفادار سپہ سالار ''خواجہ خیری'' نے سب سے پہلے اُٹھ کر سلطان سے کہا۔

''سلطانِ معظم! آپ نے جن سالاروں اور وزراء کا ذکر کیا ہے وہ سلطنت کی بقاء کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہانے کو تیار ہیں۔ کوئی سچا مسلمان عیسائیوں کے پنجہ آزمائی سے نہیں گھبراتا۔ دراصل سلطنت کے بعض پرانے وفادار یہ چاہتے ہیں کہ سلطانِ معظم عزت مآب حضرت سلطان مراد خان ثانی خود صلیبی افوج کے خلاف لشکر کی قیادت کریں۔''

خواجہ خیری نے بات مکمل ہی کی تھی کہ طبیب سلیم پاشا فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور انتہائی غصے سے خواجہ خیری کی جانب دیکھتے ہوئے سلطان سے کہا۔

''سلطانِ معظم کا اقبال بلند ہو۔ میرا خیال ہے کہ محترم سالار خواجہ خیری اب بوڑھے ہو چکے ہیں جنہوں نے بڑے سلطانِ معظم کو گوشہ نشینی سے واپس بلانے کی تجویز دی۔ سلطانِ معظم! آپ کے مبارک بدن میں تر و تازہ خون دوڑ رہا ہے۔ آپ کی قیادت ہی صلیبی افواج کے لئے موت کا پیغام ہو سکتی ہے۔ آپ کی قیادت میں عثمانی افواج جس قدر بہادری اور چستی کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کریں گی، پرانے سالاروں کی قیادت میں اس قدر ولولہ اُن میں پیدا نہ ہو گا۔ چنانچہ میری استدعا ہے کہ آپ اپنے والد محترم کو گوشۂ عزلت سے نکلنے کی تکلیف نہ دیں اور خود عثمانی افواج کی قیادت سنبھالیں۔''

سلیم پاشا غدار تھا۔ اس کا اصل نام ''لوگان'' تھا۔ اور یہ ابوجعفر کے زمانے میں ایک طبیب کی حیثیت سے ادرنہ میں داخل ہوا تھا۔ یہی شخص تھا جس نے شہزادہ علاؤالدین کو بذریعہ اثر زہر دے دے کر شہید کر دیا تھا۔ سلیم پاشا یقیناً یہ چاہتا تھا کہ نوعمر سلطان صلیبی افواج کے مقابلے کے لئے خود جائے۔ تاکہ ہونیاڈے جیسے مایہ ناز سالار کے سامنے نہ ٹھہر سکے اور شکست سے دوچار ہو۔ لیکن قاسم جو سلیم پاشا کو گہری نظروں سے گھور رہا تھا، اپنی نشست سے اُٹھا اور نوعمر سلطان سے کہا۔

''سلطانِ معظم! محترم سالار خواجہ خیری نے جو مشورہ دیا ہے، اُسی میں ہی سلطنت کی بقاء پنہاں ہے۔ تخت سلطنت پر بیٹھنا اور بات ہے..... اور میدانِ جنگ میں دشمن کی چالوں کو سمجھنا اور بات۔ آپ کو تا حال کسی بڑی جنگ میں حصہ لینے کا موقع نہیں ملا۔ چنانچہ یہی بہتر ہے کہ بڑے سلطانِ معظم یعنی آپ کے والد محترم کو پھر سے تخت حکومت سنبھالنے کی درخواست کی جائے۔ یہی صورت ہے سلطنت کے بقاء کی اور اسلام کی بہبود کی۔''

سلطان محمد اپنے دوست قاسم کی بات دل کی گہرائیوں سے سن رہا تھا۔ اُسے خود احساس تھا کہ وہ ابھی کسی بڑے لشکر کی قیادت کا اہل نہیں۔ چنانچہ اُس نے مزید مشاورت کو غیر ضروری سمجھتے ہوئے اپنا حکم جاری کیا۔

''حاضرین دربار! ہمیں اپنے رفیق و جلیس قاسم بن ہشام اور محترم سالار خواجہ خیری کے مشورے سے اتفاق ہے۔ اور ہم انہی دونوں وفادارانِ سلطنت کو حکم دیتے ہیں کہ یہ ابھی ''ایدرین'' روانہ ہوں اور فی الفور سلطانِ معظم کو واپس ادرنہ لے کر آئیں.....''

سلطان محمد نے معنی خیز نظروں سے سلیم پاشا کی جانب دیکھا اور پھر کہا۔

"اس کے علاوہ ہم اپنے رفقائے سلطنت پر یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ہمیں خوشا
کرنے والوں اور خوشامد سننے والوں سے شدید نفرت ہے۔"

اتنا کہہ کر سلطان محمد خاموش ہو گیا۔ بعد ازاں ضروری معاملات پر بحثیں ہوتی رہیں
اور پھر سلطان مراد خان ثانی کی واپسی تک دربار برخاست کر دیا گیا۔

اُسی دن خواجہ خیری اور قاسم بن ہشام "ایدین" روانہ ہو گئے۔ ایدین کی خانقاہ
زاہدوں اور درویشوں کی ایک مختصر سی جماعت موجود تھی۔ سلطان عام سادہ لباس میں
درویشوں کے درمیان بیٹھا کسی روحانی موضوع پر بات کر رہا تھا۔ اُس نے قاسم اور خوا
خیری کو خانقاہ میں داخل ہوتے دیکھا تو پہلے چونکا اور پھر خاموش ہو گیا۔ وہ دل میں سو
لگا کہ ضرور کوئی بڑا معاملہ ان اہم سالاروں کو ایدین کھینچ لایا ہے۔ لیکن سلطان پریشان
ہوا۔ اب وہ ایک درویش تھا اور اُسے دنیاوی امور پریشان نہ کیا کرتے تھے۔

خواجہ خیری اور قاسم، سلطان کے نزدیک پہنچے تو سلطان اور اُس کے ساتھی درویش
نے مہمانوں کا کھڑے ہو کر استقبال کیا۔ اور پھر اپنے قریب ہی زمین پر بٹھا لیا۔ سلطا
قاسم کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا جس پر کسی قدر پریشانی ثبت تھی۔ البتہ بوڑھے خوا
خیری کا سرخ چہرہ جوش سے لبریز تھا۔ سلطان نے اپنی دانا و بینا آنکھوں سے دونوں کا
جائزہ لیا اور پھر کہا۔

"لگتا ہے منتظمین سلطنت کو کسی بڑی مشکل نے آن گھیرا ہے۔ جس کے لئے آ
لوگوں کو یہاں آنا پڑا..... کہئے، کیسے آنا ہوا؟"

آج سلطان کے لہجے میں شاہی دبدبہ کہیں دکھائی نہ دیتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے
سلطان مراد خان ثانی نہ ہو بلکہ خانقاہ کا کوئی فقیر بول رہا ہو۔ خواجہ خیری نے طے
حکمت عملی کے تحت پہلے بات کی۔

"سلطانِ معظم! سلطنت کو اس وقت آپ کی ذاتِ با برکات کی اشد ضرورت ہے
بدبخت صلیبیوں نے 12 جولائی 1444ء کا معاہدہ توڑ دیا ہے اور عیسائیوں کی اتحادی افوا
لارڈ سلاس، کارڈنیل جولین اور ہونیاڈے کی قیادت میں سلطنت عثمانیہ پر یلغار کرتی ہو
بڑھتی چلی آ رہی ہیں۔ ہمارے تمام سرحدی شہر، قلعے اور قصبے سفاک عیسائیوں نے
دردی کے ساتھ پامال کر دیئے ہیں۔ حتیٰ کہ ہمارا اہم اور مشہور شہر "وارنا" بھی دشمن
قبضے میں آ گیا ہے۔ دشمن نے یکم ستمبر سے لے کر اب تک صرف چند دنوں میں ہماری
یورپی سلطنت کو تاخت و تاراج کر دیا ہے۔ نہتے مسلمان بے رحمی سے قتل کئے جا رہے

اور لارڈ سلاس کی افواج بے خوف و خطر ادرنہ کی جانب بڑھنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔"

خواجہ خیری کے ہر جملے کے ساتھ سلطان اپنے پہلو بدلتا جا رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں
حیرت سے پوری طرح کھلی ہوئی تھیں۔ اور دونوں بھنوئیں سکڑ کر ایک دوسرے کے قریب آ
ہوئی تھیں۔ اُس نے ایک لمحے کے لئے بھی نہ سوچا تھا کہ دس سال کے لئے کیا جانے والا
معاہدہ زبجیڈین لارڈ سلاس یوں بے دردی سے توڑ دے گا۔ معاہدہ پر دستخط کرتے وقت
لارڈ سلاس نے انجیل پر اور سلطان مراد نے قرآن پر قسم کھائی۔ لارڈ سلاس کی قسم کو یوں
روندا دیکھ کر سلطان کو ضرورت سے زیادہ دھچکا لگا۔ اُسے ہرگز اُمید نہ تھی کہ ایک بادشاہ اتنی
بڑی قسم اٹھانے کے بعد اپنے عہد سے پھر سکتا ہے۔ اُس کا خون کھولنے لگا اور مٹھیاں بھنچ
گئیں۔ اُسے رہ رہ کر لارڈ سلاس پر تاؤ آ رہا تھا۔ وہ خواب میں بھی نہ سوچ سکتا تھا کہ اس
قدر مراعات حاصل کرنے اور قسمیں اٹھانے کے بعد لارڈ سلاس یوں گھٹیا پن کا ثبوت
دے گا اور سلطان کے ساتھ کیا ہوا معاہدہ توڑ دے گا۔ قاسم اور خواجہ خیری کے ساتھ
بیٹھے درویش بھی سلطان کے چہرے پر جذبات کے اتار چڑھاؤ کو ملاحظہ کر رہے تھے۔

سلطان خواجہ خیری کی بات سن کر دیر تک خاموش رہا۔ اور پھر یکلخت اُٹھ کھڑا ہوا۔
سلطان کے اُٹھتے ہی سب لوگ بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور اب کی بار سلطان جو بولا تو یوں
لگا جیسے ہفت اقلیم کا شہنشاہ اپنے پورے جاہ و جلال کے ساتھ گرج رہا ہو۔ سلطان نے کہا۔

"ہم ابھی اور اسی وقت دارالسلطنت جائیں گے۔ اور خواجہ خیری!....." سلطان گرجا تو
خواجہ خیری کانپ گیا اور فوراً بولا۔

"جی سلطانِ معظم!"

"خواجہ خیری! ہماری یہ بات یاد رکھنا کہ بدفطرت اور معاہدہ شکن لارڈ سلاس کو میدانِ
جنگ میں ہم آنے والی نسلوں کے لئے عبرت کا نشان بنا دیں گے۔"

اتنا کہہ کر سلطان تیزی سے خانقاہ میں موجود اپنی رہائش گاہ کی جانب بڑھا۔ سلطان
کے ارادے دیکھ کر تمام درویش کوچ کی تیاری میں لگ گئے۔ اور بہت ہی مختصر وقت میں
سلطان، قاسم اور خواجہ خیری کے ہمراہ اپنے لشکر کی جانب اُڑا جا رہا تھا.....

سلطانی لشکر امیر کرمانیا کی بغاوت رفع کرنے کے لئے ابھی تک ایشیائے کوچک میں
موجود تھا۔ سلطان اپنے لشکر میں پہنچ کر ایک لمحے کے لئے بھی سکون سے نہ بیٹھا اور فوراً
جنگ کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ بہت ہی کم وقت میں سلطان نے چالیس ہزار بہترین
آزمودہ کار سپاہی اپنے ہمراہ لئے اور "وارنا" کی جانب چل دیا۔ اس لشکر میں ینی چری

کے بہترین دستے شامل تھے۔ جن میں بوڑھا سپہ سالار خواجہ خیری، دس ہزاری سالار
حسن، ادھیڑ عمر عبدالرحمٰن، ریاض بیگ اور بہت سے دیگر مایہ ناز سالار شامل تھے۔ قاسم
ہشام بھی اس مرتبہ سلطان کے پرچم تلے پانچ ہزار سپاہیوں کی کمان کر رہا تھا۔ یہ لشکر
اکتوبر 1444ء میں درِ دانیال کو عبور کر چکا تھا۔

سلطان کے لئے درِ دانیال کو عبور کرنا بھی بظاہر ممکن کام نہ تھا۔ کیونکہ سمندر کے ا
اہم راستے پر عیسائی بیڑوں کا قبضہ تھا۔ لیکن سلطان نے ''جنیوا'' کے جہازوں کی فی
ایک ڈاکٹ کی شرح سے محصول ادا کر کے اپنی پوری فوج کو یورپ میں منتقل کر
ہونیاڈے کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ''وینس'' اور ''جنیوا'' کے عیسائی بیڑے
رشوت لے کر سلطان کی خطرناک فوج کو یورپ میں اتار دیں گے۔ لارڈ سلاس
ہونیاڈے، وارنا شہر پر قابض تھے۔ جبکہ باقی فوج وارنا کے قریب میدان میں خیمہ
تھی۔ عیسائی فوج کو اپنی فتح کا مکمل یقین تھا۔ اُن کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ سلطا
کا لشکر درِ دانیال کو یوں پلک جھپکتے میں عبور کر کے اُن کے سر پر آ دھمکے گا۔

ہونیاڈے کو اُس کے مخبروں نے آ کر یہ خبر سنائی کہ سلطان مراد خان خود گوشۂ عز
سے نکل کر اور چالیس ہزار بہادر سپاہیوں کو لے کر مقابلے پر آ پہنچا ہے اور یہاں
صرف چار میل کے فاصلے پر آ کر خیمہ زن ہوا ہے۔ یہ سنتے ہی ہونیاڈے کے اوسان
ہو گئے۔ وہ عجلت میں لارڈ سلاس کے خیمے کی جانب بھاگا۔ لارڈ سلاس نے فوراً
مشاورت منعقد کی۔ جس کے اختتام پر عیسائی فوج اپنی صفیں درست کرنے لگی۔ ہونیا
کو سابق کامیابیوں کی بناء پر اپنی فتح کا پورا یقین تھا۔ چنانچہ اُس نے مجلس حربی کے
اراکین کا یہ مشورہ بھی قبول نہ کیا کہ لشکر گاہ کے گرد ناکہ بندی کر کے سلطان مراد خان
حملے کا انتظار کیا جائے۔ ہونیاڈے ازخود سلطان مراد خان پر حملہ کرنے کے لئے پوری
کے ساتھ چل کھڑا ہوا۔

26 رجب 848ھ بمطابق 10 نومبر 1444ء کو دونوں فوجیں ایک دوسرے
مدمقابل صف آراء ہو گئیں۔ عیسائی فوج کے ''میسرہ'' میں والیشیا کی فوج تھی۔ ہنگری
انتخابی سپاہی ''میمنہ'' پر مامور کئے گئے۔ کارڈنیل جولین کے زیر اہتمام عیسائی مجاہد
ایک لشکر عظیم تھا۔ شاہِ ہنگری لارڈ سلاس اپنے ملک کے سرداروں اور سورماؤں کے سا
لشکر کے ''قلب'' میں تھا۔ پولینڈ کی فوج سب سے پیچھے ایک مشہور بشپ کے زیر
تھی۔ ہونیاڈے خود اس لشکر عظیم کا سپہ سالارِ اعظم تھا۔

سلطانی لشکر میں پہلی دو صفیں بے ضابطہ سواروں اور پیدل فوجوں کی تھیں۔ داہنے بازو
کی کمان ''رومیلیا'' کے ''بیلر بے'' کے ہاتھ میں اور بائیں بازو کی کمان ''اناطولیا'' کے
بے کے ہاتھ میں تھی۔ ان صفوں کے پیچھے قلب میں خود سلطان مراد کے زیر کمان ینی
چری اور شاہی دستے تھے۔

10 نومبر کو وارنا کے میدان میں یہ لڑائی شروع ہوئی۔ سلطان مراد خان نے ''معاہدہ
ریجیڈین'' کو ایک بڑے کتبے پر لکھوا کے اور نیزہ کی نوک پر رکھ کر علم بنایا جو فوجی نشان کی
طرح فضا میں لہرا رہا تھا۔

''اور اس منتقم حقیقی کو پکار رہا تھا جو لوگوں کو عہد شکنی کی سزا دیتا ہے۔''
(مشہور مؤرخ کریسی)

آج عیسائیوں کو عہد نامہ توڑے پورے دو مہینے اور دس روز گزر چکے تھے اور وہ اس
عرصہ میں متواتر سلطنت عثمانیہ کے شہر برباد کرتے آئے تھے۔ لڑائی شروع ہونے کے
قریب ہی تھی کہ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے عیسائیوں کے دلوں میں بدشگونی پیدا ہو
گئی۔ دفعتہً ہوا کا ایک سخت جھونکا آیا اور اُن کے تمام علم اُکھڑ کر گر گئے۔ (دولت عثمانیہ)

ہونیاڈے نے داہنی طرف عثمانی فوج کے ایشیائی دستوں پر ایسا زوردار حملہ کیا کہ ترکی
لشکر کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ عیسائیوں کا حملہ بہت کامیاب تھا۔ ترکوں کی پہلی دو صفیں بری
طرح بکھر گئیں۔ فوج میں اتنا انتشار پیدا ہوا کہ سلطان کو اپنی شکست کا یقین ہونے لگا۔
زندگی میں پہلی اور آخری مرتبہ سلطان کے ہاتھ سے صبر و استقلال کا دامن چھوٹ گیا۔
سلطان ابھی اس صورتحال پر پوری طرح پریشان بھی نہ ہونے پایا تھا کہ عیسائیوں کے میسرہ
نے جن میں والیشیا کے جنگجو شامل تھے، سلطانی لشکر کے دوسرے بازو پر ایسا غضبناک حملہ
کیا کہ عثمانی فوج کا یہ بازو بھی قائم نہ رہ سکا۔ سلطان کی رہی سہی اُمید بھی جاتی رہی اور
سلطان سوچنے لگا کہ اس جنگ سے بھاگنے کی بجائے گھوڑے کو ایڑھ لگا کر آگے بڑھے اور
شاہِ ہنگری، لارڈ سلاس کے محافظ دستے پر حملہ آور ہو کر جام شہادت نوش کرے۔ سلطان
اسی سوچ میں گم تھا کہ اناطولیا کے بیلر بے نے آگے بڑھ کر گھوڑے کی لگام تھام لی اور
عرض کی۔

''سلطانِ معظم! مایوس ہونے کی ابھی کوئی وجہ نہیں۔''

سلطان نے بیلر بے کی بات سنی تو اُسے یوں لگا جیسے وہ کسی خواب سے بیدار ہو گیا
سلطان نے ایک دم اپنا گھوڑا روک لیا اور ینی چری کے دستوں کی جانب متوجہ ہو کر

باآواز بلند پکارا۔

"قاسم بن ہشام!..... یہاں آؤ۔"

قاسم سلطان سے چند قدم کے فاصلے پر اپنے دستے کے ہمراہ لارڈ سلاس کے محافظ دستے کو چیرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سلطان کی آواز قاسم کے کانوں میں پڑی تو اُس نے فوراً گھوڑا پیچھے ہٹا لیا اور ہوا میں اُڑتا ہوا سلطان کے پاس پہنچا۔ سلطان نے قاسم کو حکم دیا

"قاسم بن ہشام! آن کی آن میں یہ چڑی کے تمام کمانداروں کو میرا یہ پیغام پہنچا دو کہ دل چھوٹا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آگے بڑھ کر لڑو اور دشمن کو معاہدہ شکنی کی سزا دو۔ فتح ہماری ہوگی۔"

تھوڑی دیر بعد قاسم اپنے سالاروں اور کمانداروں کو سلطان کا پیغام پہنچا رہا تھا۔ لیکن سلطان ابھی تک خود مایوس تھا۔ اچانک سلطان مراد خان ثانی کے کانوں میں شاہِ ہنگری لارڈ سلاس کی آواز پڑی..... لارڈ سلاس انتہائی متکبرانہ انداز میں سلطان کو اپنے ساتھ مقابلے کے لئے للکار رہا تھا۔ سلطان نے فوراً کمان میں ایک تیر جوڑا اور شاہِ ہنگری کے گھوڑے کا نشانہ تاک کر چھوڑ دیا۔ گھوڑا ہنہناتے ہوئے فضا میں اُچھلا اور زخمی حالت میں دیوانہ وار اپنے سامنے کی جانب دوڑ پڑا۔ لارڈ سلاس نے سنبھلنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن زخمی گھوڑا چند قدم دوڑنے کے بعد عین خواجہ خیری کے دستے کے درمیان جا کے گرا۔ گھوڑے کے ساتھ ہی لارڈ سلاس ینی چری سپاہیوں کے قدموں میں آ گرا۔ خواجہ خیری نے فوراً اپنے گھوڑے سے چھلانگ لگائی اور تلوار سونت کر لارڈ سلاس کی جانب بڑھا۔ معاہدہ شکن لارڈ سلاس موت کو سر پر دیکھ کر گڑگڑانے لگا۔ اور خواجہ خیری سے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"سالار! مجھے قتل مت کرو۔ مجھے گرفتار کر لو۔ تمہیں منہ مانگا انعام دُوں گا۔"

لیکن غضبناک خواجہ خیری کو لارڈ سلاس کی معاہدہ شکنی کے سوا کچھ یاد نہ تھا۔ اُس نے ہنگری کے بادشاہ کی ایک نہ سنی اور اپنی تلوار کا وار کر کے لارڈ سلاس کا سر کاٹ لیا۔ ہنگری کا بادشاہ اور معاہدۂ زبجیڈین پر دستخط کرنے والا اتحادی فوج کا سربراہ لارڈ سلاس اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔ خواجہ خیری نے لارڈ سلاس کا سر اپنے نیزے کی نوک پر رکھا اور نیزے کو بلند کر کے عیسائیوں کی جانب بڑھا۔ اُدھر معاہدۂ زبجیڈین کی نقل ایک نیزے پر بلند ہوتی ہوئی صلیبیوں کو دکھائی دے رہی تھی۔ اب جو اُن کی نظر اپنے بادشاہ کے ہوئے سر پر پڑی تو اُن کے دل بیٹھ گئے۔ جنگ کے آغاز میں بدشگونی پیدا ہو ہی چکی

لارڈ سلاس کا کٹا ہوا سر دیکھا تو عیسائیوں کو یقین ہونے لگا کہ معاہدہ شکنی کی سزا سر پر آ پہنچی ہے۔ اتحادی فوج کے سپہ سالار ہونیاڈے کی نظر اپنے بادشاہ کے سر پر پڑی تو اُس نے خواجہ خیری سے لارڈ سلاس کا سر چھین لینے کے لئے یکے بعد دیگرے زبردست حملے کیے لیکن ہر مرتبہ اُسے شکست ہوئی۔ کچھ ہی دیر بعد عیسائی مجاہدوں کا سپہ سالار اور پوپ کا نمائندہ کارڈنیل جولین، قاسم بن ہشام کے دستے کے نرغے میں آ گیا۔ قاسم اسے نہیں پہچانتا تھا لیکن اُسے پیچھے سے آغا حسن کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

"قاسم!..... یہی ہے کارڈنیل جولین۔ جس نے یورپ کی تمام افواج کو مذہبی بنیادوں پر اکٹھا کیا اور عیسائیوں کو معاہدہ زبجیڈین توڑنے پر مجبور کیا۔"

یہ سننے کی دیر تھی کہ قاسم کے رگ و پے میں بجلیاں سی بھر گئیں۔ قاسم نے آگے بڑھ کر کارڈنیل جولین پر حملہ کر دیا۔ قاسم کے ساتھی سپاہیوں نے قاسم کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کی تو قاسم نے گرجدار آواز کے ساتھ اُنہیں منع کر دیا۔ قاسم نے کارڈنیل جولین کو اپنی شمشیر کے کمالات دکھا دکھا کر جب ادھ موا کر دیا اور قریب تھا کہ وہ اپنے گھوڑے پر سے گر پڑتا کہ عیسائی لشکر کی جانب سے ایک سنسناتا ہوا تیر آیا اور قاسم کے بائیں بازو میں پیوست ہو گیا۔ اب قاسم کے پاس جولین کے ساتھ کھیلنے کا مزید وقت نہیں تھا۔ چنانچہ اُس نے اپنا دایاں ہاتھ فضا میں بلند کیا اور پوری قوت سے جولین کے دائیں کندھے پر اپنی تلوار دے دی۔ قاسم کی تیز دھار تلوار جولین کی زرہ کو کاٹتی ہوئی اس قدر نیچے تک چلی گئی کہ اُس کا دھڑ دو شاخے کی شکل میں کٹ کر رہ گیا۔ جولین نے تمام عیسائیوں کو معاہدہ شکنی پر مجبور کیا تھا۔ چنانچہ اُس کا عبرتناک انجام دیکھ کر توہم پرست سپاہیوں کے پاؤں اُکھڑنے لگے۔ اسی اثناء میں جولین کے ہمراہی دو اہم بشپ یکے بعد دیگرے کٹ کر میدان اور رزم گاہ کا نقشہ بدل گیا۔ ینی چری نے عیسائیوں کو پسپا ہوتے دیکھا تو اپنے حملے اور زیادہ سخت کر دیئے۔

اب ہونیاڈے مکمل طور پر مایوس ہو چکا تھا۔ اُس نے ایک بار اپنے دستوں کو سمیٹنے کی کوشش کی اور جم کر لڑنا چاہا۔ مگر اُسے کامیابی نہ ہوئی۔ اور آخر کار عیسائی دستوں کے ساتھ اپنی جان بچا کر بھاگا۔ یوں دیکھتے ہی دیکھتے مسلمانوں نے صلیبیوں سے میدان خالی کروا لیا۔ لڑائی میں اتحادیوں کا دو تہائی حصہ قتل ہو گیا۔ شاہ لارڈ سلاس کے علاوہ ہلاک ہونے والوں میں دو مشہور بشپ اور بعض نہایت ممتاز فوجی افسر بھی تھے۔ لیکن سب سے زیادہ حیرت انگیز نقش کارڈنیل جولین کی تھی جو معاہدۂ زبجیڈین کی شکست کا خاص محرک اور

عیسائیوں کی ہلاکت کا اصلی سبب تھا۔ جس گناہ کو اپنے سر لے کر اُس نے ہنگری کی
قومی کو عثمانی سلطنت پر حملہ کرنے کے لئے آمادہ کیا تھا، اُس کی لاش اُس گناہ کے وبال
ایک ایسا مرقع تھی جو مکافاتِ عمل کے خدائی قانون کو فاتح و مفتوح دونوں کے سامنے
شکل میں پیش کر رہی تھی۔

10 نومبر کے روز سلطان نے عیسائیوں کو معاہدہ شکنی کی عبرت ناک سزا دی۔ اور
نومبر کے روز سلطان نے آگے بڑھ کر وارنا کا انتظام ایک دفعہ پھر سنبھال لیا۔ لیکن
مرتبہ غضبناک سلطان جلد واپس لوٹنے والا نہیں تھا۔ اُس نے اپنی یلغار جاری رکھی اور
ہی دن میں سربیا اور بوسنیا کو فتح کر لیا۔ یہ دونوں ممالک یونانی کلیسا کے ماتحت
چنانچہ ان دونوں ملکوں نے بلا چون و چرا سلطان کی اطاعت قبول کر لی۔ ہونیاڈے
کلیسا کو مانتا تھا اور رومن کیتھولک مذہب کا پیروکار تھا۔

''سربیا کے بادشاہ ''جارج برنکووچ'' نے ایک مرتبہ جب ہونیاڈے سے دریافت
کہ اُسے کامیابی حاصل ہوئی تو مذہب کے متعلق اُس کا رویہ کیا رہے گا؟ تو اُس
جواب دیا کہ میں سربیا کو رومن کیتھولک مذہب اختیار کرنے پر مجبور کروں گا..... اب
سلطان مراد خان ثانی جارج برنکووچ کے ملک پر ننگی تلواریں لے کر پہنچا تو جارج نے
سوال سلطان سے بھی کیا تو سلطان نے جواب دیا کہ میں ہر مسجد کے پاس ایک چرچ
دوں گا۔ اور لوگوں کو پوری آزادی ہو گی کہ اپنے اپنے مذہب کے مطابق خواہ مسجد میں
چرچ میں جا کر عبادت کریں۔'' (سربیا کا مؤرخ رانکی Ranke)

یہی وجہ تھی کہ جارج برنکووچ نے سلطان کی فوجوں کو روکنے کی کوشش نہ کی اور
ملک اُس کے حوالے کر دیا۔ یہی صورتحال بوسنیا میں بھی پیش آئی۔ اہل بوسنیا بھی رو
کیتھوک مذہب سے نفرت کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے آٹھ روز کے اندر اندر بوسنیا
70 قلعوں کے پھاٹک سلطان کے لئے کھول دیئے۔ بوسنیا کا شاہی خاندان نیست و
ہو کر سلطنت عثمانیہ میں شامل ہوا۔

عیسائیوں کی معاہدہ شکنی کا بعض خاندانوں پر یہ اثر پڑا کہ بوسنیا اور سربیا کے بہت
عیسائی گھرانے خود بخود حلقہ بگوشِ اسلام ہونے لگے۔ سلطان نے 10 نومبر 1444ء
بعد چند ہی دنوں میں اپنی سلطنت کا دائرہ کار پہلے سے بھی زیادہ وسیع کر لیا۔ بوسنیا
کے بعد عثمانی فوجیں ایک طرح سے فارغ ہو چکی تھیں۔ سلطان نے بوسنیا میں چند
آرام کی غرض سے قیام کیا۔ اس قیام کے دوران اُس نے شہر میں جگہ جگہ ترک باشند

آباد ہونے کے مشورے دیئے۔ بوسنیا میں موجود سلطانی فوج نے صلیبی افواج کی طرح
کوئی بے اصولی نہ دکھائی۔ نہ ہی بے جا کسی کو قتل کیا گیا اور نہ ہی کسی سپاہی نے شہریوں
کے گھروں میں داخل ہونے کی کوشش کی۔

قاسم بھی بوسنیا میں موجود تھا۔ آج اس شہر کو فتح کئے ہوئے دوسرا روز تھا۔ پہلے روز
وہ اس لشکر میں شامل تھا جو بوسنیا کے شاہی محل پر حملہ آور ہوا تھا۔ یہاں شاہی خاندان
کے بعض نوجوانوں نے قاسم اور اُس کے ساتھیوں کو روکنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ سب
مارے گئے تھے۔ کل جب قاسم یلغار کرتا ہوا محل میں داخل ہوا تھا تو اُسے سب سے زیادہ
حیرت اس بات پر ہوئی کہ بوسنیائی محل کی شاہی خواتین مختلف تلواریں اور بھالے لئے یونی
محل کے سپاہیوں کو بے حد پریشان کئے ہوئے تھیں۔ خواتین کے اس دستے کی کمان ایک
بوسنیائی شہزادی کر رہی تھی اور یہ سب خواتین محل کی مختلف راہداریوں میں جتھے بنا کر لڑ رہی
تھیں۔ قاسم نے اپنے سپاہیوں کو عورتوں کا قتل کرنے سے روک دیا اور خود با آواز بلند
بوسنیائی شہزادی سے مخاطب ہوا۔

''معزز شہزادی!..... آپ کے پورے ملک نے ہمارے سلطان کی اطاعت قبول کر لی
ہے۔ آپ کی لڑائی اس وقت بالکل بے مقصد ہے۔ بہتر یہ ہو گا کہ آپ ہتھیار پھینک کر
ان تلواروں سے امان حاصل کر لیں۔''

لیکن شہزادی نے شیرنی کی طرح دھاڑتے ہوئے کہا۔ ''ہم خود کو مسلمانوں کے حوالے
کرنے سے پہلے مر جانا پسند کرتی ہیں۔ ہم نے سنا ہے کہ مسلمان سپاہی درندوں سے کم
نہیں ہیں۔''

''آپ نے غلط سنا ہے معزز شہزادی! آپ کے پورے شہر میں کوئی مسلمان سپاہی کسی
عورت کے گھر میں داخل نہیں ہوا ہم کسی کو غلام بنانے کے لئے جنگ نہیں کرتے بلکہ ہماری
لڑائی حق اور صداقت کا فیصلہ صادر کرتی ہیں۔''

بوسنیائی شہزادی، جس کا چہرہ کسی شعلے کی طرح روشن تھا، قاسم کی باتوں سے متاثر ہوتی
ہوئی دکھائی دینے لگی۔ لیکن پھر بھی اُس نے پورے رُعب کے ساتھ کہا۔

''ٹھیک ہے۔ اگر تم سچ کہتے ہو تو پھر ہمارے لئے راستہ چھوڑ دو۔ ہم محل سے نکل کر
شہر میں پناہ لے لیں گے..... تم لوگ ہمارے راستے سے ہٹ جاؤ۔''

قاسم نے اپنے سپاہیوں کو ایک طرف ہٹا دیا۔ بوسنیائی شہزادی اپنے ہاتھ میں ننگی تلوار
لئے شاہی خواتین کے ہمراہ پورے جاہ و جلال کے ساتھ محل سے نکل گئی۔ قاسم نے اُن کا

تعاقب کرنا مناسب نہ سمجھا اور محل کی چالیس پچاس خواتین جو کہ سب کی سب
خاندان پر مشتمل تھیں، چند لمحوں بعد سپاہیوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔

آج قاسم نئی چڑی کے دستوں کے ہمراہ شہر میں گشت کرتے ہوئے اُسی شہزادی
بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ خدا جانے وہ آفت کی پرکالہ محل سے نکل کر
سے گھر میں داخل ہوئی ہو گی۔ سلطانی افواج کو اہل بوسنیا کے ساتھ لڑنے کی زیادہ تر
آئی تھی۔ صرف شاہی محل میں معمولی سی مزاحمت ہوئی تھی جس پر قاسم نے جلد ہی قا
تھا۔ اس وقت قاسم تین چار سواروں کے ہمراہ شاہی محل کی قریبی گلیوں میں سے گ
تھا۔ بوسنیا کے لوگ ابھی تک فاتح لشکر سے سہمے ہوئے تھے اور اِکا دُکا لوگ اپنے گ
سے نکلنے کی ہمت کر رہے تھے۔

قاسم ایک گھر کے قریب سے گزرا تو ٹھٹک کر رُک گیا۔ مکان کے اندر سے کسی
کے چیخنے چلانے اور کراہنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ قاسم نے حیرت و استعجاب کے
اپنے ساتھی سواروں کی جانب دیکھا اور پھر تھوڑی دیر کچھ سوچنے کے بعد گھوڑے سے
اُتر آیا۔ اُس کے ساتھی بھی اُس کی تقلید میں اپنے اپنے گھوڑوں سے نیچے اُتر آئے
محتاط قدموں سے دروازے کی جانب بڑھا اور پھر اپنی تلوار نکال کر اُس کے دستے
دروازے پر دستک دی۔ وہ تھوڑی دیر وہیں کھڑا ہو کر انتظار کرتا رہا۔ روتی ہوئی عور
آواز اب بھی سنائی دے رہی تھی۔ بالآخر قاسم اپنے دو ساتھیوں کو دروازے پر کھڑا
اور باقی دو کو اپنے ہمراہ چلنے کا اشارہ کر کے مکان کے اندر داخل ہو گیا۔ یہ ایک
مکان تھا جس کے اندرونی کمرے سے ایک عورت کے کراہنے کی آواز مسلسل برآمد
تھی۔ قاسم ننگی تلوار لئے احتیاط سے کمرے کی جانب بڑھا اور کمرے کا دروازہ کھول
جھانکا۔ لیکن یہ دیکھ کر وہ فوراً اُلٹے قدموں سے باہر نکل آیا کہ کمرے میں ایک جوا
عورت دردِ زہ سے چلا رہی تھی۔ اُس کا بچہ ہونے والا تھا اور گھر میں اُس کی مدد
کوئی دوسرا شخص موجود نہیں تھا۔

قاسم شش و پنج میں مبتلا ہو گیا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ معاً اُسے کوئی
اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا مکان سے باہر نکلتا چلا گیا۔ وہ دراصل اڑوس پڑوس
خاتون کا بندوبست کرنے کے لئے نکلا تھا۔ کسی ایسی خاتون کا بندوبست جو ایک
مبتلا عورت کی مدد کر سکے۔ اُس نے قریب ہی ایک مکان کے دروازے پر دستک
پھر بے چینی سے کسی کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ چند لمحے بعد مکان کے اندر

آواز سنائی دی اور پھر کسی نے دروازے کے پیچھے سے ہی ڈری ڈری آواز میں سوال کیا۔
"کون.....؟"

یہ ایک بوڑھی مردانہ آواز تھی۔ قاسم نے سوچا مفتوحہ قوم کے لوگ کس قدر ہراساں اور
فزدہ ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ سلطانی لشکر نے بوسنیا میں کسی کی جان و مال کو ضرر نہیں پہنچایا
ہیں پھر بھی شہر کے لوگ گھروں کے دروازے بند کر کے اندر سہمے بیٹھے تھے۔ قاسم نے
رھے آدمی کی آواز سنی تو کہا۔

"دیکھئے! میں سلطانی لشکر کا سالار ہوں..... آپ کے پڑوس میں ایک خاتون زچگی
عمل میں مبتلا ہے اور دردِ زہ سے چلا رہی ہے۔ ایسے عالم میں کسی عورت کو اُس کے
ں ہونا چاہئے۔ لیکن وہ اکیلی ہے۔ اگر دیر تک اُس کی مدد کو کوئی نہ پہنچا تو وہ یقیناً مر
ے گی..... کیا آپ کے گھر میں کوئی ایسی خاتون ہے جو اُس بے چاری کی مدد کر سکے؟"

قاسم کی بات سن کر بوڑھا شخص خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر خاموشی رہی اور پھر دروازہ کھل
۔ یہ ایک ضعیف العمر یورپی باشندہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت بھی تھی اور خوف
۔ بوڑھے شخص نے قاسم کو سر سے پاؤں تک بغور دیکھا اور پھر کہا۔

"آپ غالباً..... یہ ساتھ والے گھر کی بات کر رہے ہیں۔ آپ ٹھہریئے! میں اپنی بیٹی
بات کرتا ہوں۔" بوڑھے نے اتنا کہا اور اندر چلا گیا۔

قاسم کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ بوڑھے کا خوف دُور ہو چکا تھا۔ کیونکہ وہ جاتے ہوئے
پیچھے مکان کا دروازہ کھلا چھوڑ گیا تھا۔ یقیناً اُسے اور اُس کی بیٹی کو اپنی پڑوسن کے
نے والے بچے کی خبر رہی ہو گی۔ یہی وجہ تھی کہ بوڑھے کو قاسم کی بات پر فوراً یقین آ
اور اُس کا ڈر جاتا رہا۔ قاسم یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ اُسے بوڑھے کے ہمراہ دو عورتیں
ہوئی دکھائی دیں۔ ان عورتوں نے اپنے چہروں اور جسم کو بڑی بڑی چادروں کے
چھپا رکھا تھا۔ قاسم نے عورتوں کو آتے دیکھا تو اُن کے احترام میں سچے مسلمان کی
نظریں جھکا لیں۔ اب قاسم کی پریشانی دُور ہو چکی تھی۔ بوڑھا شخص اپنے ساتھ دونوں
ل کو لئے ہوئے تیزی کے ساتھ پڑوس کے مکان میں داخل ہو گیا۔ قاسم نے بوڑھے
لک کر کہا۔

دیکھئے! اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تامل اور بلا خوف و خطر آپ ہم سے کہہ
ہم یہیں دروازے پر کھڑے عمل زچگی مکمل ہونے تک آپ کے لئے دُعا کر رہے

بوڑھے شخص کی آنکھوں میں پھر حیرت نظر آئی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ فاتح قوم سکھا
تو ایسے نہیں ہوتے۔ اُسے اپنی گزشتہ زندگی میں یاد آیا کہ رومن کلیسا کے فاتحین جوا
ہم مذہب عیسائی بھائی تھے، جب ایک فاتح کی حیثیت سے اُس کے شہر میں داخل ہو
انہوں نے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ گھروں کو لوٹ لیا تھا۔ نوجوان لڑکیوں
کر لے گئے تھے۔ بوڑھوں اور بچوں کو قتل کر دیا تھا اور فصلوں کو آگ لگا دی تھی۔
رہا تھا کہ آج یہ مسلمان بھی فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے ہیں۔ لیکن انہوں
شہری کے گھر میں داخل ہونے کی کوشش نہ کی۔ اور نہ ہی کسی کو ذرہ بھر نقصان پہنچا
بوڑھا شخص اب حیرت کی بجائے محبت بھری نظروں سے قاسم کو دیکھنے لگا۔ اُس نے
میں داخل ہونے سے پہلے قاسم سے پوچھا۔

''بیٹا! ایک بات پوچھوں، برا تو نہیں مناؤ گے؟''

اس اثناء میں بوڑھے شخص کے ساتھ آنے والی عورتیں مکان میں داخل ہو چکی
صرف بوڑھا ہی دروازے پر کھڑا قاسم سے بات کر رہا تھا۔ قاسم نے بوڑھے شخص کی
سن کر خندہ پیشانی سے جواب دیا۔

''جی جی! پوچھیے، میں آپ کی کسی بات کا برا نہیں مناؤں گا۔''

''دیکھو بیٹا! تم جانتے ہو کہ ہم عیسائی ہیں۔ اور ہمارے نجات دہندہ کا نام یسو
ہے۔ جو خدا کا بیٹا بھی ہے اور رسول بھی۔ میں نے سنا ہے کہ تم مسلمانوں کا بھی ای
ہے..... میں پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ تمہارا نبیؐ خداوند کا کیا لگتا ہے؟''

قاسم کے لئے بوڑھے کا سوال انتہائی دلچسپ اور غیر متوقع تھا۔ اُس نے
ہوئے جواب دیا۔

''ہمارے نبی کا نام نامی محمد الرسول اللہ ﷺ ہے۔ آپؐ صرف اللہ کے بند
رسولؐ ہیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ اللہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ وہ ہر قسم کی ضرورت
احتیاجات سے بے پرواہ ہے۔ نہ اُس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے
ایسی ہستی نہیں جو اُس کی ہمسری کا دعویٰ کر سکے۔''

بوڑھے شخص کے ماتھے پر حیرت کی شکنیں نمودار ہوئیں۔ اُس کی آنکھوں میں
چمک پیدا ہونے لگی۔ بالکل ویسی چمک جیسی کسی کھوئی ہوئی چیز کے مل جانے پر ہو
اُس نے تیز تیز لہجے میں قاسم سے کہا۔

''آپ ضرور یہیں ٹھہریئے گا۔ میں اندر جاتا ہوں۔ اگر ہمیں کسی چیز کی ضرو

ظاہر ہے آپ سے ہی کہنا پڑے گا۔'' بوڑھا شخص اندر جانے کے لئے مڑا۔ لیکن پھر
چند لمحے ٹھٹک کر رُک گیا۔ اُس نے چند لمحے کے لئے کچھ سوچا اور مڑ کر قاسم سے کہا۔

''آپ لوگ باہر کیوں ٹھہرتے ہیں، اندر آ جایئے۔ تھوڑی ہی دیر کی تو بات ہے۔ میں
آپ کو صحن میں چارپائی ڈال دیتا ہوں۔'' بوڑھے نے اتنا کہا اور پھر قاسم کا جواب سنے
بغیر اندر چلا گیا۔

اب قاسم اور اُس کے دو ساتھی مکان کے اندر صحن میں بیٹھے تھے۔ باقی سپاہیوں کو قاسم
نے معمول کے گشت پر روانہ کر دیا تھا۔ مکان کے کمرے سے ابھی تک عورت کے چلانے
کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ لیکن اب قاسم کو تسلی تھی۔ وہ اطمینان سے صحن میں بیٹھا
بوڑھے شخص کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ بوڑھے شخص نے ایک اور سوال کیا۔

''سنا ہے تمہارا سلطان بلاوجہ کسی پر یلغار نہیں کرتا..... عیسائیوں نے بدترین معاہدہ شکنی
تو اُس نے شمشیرِ انتقام اُٹھا لی..... کیا یہ سچ ہے؟''

''ہاں! یہی سچ ہے۔ ہمارے سلطان نے دس سال کے لئے ہونیاڈے کے ساتھ
جنگ بندی کا معاہدہ کیا تھا جسے عیسائیوں نے پہلے مہینے ہی توڑ دیا۔ چنانچہ معاہدہ شکنی کی
سزا کے طور پر ہم نے نہ صرف شاہِ ہنگری کا سر کاٹ کر نیزے پر اٹھایا بلکہ پاپائے روم
کے نائب کارڈنیل جولین کو بھی دو ٹکڑوں میں کاٹ کر رکھ دیا۔ کیونکہ یہی وہ شخص تھا جس
نے پوری عیسائی ملت کو مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ شکنی پر اکسایا اور فتویٰ دیا۔''

بوڑھا شخص نہایت غور سے قاسم کی بات سن رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے قاسم کی شخصیت
سے بے حد پسند آئی ہو۔ وہ مسلمان سپاہیوں کے کردار سے بہت زیادہ متاثر دکھائی دیتا
تھا۔ اسی دوران اندرونی کمرے سے ایک عورت برآمد ہوئی اور تیز تیز قدموں سے چلتی
ہوئی اُسی طرف آنے لگی۔ وہ صحن میں اُترنے سے پہلے ہی دُور برآمدے میں رُک گئی اور
بوڑھے شخص کو بلایا۔ کچھ دیر بعد بوڑھے شخص نے قاسم کو آ کر بتایا..... کچھ ضروری سامان
جیسے ''بوٹیوں'' کی ضرورت ہے۔ قاسم نے سامان لانے کے لئے فوراً اپنے ایک سپاہی
کو روانہ کر دیا۔ وہ عورت واپس چلی گئی اور قاسم بوڑھے شخص کے ساتھ پھر مشغول ہو گیا۔

کچھ دیر بعد بوڑھے شخص نے کہا۔

''بیٹا! تم نے ابھی تک اپنا نام بھی نہیں بتایا..... اور نہ ہی فوج میں اپنا عہدہ بتایا۔
ویسے مجھے پتا چلا ہے کہ تم سلطانی لشکر میں سالار ہو۔ میں تمہارے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔''

قاسم زیرِلب مسکرا دیا۔ اور پھر مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔ ''میرا نام قاسم بن ہشام ہے۔

اور میں سلطانی لشکر میں پنج ہزاری سالار ہوں۔ لیکن آپ کا کیا تعارف ہے محترم بزرگ!"

"میرا نام "بارٹا کوزین" ہے۔ میں نے اپنی تمام عمر سمندر میں گزاری ہے۔ اوائل عمر میں ہی میں مذہبی تعلیم کے لئے یونان چلا گیا تھا۔ وہاں "آرتھوڈکس چرچ" میں رہ کر میں نے عیسائیت کی مذہبی تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں میں نے جہاز رانی کا پیشہ اختیار کیا۔ چند سال قبل تک میں جزیرہ کریٹ کے ایک بڑے بحری جہاز کا کپتان تھا..... اب بوڑھا ہو چکا ہوں اس لئے گھر میں بیٹھ گیا ہوں۔ اب میرے بیٹے جہاز رانی کرتے ہیں۔ ان دونوں عورتوں میں سے ایک میری بیٹی ہے اور ایک میری بیٹی کی سہیلی ہے جو پناہ کے لئے ہمارے پاس آ گئی ہے۔"

بوڑھے شخص بارٹا کوزین نے انتہائی مختصر الفاظ میں اپنا مفصل تعارف کروا دیا۔

قاسم بڑی قدر شناس نظروں کے ساتھ بارٹا کوزین کی جانب دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ یہاں تک کہ سپاہی ضروری سامان لے کر پہنچ گیا۔ بارٹا کوزین فوراً اُٹھا اور ضروری سامان لے کر اندرونی کمرے کی جانب چل دیا۔ عورت کے کراہنے کی آواز ابھی تک متواتر سنائی دے رہی تھی۔ وہ غالباً بے حد تکلیف میں مبتلا تھی۔ کسی وقت اُس کی کراہ زوردار چیخ میں بدل جاتی..... بارٹا کوزین اس مرتبہ اندر کی جانب گیا جلد واپس نہ لوٹا..... قاسم اپنے سپاہیوں کے ہمراہ صحن میں خاموشی سے بیٹھا مشکل وقت کے گزر جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ کئی لمحے اور کئی گھڑیاں دھیرے دھیرے گزر گئیں۔ پھر ایک لمحہ وہ بھی آیا..... جب اندرونی کمرے سے "زچہ" کی ایک فلک شگاف چیخ سنائی دی۔ اور سب کے دل دہل گئے۔ قاسم جھٹ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن اگلے لمحے اُس کی پریشانی دُور ہو گئی جب اُس کے کانوں میں نومولود بچے کے رونے کی آواز پڑی۔

اب قاسم اپنی ذمہ داری سے عہدہ برا ہو چکا تھا۔ اُس نے ایک بچہ جنتی ہوئی عورت کی مدد کی تھی۔ ایک ایسی عورت جو جنگ کے حالات میں اپنے گھر میں بے یار و مددگار درد زہ سے چلا رہی تھی، ایک مسلمان سپاہی کا یہی فرض بنتا ہے۔ چنانچہ اب قاسم اپنا فرض نبھا چکا تھا اور اب وہ یہاں سے جانا چاہتا تھا۔ اُس نے اپنے ساتھیوں سے چلنے کی بات کی اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ جانے سے پہلے وہ بوڑھے "بارٹا کوزین" سے ملنا چاہتا تھا تاکہ بچہ کی خیریت دریافت کر سکے۔ اُس نے بارٹا کوزین کو پکارا۔ جب بوڑھا بارٹا کوزین اس کے نزدیک آیا تو قاسم نے دیکھا کہ وہ خوشی سے کانپ رہا تھا۔ اُس کے عقب میں جوان عورتیں نومولود بچے کو ہاتھوں میں اٹھائے کھڑی تھیں۔ عورتوں کا فاصلہ قاسم سے

قدم دُور تھا۔ بارٹا کوزین نے کانپتے لرزتے ہاتھوں سے قاسم کو دونوں بازوؤں سے پکڑ لیا اور جذبات سے لبریز آواز میں کہا۔

"بیٹا! تم کہاں چل دیئے؟ تم آج کہیں نہیں جاؤ گے۔ ہم جی بھر کے تمہاری خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ تمہیں مبارک ہو۔ ہماری اور تمہاری کوشش رنگ لائی۔ "بریٹا" نے چاند جیسے بچے کو جنم دیا ہے۔ تمہیں یہ جان کر حیرت ہو گی کہ اس بچے کا باپ سلطانی فوج کے خلاف ہونیاڈے کے مذہبی لشکر میں شامل ہے۔ جب اُسے معلوم ہو گا کہ سلطانی لشکر کے ایک سالار نے اُس کی مرتی ہوئی بیوی اور بچے کو بچایا ہے تو اُس پر کیا گزرے گی..... میری بیٹی اور اُس کی سہیلی تمہارے کردار سے بے حد متاثر ہوئی ہیں۔ وہ دونوں تم سے ملنا چاہتی ہیں۔"

قاسم جیسے پُرخلوص سپاہی کو اس طرح کے لوازمات کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ اُسے لشکر گاہ میں واپس جانے کی بھی جلدی تھی۔ چنانچہ اُس نے بارٹا کوزین سے کہا۔

"محترم بزرگ! یہ جو کچھ میں نے کیا میرا فرض تھا۔ میں یہاں مزید نہیں رُک سکتا۔ اب آپ مجھے اجازت دیجئے۔"

لیکن ابھی بارٹا کوزین کچھ کہہ بھی نہ پایا تھا کہ عقب میں کھڑی دونوں جوان عورتوں میں سے ایک یکلخت تیز تیز قدموں کے ساتھ آگے بڑھی اور قاسم کے عین سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ اُس کی اس حرکت سے نہ صرف قاسم بلکہ قاسم کے ساتھی سپاہی حتیٰ کے بارٹا کوزین خود بھی حیرت زدہ رہ گیا۔ لیکن اُس نوجوان عورت نے سامنے کھڑے ہوتے ہی اپنے چہرے سے چادر کا پلو ہٹا دیا۔ قاسم اور قاسم کے ساتھیوں کی نظر اُس کے چہرے پر پڑی تو وہ تینوں حیرت سے اُچھلے..... یہ تو وہی لڑکی تھی جو بوسنیا کے محل میں شاہی خواتین کی حفاظت کرتے ہوئے قاسم کے ساتھ ٹکرائی تھی۔ یہ تو شہزادی تھی۔ بوسنیا کے شاہی خاندان کی ایک حسین و جمیل شہزادی۔ قاسم نے اُسے دیکھا تو اس حسین اتفاق پر انگشت بدنداں رہ گیا۔ اُس نے سوچا بوڑھے بارٹا کوزین کے گھر پناہ لینے والی لڑکی بوسنیا کی یہی شہزادی ہو سکتی ہے۔ حیرت کے مارے وہ کچھ اور تو نہ کہہ سکا صرف اتنا کہہ کر رہ گیا۔

"آ..... آپ؟؟"

"جی!..... میں۔"

شہزادی مسکرا رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں بیک وقت تشکر، احسان مندی، محبت اور حیرت کے جذبات تھے۔ وہ اپنے حسین و جمیل چہرے کو اٹھائے قاسم کے سامنے بے حد

مرعوب و متاثر کھڑی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں قاسم کے لئے عقیدت کے آنسو تھے جو پچھلی رات کے ستاروں کی طرح جھلملا رہے تھے۔

قاسم کو وہ اس انداز میں بہت پیاری لگی۔ لیکن وہ ایک مسلمان مجاہد تھا۔ اُس نے فوراً نظریں جھکا لیں۔ شہزادی قاسم سے مخاطب ہوئی۔

''میں سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ مسلمان ایسے ہوتے ہیں۔ ہمارے دربار میں تو کارڈنیل جولین نے چند ماہ قبل پاپائے روم کا پیغام پہنچایا اور مسلمانوں کے متعلق جو تقریر کی وہ مسلمانوں کو اس زمین کے بدترین درندے ثابت کرتی تھی۔ لیکن کل سے اب تک مسلمان سپاہیوں کے انداز و اطوار دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ پاپائے روم کا نائب کارڈنیل جولین جھوٹ بکتا تھا۔''

قاسم بدستور مسکرا رہا تھا۔ اُس نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔ ''شاید آپ کو یہ جان کر دکھ لگے؟..... کہ پاپائے روم کے نائب کارڈنیل جولین کو رزمگاہ میں، میں نے خود اپنے ہاتھوں سے دو ٹکڑوں میں کاٹ دیا ہے۔ حالانکہ کارڈنیل نے عیسائیوں کی فتح کا دعویٰ کرتے ہوئے معاہدہ شکنی کا گناہ اپنے سر لے لیا تھا۔ میں نے اُسے عبرت ناک انجام سے دوچار کر کے عیسائی دنیا کے سامنے ثابت کر دیا ہے کہ عیسائیت اپنے دین سے گمراہ ہو چکی ہے..... محترم شہزادی! آپ یقین کیجئے کہ اسلام کے سائے میں سلگتے جسموں کو ٹھنڈک اور چیختی روحوں کی تسکین موجود ہے۔''

قاسم کی بات سن کر بارٹا کوزین ایک قدم آگے بڑھا اور کہنے لگا۔ ''قاسم بن ہشام! تمہارے مذہب میں کوئی ایسا بوڑھا شخص بھی داخل ہو سکتا ہے جس نے اپنی تمام گزشتہ زندگی عیسائیت پر گزاری ہو؟''

بارٹا کوزین کے جملے سے قاسم چونک گیا اور اُس کی آنکھوں میں خوشی کی لہر نظر آئی۔ اُس نے فوراً بارٹا کوزین کی جانب مُڑ کر دیکھا اور بوڑھے بارٹا کوزین کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

''ہمارے مذہب میں کوئی بھی شخص اپنی سانس کے آخری لمحوں میں بھی داخل ہو سکتا ہے۔ میں آپ کو اسلام میں خوش آمدید کہتا ہوں۔ آپ میرے ساتھ چل کر ہمارے سلطان سے ملئے۔ اور سلطانِ معظم کے ہاتھ پر اسلام قبول کیجئے۔''

لیکن بارٹا کوزین کا جواب سن کر قاسم اور بھی حیران ہوا۔ بوڑھے بارٹا کوزین نے کہا

''نہیں! میں تمہارے ہاتھ پر اسلام قبول کروں گا..... مجھے عرصۂ دراز سے حق کی تلاش تھی۔ میں نے اسی پیاس کو بجھانے کے لئے بہت دُور دُور کے سفر کئے۔ لیکن تمہارے

ساتھ چند باتیں کر کے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری تشنگی پہلی مرتبہ بجھنے لگی ہے۔ میرے لئے جس قدر قابل احترام تم ہو، تمہارا سلطان نہیں ہو سکتا۔''

اب قاسم کے لئے یہاں رُکنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ اُسے بارٹا کوزین کو مسلمان کرنا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ صرف کلمہ پڑھا دینے سے کسی شخص کو مسلمان نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ نومسلم کو اسلام کے نظامِ توازن کے بارے میں بتایا جائے۔ چنانچہ قاسم نے بوڑھے بارٹا کوزین سے کہا۔

''ٹھیک ہے محترم بزرگ! آپ مجھے اس وقت کچھ دیر کے لئے اجازت دیجئے۔ تاکہ میں اپنی لشکر گاہ تک ہو آؤں۔ میں مغرب کے بعد دوبارہ آپ کے درِ دولت پر حاضری دوں گا۔ اور اُس وقت اسلام قبول کرنے سے متعلق ضروری معلومات سے آپ کو آگاہ کر دوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ آپ رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیں گے۔ اور پھر دیر تک ہم لوگ باتیں کر سکتے ہیں۔''

یہ الفاظ بوسنیائی شہزادی کے تھے..... اگرچہ اس شہزادی نے تبدیلی مذہب کا کوئی عندیہ نہیں دیا تھا۔ تاہم قاسم کے دل میں یہ بات گھر کر گئی تھی کہ اب بوسنیائی شہزادی بھی اسلام کی طرف ضرور مائل ہو گی۔ بہتری کے اسی خیال کے تحت اُس نے واپس آنے کا ارادہ کیا اور ان لوگوں سے اجازت لی۔

وہ بارٹا کوزین سے اجازت لے کر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ سیدھا لشکر گاہ کی جانب آیا۔ مسلمان سپاہی انتہائی خوش و خرم تھے۔ وارنا سے لے کر بوسنیا تک ہر شہر اور ہر علاقہ انہوں نے فتح کر لیا تھا۔ سربیا کا بادشاہ ''جارج برنیکو وچ'' جو لارڈ سٹیفن کے بعد تخت نشین ہوا تھا، لارڈ سٹیفن کے برعکس مسلمانوں کا جانی دشمن بن گیا تھا۔ حالانکہ لارڈ سٹیفن کی ایک بہن ''بایزید یلدرم'' کی بیوی تھی۔ اور اُس کی بیٹی شہزادی ''سروین'' سلطان مراد خان ثانی کی ملکہ تھی۔ اس جنگ میں جارج برنیکو وچ کو بھی شکست ہوئی تھی اور سلطان نے سربیا کا ملک مکمل طور پر اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔

قاسم لشکر گاہ میں داخل ہوا تو اُس کے ذہن میں یہی خیال موجزن تھا کہ سلطان نے فی الوقت بوسنیا تک پہنچ کر اپنی موجودہ فتوحات کا سلسلہ مکمل کر لیا ہے۔ اور اب سلطان واپس اور نہ جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ قاسم سوچ رہا تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح سلطان سے اجازت لے کر ''البانیہ'' کی جانب چلا جائے اور اپنی محبت یعنی مظلوم ماریا کو سکندر بیگ

کے خونیں پنجے سے چھڑا لائے۔ اُس نے سوچا کہ کل کسی وقت سلطان سے ملاقات کر
اپنی خواہش کا اظہار کرے۔

مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر قاسم پھر شہر کی جانب چل دیا۔ اس بار وہ اکیلا تھا
کا رُخ بوڑھے بارٹا کوزین کے گھر کی جانب تھا۔ اور پھر کچھ ہی دیر بعد وہ بارٹا کوزین
مکان میں اُس کے ہمراہ بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ بارٹا کوزین کی بیٹی اُس پڑوسن خاتون کو
اپنے گھر منتقل کر چکی تھی جس نے آج ایک خوبصورت بچے کو جنم دیا تھا۔ اسی گھر میں
کی بے پناہ حسین شہزادی بھی قاسم کی منتظر تھی۔ بارٹا کوزین کے دو نوجوان بیٹے "وینی
کے جہازوں پر ملازم تھے اور دونوں اپنے بیوی بچوں سمیت وینس کے شہر میں رہائش پ
تھے۔ اُس کی اکلوتی بیٹی بیوہ تھی۔ جس کا نوجوان شوہر ایک سال قبل مسلمانوں کے خلا
جنگ میں مارا گیا تھا۔ بارٹا کوزین کی بیٹی بھی جوان تھی۔ بوسنیا کی شہزادی جب محل
گرفتار ہونے کی بجائے زندہ سلامت نکل آئی تو اُس نے اسی لڑکی کے پاس پناہ لی۔
اب صورتحال انتہائی دلچسپ تھی۔ بارٹا کوزین اور اُس کی بیٹی اسلام قبول کرنے کا فیصلہ
چکے تھے۔ جبکہ شہزادی ابھی تک شش و پنج میں مبتلا تھی۔

کچھ دیر بعد بارٹا کوزین قاسم کو کھانے کے کمرے میں لے گیا۔ جہاں دسترخوا
قاسم، بارٹا کوزین، بوسنیائی شہزادی اور بارٹا کوزین کی بیٹی ایک ساتھ کھانا کھانے کے
بیٹھ گئے۔

بوسنیا کی شہزادی

"آپ کے سلطان نے عیسائی عبادت گاہوں کے بارے میں کیا حکم دیا ہے..... کیا
چرچ گرا دیئے جائیں گے؟ سنا ہے مسلمان اپنے مذہب کے معاملے میں بے حد متشدد
ہوتے ہیں۔"

"سلطان نے تو حکم دیا ہے کہ سربیا اور بوسنیا میں جہاں جہاں مسجد بنائی جائے اُس
کے ساتھ ایک چرچ بھی بنایا جائے۔ تاکہ عیسائیوں کو عبادت میں دُشواری نہ ہو۔ اور وہ
تمام چرچ جو پہلے سے موجود ہیں ویسے کے ویسے رہنے دیئے جائیں۔"

"یہ تو بڑا عمدہ اقدام ہے۔ اس کے برعکس ہونیاڈے نے کہا تھا کہ وہ سربیا اور بوسنیا
میں "یونانی چرچ" گرا کر "رومن کیتھولک مذہب" کے چرچ بنوا دے گا۔"

قاسم اور بوسنیائی شہزادی کے مابین بہت عمدہ مکالمہ جاری تھا۔ بوڑھا بارٹا کوزین اُن
کی باتیں غور سے سن رہا تھا۔ اُس نے جھجکتے جھجکتے قاسم سے ایک سوال کیا۔

"خداوند یسوع مسیحؑ اور اُس کی ماں کے بارے میں تمہارا مذہب کیا کہتا ہے؟"

قاسم کے ہونٹوں پر ایک دلفریب مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ بولا۔ "ہم اُنہیں خداوند نہیں
کہتے۔ بلکہ اللہ کا برگزیدہ نبی مانتے ہیں اور انہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کہہ کر پکارتے ہیں
اور اُن کی والدہ ماجدہ کو ہم حضرت مریم علیہا السلام کہہ کر پکارتے ہیں۔ اسلام اس
قصے کو ہی نہیں مانتا کہ خدا تقسیم ہو سکتا ہے یا کسی انسان کا باپ بن سکتا ہے۔"

قاسم کی بات پر شہزادی نے چونک کر کہا۔

"یہ کیا بات ہوئی؟ اگر خداوند یسوع مسیحؑ خداوند خدا کے بیٹے نہیں تو پھر وہ کس کے
بیٹے ہیں؟ کیا آپ اُن کے باپ کا نام جانتے ہیں؟"

شہزادی کے سوال سے قاسم کے چھکے چھوٹ گئے۔ اب بھلا وہ کیا کہتا اور کس کا نام
لیتا؟ اگر وہ یہ کہتا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے ایسے ہی ایک ماں کے پیٹ
سے پیدا ہو گئے، تو پھر بھی شہزادی مطمئن نہ ہوتی۔ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن کی سی
کیفیت میں قاسم کو بولنا پڑا۔

"دراصل یہ کہہ دینے سے کہ عیسیٰؑ خدا کے بیٹے ہیں، خدا تعالیٰ کی ذات ایک جسمانی

پیکر میں ڈھلی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ جبکہ خدا تو کسی جسم کا محتاج نہیں۔ یہ زمین و
خدا کا ظہور ہیں..... ظاہر ہے جب خدا نہ دکھائی دینے والی ایک محیط اور بسیط ہستی
پھر وہ کیونکر کسی انسان کی رشتہ دار ہو سکتی ہے..... اور رہی یہ بات کہ عیسیٰؑ کے باپ
ہیں؟ تو حضرت عیسیٰؑ اُس قادر و مطلق پروردگار کی قدرتِ کاملہ کا کرشمہ ہیں۔ کیونکہ
جو کچھ چاہے کر سکتا ہے۔"

اب شہزادی نے قاسم کو ایک اور اُلجھن میں ڈال دیا۔

"یہ جو آپ کہہ رہے ہیں کہ خدا جو کچھ چاہے کر سکتا ہے تو اس طرح آپ
اختیار کے بارے میں کیا کہیں گے؟ آپ کے مذہب میں خدا کے پاس کتنا اختیار ہے
انسان کے پاس کتنا؟"

اب قاسم سٹپٹا گیا۔ وہ ایک سپاہی تھا، کوئی مبلغ یا عالم نہ تھا کہ عیسائی شہزادی کے
قدر مشکل سوالات کا جواب دیتا۔ لیکن پھر بھی اُس نے ہمت کی اور کہا۔

"شہزادی حضور! یہ سارے سوالات درحقیقت خدا کے تصور سے ہی پھوٹتے ہیں۔
یہ ہے کہ آپ کے ذہن میں خدا کا تصور کس قسم کا ہے۔ عیسائی مذہب کی کتابوں میں
جو تصور پیش کیا گیا ہے وہ خدا کو ایک جسمانی وجود میں دیکھتا ہے۔ "بائبل" کے پہلے
میں لکھا ہے کہ..... "خداوند خدا جو ٹھنڈے وقت باغ میں پھرتا تھا۔ جب بولا تو آدم
اُس کی بیوی نے اُس کی آواز سنی۔" (بائبل باب پیدائش) اسی طرح دوسرے تمام مذاہب
بھی خدا کو عجیب عجیب جسمانی شکلوں میں دیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ آپ جانتی ہیں
بت پرست مذاہب میں تو باقاعدہ مٹی اور پتھر کے خدا بنا کر پوجے جاتے ہیں۔

یہ جو آپ نے اختیار کی بات کی ہے اس کا مختصر جواب ہماری اپنی ذات میں
ہے۔ ہم غور سے دیکھتے ہیں تو ہمیں اپنی ذات کے دو حصے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک وہ
جس پر ہمارا کوئی اختیار نہیں۔ یعنی جسمانی ساخت، فطری ضروریات، کھانا، سونا یا
کرنا..... اور دوسرا وہ حصہ ہے جس پر ہمارا مکمل اختیار ہے۔ یعنی کسی کا تعاون کرنا
سے ہمدردی یا محبت کرنا، سچی بات کہنا یا جھوٹ کا سہارا لینا، اللہ کی مخلوق کے ساتھ
کرنا یا برائی کا راستہ اپنانا۔

ہمارے رسولِ کریم ﷺ جو کتاب لے کر آئے ہیں وہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کا
ہے۔ بائبل مقدس کی طرح نہیں۔ بائبل میں تو صرف روایات اور حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ
کے خطوط ہیں۔ ہماری کتاب کا نام قرآنِ حکیم ہے۔ قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰهَا ..... یعنی اللہ نے انسانی شعور کو نیکی اور برائی کا الہام دیا
ہے۔ اب یہ انسان پر منحصر ہے وہ نیکی کا راستہ اپنائے یا برائی کا۔ اللہ نے انسان کو بالکل
ویسے الہام کیا ہے جیسا الہام اُس نے باقی مخلوقات کو بھی کر رکھا ہے۔ آپ دیکھئے! شہد کی
مکھی کو یہ کس نے بتایا ہے کہ وہ ایک خاندان بلکہ سلطنت کی صورت میں رہے۔ اسی طرح
بطخ کے بچے کو یہ کس نے بتایا ہے کہ وہ پانی کے تالاب میں چھلانگ لگا دے۔ اور مرغی
کے بچے کو یہ کس نے بتایا ہے کہ وہ چھلانگ نہ لگائے۔

بالکل اسی طرح کا الہام انسان کو بھی کیا گیا ہے۔ لیکن انسان چونکہ ان تمام مخلوقات
سے افضل ہے، یہی وجہ ہے کہ اُسے شعور کی دولت عطا کر کے نیکی اور بدی کے دو
الہاموں میں سے کسی ایک کو اپنانے کی کھلی چھٹی دی گئی ہے۔ تمام مخلوقات اللہ کے قوانین
کی پابند ہیں۔ لیکن انسانی ذات صرف احکامِ الٰہی کی پابند ہے۔ دراصل انسان کے پاس
کچھ زیادہ اختیار نہیں۔ صرف ایک لمحے کا اختیار ہے۔ اور وہ ہے لمحۂ موجود۔ آپ کے پاس
لمحہ حاضر ہے، آپ پر لازم ہے کہ آپ اس کا استعمال ٹھیک طریقے سے کریں، حتیٰ کہ
نتائج کے اختیار بھی آپ کے ہاتھ میں نہیں۔ آپ اگر اپنے لمحے کا اختیار اس طرح کرتے
ہیں کہ اپنے ہاتھ کو آگ میں ڈال دیتے ہیں تو لامحالہ آپ کا ہاتھ جل جائے گا۔ یہ ہے
آپ کے غلط استعمال کا نتیجہ جو آپ کو دونوں جہانوں میں بھگتنا پڑے گا۔ مادے کے جہان
میں بھی اور رُوح کے جہان میں بھی۔ آپ کا ہاتھ بھی جلے گا اور رُوح بھی گھائل ہو گی۔
لیکن اگر آپ اپنے اختیار کا استعمال درست کرتے ہیں تو آپ کا اگلا لمحہ خود بخود درست ہو
جائے گا۔ اس طرح آپ کے آنے والے تمام لمحات درست ہوتے جائیں گے۔ حتیٰ کہ
آپ کی آخرت بھی درست ہو جائے گی جسے ہم رُوح کا جہان کہتے ہیں۔ یہ ہے اسلام
کی انسانی اختیار کا نظریہ۔"

شہزادی کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ بوڑھا بارٹا کوزین جذبات کی شدت
سے کانپ رہا تھا اور اُس کی بیٹی "ماریا" پتھر کی طرح جامد و ساکت قاسم کو گھورے جا رہی
تھی۔ چند لمحے کے لئے کمرے میں سکوت چھا گیا۔ کچھ دیر بعد بوسنیائی شہزادی بولی۔
اُس کی اپنی آواز کسی گہرے کنوئیں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"آپ نے تو ہماری آنکھیں کھول دی ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے ہم پہلے کسی اَن دیکھے
جہان میں قید تھے۔ اس حقیقت کے کھلنے سے تو ہم اپنے آپ کو پہلی بار آزاد انسان محسوس
کر رہے ہیں۔ لیکن یہ جو آپ نے آخرت کی بات کی تو پھر یہ آخرت کس طرح کی ہو گی؟"

اب قاسم محسوس کر رہا تھا کہ کوئی غیبی قوت اُس کی مدد پر مامور ہے۔ وہ بے جھجک

اُٹھا۔

"آخرت؟..... آخرت تو لازمی چیز ہے۔ جو آخرت کو نہیں مانتا وہ خدا کو نہ بھی مانے

کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایسا خدا جو انسانوں کی آخرت کا منصف نہیں، خدا کہلانے کا حق

بھی نہیں۔ ہمارے قرآن حکیم میں ہے کہ ہر عمل اور فکر کا لازمی نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ ا

جو کچھ سوچتے ہیں، اس کی بھی آخرت ہے اور جو کچھ کرتے ہیں اس کی بھی آخرت

جب ہمارا لمحۂ موجود درست ہو جاتا ہے تو ہمارا اس سے اگلا لمحہ خود بخود درست ہونے

لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اعمال کا اثر شخصیت پر بھی پڑتا ہے۔ کیونکہ اعمال انسانی رُو

یعنی اندرونِ ذات کی اصلاح بھی کرتے ہیں۔ اور جس کسی کی اندرونی ذات خوبصورت

متوازن ہو جاتی ہے اُس کی بیرونی ذات بھی خوبصورت اور باوقار ہو جاتی ہے۔ اسی کو

عمل کہتے ہیں۔ جب کسی کے اعمال بہت زیادہ مقدار میں اچھے ہو جائیں تو وہ اپنی ظا

اور باطنی زندگی میں مطمئن اور شکر گزار سا رہنے لگتا ہے۔ اسلام میں اسے نفس مطمئ

ہیں۔ جس کسی کے پاس نفس مطمئنہ آ جائے وہ موت کے وقت مرتا نہیں۔ اُس کا

جسم ختم ہوتا ہے اور وہ پورے کا پورا زندہ سلامت اپنے خالق حقیقی کے پاس پہنچ جاتا

اسی کو آخرت کہتے ہیں۔ وہ شخص جو نفس مطمئنہ لے کر جاتا ہے، ہمیشہ کی زندگی حا

لیتا ہے اور اُسے ہم جنتی کہتے ہیں۔ اور وہ شخص جس کا نفس مطمئن نہیں ہوتا کیونکہ اُ

اپنی زندگی میں اپنے لمحات کا استعمال غلط کر کے ایسے اعمال کئے ہوتے ہیں جو

اندرونی اور بیرونی ذات کو تباہ کر دیتے ہیں، اُسے مرنے کے بعد بار بار مرنا پڑتا ہے

وہ دہکتی ہوئی آتش ناک زندگی میں تا ابد مرتا ہی رہتا ہے۔ اس کو ہم جہنم کہتے ہیں۔

ہمارا آخرت کا نظریہ۔"

اب شہزادی انگشت بدنداں ہو کر قاسم کی جانب ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی تھی۔ وہ

رہی تھی کہ مسلمان ایسے ہوتے ہیں، اس قدر متوازن اور خوبصورت عقائد کے مالک

اُس نے دل میں فیصلہ کیا کہ وہ بھی بارٹا کوزین کے ساتھ اسلام قبول کرے گی۔ اب

قاسم سے مزید سوالات پوچھنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ تو خاموش رہی لیکن بارٹا کوزین

ایک سادہ سا سوال کر دیا۔

"قاسم بیٹا! اس کا مطلب ہے کہ جس قدر بھی نبی اور رسول آئے یہ سب

برگزیدہ بندے تھے۔ خود خدا یا خدا کے بیٹے نہ تھے۔"

"بالکل! یہ سب اللہ کے چنے ہوئے لوگ تھے۔ نبی تو ہر زمانے اور ہر علاقے میں

بھیجے گئے ہیں۔ دراصل پرانے زمانوں میں جب کوئی نبی یا رسول دنیا سے انتقال فرما جاتا

تو اُن کے بعد عرصہ بعد اُن کے ماننے والے اپنی کم علمی اور کج فہمی کی وجہ سے اُسے خدا،

خدا کا اوتار یا خدا کا بیٹا بنا دیتے۔ اب سمندر پار ہندوستان میں "رام"، "کرشن" اور

"کوم" کو وہاں کے لوگوں نے خدا بنا لیا ہے۔ حالانکہ ہو سکتا ہے وہ اللہ کے برگزیدہ

بندے ہوں۔ دراصل کسی بھی دور میں دنیا میں رہنے والے تمام کے تمام انسان بیک وقت

صاحب شعور اور عقلمند نہیں ہوتے۔ کچھ لوگ تو اللہ کے چنے ہوئے ہوتے ہیں جنہیں ہم

پیغمبر کہتے ہیں۔ یہ لوگ مرتبۂ شعور میں سب سے بلند مقام پر ہوتے ہیں۔ یہ لوگ جب

اپنی بات دوسرے انسانوں کو بتانے لگتے ہیں تو ایسے لوگوں کو جو صاحب شعور اور عقلمند

ہوتے ہیں، یہ اپنی بات پوری طرح سمجھا کر اپنا ہمنوا بنا لیتے ہیں۔ اور جن لوگوں کو ان کی

بات سمجھ میں نہیں آتی، وہ مراتب شعور میں نچلے درجے پر ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی

زندگی کا سفر بھی سفر حیات میں پیچھے رہ جاتا ہے۔ انہیں ہم کافر کہتے ہیں۔ کچھ ایسے لوگ

ہوتے ہیں جو تمام باتیں سمجھ کر بھی اپنے عارضی مفادات کے لئے حق کا راستہ اختیار نہیں

کرتے اور سونے چاندی کی چمک دیکھ کر جانتے بوجھتے غلط راستے پر چل پڑتے ہیں۔

ایسے لوگوں کو ہمارا قرآنِ حکیم منافق اور سخت کافر کہتا ہے۔ ہمارے نبی کریمؐ شعور اور

عقلمندی کے جس مرتبے پر فائز ہیں، اُس مرتبے تک کوئی انسان نہ پہنچ سکا ہے، نہ پہنچ سکتا

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو تمام انسانوں کے لئے اور تمام جہانوں کے لئے

نبی بنا لیا ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ اب کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اور ہمارا یہ بھی عقیدہ ہے کہ

ہمارے نبیؐ پر نازل ہونے والی کتاب قیامت تک سب انسانوں کے لئے ہدایت کی آخری

کتاب ہے۔ ہمارے مذہب میں کسی دوسرے مذہب کے لئے رتی برابر بھی تعصب نہیں

ہے۔ کہ عیسائیوں کے دل میں ہمارے لئے ہے۔ ہم دنیا کے ہر انسان کو ایک اُمت کا فرد

سمجھتے ہیں اور کسی انسان کو کسی دوسرے انسان کا غلام نہیں دیکھ سکتے۔"

قاسم کا اندازِ گفتگو تینوں کے دل میں اُتر گیا۔ اُنہیں قاسم کی باتیں ایک عام فہم گفتگو کی

طرح محسوس ہوئیں۔ کچھ دیر بعد شہزادی نے انتہائی مرعوب لہجے میں کہا۔

"معزز مہمان! میں نے دل سے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں اپنا آبائی مذہب عیسائیت ترک

کر کے آپ کا مذہب اسلام اختیار کروں گی۔"

شہزادی کی بات ختم ہی ہوئی تھی کہ بارٹا کوزین بول اُٹھا۔

"چلو! یہ تو اور بھی اچھا ہوا۔ اب آپ ہم سب کو مسلمان کر دیجئے۔ آپ ہمیں بتا
کہ ہمیں مسلمان ہونے کے لئے کیا کرنا پڑے گا۔ کیا ہمیں صلیب کی طرح کوئی چیز
میں لٹکانی پڑے گی یا کچھ اور؟"

"نہیں! آپ کو کچھ بھی نہیں کرنا پڑے گا۔ آپ کو صرف سچے دل سے پورے
حواس کے ساتھ اور پورے اخلاص کے ساتھ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس عارضی زند
دنیا کے سارے دھندے اُس وقت تک بے مقصد ہیں جب تک کسی پائیدار زندگی کا
کرنے کی تگ و دو ان میں شامل نہ ہو۔ آپ حیوانوں میں دیکھ لیجئے، ایک جانور
ہے تو زندہ ہونے کے لئے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ایک بلی چوہے کو دبوچ لیتی ہے او
مر جاتا ہے۔ لیکن درحقیقت وہ اپنی باقی ماندہ نسل کو بقائے دائمی فراہم کر جاتا ہے۔
میں شہید کی جو موت ہوتی ہے وہ پوری قوم کی حیات ہوتی ہے۔ ہم جانوروں میں
دیکھتے ہیں۔ لیکن ہم انسان خود اس حقیقت پر یقین نہیں رکھتے۔ جانور تو محض اپنی
میں زندہ ہوتے ہیں۔ لیکن انسان کو جو زندگی مر کر ملتی ہے وہ صرف نسل کی بقاء پر
نہیں بلکہ ہر قسم کی مادی آلائشوں سے ماورا ایک خالص روحانی زندگی ہوتی ہے۔
مسلمان ہونے کے لئے اسی زندگی پر ایمان لانا ہوگا اور یہ بھی ماننا ہوگا کہ اس
مالک اللہ ہے۔ جو واحد لاشریک ہے۔ اور ارض و سماوات کا اکلوتا اللہ ہے۔ صرف
اطاعت انسان پر فرض ہے۔ اور دنیا میں موجود باقی ہر چیز کا خوف دل سے دُور کر
ہے۔ آپ کو صرف چند کلمات ادا کرنے ہوں گے۔ اگر آپ کا ایمان ان حقائق پر
قائم ہو چکا ہے تو چلئے میں آپ کو کلمہ پڑھا دیتا ہوں۔ کلمہ پڑھنے کے بعد آپ فا
پر بھی مسلمان ہو جائیں گے۔"

قاسم نے بوسنیائی شہزادی، ماریا اور بوڑھے بارٹا کوزین کو کلمہ طیبہ پڑھایا۔

"لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ (ﷺ)"

اور پھر اس خیال سے اُن کے لئے اسلامی نام بھی تجویز کر دیئے تاکہ بوسنیا
میں اُن کی انفرادیت اسلامی ناموں کی وجہ سے قائم ہو سکے۔ قاسم نے بارٹا کو
لئے "عباس"، بوسنیائی شہزادی کے لئے "حمیرا" اور ماریا کے لئے "مریم" نام تج
تینوں نومسلم بے حد خوش تھے۔ قاسم اُن کے ساتھ دیر تک اسلامی اعمال و فرائ
روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد کے موضوع پر باتیں کرتا رہا اور انہیں دیر تک اسلامی
فرائض ادا کرنے کے طریقے سمجھاتا رہا۔

کسی کو پتہ بھی نہ چلا اور رات گزر گئی۔ قاسم نے نمازِ فجر باجماعت ادا کروائی اور اُس
ے بعد سے قرآن حکیم کی شیریں تلاوت سن کر تینوں نومسلم وجد میں آ کر رونے لگے۔
صبح دن چڑھے قاسم لشکر گاہ لوٹا اور اپنے خیمے میں آ کر سو گیا۔

سلطان مراد خان ثانی چند روز بوسنیا میں مقیم رہا۔ اور پھر لشکر کا پڑاؤ اٹھا لیا۔ اب وہ
ہی دارالسلطنت ادرنہ کی جانب کوچ کر رہا تھا۔ اس دوران قاسم نے سلطان سے البانیہ
نے کی اجازت لینا چاہی تھی لیکن سلطان نے انکار کر دیا تھا، اور کہا۔

"قاسم بن ہشام! یہ وقت نہیں کہ تمہیں دارالسلطنت یا لشکر سے دُور بھیج دیا جائے۔ ہم
ے درپے یلغاروں سے فارغ ہوئے ہیں اور ابھی حالات کے بارے میں کچھ نہیں
جا سکتا۔ ہونیاڈے ابھی زندہ ہے اور اُس کے پرچم تلے ابھی ہنگری کی پوری فوج
رہ ہے۔ ہم ہونیاڈے کو بھی ضرور سبق سکھائیں گے۔ لیکن ابھی ہم اپنے تھکے ہوئے لشکر
ہی دارالسلطنت لے جانا چاہتے ہیں۔ تم ہمارے ساتھ ادرنہ چلو۔ وہاں سے ہم تمہیں
پہ جانے کی اجازت دے دیں گے۔"

چنانچہ قاسم کو بھی لشکر کے ہمراہ ادرنہ کی طرف لوٹنا پڑا۔

ابھی سلطانی لشکر "ادرنہ" پہنچا بھی نہ ہوگا کہ ادھر بوسنیا میں ایک دن بوسنیائی شہزادی
خواب حمیرا تھی، اچانک اعلان کیا..... کہ وہ بوسنیا میں رہنے کی بجائے اسلامی
سلطنت ادرنہ جانا چاہتی ہے۔ حمیرا اکیلی تھی۔ اُس کے والدین اور دوسرے رشتہ دار یا
ہیں کام آ گئے تھے یا پھر دُور دراز کے علاقوں میں فرار ہو چکے تھے۔ بوسنیا کے شاہی
ان کا خاتمہ ہو چکا تھا اور عباس کے سوا کوئی اُس کا پرسانِ حال نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ
نے ایک اسلامی شہر میں جا کر زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کیا۔ اُس کی بات عباس اور
نے سنی تو وہ بھی اُس کے ہمراہ چلنے کے لئے تیار ہو گئے۔ چنانچہ ان تین افراد پر
یہ قافلہ بھی لشکر کے تیئسویں روز ادرنہ کی جانب چل کھڑا ہوا۔

سلطانی لشکر باغیوں کو سزائیں دے کر اور حدودِ سلطنت کو پہلے سے زیادہ وسیع اور
کر کے دوبارہ ادرنہ پہنچ گیا۔ قاسم میدانِ جنگ سے کامیاب و کامران لوٹا تھا۔ اُس
ہی اور واقعات سن کر اُس کے اہل خانہ باغ باغ ہو گئے۔ اُس کے بھائی طاہر نے
ا اٹھا چوما، اُس کے والدین نے اُسے سینے سے لگایا اور اُس کے بھتیجوں نے خوب
اچھل کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ لیکن اُس کے دل میں ابھی ایک کسک تھی جو اُسے کسی پل
ٹیس دیتی تھی۔ اور وہ تھی گم شدہ ماریا کی یاد۔

اُس نے ماریٰ کے ساتھ سدا ایک ساتھ رہنے کے عہد و پیمان کئے تھے۔ اور
ماریٰ کے بغیر اُسے یوں لگتا تھا جیسے ساری کی ساری دنیا ویران پڑی ہے۔ بالآخر
واپسی سے تیسرے روز اُس نے سلطان سے مل کر اجازت لینے کا فیصلہ کیا اور
تیاری کرنے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ اجازت ملتے ہی ذرا سی دیر کئے بغیر وہ البانیہ کی
روانہ ہو سکے۔

وہ سہ پہر کے بعد گھر سے نکلا تا کہ بعد از نمازِ مغرب سلطان کو اُس کے محل
سکے۔ وہ اپنے مخصوص گھوڑے پر سوار ادرنہ کے بڑے بازار سے گزر رہا تھا اور دل
میں یہ دُعا کر رہا تھا کہ سلطان اُسے فی الفور البانیہ جانے کی اجازت دے دے۔
سے سلطانی لشکر واپس لوٹا تھا، ادرنہ کے بازاروں میں بھیڑ بڑھ گئی تھی۔ عیسائی لشکر
چھینا گیا مالِ غنیمت اناج، گھوڑے، تلواریں، لباس اور نہ جانے کیا کیا ادرنہ کے با
میں فروخت ہو رہا تھا۔ لیکن قاسم ہر چیز سے بے نیاز ماریٰ کے بارے میں سوچتا
بلب گزرتا چلا جا رہا تھا۔ اچانک اُسے ایک چوک پر پوری قوت کے ساتھ اپنے گھوڑ
لگامیں کھینچ لینی پڑیں۔ اُس کی آنکھیں حیرت سے اُبل پڑیں اور منہ کھلے کا کھلا رہ گیا
کے سامنے مارتھا کی ادھیڑ عمر خادمہ کھڑی تھی۔

وہی خادمہ جو مارتھا کے قتل کی چشم دید گواہ تھی۔ ادھیڑ عمر خادمہ زندہ بچ گئی تھی
کے گھر سے بے گھر ہونے کے بعد اب تک وہ ماری ماری پھر رہی تھی۔ لوگ اُسے
سمجھ کر کھانے پینے کو کچھ دے دیتے اور وہ جامعہ مسجد کے دروازے پر سو رہتی۔ قاسم
پہچانتا تھا۔ اُس نے ادھیڑ عمر خادمہ کو دیکھا تو کود کر گھوڑے سے نیچے اُتر آیا اور
تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا ایک خوانچہ فروش کے نزدیک کھڑی مفلوک الحال خادمہ کے
گیا۔ پہلے کچھ دیر تو خادمہ قاسم کو پہچان ہی نہ سکی۔ اور پھر جونہی اُس کی آنکھو
شناسائی کی چمک نظر آئی، وہ چیخ مار کر قاسم کے قدموں میں گر پڑی۔ اب وہ ہاتھ
رہی تھی۔ قاسم نے سرِ بازار خود کو تماشہ بنتے دیکھا اور خادمہ کو شانوں سے پکڑ کر اُٹھا
ماریٰ کی خادمہ کو اپنے ہمراہ لے جانا چاہتا تھا۔ اب اُس نے سلطان سے ملنے
ملتوی کر دیا تھا۔ اُس نے سوچا کہ ماریٰ کی خادمہ کی سرِ راہ ملاقات یقیناً قدرت
ہے۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ پہلے ماریٰ کی خادمہ سے واردات کی تفصیل دریافت
جائے۔ وہ ماریٰ کی خادمہ کو کرائے کی سواری میں سیدھا گھر لے کر آ گیا۔ سورج
گود میں لوریاں سننے کے لئے جانے والا تھا۔ جب قاسم اپنے گھر میں داخل ہوا

سب موجود تھے۔ سب سے پہلے قاسم کی بھابھی نے ادھیڑ عمر خادمہ کو دیکھا اور حیرت سے
اپنے ہاتھ کا کام چھوڑ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ قاسم نے سنجیدہ چہرے سے بھابھی کی جانب
دیکھا اور کہا۔

"یہ غزالہ کی خادمہ ہے۔ غزالہ کے اغواء سے لے کر اب تک ماری ماری پھر رہی
ہے۔ آج کے بعد یہ یہیں رہے گی۔ گھر کے کام کاج میں آپ کا ہاتھ بٹائے گی۔"

لیکن قاسم کی بات سن کر تیزی سے آگے بڑھی اور ماریٰ کی خادمہ کو گلے سے لگا لیا۔
ماریٰ کی خادمہ قاسم کی بات کے بعد پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ قاسم کو دیکھ رہی تھی۔
اس کے ہونٹ کچھ کہنے کے لئے ہلنا چاہتے تھے لیکن یوں لگتا تھا جیسے کسی نادیدہ قوت نے
اس کو بولنے سے روک دیا ہو۔ پھر اُس کے ہونٹوں سے بمشکل چند الفاظ ادا ہوئے۔

"یہ..... یہ غزالہ کون ہے؟ کیا آپ ماریٰ بی بی کو غزالہ کہتے ہیں؟ اگر آپ سمجھتے ہیں
کہ ماریٰ بی بی اغواء ہوئی ہے تو آپ کو بہت بڑی غلط فہمی ہے۔"

اتنا کہہ کر خادمہ خاموش ہو گئی اور قاسم کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ تو کیا ماریٰ
نہیں ہوئی؟ اگر وہ اغواء نہیں ہوئی تو وہ کہاں گئی؟ قاسم کا دل زور زور سے دھڑکنے
وہ دل ہی دل میں بڑی تیزی کے ساتھ دُعائیں مانگنے لگا کہ کاش ماریٰ خیر خیریت سے
لیکن خادمہ کی بات سے اُس کا رنگ فق ہو چکا تھا۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ خادمہ کوئی
اخبر سنانے والی ہے۔ اُس نے ہمت کر کے پوچھا۔

"کک..... کیا مطلب؟ تم کیا کہنا چاہتی ہو..... ماریٰ اغواء نہیں ہوئی تو کہاں گئی؟"

لیکن خادمہ قاسم کو جواب دینے کی بجائے دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ خادمہ کی
آہ و بکا سن کر قاسم کا باپ ہشام، اُس کا بھائی، اُس کی ماں، حتیٰ کہ اُس کے ننھے بھتیجے بھی
جمع ہو گئے۔ خادمہ ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ سب گھر والوں نے مل کر اُسے بمشکل
چپ کروایا اور ماریٰ کے بارے میں دریافت کیا۔ خادمہ نے ہچکیوں بھری آواز میں کہا۔

"ماریٰ بی بی بھی اپنی ماں کے ساتھ چلی گئی ہے۔"

"یہ جھوٹ ہے..... اگر ایسی بات ہے تو اُس کی ماں کی اکیلی نعش کیوں ملی ہے؟" قاسم
کے بھائی نے جذباتی ہو کر پوچھا۔ خود قاسم تو گم سم کھڑا تھا۔ قاسم کی ماں اور بھابھی نے
بھائی کی بات دہرائی۔ تب خادمہ نے کہا۔

"میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ماریٰ بی بی نے اپنی ماں کے قتل کے بعد حملہ
آور کا خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اور پھر جب تھک گئیں تو اپنی آبرو بچانے کے لئے اپنی

تلوار اپنے پیٹ میں گھونپ لی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ماری بی بی کے لہو
اُن کا پورا جسم لت پت ہو رہا تھا اور وہ آخری ہچکی لے کر اپنی ماں کے پاس چلی گئی تھی
..... پھر ابوجعفر اور اُس کے ساتھی نے ماری بی بی کی نعش کو اٹھایا اور اپنے ساتھ لے
باہر اُن کا ایک ساتھی بھی موجود تھا۔ میں نے یہ سارا سانحہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے
میں اس سانحے کے بعد آپ کے گھر آنا چاہتی تھی۔ لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ
رہتے ہیں۔ میرے اندر محل میں جانے کی جرأت نہ تھی۔ میں نے بازار میں بہت
لوگوں سے آپ کا پتہ پوچھا لیکن مجھے کسی نے کچھ نہ بتایا۔"

قاسم کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں اور ایک طرف دیوار سے لگ کر کھڑا تھا۔ جبکہ اُس
ماں اور بھابھی خادمہ کی باتوں کے ساتھ ساتھ آنسو بہا رہی تھیں۔ طاہر کے پاس اب
کے لئے کچھ نہ تھا۔ اتنے میں بوڑھے ہشام کی بارُعب آواز گونجی۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اُس وقت غزالہ بے ہوش ہو۔ اور وہ اسی لئے اُسے اُٹھا
لے گئے ہوں۔ اگر وہ شہید ہو گئی ہوتی تو وہ لوگ اُسے اٹھا کر ہی کیوں لے جاتے۔"

لیکن ماری کی خادمہ نے زور زور سے نفی میں سر ہلایا اور کہا۔ "نہیں نہیں!! ماری
کی گردن ڈھلک چکی تھی۔ اور پھر انہوں نے جس طرح اپنے آپ کو تلوار گھونپی تو اس
صاف ظاہر تھا کہ وہ اگر بچ بھی جاتیں تو ہوش میں آتے ہی خود کو پھر ختم کر لیتیں۔
یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ ماری بی بی بھی شہید ہو چکی ہیں۔"

قاسم کو تو جیسے سکتہ سا ہو گیا تھا۔ وہ سب کو اُن کے حال پر چھوڑ کر دوسرے کمرے
آ گیا۔ ماری اُس کی محبت تھی۔ وہ اور ماری کچھ ہی دنوں بعد ایک ہونے والے تھے
کو اُس کے ساتھ گزرا ہوا ایک ایک لمحہ یاد آنے لگا۔ اُس کے دل کو یقین نہ آ رہا تھا
ماری مر چکی ہو گی۔ لیکن یقین کرنے کے سوا اب اُس کے پاس چارہ بھی تو نہیں
ابوجعفر نے جھوٹ بولا تھا کہ ماری زندہ ہے۔ قاسم دیر تک یہی سوچتا رہا۔ اُسے ابوجعفر نے شدید
بتایا تھا کہ ماری کو البانیہ بھیج دیا گیا ہے۔ قاسم نے سوچا کہ شاید ابوجعفر نے شدید
کے ڈر سے ماری کی شہادت کا ذکر نہ کیا ہو گا۔

قاسم دیر تک انتہائی دُکھی دل کے ساتھ ماری کی موت و حیات کے بارے میں
رہا۔ اب تو اُسے بھی ایسے لگنے لگا تھا جیسے ماری اُس سے بہت دُور چلی گئی ہو۔
گھر والے اُس کے پاس آئے، بیٹھے، اُسے دلاسہ دیا اور چلے گئے۔ اُس کی ماں
اور بھائی سب آئے لیکن اُسے کسی کے آنے جانے کی خبر نہ ہوئی۔ وہ ماری کی یا

ابوجعفر کے زندہ بچ جانے پر اپنے ہی دل کو نوچ نوچ کر کھاتا رہا۔ آج کی رات گزارنی
اس کے لئے مشکل ہو گئی۔ وہ رات بھر جاگتا رہا اور ماری کے بارے میں ہی سوچتا رہا۔

اگلے دن اُس نے آغا حسن کے ساتھ مل کر ماری کے بارے میں نئی اطلاع پر گفتگو
کی۔ اب وہ چاہتا تھا کہ کسی عقلمند اور وفادار ساتھی کو البانیہ بھیج کر ماری کے بارے میں
معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اُسے ایک موہوم سی اُمید تھی کہ ہو سکتا ہے ماری
زندہ ہو۔ اُس نے اپنے دوست آغا حسن کو تمام کہانی سنائی اور پھر اُس کے مشورے سے
ینی چری کے ایک وفادار سپاہی "ابراہیم" کو البانیہ کی جانب روانہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

چند دن بعد ابراہیم بھیس بدل کر البانیہ کے سفر پر روانہ ہو چکا تھا۔ اس دوران قاسم کو
سلطان سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ لیکن آج جب اُس نے یہ سنا کہ سلطان نے ایک
مرتبہ پھر شہزادہ محمد کو تخت نشین کر کے گوشہ نشینی اور زہد و عبادت کا فیصلہ کیا ہے تو وہ سلطان
سے ملنے کے لئے محل میں چلا گیا۔ آج اُس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ شہزادہ محمد سے بھی
ملاقات کرے گا۔ لیکن سب سے پہلے وہ سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سلطان نے
اسے جلد باریابی کی اجازت دے دی۔ قاسم جب سلطان کے کمرۂ ملاقات میں حاضر ہوا تو
اسے سلطان کے نورانی چہرے پر ایک عارفانہ سی مسکراہٹ دکھائی دی۔ اُس نے انتہائی
ادب کے ساتھ سلطان کی خدمت میں سلام عرض کیا اور خاموش کھڑا ہو گیا۔ سلطان نے
قاسم کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہم تو سمجھ رہے تھے کہ قاسم بن ہشام ہمیں فراموش کر چکا ہے۔ لیکن تمہاری آمد بتاتی
ہے کہ ہم ابھی تک بھی تمہیں یاد ہیں۔" سلطان کے لہجے میں چھپا پیار بھرا طنز قاسم محسوس
کئے بغیر نہ رہ سکا اور اُس نے انتہائی لجاجت کے ساتھ کہا۔

"نہیں سلطانِ معظم! خدا میری زندگی میں وہ دن نہ لائے کہ میں آپ جیسے محسن
انسانیت کو بھول جاؤں..... میں دراصل ہر روز قدم بوسی کے لئے حاضر ہونا چاہتا تھا۔ لیکن
ہر بار بدنصیبی آڑے آتی رہی۔ آج سلطانِ معظم کی دوبارہ خلوت نشینی کا سنا تو بدنصیبی کو
دھتکار کر حاضر خدمت ہو گیا۔"

"بہت خوب! دولت غم نے تمہیں حسن گفتگو سے مالا مال کر دیا ہے۔"

"دولت غم؟..... میں نالائق، سلطانِ معظم کا حسن کنایہ سمجھ نہیں پایا۔"

"ہمارا مطلب ہے البانوی کنیز کی بیٹی ماری کی گمشدگی نے تمہیں کافی مضمحل کر دیا
ہے۔ اسی کو ہم دولت غم کہہ رہے ہیں۔"

سلطان کا اشارہ سن کر قاسم نے سر جھکا لیا اور سلطان دو قدم آگے بڑھا۔ اُس نے قاسم کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''قاسم بن ہشام! تم ہمارے بیٹوں جیسے ہو۔ یاد رکھو، ہم تمہاری طرف سے بے خبر نہیں ہیں۔ ہم نے محاذِ جنگ سے لوٹتے ہی اپنے ایک خاص قاصد کو سکندر بیگ کی جانب روانہ کر دیا ہے۔ سکندر بیگ ہمارے ایلچی سے ذاتی طور پر واقف ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ وہ ہماری بات کو نہیں ٹھکرائے گا کیونکہ ہم نے اُسے اپنے بیٹوں سے بڑھ کر پیار اور محبت دیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اُس نے بغاوت کی ہے، لیکن ہم اُس کی بغاوت کو ایک لاڈلے بیٹے کی ضد سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔''

''لیکن سلطانِ معظم! سکندر بیگ نے صرف بغاوت ہی نہیں کی، اُس نے اپنا مذہب بھی بدل لیا ہے۔ بالفاظِ دیگر وہ مُرتد ہو چکا ہے۔''

''ہاں! ہم یہ بھی جانتے ہیں۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن ہماری شفقت پدری کو یاد کر کے ضرور لوٹ آئے گا۔ ہم نے اُس کو اپنی محبت کی کچھ نشانیاں بھیجی ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ وہ البانوی کنیز کی بیٹی کو ہمارے احسانات کے بدلے واپس کر دے گا۔''

لیکن قاسم کو ذرا بھی یقین نہ تھا کہ سکندر بیگ سلطان کی بات مان کر ماریا کو واپس کر دے گا۔ اوّل تو اُسے ماریا کے زندہ ہونے کا بھی یقین نہ تھا۔ لیکن پھر بھی اُس نے سلطان کا شکریہ ادا کیا اور کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔

''سلطانِ معظم! شہزادہ محمد ابھی کم عمر ہیں۔ اور سلطنت کے دشمن ہر وقت تاک میں بیٹھے ہیں۔ میں سلطانِ معظم کی خدمت میں اس لئے حاضر ہوا تھا کہ پاسبانِ ملت کی نئی چری کے سپاہیوں کی طرف مبذول کراؤں جو گزشتہ کئی دنوں سے پھر تنخواہوں کی تذکرہ لے بیٹھے ہیں۔ سلطانِ معظم! مجھے تو یوں لگتا ہے کہ اور نہ میں پھر کوئی سازش چڑھ چکی ہے۔ اور خصوصاً قیصرِ قسطنطنیہ نے اس سازش کا جال بھی سلطانِ معظم کی موجودگی میں پھیلانے کی کوشش کی ہے۔''

قاسم نے سلطان کی خلوت نشینی سے پیدا ہونے والے خدشات کا ذکر اور تازہ حالات کی تفصیل سلطان کے سامنے پیش کر دی۔ لیکن اس مرتبہ سلطان نے چونکنے بجائے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''تم فکر مت کرو۔ ہمیں تنخواہوں کے مطالبات کی اطلاع مل چکی ہے اور ہم نے چری کے سپاہیوں کی تنخواہیں بڑھانے کا حکم بھی جاری کر دیا ہے۔ لیکن پریشان ہو

ضرورت نہیں۔ یہ مطالبات کسی سازش کے نتیجے میں نہیں آئے۔ بلکہ ایک مدت سے سپاہیوں کے اس مطالبہ کی ہمیں اطلاع دی جاتی رہی ہے۔''

لیکن سلطان کی تسلی سے سلطان خود مطمئن ہو تو ہو، قاسم مطمئن نہیں تھا۔ اُسے یوں لگتا تھا جیسے قیصر کے جاسوس ابھی تک ادرنہ میں چھپے ہوئے ہیں۔ وہ کچھ اور دیر بھی سلطان کے پاس رہا۔ اس دوران سلطان نے اُسے بتایا کہ وہ ایک بار پھر ایدین کی فضاؤں میں اپنے معمولات میں مشغول ہونے کے لئے جا رہا ہے۔ یہ سلطان کا فیصلہ تھا اور قاسم اُسے روکنے کے لئے کچھ نہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ وہ چپ رہا۔ واپسی پر قاسم، شہزادہ محمد سے بھی ملا اور باقی کا تمام دن وہ تقریباً ایک ساتھ رہے۔

چند دن بعد سلطان ''ایدین'' کی خانقاہ میں جا چکا تھا اور شہزادہ محمد ایک مرتبہ پھر سلطان محمد خان بن کر تختِ حکومت پر جلوہ افروز تھا۔ ادرنہ میں خوب چہل پہل تھی۔ نئے سلطان کی تخت نشینی کے موقع پر جشن تاج پوشی کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ گزشتہ فتوحات نے سلطنت عثمانیہ کے باشندوں کو پھر سے باغ و بہار کر دیا تھا۔ ادرنہ کی گلیاں اور بازار خوب سجے ہوئے تھے۔ دُور دراز کے مسافر اور سوداگر اپنا اپنا مال و متاع لئے ادرنہ پہنچ آئے تھے۔ روزانہ علی الصبح جب شہر کے دروازے کھلتے تو سوداگروں اور مسافروں کا تانتا بندھ جاتا۔ جانے والوں سے زیادہ تعداد آنے والوں کی ہوتی۔ دروازے کے سپاہی دن بھر رنگا رنگ کے لوگوں کو دیکھتے۔ قاسم بھی روزانہ علی الصبح نئی چری کے معسکر جانے کے لئے فصیل کے دروازے سے گزرتا۔ ایک روز وہ اپنے وقت پر اُسی دروازے سے گزر رہا تھا کہ اُس کی نظر یورپ کی جانب سے آنے والے ایک قافلے پر پڑی۔ قافلہ نہ بہت بڑا تھا اور نہ چھوٹا... یہ قافلہ بھی سوداگروں کا ہی معلوم ہوتا تھا۔ فصیل سے باہر سامان سے لدے اُونٹ قطار میں بیٹھے تھے اور قافلے میں شامل مرد و خواتین نیچے زمین پر جگہ جگہ چٹائیاں بچھا کر کھانے پینے میں مشغول تھے۔ قاسم نے قافلے کے قریب سے گزرتے ہوئے ازراہِ طلوت ایک سوداگر سے پوچھا۔

''بھائی صاحب! یہ قافلہ کس ملک سے آیا ہے؟''

''ہمارا قافلہ سربیا کی سرحدات سے آیا ہے۔''

قاسم نے رُکے بغیر یہ سوال کیا تھا۔ اور پھر اپنے گھوڑے کی لگامیں ڈھیلی چھوڑ دی تھیں۔ لیکن سربیائی سرحدات کا ذکر سنتے ہی نہ جانے کیوں اُس کے ذہن میں بوسنیائی شہزادی کی تصویر گھومنے لگی۔ قاسم کا گھوڑا اپنی رفتار سے دوڑتا ہوا معسکر کی جانب اُڑا چلا جا

رہا تھا۔

سربیائی سرحدات سے آنے والا قافلہ اندرنہ پہنچتے ہی منتشر ہونے لگا تھا۔ قافلے میں شامل ہر فرد اپنی اپنی منزل کی جانب چل دیا تھا۔ لیکن دو اجنبی عورتیں اور ایک بوڑھا مرد ابھی تک شش و پنج میں مبتلا تھے۔ اندرنہ میں اُن کو جاننے والا ایک ہی شخص تھا اور وہ تھا قاسم بن ہشام۔ کیونکہ یہ دونوں عورتیں حمیرا اور مریم تھیں اور بوڑھا مرد عباس تھا۔

یہ لوگ لشکر کی روانگی سے 23 ویں روز بوسنیا سے تو چل پڑے تھے لیکن سوداگروں کا قافلہ جس کے ہمراہ انہیں اندرنہ آنا تھا، دیر سے روانہ ہوا ورنہ یہ لشکر کے فوراً بعد پہنچ جاتے۔ آج صبح قاسم اس قافلے کے بالکل قریب سے گزرا تھا۔ اُس نے ایک سوداگر سے قافلے کی بابت سوال بھی کیا تھا۔ لیکن اُس کا سامنا حمیرا سے نہ ہو سکا تھا۔

کافی دیر سوچ بچار کرنے کے بعد عباس نے شہر کی جانب چلنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ حمیرا اور مریم نے چادریں اوڑھ رکھی تھیں جن کے پلوؤں سے انہوں نے اسلامی پردہ کر رکھا تھا۔ وہ لوگ فصیل کے بڑے دروازے سے شہر میں داخل ہوئے اور بغیر کسی سے کچھ پوچھے اندرون شہر کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ ان کے پاس نہ تو کوئی سواری تھی اور نہ ہی بہت زیادہ ساز و سامان تھا۔ شہزادی کے پاس کچھ ہیرے جواہرات اور باقی زیورات تھے۔ اسی طرح عباس اور مریم بھی اپنے گھر کا قیمتی سامان ساتھ لے کر روانہ ہوئے تھے۔ انہوں نے سوچا تھا کہ وہ اپنا قیمتی سامان فروخت کر کے اندرنہ میں مکان اور کسی کاروبار کا بندوبست کر لیں گے۔ عباس نے تو کہا تھا کہ وہ لوگ قاسم کی مدد سے اندرنہ میں قیام پذیر ہونے کا وسیلہ تلاش کریں گے۔ لیکن شہزادی حمیرا نے ایسا کرنے سے منع کر دیا تھا۔ نہ جانے اُس کے دل میں کیا تھا۔ حالانکہ وہ چاہتی تو قاسم کی مدد سے یہاں شاہی مہمان بن سکتی تھی۔ آخر وہ بوسنیا کی شہزادی تھی۔ لیکن شاید اُس نے شہزادگی سے زیادہ سادہ زندگی کو ترجیح دی تھی۔

وہ لوگ شہر کے بڑے بازار میں کافی دیر تک چلتے رہے اور بالآخر عباس نے ایک سرائے کے سامنے پڑاؤ ڈال دیا۔ اب وہ حمیرا کو استفہامیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"بیٹی، میرا خیال ہے کہ ہم اسی سرائے میں قیام کر لیتے ہیں۔ ہمیں سرائے میں تو کئی دن رہنا ہی پڑے گا۔"

حمیرا نے ایک نظر سرائے کی عمارت پر ڈالی اور پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے چچا جان!..... جیسے آپ مناسب سمجھیں۔"

کچھ دیر بعد وہ سرائے کے منشی کے پاس اپنی اقامت کا اندراج کروا رہے تھے۔ یہ سرائے شہر کے وسط میں تھی۔ سرائے کے ایک ملازم نے ان کا سامان اٹھایا اور انہیں اُن کا کمرہ دکھانے کے لئے ساتھ چل پڑا۔ یہ کمرہ ایک وسیع اور ہوا دار "غرفہ" تھا۔ کھڑکیوں پر پردے لٹکے ہوئے تھے اور فرش کے وسط میں فرشی بستر لگے ہوئے تھے۔ عباس نے سوچا، خواتین کی رہائش کے لئے یہ کمرہ مناسب نہیں۔ یہ لوگ کمرے میں داخل ہوئے اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

ابھی یہ لوگ پوری طرح بیٹھ بھی نہ پائے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ دونوں لڑکیوں نے چونک کر دروازے کی جانب دیکھا۔ عباس اٹھا اور دروازے کی چٹخنی گرا دی۔ سامنے ایک ادھیڑ عمر شخص کھڑا تھا جس کے چہرے پر معصومی ثبت تھی۔ وہ انتہائی سادہ نظروں سے بوڑھے عباس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ عباس کے لئے اس شخص کی آمد انتہائی غیر متوقع تھی۔ اس سے پہلے کہ عباس اُس سے کچھ پوچھتا وہ بول پڑا۔

"محترم بزرگ!..... کیا آپ کا نام "بارٹا کوزین" ہے؟ میں آپ کو پہچانتا ہوں۔"

اجنبی کے منہ سے اپنا نام سن کر بارٹا کوزین جو اب عباس تھا..... حیرت زدہ رہ گیا۔ حمیرا اور مریم کے بھی کان کھڑے ہو گئے۔ لیکن اجنبی نے مزید دیر نہ کی اور پھر کہا۔

"دیکھئے آپ گھبرائیے مت!..... یہ دنیا ہے..... یہاں انسان ایک دوسرے سے مل ہی جاتے ہیں۔ دراصل آپ پہچان نہیں سکے۔ میں اربان ہوں..... ہنگری کا آہن گر۔ میں کریٹ سے یونان تک آپ کے ساتھ جہاز میں سفر کیا کرتا تھا۔ آپ ہمارے جہاز میں کپتان تھے۔"

عباس کو یوں لگا جیسے وہ ایک دم خواب سے بیدار ہو گیا ہو۔ اُسے سب کچھ یاد آ گیا۔ اُسے یہ بھی یاد آیا کہ اربان کے ساتھ جہاز کے عرشے پر خوب محفل جمتی تھی اور سارے جہان کی باتیں خیر بحث آتی تھیں۔ عباس نے تیزی سے دروازے کے پٹ کھولے اور آگے بڑھ کر اربان کو گلے سے لگا لیا۔ اب حمیرا اور مریم کے چہروں پر بھی مسکراہٹ نظر آ رہی تھی۔

آہن گر اربان ابھی تک اسی سرائے میں رہ رہا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جو ایک روز قاسم کے ساتھ اسی سرائے میں ٹکرا گیا تھا اور قاسم نے اُس کے ساتھ دوبارہ ملاقات کا وعدہ کر کے اجازت مانگی تھی۔ لیکن قاسم اپنی گوناگوں مصروفیات کی بدولت اب تک یہاں دوبارہ نہ آ سکا تھا۔ یہی وہ شخص تھا جو لوہے کی ڈھلائی کا فن جانتا تھا۔ اس زمانے میں لوہے کی

ڈھلائی آسان کام نہ تھا۔ بہت کم لوگ ڈھلائی کا کام جانتے تھے۔ باقی تمام آہن گر
درحقیقت لوہار ہوا کرتے تھے جو لوہا گرم کر کے ہتھوڑے سے کوٹتے اور آلات بناتے
اربان بڑی بڑی کھٹالیاں بنانے کا فن بھی جانتا تھا جن میں لوہے کو پگھلایا جاتا تھا۔
درحقیقت ایک حکیم اور سائنسدان تھا۔ اسی زمانے میں گندھک کے استعمال سے بارود
استعمال ہوا تھا۔ لیکن ابھی تک بارود کے لئے استعمال ہونے والا اسلحہ کم ہی بنایا جاتا تھا
اربان نے جنگی مقاصد کے لئے ایک خاص قسم کی منجنیق کی ترکیب سوچ رکھی تھی جو بارود
بڑے سے بڑا گولا بہت زیادہ قوت کے ساتھ پھینک سکتی تھی۔ یہی اربان عباس کا پرا
شناسا تھا۔ اُسے معلوم نہ تھا عباس اسلام قبول کر چکا ہے۔ وہ عباس کو ابھی تک بارٹا کوریو
ہی سمجھ رہا تھا۔ عباس اور اُس کی ہمراہی لڑکیاں جب پاس کے کمرے میں داخل ہو رہی تھیں
تو اربان نے عباس کو دیکھ لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اب اُس سے ملنے کے لئے چلا آیا تھا۔
عباس نے اُسے بڑے پُرجوش انداز میں کمرے کے اندر بلا لیا اور اپنی بیٹی کی طرف
اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ میری بیٹی ہے مریم..... اور یہ ہیں ہماری شہزادی حمیرا.....“

”مریم؟..... حمیرا؟..... کیا آپ نے اسلام قبول کر لیا ہے؟“ اربان نے حیرت سے
سوال کیا۔

عباس مسکرایا اور کہنے لگا۔ ”الحمدللہ!..... اب میرا اسلامی نام ”عباس“ ہے..... ہم اپنا
چھوڑ آئے ہیں۔ اب ہم یہیں رہیں گے۔“

لیکن اربان نے عباس کی یہ بات غور سے نہ سنی تھی۔ اُس نے شہزادی حمیرا کی جا
دیکھتے ہوئے کہا۔ ”شہزادی صاحبہ؟..... محترم بزرگ! کیا یہ خاتون شہزادی ہیں؟“

لیکن عباس سے پہلے حمیرا نے جواب دیا۔ ”نہیں معزز مہمان!..... ہمارے
صاحب ہمیں پیار سے کبھی کبھی شہزادی کہہ کر بھی پکارتے ہیں۔“

حمیرا کے جواب سے اربان کی حیرت دُور ہو گئی۔ عباس نے اُسے بیٹھنے کے لئے
اور وہ لوگ ادرنہ سے متعلق باتیں کرنے لگے۔ اربان گزشتہ کئی ماہ سے ادرنہ میں تھا۔
نے یہاں شہر کے سب سے بڑے آہن گر کے پاس ملازمت اختیار کر لی تھی۔ لیکن
تک وہ سرائے میں ہی رہ رہا تھا۔ دراصل سرائے کے مالک کے ساتھ اُس کی راہ و رسم
بڑھ چکی تھی کہ سرائے کے مالک نے اُسے ابھی تک یہاں سے جانے نہ دیا تھا۔
بھی تو کہاں۔ شہر میں ایک اکیلا مرد ایک سرائے میں ہی رہ سکتا تھا۔ اربان آج سے
قبل قسطنطنیہ سے روانہ ہوا تھا۔ اُس کی تمام زندگی آوارہ گردی میں گزری تھی۔

ایک سادہ لوح اور درویش صفت انسان تھا۔ بچپن سے لے کر اب تک اُس نے زندگی کو
بہت قریب سے دیکھا تھا اور دنیا کی کم مائیگی نے اُسے ایک جگہ ٹک کر رہنے سے دلبرداشتہ
کر دیا۔ قسطنطنیہ میں اُس نے کئی سال تک اپنے فن کے کمالات کا مظاہرہ کیا۔ لیکن ایک
دن بیٹھے بٹھائے اُس کے دل میں مسلمانوں کو قریب سے دیکھنے کا شوق چمکا۔ اور وہ ادرنہ
چلا آیا۔ ادرنہ میں پہلے دن ہی اُس کی ملاقات قاسم بن ہشام سے ہو گئی تھی۔ وہ بعد میں
کئی روز تک قاسم کا انتظار کرتا رہا۔ لیکن قاسم جب زیادہ دن نہ لوٹا تو دھیرے دھیرے اُس
کے مراسم اوروں کے ساتھ بھی بڑھنے لگے۔ خصوصاً سرائے کے مالک نے تو اُسے اپنا بھائی
بنا لیا تھا۔

آج اتفاق سے اُسے بوڑھا ملاح نظر آ گیا۔ وہی ملاح جس کے ساتھ ایک مرتبہ
اربان نے کریٹ سے یونان تک کا سفر کیا تھا۔ عباس کو بھی وہ سفر اچھی طرح یاد تھا۔
حالانکہ سفر کا دورانیہ مختصر تھا۔ لیکن اربان کی رنگا رنگ شخصیت نے تمام مسافروں کو اپنا
گرویدہ کر لیا تھا۔ خصوصاً جہاز کا عملہ جس کا کپتان عباس تھا، اربان کے ساتھ بہت بے
تکلف ہو گیا تھا۔ اربان کی بذلہ سنجی سے جہاز کی محفل ہر وقت زعفران رہتی۔ یہی وجہ تھی
کہ آج عباس نے اربان کو پہچانتے ہی تپاک کا اظہار کیا تھا۔ وہ اُسے فوراً اپنے کمرے
میں لے آیا اور اپنی بیٹیوں کے ساتھ بھی ملوا دیا۔ عباس نے اربان سے پوچھا۔

”لیکن بھائی!..... تم یہاں کیا کر رہے ہو اور کب سے مقیم ہو؟“

”مجھے مسلمانوں کا طرزِ زندگی یہاں کھینچ لایا۔ میں گہری نظر کے ساتھ اسلام کا مطالعہ
کر رہا ہوں۔ اور اب تو مسلمان آہن گروں کے ساتھ مل کر میں بارود پھینکنے والی منجنیق
بنانے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

اربان نے اپنے بارے میں بتایا تو بوڑھے عباس نے حیرت سے پلکیں پٹپٹاتے ہوئے
کہا۔ ”بارود پھینکنے والی منجنیق؟..... یہ تو بڑا خطرناک آلہ حرب ہو گا اربان! یہ تم کیا کر رہے
ہو؟ تم تو جنگ و جدل اور خون خرابے کے مخالف تھے۔“

اربان مسکرایا اور خلاء میں گھورتے ہوئے بولا۔ ”میں اب بھی انسانوں کے قتل کی
مذمت کرتا ہوں۔ میں اب بھی یہی چاہتا ہوں کہ ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ
محبت سے پیش آئے۔ لیکن میں نے قسطنطنیہ میں رہ کر دیکھا ہے کہ کچھ لوگ زمین پر امن
قائم نہیں ہونے دیتے۔ میں نے عیسائیوں کے شہنشاہ قیصرِ قسطنطنیہ کی باتیں سنی ہیں۔ وہ
شیطان کا نمائندہ ہے۔ پُرامن بستیوں کو اجاڑنا، مینڈھے لڑوانا اور انسانوں کو قتل کروانا اُس

کا مشغلہ ہے..... قیصر کو دیکھ کر مجھے یقین ہوا کہ امن کے لئے بھی جنگیں ضروری ہیں۔"

حمیرا ارہان کی باتیں بڑی دلچسپی کے ساتھ سن رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں تحسین آمیز رمق تھی۔ وہ پہلی بار ارہان سے مخاطب ہوئی۔

"چچا جان! آپ بارود پھینکنے والی منجنیق کیسے بنائیں گے؟"

"اسے ہم منجنیق نہیں کہیں گے بلکہ "توپ" کہیں گے..... عیسائی دنیا کے کچھ سائنسدان اس قسم کی توپیں بنا رہے ہیں۔ لیکن جو خاکہ میرے ذہن میں ہے وہ ہماری توپ کو دنیا کی پہلی باقاعدہ توپ بنا دے گا۔ (دولت عثمانیہ) ..... میں کھلی گندھک کی بجائے بارود کا گولہ بنانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس گولے سے مضبوط ترین فصیل کو بھی توڑا جا سکے گا۔"

"پھر تو آپ کو سلطان سے ملنا چاہئے تھا..... سلطان یقیناً آپ کی بہت قدر کرے گا۔"

"میں سلطان سے ملنا چاہتا ہوں۔ لیکن اس سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ اپنی توپ کا ایک چھوٹا سا نمونہ تیار کر لوں۔ اسی لئے میں ایک آہن گر کے ساتھ کام کر رہا ہوں۔ اس کا تو میرا نمونہ تقریباً تیار ہے۔ اور میں جلد ہی سلطان سے ملنے کی کوشش کروں گا۔"

بوڑھے عباس نے بھی ارہان کو اپنی اور نہ میں آمد کا مقصد بتایا۔ اُس نے بتایا کہ لوگ اب اور نہ میں ہی رہیں گے اور اپنے مسلمان بھائیوں کے درمیان باقی ماندہ زندگی بسر کریں گے۔ پھر وہ دیر تک اپنے آئندہ لائحہ عمل سے متعلق باتیں کرتے رہے۔

چند دن بعد بوڑھا عباس اپنی دونوں بیٹیوں یعنی شہزادی حمیرا اور مریم کے ہمراہ اور کے ایک محلے میں منتقل ہو گیا۔ ارہان بھی اُن کے ساتھ تھا۔ شہزادی حمیرا کے پاس کے قیمتی زیورات تھے۔ جنہیں بیچ کر انہوں نے سرائے کے مالک کی مدد سے خوبصورت مکان خریدا۔ بوڑھے عباس نے وسیلہ روزگار کے طور پر انہی پیسوں سے موٹا کاروبار شروع کیا۔ ارہان کی تنخواہ بھی اسی گھر میں آنے لگی اور یوں یہ لوگ اور نہ کی رہائش پذیر ہو گئے۔ ارہان نے ابھی تک باقاعدہ طور پر اسلام قبول نہ کیا تھا۔ لیکن الحقیقت وہ دل سے مسلمان ہو چکا تھا۔

اسی اثناء میں سلطان مراد خان ثانی دوسری مرتبہ گوشہ نشین ہو گیا۔ اُس نے اپنے بیٹے شہزادہ محمد کو پھر تخت نشین کیا۔ قاسم کو اُس کا خاص مشیر مقرر کیا اور خود دوبارہ "ایدرنہ" چلا گیا۔ اب حالات کی صورت بڑی عجیب تھی۔ قاسم کو کسی حد تک یقین ہو چلا تھا کہ اس شہید ہو چکی ہے۔ بوسنیا کی شہزادی قاسم کی شخصیت سے مسحور ہو کر اُس کے پیچھے اور رہنے لگی تھی۔ لیکن اُس نے اپنے آپ کو ظاہر نہ کیا تھا۔ ہونیاڈے، شاہ لارڈ سلاناس

کے بعد ہنگری کا تخت خود سنبھال چکا تھا۔ سلطان درویشوں کی محفل میں جا بیٹھا تھا اور شہزادہ محمد عثمانی دارالسلطنت میں دوبارہ تخت نشین تھا..... ماریا شہید نہ ہوئی تھی اور زندہ سلامت سکندر بیگ کے محل میں پہنچ چکی تھی۔ جبکہ طبیب سلیم پاشا ابھی تک ادرنہ میں مقیم تھا اور اُس کے جاسوس ہونے کا راز کسی کو معلوم نہ تھا۔

جونہی سلطان دوبارہ گوشۂ عزلت میں جا بیٹھا اور نوعمر شہزادہ تخت نشین ہوا، سلیم پاشا کا کام پھر آسان ہو گیا۔ اب ابوجعفر تو ادرنہ میں نہ تھا لیکن سلیم پاشا کو ابوجعفر کی ضرورت بھی نہ تھی۔ اُس نے ابوجعفر سے زیادہ تیزی دکھائی اور سلطان کی عدم موجودگی سے فائدہ اُٹھا کر ینی چری میں پھر سے بغاوت کا بیج بو دیا۔ اُس نے مدتوں پرانا تنخواہوں کا مسئلہ پیدا کر کے نوجوان سپاہیوں میں شرارت کی آگ لگا دی۔ یہ آگ جنگل کی آگ کی طرح پھیلی اور اس نے دیکھتے ہی دیکھتے پوری سلطنت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یہ 1445ء کے آغاز کا واقعہ ہے۔

سلیم پاشا کو بغاوت پھیلانے میں اس لئے بھی آسانی میسر آئی کہ ابوجعفر گزشتہ بیس سالوں سے اسی سازش کے تانے بانے بنتا رہا تھا۔ سپاہیوں کی بغاوت سے عثمانی سلطنت لرز کر رہ گئی۔ نوعمر سلطان محمد خان بوکھلا گیا۔ شہر میں باغیوں نے بلوائیوں کا رُوپ دھار لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہنستے بستے خوشحال ادرنہ کو ایک دہشت زدہ شہر بنا دیا۔ ہر طرف بلوائیوں کے جتھے قتل و غارت کرنے لگے اور جگہ جگہ سرکاری املاک کو نذرِ آتش کیا جانے لگا۔ یہ صورتحال سلطان محمد خان کے لئے انتہائی پریشان کن تھی۔ اُسے کچھ سجھائی نہ دیتا تھا کہ وہ اس بغاوت پر کیسے قابو پائے۔ بہرام خان شہر بھر میں دوڑ دوڑ کر تھک گیا تھا۔ لیکن وہ اس سازش کے سرغنہ کو نہ پکڑ سکا۔ کوتوالِ شہر بھی جگہ جگہ چھاپے مار رہا تھا لیکن بات تھی کہ بنتی نظر نہ آتی تھی۔ اس مرتبہ قاسم بھی کچھ نہ کر سکا۔ کیونکہ اب وہ شاہی سراغ رساں نہیں تھا بلکہ ماریا کی جدائی نے اُسے ذہنی طور پر مفلوج کر رکھا تھا.....

کئی روز گزر گئے۔ اور بلوائی شہر میں لوگوں کے جان و مال کو نقصان پہنچاتے رہے۔ ناچاری ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگی اور سلطنت عثمانیہ کی سالمیت کو ایک مرتبہ پھر خطرات لاحق ہو گئے۔ امراء سلطنت نوعمر سلطان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اُسے ایک مرتبہ پھر سلطان مراد خان ثانی کو واپس بلانے پر آمادہ کر لیا۔ اس مرتبہ بھی نوعمر سلطان نے قاسم بن ہشام کو یہ ذمہ داری سونپی..... لیکن اس مرتبہ قاسم کے ہمراہ خواجہ خیری کی بجائے اُس کا بھائی طاہر بن ہشام تھا۔ سلطان محمد خان کا حکم ملتے ہی یہ دونوں بھائی ایدین کی طرف

روانہ ہو گئے۔

یہ جمعہ کا روز تھا۔ لوگ ڈر کے مارے دُبک کر گھروں میں بیٹھے تھے۔ شہر کی گلیوں
نئی چڑی کے باغی دستے دندناتے پھر رہے تھے۔ کبھی کسی گلی سے کوئی جلوس نمودار ہو
نعرے لگاتا، پتھر پھینکتا اور آگ لگاتا چلا جاتا۔ بلوائیوں نے کوتوالِ شہر کو یرغمال بنا لیا تھا
فی الحقیقت ان حالات کی اصل باگ ڈور سلیم پاشا کے ہاتھ میں تھی۔ حالانکہ وہ
ہمہ وقت نوعمر سلطان محمد خان کے نزدیک موجود رہتا۔ وہ صرف شاہی طبیب ہی
عمائدین سلطنت میں بھی اُس کو اچھا خاصا مقام حاصل تھا۔ جس وقت سلطان محمد خان
قاسم بن ہشام کو ایدین کی طرف روانہ کیا، سلیم پاشا وہیں موجود تھا۔ اُس کے لئے
سلطان مراد خان ثانی کو واپس بلایا جا رہا ہے، پریشان کن تھی۔ لیکن قاسم اور اُس کے
کے ایدین روانہ ہونے کی خبر سن کر نہ جانے کیوں اُس کی آنکھوں میں ایک مکار
چمک لہرائی۔ اور پھر جب قاسم طاہر کے ساتھ سلطان کو لانے کے لئے ایدین چلا
سلیم پاشا نے فوراً اپنے خفیہ گماشتوں کو طلب کر کے حکم دیا۔

''قاسم بن ہشام اور طاہر بن ہشام ادرنہ سے جا چکے ہیں۔ تم لوگ اُن کے
دھیان رکھو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ شہر میں پھیلے فتنہ گر اور بلوائی اُن کے اہل خانہ کو کوئی
پہنچا دیں۔'' اُس کے ہونٹوں پر مکارانہ مسکراہٹ تیر رہی تھی اور آنکھوں میں
رقصاں تھی۔ وہ بغاوت کا سرغنہ تھا اور ادرنہ میں ابوجعفر کا نائب تھا۔ اُس کے خفیہ گما
نے اُس کی بات کا مطلب بخوبی سمجھ لیا اور فوراً تعمیل کرنے کے لئے چل کھڑے ہو

سلیم پاشا کے حکم سے تقریباً ایک گھنٹہ بعد بلوائیوں کا ایک دستہ جو لگ بھگ
افراد پر مشتمل رہا ہوگا، نعرے مارتا اور توڑ پھوڑ کرتا ہوا قاسم کے گھر کے سامنے
لوگ ایک طے شدہ منصوبہ کے تحت یہاں آئے تھے۔ سلیم پاشا اپنے دیرینہ دشمن
ہشام کو ایک بہت بڑا دھچکا پہنچانا چاہتا تھا۔ شہر میں ہر طرف ہنگامے اور آتش بازی
رہی تھی۔ ان حالات میں اگر کوئی گروہ قاسم کے گھر پر ہلہ بول دیتا تو شک کس پر
قاسم کے گھر پر موجود افراد خانہ نے گلی میں جلوس کا شور وغل سنا اور یہ سوچ کر
دروازے بند کر لئے کہ بلوائیوں کا گروہ تخریب کاری کی غرض سے گھر میں نہ گھس
چھوٹے بچے عمر اور علی بے خوف وخطر مکان کی چھت پر چڑھ گئے اور گلی میں موجود
دیکھنے لگے۔ قاسم کے بوڑھے باپ ہشام نے عہد رفتہ کو آواز دی اور ننگی تلوار
لے کر اپنی بیوی، بہو اور پوتوں کی حفاظت کے لئے گھر کے بند دروازے کے

ہاں کر کھڑا ہو گیا۔ ماریہ کی ادھیڑ عمر خادمہ بھی اسی گھر میں مقیم تھی۔

بلوائی دروازے پر پہنچے اور دروازے کو دھڑ دھڑانا شروع کر دیا۔ ہشام کے اعصاب
ن ہو گئے اور اُس کے ذہن میں انجانے خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ اُس کا دل کہہ رہا تھا
کوئی سانحہ ہونے والا ہے۔ بلوائی ابھی دروازہ دھڑ دھڑا ہی رہے تھے کہ طاہر کی بیوی
بدحواس دوڑتی ہوئی ایک کمرے میں گئی اور اپنے شوہر کی کمان اور تیروں سے بھرا ترکش اٹھا
ایک دریچے میں جا بیٹھی۔ ہشام کی بیوی اور قاسم کی ماں کو بچوں کا خیال آیا تو وہ دوڑتی
چھت پر گئی اور بچوں کو پکارنے لگی۔ عمر اور علی اب تماشہ دیکھنے کی بجائے خوف کے
م میں ایک پردے کے ساتھ چپک کر سہمے بیٹھے تھے۔ بلوائیوں نے دروازہ دھڑ دھڑاتے
ے..... ''دروازہ کھولو ورنہ توڑ دیں گے۔'' کہنا شروع کر دیا۔ لیکن بوڑھے ہشام کی
دار آواز سن کر ایک مرتبہ تو بلوائیوں کے پورے گروہ کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ ہشام نے
ا تھا۔

''غدارو! دروازہ توڑ کر تم اپنی موت کو آواز دو گے۔ اندر داخل ہونے سے پہلے ہزار
وچ لینا کہ تمہارے سامنے وادیٔ حجاز کا مایہ ناز شمشیر زن ہشام بن عدی کھڑا ہے۔''

لیکن چند ثانیے بعد بلوائیوں کے گروہ میں موجود تین چار نقاب پوشوں نے ہشام کے
کا دروازہ توڑنا شروع کر دیا۔ اب ہشام کے اعصاب پوری طرح تن گئے اور اُس کا
ے سرخ ہو گیا اور وہ سیدھا تن کر کھڑا ہو گیا۔ اسی اثناء میں دروازے کا ایک
ا اور تینوں نقاب پوش بلوائی اندر گھستے چلے آئے۔ لیکن بوڑھا ہشام کسی سیسہ پلائی
دیوار کی طرح اُن کے راستے میں ڈٹ گیا۔ اُس کی تلوار جب جب وار کرنے کے
بلند ہوتی تو اُس کے حلق سے خالص عربی لہجے میں اللہ اکبر کا نعرہ نکلتا۔ اب صورتحال
کہ ایک اکیلا بوڑھا ہشام اپنی لمبی تلوار پر بیک وقت کئی بلوائیوں کو روکے ہوئے تھا۔
کی مجال نہ تھی کہ کوئی ایک قدم بھی آگے بڑھ پاتا۔ قیصر کے جاسوسوں کو محسوس ہونے
رہے تنہا یہ شخص اُن کے ارادوں کو ناکام بنا دے گا۔ ہشام کی ایک تلوار بلوائیوں کی کئی
حملوں کو روکے ہوئے تھی۔ اسی اثناء میں اندرونی کمرے کے دریچے سے سنسناتا ہوا
تیر آیا اور ایک نقاب پوش کی گردن میں پیوست ہو گیا۔ نقاب پوش کسی بیل کی طرح
ا ہوا زمین بوس ہوا ہی تھا کہ ایک اور سنسناتا ہوا تیر بلوائیوں کی طرف لپکا..... ادھر
کی تلوار بھی یکے بعد دیگرے بلوائیوں کے بازو اور گردنیں کاٹ رہی تھی۔ آسمان کی
دیکھ رہی تھیں کہ ہشام کی جوانی پھر سے لوٹ آئی تھی۔ سکینہ دریچے سے تاک تاک

کر ایسے تیر چلا رہی تھی کہ بلوائیوں کے لئے ڈیوڑھی میں جم کر کھڑا رہنا مشکل ہو
قدم بقدم پسپا ہونے لگے۔ یہ دیکھ کر ہشام کی ہمت اور بڑھی اور اُس نے اُچھل کر
نقاب پوش پر کھڑی تلوار کا وار کر دیا۔ نقاب پوش کی گردن کٹ کر دُور جا گری۔ یہ
بلوائیوں کا سردار تھا۔ بلوائیوں نے اپنے سردار کو گرتے دیکھا تو اُلٹے قدموں باہر
اور آن کی آن میں ڈیوڑھی خالی ہو گئی..... اب بوڑھا ہشام اپنی خون آلود تلوار
دروازے میں آ کر کھڑا ہو گیا اور بزدل بلوائیوں کو للکارنے لگا۔ آج اُس نے اپنی
زنی کے وہ جوہر دکھائے تھے کہ اگر اُس کے بیٹے اُسے لڑتا ہوا دیکھ لیتے تو اب بھی
مہارت کا لوہا مان جاتے۔

لیکن بلوائیوں کا خطرہ ابھی دُور نہ ہوا تھا۔ ہشام نے گرے ہوئے دروازے
کو اٹھا کر پھر اُسی جگہ پھنسا دیا جہاں سے وہ گرا تھا اور گھر کے دروازے کو اس طرح
طور پر بند کر دیا۔ ابھی ہشام پوری طرح مطمئن نہ تھا۔ چنانچہ اُس نے مہلت ملتے ہی
اہل خانہ کو پڑوسیوں کے ہاں منتقل کرنے کا ارادہ کیا تا کہ اگر بلوائی دوبارہ حملہ آور
گھر کی خواتین اور بچے محفوظ رہ سکیں۔ لیکن سکینہ نے اپنا مورچہ چھوڑنے سے انکار
اُس نے کہا۔

''ابا جان! میں آپ کے شانہ بشانہ دشمن کا مقابلہ کروں گی۔ ہم امی جان
غزالہ کی خادمہ کو ہمسایوں کے گھر میں بھیج دیتے ہیں۔''

بچے اور ہشام کی بیوی اب نیچے اُتر آئے تھے۔ لیکن اُن کے چہروں پر خوف
کی زردی چھا گئی تھی۔ ہشام کو یہ اچھا نہ لگا۔ اُس نے عمر اور علی سے مخاطب ہو کر
''عمر اور علی!..... ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ دیکھو، تمہارے بوڑھے
سارے دشمنوں کو بھگا دیا۔ یاد رکھو! شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ
بہتر ہے۔''

بچوں کو دادا کی بات سے حوصلہ ملا نہ ملا، لیکن وہ اگلے چند لمحوں میں پڑوس
منتقل ہو چکے تھے۔ اُن کے پڑوس میں بھی بوڑھے سالار کا گھر تھا۔ بوڑھا سالار
چکا تھا لیکن اُس کے گھر کی خواتین اور ایک بیٹا یہاں رہتے تھے۔ گھر میں اس وقت
کے علاوہ صرف ایک خادم تھا۔ ہشام نے اُسے انتہائی عجلت میں کچھ باتیں
اپنے اصطبل سے ایک عمدہ گھوڑا دے کر کسی جانب روانہ کر دیا۔ اس پورے
گلی خالی پڑی رہی تھی۔ بلوائی جا چکے تھے۔ لیکن اُن کی واپسی کا خطرہ موجود

ں اور بازاروں میں جگہ جگہ بغاوت، فسادات اور آتش بازی نہ ہوتی تو ہشام بھی کسی
جاب چل پڑتا۔ لیکن اور نہ شہر تو کربلا کا سماں پیش کر رہا تھا۔ چنانچہ ہشام نے اپنے
ر میں رہ کر دشمن کا مقابلہ کرنا ہی مناسب سمجھا۔

اُدھر سلیم پاشا کو جب یہ خبر ملی کہ قاسم اور طاہر کے بوڑھے باپ نے باغیوں کے
ں افراد پر مشتمل دستہ کے دانت کھٹے کر دیئے ہیں تو وہ پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ اُسے
ا غصہ آیا اور وہ اپنے باغیوں کو بری طرح ڈانٹنے لگا۔ وہ قاسم کی عدم موجودگی سے
پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ ناکامی کی خبر ملتے ہی فوراً اٹھا اور اپنے چہرے پر
ا باندھ کر خود اس شیطانی مشن کی تکمیل کے لئے چل کھڑا ہوا۔ اس مرتبہ اُس کے ہمراہ
بلوائی نہ تھے بلکہ نئی چڑی کے بہترین تلوار باز تھے۔ اور یہ لوگ گھوڑوں پر سوار تھے۔
رحال میں قاسم کو صدمہ پہنچا کر مفلوج کرنا چاہتا تھا۔ گھڑ سواروں کا یہ دستہ تیزی کے
م کے محلے کی طرف اڑا چلا جا رہا تھا۔

م ابھی تک پچھلی لڑائی کی تھکن بھی دُور نہ کر سکا تھا کہ سلیم پاشا کا نقاب پوش دستہ
دروازے کا پٹ گراتا ہوا اندھا دُھند اندر داخل ہوا۔ ہشام نے حسب سابق اُن
ل ڈیوڑھی میں ہی کیا..... اور سکینہ نے بھی کمان کے چلے پر چڑھا تیر چھوڑ دیا۔
ا مرتبہ شاید قسمت بوڑھے ہشام کا ساتھ دینے سے انکار کر چکی تھی۔ اُس نے
کا جان توڑ کر مقابلہ کیا۔ پے در پے تین بہترین سپاہی واصل جہنم کر دیئے۔ سکینہ کی
ے بھی کئی سپاہی زخمی ہوئے۔ لیکن سپاہیوں کی تعداد زیادہ تھی اور ہشام کے
بازوؤں میں سکت ختم ہو چکی تھی۔ بالآخر ہشام کی تلوار دشمن کے وار روکنے میں
گئی۔ اور بوڑھا عرب شمشیر زن آخر دم تک مردانہ وار لڑتا ہوا شہید ہو گیا.....!

م کے گرتے ہی سلیم پاشا کے دہشت گرد پورے مکان میں پھیل گئے۔ سلیم پاشا
ا تک صحیح سلامت تھا۔ اُس نے خود عملی طور پر ہشام کے خلاف لڑائی میں حصہ ہی
یا تھا۔ جس کمرے میں سکینہ تھی، دہشت گرد اُس کمرے میں داخل ہونے سے ہچکچا
ے۔ سکینہ بھی اب کمان چھوڑ کر تلوار اُٹھا چکی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں دروازے کے
ب کر کھڑی تھی۔ دہشت گرد ہچکچاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ سب سے
ایک نقاب پوش تھا اور اُس کے پیچھے سلیم پاشا تلوار سونت کر داخل ہو رہا تھا۔ وہ
ے کمرے میں داخل ہوئے..... لیکن اُن کی احتیاط اُن کے کسی کام نہ آئی۔ سکینہ
لی ٹیرنی کی طرح دروازے کے عقب سے نکلی اور جھپٹ کر نقاب پوشوں پر حملہ کر

دیا۔ اُس نے پہلے ہی وار میں اگلے نقاب پوش کا کام تمام کر دیا اور کسی ماہر اور مشاق باز کی طرح سلیم پاشا پر حملہ آور ہوئی۔ سلیم پاشا اُس کی پھرتی اور چابکدستی دیکھ کر گیا۔ وہ ایک طبیب تھا، سپاہی نہ تھا۔ جبکہ سکینہ ہشام کی بہو اور طاہر کی بیوی تھی۔ اُس سکینہ کی جھپٹ پلٹ دیکھی تو ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ خود کو پو پوری طرح پیچھے ہٹتا، سکینہ کا دیوانہ وار حملہ کام کر گیا اور سکینہ کی تلوار طبیب کے تلوار ہاتھ پر پڑی۔ تلوار سلیم پاشا کے دستے پر گری اور اُس کے ہاتھ کی تین اُنگلیاں کاٹتی فرش سے جا ٹکرائی۔ سلیم پاشا کسی ذبح ہوتی ہوئی بکری کی طرح چیخا اور اپنا ہاتھ پکڑ ہوا ایک کونے کی طرف بھاگا۔ اب وہ نہتا تھا۔ سکینہ اُس کے پیچھے لپکی لیکن اُس تک سکی۔ کیونکہ عقب سے تین چار نقاب پوشوں نے بیک وقت اس دلیر خاتون پر حملہ تھا۔ سکینہ تین چار تلواروں کو ایک ساتھ نہ روک سکی اور بری طرح زخمی ہو گئی۔ اُس کندھا کٹ چکا تھا اور سر پر بھی تلوار کی کاری ضرب پڑی تھی۔ ایک دم اُس کی آنکھو سامنے ستارے سے ناچنے لگے۔ اور پھر وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑی۔

نقاب پوش اس بہادر عورت کی جانب سے مطمئن ہو کر طبیب سلیم پاشا کی مدد کیونکہ وہ درد کی شدت سے بری طرح لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ اسی اثناء میں باقی آور بھی اس کمرے میں آ گئے۔ انہوں نے پورا گھر اچھی طرح چھان لیا تھا۔ گھر دونوں کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ سلیم پاشا نے درد سے کراہتے ہوئے کہا۔

''اتنی جلدی باقی لوگ کہاں جا سکتے ہیں؟..... یقیناً وہ لوگ پڑوس کے مکان گے۔ تم فوراً آس پاس کے دونوں مکانوں پر حملہ کر دو.....''

سلیم پاشا کی بات ابھی مکمل نہ ہوئی تھی کہ باہر گلی میں دوڑتے ہوئے گھوڑوں سنائی دی۔ یہ سب لوگ چوکنے ہو گئے اور سلیم پاشا کی چھٹی حس خطرے کا الارم لگی۔ اُس نے ایک لمحے کی دیر بھی مناسب نہ سمجھی اور باہر کی طرف لپکا..... اُس کے پیچھے تھے۔ وہ گلی میں پہنچے ہی تھے کہ اُنہیں ایک جانب سے گھڑ سوار سپا ایک دستہ اسی جانب آتا دکھائی دیا۔ دستہ اُن لوگوں کے سروں پر پہنچے ہی والا تھا۔

یہ وہی لوگ تھے جنہیں بلانے کے لئے ہشام نے پڑوسیوں کے خادم کو روان یہ آغا حسن کے سپاہی تھے۔ قاسم بن ہشام کے دوست آغا حسن نے دہشت گردو کے مکان سے نکلتے دیکھا اور نعرہ مارتے ہوئے اُن پر حملہ کرنے کے لئے گھوڑا لیکن سلیم پاشا کے سپاہی ان لوگوں سے لڑنے کی ہمت نہ کر سکتے تھے چنانچہ وہ

بھاگے..... آغا حسن نے اُنہیں للکارتے ہوئے اپنا گھوڑا اُن کے پیچھے ڈال دیا اور جلد قاسم کے باپ اور بھابھی کے قاتلوں کو جا لیا۔ انہوں نے آن کی آن میں تمام گردوں کا صفایا کر دیا..... لیکن.....

لیکن سلیم پاشا..... نکل چکا تھا۔ وہ سب سے پہلے باہر آیا تھا اور سب سے پہلے اپنے ڑے پر سوار ہو کر یہاں سے فرار ہو گیا تھا۔

آغا حسن دہشت گردوں سے نمٹ کر واپس لوٹ آیا۔ لیکن اُس کا دل زور زور سے رہا تھا اور اُس کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہو رہے تھے..... کہیں نے قاسم کے اہل خانہ کو کوئی نقصان نہ پہنچا دیا ہو۔ یہی سوچتا ہوا وہ قاسم کے گھر میں ل ہوا۔ اور ڈیوڑھی میں ہی اُس کا دل دھک سے رہ گیا..... قاسم کا باپ ہشام اپنی تلوار دینے کو مضبوطی سے پکڑے ڈیوڑھی میں ہی لہولہان پڑا تھا۔ اُس کے چہرے پر اب بلا کا رعب تھا اور اُس کے دائیں بائیں دہشت گردوں کی کئی لاشیں پڑی تھیں۔ جنہیں اکیلے شخص اور اس کی بہو نے مل کر جہنم رسید کیا تھا۔ گھر میں موت کا سناٹا تھا اور ہر خون کی لکیریں بہہ رہی تھیں۔ آغا حسن غمزدہ دل کے ساتھ آگے بڑھا اور اُس نے ہشام کی لاش کو اٹھا لیا۔ اب وہ اندر کے کمروں کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اُسے یقین کا تھا کہ قاسم کے اہل خانہ شہید ہو چکے ہیں۔ وہ کمرے میں داخل ہوا تو اُسے ایک ان کی لاش نظر آئی جس کا سر اور کندھا زخمی تھا اور باوقار خاتون بھی اپنی شمشیر اپنے اٹھائے اوندھے منہ پڑی تھی۔ کمرے میں ایک نقاب پوش کی لاش بھی پڑی تھی اور ہر خون ہی خون تھا۔ آغا حسن کے لئے یہ بہت بڑا صدمہ تھا۔ اُسے رہ رہ کر خیال آ تھا کہ وہ اپنے دوست قاسم کے گھر والوں کو نہ بچا سکا۔ گھر کا سامان بری طرح بکھرا پڑا ہر چیز پر سرخ لہو کے چھینٹے تھے۔ وہ ابھی تک گم صم کھڑا کمرے کا جائزہ لے رہا اُس نے ہشام کی لاش ایک تخت پر رکھی اور اپنے ساتھیوں کو پورے مکان کا جائزہ لئے کہا۔

لمحہ اُسے ایک نسوانی کراہ سنائی دی۔ یہ غالباً سکینہ کی آواز تھی۔ وہ اُچھل کر زخمی کی جانب بھاگا۔ گویا..... خاتون ابھی تک زندہ تھی۔ وہ تیزی سے اُس کے قریب پہنچا گری پڑی خاتون کو احتیاط کے ساتھ سیدھا کر دیا۔ سکینہ کی آنکھیں کھلی تھیں۔ وہ ہوش آ چکی تھی۔ اُس نے آغا حسن کو دیکھا اور مدھم سی آواز میں کچھ بڑبڑائی۔ آغا حسن نے

"میں آغا حسن ہوں..... قاسم کا دوست..... بچے کہاں ہیں؟"

اب سکینہ کے چہرے پر ایک عارفانہ سی مسکراہٹ نظر آئی۔ اُس نے سر اوپر اٹھانے کی کوشش کی تو آغا حسن نے تیزی سے آگے بڑھ کر اُس کا سر اپنے بازو پر رکھ لیا اور پانی دے کر اپنے ایک سپاہی سے پانی لانے کے لئے کہا..... سکینہ حسرت بھری نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھی اور ہونٹوں سے انتہائی مدہم اور نحیف آواز میں کچھ الفاظ نکل رہے تھے۔

"آپ نے پہنچنے میں دیر کر دی..... زندہ، زندگی الوداع ہوا..... ہوا چاہتی ہے..... پڑوس کے گھر میں تھے..... ہم نے..... ہم نے خوب مقابلہ کیا..... ابا..... ابا جی، شہید ہو چکے ہیں..... وہ..... بہت سے نقاب پوش تھے..... دو..... دو..... مرد، مرتبہ حملہ آور ہوئے تھے..... میں نے..... اُن..... اُن کے سر، دار..... کو زخم..... زخم....."

سکینہ کی سانسیں اُکھڑنے لگیں۔ آغا حسن کا ساتھی پانی لے آیا تھا۔ آغا حسن نے پیالہ سکینہ کے ہونٹوں سے لگانے لگا۔ کچھ پانی تڑپتی ہوئی سکینہ کے منہ میں گرا اور کچھ بہہ گیا۔ پانی کے قطرے سکینہ کے حلق میں اُترے تو وہ ایک بار پھر سنبھلی اور کہنے لگی۔

"میرے..... بچے..... بچے..... لے آؤ..... میرے بچے کہاں ہیں؟"

آغا حسن نے فوراً اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ پڑوس کے گھر سے بچوں کو لے آئیں۔ سکینہ کو تسلی دینے لگا۔

"بہادر خاتون! ہم سب سپاہی آپ کی عظمت کو سلام کرتے ہیں۔ آپ گھبرائیں نہ آپ صرف زخمی ہیں۔ میں ابھی آپ کو طبیب کے پاس لے چلتا ہوں۔"

لیکن اُس کی آنکھوں میں مایوسی کی جھلک تھی۔ اُسے اپنے زندہ بچ رہنے کی کوئی اُمید نہ تھی۔ کچھ ہی دیر بعد گھر کے صحن میں قاسم کی ماں کے رونے کی آواز سنائی دی۔ اگلے سکینہ کے بچے آ گئے تھے۔ یہ بڑا دردناک سماں تھا۔ عمر اور علی گم صم کمرے میں داخل ہوئے۔ اُن کے چہرے ہلدی کی طرح زرد ہو رہے تھے۔ ننھے عمر اور علی کی آنکھوں میں ایک انجانی سی حسرت اور معصومانہ یاس کی کیفیت تھی۔ ننھے عمر اور علی اپنی شہید ہوئی ماں سے ملنے جا رہے تھے۔ آغا حسن سے یہ منظر دیکھا نہ گیا۔ بچے ماں کے پاس آ ماں کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئے۔ قاسم کی ماں بھی روتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ کسی خیال کے تحت آغا حسن نے اپنے سپاہیوں سے کہا۔

"جتنی جلدی ممکن ہو سکے، ایک آرام دے بگھی لے آؤ۔ ہم انہیں سب کو طبیب کے پاس لے چلتے ہیں۔"

لیکن آغا حسن پوری طرح پُر اُمید نہیں تھا۔ سپاہی بجلی کی طرح دوڑتے چلے گئے۔ سکینہ نے بچوں کو دیکھا تو ایک ہاتھ اٹھا کر اُن کے رخساروں کو چھونے کی کوشش کی۔ لیکن وہ ایسا نہ کر سکی۔ اُس کا اٹھا ہوا ہاتھ گر گیا اور وہ پھر بے ہوش ہو گئی۔ آج قاسم کے گھر میں کرب و بلا کا سماں تھا۔ ماری کی خادمہ ایک دہلیز میں بیٹھی سسکیاں لے کر رو رہی تھی۔ اڑوس پڑوس کے مرد و خواتین بھی یہاں آ چکے تھے۔ اس مرتبہ سکینہ پر زیادہ دیر کے لئے غشی طاری ہوئی۔ اتنی دیر تک کہ سپاہی بگھی لے کر آ گئے۔ اور پھر بہت ہی کم وقت میں سکینہ کو شہر کے بڑے طبیب سلیم پاشا کے مطب پر پہنچا دیا گیا۔ لیکن سلیم پاشا کا مطب بند تھا۔ آغا حسن نے کوچوان کو حکم دیا کہ وہ بگھی کو سلیم پاشا کے گھر لے جائے۔ شہر میں بغاوت کی وجہ سے گلیاں اور بازار بند تھے۔ اِکا دُکا جو لوگ نظر آتے اُن کے چہروں پر خوف و ہراس اور دہشت دکھائی دیتی۔ بالآخر سلیم پاشا کا گھر بھی آ گیا۔ سلیم پاشا گھر پر ہی موجود تھا لیکن اُس نے ناسازیٔ طبع کے باعث زخمی خاتون کا علاج کرنے سے انکار کر دیا۔ اب آغا حسن کے لئے زبردستی کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اُس نے اپنی تلوار نیام سے نکالی اور سلیم پاشا کے خادم سے کہا۔

"طبیب کو فوراً بلاؤ۔ ورنہ سپاہی گھر میں گھس کر زبردستی کریں گے۔ تم جانتے ہو شہر میں بغاوت اور افراتفری کا عالم ہے۔ فوراً جاؤ اور میرے حکم کی تعمیل کرو۔"

خادم اندر کی طرف دوڑا۔ اسی اثناء میں سکینہ کو پھر ہوش آ گیا۔ لیکن اس مرتبہ اُس کی سانسیں زیادہ تیزی سے اُکھڑنے لگیں۔ اُس کا سینہ دُھونکنی کی طرح چلنے لگا۔ شاید اُس کا آخری وقت آ پہنچا تھا۔ آغا حسن نے سکینہ کی حالت دیکھی تو بے دھڑک سلیم پاشا کے گھر میں داخل ہو گیا۔ سلیم پاشا پہلے ہی باہر کی طرف آ رہا تھا۔ اُس کے دائیں ہاتھ پر بڑی سی پٹی بندھی تھی اور چہرہ ہلدی کی مانند زرد ہو رہا تھا۔ اُس کے قدم بھی انتہائی سست اور پورا جسم لاغر تھا۔ آغا حسن کی دھمکی سے وہ مریضہ کو دیکھنے کے لئے چلا آیا۔ آغا حسن اُسے لے کر تیزی کے ساتھ بگھی میں لیٹی سکینہ کے پاس پہنچا۔ لیکن سکینہ کے چہرے پر نظر پڑتے ہی سلیم کے ہوش اُڑ گئے۔ جو عورت اُس کی آنکھوں کے سامنے مر چکی تھی وہ پھر زندہ ہو کر اُس کے ہاتھوں تندرست ہونے کے لئے اُس کے سامنے آ چکی تھی۔ اُس کے رہے سہے حواس جاتے رہے۔ اُسے ایسے لگا جیسے مریضہ نہیں بلکہ موت اُس کے سر پر آ چکی ہے۔ اس غیر متوقع اور اچانک ملاقات نے اُس پر سکتہ سا طاری کر دیا۔ وہ ایک ٹک گھور گھور کر سکینہ کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ اسی اثناء میں سکینہ کی جھکی ہوئی پلکیں اُٹھیں اور اُس کی نظر

سلیم پاشا پر پڑی۔ اگرچہ حملے کے وقت سلیم پاشا کے چہرے پر نقاب تھی لیکن پھر بھی اُس کی آنکھیں دیکھ کر دم توڑتی ہوئی سکینہ حیرت زدہ رہ گئی۔ اُس نے پوری قوت سے آنکھ کھولنے کی کوشش کی اور ہاتھ اُٹھا کر اُنگلی کے اشارے سے سلیم پاشا سے کچھ کہنا چاہا لیکن اُسے شدتِ حیرت سے ایک زوردار ہچکی آئی اور اُس نے دم توڑ دیا۔

آغا حسن کے لئے یہ معمہ عجیب تھا۔ اُسے یوں لگا جیسے سکینہ آخر وقت میں طبیب کو کچھ بتانا چاہتی تھی۔ وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ سکینہ طبیب کو پہچان چکی تھی۔ سکینہ نے آخری ہچکی لی تو آغا حسن کے سینے سے ایک ٹھنڈی سانس خارج ہوئی۔ وہ بے حد غمزدہ اور پریشان تھا۔ اسی پریشانی میں وہ سلیم پاشا کی حالت پر غور نہ کر سکا۔ اُس نے سپاہیوں کو سکینہ کی لاش لے جانے کا حکم دیا اور خود سر جھکائے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

قاسم اور طاہر واپس لوٹے تو اُن کی دنیا تاریک ہو چکی تھی۔ اُن کا ہنستا بستا گھر شاہ غریباں کا منظر پیش کر رہا تھا۔ اُن کا بہادر اور شفیق باپ منوں مٹی تلے دفن تھا اور طاہر کی رفیقۂ حیات، اُس کے دُکھ سکھ کی ساتھی سکینہ بھی شہر خموشاں کی باشندہ بن چکی تھی۔ ننھے اور علی اپنی ماں کی یاد میں رو رو کر ہلکان ہو گئے تھے۔ قاسم اور طاہر کے لئے یہ صدمہ ناقابل برداشت تھا۔ وہ سلطان مراد خان ثانی کو واپس لانے کے لئے ایدین گئے تو انہوں نے سلطان کی خدمت میں دارالسلطنت میں بغاوت کا کچھ ایسا نقشہ کھینچا کہ سلطان فی الفور واپسی کے لئے تیار ہو گیا۔ وہ سلطان کو تو گوشۂ عزلت سے نکال کر ادرنہ واپس لے آئے۔ لیکن اب شدتِ غم کی وجہ سے اُن کا خود گوشۂ عزلت میں جانے کا وقت تھا۔

قاسم کے ذہن سے غم کے بادل چھٹے تو غصے اور انتقام کے گھٹا ٹوپ بادل چھا گئے۔ وہ ہر حال میں اپنی بھابھی اور باپ کے قاتل تک پہنچنا چاہتا تھا۔ آغا حسن نے اُسے سانحے کی تفصیلی سرگزشت سنا دی تھی۔ اُسے اپنے پڑوسیوں سے بھی ایک ایک بات معلوم ہو چکی تھی۔ اُس کی ماں اور مارسی کی خادمہ نے یہی بتایا تھا کہ حملہ آور نقاب پوش تھے لیکن نہ جانے کیوں قاسم کے دل میں کوئی بات کھٹک رہی تھی۔ اُسے آغا حسن نے بتایا کہ اُس کی بھابھی نے دم توڑتے وقت حملہ آوروں کے سردار کو زخمی کرنے کی بابت تھا۔ آغا حسن سے اُسے یہ بھی معلوم ہوا کہ طبیب سلیم پاشا نے اُس کی بھابھی کا علاج کرنے میں دیر کر دی تھی۔ لیکن آغا حسن نے اُسے سلیم پاشا کی حالت اور زخمی ہاتھ کے بارے میں بتانا ضروری نہ سمجھا تھا۔ قاسم، سلیم پاشا کو پہلے ہی دل سے اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ اُسے یہ شک تھا کہ شہزادہ علاؤالدین کو سلیم پاشا کے ساتھ کوئی پراسرار نسبت تھی۔ وہ شہ

روز اسی طرح کی سوچوں میں گم رہنے لگا۔

سلطان کے آنے سے ادرنہ میں بغاوت پر ایک دم قابو پا لیا گیا تھا۔ سلطان نے بغاوت کے بڑے بڑے ذمہ داروں کو آتے ہی موت کی سزا کا حکم سنا دیا۔ اُس نے بہت سے غیر ذمہ دار افسروں کو قید میں ڈال دیا اور ینی چری کے بہت سے باغی سپاہیوں کو جرمِ بغاوت قتل کروا دیا۔ اور بہت جلد ادرنہ کا ماحول معمول پر آ گیا۔ لیکن سلطان کو بغاوت کے اصل تار پود کی سمجھ نہ آ سکی۔ سلیم پاشا ابھی تک زندہ تھا اور اُس کے ہاتھ پر ابھی تک پٹی بندھی تھی۔ اُس کے دائیں ہاتھ کی تین اُنگلیاں کٹ چکی تھی اور وہ ابھی تک پوری طرح صحت یاب نہ ہوا تھا۔

سلطان نے کئی روز بعد قاسم کو بلوایا۔ اُس نے قاسم کے اہل خانہ کی حادثاتی موت پر بے حد افسوس کا اظہار کیا اور اُس کو ذمہ داری سونپی کہ وہ اس بغاوت کے اصل تار پود کا سراغ لگائے۔ قاسم خود یہی چاہتا تھا کہ اُسے سرکاری اختیارات مل جائیں تاکہ وہ آزادی کے ساتھ اپنے دشمنوں کو ڈھونڈ سکے۔ اب وہ ایک مرتبہ پھر سرکاری سراغ رساں تھا۔ اس نے زینہ بہرام خان اور اُس کے پورے خفیہ محکمے کو براہِ راست قاسم کی ماتحتی میں دے دیا گیا۔ محل میں معزول سلطان شہزادہ محمد نے بھی قاسم کو اپنی ہمدردی اور محبت کا یقین دلایا۔

سانحے کے اکیسویں روز قاسم کے ساتھ ایک عجیب اتفاق پیش آیا۔ وہ ادرنہ کے بازارِ ان گراں سے گزر رہا تھا کہ اُس کی ملاقات اربان کے ساتھ ہو گئی۔ یہ ادرنہ کا ایک تنگ بازار تھا جہاں زیادہ تر لوہے اور لکڑی کے کاریگروں کی دُکانیں تھیں۔ اس بازار میں شمشیریں، نیزے، تیر کمان اور دیگر جنگی ساز و سامان کے علاوہ روزمرہ کی چیزیں بھی تیار کی جاتی اور فروخت ہوتی تھیں۔ قاسم نے پہلی نظر میں ہی اربان کو پہچان لیا۔ لیکن اربان بظاہر طور پر قاسم کو نہ پہچان سکا۔ لیکن جب اُس کی نظروں میں شناسائی کی جھلک نمودار ہوئی تو وہ فوراً قاسم کے ساتھ بغلگیر ہو گیا۔ قاسم نے سب سے پہلے تو اربان سے معذرت کی کہ وہ اپنی گوناگوں مصروفیات کی بدولت اُس کو دوبارہ ملنے نہ آ سکا۔ اور پھر اُس نے اربان سے دریافت کیا کہ وہ ادرنہ میں ابھی تک کیا کر رہا ہے اور کہاں مقیم ہے؟ اربان نے جواب میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں اسی بازار میں ایک بڑے آہن گر کے پاس کام کرتا ہوں۔ اور ادرنہ ہی کے محلے میں رہائش پذیر ہوں۔"

قاسم اچھی طرح جانتا تھا کہ اربان بے ضرر ہے۔ لیکن پھر بھی ایک یورپی اور عیسائی

باشندہ ہونے کی وجہ سے اُس کے دل میں اربان کی طرف سے شک پیدا ہوا۔ اُس
اربان کا مزید جائزہ لینے کے لئے کچھ کہنا ہی چاہا کہ اربان پہلے بول پڑا۔

''ارے دوست!..... تمہیں یہ سن کر حیرت اور خوشی ہوگی کہ میں نے اسلام قبول کر
ہے۔ اور بغاوت کے دنوں میں جب میں گھر میں بند ہو کر رہ گیا تھا تو میں نے قرآن
پڑھنے کی بھی کوشش کی۔''

''حیرت انگیز!..... آپ نے اسلام قبول کر لیا؟..... اب تو آپ میرے دوست
نہیں مسلمان بھائی بھی ہیں..... لیکن یہ انقلاب کیسے آیا اور کس کی مہربانی سے؟''

قاسم کے لہجے میں واقعی حیرت تھی۔ لیکن جب اُسے اربان نے اپنے مہربان کا نام
تو قاسم کو حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔ کیونکہ اربان نے کہا تھا۔

''یہ انقلاب میری نومسلم بھتیجیوں حمیرا اور مریم کے طفیل رونما ہوا۔ میری بھتیجیاں
اچھی ہیں۔ وہ خود اور اُن کا باپ عباس بھی حال ہی میں مسلمان ہوئے ہیں۔ ہم
قرآن حکیم پڑھنا چاہتے تھے۔ اب ہم نے اپنے لئے ایک استاد کا انتظام کر لیا ہے۔
کبھی ہمارے گھر آؤ نا.....!''

قاسم کو یہ خبر سن کر ایسے لگا جیسے ایک دم وہ ہوا میں اٹھ گیا ہو۔ مارے حیرت کے
کی زبان سے الفاظ نہ نکل رہے تھے۔ حمیرا، مریم اور عباس کو وہ جانتا تھا۔ بلکہ یہ نام
اُس کے اپنے تجویز کردہ تھے۔ وہ بوسنیا کی شہزادی کو کیسے بھول سکتا تھا جس نے پہلے
ہی ینی چری کے ایک پنج ہزاری سالار کے ساتھ ٹکرا جانا چاہا۔ وہ بوڑھے عباس اور اُس
بیٹی مریم کو بھی نہ بھول سکتا تھا۔ اُسے اس بات پر بھی بے حد حیرت تھی کہ یہ لوگ کب
کیسے ادرنہ آ نکلے تھے۔ اور یہی نہیں کہ ادرنہ آ پہنچے تھے بلکہ اربان اور یہ سب ایک
ادرنہ کے ایک محلے میں مقیم تھے۔ اُس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور اُسے اپنی لا
افسوس ہو رہا تھا۔ وہ اربان کو لے کر ایک قہوہ خانے میں جا بیٹھا اور دیر تک اُس کے
بوسنیائی مہمانوں کے موضوع پر باتیں کرتا رہا۔ اربان نے اُسے یہ بھی بتایا کہ وہ ایک
وغریب منجنیق جسے توپ کہا جائے گا، مسلم سپاہ کے لئے بنانا چاہتا تھا اور سلطان سے
ملنے کا خواہشمند تھا۔ قاسم کے لئے یہ تمام خبریں نئی اور حیران کن تھیں۔ اُس نے
کے ساتھ وعدہ کیا کہ وہ اُسے کل ہی سلطان کی خدمت میں لے جائے گا۔ اُس نے
سے اُس کے گھر کا پتہ بھی معلوم کر لیا اور یہ کہہ کر رخصت ہوا کہ وہ اب سیدھا قصر
میں سلطان مراد خان کے ساتھ اربان کی جدید توپ کے سلسلے میں ملنے کے لئے

سلطان سے کل کے لئے ملاقات کا وقت حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ ایک طویل
ملاقات کے بعد وہ قہوہ خانے سے اٹھا اور قصرِ سلطانی کی جانب چل دیا۔

قاسم نے سلطان کو اربان کے بارے میں بتایا تو سلطان کی باچھیں کھل گئیں اور اُسے
اربان سے ملنے کا بے حد اشتیاق پیدا ہوا۔ قاسم تو کل کا وقت لینے کے لئے حاضر ہوا تھا
لیکن سلطان کل تک صبر نہ کر سکا۔ اُس نے قاسم کو محل میں ٹھہرنے کے لئے کہا اور قاسم
سے اربان کا پتہ حاصل کر کے اپنے خاص ہرکارے اربان کو عزت کے ساتھ محل میں لانے
کے لئے دوڑا دیئے۔ قاسم نے اربان کی بابت تو سلطان کو سب کچھ بتا دیا تھا لیکن بوسنیائی
شہزادی اور عباس کا مطلق ذکر نہ کیا۔ نہ جانے اس میں قاسم کی کیا مصلحت تھی۔ قاسم
سلطان کی ہدایت کے مطابق محل میں ٹھہر کر اربان کا انتظار کرنے لگا۔

بہت کم وقت گزرا تھا کہ عظیم آہن گر اربان کو بڑے عزت و احترام کے ساتھ سلطان
مراد خان ثانی کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ یہ سلطان کا دیوانِ خاص تھا جہاں اس وقت
سلطان، عظیم آہن گر اربان اور قاسم بن ہشام موجود تھے۔ اربان کے چہرے پر اس طرح
کا بلک بلائے جانے سے کسی قدر حیرت تو تھی لیکن خوف یا مرعوبیت کا کوئی شائبہ نہ تھا۔
سلطان نے اس آہن گر کا اُٹھ کر استقبال کیا تو آہن گر اربان کی آنکھوں میں پہلی بار
بدحیرت کی چمک نظر آئی۔ وہ عیسائیت کے شہنشاہ قیصرِ قسطنطنیہ کے دربار میں بھی حاضر
ہوا تھا لیکن مسلمانوں کے سلطان کو دیکھ کر اُس کے دل کی کیفیت عجیب تھی۔ اُس نے
سوچا، کیا بادشاہ بادشاہوں کے علاوہ بھی کسی کا اُٹھ کر استقبال کرتے ہیں؟ لیکن وہ نہیں
جانتا تھا کہ سلطان مراد خان ثانی ایک درویش صفت بادشاہ ہے۔ اربان خود بھی فلسفی اور
آزاد مزاج شخص تھا۔ چنانچہ اُس نے سلطان کی مسکراہٹ میں اپنے لئے اپنائیت اور
محبت محسوس کی۔ سلطان نے اربان کے ساتھ گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے پہلا جملہ یہ کہا۔

''ہم اپنے معزز مہمان سے ناراض ہیں۔ کیونکہ قسطنطنیہ کا عظیم آہن گر ہمارے
سلطنت میں گزشتہ چار ماہ سے موجود ہے لیکن ہمیں ملنے کے لئے نہیں آیا۔''

لیکن اربان نے جواب میں ایک عجیب بات کہہ کر عثمانی سلطنت کے فرمانروا مراد خان
کو حیران کر دیا۔ اُس نے کہا۔

''ہم ذوقِ سلطانی سمجھتے ہیں یہ کھلونوں سے بہل جایا کرتا ہے۔ خانہ بدوشوں کا کوئی
تعلق نہیں ہوتا جس کی خدمت میں وہ حاضری دیں..... مجھے ظلم سے نفرت ہے۔ اس لئے
میں ظلم کو مٹانے کی غرض سے اسلامی افواج کی خاطر ایک تاریخ ساز اسلحہ ایجاد کرنا چاہتا

ہوں۔ فقیر بے پرواہ ہے اُن انعامات و اکرامات سے جو ایسے فنکاروں کو سلطان
کرتے ہیں۔"

سلطان کے لئے ایک آہن گر کی یہ باتیں جن میں گہری معنویت تھی، اجنبی اور
مانوس تھیں۔ لیکن وہ درویش تھا۔ اُس نے کسی بات کا برا نہ منایا بلکہ کسی قدر خفیف
مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"ہم جانتے ہیں شاہی انعامات معزز آہن گر کے فن کی قیمت نہیں ہو سکتے۔ لیکن
بھی شاہی انعامات ظلِ سبحانی کا عطیہ ہوتے ہیں۔ جنہیں فخر کے ساتھ قبول کرنا چاہئے۔"

لیکن اس مرتبہ بھی سلطان کو ایک سچے درویش کا انوکھا جواب سننا پڑا۔

"سلطانِ معظم! انعام تو ہم آپ کو دیں گے اور فی الحقیقت ہمارے انعام کو ہی
دنیا تک ظلِ سبحانی کا عطیہ سمجھا جائے گا۔ وہ ہیرے جواہرات جو ایک سلطان کسی فنکار
بخشیش کرتا ہے چند ماہ یا چند سال بھی باقی نہیں رہتے۔ لیکن وہ انعام جو ہم سلطنت عثمانیہ
کو بخشیں گے، ہزاروں سال تک سلطنت عثمانیہ کے لئے فخر و مباہات کا باعث رہے گا۔"

اب سلطان کی آنکھوں میں آہن گر کے لئے تحسین کے جذبات اُمڈ آئے۔ اُس کے
چہرے پر سلطانی غصے کی ایک لکیر بھی نہ تھی۔ اُس نے آگے بڑھ کر اربان کے کندھے
ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔

"زہے نصیب!..... ہم سلطنت عثمانیہ کے لئے معزز فنکار کا انعام بہ سر و چشم قبول
کریں گے۔ ہمیں تسلیم ہے کہ ہم نے اتنے عظیم فنکار کو اپنے حضور طلب کر کے غلطی کی
حق تو یہ تھا کہ ہم فن کے اس شہنشاہ کے حضور خود حاضر ہوتے۔ ہمیں آپ کی باتیں بے
پسند آئی ہیں۔ اور ہم نے آپ کی توپ کے بارے میں بھی سن لیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں
آپ اس جدید اسلحہ کو سلطنت کے شاہی خزانے سے تیار کریں۔ ہم آج ہی ایک
کارخانہ بنانے کا حکم جاری کرتے ہیں جہاں آپ اپنی نگرانی میں ہر طرح کا ساز و سا
نصب کروائیں۔"

قاسم کے لئے سلطان اور اربان کے مابین ہونے والی گفتگو دلچسپ بھی تھی اور پُر
بھی۔ اُسے اربان کی جرأتِ گفتار پر بھی حیرت تھی اور سلطان کی فیاضی پر بھی۔ لیکن
وہ اس گفتگو کا مزہ لے ہی رہا تھا کہ شاہی دربان نے حاضر ہو کر اُس کی تمام حسیات
ایک دم بیدار کر دیا۔ کیونکہ شاہی دربان نے سلطان سے کورنش بجا لانے کے بعد کہا۔

"سلطانِ معظم! طبیب سلیم پاشا طویل علالت کے بعد شرفِ قدم بوسی کے

حاضری کی اجازت چاہتے ہیں۔"

قاسم کے لئے طبیب سلیم پاشا کا نام عجیب سنسنی کا حامل تھا۔ یہی شخص تھا جس نے
اس کی پیاری بھابھی کا بروقت علاج کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اُسے تو یہ بھی معلوم نہ تھا
کہ یہ شخص کب علیل ہوا اور کب صحت یاب۔ ہاں، البتہ اُس نے کئی روز سے طبیب سلیم
پاشا کی شکل نہ دیکھی تھی۔ اب دربان نے سلیم پاشا کا نام لیا تو قاسم کی چھٹی حس بیدار ہو
گئی۔ اُس نے سرکاری سراغ رساں بننے کے بعد اپنی حکمت عملی میں یہ بھی سوچ رکھا تھا
کہ وہ کسی وقت اس شخص کا حدودِ اربعہ معلوم کرنے کی کوشش ضرور کرے گا۔ لیکن آج
اتفاق سے طبیب سلیم پاشا اچانک اُس کے سامنے آ گیا تھا۔

سلیم پاشا دیوانِ خاص میں داخل ہوا تو اُس کا سر فرطِ ادب سے جھکا ہوا تھا۔ وہ
سلطان کے حضور پہنچتے پہنچتے کمر تک جھک گیا۔ لیکن جونہی اُس نے سر اوپر اٹھایا تو اُس کی
نظر قاسم بن ہشام پر پڑی تو اُس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ اپنے پیروں پر
طرح لڑکھڑایا اور دیوانِ خاص کے فرش پر گرتے گرتے بچا۔ سلطان اور اربان نے
کی اس حرکت کو بڑی عجیب نظروں سے دیکھا۔

سلیم پاشا کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور وہ غیر ارادی طور پر اپنے زخمی ہاتھ کو
پر پٹی باندھی تھی، اپنی قباء میں چھپانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس حرکت سے اُس کی
کا آغاز ہوا۔ کیونکہ قاسم کے لئے اُس کا زخمی ہاتھ بے حد اہمیت رکھتا تھا۔ قاسم کو
یت تھی کہ ایک غیر جنگجو طبیب کا ہاتھ کیسے زخمی ہو گیا؟ اُس کے ذہن میں اپنی بھابھی
آخری جملے گونجنے لگے جو اُس نے آغا حسن سے سنے تھے۔ اُس کی بھابھی نے جان
وقت کہا تھا کہ..... اُس نے نقاب پوشوں کے سردار کو زخمی کر دیا تھا..... یہی بات سلیم
کا ہاتھ دیکھ کر اُسے کیوں یاد آئی۔ اُس کا دماغ سنسنانے لگا اور بدن کے رونگٹے
ے ہو گئے۔ اُسے آغا حسن کا بتایا ہوا اپنی شہید بھابھی کا آخری وقت پوری طرح یاد
لگا جب اُس کی بھابھی نے طبیب سلیم پاشا کو دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا تھا اور اُنگلی کا
ارا کر کے کوئی بات کہنے کی کوشش کی تھی۔ قاسم کو ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کی بھابھی نے
فت میں اپنے قاتل کو پہچان لیا تھا اور اُس کی جانب انگلی سے اشارہ کیا تھا۔ اب
کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی کی لہر برقی رو کی طرح دوڑنے لگی۔ اُسے اپنے دماغ پر
ہوتا ہوا محسوس ہوا اور اُس کے جبڑے اکڑ گئے۔ کیونکہ یکے بعد دیگرے بہت سی کڑیاں
جا رہی تھیں۔ اس لئے کہ اُس کے ذہن میں یہ بات تو تھی ہی کہ سلیم پاشا نے آخری

وقت میں زخمی خاتون کو دیکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ قاسم نے سوچا، یقیناً یہی وقت رہا ہو
جب طبیب نے اپنے زخموں کی مرہم پٹی کی ہو گی۔ اب اُس کی آنکھوں میں لال لال
ڈورے دوڑنے لگے اور اُس کی بھنوئیں تن کر سیدھی ہو گئیں۔ اُس کی نبضوں کی رفتار بھی
تیز ہونے لگی۔ اُسے یقین ہو رہا تھا کہ طبیب سلیم پاشا ہی اُس کے خاندان کا قاتل تھا
لیکن سلطان کے الفاظ نے اُس کے خیالات کی رو کو اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ سلطان سلیم
پاشا سے کہہ رہا تھا۔

"محترم طبیب! آپ کا ادبِ شاہی بجا لانے کا انداز ہمیں پسند نہیں آیا۔ ہم رکوع وسجود
کو صرف اللہ کے حضور جائز سمجھتے ہیں۔ لیکن بہرحال ہمیں آپ کی علالت کا سن کر افسوس
ہوا تھا۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ کے ہاتھ پر پٹی بندھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے آپ کے
ہاتھ کی اُنگلیاں سلامت نہیں رہیں..... نصیب دشمناں کہیں کٹ تو نہیں گئیں؟ سنا ہے آپ
بغاوت کے دنوں میں ہی کسی حادثے کا شکار ہوئے ہیں۔"

بغاوت کے دنوں میں سلیم پاشا کے حادثے کا ذکر قاسم کے لئے ایک اور کڑی تھا۔
گویا سلیم پاشا کا زخم بھی انہی ایام کا ہے جب اُس کی بھابھی شہید ہوئی تھی۔ اور پھر جس
سلیم پاشا نے سلطان کو جواب دیا تو قاسم کے شک کی رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی۔ کیونکہ
طبیب کا جواب فی الحقیقت بچگانہ اور غیر معقول تھا۔ سلیم پاشا نے بتایا۔

"سلطانِ معظم! میں ناواقف آدابِ شاہی ہونے پر بے حد شرمسار ہوں..... سلطان
معظم نے میرے زخمی ہاتھ کی بابت دریافت فرمایا..... میرا یہ ہاتھ ایک نسخہ تیار کرتے
ہوئے اچانک تیزاب میں جل کر ضائع ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ میں کئی روز سے صاحبِ
فراش ہوں۔"

طبیب کی بات اس لئے غیر معقول تھی کہ اُس کی پٹی دیکھ کر صاف پتہ چلتا تھا کہ اُس
کے ہاتھ کی اُنگلیاں کٹ چکی ہیں۔ اور پھر یہ بات بھی تھی کہ تیزاب میں اچانک ہاتھ
جانے سے اس قدر سنگین نقصان ممکن نہیں تھا۔ طبیب محل میں بڑے ہونے والے ایک
بادشاہ کو تو دھوکہ دے سکتا تھا لیکن قاسم جیسے ذہین دماغ کو فریب نہ دے سکتا تھا۔ معاً قاسم
کو ایک خیال آیا اور اُس نے سلطان کی خدمت میں ادب سے گزارش کی۔

"سلطانِ معظم! انتہائی احتیاط کے ساتھ کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔"

سلطان نے چونک کر قاسم کی جانب دیکھا اور سر کی جنبش سے بات کرنے کی اجازت
دی۔ قاسم نے پھر کہا۔ "سلطانِ معظم! حیرت کی بات ہے..... سرکاری سراغ رساں کو ایسے

کسی شخص کی تین داہنی اُنگلیاں کٹی ہوئی ملی ہیں جنہیں تفتیش کی غرض سے مشک
اور قدرتی برف میں محفوظ کر لیا گیا ہے..... اگر گستاخی نہ سمجھی جائے تو میں یہ کہنا
چاہوں گا کہ طبیب سلیم پاشا سلطانِ معظم سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

قاسم بات کر رہا تھا اور سلیم پاشا کی ٹانگیں زور زور سے کانپ رہی تھیں۔ قاسم نے
تین اُنگلیوں کا ذکر کر کے اُس کا بھانڈا پھوڑ دیا تھا۔ اُس کے چہرے کا رنگ خزاں رسیدہ
پتے کی طرح پیلا ہونے لگا اور وہ شاہی نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے فرش پر گھورنے
لگا۔ اُس کی اب تک کی حرکتیں سلطان کے لئے بھی چونکا دینے والی تھیں۔ چنانچہ سلطان
نے کسی قدر بلند آواز میں کہا۔

"طبیب!..... آپ کی ٹانگیں کیوں کانپ رہی ہیں؟ معلوم ہوتا ہے آپ کا کوئی نہ کوئی
تعلق ان تین اُنگلیوں کے ساتھ ہے۔"

سلطان کی بات نے سلیم پاشا کی رہی سہی جان بھی نکال لی۔ اسی اثناء میں قاسم نے
کہا۔ "سلطانِ معظم! یہ کٹی ہوئی اُنگلیاں مجھے اپنے ہی گھر سے ملی ہیں اور میری بھابھی
جان نے مرتے وقت بتایا تھا کہ انہوں نے حملہ آور نقاب پوشوں کے سردار کو زخمی کر دیا
تھا۔ لیکن سلطانِ معظم! یہ ضروری تو نہیں کہ وہ اُنگلیاں محترم طبیب سلیم پاشا کی ہی ہوں۔"

قاسم نے جملے کا آخری حصہ کسی قدر زور دیتے ہوئے جان بوجھ کر کہا تھا۔ اب گویا
اُس نے سلیم پاشا پر اپنے شک کا براہِ راست اظہار کر دیا تھا۔ سلیم پاشا کی حالت غیر تھی
اور اُس کی زبان کوئی بھی لفظ ادا کرنے کی ہمت نہ کر پا رہی تھی۔ شکار کو جال میں پھنستے
دیکھ کر قاسم نے آخری ضرب لگائی اور کہا۔

"سلطانِ معظم!..... خفیہ محکمے کے ماہرین ان اُنگلیوں اور محترم طبیب کے دوسرے ہاتھ
کی اُنگلیوں کو دیکھ کر با آسانی بتا سکتے ہیں کہ یہ اُنگلیاں محترم طبیب سلیم پاشا کی ہی ہیں....."

قاسم کی بات پوری طرح ختم نہ ہوئی تھی کہ دیوانِ شاہی میں ایک عجیب حادثہ رونما ہو
گیا۔ سلیم پاشا نے خود کو چوہے دان میں پھنستے دیکھا تو ایک دم بجلی کی سرعت سے اپنی قباء
کے اندر اپنا بایاں ہاتھ ڈالا اور ایک تیز دھار چمکتا ہوا خنجر نکال کر پلک جھپکتے میں سلطان
مراد خان ثانی پر حملہ کر دیا۔ بہت ممکن تھا کہ اُس کا خنجر سلطان کا پیٹ چاک کر دیتا، لیکن
سلطان نے بروقت ایک عجیب حرکت کی اور بجلی کی طرح سلطان کے سامنے آ گیا۔ سلیم پاشا
کا خنجر اربان کی پسلیوں میں گھستا چلا گیا لیکن سلطان بال بال بچ گیا۔
اتنی مہلت کافی تھی۔ قاسم نے فوراً اپنی شمشیر بے نیام کی اور سامنے کی طرف سونت کر

سلیم پاشا کی گردن پر رکھ دی۔ سلطان نے با آوازِ بلند دربان کو پکارا اور دربان تلوار لہراتا ہوا کر اندر کی جانب لپک آیا۔ اب سلیم پاشا بے بس ہو چکا تھا۔ لیکن اُس نے آخر میں سب کو سے حیران کر دینے والی حرکت کی اور اپنا خنجر اربان کی پسلیوں سے کھینچ کر اپنے دل میں گھونپ لیا۔ اُس کا پول کھل چکا تھا اور اب اُس کے لئے مزید زندہ رہنا کسی صورت ممکن نہ تھا۔ چنانچہ اُس نے خودکشی کر لی۔

اگلے روز غدار سلیم پاشا کی لاش شہر کے سب سے بڑے چوراہے میں اُلٹی لٹکی ہوئی تھی جس کے پاس ہی ایک چھوٹے سے ستون پر سرکاری اشتہار آویزاں تھا جس میں سلیم پاشا کے سیاہ کارنامے درج تھے۔ قاسم کا انتقام پورا ہو چکا تھا اور اُس کا سب سے دشمن، حملہ آور نقاب پوشوں کا سردار اور قیصر کا خطرناک جاسوس اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔ قاسم آج بہت خوش تھا اور وہ اسی سرشاری کے عالم میں دھڑکتے دل کے ساتھ اربان کے گھر جا پہنچا۔ یہاں وہ اپنے بوسنیائی مہمانوں سے ملنے آیا تھا۔ لیکن درحقیقت اُس کے دل میں کوئی انجانا سا چور بھی سر چھپائے بیٹھا تھا۔ یہ غالباً شہزادی حمیرا کی ملاقات کا چور تھا۔ وہ اربان کے گھر پہنچا تو بے حد جذباتی ہو رہا تھا۔ اُس نے لرزتے ہاتھ کے ساتھ خوبصورت مکان کے دروازے پر دستک دی اور کچھ دیر کھڑے رہ کر انتظار کرنے لگا۔

چند لمحے بعد مکان کا دروازہ کھلا تو وہ اپنی جگہ پر مارے جذبات کے کانپ کر رہ گیا۔ سامنے بوسنیا کی حسین شہزادی کھڑی تھی۔ قاسم کو توقع نہ تھی کہ دروازہ کھولنے کے لئے شہزادی حمیرا خود چلی آئے گی۔ وہ تو ششدر تھا ہی، دیکھنے والی حالت تو شہزادی حمیرا کی تھی جس کے سامنے اچانک اُس کے خوابوں کا شہزادہ آفتابِ روشن کی طرح طلوع ہوا تھا۔ شہزادی پھٹی پھٹی آنکھوں سے قاسم کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھے چلی جا رہی تھی۔ اُس کی دونوں ہاتھ دروازے کے کواڑوں پر تھے اور منہ سکتے کے عالم میں کھلا تھا۔ قاسم کی آمد معجزے سے کم نہ تھی۔ وہ سوچ رہی تھی مسلمان ہونے کے بعد اُس کی پہلی دُعا ہی قبول کر لی گئی تھی۔ اُس نے مسلمان ہونے کے بعد اپنے خدا سے قاسم کی دوبارہ ملاقات طلب کی تھی اور آج قاسم خود بخود اُس کے سامنے چلا آیا تھا۔

دونوں طرف کی حیرتیں ماند پڑیں تو دونوں ملاقاتی عجیب سے انداز میں مسکرانے لگے۔ شہزادی نے بغیر کوئی سوال کئے قاسم کو اندر آنے کے لئے کہا اور خود دوڑتی ہوئی مرحوم بوڑھے عباس کو پکارنے لگی۔ قاسم کی ملاقات سب کے لئے اچانک اور چونکا دینے والی تھی۔ اربان گھر پر موجود نہ تھا۔ لیکن ان تینوں نے قاسم کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اُس کی

شہزادی کے گھر میں چار چاند روشن ہو گئے۔ وہ ایک جگہ جا کر بیٹھے تو عباس نے بچھتے ہی خوشی سے کپکپاتی آواز میں کہا۔

"بیٹی حمیرا دیکھو!..... تمہارا دولہا خود بخود آ گیا۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں تم پہلے دن سے ہی قاسم کو چاہنے لگی ہو۔ تم مجھ سے کچھ نہیں چھپا سکتی۔"

حمیرا کا چہرہ حیاء سے گلنار ہو گیا۔ وہ فوراً اُٹھی اور اندر کی طرف جانے لگی۔ لیکن عباس نے اُس کو کلائی سے پکڑ لیا۔ "بیٹی! جاتی کہاں ہو؟ یہاں بیٹھو۔ اتنی مدت بعد قاسم ایک بار پھر ہمارے گھر آیا ہے اور تم چل دیں۔ خوشبو اور محبت کو چھپایا نہیں جا سکتا۔ تم تو یہ بھی نہیں جانو گی کہ تم اندر نہ میں قاسم ہی کے سلسلے میں آئی ہو۔"

حمیرا چھوئی موئی سی ہو گئی اور عباس سے اپنی کلائی چھڑاتے ہوئے کہنے لگی۔

"چچا! آپ نے دیکھا میری دُعاؤں کا اثر۔ قاسم بن ہشام خود چل کر ہمارے پاس آئے ہیں۔ آپ میرا ہاتھ چھوڑیئے! میں ان کے لئے کچھ کھانے کا بندوبست کرتی ہوں۔"

لیکن قاسم اس صورتحال سے بری طرح سٹپٹا گیا تھا۔ اُسے قطعاً توقع نہ تھی کہ معاملہ اس حد تک بڑھ چکا ہے۔ وہ تو اپنی غزالہ یعنی مارسی سے محبت کرتا تھا۔ آج اُس کے دل میں شہزادی حمیرا کی محبت نے شمع جلانے کی کوشش کی تو اُسے مارسی کی بے پناہ یاد آنے لگی۔ اُسے یوں لگا جیسے وہ مارسی کی روح سے بے وفائی کر رہا ہو۔ اس کے بعد وہ جتنی دیر ان لوگوں کے پاس رہا اسی احساس کی آگ میں جلتا رہا اور حمیرا کی بے پایاں عقیدت اور خود اعتناء نہ سمجھا۔ حتیٰ کہ جب وہ رات کو واپس ہونے لگا تو بالآخر حمیرا بول اُٹھی۔

"محترم سالار!..... آج آپ کھوئے کھوئے سے تھے۔ معلوم ہوتا ہے آپ کے دل میں کسی اور کے نام کا چراغ روشن ہے۔ اگر میری وجہ سے آپ کو کوئی دُکھ پہنچا ہو تو میں اس کے لئے معافی کی خواستگار ہوں۔"

قاسم کو دھچکا لگا۔ حمیرا نے اُس کی بے رُخی کو بھانپ لیا تھا۔ وہ ایک بار پھر سٹپٹا گیا۔ ایک طرف مارسی کی یاد اُسے کچوکے دے رہی تھی تو دوسری طرف کوئی غیبی طاقت اُسے حمیرا کی طرف بھی کھینچ رہی تھی۔ اُس کے دل کی ناؤ ڈولنے لگی۔ اُس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

"نہیں شہزادی صاحبہ! میں آپ کی محبت کے لائق نہیں ہوں۔ میں نے پہلے بھی ایک شمع جلانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ سراجِ منور اب اس دل کے تاریک شبستانوں میں کسی قبر پر جلتا ہوا ایک دیا بن کر ٹمٹما رہا ہے۔ آپ بہت اچھی ہیں۔ اور میں اپنے دل

میں آپ کے لئے ایک انجانا سا جذبہ محسوس بھی کرتا ہوں۔ لیکن میں آپ کو دھوکے میں نہیں رکھ سکتا۔ آپ سے پہلے ایک لڑکی میری زندگی میں آ چکی ہے۔ اور وہی میری پہلی محبت تھی۔"

"پہلی محبت تھی؟..... تھی سے کیا مراد؟ وہ خوش نصیب اب کہاں ہے؟"

قاسم کی آنکھوں میں عرب کی اُداس شام اُتر آئی۔ اُس نے دُور خلاء میں گھورتے ہوئے جواب دیا۔ "وہ شہید ہو چکی ہے۔ اسلام کی محبت کے نام پر۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہی۔"

"حیرت ہے۔ ایک سپاہی ایک شہید کی شہادت پر اُداس اور غمزدہ ہے۔ میں نے اسلام میں یہ سنا ہے کہ شہید زندہ ہوتے ہیں۔ پھر آپ نے کیوں اُس کی جدائی کا غم سے لگا لیا۔ میں آپ سے صرف ایک درخواست کروں گی کہ جب کبھی بھی دل پر اُس نصیب کی جدائی کا بوجھ محسوس کریں تو مجھ بدنصیب کو اپنے غم کا تھوڑا وزن اٹھانے کا ضرور دیں۔"

حمیرا کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو جھلمل جھلمل کر رہے تھے۔ نہ جانے قاسم ہوا کہ اُس نے بے ساختہ شہزادی حمیرا کا ہاتھ تھام لیا اور تیزی سے کہا۔

"نہیں حمیرا، نہیں! آپ مجھے اتنی عزت مت دیجئے کہ میں آپ کی محبت میں گرفتار جاؤں۔ اور اپنی غزالہ کی یادوں کو بھلا دوں۔"

حمیرا نے اپنی پُرنم پلکیں اُٹھائیں تو اُس کی آنکھوں سے پگھلے ہوئے کانچ کے قطرے اُس کے رخساروں پر ایک ٹھنڈی لکیر چھوڑتے ہوئے دروازے کی دہلیز میں جذب ہو گئے۔ حمیرا ایک سسکی کے ساتھ مسکرا دی۔ اُس نے قاسم سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور جھکاتے ہوئے کہا۔

"آپ پھر کب آئیں گے؟ اب تو کان دروازے کی آہٹ پر لگے رہیں گے۔"

قاسم نے حمیرا کے رخساروں پر بنی لکیروں میں مشعل کی چمک دیکھی اور جانے سے پہلے کہا۔ "میں ضرور آؤں گا۔ آپ کے چچا عباس کے لئے اور سب کے لئے..... بھی میرے گھر آئیے گا۔ میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ ننھے عمر اور علی ہماری بہادر کی شہادت کے بعد سے بے حد اُداس رہنے لگے ہیں۔ آپ آئیں گے تو اُن کا دل جائے گا۔"

قاسم رخصت ہو کر سیدھا گھر پہنچا تو ایک مہمان اُس کا منتظر تھا۔ یہ اُس کا خاص

جسے اُس نے غزالہ کی خبر لانے کے لئے البانیہ بھیجا تھا۔ قاسم نے اُسے دیکھا تو اُس کی سانسیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ وہ غزالہ کے بارے میں کوئی بری خبر نہیں سننا چاہتا تھا۔ اُس کی تمام موہوم اُمیدیں اُس آدمی کو دیکھتے ہی نئے سرے سے جاگ اُٹھیں۔ لیکن جب اُس نے اپنے جاسوس کی کارگزاری سنی تو اُس کے دل پر پھر یاسیت کے بادل چھا گئے۔ اُس کے جاسوس نے اُسے بتایا کہ غزالہ کی کوئی خبر نہیں ملی۔ بلکہ سلطان مراد خان ثانی کے بھیجے ہوئے ایلچی جو سکندر بیگ سے غزالہ کو واپس مانگنے گئے تھے، بھی قتل کروا دیئے گئے۔ اُسے غزالہ ملتی بھی کیسے۔ یا اُس کا جاسوس غزالہ کی کوئی خبر لاتا تو کیسے۔ کیونکہ غزالہ تو سکندر بیگ کے محل میں بھی نہ تھی۔ آج قاسم کو پوری طرح یقین ہو گیا کہ اُس کی غزالہ اس دنیا میں نہ رہی تھی۔

وہ کچھ دن تک غزالہ کی یادوں کے سہارے جیتا رہا۔ لیکن کب تک۔ بالآخر کئی دن بعد ایک بار پھر اُس کے قدم اربان کے گھر کی جانب اُٹھ گئے۔ اُس کی زندگی کا نیا باب شروع ہونے والا تھا۔ کئی ماہ تک اُس کا آنا جانا اربان کے گھر رہا اور شہزادی حمیرا کی آمدورفت قاسم کے گھر رہی۔ یہ ملاقاتیں بہت کم عرصے میں شدید محبت میں بدل گئیں اور ایک دن دونوں گھروں کی رضامندی سے بوسنیا کی شہزادی حمیرا، قاسم کی دُلہن بن کر اُس کے گھر آ گئی۔

✿

دو بار کے تجربے سے سلطان مراد خان ثانی کو بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ شہزادہ محمد خان ابھی سلطنت کے سنبھالنے کی کافی قابلیت پیدا نہیں ہوئی۔ کیونکہ وہ ایک سال میں دو بار تخت نشین ہو چکا تھا لیکن ہر بار سلطان کو خود بگڑتے ہوئے حالات کو سنبھالا دینا پڑتا تھا۔ چنانچہ اُس نے پھر تخت چھوڑنے کا قصد نہ کیا۔ چنانچہ سلطان نے سہ بارہ تخت نشین ہونے کے کچھ عرصہ بعد شہزادہ محمد خان کو ایشیائے کوچک میں بھیج دیا تاکہ وہ وہاں رہ کر سلطنت کے متعلق زیادہ تجربہ حاصل کر سکے۔ بادشاہ تخت سے دستبردار تو ہوتے رہتے ہیں لیکن دوسرا مرتبہ تخت چھوڑ کر پھر سلطنت کی ذمہ داریوں کو اپنے سر لینا صرف سلطان مراد خان ثانی کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہ فلسفی سلطان دنیاوی عظمت کی بے حقیقی سے آگاہ ہو کر 40 سال کی عمر میں دو بار تخت سے علیحدہ ہوا۔

لیکن اس مرتبہ تخت پر آنے کے بعد اُس نے عیسائیوں کو پھر سر اٹھانے کا موقع نہ دیا۔ بلاوجہ کسی کو ستایا۔ حالانکہ شاہِ قسطنطنیہ اپنی شرارتوں اور فساد انگیزیوں کے سبب عثمانیوں

کا سب سے بڑا دشمن اور منبع فساد تھا۔ سلطان کے لئے اُس کا قلع قمع کر دینا کچھ زیا
دُشوار نہ تھا۔ لیکن اُس نے قیصر کو بھی اُس کے حال پر رہنے دیا۔ البتہ اس مرتبہ اُ
''موریا'' کی طرف توجہ کرنی پڑی جہاں قیصرِ قسطنطنیہ کے دو بھائی ''قسطنطین''
''تھامس'' علیحدہ علیحدہ حصوں پر حکمران تھے۔ قسطنطین نے اپنے مقبوضات کے تحفظ
لئے ''خاکنائے کورنتھ'' کی قلعہ بندی کی اور ادھر سے مطمئن ہونے کے بعد ''تھیبس
(THEBES) کے شہر پر جو اُس کی سرحد سے قریب سلطنت عثمانیہ کا مقبوضہ تھا، دفعتہً حملہ
دیا اور تھیبس پر قبضہ کر لیا۔ اس حملہ کی اطلاع ملتے ہی سلطان فوراً موریا کی طرف رو
ہوا۔ ''قورنتھ'' کا مضبوط قلعہ اُس کی راہ میں حائل تھا۔ مگر عظیم آہن گر اُربان کی بنائی
توپوں کی گولہ باری کے سامنے وہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ یہ پہلی جنگ تھی جس
عثمانی فوج نے توپیں استعمال کی تھیں۔ (دولت عثمانیہ) قورنتھ کی فتح کے بعد موریا کا ر
بالکل صاف تھا۔ قسطنطین اور تھامس کے لئے اظہارِ اطاعت کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہ
تھا۔ انہوں نے خراج دینا منظور کیا اور ''موریا'' بھی دولت عثمانیہ کی باجگذار ریاستوں میں
شامل کر لیا گیا۔

اُدھر سلطان کا دیرینہ دشمن ''ہونیاڈے'' اپنی معاہدہ شکنی کے نتیجے میں ہونے وا
''وارنہ'' کی شکست کے بعد سے لے کر اب تک ترکوں سے انتقام لینے کی تیاریوں
مصروف رہا تھا۔ اُس کے دامن شہرت پر شکست وارنہ کا داغ بہت بدنما تھا۔ چنانچہ
نے چار سال کے اندر اسّی ہزار کی ایک زبردست فوج پھر جمع کر لی اور ''دریائے ڈینوب
کو عبور کر کے ''سربیا'' میں داخل ہو گیا۔ یہاں سربیا اور بوسنیا کے سپاہی ایک بار
ہونیاڈے کے ساتھ مل گئے۔ حالانکہ سربیا اور بوسنیا نے جنگ وارنہ کے بعد دولت عثمانیہ
اطاعت قبول کر لی تھی۔ مگر ہونیاڈے کی کوششوں سے یہ دونوں حکومتیں اپنے معاہدے
منحرف ہو گئیں اور مکمل آزادی کی خواہش انہیں سلطان کے بالمقابل میدانِ جنگ میں
کھینچ لائی۔ یہ قوت آزمائی ''کسودہ'' کے اس میدان میں ہوئی جہاں تقریباً ساٹھ سال
عثمانی فرمانروا مراد خان اوّل نے سربیا کی طاقتور سلطنت کو شکست دے کر اپنا مطیع
تھا۔ اس مرتبہ تین روز کی شدید جنگ کے بعد 18 شعبان 852ھ بمطابق 17
1448ء کو بالآخر سلطان نے ہونیاڈے کی متحدہ افواج کو بری طرح شکست دی۔
کی اس عظیم الشان جنگ کا نتیجہ یہ ہوا کہ سربیا کی آزادی سلب کر لی گئی اور وہ
عثمانیہ کا حصہ بن گیا۔ البتہ سلطان نے بوسنیا سے اس مرتبہ بھی سالانہ خراج وصول کر

اکتفا کیا۔ اس جنگ میں بھی حسب معمول قاسم بن ہشام اپنے برق رفتار دستے کے ہمراہ
شریک ہوا اور اُس نے کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔ اب وہ صرف ایک مجاہد اور ایک سپاہی
نہ تھا بلکہ ایک چاند سی بیٹی کا باپ بھی تھا۔ اُس نے اپنی بیٹی کا نام ''غزالہ'' رکھا اور وہ
سے کبھی کبھی مارسی کہہ کر بھی پکارتا تھا۔

کسودہ کی جنگ کے خاتمے پر سلطان نے سکندر بیگ کو ایلچیوں کے قتل اور دیگر جرائم
کی وجہ سے سبق سکھانا ضروری سمجھا اور البانیہ پر چڑھائی کر دی۔ لیکن البانیہ سکندر بیگ کی
ماہرانہ چالوں کی وجہ سے سلطان کے لئے تر نوالہ ثابت نہ ہوا۔ البانیہ کے پیچ در پیچ پہاڑی
ڈوں کی وجہ سے عثمانی فوجوں کو کھل کر لڑنے کا موقع نہ ملتا تھا۔ چنانچہ متعدد کوششوں کے
وجود سلطان البانیہ کو فتح نہ کر سکا۔ حتیٰ کہ سلطان مراد خان ثانی کا وقت وصال قریب آ
تھا۔

5 محرم الحرام 855ھ بمطابق 9 فروری 1451ء کو سلطان مراد خان ثانی نے عثمانی
سلطنت ادرنہ میں وفات پائی اور اُس کی تجہیز و تکفین قدیم پایۂ تخت ''بروصہ'' میں ہوئی۔
عمر اور علی، علی الترتیب نو اور بارہ سال کے ہو چکے تھے۔ ننھی غزالہ اب حمیرا کے ساتھ
تو ماں کی اُنگلی نہ پکڑتی۔ وہ پانچ سال کی ہونے والی تھی۔ چھ سال کے اس عرصہ میں
م کی بوڑھی ماں بھی اپنے خالق حقیقی سے جا ملی تھی۔ قاسم کی کوششوں سے طاہر دو سال
اور غمگین رہنے کے بعد شادی پر آمادہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ قاسم نے بوڑھے ملاح عباس
بیٹی مریم کا ہاتھ اپنے بھائی طاہر بن ہشام کے لئے مانگ لیا تھا۔ لیکن طاہر کی ابھی تک
کے بطن سے کوئی اولاد نہ تھی۔ اربان اور عباس بھی قاسم اور طاہر کے ساتھ ہی رہتے
قاسم اب ایک پختہ کار اور زیرک مرد بن چکا تھا۔ اُس کی عمر سلطان مراد خان ثانی کی
کے وقت بمشکل تیس سال بھی نہ تھی۔ لیکن اُس کے تجربہ اور دانائی نے اُسے صف
کے سالاروں میں شمار کروا دیا تھا۔

بھی البانوی کنیز مارتھا کی بیٹی مارسی اُسے کبھی کبھی بے حد یاد آتی۔ وہ مارسی کو یاد
اُداس ہو جاتا۔ وہ کبھی کبھی لالہ شاہین کی یادگار جا کر ٹوٹی ہوئی بارہ دری میں بیٹھ
کے ساتھ کئے ہوئے وعدے دہرانے لگتا۔ سلطان کی وفات سے قاسم کو بھی بہت
تھا۔ آغا حسن ابھی تک ینی چری میں موجود تھا اور اب وہ اپنے تجربے کی بنیاد پر
کا نائب سپہ سالار بن چکا تھا۔
کے زیر کمان دس ہزار کی سپاہ تھی۔ البتہ اُن کے دوسرے تمام دوست یا تو شہید

ہو چکے تھے اور یا ابھی تک اپنے سابقہ عہدوں پر ہی موجود تھے۔ خصوصاً ریاض بیگ تک بھی ینی چری میں موجود تھا۔ سلطان کی وفات ہوئی تو سکندر بیگ نے سکھ کا سا لیا۔

شہزادہ محمد اب نوعمر لڑکا نہیں تھا بلکہ ایک کڑیل اور ذہین نوجوان بن چکا تھا۔ باپ کی وفات پر اُسے ایشیائے کوچک سے فوراً بلوا کر ادرنہ کے تخت پر بٹھا دیا گیا۔ تخت نشینی کے وقت سلطان محمد خان کی عمر 21 سال چند ماہ تھی۔

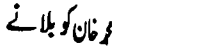

نوٹ: حصہ اول ''درویش بادشاہ'' تمام ہوا۔

اوراقِ گزشتہ

(1)

اس مرتبہ شہزادہ محمد تخت نشین ہوا تو اُس کی عمر بائیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اس سے پہلے وہ دو مرتبہ جب ابھی اُس کی عمر صرف چودہ پندرہ سال تھی باپ کی زندگی میں تخت نشین ہو چکا تھا۔ سلطان مراد خان ثانی کی وفات کے بعد ایشیائے کوچک میں موجود شہزادہ محمد خان کو بلانے کے لئے اراکین سلطنت نے اُس کے پاس خبر بھیجی اور وہ بلا توقف وہاں سے روانہ ہو کر درِ دانیال کو عبور کرتا ہوا ادرنہ پہنچا۔ یہیں اُس کی تخت نشینی کے مراسم ادا ہونے تھے۔

سلطان محمد خان خاندانِ آلِ عثمان کا ساتواں نوجوان فرمانروا تھا۔ سلطنت عثمانیہ کا بانی خود ''عثمان خان'' تھا۔ جو ''غیاث الدین کیخسرو سلجوقی'' کا داماد تھا۔ سلطان محمد خان، عثمان خان کی پشت میں ساتواں حکمران تھا۔ عثمانی سلطنت کی بنیاد آج سے ایک سو چھپن برس قبل اُس وقت رکھی گئی تھی جب 1300ء عیسوی میں تاتاریوں نے ایشیائے کوچک پر حملہ کر کے سلجوقی فرمانروا ''سلطان علاؤالدین'' اور پھر اُس کے بیٹے ''غیاث الدین کیخسرو'' کو قتل کر دیا تھا۔ غیاث الدین کا کوئی بیٹا نہ تھا۔ صرف ایک لڑکی تھی جو ''عثمان خان'' کے عقد میں تھی۔ لہٰذا اراکین سلطنت نے متفقہ طور پر عثمان خان کو ''قونیا'' کے تخت سلطنت پر بٹھا کر اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا تھا۔ اس طرح ''اسرائیل بن سلجوق'' کی اولاد نے جو سلطنت 1077ء عیسوی میں قائم کی تھی، 1300ء عیسوی میں اُس کا خاتمہ ہو گیا اور اس کی جگہ سلطنت عثمانیہ قائم ہوئی۔ (جو موجودہ زمانے 1915ء تک رہی.....)۔

عثمانی سلطنت سے پہلے سلجوقی سلطنت تھی جس کا جد امجد اسرائیل بن سلجوق تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس کو ''سلطان محمود غزنوی'' کے حکم سے سات برس تک ہندوستان کے ''قلعہ ہانسی'' میں قید رہنا پڑا تھا۔

عثمانی سلطنت کا بانی عثمان خان، سلجوقی عہد میں انگورہ کے ایک جاگیردار ''اُرطغرل'' کے گھر پیدا ہوا۔ یہ سلطان علاؤ الدین کا زمانہ تھا۔ ''اُرطغرل'' کی بہادری اور معاملہ فہمی کو دیکھ کر ''سلطان علاؤالدین سلجوقی'' نے اُسے بازنطینی سرحدات کی جاگیریں سونپ دیں۔ سلجوقی سلطان علاؤالدین، اُرطغرل خان کا ممنونِ احسان بھی تھا۔

دراصل سلطان محمد خان کا قبیلہ اولین اولین اُنہی مہاجر قبائل میں سے تھا جو "چنگیز خان" کے حملوں کے بعد اپنا وطن چھوڑ کر مارے مارے پھر رہے تھے۔ یہ قبیلہ "ترکمان اوغوز" کے قبیلہ کا ایک جزو تھا جو عثمان خان کے دادا ارطغرل خان کے باپ "سلیمان شاہ" کی سرکردگی میں اپنے وطن خراسان (افغانستان) کو چھوڑ کر مختلف ملکوں میں گھومتا ہوا شام کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں دریائے فرات کو عبور کرتے ہوئے سلطان محمد خان کا خوارزم جد امجد "سلیمان شاہ" ڈوب کر ہلاک ہو گیا۔ قبیلے کا بیشتر حصہ اُسی وقت منتشر ہو گیا۔ جو لوگ رہ گئے وہ اُرطغرل خان اور اُس کے بھائی "دوندار خان" کے ساتھ ایشیائے کوچک کی طرف روانہ ہوئے اور سلطان علاؤالدین سلجوقی کی سلطنت میں داخل ہو گئے۔

چنگیز خان نے خوارزم شاہ کو برباد کر دیا تھا اور اُس کی تمام سلطنت ٹکڑوں میں تقسیم کر کے اپنے بیٹوں میں بانٹ دی تھی۔ خراسان کا یہ افغانی قبیلہ جب لٹا پٹا سلیمان شاہ کے ڈوبنے کے بعد ارطغرل خان کی قیادت میں چلتا ہوا سلطان علاؤالدین سلجوقی کی سلطنت میں داخل ہوا تو یہ جماعت صرف چار سو بیس گھرانوں پر مشتمل تھی۔ (ٹرکی ایمپائر از ایور سلے) چار سو بیس گھرانوں پر مشتمل یہ جماعت سلطان علاؤالدین کے زیر سایہ پناہ کے لئے پایۂ تخت قونیا کی طرف بڑھی چلی جا رہی تھی کہ راستے میں انگورہ کے قریب اُرطغرل خان کو دو فوجیں مصروفِ جنگ نظر آئیں۔ وہ کسی فریق سے واقف نہ تھا۔ لیکن دیکھ کر کہ اُن میں ایک تعداد کے لحاظ سے کمزور اور دوسری قوی ہے، اپنے سواروں کے دستہ کے ساتھ جن کی مجموعی تعداد صرف 444 تھی، کمزور فریق کی حمایت کے لئے بڑھا۔ ایسی جانبازی سے حملہ آور ہوا کہ دشمن کو میدان چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ فتح حاصل کرنے کے بعد اُسے معلوم ہوا کہ جس فریق کی اُس نے یوں بروقت مدد کی تھی وہ سلطان "علاؤالدین سلجوقی" کی فوج تھی جو ایشیائے کوچک کا بادشاہ تھا۔ اور دوسری فوج تاتاریوں کی تھی۔

اُرطغرل کے اس کارنامہ کے صلہ میں سلطان علاؤالدین نے اُسے "سفوت" کا وہ علاقہ جو "دریائے سقاریہ" کے بائیں جانب بازنطینی (قسطنطنیوی) سرحد کے قریب تھا، جاگیر میں عطا کر دیا اور سفوت کا شہر بھی اُسے دے دیا۔ اس علاقہ میں اُرطغرل اُس کے ساتھیوں نے جو خراسان اور آرمینیا سے آئے تھے، بود و باش اختیار کی۔ علاؤالدین نے اُرطغرل کو اس علاقے میں سپاہ رکھنے کی اجازت بھی دی اور بازنطینی داروں کو وقتاً فوقتاً سبق سکھانے کی ہدایت بھی کی۔ بازنطینی سلطنت کا دارالحکومت تھا۔ علاؤالدین سلجوقی نے جس خراسانی نوجوان اُرطغرل کو بازنطینیوں کی چھیڑ

جواب دینے کی ہدایت کی تھی، ٹھیک ڈیڑھ سو سال بعد اُسی شخص کی اولاد میں سلطان محمد فاتح پیدا ہوا جس نے بازنطینی دارالسلطنت قسطنطنیہ بالآخر فتح کر کے دنیائے عیسائیت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

ارطغرل خان کا انتقال 1288ء عیسوی میں 90 سال کی عمر میں ہوا۔ وہ عمر بھر سلطان علاؤالدین سلجوقی کا منظورِ نظر رہا۔ حتیٰ کہ ایک وقت وہ آیا جب اُرطغرل نے علاؤالدین کے نائب کی حیثیت سے تاتاریوں اور بازنطینیوں کی ایک متحدہ فوج کو شکست دی۔ چنانچہ سلطان علاؤالدین نے "بنی شہر" اور "بروصہ شہر" بھی اُرطغرل کو دے دیئے۔ اُس نے اُرطغرل کی جاگیر کا نام "سلطانوی" رکھا اور اُسے اپنے مقدمۃ الجیش، سپہ سالار مقرر کر دیا۔

ہلال، سلطان علاؤالدین کے علم کا نشان تھا..... اُرطغرل کی وفات پر اُس کا بڑا لڑکا عثمان خان اُس کا جانشین ہوا۔ یہ دولت عثمانیہ کا بانی اور سلطنت عثمانیہ کا پہلا تاجدار تھا۔ اُس کے باپ نے اپنی زندگی میں سلجوقی سلطان کے ساتھ ہمیشہ وفاداری قائم رکھی تھی۔ سلطان نے بھی یہی روش اختیار کی۔ لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب دولت سلجوقیہ دم توڑ رہی تھی اور ایشیائے کوچک میں طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی۔ عثمان صرف بازنطینی دشمنوں کے خلاف برسرِ پیکار رہا۔ بالفاظ دیگر عثمان کی توجہ عیسائیوں کے خلاف مبذول رہی۔ اُسی زمانہ میں شہنشاہِ قسطنطنیہ کوہ اولمپس کے دروں کی حفاظت نہ کر سکا اور عثمان کی فوج "بیتھینیا" کے میدانوں میں داخل ہو گئی۔ بازنطینی سلطنت جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک دنیا کی عظیم ترین سلطنتوں میں شمار کی جاتی تھی، عثمان کے دور میں رُو بہ زوال تھی۔ فرقہ وارانہ جنگوں اور حکومتی بدنظمیوں نے عثمان کو موقع دیا کہ وہ بازنطینی سلطنت کے بیشتر علاقوں پر قبضہ کر لے۔ ایک زمانہ تھا جب قسطنطین کی حکومت ایشیائے کوچک تک پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن اب ایشیائے کوچک میں قسطنطین کے پاس صرف "نائیسیا"، "انگیمیڈیا" اور اُن کے نواحی اضلاع باقی رہ گئے تھے۔ عثمان کے لئے بازنطینی علاقوں کی طرف توجہ ہونے کی وجہ اسلامی تبلیغ تھی۔

بہرحال عثمان نے مسلم افواج کے لئے یورپ کے دروازے کھول دیئے اور درِ دانیال کو عبور کر کے عثمان کی اولاد کے لئے کھیل بن گیا۔ عثمان نے سلجوقی سلطان کی اطاعت میں رہ کر بڑے بڑے معرکے سر کئے جن میں "قراجہ حصار" کا معرکہ بہت مشہور ہے۔ اس قلعہ کو فتح کر کے مسلمانوں نے یورپیوں کو خبردار کر دیا کہ اب اُن کا عہد حکومت رخصت ہوا چاہتا ہے۔ سلطان علاؤالدین سلجوقی نے اپنے بہادر سپہ سالار عثمان کو "نیز بیگ" کے

خطاب سے سرفراز کر کے اُسے اپنا سکہ جاری کرنے اور اپنا نام جمعہ کے خطبہ میں پڑھوانے کرنے کی بھی اجازت دے دی۔ اس طرح صرف لقب کے علاوہ بادشاہی کے تمام امتیازات عثمان کو حاصل ہو گئے۔ اور پھر یہ کمی بھی چند سالوں میں ہی پوری ہو گئی جب 1300ء میں سلطان علاؤالدین سلجوقی اور اُس کے بیٹے سلطان غیاث الدین سلجوقی کی یکے بعد دیگرے وفات کے بعد عثمان کو ایک آزاد اور خودمختار تاجدار تسلیم کر لیا گیا۔

سلجوقی خاندان کی حکومت کے خاتمہ کے بعد آلِ عثمان کی حکومت کا آغاز ہوا۔ کیونکہ بعض سلجوقی امراء جن میں ''امیر کرمانیا'' خاص طور پر شامل ہے، عثمان کو حسد اور رقابت سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ کچھ ہی عرصہ بعد امیر کرمانیا کے ساتھ عثمان کی زندگی میں ہی جنگ کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا جو اُس کے متعدد جانشینوں کے عہد تک جاری رہا۔ عثمان نے خاص اسلامی حکومت کو رواج دیا۔ اُس نے 1301ء میں ''نائیکومیڈیا'' سے شمال ''قیون حصار'' کے مقام پر پہلی بار شہنشاہِ قسطنطنیہ کی باقاعدہ افواج سے مقابلہ کیا جس میں اُسے شاندار کامیابی حاصل ہوئی اور چھ سال کے اندر اُس کی فتوحات کا دائرہ ''بحرِ مرمرہ'' کے ساحل تک پہنچ گیا۔ وہ اپنی زندگی میں بیک وقت تین محاذوں پر فتوحات حاصل کرتا رہا۔ ایک..... باغی سلجوقی امراء کے خلاف۔ دوسرے..... تاتاریوں کے خلاف اور تیسرے..... بازنطینی افواج یعنی شاہِ قسطنطنیہ کے خلاف۔ 1317ء میں عثمان نے ''بروصہ'' کا محاصرہ کیا۔ یہ شہر قیصرِ قسطنطنیہ کا ایشیائے کوچک میں اہم مرکز تھا۔ یہ دنیا کا ایک طویل ترین محاصرہ تھا جو دس سال تک جاری رہا۔ بالآخر 1326ء میں محصورین نے ہتھیار ڈال دیئے۔ عثمان خان کا بیٹا ''اُور خان'' فاتح کی حیثیت سے شہر میں داخل ہوا۔ عثمان اس وقت ''سغوت'' میں بسترِ مرگ پر تھا لیکن وفات سے قبل ''اُور خان'' اپنے باپ کے پاس فتح کی خوشخبری لے کر پہنچا۔ چنانچہ عثمان نے اُسے اپنا جانشین مقرر کر دیا اور حکم دیا کہ اُسے ''بروصہ'' میں دفن کیا جائے۔ اور اس شہر کو عثمانی مملکت کا پایۂ تخت بنایا جائے۔ چنانچہ اُس کی وصیت کے مطابق اُسے ''بروصہ'' میں دفن کیا گیا۔

عثمان دولت عثمانیہ کا پہلا تاجدار تھا۔ اُس نے اپنے لئے سلطان کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ اُس کے بیٹے ''اُور خان'' اور پوتے ''مراد اوّل'' نے بھی صرف ''امیر'' کا لفظ ہی اختیار کئے رکھا۔ سلطنت عثمانیہ کے بانی عثمان کی شادی بھی دلچسپ انداز میں ہوئی۔ شہر ''ابترونی'' نام کی ایک بستی میں ایک خدا رسیدہ عالم اور درویش ''اَدہ بالی'' رہا کرتے تھے۔ عثمان اپنی نوعمری کے زمانے میں اکثر حاضر ہوتا رہتا تھا۔ اُن کی ایک نہایت حسین

بیٹی کا نام ''مال خاتون'' تھا۔ ایک روز اتفاق سے عثمان کی نظر اُس دوشیزہ پر پڑ گئی اور وہ دیکھتے ہی اُس پر فریفتہ ہو گیا۔ اُس نے نکاح کا پیغام دیا لیکن اَدہ بالی نے ایک درویش اور ایک امیر سلطنت کا فرق جانتے ہوئے انکار کر دیا۔ دو سال تک عشق و محبت کا یہ سلسلہ جاری رہا اور عثمان نے اَدہ بالی کے گھر میں آمد و رفت جاری رکھی۔ اس عرصہ میں چند اور بڑے سرداروں نے بھی جو طاقت اور شہرت میں عثمان سے بڑھے ہوئے تھے مال خاتون سے شادی کی خواہش کی۔ لیکن اَدہ بالی نے اُن کو بھی صاف جواب دیا۔ بالآخر ایک رات جب عثمان اَدہ بالی کے گھر مقیم تھا اُس نے یہ عجیب و غریب خواب دیکھا کہ ایک چاند ہلال بن کر اَدہ بالی کے سینے سے نکلا اور رفتہ رفتہ بدرِ کامل بن کر اُس کے یعنی عثمان کے سینے میں اُتر آیا۔ پھر اُس کے پہلو سے ایک زبردست درخت نمودار ہوا جو بڑھتا ہی چلا گیا۔ یہاں تک کہ اُس کی شاخیں بحر و بر پر چھا گئیں۔ درخت کی جڑ سے دنیا کے چار بڑے دریا دجلہ، فرات، نیل اور ڈینوب بہہ رہے تھے۔ اور چار بڑے پہاڑ کوہِ قاف، کوہِ بلقان، کوہِ طور اور کوہِ اٹلس اس کی شاخوں کو سنبھالے ہوئے تھے۔ دفعتہً ایک تیز ہوا چلی اور اس درخت کی پتیوں کا رُخ جو شکل میں تلوار سے مشابہہ تھیں، ایک عظیم الشان شہر کی طرف ہو گیا۔ یہ شہر دو سمندروں اور دو براعظموں کے اتصال پر واقع تھا اور مثلِ ایک انگوٹھی کے دکھائی دیتا تھا۔ جس میں دو نیلم اور دو زمرد جڑے ہوئے تھے۔ عثمان اس انگوٹھی کو پہننا ہی چاہتا تھا کہ اُس کی آنکھ کھل گئی..... بیدار ہونے کے بعد اُس نے یہ خواب اَدہ بالی سے بیان کیا۔ اَدہ بالی نے اس میں عثمان کے شاندار مستقبل کی تعبیر دیکھی اور اسے ایک غیبی اشارہ سمجھ کر ''مال خاتون'' کو اُس کے نکاح میں دے دیا۔ (دولت عثمانیہ)

عثمان کا یہی خواب جو آج سے ڈیڑھ سو برس قبل اُس نے دیکھا تھا، اب سلطان محمد خان کے ہاتھوں پورا ہونے والا تھا۔ دو سمندروں اور دو براعظموں کے اتصال پر واقع شہر قسطنطنیہ ہی تھا۔ سلطان محمد خان کے آباؤ اجداد میں عثمان کا بیٹا ''اُور خان'' بھی ایک فاتح اور بہادر بادشاہ تھا۔ یہ عثمانی سلطنت کا دوسرا تاجدار تھا اور عثمان خان کا چھوٹا بیٹا تھا۔ اُس کا بڑا بھائی علاؤالدین، علوم دینیہ اور فلسفہ و تصوف کا دلدادہ ہونے کے ساتھ ساتھ دانشور اور مدبر بھی تھا۔ روئے زمین کی پہلی باقاعدہ باوردی، تنخواہ دار، کل وقتی اور بیرکوں (کینٹ) میں رہنے والی فوج ''ینی چری'' کا آغاز اسی شخص کے مشورے پر کیا گیا۔ اس تجویز میں ''قرا خلیل'' کا بھی حصہ تھا۔ اس سے پہلے تک دنیا میں فوجیں منظم بھی ہوتی تھیں اور تربیت بھی۔ لیکن صرف جنگ کے دنوں میں۔ یونانی اور رومی سلطنتوں میں بھی یہی رواج

تھا۔ ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ'' نے فوجیوں کی تنخواہیں مقرر کیں اور چھٹیوں کا رواج
کیا۔ لیکن کینٹ کا تصور اُس وقت بھی نہ تھا۔ چنانچہ یہ ''اُور خان'' ہی تھا جس نے
بھائی علاؤالدین اور رشتہ دار ''قرا خلیل'' کے مشورے سے ان عیسائی نوجوان قیدیوں کو
مختلف جنگوں میں اُس کے ہاتھ لگتے تھے، تربیت دے کر ایک باقاعدہ فوج بنائی جس کا
''ینی چری'' رکھا گیا۔

''اُور خان'' نے اپنی حکومت کے پہلے ہی سال 726ھ بمطابق 1326ء میں ''نائیکیا
میڈیا'' پر قبضہ کر لیا۔ ''بروصہ'' اُس کا دارالسلطنت تھا۔ ''قسطنطین'' کے ایشیائی مقبوضات
میں اب صرف ایک ہی بڑا شہر ''نائیسیا'' رہ گیا تھا جو اپنی عظمت اور اہمیت کے اعتبار
قسطنطنیہ کے بعد دوسرے درجے پر تھا۔ شاہِ قسطنطنیہ یعنی قسطنطین نے اس شہر کو بچانے
بے حد کوشش کی۔ اُور خان نے اس کا سخت محاصرہ کیا اور 730ھ بمطابق 1330ء
اسے فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس شہر کے لوگ بھی بکثرت اسلام
داخل ہوئے۔ اسی دوران 1333ء میں ایک باغی ترک امیر کے شہر ''قراسی'' پر بھی
خان'' کو قبضہ کرنا پڑا۔ کچھ ہی عرصہ میں اُور خان کی سلطنت ''اناطولیا'' کی شمال
سرحدات تک پھیل گئی۔

اُور خان نے اپنی توجہ زیادہ تر فتوحات کی بجائے سلطنت کے انتظام انصرام اور
کی فلاح و بہبود پر رکھی۔ وہ آئین وضوابط کے مطابق پوری سلطنت کو اسلامی سانچے
ڈھالنا چاہتا تھا۔ 1336ء کے بعد اُور خان نے 20 سال تک کوئی جنگ نہ کی۔ بلکہ
عوام کی تربیت کرتا رہا۔ سلطنت کے اندرونی انتظامات سے فارغ ہو کر وہ یورپ کی جا
متوجہ ہوا۔ اُس کی زندگی کے آخری چند سال شہنشاہِ قسطنطنیہ کے یورپین مقبوضات میں
جانے کی کوشش میں صرف ہوئے۔ قسطنطین کی سلطنت جو کبھی دریائے ڈینوب اور
میں اناطولیا اور شام تک پھیلی ہوئی تھی اب صرف ''تھریس''، ''مقدونیا'' کے ایک
''سالونیکا'' اور یونان میں ''موریا'' کے ایک بڑے حصے تک محدود تھی۔ ایشیائی مقبوضا
تقریباً عثمانیوں کے قبضے میں جا چکے تھے۔ اس زمانہ میں قسطنطنیہ کے تخت کا جھگڑا اُٹھ
ہوا۔ اُور خان نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور ایک فریق کنٹا کوزین کی مدد کے لئے
ہزار سپاہی بھیج دیئے..... اسی طرح اُور خان نے ایک مرتبہ ''کنٹا کوزین'' اور دوسرے
''جان پلیولوگس''، یعنی دونوں کی درخواست پر شاہِ سربیا کے خلاف بھی فوج بھیجی۔
یہ بادشاہ ''اسٹیفن ڈوشن'' ''سالونیکا'' پر حملہ کر چکا تھا..... کچھ عرصہ بعد قسطنطنیہ سے

جھگڑا پھر اُٹھا تو اُور خان نے اپنے بیٹے ''سلیمان پاشا'' کی قیادت میں بیس ہزار سپاہی کنٹا
کوزین کی مدد کے لئے بھیجے۔ جان پلیولوگس کو شکست ہوئی اور کنٹا کوزین نے تخت سنبھال
لیا اور اُور خان کو حسب معاہدہ قلعہ ''زنپ'' دے دیا گیا جس میں سلیمان پاشا نے عثمانی
رنے متعین کر دیئے۔ اتفاق سے چند ہی دن بعد تھریس میں زلزلہ آیا۔ جس سے بہت
ے شہروں کی فصیلیں گر گئیں۔ انہی میں ''گیلی پولی'' بھی تھا جو درِ دانیال کے مغربی ساحل
ب سے اہم قلعہ تھا۔ سلیمان پاشا ''زینپ'' میں تھوڑے ہی فاصلے پر موجود تھا۔ اُس
نے زلزلے کو تائید غیبی سمجھا اور آگے بڑھ کر گیلی پولی پر قبضہ کر لیا۔ گیلی پولی کی فتح سے
رکوں کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ 755ھ بمطابق 1354ء میں انہوں نے پہلی
ار فاتح کی حیثیت سے یورپ میں قدم رکھا اور مسیحی یورپ میں ایک عظیم الشان اسلامی
لطنت کی بنیاد ڈالی جو دو صدیوں کے اندر گیلی پولی سے ''ویانا'' کی دیواروں تک پھیل
گئی۔ قرونِ اولیٰ کے مجاہدوں نے مغربی یورپ سسلی، روما اور اسپین تک اسلام کی آواز
پہنچائی تھی۔ ترک مجاہدوں نے مشرقی یورپ کو بھی اسلامی دعوت سے بہرہ اندوز کر دیا۔

اُور خان کا بیٹا ''سلیمان پاشا'' 1358ء میں شکار کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر کر ہلاک
ہوا۔ یہ شہزادہ فن سپہ گری و سپہ سالاری میں ممتاز اور خاندانِ عثمانی کے اعلیٰ اوصاف کا مالک
تھا۔ اُور خان بیٹے کی وفات سے بے حد غمگین ہوا اور دوسرے ہی سال اُس کا بھی انتقال
ہو گیا۔ وہ بہت نیک اور درویش صفت بادشاہ تھا۔ غریبوں میں روٹی اور شوربا اپنے ہاتھ
سے تقسیم کیا کرتا تھا۔ بڑے بڑے مشہور علماء اور مشائخ جن میں ''ملا داؤد قیصری'' اور ''تاج
الدین'' شامل ہیں، اُس کی صحبت میں رہا کرتے تھے۔

اُور خان کی وفات پر اُس کا چھوٹا لڑکا ''مراد خان اوّل'' چالیس سال کی عمر میں تخت
نشین ہوا۔ عنانِ حکومت کو ہاتھ میں لیتے ہی مراد خان نے یورپ کی طرف بڑھنے کا قصد
کیا۔ لیکن ''امیر کرمانیا'' نے قدیم عداوت کی بناء پر ایشیائے کوچک میں بغاوت کر دی۔
اسے فوراً موقع پر پہنچ کر بغاوت کا استیصال کیا۔

یہاں سے فارغ ہو کر وہ یورپ کی طرف پلٹا اور 1360ء میں درِ دانیال کو عبور کر کے
فتوحات کا وہ حیرت انگیز سلسلہ شروع کیا جو 1389ء میں صرف اُس کی شہادت پر ''جنگ
کوسوا'' میں ختم ہوا۔

1363ء میں مراد خان اوّل نے درِ دانیال کو عبور کر کے ایک زبردست فوج کے ساتھ
یورپ میں قدم رکھا۔ اور سب سے پہلے ''قلعہ شورلو'' پر قبضہ کیا جو قسطنطنیہ سے صرف پانچ

میل کے فاصلے پر تھا۔ اس کے بعد دوسرا قلعہ ''کرک کلیسے'' فتح ہوا۔ اسی سال ''بابا'' کے مقام پر بازنطینیوں کے ساتھ مراد کو ایک بڑی جنگ لڑنی پڑی جس میں مراد نے اُنہیں کاری طرح شکست دی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ''ایڈریانوپل'' یعنی ''ادرنہ'' نے فوراً ہتھیار ڈال دیئے۔ اور اس طرح تمام ''تھریس'' مراد کے قبضے میں آ گیا۔ اس کے بعد عثمانی جنرل ''لالہ شاہین'' ''بلغاریہ'' میں داخل ہو کر ''فلپوپولس'' پر قبضہ کر لیا جو کوہِ بلقان کے جنوب میں سلطنت بازنطینی کا مقبوضہ تھا۔ چنانچہ قسطنطین کو مراد سے صلح کرنی پڑی۔ یورپ میں مراد کا مقابلہ اُس وقت تک صرف بازنطینیوں سے تھا اور دوسری مسیحی حکومتوں نے ترکوں کی مدافعت میں سلطنت بازنطینی کو کوئی مدد نہیں دی تھی۔ لیکن 1363ء میں ''پوپ اربن پنجم'' نے ہنگری، سربیا، بوسنیا اور ولاچیہ کے فرمانرواؤں کو آمادہ کیا کہ ترکوں کے بڑھتے ہوئے روکنے کے لئے اپنی فوجیں روانہ کریں۔ چنانچہ اتحادیوں نے بیس ہزار فوج ''تھریس'' روانہ کی۔ لیکن ''جنرل لالہ شاہین'' نے اُنہیں شکست دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوہِ بلقان بھی سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا گیا۔ اسی جنگ کے بعد ''ڈیموٹیکا'' کو جو ''تھریس'' واقع تھا، مراد نے اپنا پایۂ تخت بنا لیا۔ اور پھر تین سال کے بعد ''ادرنہ'' کو دارالسلطنت قرار دیا۔ ''جنگ مارٹیزا'' کے بعد شہنشاہ سلطان کا باجگوار بن گیا۔ لیکن شہنشاہِ قسطنطنیہ کو توہین گوارا نہ ہوئی۔ چنانچہ اُس نے 1369ء میں ''روما'' کا سفر کیا۔ اور پاپائے روم سے سلطان کے خلاف مدد کی درخواست کی۔ اُن دنوں ''رومن کلیسا'' اور ''یونانی کلیسا'' شہنشاہ کا مذہب تھا..... کے مابین دشمنی کی حد تک اختلافات تھے۔ شہنشاہ نے ذلت کی اور کلیسائے رومہ کی برتری تسلیم کر لی۔ لیکن پھر بھی اُسے اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی اور پھر جب واپسی پر وہ ''وینس'' سے گزر رہا تھا تو اپنے بعض قرض خواہوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔ ادھر قسطنطنیہ میں اُس کا لڑکا ''ایڈرونکس'' بادشاہ بن بیٹھا۔

مراد خان اول اپنے اصولوں میں بے حد سخت تھا۔ اُس کا سب سے چھوٹا لڑکا ''صادوجی'' ایک مرتبہ عیسائیوں کے ساتھ مل گیا۔ اور جب مراد نے اُسے گرفتار کیا تو بیٹے کی آنکھوں میں گرم سیسہ ڈال کر اُسے اندھا کر دیا اور پھر اُسے قتل کر دیا۔ 1371ء میں سلطان مراد خان اوّل کے سپہ سالار ''لالہ شاہین'' نے ''صوفیا'' کے قریب کے میدان میں بلغاری اور سربیائی افواج کا مقابلہ کیا اور اُن کو سخت شکست دی۔ اس کے بعد کوہِ بلقان تک بلغاریہ کا سارا علاقہ سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا گیا۔ دوسرے

''لالہ شاہین'' اور عثمانی فوج کے ایک اور جنرل ''افرینوس'' نے ''مقدونیا'' پر حملہ کیا۔ جو ''سربیا'' کا ایک صوبہ تھا۔ وہاں سے ''کوالا ڈروما'' اور ''سریز'' کے شہروں کو فتح کرتے ہوئے یہ فوج ''دریائے دردار'' کو عبور کر گئی۔ مراد نے سربیا، البانیہ اور بوسنیا کو اسی موقع پر اپنی سلطنت کا باجگوار بنا لیا۔ بلغاریہ کے بادشاہ سلیمان نے اپنی لڑکی حرمِ سلطانی میں پیش کر کے جان بچائی۔ پھر یکے بعد دیگرے ''موناستر'' اور ''صوفیا'' بھی فتح ہو گئے۔ مراد اول نے توسیع سلطنت کے سلسلے میں بہت تیزی دکھائی۔

1376ء میں مراد نے اپنے شہزادے ''بایزید یلدرم'' کا نکاح ''امیر کرمیان'' کی بیٹی سے کر دیا۔ ''کرمانیا'' اور آلِ عثمان کی آویزش ابتداء سے چلی آتی تھی۔ اسے دور کرنے کے لئے مراد نے اپنی لڑکی ''نفیسہ'' کا نکاح امیر کرمانیا سے کر دیا۔ تقریباً دس سال تک یہ صلح رہی۔ لیکن پھر 1377ء میں دونوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ میں ''امیر کرمانیا'' نے شکست کھائی اور شہزادہ ''بایزید'' کو ''یلدرم'' کا خطاب ملا۔

مراد کے خلاف مسیحی حکومتوں کا اتحاد سربیا سے شروع ہوا۔ اس اتحاد میں سربیا، بوسنیا اور بلغاریہ کے علاوہ البانیہ، ولاچیہ اور ہنگری نے بھی پوری شرکت کی۔ ''پولینڈ'' نے بھی اپنی فوج بھیجی۔ یوں یہ ایک صلیبی جنگ بن گئی۔ یہ اتحاد بظاہر ترکوں کو یورپ سے نکال دینے کے لئے کافی تھا۔ مراد 70 سال کی عمر میں اس فوج سے نمٹنے کے لئے نکلا۔ لیکن مراد کے پہنچنے سے پہلے ہی اتحادیوں نے بوسنیا میں عثمانی فوج پر حملہ کر دیا اور پندرہ ہزار ترکوں کو تہہ تیغ کر ڈالا۔ ''سربیا'' اس جنگ کا قائد تھا اور اُس کے بادشاہ کا نام ''لازار'' تھا۔ بہت سے معرکوں کے بعد بالآخر 1389ء میں ''کسودہ'' کے میدان میں وہ آخری مقابلہ پیش آیا جس نے اتحادیوں کا شیرازہ پراگندہ کر کے ''سربیا'' کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔

جنگ اختتام کے قریب تھی کہ ''میلوش کوبیلووچ'' ایک سربیائی امیر عثمانی لشکر کی طرف گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا۔ اور اپنے بادشاہ ''لازار'' کے خلاف بغاوت کا اعلان کرتے ہوئے اُس نے یہ بیان کیا کہ مجھے کچھ نہایت اہم باتیں سلطان سے کہنی ہیں۔ چنانچہ اُسے مراد کی خدمت میں لایا گیا۔ لیکن قدم بوسی کے وقت اُس نے دفعتہً اُٹھ کر مراد پر خنجر سے حملہ کر دیا۔ اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر اُس نے بھاگ جانے کی کوشش کی۔ لیکن سپاہیوں نے خنجر زدن میں اُس کے ٹکڑے اڑا دیئے۔ اب مراد تھوڑی دیر کا مہمان تھا۔ اسی حالت میں اُس نے آخری حملے کا حکم دیا۔ جلد ہی اتحادیوں کو شکست ہوئی اور شاہِ سربیا ''لازار'' کو

گرفتار کر کے مراد کے سامنے لایا گیا۔ مراد نے ''لازار'' کے قتل کا حکم دے دیا اور کچھ بعد خود بھی جاں بحق تسلیم ہوا۔ مراد کی شہادت کے بعد ہی ''جنگ کسودہ'' کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ شہزادہ ''بایزید یلدرم'' تخت نشین ہوا تو اُس نے پہلے روز ہی اپنے چھوٹے بھائی ''شہزادہ یعقوب'' کو جس نے ''جنگ کسودہ'' میں شجاعت کے شوہر دکھائے تھے، فوراً قتل کر دیا۔ تخت سلطنت کی خاطر آلِ عثمان میں یہ پہلا قتل تھا۔

سربیا کا بادشاہ ''لازار'' ہلاک ہوا تو ''لارڈ سٹیفن'' حکمران بنا۔ اُس نے اپنی بہن شہزادی ''ڈیسپینا'' کو بایزید کے نکاح میں دے دیا اور صلح کر لی اور وعدہ کیا کہ آئندہ ترکوں کی لڑائیوں میں وہ اپنی فوج لے کر شریک ہوا کرے گا۔ چنانچہ آخر دم تک وہ اپنے وعدے پر قائم رہا۔ ''بایزید'' نے ''شہنشاہِ قسطنطنیہ'' سے نئی صلح کی۔ حتیٰ کہ اس صلح کے بعد ''بایزید'' نے شہنشاہ کو مجبور کیا کہ وہ خود اپنی فوج کے ذریعے ''فلاڈلفیا'' کا قلع قمع کرا دے۔ چنانچہ یہ عبرتناک واقعہ ظہور میں آیا کہ عیسائیوں نے فلاڈلفیا پر خود حملہ کیا اور اسے فتح کر کے ''بایزید'' کے حوالے کر دیا۔ ''بایزید'' کے دور میں ''ایدین''، ''امنتشا'' اور ''ساروخاں'' کے شہر فتح ہوئے۔ 1390ء میں بایزید نے جزیرہ ''قبوس'' پر حملہ کیا۔ اسی طرح ''سرنا'' اور ''کرمانیا'' بھی بایزید کی تلوار سے نہ بچ سکے۔ بایزید نے اپنی زندگی میں دو بار ''قسطنطنیہ'' کا محاصرہ کیا۔ پہلی بار محاصرہ سات مہینے تک جاری رہا۔ پھر چونکہ بایزید کو شاہ ہنگری ''بجسمنڈ'' جو ''ہونیاڈے'' کا باپ تھا کے خلاف فوجیں درکار تھیں اس لئے اُس نے ایک سال کے لئے صلح کر کے محاصرہ اٹھا لیا۔ شرائط صلح بہت سخت تھیں۔ سالانہ خراج کی رقم ''تیس ہزار طلائی کرادن'' مقرر ہوئی۔ مسلمانوں کے لئے قسطنطنیہ میں ایک شرعی عدالت قائم کی گئی جس میں بایزید نے ایک ترکی قاضی مقرر کیا اور کلیسائے مشرق کے اس حصہ میں ایک عالیشان مسجد بھی تعمیر کروائی۔ قیصرِ قسطنطنیہ کے ''مینوئل'' نے شہر کے سات مقامات بھی مسلمانوں کو دے دیئے اور ''غلطہ'' کا نصف حصہ بایزید کے حوالے کر دیا۔ اس میں چھ ہزار عثمانی فوج متعین کی گئی۔ اسی وقت سے عثمانیوں نے قسطنطنیہ کو ''استنبول'' کہنا شروع کیا۔

پھر ''والیشیا'' فتح ہوا۔ اور پھر یکے بعد دیگرے ''نائیکوپولس'' اور ''بلغاریہ'' کی فتوحات ہوئیں۔ بایزید اب ہنگری پر حملہ کرنے والا تھا۔ لیکن دفعتہً اُسے ایشیائے کوچک کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ ''امیر کرمانیا'' نے پھر بغاوت کر دی تھی۔ سلطان بایزید یلدرم نے ''بروصا'' کے درمیان ''امیر کرمانیا'' کے ساتھ لڑائی کی لیکن اس لڑائی میں بایزید

کو شکست ہوئی۔ یہ سن کر بایزید خود جنگ میں شامل ہوا اور ''امیر کرمانیا'' سے شکست کا بدلہ لیا۔ اس جنگ میں ''امیر کرمانیا'' کے دو لڑکے بھی قتل کئے گئے۔

سلطان بایزید یلدرم سے پہلے عثمانی فرمانروا امیر کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ لیکن بایزید نے پہلی مرتبہ مصر کے عباسی خلیفہ کی اجازت سے سلطان کا لقب اختیار کیا۔ بایزید دوسرے فرمانرواؤں کی نسبت عیاش بھی تھا۔ اُس نے اپنی بیوی ''ڈیسپینا'' کی ترغیب سے شراب بھی شروع کر دی تھی۔ اسی اثناء میں ہنگری کے بادشاہ بجسمنڈ نے ایک مرتبہ پھر صلیبی اتحاد قائم کرنے کی کوشش کی۔ ہنگری قسطنطنیہ کے مذہبی مرکز کی بجائے کلیسائے رومہ سے وابستہ تھا۔ اس لئے پاپائے روم نے بھی اُس کی مدد کی۔ ''بجسمنڈ'' کی خاص کوشش سے ''فرانس'' اور ''برگنڈی'' بھی اس جنگ میں شامل ہوئے۔ یہ ایک لشکر جرار تھا جو دریائے دانیال کو عبور کر کے ''شام'' میں داخل ہوا اور ارضِ مقدس کو آزاد کرواتا یہ لشکر جرمنی سے گزرا تو جرمنی کے اعلیٰ دستے بھی اس میں شامل ہوئے۔ یہ اتحاد پوری عیسائی دنیا کا اتحاد تھا۔ ''بجسمنڈ'' کا لشکر جب سربیا پہنچا تو انہوں نے بایزید کے دوست اور وفادار ''لارڈ سٹیفن'' پر حملہ کر کے سربیا میں وحشیانہ قتل و غارت گری کی۔ اس لشکر نے کامیابی کے ساتھ ''مسلوڈا''، ''ویدین'' اور ''ارسودا'' پر قبضہ کر لیا۔ یہ لشکر ''نائیکوپولس'' پہنچا اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ ''نائیکوپولس'' کے کمانڈر ''یوغلان بے'' نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا۔ اُسے یقین تھا کہ بایزید اُس کی مدد کو ضرور پہنچے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور بایزید برقی سرعت کے ساتھ محاصرے کے سولہویں دن ''نائیکوپولس'' پہنچ گیا۔ فرانسیسیوں کو گمان بھی نہ تھا کہ بایزید اس قدر جلد آ پہنچے گا۔ وہ سمجھتے تھے کہ بایزید ''آبنائے باسفورس'' عبور کرنے کی جرأت بھی نہ کر سکے گا۔ بالآخر 24 ستمبر 1396ء کو کاؤنٹ ڈی نیورس، بجسمنڈ اور فرانسیسی فوج کے خلاف بایزید نے طبل جنگ بجا دیا۔ یہ ایک مشہور صلیبی جنگ ہے۔ بجسمنڈ، ترکوں سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ترکوں کے بہترین دستے ایک غیر منظم اور کم بہترین فوج کی حیثیت سے رہ کر شریک ہوتے ہیں۔ ''بجسمنڈ'' کا مشورہ تھا کہ ترکوں کی ظاہری فوج کے ساتھ اپنا وقت ضائع نہ کیا جائے بلکہ اصل فوج پر حملہ کیا جائے۔ لیکن صلیبی اتحاد میں شامل دوسرے ممالک کے سالاروں نے اس تجویز پر عمل کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ جنگ تین گھنٹے سے زیادہ قائم نہ رہ سکی۔ اس جنگ میں شاہِ سربیا، بایزید کی حمایت میں لڑ رہا تھا۔ عیسائی فوج کا بہت زیادہ نقصان ہوا اور بایزید نے ان قیدیوں کے انتقام میں جنہیں جنگ سے پہلے عیسائیوں نے قتل کر ڈالا تھا، اس جنگ میں دس ہزار عیسائی گرفتار کر کے قتل کا حکم

دے دیا۔ قیدیوں میں کاؤنٹ ڈی نیورس اور چوبیس مزید عیسائی امراء اور شرفاء بھی شامل تھے۔ بایزید نے انہیں رہا کر دیا۔ لیکن روانہ کرنے سے پہلے کاؤنٹ ڈی نیورس کے سامنے ایک تقریر کی۔

''جان! مجھے خوب معلوم ہے کہ تو اپنے ملک میں ایک بڑا سردار اور ایک طاقتور رئیس لڑکا ہے۔ تو نوجوان ہے اور ابھی تیرے لئے اُمید کے بہت سے سال باقی ہیں۔ ممکن ہے میدانِ جنگ میں تیری اس پہلی کوشش کی ناکامی کے بعد لوگ تجھے موردِ الزام ٹھہرائیں اور تو اس اتہام کو رفع کرنے اور اپنی شہرت و نیک نامی کو دوبارہ حاصل کرنے کی غرض سے ایک طاقتور فوج اکٹھی کر کے پھر میرے مقابلے میں آئے۔ اگر میں تجھ سے ڈرتا تو تجھ سے اور تیرے ساتھیوں سے ایمان اور عزت پر حلف لے لیتا کہ تم اور تمہارے ساتھی پھر میرے مقابلے پر نہیں آؤ گے۔ لیکن نہیں، میں ایسے حلف کا مطالبہ نہیں کروں گا۔ برخلاف اس کے میں خوش ہوں گا اگر تو اپنے ملک میں واپس پہنچ کر ایک فوج جمع کر لے اور اسے لے کر یہاں آئے۔ تو ہمیشہ مجھے میدانِ جنگ میں اپنے مقابلہ کے لئے تیار پائے گا۔ میری بات اس وقت میں کہہ رہا ہوں اسے تو جس شخص سے بھی چاہے نقل کر دینا۔''

(کریسی جلد 1 صفحہ 88)

جنگ نائیکوپولس کے بعد ولاچیا، اسٹائریا اور ہنگری پر بھی حملے کئے گئے۔ پیٹر وارڈن کے شہر پر قبضہ کر لیا گیا۔

اس کے بعد بایزید ''اورنہ'' پہنچا اور 1357ء میں یونان پر حملہ آور ہوا۔ تھسلی، ڈوبیس ڈوریس اور لوکریس پر قبضہ کر لیا۔ کچھ ہی دن بعد ''موریا'' کا تمام علاقہ بھی فتح ہو یونان کی فتح سے لوٹا تو بایزید نے ایک مرتبہ پھر قسطنطنیہ کا محاصرہ کر لیا۔ حالانکہ معاہدہ دس سال پورے نہ گزرے تھے۔ اُس نے اپنے خاص ایلچی کے ذریعے شہنشاہ ''مینوئل'' حکم بھیجا کہ وہ تخت سے دستبردار ہو جائے ورنہ شہر بزورِ شمشیر فتح کر لیا جائے گا۔ مینوئل نے سلطان کی بات نہ مانی۔ چنانچہ سلطان نے قسطنطنیہ کا سخت محاصرہ کر لیا۔ عین اس وقت جب بایزید قسطنطنیہ پر حملہ کی تیاریاں کر رہا تھا، اُس کے ایشیائی مقبوضات میں نہایت انقلاب انگیز حالات رونما ہو رہے تھے جن سے مجبور ہو کر اُسے محاصرہ اٹھانا پڑا۔ اسی روز سے بایزید کی بدقسمتی کا آغاز ہوا اور آئندہ دو سالوں میں جو اُس کی زندگی کے آخری سال تھے اُسے اتنی زبردست شکست اٹھانی پڑی کہ اُس کی تمام فتوحات خاک میں مل گئی۔ خود بایزید کا پھر گیا اور کچھ دنوں کے لئے سلطنت عثمانیہ کی عظمت خاک میں مل گئی۔

قید کی حالت میں ہوا۔ اُس کی یہ تباہی، یہ بربادی ''امیر تیمور'' کے ہاتھوں ہوئی۔

تیمور کی سلطنت ''دیوارِ چین'' سے لے کر ''ایشیائے کوچک'' کی سرحد تک اور ''بحر ارل'' سے لے کر ''دریائے گنگا'' اور خلیج فارس تک پھیلی ہوئی تھی۔ 35 سال کی عمر میں اُس نے سب دشمنوں کو زیر کر کے ''سمرقند'' کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔ اس کے بعد آنے والے عرصہ میں اُس نے 27 مملکتیں فتح کیں اور 9 شاہی خاندانوں کو فناء کر دیا۔ تیمور کی سلطنت کے بعد بایزید ہی کی سلطنت اُس وقت دنیا کی سب سے زیادہ طاقتور سلطنت تھی۔ بایزید اپنی سابقہ فتوحات کے نشہ میں اتنا سرشار تھا کہ اُس نے تیمور کی قوت کا صحیح اندازہ نہ کیا۔ اور ایک بے فاتح کو برانگیختہ کر دیا جس کی دہشت سے بڑے بڑے بادشاہ کانپتے تھے۔ پہلے پہل دونوں کے درمیان نہایت تلخ خط و کتابت شروع ہوئی اور بالآخر نوبت جنگ تک آ گئی۔

1400ء عیسوی میں تیمور نے بایزید کے شہر ''سیواس'' کا چھ لاکھ کی فوج کے ساتھ محاصرہ کر لیا۔ سیواس کی حفاظت پر ''بایزید'' کا سب سے بڑا لڑکا ''اُرطغرل'' مامور تھا۔ اُرطغرل نے ایسی جانبازی کے ساتھ تیمور کا مقابلہ کیا کہ کئی روز تک چھ لاکھ کی فوج کامیاب نہ ہو سکی۔ لیکن آخر میں تیمور نے ایک ایسی تدبیر اختیار کی جس کا جواب محصورین کے پاس نہ تھا۔ اُس نے چھ ہزار مزدور لگا کر دیواروں کی بنیادیں کھودنا شروع کیں اور ان کو لکڑیوں کی تھونی لگا کر دیواروں کو روکے رکھا۔ جب کھدائی کا کام مکمل ہو گیا تو لکڑیوں میں آگ لگا دی گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دیواریں بیٹھ گئیں اور شہر پر فوراً قبضہ ہو گیا۔ تیمور نے اپنی ظالمانہ روایت برقرار رکھی اور بایزید کے بیٹے اُرطغرل کے ساتھ چار ہزار شہریوں کو بھی بے دردی سے قتل کر دیا۔ بایزید اُس وقت قسطنطنیہ کا محاصرہ کئے ہوئے تھا۔ اُس نے یہ خبر سنی تو محاصرہ چھوڑ کر آندھی اور طوفان کی طرح تیمور کے مقابلے کے لئے ایشیائے کوچک لوٹا۔ لیکن تیمور شام اور مصر کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ دو سال کے بعد وہ پھر لوٹا اور پہلے سے بھی زیادہ اختلافات کے ساتھ دونوں کے درمیان خط و کتابت ہونے لگی۔ اور بالآخر چشم فلک نے تاریخ کی اُس دردناک جنگ کا نظارہ کیا جس میں دونوں طرف مسلمان سپاہی شریک تھے.....!

یہ جنگ ''جنگ انگورہ'' کے نام سے جانی جاتی ہے۔ بایزید ایک لاکھ بیس ہزار فوج کے ساتھ ''سواس'' کی طرف بڑھا۔ لیکن تیمور نے آٹھ لاکھ کی فوج کے ساتھ بایزید کے شہر ''انگورہ'' کو گھیرے میں لے لیا۔ بایزید ''انگورہ'' کو بچانے کی غرض سے ''انگورہ'' کی طرف بڑھا۔ تیمور تاتاری تھا۔ اُدھر بایزید کی فوج میں ایک بڑی تعداد تاتاریوں کی تھی۔ تیمور

نے اپنے جاسوس بھیج کر ان تاتاریوں کو ورغلایا جو عین جنگ کی حالت میں ٹوٹ کر تیمور سے جا ملے۔ اس موقع پر بایزید سے سب سے بڑی حماقت یہ سرزد ہوئی کہ وہ ایک طرف اپنی بے خوفی کا مظاہرہ کرنے کے لئے اپنی پوری فوج کو لے کر شکار کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ جس مقام پر شکار طے پایا، وہاں پانی بہت کم تھا۔ اور پانچ ہزار عثمانی سپاہی پیاس کی شدت سے تڑپ کر مر گئے۔ جو زندہ بچے وہ بھی گرمی اور پیاس سے نڈھال تھے۔ شکار سے واپس لوٹا تو اُس نے دیکھا کہ اُس کی لشکر گاہ پر تیمور کا قبضہ تھا۔ جس چشمہ سے عثمانی فوج پانی لیتی تھی اُس کا رُخ بھی تیمور نے پھیر دیا تھا۔ اب بایزید کے پاس ماسوائے فوری جنگ کے اور کوئی راستہ نہ تھا۔ چنانچہ منگل کے روز 17 ذوالحجہ 804ھ بمطابق 20 جولائی 1402ء کو "انگورہ" کے مقام پر وہ معرکہ پیش آیا جس نے.....

"تیمور کی شہرت و عظمت کو حیاتِ ابدی بخش دی۔ اور بایزید کی ذلت و رُسوائی کو دنیا کے لئے یادگار بنا دیا۔" (گبن)

دورانِ جنگ بہت سے مسلمان سردار بایزید کا ساتھ چھوڑ گئے۔ اور بالآخر بایزید تاتاریوں کے مقابلے میں صرف دس ہزار ینی چری کے سپاہیوں کے ہمراہ اکیلا رہ گیا۔ سربیا کا بادشاہ "لارڈ سٹیفن" بھی آخری وقت بایزید کے ساتھ اور شکست سے چند پہلے فرار ہوا۔ بایزید کو محمود خان چغتائی نے گرفتار کر لیا۔ اُس کے پانچ لڑکوں میں سے لڑائی میں شریک تھے تین دشمن کی زد سے بچ نکلے۔ "شہزادہ سلیمان" نے یورپ کا رُخ کیا۔ "شہزادہ محمد" نے "اماسیہ" پہنچ کر دم لیا۔ اور "شہزادہ عیسیٰ" کرمانیا کی طرف بھاگا۔ "شہزادہ موسیٰ" گرفتار ہوا اور "شہزادہ مصطفیٰ" کا حشر کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔ ممکن ہے جنگ میں مارا گیا ہو۔ لیکن کسی کو اُس کا سراغ نہ ملا۔ جنگ کے اختتام پر بایزید کو گرفتار کر کے امیر تیمور نے ایک لوہے کے پنجرے میں ڈال دیا۔ تیمور قیدی سلطان کو لوہے کے پنجرے میں بند رکھتا۔ وہ جہاں جاتا اس پنجرے کو ساتھ لے جاتا۔ بایزید اس رسوائی کو برداشت نہ کر سکا اور صرف آٹھ مہینے بعد اُس کی روح قفس عنصری اور قفس فولادی دونوں سے بیک وقت آزاد ہو گئی۔ (دولت عثمانیہ)

"جنگ انگورہ" کے بعد سلطنت عثمانیہ کا بظاہر خاتمہ ہو گیا۔ عثمانی سلطنت کی تمام ریاستیں آزاد ہو گئیں۔ بایزید کے چھ لڑکوں میں سے پانچ اُس کے ساتھ جنگ انگورہ میں شریک تھے۔ چار لڑکے جو زندہ بچ گئے، بایزید کی وفات کے بعد مختلف چھوٹی ریاستوں میں جا کر حکمران بن بیٹھے اور آپس میں لڑنے لگے۔ بھائیوں کی اس لڑائی

آخری فتح "شہزادہ محمد" کو ہوئی۔ اور "شہزادہ محمد" نے صرف آٹھ سال کے عرصہ میں سلطنت عثمانیہ کا کافی حد تک وقار بحال کر لیا۔

"محمد" نے 41 سال کی عمر میں 1421ء میں وفات پائی اور "بروصا" میں دفن ہوا۔ سلطان مراد خان ثانی اسی کا بیٹا تھا۔ اور اس طرح سلطنت عثمانیہ کے سلاطین کا شجرۂ نسب یوں بن گیا کہ "عثمان" پہلا تاجدار تھا جو 1288ء میں نمودار ہوا۔ اُس کا بیٹا "اُورخان" 1324ء میں..... اُس کا بیٹا "مراد اول" 1359ء میں..... اُس کا بیٹا "بایزید یلدرم" 1389ء میں..... اُس کا بیٹا "محمد اول" 1431ء میں..... اُس کا بیٹا "مراد خان ثانی" 1421ء میں..... اور اُس کا بیٹا سلطان "محمد فاتح" 1451ء میں تخت نشین ہوا۔

سلطان محمد فاتح کے بعد بھی سلطنت عثمانیہ کئی سو سال قائم رہی۔ لیکن جو شہرت اور عزت محمد فاتح کے حصے میں آئی وہ کسی اور کو نصیب نہ ہو سکی۔ دراصل رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا.....

"قسطنطنیہ کا فاتح جنت میں داخل ہو گا۔"

یہ حدیث مبارکہ بہت مشہور تھی۔ اور اسی حدیث کا سہرا اپنے سر باندھنے کے لئے حکمران "یزید اول" سے لے کر بایزید یلدرم اور سلطان مراد خان ثانی تک..... سب نے قسطنطنیہ پر جارحانہ حملے کئے۔ لیکن کوئی بھی قسطنطنیہ کو فتح نہ کر سکا۔ یہ سعادت سلطان محمد فاتح کے حصے میں آئی جس نے 29 مئی 1453ء کی رات عظیم آہن گر اُربان کی بنائی ہوئی توپوں سے بالآخر قسطنطنیہ کی ایک دیوار کو گرا دیا۔ اور یوں یہ شہر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مسلمانوں کا استنبول بن گیا۔

سلطان محمد خان

5 محرم الحرام 855ھ بمطابق 9 فروری 1451ء کو ''سلطان مراد خان ثانی'' نے ا
میں وفات پائی۔ تجہیز و تکفین قدیم پایۂ تخت ''بروصا'' میں ہوئی۔ سلطان مراد خان
وفات کے بعد اُس کا بیٹا شہزادہ محمد ایشیائے کوچک کی ریاست ''ایدین'' میں تھا۔
شہزادہ محمد کی عمر اکیس سال اور چند ماہ تھی۔ اس سے پہلے وہ دو مرتبہ باپ کی زندگی
تخت نشین ہو چکا تھا۔ جب اُسے مراد خان کی وفات کی خبر ملی تو وہ فوراً ایک عربی گھو
پر سوار ہوا اور گھوڑے کو ایڑھ لگانے سے پہلے یہ کہا۔

''جو لوگ مجھ سے محبت کرتے ہیں، وہ میرے ساتھ آئیں۔'' (دولت عثمانیہ)

وہ دریا دانیال کو عبور کر کے ادرنہ پہنچا۔ جہاں تخت نشینی کے مراسم ادا کیے گئے۔ اب
شہزادہ محمد خان نہیں تھا۔ بلکہ ''سلطان محمد خان'' بن چکا تھا۔ وہ ادرنہ کے شاہی محل
داخل ہوا تو یہاں اُس سے محبت کرنے والے بہت موجود تھے۔ ملکہ سروین جو شاہ
لارڈ سٹیفن کی بیٹی تھی اور سلطان مراد خان ثانی کی بیوی..... اپنے سوتیلے بیٹے شہزادہ
تخت نشینی سے بے حد خوش تھی۔ ملکہ سروین کے بطن سے شہزادہ محمد کا ایک بھائی بھی تھا
کی عمر صرف آٹھ ماہ تھی۔ ملکہ سروین کے علاوہ آغا حسن، قاسم بن ہشام اور طاہر بن
بھی سلطان محمد خان کے استقبال کے لئے موجود تھے۔ وزراء اور عمائدین سلطنت
مشورے سے جشن تاج پوشی کا دن مقرر کیا گیا۔ جس کی تیاریاں زور و شور کے سا
جانے لگیں۔

سلطان محمد خان اپنی نوعمری کے زمانے میں جب دو بار تخت نشین ہوا تو دونوں
اُسے نامساعد حالات کی وجہ سے تخت سلطنت سے الگ ہونا پڑا تھا۔ پہلی مرتبہ ہونے
اور لارڈ سلاس کی معاہدہ شکنی کی وجہ سے۔ اور دوسری مرتبہ ادرنہ شہر میں ''ینی چری
بغاوت کے سبب۔ دونوں مرتبہ اُس کے باپ سلطان مراد خان ثانی کو واپس آنا
جس کی وجہ سے عام عوام میں یہ تاثر پیدا ہو گیا تھا کہ شہزادہ محمد نظامِ سلطنت
لئے نا اہل اور ناکافی ہے۔ اب سلطان محمد خان کو ثابت کرنا تھا کہ چودہ پندرہ سا
میں جب اُسے سلطانی ملی تھی تو اور بات تھی۔ اور اب بائیس سال کی عمر میں جب

سلطانی ملی ہے تو یہ اور بات ہے۔ اب محمد بچہ نہیں تھا۔ اُس نے جشن تاجپوشی سے دو روز
قبل قاسم بن ہشام کو اپنے پاس بلایا اور شاہانہ مسکراہٹ کے ساتھ اُس کا استقبال کیا۔

''آیئے!..... قاسم بن ہشام آیئے!..... دیکھئے، دو دن بعد ہمارا جشن تاجپوشی ہے۔
اب ہم سلطنت عثمانیہ کے تاجدار اور سلطان بن چکے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے
شانوں پر کتنی بڑی ذمہ داری آ پڑی ہے۔ قبل ازیں جب ہمیں سلطان بنایا گیا تو ہمیں
آپ کی مشاورت سے بے حد قوت اور توانائی ملی تھی۔ اسی لئے ہم نے آج آپ کو زحمت
دی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ اس مرتبہ بھی ہر قدم پر ہمارے ساتھ رہیں۔''

قاسم سلطان کا لہجہ سن کر حیران رہ گیا۔ وہ اب نوعمر شہزادہ تو نہ تھا۔ جو آج سے چھ
سال پہلے یوں تخت نشین ہوا تھا گویا چوہے دان میں پھنس گیا ہو۔ قاسم کو محسوس ہوا کہ وہ
کسی عظیم شہنشاہ کی آواز سن رہا ہے۔ سلطان کے لب و لہجے کے علاوہ سلطان کی باقی
شخصیت بھی پہلے کی نسبت بہت نکھر چکی تھی۔ اُس کے چہرے پر نوجوانی کا تازہ خون اور
آنکھوں میں موجود شاہی جاہ و جلال اور دبدبہ دیکھ کر قاسم کو محسوس ہونے لگا کہ اس مرتبہ
سلطان محمد خان کوئی بہت بڑا عزم لے کر تخت سلطانی پر جلوہ افروز ہونا چاہتا ہے۔ اُس نے
اپنی سابقہ دوستی کو فراموش کرتے ہوئے انتہائی ادب کے ساتھ کہا۔

''سلطانِ معظم!..... سلطنت عثمانیہ کو آپ جیسے تاجدار پر فخر رہے گا۔ میں محسوس کرتا
ہوں کہ قدرت آپ کے ہاتھوں کوئی بڑا کام سرانجام دینا چاہتی ہے..... جہاں تک میری
خدمات کا تعلق ہے تو میں اور میرا خاندان اسلام اور سلطنت عثمانیہ کے لئے ہر پکار پر ہمیشہ
لبیک کہتے رہیں گے۔''

قاسم نے سلطان محمد خان کے ساتھ بات کرتے ہوئے اپنی سابقہ بے تکلفی کا بالکل
مظاہرہ نہ کیا۔ بلکہ شاہی آداب کے تمام تقاضوں کا خیال کرتے ہوئے سلطان سے بات
کی۔ دو روز بعد جشن تاجپوشی تھا۔ چنانچہ سلطان نے کہا۔

''قاسم بن ہشام..... ہمیں سب کچھ بھول سکتا ہے۔ لیکن ''ینی چری'' کے دستوں کی وہ
بغاوت نہیں بھول سکتی جس میں تمہارے والد اور بھاوج شہید ہوئے تھے۔ اور ہمیں اب
بھی ان لوگوں کی جانب سے جو ''ینی چری'' میں اُس وقت بغاوت پیدا کرنے کا باعث
بنے تھے اندیشہ ہے کہ وہ لوگ پھر کہیں انتظامِ سلطنت کو درہم برہم کرنے پر نہ تُل
جائیں۔ اس مرتبہ ہم نے بروقت تمہیں اسی لئے طلب کیا ہے تاکہ پیش آمدہ خطرات پر نظر
رکھی جا سکے۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم ''ینی چری'' کے اُن لوگوں پر نظر رکھو جنہیں مشکوک سمجھا

جا سکتا ہے۔"

قاسم، سلطان محمد خان کے ارادے پوری طرح بھانپ چکا تھا۔ سلطان ایک بار پھر کو جاسوسی کی ذمہ داری سونپنا چاہتا تھا۔ خود قاسم کی نظر میں بھی یہ ضروری تھا۔ کیونکہ سلطان مراد خان کی وفات کے ساتھ ہی اُسے اس طرح کی خبریں ملی تھیں کہ "ینی چری" میں پھر بغاوت کا اندیشہ محسوس کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ قاسم نے ذمہ داری قبول کر لی اور سلطان سے کہا۔

"سلطانِ معظم!..... میں آپ کی بصیرت کی داد دیتا ہوں۔ خصوصاً جشن تاجپوشی کے تخریبی عناصر پر نظر رکھنا بہت ضروری ہے۔ دراصل کچھ لوگ آپ کی شخصیت اور عزائم سے خائف ہیں۔ جو نہیں چاہتے کہ آپ مسلمانوں کی قیادت سنبھالیں۔ اور ایسے لوگ جو کوئی کم ہیں، لیکن یہ بات طے ہے کہ یہ لوگ شہنشاہِ قسطنطنیہ کے پروردہ، اور خاص آدمی ہیں۔"

قاسم، سلطان کے ساتھ دیر تک بہت سے خفیہ معاملات پر بات چیت کرتا رہا۔ اور وہاں سے اجازت لے کر واپس آ گیا۔

اور پھر سلطان محمد خان کی تاجپوشی کی تقریب بھی تاریخ عثمانیہ کی ایک کبھی نہ بھلا جانے والی تقریب ہے..... جب سلطان اور قاسم بن ہشام کے تمام انتظامات دھرے کے دھرے رہ گئے اور دشمن عین تاجپوشی کے وقت اپنا کام دکھا گیا۔

سلطان محمد خان کا دربار لگا ہوا تھا۔ عمائدین سلطنت، وزرائے سلطنت، امراء اور شرفائے شہر..... قصرِ سلطانی کے دیوانِ عام میں جمع تھے۔ یہ ایک وسیع و عریض برآمدہ جس کے چاروں طرف شرکائے تقریب کے لئے نشستیں لگائی گئی تھیں۔ اس وقت دیوانِ عام میں ہزار سے زیادہ افراد موجود تھے۔ سلطان کے سر پر تاجِ عثمانی سجا دیا گیا تھا۔ شاہی خاندان کے افراد سب سے پہلے باری باری سلطان کو تاجپوشی کی مبارک باد دے رہے تھے۔ چند بزرگ مرد و خواتین کے بعد ملکہ سروین کی باری آئی۔ یہ سلطان مراد کی نوجوان ملکہ تھی جو شاہ سربیا لارڈ سٹیفن کی لاڈلی بیٹی تھی اور یورپی النسل ہونے کی بدولت انتہائی حسین و جمیل بھی تھی۔ ملکہ سروین سلطان محمد خان کو بہت اچھا سمجھتی تھی۔ شروع دن سے سلطان کے ساتھ اخلاص و محبت کے ساتھ پیش آیا کرتی تھی۔ ملکہ سروین آگے بڑھی اور پھولوں کا تحفہ سلطان کے ہاتھوں میں تھمانے کے لئے تختِ شاہی کے قریب آ کر رُک گئی۔ ابھی اُس نے کچھ کہنے کے لئے ہونٹ کھولے ہی تھے کہ دیوانِ عام کے باہر اچانک شور سنائی دیا۔ ملکہ سروین اپنی جگہ رُک گئی۔ سلطان کے ماتھے پر شکنیں پڑ

اور وہ کسی قدر برافروختہ نظر آنے لگا۔ اُس نے حکم دیا۔

"کون گستاخ ہے یہ؟..... جو ہمارے جشن تاجپوشی میں اپنی منحوس آواز کے ذریعے بدشگونی پھیلا رہا ہے..... اسے گرفتار کر کے ہمارے سامنے لایا جائے۔"

بہت سے سپاہی اپنی جگہوں سے بجلی کی سرعت کے ساتھ دیوانِ عام سے باہر کی جانب لپکے۔ سلطان کی نظریں باہر کی طرف ہی لگی ہوئی تھی۔ سلطان کے چہرے پر حیرت و اضطراب کے ساتھ ساتھ غصہ بھی تھا۔ تمام اہل دربار اپنی اپنی جگہوں پر کسمسا رہے تھے۔

کچھ دیر بعد سلطان کے سپاہی ایک بوڑھے "خواجہ سرا" کو بازوؤں سے پکڑ کر سلطان کے سامنے لے آئے۔ خواجہ سرا نے اپنے دونوں بازوؤں میں کوئی چیز اٹھا رکھی تھی جو کپڑے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے خواجہ سرا نے کوئی شیر خوار بچہ اٹھا رکھا ہو۔ بوڑھا خواجہ سرا زور زور سے روتا ہوا دربار میں داخل ہوا۔ اُس نے عتابِ شاہی کی ذرہ بھر بھی پرواہ نہ کی۔ وہ دربار میں داخل ہوا اور واویلا مچاتا ہوا سلطان کی خدمت میں پیش ہونے کی بجائے ملکہ سروین کے سامنے جا کر دھاڑیں مارنے لگا۔ ملکہ پہلے ہی اُسے پہچان کا حیران و ششدر کھڑی تھی۔ یہ اُس کا خاص خواجہ سرا تھا..... "خادمِ خاص"۔ ملکہ اُس کے ہاتھوں میں شیر خوار بچہ دیکھ کر تڑپ اُٹھی۔ وہ سب کچھ بھول کر روتے ہوئے خواجہ سرا کی طرف دوڑی۔ اُس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ یقیناً خواجہ سرا کے ہاتھوں میں ننھا شہزادہ تھا۔ سلطان محمد خان کا معصوم بھائی جو ابھی شیر خوار تھا، اور ملکہ سروین کے بطن سے تھا۔

ملکہ زرد چہرہ لئے خواجہ سرا کی طرف بڑھی اور اپنے بچے کو اُس کے بازوؤں سے چھین لیا۔

دربار پر اُس واقعہ سے عجیب ماحول طاری ہو چکا تھا۔ لوگ خواجہ سرا کے رونے اور بازوؤں میں بچے کو اٹھانے کے انداز سے اندازہ لگا چکے تھے کہ خواجہ سرا کے بازوؤں میں ملکہ سروین کے شیر خوار بچے کی لاش ہے۔ سلطان محمد خان کی عمر ابھی بمشکل بائیس سال تھی، اس صورتحال سے بری طرح سٹپٹا گیا۔ اُسے کچھ سمجھ نہ آ رہی تھی کہ یہ سب کچھ اچانک کیسے ہو گیا تھا۔ ملکہ نے جونہی اپنے مُردہ بچے کو ہاتھوں میں اٹھایا، اُس کی ایک دلدوز چیخ بلند ہوئی جس سے پورا دربار لرز کر رہ گیا۔ ملکہ نے دیکھا کہ اُس کا شیر خوار بچہ جس کی عمر آٹھ ماہ تھی، مر چکا تھا۔ یہ اچانک کیسے مر گیا تھا؟ ابھی چند لمحے پہلے تو اپنے ننھے شہزادے کو جیتا جاگتا اور ہنستا، مسکراتا چھوڑ کر آئی تھی۔ ابھی چند لمحے پہلے تو ننھا شہزادہ اپنی ماں کے ساتھ کھیل رہا تھا اور کھیل رہا تھا۔ پھر یہ اچانک کیسے ہوا کہ خواجہ سرا اس معصوم کی لاش اٹھا کر یہاں اچانک دربار میں لے آیا۔ ملکہ حاضرین دربار کی پرواہ کئے بغیر رو رہی تھی۔ وہ

ماں تھی اور ننھا شہزادہ اُس کا لختِ جگر تھا۔ سلطان بری طرح بوکھلا چکا تھا۔ یہ اُس کا تخ
نشینی کا پہلا دن تھا۔ اچانک اُسے خیال آیا کہ وہ خواجہ سرا سے حقیقت حال معلوم کر
اُس نے کسی قدر نرم لہجے میں خواجہ سرا کو مخاطب کیا۔

''خواجہ سرا.....! یہ سب کیسے ہوا..... ہمیں بتاؤ۔ تاکہ ہم اس معصوم کے قاتل کو
اور اسی وقت جہنم رسید کر کے اپنے ننھے بھائی کا انتقام لے سکیں۔''

سلطان کے آخری الفاظ میں گرج تھی۔ لیکن خواجہ سرا کا بیان سن کر سلطان کے پاؤ
تلے سے حقیقی معنوں میں تخت نکل گیا اور وہ اُچھل کر نیچے فرش پر اُتر آیا اور اگلے پ
پورے دربار نے اس طمانچے کی آواز سنی جو سلطان نے بوڑھے خواجہ سرا کے چہرے
رسید کیا تھا..... کیونکہ خواجہ سرا نے سلطان سے کہا تھا۔

''واہ، سبحان اللہ، قاتل بھی پوچھتا ہے کہ ننھے شہزادے کو کس نے قتل کیا ہے.....
اہلیانِ دربار!..... میں دہائی دیتا ہوں..... کہ اس معصوم اور ننھی جان کو تمہارے
سلطان'' نے قتل کروایا ہے۔ میں دہائی دیتا ہوں..... میں دہائی دیتا ہوں۔''

خواجہ سرا زور زور سے چیخ رہا تھا۔ تمام اہلیانِ دربار مارے حیرت اور خوف کے سُن
کر رہ گئے۔ خواجہ سرا نے بے حد بے باکی اور گستاخی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اُس نے عثما
شاہی کو کھلم کھلا دعوت دی تھی۔ اُس نے سرِ دربار، تخت نشینی کے پہلے روز ہی سلطان
خان پر اپنے ننھے بھائی کے قتل کا الزام عائد کر دیا تھا۔ ملکہ سروین یہ خبر سن کر یکدم خاموش
ہوگئی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے سلطان کو دیکھنے لگی۔ کچھ وقت کے لئے سلطان سمیت تما
دربار کو سانپ سونگھ گیا۔ ہر کوئی اپنی جگہ یہ سوچ رہا تھا کہ..... اب کیا ہوگا۔ ملکہ کو تو
سکتہ ہوگیا تھا۔ اُس نے اپنے شیر خوار بچے کی لاش کو اپنے سینے سے بھینچ رکھا تھا اور وہ
بھری، حسرت ناک نظروں سے اُس سلطان کو دیکھ رہی تھی جس کی تاج پوشی پر آج
مبارک باد دینے کے لئے آئی تھی۔ بوڑھا خواجہ سرا ابھی تک دیوانِ عام کے فرش پر
پاؤں کھڑا تھا۔ اور اہلیانِ دربار اپنی سانسیں روکے حکم سلطانی کے منتظر تھے۔

اتنے میں ایک بوڑھا سردار اپنی نشست سے اٹھا اور سلطان سے مخاطب ہوا۔ ''سلطا
معظم!..... اہلیانِ دربار حکم شاہی کے منتظر ہیں۔ اور سب لوگ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ
والا نے تخت نشینی کے پہلے روز ننھے شہزادے کی موت کا حکم کیونکر صادر فرمایا؟''

اب سلطان محمد خان کے لئے مزید خاموش رہنا ممکن نہ تھا۔ وہ ایک دم سے اپنی
سمیٹتا ہوا تختِ شاہی کی جانب بڑھا اور انتہائی جارحانہ انداز میں تخت پر چڑھا۔ لیکن

ے مسند پر بیٹھنے کی بجائے کھڑے ہو کر اپنے درباریوں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور پھر کسی
ہی شیر کی طرح گرجا۔

''ہم حکم دیتے ہیں..... کہ ابھی اور اسی وقت معصوم شہزادے کے قاتل کو پابہ زنجیر
ارے سامنے حاضر کیا جائے..... ہم جاننا چاہتے ہیں کہ اُس نے کس شیطان کے حکم پر یہ
ون اور مکروہ فعل سرانجام دیا ہے۔ ہم معصوم شہزادے کے قاتل کا سر خود اپنے ہاتھ سے
ا کریں گے۔''

سپاہی اندرونی محل کی طرف دوڑتے چلے گئے۔ لیکن سلطان گھوم کر خواجہ سرا سے
طب ہوا۔ ''ہم ملکہ معظمہ کے خواجہ سرا کی گستاخی معاف کرتے ہیں..... اور خواجہ سرا سے
دریافت کرتے ہیں کہ اسے کس طرح ننھے شہزادے کے قاتل کی بابت معلوم ہوا؟''

اب خواجہ سرا بھی اپنی جذباتی کیفیت سے کسی قدر سنبھل چکا تھا اور کچھ سلطان کے
نے اُسے احساس دلایا کہ اُس نے بلا تحقیق نئے سلطان پر چھوٹے بھائی کے قتل کا
ان باندھ کر سرِ دربار اپنی موت کو دعوت دی ہے۔ لیکن جونہی سلطان نے اُسے معاف
ہ اُس کی جان میں جان آئی اور اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''سلطانِ معظم!
ی دہائی کی وجہ یہ تھی کہ مجھے ننھے شہزادے کے قاتل نے شہزادے کو قتل کرنے کے بعد
یہ بتایا تھا کہ اُس نے شہزادے کو سلطانِ معظم کے حکم سے قتل کیا ہے۔''

خواجہ سرا کی بات سن کر سلطان لرز گیا۔ اُس نے گرجدار آواز میں بے اختیار ہو کر
ہا۔ ''کون ہے وہ بدبخت جس نے ہم پر اتنا بڑا الزام لگایا؟ اور جس نے اس معصوم کے
اہ خون سے ہاتھ رنگے؟''

سلطان کے چہرے پر جوانی کا جوش شاہی جاہ و جلال کے روپ میں ظاہر ہوا اور دربار
وجود ہر شخص اپنی جگہ سہم کر رہ گیا۔ خواجہ سرا کی حالت اب پہلے سے بالکل مختلف تھی۔
اپنے پچھلے رویئے پر پچھتا رہا تھا۔ اُس نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان کے ساتھ پھر کہا۔
سلطانِ معظم! معصوم شہزادے کو ینی چری کے سپہ سالار نے شاہی کنیزوں کو آپ کا
ا کر حاصل کیا۔ اور اُس سفاک انسان نے آٹھ ماہ کی اس ننھی جان کو حمام میں لے
ا کے حوض میں غرق کر دیا.....''

وم پورے دربار کی توجہ ملکہ کی جانب مبذول ہوگئی۔ کیونکہ ملکہ کھڑی کھڑی اپنی
رائی اور پھر گھٹنوں کے بل زمین پر گر کر بے ہوش ہوگئی۔ سلطان فوراً آگے بڑھا
ملکہ سروین کو سہارا دیا۔ کچھ دیر بعد ملکہ اپنے کمرۂ خاص میں شاہی طبیبوں کی زیر

نگرانی اپنے بستر پر تھی۔ دربار ابھی تک برخاست نہیں ہوا تھا۔ سلطان نے خواجہ سرا سے تمام واقعے کی تفصیل پوچھی اور ینی چری کے سپہ سالار کو پابہ زنجیر اپنے حضور پیش کرنے کا حکم دیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ سلطان کے نئے حکم کی تعمیل کے لئے سپاہی روانہ ہوتے خفیہ محکمے کا سربراہ بہرام خان ینی چری کے ''قاتل سپہ سالار'' کو گرفتار کر کے سلطان کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ سپہ سالار بے خوفی کے ساتھ دربار میں حاضر ہوا..... اور سلطان کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ سلطان کا چہرہ سرخ ہو چکا تھا اور اُس کی آنکھیں غصے سے انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ اُسے ینی چری کے سپہ سالار کی بے باکی پر حیرت بھی ہوئی اور بے حد غصہ بھی آ رہا تھا جس نے اپنے انداز سے یہی ظاہر کیا تھا جیسے اُس نے کوئی جرم نہ کیا ہو۔ بلکہ جو کچھ کیا ہو، درست کیا ہو۔ سلطان کے لئے سپہ سالار کا انداز چڑانے والا تھا۔ چنانچہ اُس نے انتہائی سخت اور سرد لہجے میں سپہ سالار کو مخاطب کیا۔

''سپہ سالار!..... ہمیں صرف دو الفاظ میں اپنے سوال کا جواب درکار ہے۔ کیا تم نے ہمارے چھوٹے بھائی کو قتل کرنے کا سفاک اور سنگین جرم کیا ہے؟..... یا نہیں؟''

''ہاں، میں نے ننھے شہزادے کو قتل کیا ہے..... لیکن ایسا کر کے میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ میں نے جو کیا ہے سلطنت کی بہتری کے لئے کیا ہے۔ کیونکہ سلطنت عثمانیہ میں ہمیشہ سے یہ مسئلہ رہا ہے کہ سلطنت کے شہزادے تخت و تاج کے لئے پوری قوم کے مقدر کو داؤ پر لگاتے رہتے ہیں۔''

''خاموش..... تم حد ادب سے گزر چکے ہو..... تم نے صرف ننھے شہزادے کو قتل ہی نہیں کیا بلکہ ہم پر جھوٹا بہتان بھی باندھ رکھا ہے۔ جس کی بناء پر ملکہ کا خواجہ سرا یا دربار کے بعض دیگر لوگ ہمیں اس کام میں تمہارے ساتھ شریک سمجھتے ہیں..... حالانکہ ہم پورے دربار میں اپنے پروردگار کو حاضر جان کر یہ حلف دیتے ہیں کہ ہم اس سفاک درندگی کے بارے میں مطلق بے خبر تھے..... اور تمہاری یہ جسارت بھی قابل معافی نہیں جو تم نے عثمان پر تخت و تاج کے لئے لڑنے کا بہتان باندھا ہے..... ہم تمہیں سزائے موت کا حکم سنانے سے پہلے یہ جاننا چاہتے ہیں کہ تم کس کے لئے کام کرتے ہو؟ قیصر قسطنطنیہ کے لئے یا شاہِ ہنگری ہونیاڈے کے لئے؟''

سلطان نے ایک طرح سے سپہ سالار کو سزائے موت کا حکم سنا دیا تھا۔ لیکن دربار کا ہر فرد وہ دل سے ڈر رہا تھا۔ اُسے اچھی طرح علم تھا کہ ''ینی چری'' جیسی منہ زور سپاہ کا سپہ سالار اگر تخت نشینی کے پہلے دن نئے سلطان کے ہاتھوں قتل کر دیا گیا تو ایک بار پھر اس فوج

بغاوت پھوٹ پڑے گی۔ آج سلطان کے لئے زندگی کا مشکل ترین لمحہ گزارنا ناممکن ہو رہا تھا۔ نہ جائے رفتن..... نہ پائے ماندن۔ اگر وہ ننھے شہزادے کے سفاکانہ قتل کا بدلہ سپہ سالار سے نہ لیتا تو اہلیانِ دربار اور دیگر عوام میں شدید ناراضگی پھیل سکتی تھی۔ خصوصاً جب اس کی سوتیلی ماں ملکہ سروین اپنے شیر خور بچے کی جدائی پر نڈھال تھی اور خود سلطان کو بھی اپنا بھائی عزیز تھا اور پیارا تھا اُسے سپہ سالار پر بے حد غصہ آ رہا تھا۔ لیکن وہ خود کو بے بس محسوس کر رہا تھا۔ اُس نے سپہ سالار سے یہ سوال اسی لئے کیا تھا تاکہ سپہ سالار کے واقعات عیسائیوں کے ساتھ ظاہر ہوں اور اس سفاک درندے کی گردن آسانی سے مار سکے..... لیکن سپہ سالار نے پھر اسی طرح جواب دیا۔

''سلطانِ معظم!..... سلطان بایزید یلدرم نے تخت نشین ہوتے ہی اپنے چھوٹے بھائی شہزادہ یعقوب کو اسی مقصد کے تحت قتل کر دیا تھا جو آج کے روز میرا مقصد تھا۔ اور اُس وقت دربار کے علماء نے فتویٰ جاری کیا تھا کہ ..... ''الفتنۃُ اشدُّ مِن القتل''..... فتنہ قتل سے زیادہ برا ہے۔ چنانچہ شہزادہ یعقوب کو بلاوجہ قتل کر دیا گیا تھا تاکہ فتنہ پیدا نہ ہو سکے۔ میں نے بھی اسی غرض سے شہزادے کی جان لی ہے۔ تاکہ سلطنت آنے والے فتنہ سے بچ سکے۔''

سپہ سالار کا جواب بڑا عجیب تھا۔ سلطان نے کڑک کر کہا۔ ''تم سراسر جھوٹ بکتے اور خاندانِ اسلام پر بہتان لگاتے ہو۔ یہ سلاطین اسلام کا شیوہ نہیں بلکہ فراعین مصر کا شیوہ رہا ہے ننھے بچوں کو تخت و تاج چھن جانے کے ڈر سے قتل کر دیا جائے۔ ہم تمہیں کسی طرح معاف نہیں کر سکتے چاہے ہمیں پوری سلطنت سے ہاتھ دھونے پڑیں۔''

سلطان نے دل میں ایک مصمم ارادہ کرتے ہوئے پتھر کی طرح سخت لہجے میں کہا اور حکم دیا کہ وہ سپہ سالار کا سر قلم کر کے ملکہ معظمہ کے قدموں میں ڈال دے۔ سلطان کے سنتے ہی ینی چری کے سپہ سالار نے پہلی مرتبہ گھبراہٹ اور پریشانی کا اظہار کیا اور مضطرب لہجے میں سلطان سے مخاطب ہوا۔

''سلطانِ معظم! ایک شیر خوار کے عوض سلطنت عثمانیہ کی عظیم فوج ینی چری کا مستقبل داؤ اقوام کے لئے ضرر رساں ثابت ہو سکتا ہے۔ اس طرح پچھلی مرتبہ کی طرح فوج میں بغاوت پھیلنے کا اندیشہ بھی ہے۔ مجھے اپنی جان عزیز نہیں۔ میں سلطانِ معظم کے حکم پر اپنی گردن کٹوانے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن اس طرح سلطنت بہت بڑے نقصان سے دوچار ہو سکتی ہے۔''

سپہ سالار کی بات میں چھپی ہوئی دھمکی کو سلطان صاف محسوس کر رہا تھا۔ لیکن اب فیصلہ کر چکا تھا کہ کسی صورت میں اس ظالم قاتل کو معاف نہیں کرے گا۔ اُس کے حکم جلاد سپہ سالار کا کام سرِ دربار تمام کرنے کے لئے آگے بڑھا..... لیکن اس سے پہلے کہ زنجیروں میں جکڑے سپہ سالار کو جان سے مارتا، یکدم..... ایک طرف سے قاسم بن ہشام نے آگے بڑھ کر سلطان کی خدمت میں عرض کی۔

''سلطانِ معظم! ایک سرکاری سراغ رساں کی حیثیت سے میں سلطانِ معظم سے اجازت چاہتا ہوں کہ وہ اس مجرم کو مزید تفتیش کے لئے میرے حوالے کر دیں تاکہ اس سے معلوم کیا جا سکے کہ اس نے یہ مذموم فعل کس کے اشارے پر سرانجام دیا؟''

قاسم نے گویا سلطان کی مشکل آسانی کر دی۔ اس طرح اگر سپہ سالار کا تعلق کسی مسیحی سازش سے ثابت ہو جاتا تو نئی چڑی کے سپہ سالار کا قتل بہت آسانی سے کیا جا سکتا تھا۔ ادھر سلطان کو قاسم کی مداخلت سے حوصلہ ملا اور اُدھر سپہ سالار کی جان میں جان آئی۔ اُسے قاسم بن ہشام کی مداخلت سے یوں لگا جیسے رحمت کا فرشتہ اُس کی مدد کو آیا ہو۔ سلطان نے فوراً سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ ننھے شہزادے کے سفاک قاتل کو قاسم بن ہشام کے ہمراہ لے جائیں۔ اور اس کے بعد سلطان نے اپنا پہلا باقاعدہ دربار برخاست کرنے کا حکم دیا۔ آج جشن تاجپوشی کا دن تھا اور وہی ہوا جس کا ڈر سلطان اور قاسم بن ہشام کے دل میں جاگزیں تھا۔ سازشی اور غدار اپنا کام دکھا گئے تھے اور سلطان کے پہلے روز ہی انتہائی خطرناک مسئلہ پیدا کر دیا تھا۔ جسے بالآخر قاسم نے ہی سلجھایا اور دربارِ شاہی سے اس سفاک قاتل کو اپنے ہمراہ خفیہ محکمے کے تہہ خانے میں لے آیا۔

یہاں آ کر قاسم نے باقی تمام سپاہیوں کو چلتا کیا۔ اور جب تہہ خانہ خالی ہو گیا تو اس نے سپہ سالار سے کہا۔ ''سپہ سالار! دیکھو، تم نے بادشاہ کے بھائی کو قتل کیا ہے اور اپنے ہاتھ سے قتل کیا ہے۔ تم جانتے ہو کہ تم موت سے بچ نہیں سکتے۔ لیکن تمہارے بچنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ میں تمہیں یہاں سے فرار کرا دوں۔ میں تمہارے ساتھ تعاون کرنے کے لئے تیار ہوں اگر تم مجھے صرف ایک بات بتا دو۔''

''قاسم بن ہشام! میں جانتا ہوں تم مجھ سے کیا پوچھو گے۔ تم مجھ سے یہ اُگلوانا چاہو گے کہ میں عیسائیوں کا جاسوس ہوں۔ لیکن یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ میں اب بھی اسی بات پر قائم ہوں کہ میں نے سلطان کے بھائی کو سلطنت کی بھلائی میں قتل کیا ہے۔''

سپہ سالار، قاسم کی توقع سے زیادہ تیز نکلا۔ لیکن قاسم نے ہمت نہ ہاری اور پھر

''مجھے تم سے کچھ اُگلوانے کی ضرورت نہیں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم کس کے لئے کام کرتے ہو۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہاری اصلیت کیا ہے اور تم نئی چڑی میں کس طرح شامل ہوئے۔ تمہیں شاید معلوم نہیں کہ جس شخص نے پہلی مرتبہ ابوجعفر اور سلیم پاشا کی قلعی کھولی تھی وہ میں ہی ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ سلطان کے بڑے بھائی شہزادہ علاؤالدین بیماری سے فوت نہیں ہوئے بلکہ اُنہیں قتل کیا گیا ہے۔ تم کسی خوش فہمی میں مت رہنا۔ میں تو تمہارے ساتھ ایک سودا کر رہا تھا۔ مجھے اپنے ایک ذاتی دشمن کا پتہ درکار ہے، اس کے بدلے میں، میں تمہیں ''ادرنہ'' سے فرار ہونے کا موقع دے سکتا ہوں۔''

اب قاسم کی بات سن کر سپہ سالار کا دل دھک سے رہ گیا۔ اُسے قاسم کی بات میں سچائی محسوس ہونے لگی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ قاسم کا دشمن کون ہے۔ وہ ابوجعفر کو کیسے بھول سکتا تھا جسے چھڑانے کے لئے آج سے کئی سال پہلے ایک تاریک رات میں اُس نے ادرنہ کے شمالی قلعے پر حملہ کیا تھا۔ ہاں!..... یہ سپہ سالار وہی شخص تھا جس کا نقاب پوش دستہ رات کی تاریکی میں ابوجعفر کو قاسم کی قید سے چھڑوا کر لے گیا تھا۔ سپہ سالار کی کہانی مختصر سی تھی۔ اُس نے ''قسطنطنیہ'' میں آنکھ کھولی تھی۔ وہیں تربیت اور پرورش پائی۔ اُس کا خاندان ''قیصر'' کا قرابت دار تھا۔ چنانچہ ''قیصر'' نے اُسے ایک بڑے کام کے لئے منتخب کیا۔ اور وہ بڑا کام یہ تھا کہ اُسے کسی جنگ میں مصنوعی طور پر قید ہو کر سلطانی سپاہ ''نئی چڑی'' کا حصہ بننا تھا۔ چنانچہ اُس نے ایسا ہی کیا۔ کیونکہ ایسا کرنا کچھ مشکل نہ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سلطان کی نئی چڑی فوج دراصل تھی ہی اُن عیسائی نوجوانوں کا مجموعہ جو جنگوں میں گرفتار ہو کر آتے اور بعد میں انہیں تربیت دے کر اور مسلمان کر کے نئی چڑی میں شامل کر لیا جاتا۔ سپہ سالار نے جب قاسم کے منہ سے یہ سنا کہ قاسم اُس کے بارے میں سب کچھ جانتا ہے تو اُس کی رُوح کانپ گئی۔ اور اُسے یوں لگا جیسے سلطانی تلوار اُس کے سر پر آ پڑی ہو۔ اُس نے فی الفور فیصلہ کیا کہ وہ قاسم کے ساتھ تعاون کرے گا اور ''ادرنہ'' سے فرار ہونے کی کوشش کرے گا۔ یہ سوچ کر اُس نے کہا۔

''اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تم اپنے دشمن کا پتہ معلوم کر کے مجھے زندہ چھوڑ دو گے؟''

قاسم کا تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا تھا۔ گویا سپہ سالار نے اعتراف کر لیا تھا کہ وہ قیصر کا جاسوس ہے۔ اُس کے سوال پر قاسم نے کہا۔ ''میرے سودے پر یقین کرنا تمہاری مجبوری ہے۔ اگر تم یقین نہیں کرتے تو نہ کرو۔ میں اپنے دشمن کا پتہ تمہیں اذیت میں مبتلا کر کے بھی معلوم کر سکتا ہوں۔ اب جیسے تمہاری مرضی۔''

قاسم کی بات میں وزن تھا۔ جسے سپہ سالار نے پوری طرح محسوس کیا اور بے بسی سے قاسم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم ٹھیک کہتے ہو۔ تم پر اعتماد کرنا میری مجبوری ہے۔ میرے ہاتھ پاؤں کی زنجیریں کھول دو۔ میں تمہارے ساتھ تعاون کرنے کیلئے تیار ہوں۔“

قاسم نے اُس کی تمام زنجیریں کھول دیں۔ صرف ہاتھوں میں ہتھکڑی لگی رہنے دی تاکہ وہ حملہ نہ کر سکے۔ اور اُس کے قریب فرش پر بیٹھ گیا۔ سپہ سالار نے کہا۔

”ابوجعفر کو جمعہ کی شب میں نے ہی تمہاری قید سے رہا کروایا تھا۔ میں اور میرے ساتھیوں نے آدھی رات کے بعد شمالی قلعے پر حملہ کر کے وہاں موجود محافظوں کو قتل کر دیا اور قلعے کے تہہ خانے سے ابوجعفر کو نکال کر ہم لوگ فصیل کی جانب سے ہی شہر سے باہر اُتر گئے۔ شہر سے باہر البانوی کنیز کی بیٹی ”ماری“ کی سواری محافظوں کے ایک دستے سمیت ہماری منتظر تھی.....“

سپہ سالار نے ابھی اتنا بتایا تھا کہ قاسم کا دماغ سنسنانے لگا۔ تو کیا ابوجعفر، ماری کو اپنے ساتھ لے گیا تھا؟ کیا اُس وقت تک ماری زندہ تھی؟..... یہ الفاظ قاسم کے رگ و پے میں سرد لہر کی طرح اتر گئے۔ اُس نے بے صبری سے دریافت کیا۔

”یہ کیا..... یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ کیا البانوی کنیز کی بیٹی ماری اُس وقت تک زندہ تھی؟“

”ہاں، وہ زخمی تھی۔ لیکن پوری طرح صحت یاب تھی۔ اُسے ہم لوگ ایک رتھ میں لٹا کر ”البانیہ“ کی جانب روانہ ہوئے تھے۔ ہم نے براہِ راست ”البانیہ“ کا راستہ اختیار نہ کیا بلکہ پہلے ہم نے ایشیائے کوچک کی جانب پانچ سو کوس کا فاصلہ طے کیا اور پھر ہم نے ایک لمبا موڑ کاٹ کر ”کوہِ بلقان“ کا رُخ کیا تھا۔ کوہِ بلقان کے نزدیک پہنچ کر میں نے ابوجعفر کو الوداع کہا اور واپس ”ادرنہ“ لوٹ آیا۔ اُس وقت تک میں سپہ سالار نہیں تھا۔ بلکہ میری گرفتاری کا سپہ سالار ”خواجہ خیری“ تھا۔ اس لئے میری گمشدگی پر کسی کی نظر نہ گئی۔“

قاسم پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے۔ اس کا مطلب تو یہ تھا کہ ماری ابھی تک زندہ ہے۔ اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی اور وہ اپنی جگہ پر بیٹھا بیٹھا مضطرب ہو گیا۔ ماری اُس کی پہلی محبت، اُس کی زندگی ابھی تک زندہ تھی۔ جسے وہ چھ سال پہلے مُردہ تصور کر چکا تھا۔ اور پھر جب اُس کے خاص آدمی نے اُسے آ کر یہ بتایا کہ سکندر بیگ نے سلطان مراد خان کے ایلچیوں کو قتل کر دیا ہے اور ماری البانوی محل میں موجود نہیں تو اُسے یقین ہو گیا تھا کہ ماری مر چکی ہے۔ لیکن آج سپہ سالار کی بات سن کر اُس کے اوسان ٹھکانے نہ رہے تھے۔ کیونکہ اب چھ سات سال بعد اُسے اچانک ماری کے زندہ ہونے کی خبر مل رہی تھی۔

وہ بری طرح بے چین ہو گیا تھا اور چاہتا تھا کہ کسی طرح اُسے پر لگ جائیں اور وہ اُڑ کر اپنی ماری تک جا پہنچے۔ لیکن اُسے یہ معلوم نہ تھا کہ ماری کہاں ہے؟ اُس نے جذبات سے لبریز لہجے میں پوچھا۔

”کیا تمہیں اُس البانوی کنیز کی بیٹی کے بارے میں کچھ خبر ہے کہ ابوجعفر اُسے کہاں لے کر جا رہا تھا؟“

”ہاں، مجھے معلوم ہے۔ ابوجعفر اُسے سکندر بیگ کے لئے البانیہ لے کر جا رہا تھا۔“

”لیکن وہ تو البانیہ میں نہیں ہے۔ میں نے خود معلوم کیا ہے۔“

قاسم نے بے چینی سے کہا۔ اب قاسم کی حالت پر سپہ سالار غور کرنے لگا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ قاسم، ماری کے ذکر پر جذباتی ہوا جا رہا ہے۔ لیکن وہ ماری کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہ جانتا تھا کہ اُسے آخری بار ابوجعفر البانیہ کی جانب لے جا رہا تھا۔ اُس نے کسی قدر مایوسی سے کہا۔

”مجھے ماری کے بارے میں تو کچھ معلوم نہیں۔ البتہ میں ابوجعفر کے بارے میں جانتا ہوں کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔“

یہ خبر بھی قاسم کے لئے کم چونکانے والی نہ تھی۔ اُس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے اور وہ پوری طرح ہمہ تن گوش ہو گیا۔ سپہ سالار بتا رہا تھا۔ ”ابوجعفر اس وقت قسطنطنیہ کے سب سے بڑے کلیسا ”آیا صوفیاء“ میں ہے۔ اس کا اصل نام ”ڈیمونان“ ہے اور وہ ”آیا صوفیاء“ میں ایک معزز ”بطریق“ ہے۔ ”ڈیمونان“ اپنے سابقہ کارناموں کی بدولت بطریق اعظم اور شہنشاہ کا منظورِ نظر ہے اور اب بھی وہ جاسوسی کے نظام کے ساتھ منسلک ہے۔“

قاسم کے لئے یہ معلومات بے حد حیران کن تھیں۔ ابوجعفر کی اصلیت جان کر اُس کا دل اُچھلنے لگا۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اگر وہ ابوجعفر تک پہنچ گیا تو اپنی ماری تک پہنچ جائے گا۔ قاسم کو اس سے زیادہ سپہ سالار سے کچھ پوچھنا بھی نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی کچھ دیر تک سپہ سالار کے ساتھ بہت سی باتیں کرتا رہا۔ اُس نے سپہ سالار سے یہ بھی معلوم کیا کہ ”ادرنہ“ میں قیصر کے اور کتنے جاسوس سرگرمیوں میں ملوث ہیں۔ سپہ سالار سے راز اُگلوانے کے بعد قاسم وہاں سے اٹھا اور جانے لگا تو سپہ سالار بھی عجلت میں اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔

”یہ کیا؟..... تم تو جا رہے ہو..... اور وہ تمہارا سودا؟..... میرا کیا ہوگا؟“

"تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ میں رات کو کسی وقت تمہیں یہاں سے نکال دوں گا۔"

لیکن وہ رات کبھی نہ آئی۔ کیونکہ قاسم وہاں سے سیدھا "سلطان محمد خان" کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُسے تمام تفصیلات سے آگاہ کیا۔ جس کے نتیجے میں اگلے روز شہر کے سب سے بڑے چوک میں سفاک قاتل سپہ سالار کی لاش لٹک رہی تھی۔ سلطان نے شہر میں منادی کروا کر لوگوں کو بتایا تھا کہ نئی چڑی کے سپہ سالار کو ننھے شہزادے کے قتل کے قصاص میں سزائے موت دی گئی ہے۔ جبکہ اُن معلومات کی بناء پر جو قاسم نے سپہ سالار سے حاصل کی تھیں، نئی چڑی میں موجود کئی سالاروں اور بہت سے سپاہیوں کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ جس کی وجہ سے بغاوت کا خطرہ بھی ٹل گیا تھا۔ سلطان نے نئی چڑی کے سپہ سالار کو سزائے موت دینے کے بعد نئی چڑی کے لئے نیا سپہ سالار مقرر کیا جو قاسم کا ہشام کا دوست "آغا حسن" تھا۔

آغا حسن کو سپہ سالاری ملی تو فوج کے طور اطوار ہی بدل گئے۔ کیونکہ "آغا حسن" ایک مخلص، سچا اور کھرا مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہادر اور جنگجو مجاہد بھی تھا۔ پوری فوج میں آغا حسن کی آمد سے غیرت، حمیت اور شجاعت کی لہر دوڑ گئی۔

قاسم بھی آغا حسن کی تعیناتی پر بہت خوش تھا۔ لیکن اُس کے ذہن میں ہر گھڑی "قسطنطنیہ" جانے کا خیال سمایا ہوا تھا۔ وہ ابوجعفر تک پہنچنا چاہتا تھا تاکہ اپنی ماری کو ڈھونڈ سکے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اُس کے دل نے گزشتہ چھ سات سالوں میں کبھی بھی یہ تسلیم نہ کیا تھا کہ ماری مر چکی ہے۔ اُس کے ذہن میں ماری ہر وقت موجود تھی۔ لیکن جب سے اُسے ماری کے زندہ ہونے کی خبر ملی تھی، اُس کی نیندیں اُڑ چکی تھیں۔ وہ ہر لمحہ "قسطنطنیہ" جانے کے بارے میں سوچتا رہتا۔ گھر میں حمیرا نے اُسے پریشان دیکھا تو ایک دن پوچھ لیا۔

"آج کل آپ دل گرفتہ دکھائی دیتے ہیں..... لگتا ہے کسی بچھڑے ہوئے کی یاد ستا رہی ہے؟"

قاسم نے حمیرا کو ماری کے بارے میں سب کچھ بتا رکھا تھا۔ چنانچہ اُس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "ہاں!..... دراصل مجھے ایک عجیب اطلاع ملی ہے۔ سوچتا ہوں تمہیں بتاؤں یا نہ بتاؤں۔"

"ایسی بھی کیا اطلاع ہے جو آپ مجھے بتاتے ہوئے بھی گھبراتے ہیں..... آپ بے فکر ہو کر بتائیے۔ آپ نے ماری سے محبت کی ہے۔ لیکن میں نے آپ سے محبت کی ہے۔ مجھے کچھ فرق نہیں پڑتا چاہے آپ اس گھر میں ماری کو زندہ کر کے ہی کیوں نہ لے آئیں۔"

قاسم، حمیرا کی بات سے ششدر رہ گیا۔ اور اُسے اپنی پیاری بیوی پر بے طرح پیار آنے لگا۔ اُس نے حمیرا کو اپنی بانہوں میں بھر لیا اور اپنے ساتھ بھینچتے ہوئے اُس کے سر پر ٹھوڑی ٹکا دی۔

"حمیرا! تم میری زندگی ہو۔ میری بچی کی ماں ہو۔ اور سچ تو یہ ہے کہ میری محبت حمیرا! میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ ماری شہید نہیں ہوئی، ابھی تک زندہ ہے۔ لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کہاں ہے۔ اُس کی ماں کا قاتل اور اُس کو یہاں سے اغواء کر کے لے جانے والا شخص "قسطنطنیہ" میں ہے اور اُس کا پتہ چل گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کسی طرح سلطان سے اجازت لے کر قسطنطنیہ چلا جاؤں اور ماری کا پتہ لگانے کی کوشش کروں۔"

قاسم نے محسوس کیا کہ ماری کے زندہ ہونے کی خبر سن کر حمیرا کا دل دھک سے رہ گیا اُس کے چہرے پر کسی قدر یاس انگیز حیرت تھی۔ اُس نے سر اوپر اٹھایا اور اپنی آنسو بھری پلکیں پٹپٹاتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔

"ارے واہ! یہ تو بہت بڑی خوشخبری ہے۔ اگر ماری زندہ ہے تو میں اُسے خود اپنے ہاتھوں سے دلہن بنا کر یہاں لے آؤں گی۔ وہ آپ کی محبت ہی نہیں میری بہن بھی ہے بہت عظیم بھی۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ جبکہ اُس نے اپنا سب کچھ ایمان اور اسلام کے داؤ پر لگا دیا ہے۔ ایسی لڑکی تو زیارت کے قابل ہے۔"

حمیرا کے دل میں ایک طرف ماری سے عقیدت کے جذبات اُمڈ رہے تھے اور دوسری طرف اپنی محبت کے تقسیم ہو جانے کا اندیشہ سر اٹھا رہا تھا۔ لیکن اُس نے اپنے انداز سے کوئی اندیشہ ظاہر نہ ہونے دیا۔ وہ قاسم کی بانہوں میں اور بھی سمٹ گئی۔

✿

سلطان محمد خان نے تخت و تاج سنبھال لیا تھا۔ پہلے روز اُس پر اپنے بھائی کے قتل کا الزام لگا تھا وہ صاف ہو چکا تھا۔ زیادہ تر عمائدین سلطنت کو تو یہ سوچ کر یقین آ گیا تھا کہ ننھے شہزادے کے قتل کا حکم سلطان نے دیا ہوتا تو وہ اُسے کبھی بھی عین تقریب کے دوران قتل نہ کرواتا۔ وہ اپنی تخت نشینی کے مراسم سے فارغ ہونے کے بعد بھی بچے کی جان لینے کی تدابیر پر عمل کر سکتا تھا۔ اُس شیر خوار بچے کو تخت نشین کرنے کا فیصلہ رکن سلطنت کے دل میں موجود نہ تھا۔ بلکہ سب محمد خان کے حامی تھے۔ سلطان نشینی سے دو روز قبل ہی "ادرنہ" آیا تھا۔ جبکہ فوج کا سربراہ پہلے سے ہی یہاں

موجود تھا۔ اگر یہ کام سلطان نے کروانا ہوتا تو وہ اُن سرداروں سے کرواتا جو اچ
کوچک سے اور نہ اُس کے ساتھ آئے تھے اور جن پر اُس کو مکمل بھروسہ تھا۔ اور نہ میں
ہی ایک ایسے سردار کو جو اُس کے لئے کوئی مانوس شخص نہ تھا اس طرح کا حکم دینا معقو
احتیاط کے بھی برخلاف تھا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ''ینی چری'' کے سپہ سالار
مرتے دم تک دوبارہ سلطان پر الزام نہ لگایا تھا۔ یہی باتیں سوچ کر اراکین سلطنت مطم
ہو گئے۔ دراصل ینی چری فوج چونکہ سلطنت عثمانیہ کی لاڈلی فوج سمجھی جاتی تھی اس لئے
فوج اور اس فوج کے سرداروں میں عام طور پر سرکشی اور بغاوت کے اثرات پائے جا
تھے۔ قاتل سپہ سالار نے سلطان کو اپنے قابو میں رکھنے کے لئے یہ حرکت کی تھی۔ اُسے
توقع تھی کہ سلطان بغاوت کے ڈر سے اُس کی جان بھی نہ لے گا اور ہمیشہ اُس سے
رہے گا۔ لیکن سلطان محمد خان بالکل مختلف مزاج کا شخص ثابت ہوا۔ جو لوگ یہ سوچ رہے
تھے کہ سلطان محمد خان وہی سلطان ہے جو چند سال پہلے دو بار ناکام سلطان رہ چکا ہے
اب بھی ناکام رہے گا، وہ محمد خان کے اس اقدام سے خبردار ہو گئے تھے اور انہیں محسو
ہونے لگا تھا کہ سلطان محمد خان اب بچہ نہیں رہا۔

محمد خان کی تخت نشینی سے تین سال قبل بازنطینی سلطنت کا آخری فرمانروا..... بار
قسطنطین، قسطنطنیہ کے تخت پر بیٹھ چکا تھا۔ یہ بھی ''جان پلیولوگس'' کی طرح چالاک
ہوشیار آدمی تھا۔ اُس نے سلطان محمد خان کی تخت نشینی کے بعد ایشیائے کوچک کے
اور باغیانہ خیالات رکھنے والے امیروں کو سہارا دے کر فوراً ایک بغاوت کرا دی تھی
کے سبب سلطان محمد خان کو تخت نشین ہونے کے چند دن بعد ہی ایشیائے کوچک کی
متوجہ ہونا پڑا۔ ابھی سلطان ایشیائے کوچک کے انتظام سے فارغ نہ ہوا تھا کہ
قسطنطنیہ نے اُس کے پاس پیغام بھیجا کہ سلطان مراد خان ثانی کے زمانے سے
عثمانیہ کا ایک شہزادہ ''اُرخان'' نامی ہمارے پاس نظر بند ہے۔ اُس کے اخراجات
کے لئے جو رقم سلطانی خزانہ سے آتی ہے اُس میں اضافہ کرو۔ ورنہ ہم اُس شہزادے
کر دیں گے اور آزاد کر کے اُسے تمہارے خلاف فوج کشی کرنے میں مدد بھی دیں
''اُرخان''، ''بایزید یلدرم'' کا پوتا تھا۔ جو بایزید یلدرم کے اُن بیٹوں میں
''جنگ انگورہ'' کے بعد بکھر گئے تھے، ایک کا بیٹا تھا۔ اس لحاظ سے ''اُرخان'' کو
مراد خان ثانی'' کا چچا زاد بھائی بھی تھا۔ قیصرِ قسطنطنیہ چونکہ ''سلطان محمد خان'' کو
طبیعت کا شخص سمجھتا تھا اس لئے اُس نے اس دھمکی کے ذریعے سلطان سے روپیہ

اس کو دبانا چاہا۔ لیکن سلطان محمد خان نے اُس کی مطلق پرواہ نہ کی۔ چنانچہ سلطان نے
قیصر کے ایلچیوں کو نامراد لوٹا دیا اور دل میں تہیہ کر لیا کہ جب تک عیسائی سلطنت کا قصہ
پاک نہ کر دیا جائے، سلطنت عثمانیہ کا قیام و استحکام ہمیشہ خطرے میں رہے گا۔ اُس وقت
سلطان نے قیصر کے ایلچیوں کو کوئی صاف جواب نہ دیا اور خود قیصر کے خاتمے کی تدبیریں
سوچنے لگا۔

''قسطنطین'' ایک جنگجو شہزادہ تھا۔ لیکن اُس نے ''محمد خان'' کو چھیڑ کر اُسی غلطی کو دہرایا
جو اُس کے پیش رو ''مینوئیل'' نے ''سلطان مراد خان ثانی'' کے ساتھ کی تھی۔ ''اُرخان''،
شہزادہ سلیمان'' کی اولاد میں سے تھا۔ شہنشاہ نے سلطان محمد خان کو دھمکی تو دے دی۔
لیکن اُسے معلوم نہ تھا کہ نوعمر سلطان کی قوتیں حیرت انگیز سرعت کے ساتھ ترقی پا چکی ہیں
وہ بائیس سال کی عمر میں ہی وہ ارادے کی پختگی، فوجی قابلیت اور ملکی تنظیم و تدبیر میں اپنے
پہلوں کا حریف بن چکا ہے۔

''سلطان محمد خان'' کے وزیر اعظم ''خلیل پاشا'' نے قسطنطین کے واپس ہوتے ہوئے
ایلچیوں کو اس احمقانہ مطالبے کے خطرات سے آگاہ کیا اور سفیروں سے کہا۔

''تمہارا جنون ''قسطنطنیہ'' کو سلطان کے ہاتھوں میں دے کر رہے گا۔ یورپ میں ''اُر
خان'' کے سلطان ہونے کا اعلان کر دو۔ بے شک اہل ہنگری کو اپنی مدد کے لئے بلا لو۔ جو
اب تم واپس لے سکتے ہو، بے شک لے لو۔ لیکن بہت جلد تم کو بازنطینی سلطنت کا خاتمہ
نظر آ جائے گا۔''

اس روز قیصر کے ایلچی سلطان سے ملے، اُسی روز سے سلطان نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ
شہر کو اپنی سلطنت میں شامل کرے گا۔ ''سینوپ'' اور ''طرابزون'' کے علاوہ قدیم
سلطنت کے تمام ایشیائی علاقوں پر عثمانیوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ یورپ میں صرف
قسطنطنیہ'' اور اس کے مضافات اس سلطنت سے باقی رہ گئے تھے۔ قیاصرہ کی وہ عظیم
سلطنت جو اپنی وسعت اور قوت کے لحاظ سے کبھی دنیا کی تمام سلطنتوں پر فوقیت رکھتی
تھی تباہی اور بربادی کی آخری حد تک پہنچ گئی تھی۔ اور جہاں تک وسعت اور قوت کا
تعلق ہے گویا فنا ہو چکی تھی۔ تاہم اس حالت میں بھی ''قسطنطنیہ'' کا وجود بجائے خود نہایت
اہم اور قیصرِ سلطنت کی یہ پہلی اور آخری اینٹ ہنوز اپنی جگہ پر قائم تھی۔ ترکوں نے
جس یورپ کی سرزمین پر قدم رکھا، اُسی وقت سے اس شہر کو فتح کرنے کا حوصلہ اُن
میں پیدا ہوتا گیا۔ جوں جوں فتوحات کا دائرہ بڑھتا جاتا تھا، اُن کے دلوں میں

ارادے کی پختگی اور قوت آتی جاتی تھی۔ اور بالآخر اس کا پہلا عملی اظہار ''بایزید یلدرم'' عہد میں ہوا جب اُس نے ''آبنائے باسفورس'' کے مشرقی ساحل پر ایک مضبوط قلعہ تعمیر کرانے کے بعد ''قسطنطنیہ'' کا محاصرہ کر لیا تھا۔ لیکن محاصرہ کو چند ہی روز گزرے تھے کہ تیموری حملہ نے ''بایزید'' کو یہ محاصرہ اٹھا لینے پر مجبور کیا۔ اور ''جنگ انگورہ'' کے بعد دنوں کے لئے قسطنطنیہ محفوظ و مامون ہو گیا۔ سلطان مراد خان ثانی اگرچہ شہنشاہ آویزش پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن خود شہنشاہ کی غداری نے اُسے مجبور کیا کہ سلطنت حفاظت کے خیال سے سازشوں کے مرکز ''قسطنطنیہ'' پر قبضہ کر کے ہمیشہ کے لئے اس استیصال کر دے۔ مگر سلطنت بازنطینی کے ایامِ حیات ابھی کچھ باقی تھے۔ اور سلطان خان کو بھی محاصرہ اٹھا کر اپنی ایک بغاوت فرو کرنے کے لئے جانا پڑا۔

''سلطان محمد خان'' اچھی طرح جانتا تھا کہ ''بحر مارمورا'' کے دونوں ساحلوں پر عثمانی کی حکومت ہے اور درمیان میں ''قسطنطنیہ'' عیسائیوں کے قبضے میں ہے۔ چنانچہ جب ''قسطنطنیہ'' رہا، سلطان کے ایشیائی اور یورپی حصوں کا تعلق قائم نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا جو اُسے عیسائی سازشوں کا قلع قمع کرنے کے لئے قسطنطنیہ پر یلغار کرنی تھی وہاں اپنی سلطنت میں استحکام کے لئے بھی اُس کا قسطنطنیہ پر حملہ ناگزیر تھا۔ یہ وجوہات تھیں جن کی بنا پر اُس نے پہلے روز ہی قسطنطنیہ پر حملے کا فیصلہ کیا تھا اور اس طرح اُس نے اپنے دورِ حکومت کے سب سے عظیم الشان کارنامے کے لئے تیاریاں شروع کر دیں۔

قیصر کے ایلچیوں کے چلے جانے کے بعد سلطان ''ایشیائے کوچک'' واپس آیا اور سب سے پہلے اپنے وزراء، امراء، سالاروں اور عمائدین سلطنت کا اجلاس طلب کیا۔ اس اجلاس میں قاسم بھی موجود تھا۔ سلطان چاہتا تھا کہ اپنے ارکانِ سلطنت کو نہ صرف اپنے ارادے سے آگاہ کرے بلکہ اُن سے ''قسطنطنیہ'' پر حملے کی منظوری بھی حاصل کرے۔ یہ اتفاق حسن اتفاق کہ جس دن سلطان نے یہ اجلاس طلب کیا، اُسی دن اور نہ میں شہنشاہ قسطنطنیہ کی ایک اور سفارت پہنچی۔ عین اُس وقت جب دربار میں قسطنطنیہ پر حملے سے گرم بحث جاری تھی، وزیر سلطنت نے سلطان کے نزدیک آ کر اُس کے کان میں قیصر کے ایلچیوں کی بابت بتایا۔ دربار میں کچھ لوگ قیصر کے ساتھ تعلقات بگاڑنے کے حق میں تھے۔ سلطان کو ایلچیوں کی آمد تائید غیبی محسوس ہوئی اور اُس نے اُن قسطنطنیوی سفیر کو دورانِ اجلاس اپنے دربار میں طلب کر لیا۔

شہنشاہ کے سفیر دربار میں داخل ہوئے تو تمام اہلیانِ دربار کی نظریں اُن کی

تھیں۔ یہ لوگ بھاری بھرکم جبوں میں ملبوس تھے۔ ان کی گردنوں میں طلائی صلیبیں لٹک رہی تھیں اور سر پر ''قسطنطنیہ'' کی مخصوص لمبوتری ٹوپیاں رکھی تھیں۔ شہنشاہ کا سفیر سلطان کے سامنے پہنچ کر شاہی آداب بجا لائے بغیر بے ادبی سے کھڑا رہا۔ سلطان کے اشارے پر سفیر نے شہنشاہ قسطنطنیہ کا پیغام پڑھ کر سنانا شروع کیا۔

''شہنشاہوں کے شہنشاہ قیصرِ قسطنطنیہ ''قسطنطین دوازدہم'' کی جانب سے سلطان محمد خان کے نام!

سلطان کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ ''بایزید یلدرم'' کا پوتا اور ''سلیمان شاہ'' کا فرزند ''اُرخان'' ہماری قید میں ہے۔ جس کے نان نفقہ کے لئے جو رقم سلطانی خزانے سے بھیجی جاتی ہے وہ ناکافی ہے۔ چنانچہ سلطان کو چاہئے کہ وہ اس رقم میں اضافہ کر کے اسے دوگنا کرے۔ بصورتِ دیگر شہنشاہ، عثمانی شہزادہ ''اُرخان'' کو آزاد کر کے ''سلطان محمد خان'' کے مقابلے کھڑا کر دے گا۔ شہنشاہ نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ اس مرتبہ شہنشاہ کے ایلچیوں کو ناکام مراد لوٹایا گیا تو تمام ذمہ داری سلطان پر ہو گی۔''

قیصرِ قسطنطنیہ کے ایلچیوں کی زبانی قیصر کا پیغام سن کر تمام اہلیانِ دربار آگ بگولہ ہو گئے۔ سلطان کی ترکیب کامیاب رہی۔ اور وہ لوگ بھی جو قیصر کے خلاف نہ تھے، اس توہین کے بعد پیچ و تاب کھانے لگے۔ سلطان نے اہلیانِ دربار کی رائے لینے کے بعد شہنشاہ کے ایلچیوں کو نہایت ذلت کے ساتھ اپنے دربار سے نکال دیا۔ قیصر کے ایلچی چلے گئے تو دربار میں جاری اجلاس پھر سے شروع ہوا۔ اس مرتبہ سب کی رائے یہ تھی کہ قسطنطنیہ پر حملہ کرنے کے لئے زور و شور سے تیاریاں شروع کی جائیں۔ سلطان کو ایک بوڑھے رُکن سلطنت نے اُٹھ کر ایک عجیب مشورہ دیا۔

''سلطانِ معظم! سلطنت عثمانیہ کے سابقہ فرمانروا بھی قسطنطنیہ پر حملہ آور ہوتے رہے ہیں۔ لیکن ہر مرتبہ ''ایشیائے کوچک'' سے بغاوت اُٹھ کھڑی ہوتی ہے اور انہیں ان شورشوں کو فرو کرنے کے لئے جانا پڑتا ہے۔ میرا یہ ناقص مشورہ ہے کہ اس مرتبہ قسطنطنیہ پر حملہ کرنے سے پہلے ''امیر کرمانیا'' کے ساتھ مکمل صلح کر لی جائے..... میرے ذہن میں اس صلح کے لئے ایک تجویز ہے۔ اگر سلطانِ معظم اجازت دیں تو میں بیان کروں۔''

''اجازت ہے۔''

''سلطانِ معظم! ''امیر کرمانیا'' کی ایک نوجوان لڑکی ہے۔ اگر سلطانِ معظم اُس کے ساتھ عقد کا ارادہ فرما لیں تو مجھے یقین ہے کہ ''امیر کرمانیا'' بخوشی یہ رشتہ قبول کر لے گا اور

اس طرح وہ ہمیں قسطنطنیہ کے محاصرہ کے دوران پریشان نہ کر سکے گا۔"

سلطان کو بوڑھے رکن سلطنت کی تجویز بہت پسند آئی اور اُس نے بلا تامل اس پر
کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اسی اثناء میں قاسم بن ہشام اپنی نشست پر اُٹھ کھڑا ہوا
سلطان سے کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہی۔ سلطان نے قاسم بن ہشام کی جانب
اور مسکراتے ہوئے بات کرنے کی اجازت دی۔

"سلطانِ معظم! امیر کرمانیا کے ساتھ صلح کرنے کا مشورہ بے حد عمدہ اور بصیرت
ہے۔ اسی طرح میری رائے یہ ہے کہ قسطنطنیہ پر حملہ سے پہلے "شاہ ہنگری ہونیاڈے"
بھی صلح کر لی جائے۔ کیونکہ پے در پے شکستوں کے بعد "شاہ ہنگری" بھی ہر دم اس
میں رہتا ہے کہ اسے سلطنت عثمانیہ سے بدلہ لینے کا موقع ملے۔"

لیکن اس سے پہلے کہ سلطان کوئی جواب دیتا ایک نوجوان وزیر سلطنت اپنی نشست
سے اُٹھا اور عرض کی۔ "سلطانِ معظم! محترم قاسم بن ہشام کی عجیب رائے سن کر مجھے
ہوئی ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک صلیبی جنگ کا سربراہ ہونیاڈے موقع ملنے پر
کے خلاف تلوار نہ اٹھائے گا۔"

وزیر سلطنت کی بات میں وزن تھا۔ اب سلطان دیگر عمائدین سلطنت کی رائے
جاننا چاہتا تھا۔ چنانچہ سلطان نے اہل اجلاس کو تبصرہ کرنے کی اجازت دی۔ وہی
رُکن سلطنت پھر اُٹھا اور کہنے لگا۔

"سلطانِ معظم! قاسم بن ہشام کی رائے غیر درست نہیں۔ ہونیاڈے کے ساتھ
جا سکتی ہے۔ کیونکہ ہونیاڈے خود شہنشاہِ قسطنطنیہ کے خلاف مذہبی اختلافات رکھتا ہے
طرح قسطنطنیائی افوج کا سپہ سالار "گرانڈ ڈیوک نوٹاراس" بھی ہونیاڈے کو
اختلافات کی وجہ سے ناپسند کرتا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ دونوں عیسائی ہیں
سلطانِ معظم! جب سے عیسائیت دو بڑے مذہبی فرقوں میں تقسیم ہوئی ہے اس کا
اتحاد پارہ پارہ ہو کر رہ گیا ہے۔ دونوں فرقے ایک دوسرے کو کافر، مرتد اور گمراہ کہتے
ان میں اتنی محبت بھی باقی نہیں رہی کہ کسی تیسرے دشمن مثلاً مسلمانوں کے خلاف
پر متحد ہو سکیں۔"

سلطان بوڑھے رکن سلطنت کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔ اسی اثناء
اعظم "خلیل پاشا" پہلی مرتبہ اپنی نشست سے اُٹھا اور کہنے لگا۔ "سلطانِ
اراکین سلطنت کی دانشمندی اگر اسی طرح قائم رہی تو مجھے یقین ہے کہ سلطنت

زوال نہیں آ سکتا۔ اہل قسطنطنیہ ابھی تک یونانی قدیم کلیسا کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اور
نطنطنیہ ہی اس فرقے کا مرکز ہے۔ اس کے برعکس اہل ہنگری نئے فرقے رومن کیتھولک
کے ساتھ وابستہ ہے جس کا مرکز "روما" میں "پاپائے روم" کا کلیسا ہے۔ ان کا یہ نفاق
اسلام کے لئے اللہ کی امدادِ غیبی ہے۔ یہی مناسب وقت ہے کہ ہم عیسائیت پر ایک آخری
اور کاری ضرب لگائیں۔ میں قاسم بن ہشام کے مشورے کی تائید کرتا ہوں۔"

اب سلطان محمد خان کے لئے مزید کسی کا مشورہ سننا ضروری نہ تھا۔ چنانچہ اُس نے
ایک سفارت تیار کرنے کا حکم دیا جسے ہونیاڈے کے ساتھ صلح کی بات چیت کے لئے روانہ
کیا جاتا۔ سلطان نے ہونیاڈے کو تین سال کی جنگ بندی کا پیغام بھیجا اور اُسے راضی
کرنے کے لئے کافی نرم زبان استعمال کی۔ اسی طرح اب اہل اجلاس کو شمالی یورپ کی
طرف سے بھی کوئی خطرہ باقی نہیں رہے گا۔ دربار کا اہم اجلاس ابھی جاری تھا کہ ینی چری
کے لشکر کا سپہ سالار نوجوان اور خوبرو "آغا حسن" سلطان سے اجازت لے کر کہنے لگا۔

"سلطانِ معظم! ہمیں "موریا" کی طرف سے بھی خطرات لاحق ہیں۔ کیونکہ "موریا"
کے حکمران شہنشاہِ قسطنطنیہ کے بھائی ہیں۔ اور عین ممکن ہے کہ وہ بھی شہنشاہ کی مدد کے لئے
آئیں۔"

آغا حسن کی بات پر کافی دیر تک دربار میں تبصرہ ہوتا رہا۔ اور پھر باہمی مشورے سے
بہترین فوج موریا کی جانب روانہ کرنے کا فیصلہ بھی کیا گیا۔ سلطان نے اراکین
لطنت کو مخاطب کر کے کہا۔

"معزز اراکین سلطنت! میں محسوس کرتا ہوں کہ "قسطنطنیہ" اپنے محل وقوع کی وجہ سے
محفوظ شہر ہے۔ کیونکہ اس کے تین اطراف میں سمندر اور ایک جانب خشکی ہے۔ انہیں
کی موجودگی نے بحری فوج بنانے پر بھی مجبور کر رکھا ہے۔ قسطنطنیہ کے علاوہ یونان اور
کے جہاز بھی ان کی مدد کو پہنچ سکتے ہیں۔ اس کے برعکس سلطنت عثمانیہ کے پاس بحری
نہ ہونے کے برابر ہے۔ ان کے جہازوں کے مقابلے میں عثمانی کشتیاں بالکل بے
اور ناکارہ ہو جاتی ہیں۔ اور پھر ہمارے پاس کشتیاں بھی تو بہت کم ہیں۔ میں سمجھتا
ہمیں قسطنطنیہ پر حملہ سے پہلے اپنی بحری قوت میں اضافہ کرنا ہوگا۔"

سلطان کی بات پر اہل دربار کی آنکھوں میں خراجِ تحسین کی جھلک نظر آئی اور وہ یہ
پر مجبور ہوئے کہ سلطنت عثمانیہ کو بحری طاقت کی ضرورت ہے۔ دیر تک اسی موضوع
ہوتی رہیں۔ قاسم نے سلطان کو بوڑھے ملاح عباس کے بارے میں بتایا۔ اور

اُسے یہ بھی بتایا کہ وہ بڑے بڑے بحری جہازوں کے تیار کروانے اور اُن کو سمندر میں جنگی اغراض سے استعمال کرنے کا ماہر ہے۔ سلطان نے اہل دربار کے باہمی مشورے کے بالآخر یہ اعلان کیا کہ سلطنت عثمانیہ کا ایک جنگی بحری بیڑا تیار کیا جائے گا جو فتح قسطنطنیہ کے موقع پر مسلمانوں کے بحری محاذ کو سنبھالے گا۔ آج کا سارا دن اجلاس جاری رہا۔ مغرب کے بعد اجلاس اگلے روز کے لئے برخواست کر دیا گیا۔ اور سلطان نے قاسم کو اپنے کمرۂ خاص میں طلب کر لیا۔ قاسم سلطان کے پاس تخلیے میں پہنچا تو سلطان نے کہا۔

''قاسم بن ہشام! اسلام اور سلطنت عثمانیہ کے لئے آپ کی دس سالہ خدمت پر نظر ڈالی جائے تو آپ کی عسکری صلاحیتوں میں سراغ رسانی اور جاسوسی نمایاں نظر آتی ہے۔ میں نے قسطنطنیہ پر حملہ کرنے کے لئے ایک اور محاذ پر توجہ دینے کا بھی فیصلہ کیا ہے۔ یہ ہے نظامِ جاسوسی کا خفیہ محاذ۔ میں چاہتا ہوں ''قسطنطنیہ'' کے حفاظتی حصار، فصیل کی حالت، بحری قوت کی تفصیل، جنگی اور دفاعی صلاحیتیں، حتیٰ کہ شہنشاہِ قسطنطنیہ کی کمزوریوں تک کا بھی میری نظروں سے اوجھل نہ رہے۔ یہ بہت مشکل اور خطرناک کام ہے۔ کیونکہ یہ معلومات کے لئے جس کو بھی بھیجا جائے گا، ایک غیر ملکی جاسوس کی حیثیت سے اُس کی جان ہتھیلی پر رہے گی۔ میں چاہتا ہوں کہ میں قسطنطنیہ میں آپ کی رائے اور مشورے سے اس مقصد کے لئے کسی شخص کو بھیجوں۔''

سلطان کی بات کے ساتھ ساتھ قاسم کے رگ و پے میں لہو کی گردش تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اندھا کیا چاہتا تھا..... دو آنکھیں۔ وہ تو پہلے سے ہی قسطنطنیہ جانا چاہتا تھا۔ اُس نے بے صبری سے کہا۔

''سلطانِ معظم! اس اہم اور مشکل مہم پر میں خود روانہ ہونا چاہتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں یہ مقصد کسی بھی اور شخص سے زیادہ بہتر طور پر سرانجام دے سکتا ہوں۔''

سلطان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ کیونکہ سلطان خود بھی یہی چاہتا تھا کہ اس مرتبہ وہ ہر کام ٹھیک ٹھیک طریقے سے ناپ تول کر کرے۔ تاکہ قسطنطنیہ کو فتح کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی باقی نہ رہے۔ سلطان بھی یہی چاہتا تھا کہ اس مہم پر قاسم خود روانہ ہو۔ قاسم کو قسطنطنیہ کے لئے تیار دیکھ کر سلطان نے فوراً کہا۔

''ٹھیک ہے۔ آپ اپنے سفر کی تیاری شروع کریں۔ آپ بہت جلد عیسائی دنیا کے قدیم مرکز اور بازنطینی سلطنت کے دارالحکومت قسطنطنیہ روانہ ہو رہے ہیں۔ قاسم بن ہشام! ایک بات یاد رکھئے، کہ ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زبانی ''قسطنطنیہ

کے فاتح کو جنت کی بشارت دی ہے۔ آپ عثمانی افواج کے قسطنطنیہ میں داخل ہونے سے پہلے اس شہر کو داخلی طور پر فتح کرنے جا رہے ہیں۔ قسطنطنیہ میں پہلے بھی مسلمان آباد ہیں۔ ان میں سے بعض لوگ سلطنت عثمانیہ کے لئے مدت سے کام کر رہے ہیں۔ قسطنطنیہ میں ''غلطہ'' کا نصف حصہ ہمارے آباء میں سلطان ''بایزید یلدرم'' نے اُس وقت کے شہنشاہ ''مینوئیل'' سے حاصل کر لیا تھا..... آپ کو وہاں پریشانی نہ ہو گی۔ لیکن پھر بھی جنگی نوعیت کی معلومات حاصل کرنے کے لئے آپ کو بے حد محنت کرنی پڑے گی۔ چنانچہ یہی بہتر ہے کہ آپ جلد سے جلد قسطنطنیہ روانہ ہو جائیں۔''

اس مرتبہ سلطان نے مشرقی یورپ کے اس مرکز اور قدیم عیسائیت کے اس مذہبی شہر کو ہر صورت فتح کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ نوعمری میں دو مرتبہ ناکام سلطان بننے کے بعد جب سلطان مراد خان ثانی نے اُسے تعلیم و تربیت کے لئے ''ایدین'' بھیجا تو اس لاڈلے شہزادے کو اسلامی تعلیمات اور تاریخ پڑھنے کا صحیح معنوں میں موقع ملا۔ اُسے معلوم ہوا کہ آقائے نامدار، مقصودِ کائنات، سرکارِ دوعالم، خیر الانام، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی حیاتِ مبارکہ میں قسطنطنیہ کی فتح سے گہری دلچسپی رہی تھی۔ اُس نے تاریخ کا مطالعہ کیا اور اُسے معلوم ہوا کہ قسطنطنیہ کو فتح کرنے کی نیت سے پہلا اسلامی حملہ 48ھ میں کیا گیا۔ اس معرکے میں کئی اصحابِ رسولؐ بھی شریک تھے۔ سابقون الاوّلون میں ''حضرت ابو ایوب انصاریؓ'' جیسے جید صحابہ بھی شامل تھے۔ اُسے مطالعے کے دوران یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت ایوب انصاریؓ اسی معرکے میں شہید ہوئے اور قسطنطنیہ کی فصیل کے نزدیک ہی دفن کئے گئے۔ اُسے سب سے زیادہ دلچسپی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اُس فرمان پر تھی جس میں آپؐ نے فاتح قسطنطنیہ کو جنت کی بشارت دی تھی۔ اسی لئے وہ اس قدر اہتمام اور تیاری کے ساتھ قسطنطنیہ پر حملہ آور ہونا چاہتا تھا۔

اُدھر قسطنطین پر یہ مصیبت خود اُس کی اپنی غلطی سے نازل ہوئی تھی۔ اُس نے سلطان مراد خان کو تخت نشین ہونے کے بعد دو مرتبہ دھمکی آمیز سفارت بھیج کر اپنی موت کے پروانے پر خود دستخط کئے تھے۔ سلطان نے قاسم بن ہشام کو قسطنطنیہ کے لئے روانہ کیا۔ ''شہزادے کوچک'' کی شورشوں کو فرو کرنے کے لئے امیر کرمانیا سے صلح کر لی اور اُس کی بیٹی سے عقد کر لیا۔ اس کے بعد تین سال کے لئے ہونیاڈے سے بھی صلح کر لی۔ جس کی وجہ سے شمالی یورپ کی طرف سے کوئی خطرہ باقی نہ رہا۔ پھر اُس نے ایک فوج ''موریا'' کی طرف بھیج دی تاکہ شہنشاہ کے بھائی جو وہاں حکومت کرتے تھے، قسطنطنیہ کی مدد سے روک

دیئے جائیں۔ ان تدبیروں سے فارغ ہو کر اُس نے ''آبنائے باسفورس'' کے یورپی ساحل اور ''قسطنطنیہ'' سے تقریباً پانچ میل کے فاصلے پر ایک زبردست قلعہ تعمیر کروانا شروع کر اس سے پہلے سلطان بایزید یلدرم نے آبنائے باسفورس کے ایشیائی ساحل پر ایک قلعہ تعمیر کروایا تھا۔ سلطان محمد خان نے ایشیائی ساحل کے ٹھیک سامنے آبنائے باسفورس کے یورپی ساحل پر دوسرا قلعہ تعمیر کروانا شروع کیا۔ قسطنطنیہ شہر بھی اسی ساحل پر واقع تھا۔

''آبنائے باسفورس'' بھی اپنی طرز کی عجیب آبنائے ہے۔ براعظم ایشیاء اور براعظم یورپ حقیقت میں سمندر کے اندر تیرتے ہوئے خشکی کے دو بڑے ٹکڑے ہیں۔ کئی لاکھ سال پہلے یہ ٹکڑے تیرتے تیرتے آہستہ آہستہ ایک دوسرے کے نزدیک آئے۔ حتیٰ کہ اب قدرے نزدیک آ گئے کہ درمیان میں صرف ''آبنائے باسفورس'' کا تھوڑا سا پانی رہ گیا۔ البتہ شمال کی جانب سے یہ دونوں براعظم آپس میں مل گئے۔ اسی کو یورپی روس کہتے ہیں۔ آبنائے باسفورس ایک آبی گزرگاہ ہے جو ایشیا اور یورپ کے درمیان حائل ہے۔ یہ ایک پٹی کی طرح سے دونوں براعظموں کے درمیان پڑی ہے۔ اور اس کے دونوں سروں پر کالا سمندر واقع ہے۔ ایک سرے پر واقع کھلے سمندر کا نام ''بحر اسود'' ہے۔ جبکہ دوسرے سرے پر واقع سمندر کا نام ''بحر مارمورا'' ہے۔ ''بحرہ مارمورا'' کی جانب جس مقام سے کھلا سمندر شروع ہوتا ہے، اس مقام کو ''درِ دانیال'' کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ یہی درِ دانیال ہے جو صدیوں سے مشرق اور مغرب کے حملہ آوروں کے بحری جہازوں کی گزرگاہ رہا ہے۔

چنانچہ سلطان نے آبنائے باسفورس کے یورپی ساحل پر بھی ایک زبردست جنگی قلعہ کے کام کا آغاز کر دیا۔ قسطنطین نے اس قلعہ کی تعمیر کے خلاف احتجاج کیا۔ لیکن سلطان نے اُس کی ایک نہ سنی۔ قلعہ کی تعمیر کے دوران بعض ترک سپاہیوں نے چند یونانی کاشتکاروں سے چھیڑ چھاڑ کی۔ جس نے ایک چھوٹی سی لڑائی کی شکل اختیار کر لی۔ اور اس میں فریقین کے چند سپاہی مارے گئے۔ ''قسطنطین'' سمجھ چکا تھا کہ یہ تمام تیاریاں دراصل قسطنطنیہ پر حملہ کے لئے ہو رہی ہیں۔ اُس نے قسطنطنیہ پر حملہ کے خوف سے شہر کے پھاٹک بند کرا دیئے۔ اور ایک وفد بھیج کر سلطان محمد خان کی خدمت میں ترک سپاہیوں کے طرزِ عمل کی شکایت کی۔ ''محمد'' نے اس شکایت کا جواب اعلانِ جنگ سے دیا۔ اب سلطنت بازنطینی کی موت و زیست کا مسئلہ آخری فیصلے کا منتظر تھا۔ سلطان محمد خان کے اطوار بتاتے تھے کہ وہ اس مرتبہ کسی صورت شہنشاہ کو معاف کرنے والا نہیں۔ دراصل سلطان نے اندازہ کر لیا تھا کہ جب تک قسطنطنیہ فتح نہ ہو، اسلامی سلطنت کو مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ

حدیثِ سید الانبیاء، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خواہش تھی۔ سلطان اپنی عسکری زندگی کے آغاز قسطنطنیہ جیسے عظیم شہر پر کامیاب حملے سے کرنا چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہر طرح کے انتظامات خود اپنی نگرانی میں مکمل کروا رہا تھا۔ اُس نے مایہ ناز آہن گر نومسلم ''اُربان'' کو بلوایا اور اُسے قسطنطنیہ پر حملے کے لئے ایک ایسی زبردست توپ بنانے کا حکم دیا جو ''قسطنطنیہ'' کی تہہ در تہہ بنی فصیل کو تباہ کرنے کا کام کماحقہ کر سکے۔ ''اُربان'' کے ذہن میں تو پہلے ہی سے ایک ایسی ہی توپ کا خاکہ تھا۔ اُس نے سلطان سے کہا۔

''سلطانِ معظم! میں ایک ایسی توپ بنا سکتا ہوں جس میں چالیس بالشت (30 انچ یا 2½ فٹ) موٹائی کا بھاری بارود سے لیس گولا داغا جا سکتا ہے۔ یہ توپ قد و قامت کے لحاظ سے بہت بڑی ہو گی۔ اس لئے یہ لوہے کی بجائے پیتل سے ڈھالنی پڑے گی۔''

(دولت عثمانیہ)

سلطان نے اُربان کی توپ کے خاکے کو بہت سراہا اور اُسے فوری طور پر ایسی توپ بنانے کی اجازت دے دی۔ اسلحہ کی تیاری کے لئے سلطان محمد خان نے اپنے مشہور جرنیل احمد کدک پاشا'' اور ''محمود پاشا'' کو مقرر کیا۔ اسی طرح اُس نے برق رفتار معماروں کی جماعت قسطنطنیہ کے یورپی ساحل پر اتاری تاکہ وہ قسطنطنیہ سے پانچ میل کے فاصلے پر آبنائے باسفورس کے کنارے ایک زبردست جنگی قلعہ تعمیر کرے۔ اس کا سربراہ بھی ''مصلح الدین آغا'' جیسا تاریخ ساز ماہر فن تعمیر تھا۔ جس نے تین چار ماہ کے قلیل عرصہ میں ''رومیلی حصار'' تعمیر کر دیا تھا۔ اب آبنائے باسفورس کے دونوں ساحل مسلمانوں کے قبضے میں آنے والے تھے۔ جونہی قلعہ کی تعمیر مکمل ہوتی، دو سرسبز و شاداب ساحلوں کے درمیان تقریباً اٹھارہ میل لمبی دلکش نیل گوں لکیر یعنی ''آبنائے باسفورس'' پر مسلمانوں کا قبضہ ہو جاتا۔ ''رومیلی حصار'' سے قسطنطنیہ کا ''برجِ غلاطہ'' صاف دکھائی دیتا تھا۔ ادھر سلطان نے ''رومیلی حصار'' کے معماروں کو ''مصلح الدین آغا'' کی سرکردگی میں قسطنطنیہ روانہ کیا اور ''ارقام بن ہشام قسطنطنیہ کے خفیہ راز اور اہم عسکری معلومات حاصل کرنے کے لئے اس کے ٹھکانے کی جانب روانہ ہو گیا۔ جبکہ موریا کی طرف سلطان کی ایک بہادر فوج پہلے ہی کوچ کر چکی تھی۔

سلطان محمد خان آغا حسن، احمد کدک پاشا اور محمود پاشا جیسے سالاروں کے ہمراہ ایک طرف اور ناقابل تسخیر فوج تیار کرنے میں مصروف تھا۔ اُس نے اپنے ہر صوبے میں نئی بھرتی کے لئے پیغام بھیجے۔ ہر صوبے کا حکمران ''بیلر بیگ'' کہلاتا تھا۔ بیگ اور پاشا

ایک ہی طرز کے القابات تھے۔ ایسے فوجی سردار جن کے نیزے کے سرے کے ساتھ گھوڑے کی دُم جیسا ایک پھندنا لگا ہوتا تھا وہ بیگ یا پاشا کہلاتے۔ یہ عثمانیوں کا فوجی نشان تھا۔ ''پاشا'' ترکی زبان میں فوجی سرداروں کو کہتے ہیں۔ ایک ''بیلر بیگ'' یعنی کسی صوبے کا جاگیردار وہ پاشا ہوتا تھا جس کے نیزے کے ساتھ گھوڑے کی دُم جیسے پھندنے لگے ہوتے۔ یہ لوگ اُن جاگیروں کے سردار تھے جن کو فوجی خدمات کے بدلے میں زمینیں دی گئی تھیں اور ان کے فرائض میں شامل تھا کہ جنگ کے موقع پر مسلح ہو کر لشکر میں شامل ہوں۔ ان جاگیروں کے لوگ ایسے موقعوں پر اپنے اپنے سرداروں کے علم کے نیچے جمع ہو جاتے تھے۔ علم کو ترکی زبان میں ''سنجق'' کہتے ہیں۔ اور چونکہ ''سنجق'' ہر علاقے کا الگ ہوتا ہے اس لئے دھیرے دھیرے لوگ صوبوں اور علاقوں کو سنجق کہنے لگے۔ یہ سنجق یعنی فوجی پرچم تلے ''بیگ'' یعنی ''بیلر بیگ'' کے بہت سے ماتحت ہوا کرتے اور ہر بیگ کا دستہ چار سو سواروں پر مشتمل ہوتا۔

سلطان نے اس عظیم حملہ کے لئے اپنے یورپی اور ایشیائی مقبوضات سے باضابطہ طور پر ایک لاکھ کی فوج تیار کرنا شروع کر دی۔ رضا کار اس کے علاوہ تھے جو ہر جنگ کے موقع پر بطور خود اپنی خدمات پیش کرتے اور جن کا معاوضہ صرف مالِ غنیمت تھا۔ ان دونوں کی افواج سے زیادہ شان وشوکت اور عظمت وشہرت ''ینی چری'' کی تھی۔ جس کا سپہ سالار ''آغا حسن'' تھا..... ایک طرف اگر آغا حسن، سلطان کی فوج کے لئے ایک مایہ ناز اور بہادر سالار تھا تو دوسری طرف ''احمد کدک پاشا'' اور ''محمود پاشا'' صوبیداری فوج کے جگمگاتے جرنیل تھے۔

بحریہ کو مضبوط کرنے کے لئے سلطان نے ایک مضبوط بحری بیڑا تیار کرنے کا حکم دیا جس میں کم سے کم ایک سو اسّی جہاز شامل ہوتے۔ چھوٹی بڑی کشتیوں کی تعداد الگ تھی جو پہلے سے ''عثمانی بحریہ'' کا حصہ تھیں۔

''سلطان محمد خان'' ایک با صلاحیت نوجوان تھا۔ جس کی خداداد قابلیت کے جوہر رزم بزم..... دونوں جگہ یکساں طور پر نمایاں تھے۔ ''ایدین'' کے مقام پر اُس نے بہترین اساتذہ سے حیرت انگیز تیزی کے ساتھ علوم وفنون کی تحصیل کی تھی۔ وہ اپنی مادری زبان کے علاوہ عربی، فارسی، عبرانی، لاطینی اور یونانی زبانوں پر بھی قدرت رکھتا تھا۔ سلطان کی نظر نہ صرف دنیا کی تاریخ پر تھی بلکہ وہ کرۂ ارض کے جغرافیے سے بھی پوری واقفیت رکھتا تھا۔ وہ ایک بلند پایہ شاعر اور شعر وسخن کا بہت بڑا رسیا تھا۔ ''سلطان محمد خان'' کو اپنے

وقت کے جید عالم اور فقیہہ ''ملا عبدالرحمٰن جامی'' کے ساتھ براہِ راست نسبت تھی اور وہ ہندوستان کے ''خواجۂ جہاں'' کی عقیدت میں بھی پیش پیش رہتا تھا۔ سلطان کی صوبیداری افواج کا سالار ''محمود پاشا'' بھی سپاہی ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی تھا۔

قسطنطنیہ پر حملے کا ارادہ کیا تو سلطان نے انتہائی گہری نظر کے ساتھ ''پلوٹارک'' کی مشہور ومعروف تصنیف جو ''یونان'' اور ''روم'' کے تذکروں پر مشتمل تھی، پڑھنا شروع کر دی۔ اُس نے ''سکندرِ اعظم قسطنطین اوّل'' اور ''تھیوڈوسیس'' کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ کر کے ''قسطنطنیہ'' کے طویل ماضی کو ازبر کر لیا۔

ان دنوں اس خطے کی صورتحال یہ تھی کہ ایشیائے کوچک میں ''امیر کرمانیا'' راضی بارضا خاموش تھا۔ ''البانیہ'' میں سلطان محمد خان کے ساتھ پل کر جوان ہونے والا ''سکندر بیگ'' مرتد ہو کر قابض تھا۔ لیکن سلطان ابھی تک ضدی سکندر بیگ کو نہ چھیڑنا چاہتا تھا۔ ''ولیشیا'' (والاچیہ) کا سربراہ ''ولاد'' ایک ظالم اور کینہ پرور شخص تھا اور جو قیدیوں کے جسموں میں میخیں ٹھونک کر ہلاک کر دیا کرتا تھا۔ لیکن اُس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ سلطان کے مقابلے پر آتا۔ ہمت تھی تو صرف شاہِ ہنگری ''ہونیاڈے'' کے بازوؤں میں تھی۔ لیکن سلطان نے اُس کے ساتھ تین سال کی صلح کا معاہدہ کر لیا تھا۔ ''ہونیاڈے'' سلطان کے باپ مراد خان کے ہاتھوں ایک معاہدہ شکنی کا مزہ چکھ چکا تھا۔ چنانچہ دوسری بار معاہدہ توڑنے کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اب صرف ''موریا'' ہی ایسا علاقہ تھا جہاں سے قسطنطنیہ کے لئے بروقت کمک مہیا کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ سلطان کی ایک ماہر فوج ''موریا'' کی طرف کا راستہ روکنے کے لئے ''موریا'' کی جانب چل دی۔

چنانچہ تمام تیاریوں کا خاکہ مکمل طور پر تیار کرنے کے بعد سلطان نے ایک حتمی اجلاس طلب کر کے قسطنطنیہ پر حملے کے فیصلے کو آخری شکل دے دی۔ یہ اجلاس بھی بڑے بڑے جرنیلوں، سرداروں اور عمائدین سلطنت پر مشتمل تھا۔ اس اجلاس میں قاسم بن ہشام کسی کو نظر نہ آیا۔ کیونکہ وہ ''وادیٔ تھریس'' عبور کرنے والا تھا۔ اجلاس مسلسل تین روز تک جاری رہا اور سلطان نے حملے کی حتمی شکل کے بعد سلطنت کے لئے نئے احکامات وقوانین بھی نافذ کئے۔ ''اُرخان'' کے زمانے میں دولت عثمانیہ کے وزیر اعظم ''علاؤالدین'' نے فوجی اصلاحات جاری کی تھیں جن کی تکمیل ''مراد خان اول'' کے زمانے میں ہوئی۔ لیکن نظامِ سلطنت کے لئے کوئی دستور سلطان محمد خان کے زمانے تک مرتب نہ ہوا تھا۔ سلطان نے سلطنت کو باضابطہ طور پر ترتیب دیا اور اس کا قانون نامہ سلطنت عثمانیہ کا باقاعدہ

دستور بن گیا۔ سلطان نے آئین سلطنت پیش کرتے وقت اپنے خطاب کے دوران سلطنت کو ایک خیمے سے تشبیہہ دی اور کہا کہ سلطنت کا یہ خیمہ چار ستونوں پر قائم ہوگا (1) وزرائے سلطنت، (2) قضاۃِ عسکر، (3) دفتر دار (خازن)، (4) نشانجی (معتمد سلطنت) اس خیمے کے ستون ہیں۔ اُس نے خیمے کے دروازے کو ''باب عالی'' کا نام دیا جو رہتی دنیا تک حکومت عثمانیہ کا نام بن گیا۔ اُس نے چار وزرائے سلطنت مقرر کئے جن کا صدر وزیر اعظم تھا۔ جو سلطنت کے تمام عہدہ داروں کا افسر اعلیٰ تھا اور اُسی کے پاس حکومت کی مُہر رہتی تھی۔ وزیر اعظم بھی سلطان کی طرح اپنے محل میں دربار طلب کر سکتا تھا۔

''قضاۃِ عسکر'' کا تعلق علماء کی جماعت سے ہوتا تھا اور قضاۃ العسکر یورپی عدالتوں جیسا ایک قضاۃ العسکر ایشیائی عدالتوں کے لئے سلطان نے مقرر کیا۔ خواجہ، مفتی اور قاضی بھی طبقۂ علماء سے لئے گئے۔ سلطان نے حکومت کی مجلس حل و عقد کا نام ''دیوان'' ہی رہنے دیا۔ جبکہ دیوان میں نشستوں کی تعداد بڑھا دی۔ سلطان نے نئے دستور میں ''خارجی آغا'' اور ''داخلی آغا'' کے عہدے مقرر کئے۔ ''خارجی آغا'' وہ فوجی حکام تھے جن کے پاس صوبوں کی حکومت تھی۔ جبکہ ''داخلی آغا'' درباری عہدوں پر مامور تھے۔ سلطان نے آغاؤں کے مزید عہدے بھی تجویز کئے۔ مثلاً ''کاپو آغا'' (گورے خواجہ سراؤں کا افسر)، ''قیزلر آغا'' (حبشی خواجہ سراؤں کا افسر)، ''بوستانجی ماشی'' (باغبانوں کا افسر)، ''چاؤش باشی'' (حکومت کے قاصدوں کا افسر) وغیرہ مقرر کئے۔

''سلطان محمد خان'' نے سب سے زیادہ توجہ اپنے آئین سلطنت میں تعلیم اور تدریس دی۔ پچھلے عہد میں تمام مدرسے محض مذہبی ہوتے تھے۔ اگرچہ ان میں اور علوم بھی پڑھائے جاتے تھے۔ لیکن ترکوں کا سرشتہ تعلیم پولیٹیکل حیثیت کا حامل تھا اور وہ سلطنت کے لائق عہدہ دار پیدا کرتا تھا۔ (مولانا شبلی)''

سلطان کا اجلاس تین روز تک جاری رہا۔ تیسرے روز سلطان نے اختتامی تقریر کرتے ہوئے کہا۔

''معزز اراکین سلطنت! الحمد للہ! اللہ کے فضل و کرم سے ہم نے سلطنت کے نظام کو علمائے ملت اور عمائدین سلطنت کے مشورے سے پہلے کی نسبت بہت بہتر بنا دیا ہے۔ اب ہم پورے اطمینان کے ساتھ اُس فاتح لشکر کا حصہ بن سکتے ہیں جس میں شامل مسلمان مجاہدوں کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی دنیا میں مغفرت کی خبر سنائی ہے۔

سلطنت عثمانیہ کے جانباز سپہ سالارو!

جب سے رومی بادشاہ ''قسطنطین'' نے تیسری صدی عیسوی میں عیسائی مذہب قبول کر کے اس شہر کو اپنا پایۂ تخت بنایا تھا، اُسی روز سے اس کا نام ''قسطنطنیہ'' ہو گیا تھا۔ یہ شہر عرصۂ دراز تک بازنطینی سلطنت اور عیسائی مذہب دونوں کا اہم ترین مرکز رہا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی خالہ اُمِ حرام بنت ملحان رضی اللہ عنہا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رضاعی رشتہ دار تھیں۔ ایک روز آپؐ اُن کے گھر سوئے ہوئے تھے کہ اچانک بیدار ہوئے تو آپؐ کے چہرۂ مبارک پر تبسم تھا۔ حضرت اُم حرامؓ نے تبسم کی وجہ پوچھی تو آپؐ نے فرمایا کہ.....

''مجھے خواب میں اپنی اُمت کے وہ لوگ دکھائے گئے جو جہاد کے لئے سمندر کی موجوں پر اس طرح سفر کریں گے جیسے تخت پر بادشاہ بیٹھے ہوں۔''

حضرت اُم حرامؓ نے عرض کیا کہ..... ''یا رسولؐ اللہ!..... دُعا فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی ان لوگوں میں شامل فرما لے۔'' آپؐ نے دُعا فرما دی اور دوبارہ محو خواب ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد پھر بیدار ہوئے تو دوبارہ چہرۂ مبارک تبسم سے کھلا ہوا تھا۔ حضرت اُم حرامؓ نے دوبارہ وجہ پوچھی تو آپؐ نے فرمایا کہ..... ''میری اُمت کا پہلا لشکر جو قیصر (روم) کے شہر (قسطنطنیہ) پر جہاد کرے گا اُس کی مغفرت کی بشارت دی گئی ہے۔'' حضرت اُم حرامؓ نے دوبارہ دُعا کی درخواست کی..... لیکن آپؐ نے فرمایا..... نہیں! تم پہلے لشکر میں شامل ہو۔'' (بخاری شریف)

معزز اراکین سلطنت! آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ دونوں بشارتیں اس طرح پوری ہوئیں کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ''قبرص'' پر حملہ کیا۔ یہ تاریخ اسلام کی پہلی بحری مہم تھی اور اس میں حضرت اُم حرامؓ اپنے شوہر حضرت عبادہ بن صامتؓ کے ساتھ لشکر میں شامل ہوئیں۔ یہ جنگی مہم اس لحاظ سے کامیاب رہی کہ ''اہل قبرص'' نے مسلمانوں سے صلح کر لی۔ اور جب مسلمان واپس لوٹنے لگے تو حضرت اُم حرامؓ ایک گھوڑے پر سے گر کر جامِ شہادت نوش فرما گئیں۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی بشارت کی تکمیل تھی۔ بشارت کا

دوسرا حصہ مجاہدین قسطنطنیہ سے متعلق تھا۔ چنانچہ قسطنطنیہ پر جہاد کرنے کے لئے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ایک لشکر نے قسطنطنیہ پر پہلا حملہ کیا۔ اس لشکر میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا بیٹا ''یزید'' بھی شامل تھا اور جید صحابی رسولؐ ''حضرت ابوایوب انصاریؓ'' بھی شامل تھے۔ یہ مسلمانوں کی طرف سے قسطنطنیہ کا پہلا محاصرہ تھا جو کافی مدت تک جاری رہا۔ اور حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ اسی محاصرے کے دوران بیمار ہو کر شہید ہوئے اور اس عظیم شہر کی فصیل کے نیچے مدفون ہوئے۔ لیکن یہ لشکر قسطنطنیہ کو فتح نہ کر سکا۔ البتہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت کا دوسرا حصہ بھی مکمل ہوا۔

محترم اراکین سلطنت! یاد رکھئے کہ صرف یہ بشارت ہی نہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اور حدیث بھی ہے جس میں صرف قسطنطنیہ پر جہاد کرنے والوں کی بات آپؐ نے نہیں فرمائی بلکہ اس شہر کو فتح کرنے والوں کو آپؐ نے خوشخبری سنائی ہے۔

حضرت بشر بن سحیم رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث کی روایت ہے.....

لتفتحن القسطنطنیہ، فلنعم الامیراً میراھا والنعم الجیش ذلک الجیش

ترجمہ:۔ تم ضرور قسطنطنیہ فتح کر لو گے۔ پس بہتر امیر اس کا امیر ہو گا اور بہتر لشکر وہ لشکر ہو گا۔ (مسند امام احمدؒ)

چنانچہ اس حدیث میں بیان کردہ سعادت کے حصول کے لئے بہت سے مسلمان حکمرانوں نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا۔ جن میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ، ہشام بن عبدالملک، مہدی عباسی اور خلیفہ ہارون الرشید وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن کوئی بھی اس شہر کو فتح نہ کر سکا۔

سلطنت عثمانیہ غالباً دستِ قدرت نے قائم ہی اس لئے کی تھی کہ وہ بابرکت لشکر وجود میں آ سکے جسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہتر لشکر کہہ کر پکارا ہے۔ ہمارے دادا ''سلطان بایزید یلدرم'' نے 1402ء میں قسطنطنیہ کا پوری قوت کے ساتھ محاصرہ کیا۔ قریب تھا کہ وہ اس شہر کو فتح کر لیتے کہ ''تیمور لنگ'' نے ''ایشیائے کوچک'' پر حملہ کر دیا۔ جس کے نتیجے میں انہیں

محاصرہ اُٹھانا پڑا۔ یہ آج سے پچاس سال پہلے کا واقعہ ہے۔ اور اہلیانِ دربار میں بعض بزرگانِ سلطنت کو یاد بھی ہو گا۔ اس کے بعد ہمارے آباء میں سے ہمارے والد محترم تک سب نے اس شہر کا محاصرہ کیا لیکن سب ناکام رہے۔

معزز عمائدین سلطنت! آج ہم بھی اُسی لشکر میں شامل ہونے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں جس کا قیام ہمارے ارادوں پر منحصر ہے۔ ''قسطنطنیہ'' ایسے مقام پر واقع ہے کہ جب تک یہ شہر فتح نہیں ہو جاتا، اسلامی سلطنت کو مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ اور مجھے یقین ہے کہ جس دن یہ قدیم شہر تسخیر کر لیا گیا اس کے بعد کوئی بھی قیصر دوبارہ پیدا نہ ہو سکے گا۔ کیونکہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے.....

اذا ھلک قیصر، فلا قیصر بعدہٗ

ترجمہ:۔ جب قیصر ہلاک ہو گیا، تو پھر کوئی قیصر پیدا نہیں ہو گا۔''

السلام علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہٗ''

یہ دربارِ سلطنت میں ''سلطان محمد خان'' کی اختتامی تقریر تھی۔ اہلیانِ دربار اپنے سلطان اسلامی معلومات دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اُنہیں توقع نہ تھی کہ کل تک دو مرتبہ ناکام نے والا نوعمر سلطان اب یوں عالم فاضل اور صاحب دانش ہو چکا ہے۔

یہ تھا ''سلطان محمد خان'' جو اب دنیا کے عظیم شہر ''قسطنطنیہ'' کو فتح کرنے کے لئے ت سفر باندھنے والا تھا۔ دنیا کی تاریخ ایک نئی کروٹ لینے والی تھی اور مسلم فتوحات کی لیل کے ساتھ یورپ کی نشاۃِ ثانیہ کا نیا دور شروع ہونے والا تھا۔

سنہری سینگ

''مقدس باپ! آپ کی قلیل وقت کی اس رفاقت کو میں اپنے لئے سعادت
ہوں۔ میں گزشتہ 25 سال سے اسی مقام پر کشتی رانی کر رہا ہوں..... اور زندگی میں
بڑے راہبوں کی باتیں سنی ہیں لیکن آپ کے ساتھ کیا گیا یہ سفر مجھے عمر بھر یاد رہے گا۔''

یہ اُس بوڑھے ملاح کی آواز تھی جو ''قاسم بن ہشام'' کو لے کر ''آبنائے باسفور
کے یورپی ساحل کی جانب جا رہا تھا۔ قاسم آج کئی روز سے سفر میں تھا۔ وہ ''ادرنہ''
اکیلا ہی روانہ ہوا تھا اور آبنائے باسفورس کے ایشیائی ساحل پر ''سلطان بایزید یلدرم''
بنائے ہوئے ''اناضول حصار'' کے بالکل سامنے اب آبنائے باسفورس کے یورپی ساحل
جانب بڑھ رہا تھا۔ اُس نے عیسائی راہبوں کا لباس پہن رکھا تھا اور گلے میں صلیب
علاوہ ''عیسیٰ علیہ السلام'' کی فرضی شبیہہ بھی ایک سنہری زنجیر کے ساتھ لٹکا رکھی تھی۔
کے سر پر پادریوں والی ٹوپی اور بدن پر بھاری بھرکم جبہ تھا۔ قاسم ایک ماہر جاسوس
یہی وجہ تھی کہ اُس نے انتہائی کامیابی کے ساتھ یہ حلیہ اختیار کر رکھا تھا۔ لیکن ایک خ
کی بات تھی کہ قاسم نے مغربی یورپ کے پادریوں جیسا لباس پہن رکھا تھا جو ''رو
کیتھولک مذہب'' کے ساتھ وابستہ تھے اور جن کا مرکزی کلیسا روم کے شہر میں
روم'' کے ماتحت چلتا تھا۔ ''رومن کیتھوک مذہب'' عیسائیوں کے لاطینی فرقے کا
تھا۔ اور یہ فرقہ مغربی یورپ کے علاوہ اہل ہنگری اور کوہِ بلقان کے بعض باشندوں پر
تھا۔ اس کے برعکس عیسائیوں کا قدیم فرقہ ''دی ہولی آرتھوڈکس چرچ'' تھا۔ جس کا مر
شہر ''قسطنطنیہ'' تھا۔ اور جو عیسائیت کا یونانی فرقہ سمجھا جاتا تھا۔ اُس وقت تک ''پروٹسٹنٹ''
فرقہ پیدا نہ ہوا تھا اور ''پروٹسٹنٹ'' فرقے کے بانی جرمن ''مارٹن لوتھر'' کے ''ایزلبن''
پیدا ہونے میں ابھی 30 سال باقی تھے۔

''آبنائے باسفورس'' جس میں اس وقت قاسم کی کشتی نیلگوں پانیوں پر رواں دواں
اٹھارہ میل لمبی ایک سمندری پٹی کا نام تھا۔ اس آبنائے کے شمالی سرے پر ''بحر
(Black sea) اور جنوبی سرے پر ''بحر مارمورا'' واقع ہے۔ اس کے مشرقی سر
''ایشیا'' اور مغربی سرے پر ''یورپ''..... دو عظیم براعظم واقع ہیں۔ دونوں براعظموں

درمیان آبنائے باسفورس کی چوڑائی سب سے زیادہ بحر مارمورا کی طرف سے ہے جہاں
اس کا پاٹ پونے تین میل اور سب سے کم چوڑائی بحر اسود کے رُخ پر ہے۔ جہاں اس کا
پاٹ کل آٹھ سو گز رہ گیا ہے۔ اس کی گہرائی مختلف جگہوں پر چالیس سے لے کر بتیس گز
تک ہے۔ قاسم نے بہت تھوڑے وقت میں ملاح سے بہت زیادہ معلومات حاصل کر لیں۔
وہ کشتی میں بیٹھا آبنائے باسفورس کے اندر عثمانی جہازوں کو گشت کرتے دیکھ رہا تھا۔ اُسے
آبنائے کے ایشیائی ساحل پر عظیم فارس کے ہیبت ناک حکمران ''کسریٰ'' کی وہ بے پناہ
فوج خیمہ زن نظر آئی جس نے قیصرِ روم کو مسلسل شکستیں دے کر قسطنطنیہ میں محصور کر دیا
تھا۔ لیکن پھر قرآن حکیم کی وہ حیرت انگیز پیشگوئی پوری ہوئی کہ رومی عنقریب مغلوب ہونے
کے بعد غالب آ جائیں گے۔ اور پھر ''کسریٰ'' کی فوجوں کو یہاں سے بھاگنا پڑا۔ اُسے
دور..... بہت دُور کسی شہر کے چھوٹے چھوٹے نشانات نظر آئے تو اُس نے ملاح سے پوچھا۔

''وہ دیکھئے!..... وہ کیا ہے؟..... لگتا ہے یہاں سے چار پانچ میل پر کوئی شہر ہے۔''

''جی ہاں!..... یہی تو قسطنطنیہ ہے جہاں آپ جا رہے ہیں..... یہی شہر تو ہے جس کی
حفاظت خداوند یسوع مسیح کا دین زندہ ہے۔ خداوند اسے ہر بلا سے محفوظ رکھے۔ آپ تو
''رومہ'' کے پادری ہیں۔ ہمارے چرچ کو تو آپ نہیں مانتے..... ہے نا؟'' بوڑھا ملاح بھی
یورپی عیسائی فرقوں کے بارے میں جانتا تھا۔

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ قسطنطنیہ تو ''یسوع مسیح'' کے رسولوں کا شہر ہے..... میں
ہمیشہ دُعا کرتا ہوں کہ خداوند اس شہر کو محفوظ ہاتھوں میں دے دے۔''

قاسم کی بات سن کر ملاح چونک اُٹھا اور کسی انجانے خطرے سے اُس کا چہرہ زرد ہونے
لگا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ محفوظ ہاتھوں میں دے دینے کی دُعا تو شہنشاہ کے حق میں
کی جاتی ہے۔ کیونکہ سب جانتے ہیں ہمارے قیصر کے ہاتھ محفوظ نہیں۔ سنا ہے مسلمانوں کا نیا
سلطان قسطنطنیہ پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔''

ملاح کی بات سے قاسم کا کلیجہ کانپ گیا۔ اُسے ایک دم اپنی حیثیت یاد آئی کہ وہ ایک
جاسوس ہے۔ اور وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ لیکن اُسے حیرت تھی کہ سلطانی حملہ کی خبر اس قدر
قبل از وقت یہاں کیسے پہنچ گئی تھی؟ اُس نے ملاح کو مزید ٹٹولنے کے لئے کہا۔

''لیکن یہ خبر تو بڑی خطرناک ہے..... سنا ہے مسلمانوں کا نیا سلطان بڑا جنگجو اور بہادر
ہے۔''

''جی ہاں!..... اُس نے یہاں سامنے ہی قسطنطنیہ سے پانچ میل جنوب کی جانب ایک

عظیم الشان قلعہ تعمیر کرنا شروع کر دیا ہے۔ آج کل تو ہماری آبنائے میں سے یورپی جہاز گزرتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کوئی خطرناک جنگ ہونے والی ہے۔ پیارے مقدس باپ! کس قدر خون خرابا ہوگا۔ دونوں طرف کے انسان مریں گے۔ حالانکہ یسوع مسیح امن اور محبت کے پیغامبر تھے۔''

بوڑھے ملاح نے حسرت بھری آواز میں کہا۔ قاسم کو ایسے لگا جیسے ملاح اپنے مذہبی پیشواؤں سے بیزار ہو یا پھر اپنے مذہبی پیشواؤں سے۔ کچھ دیر بعد قاسم نے ملاح سے سوال کیا۔

''تو پھر کیا سلطانی حملے کے خلاف شہنشاہ نے بھی کوئی تدبیر سوچ رکھی ہے؟''

''شہنشاہ کیا تدبیر سوچے گا۔ قسطنطنیہ میں کوئی ایسا شخص ہی نہیں رہا جو بچاؤ کی کوئی تدبیر سوچ سکے۔ لوگ کہتے ہیں قیصر نے خود نئے سلطان کو چھیڑا ہے..... میں پوچھتا ہوں کیا ضرورت تھی ایسا کرنے کی؟'' بوڑھا ملاح چڑچڑا بھی ہو رہا تھا۔ لیکن اُسے کچھ خاص معلوم ہی نہ تھا۔

قاسم کے لئے یہ سفر بہت دلچسپ رہا۔ آبنائے میں اِکا دُکا کشتیاں اور بھی رواں دواں تھیں۔ وہ پھر تصورات کی دنیا میں بہنے لگا۔ اُسے قسطنطنیہ کی دیواروں پر عثمانی توپوں کے گولے برستے دکھائی دیئے اور ''خلیج طرابیہ'' کے کنارے عربی نسل کے گھوڑے دوڑتے ہوئے نظر آئے۔ کچھ ہی دیر بعد کشتی ساحل سے آ لگی۔ وہ اپنے سینے میں بہت عجیب احساس لے کر قسطنطنیہ کی سرزمین پر اُترا۔ ساحل پر اور بھی کئی کشتیاں اپنے مسافروں کے انتظار میں ہچکولے کھا رہی تھیں۔ قاسم کو محسوس ہوا کہ یہ مچھیروں کی کوئی بستی تھی جو ساحل پر اترتے ہی اُس کی نگاہوں کے سامنے انجیر کے درختوں کے درمیان پھیلی ہوئی تھی۔ ہوا ابھی تک سرد تھا اور سمندر کی لہریں ابھی تک گزشتہ سردیوں کا تصور کر کے بری طرح کانپ رہی تھیں۔ سرسبز و شاداب پہاڑیوں کی وجہ سے ''خلیج طرابیہ'' کا پورا علاقہ سرد تھا۔ یہاں گرمی تھوڑے وقت کے لئے اور کم پڑتی تھی۔

یہ دوپہر کے قریب کا وقت رہا ہوگا جب قاسم ''باسفورس'' کے یورپی ساحل پر مچھیروں کی بستی کے قریب اترا۔ اُسے مچھیروں کے بچے ''باسفورس'' کے ساحل پر کھیلتے نظر آئے۔ اب اُس کے بائیں طرف تین میل کے فاصلے پر قسطنطنیہ کا شہر تھا اور دائیں طرف ''باسفورس'' کی طرف جاتا ہوا ''باسفورس'' کا طویل ویران کنارہ۔ اُس نے باسفورس کے یورپی ساحل پر کھڑے ہو کر ایشیائی کنارے پر نگاہ ڈالی تو اُسے ''بایزید یلدرم'' کا بنایا ہوا ''انادولو حصار'' صاف دکھائی دیا۔ اُسے معلوم تھا کہ اُس حصار کے بالکل سامنے اسی کنارے

جہاں وہ اس وقت کھڑا تھا، سلطان محمد خان ایک قلعہ تعمیر کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے اپنے ساحل کے چاروں طرف نظر دوڑائی تاکہ اُسے نئے قلعے کی تعمیر کے آثار نظر آئیں۔ لیکن پھر اُسے اندازہ ہوا کہ غالباً وہ ابھی قلعہ کی متعین کردہ جگہ سے بہت دُور ہے۔ حقیقت میں سلطان محمد خان کا یہاں قلعہ بنانا بہت بڑی جرأت کا کام تھا۔ کیونکہ یہ دشمن کا علاقہ تھا اور خصوصاً اس علاقے میں جہاں وہ اس وقت کھڑا تھا یونانی سپاہیوں کا قبضہ تھا۔ یہ سپاہی اگرچہ قسطنطین کے ماتحت تھے لیکن اپنی عادات و اطوار کے لحاظ سے بدتمیز اور ہتھ چھٹ واقع ہوئے تھے۔ قاسم اگر یہاں سے قسطنطنیہ جانا چاہتا تو اُسے شمال کی طرف تین میل کا فاصلہ پیدل طے کرنا پڑتا۔ لیکن پھر بھی وہ قسطنطنیہ اس لئے نہ پہنچ سکتا کہ اسی جانب سے قسطنطنیہ کی فصیل کے ساتھ متصل ''آبنائے باسفورس'' کی ایک اور شاخ نکلتی چلی گئی تھی۔ یہ ایک پتلی اور لمبی سمندری پانی کی شاخ ہے جسے ایک چھوٹی سی مستطیل خلیج بھی کہا جا سکتا ہے جو ''باسفورس'' سے مغربی سمت خشکی کی طرف نکل آتی ہے اور اس کی شکل سینگ سے مشابہ ہے۔ کسی نے قسطنطنیہ کی فصیل سے طلوعِ آفتاب کے وقت اسے دیکھا تو سورج کی کرنوں کی وجہ سے اُسے پانی کا رنگ سنہرا نظر آیا۔ تب سے اسے ''سنہرا سینگ'' کہا جانے لگا۔ یعنی ''گولڈن ہارن''۔ فارسی بولنے والوں نے اسے ''شاخِ زرّیں'' کا نام دیا۔ یہ شہر کی جنوبی فصیل کے ساتھ چلتی ہوئی کافی پیچھے کی طرف چلی گئی تھی۔ اس طرح یہ مثلث شہر تین اطراف سے سمندر میں گھرا ہوا تھا۔ تیسری اور اکلوتی سمت خشکی کی جانب تھی۔ لیکن اس طرف تہہ در تہہ فصیل بنی ہوئی تھی۔

قاسم دیر تک قسطنطنیہ کی جانب سر اٹھائے دیکھتا رہا۔ اُسے یہاں سے ''برجِ غلاطہ'' کسی میخ کی طرح نکلا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد مچھیروں کے بچے دوڑتے ہوئے قاسم کے قریب نکل آئے۔ یہ عیسائی بچے تھے اور راہب کے لباس کو پہچانتے تھے۔ ''مقدس باپ، مقدس باپ'' کہتے ہوئے قاسم کے گرد جمع ہونے لگے۔ قاسم کو ابھی قسطنطنیہ جانے سے پہلے اس ساحل پر موجود اپنے سپاہیوں اور معماروں کو تلاش کرنا تھا اور اُن کے کام کا جائزہ لینا تھا۔ چنانچہ قاسم نے مچھیروں کی بستی میں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا اور اپنے گرد جمع ہوتے ہوئے بچوں کے ساتھ پادریوں والی شفقت سے پیش آنے لگا۔ بچے اگرچہ میلے کچیلے تھے لیکن اُن کی رنگت یونانیوں جیسی صاف تھی۔ یہ مچھیرے بھی دراصل یونانی نسل کے تھے۔ قاسم نے بچوں کو اپنے سامان سے کھانے کی کچھ چیزیں نکال کر دیں تو وہ اس پر نثار ہو گئے۔ اب بچے قاسم کی ہر بات کا اشتیاق سے بھرپور لہجے میں جواب دے

رہے تھے۔ قاسم نے ایک تیز طرار بچے سے پوچھا۔

"کیوں بیٹا! یہاں قریب ہی کچھ سپاہی آئے ہوئے ہیں..... شاید غیر ملکی سپاہ ہیں..... کیا تم جانتے ہو کہ وہ کس طرف ہیں؟"

"جی ہاں! وہ سب کے سب سروں پر عمامے باندھے ہوئے ہیں اور ان کی تلواریں گول ہیں..... ایسے۔" بچے نے ہاتھ کے اشارے سے مسلمانوں کی مخصوص ہلالی تلوار ہوا میں شکل بنائی تو قاسم کے چہرے پر مسکراہٹ کی جھلک دکھائی دی۔ وہ سمجھ گیا سلطان کے سپاہی اس ساحل پر قلعہ بنانے کے لئے پہنچ چکے ہیں۔ ابھی قاسم کچھ اور پوچھنے ہی والا تھا کہ دو بچے بہ یک وقت بے صبری کے ساتھ بول اُٹھے۔

"جی ہاں!!..... وہ اپنے ساتھ بہت سارا سامان بھی لائے ہیں..... وہ اُس طرف ہیں۔" بچوں نے بحر اسود کے ساحل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ بچوں نے قاسم کو بتایا کہ عمامے والے سپاہیوں اور یونانی سپاہیوں کے درمیان نوک جھونک اور اِکا دُکا لڑائی کے واقعات بھی ہوئے ہیں۔ قاسم نے اطمینان کی سانس لی اور اُسے یقین ہوا کہ قلعہ کی تعمیر کا سربراہ "مصلح الدین آغا" اپنے کام کا آغاز کر چکا ہے۔ قاسم نے مزید کچھ باتیں کرنے کے بعد بچوں سے کہا۔

"چلو!..... تمہاری بستی میں چلتے ہیں۔ میں تمہیں یسوع کا قصہ سناؤں گا۔"

بچے خوشی سے اُچھل پڑے اور قاسم کے آگے آگے بھاگنے لگے۔ اب قاسم مچھیروں کی بستی میں جا رہا تھا۔ یہ تیس پینتیس گھروں پر مشتمل ایک بستی تھی۔ زیادہ تر مرد اپنے جال سمندر میں ڈالے آبنائے باسفورس کے نیلے پانیوں میں دُور سے سیاہ دھبوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ سورج پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ عورتیں گھروں میں کھانے پکانے کے کام میں مصروف تھیں۔ البتہ لڑکیاں بالیاں باہر کھلے پر دُھوپ میں کھیل رہی تھیں۔ کچھ دوشیزائیں ایک طرف بیٹھی چمکتی دُھوپ میں اپنے بال کھولے اُن میں کچھ تلاش کر رہی تھیں اور اس کام میں ایک دوسرے کا ہاتھ بھی بٹا رہی تھیں اور ذرا ذرا سی بات پر زور زور سے ہنس رہی تھیں۔ جونہی ان دوشیزاؤں کی نظر قاسم پر پڑی، اُن کے قہقہے رُک گئے اور وہ ایک دوسرے کو چھوڑ کر اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ لڑکیاں بالیاں بھی اجنبی کی طرف بھاگیں اور دوشیزائیں بھی اُس نوجوان پادری کے نزدیک آ گئیں۔ قاسم کا قد و قامت اور سرخ و سفید چہرہ دیکھ کر مچھیرن دوشیزاؤں کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اتنا کڑیل اور خوبصورت راہب انہوں نے پہلی بار دیکھا

انہوں نے مقدس باپ کو سلام کیا اور سر جھکا کر دھیرے دھیرے ہنسنے لگیں۔ قاسم نے لڑکیوں کی نگاہوں میں اپنے لئے ستائش کے جذبات دیکھ لئے تھے۔ اُس نے ایک معصوم مسکراہٹ پھینکتے ہوئے راہبانہ انداز میں کہا۔

"بچو! سلامت رہو۔ لمبی عمر پاؤ۔ اور ایک دوسرے کے ساتھ محبت سے رہو! کیونکہ خداوند یسوع مسیح محبت کو پسند کرتے ہیں۔"

محبت کے لفظ پر دوشیزائیں کسمسائیں۔ ایک تیز طرار لڑکی نے جھٹ قاسم سے سوال کر دیا۔ "فادر! کیا آپ نے محبت کی ہے؟..... کبھی، کسی کے ساتھ؟"

"ہاں! میں نے پوری انسانیت کے ساتھ محبت کی ہے۔ میرے دل میں محبت کے سوا کچھ بھی نہیں..... بچو! میرے دل میں سب کے لئے محبت ہے۔ آپ کے لئے بھی۔"

قاسم کے آخری الفاظ پر ایک شرمیلی سی مچھیرن دوشیزہ نے پہلی بار پلکیں اُٹھا کر اُسے دیکھا۔ قاسم کی نظر اُس لڑکی کے چہرے پر پڑی تو اُسے محسوس ہوا کہ یہ لڑکی دوسری لڑکیوں سے مختلف ہے۔ قاسم ابھی اسی جگہ موجود تھا کہ ایک بوڑھا مچھیرا کندھے پر چپو ڈالے اسی طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ بچے بولے۔

"سردار آ رہا ہے۔"

لڑکیاں ایک طرف ہٹ کر کھڑی ہو گئیں۔ مچھیروں کا سردار قاسم کے قریب آیا اور اُس نے ادب کے ساتھ ملا۔ "مقدس باپ! آپ نے ہماری بستی میں آ کر ہمیں بہت بڑا بخشا ہے۔ یہاں بہت کم فادر آتے ہیں۔ ہم مچھیرے ہیں نا، اس لئے یہاں ہم نے ایک جھونپڑی کو چرچ بنا رکھا ہے۔ آپ آئیے! آپ کے آنے سے پہلی بار ہمارے گاؤں میں ایک مقدس راہب داخل ہو گا۔"

قاسم نے بوڑھے سردار کو فادروں والی شفقت دی اور اُس کے ساتھ چل پڑا۔

شام تک پوری بستی اسی دُھن میں لگ گئی کہ مقدس باپ زیادہ سے زیادہ دیر اُن کے ہاں ٹھہرے۔ قاسم کو اندازہ نہ تھا کہ مچھیروں کی بستی میں اُسے اس قدر پذیرائی ملے گی۔ ڈر تھا کہ مچھیرے جو کہ یقیناً یونانی کلیسا کے ساتھ وابستہ ہوں گے، اُس کے "رومن کیتھولک" ہونے پر اچھا نہ جانیں گے۔ اُس نے رومن کیتھولک لباس کسی اور مقصد کے لئے پہنا تھا۔ لیکن مچھیروں کو جب معلوم ہوا کہ فادر "روما" سے آیا ہے تو وہ اور بھی زیادہ خوش ہوئے۔

ان پڑھ، غیر مذہبی لوگ تھے اور انہیں مذہبی فرقوں کی زیادہ خبر نہ تھی۔ اب یہاں

رہنا قاسم کے لئے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ چنانچہ اُس نے مچھیروں کی بستی میں رہنے کا فیصلہ
تاکہ وہ قسطنطنیہ کی سمندری اطراف کا گہری نظر سے جائزہ لے کر سلطان کو آگاہ کر
وہ یہیں سے قسطنطنیہ جانا چاہتا تھا۔ لیکن اس طرف سے قسطنطنیہ جانے کے لئے
راستے میں پڑنے والے ''گولڈن ہارن'' کو کشتی کے ذریعے عبور کرنا پڑتا۔ اور اگر وہ خشکی
کے راستے قسطنطنیہ میں داخل ہونا چاہتا تو اُسے ''گولڈن ہارن'' کے اوپر سے ہو کر شہر کے
بڑے دروازے ''سینٹ رومانس'' سے داخل ہونا پڑتا۔

چنانچہ قاسم مچھیروں کی بستی میں رہ پڑا۔ شرمیلی لڑکی جو دوسری لڑکیوں سے مختلف تھی
بستی کے سردار کی بیٹی تھی۔ اُس کا نام ''روزس'' تھا اور باقی لڑکیاں اُسے ''روزی'' کہہ کر
پکارتی تھیں۔ بستی کی لڑکیاں اور بچے قاسم سے انجیل کا سبق پڑھنے لگے اور اُس کے
ایک اشارے کے گرویدہ ہو گئے۔ روزی جانتی تھی کہ قاسم ایک راہب ہے اور وہ کبھی
شادی نہیں کر سکتا۔ لیکن پھر بھی وہ قاسم کو دیکھتے ہی خدا جانے کیوں نئے نئے سپنے دیکھنے
لگی تھی۔ یہ سپنے تو وہ پہلے سے ہی دیکھتی تھی۔ وہ دیکھتی تھی کہ اُس کے خوابوں کا شہزادہ
نہ کسی روز اُسے لینے کے لئے ضرور آئے گا۔ لیکن اُس نے یہ نہ سوچا تھا کہ وہ شہزادہ
راہب کے روپ میں آئے گا۔ وہ ن بھر کسی نہ کسی بہانے قاسم کی خدمت میں حاضر
تھی۔ سادہ سی، معصوم سی اور شرمیلی سی وہ مچھیرن تیسرے دن ہی دل و جان ہار بیٹھی
قاسم سے کہہ دیا۔

''فادر! آپ اس عمر میں ایک راہب کی حیثیت سے بالکل اچھے نہیں لگتے۔ آپ
سپاہی ہونا چاہئے تھا۔''

قاسم مسکرا رہا تھا۔ اُس معصوم مچھیرن کو کیا معلوم کہ جس نوجوان پر وہ مرمٹی ہے وہ
الحقیقت سپاہی ہے۔ قاسم اپنی آمد کے دوسرے روز ہی ''آبنائے باسفورس'' کے اس
کا ''گولڈن ہارن'' تک جا کر جائزہ لے آیا تھا۔ وہ جنوب کی طرف بھی گیا تھا اور
نے دُور سے ''مصلح الدین آغا'' کے معماروں کو سلطانی قلعے کا کام کرتے بھی دیکھا
اپریل کے اختتام تک قلعے کی بنیادیں چنوائی جا چکی تھیں۔ سلطان نے اس قلعے کا
''رومیلی حصار'' تجویز کیا تھا۔

اب قاسم ''گولڈن ہارن'' کا مزید جائزہ لینا چاہتا تھا۔ وہ فی الحقیقت اُس
نزدیک سے دیکھنا چاہتا تھا جو ''گولڈن ہارن'' کے دہانے پر سمندر میں نکلتی
گولڈن ہارن ایک چھوٹی سی خلیج تھی جو قسطنطنیہ کے پہلو میں فصیل کے ساتھ لیتی

چھوٹی سی خلیج ''آبنائے باسفورس'' سے نکل کر یورپی ساحل میں داخل ہو گئی۔ عام طور پر
چھوٹے جہاز اور کشتیاں جو آبنائے میں چلتی ہیں اس خلیج میں بھی داخل ہو جاتی ہیں۔
گولڈن ہارن کی جانب سے قسطنطنیہ کی یورپی تجارت ہوتی تھی۔ اسی جانب شہر کا ایک اور
دروازہ تھا جو خلیج میں کھلتا تھا۔ اسی خلیج کے دہانے پر شہر کی حفاظت کے لئے لوہے کی ایک
بہت بڑی زنجیر یوں باندھی گئی تھی کہ عام حالات میں وہ ڈھیلی ہو کر سمندر کے اندر لٹکی
رہتی۔ اور جب کبھی ''گولڈن ہارن'' میں کشتیوں اور جہازوں کو روکنا مقصود ہوتا تو زنجیر کھینچ
کر ''گولڈن ہارن'' کا دروازہ بند کر لیا جاتا۔ روزِ اول سے کوئی بھی فاتح قسطنطنیہ کو اس
لئے فتح نہ کر سکا تھا کہ یہ زنجیر خلیج کے دہانے پر اس کا راستہ روک لیتی۔ قاسم اسی زنجیر کو
نزدیک سے دیکھنا چاہتا تھا۔

آج مچھیروں کی بستی میں اُسے پانچواں روز تھا اور آج صبح ہی ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا
جس نے قاسم کو کسی قدر چونکا دیا تھا۔ جب علی الصبح یونانی سپاہیوں پر مشتمل قیصری فوج
کا ایک دستہ مچھیروں کی بستی میں آ نکلا تھا۔ سپاہیوں کو جونہی علم ہوا کہ بستی میں نیا پادری آیا
ہے۔ وہ اس پادری سے ملنے کے لئے چلے آئے۔ لیکن جونہی اُن کی نظر قاسم کے مذہبی
لباس پر پڑی وہ ٹھٹک گئے۔ اُن کے سپہ سالار نے قاسم کے جبے پر بنے پاپائے روم کے
نشان کو دیکھ کر قاسم سے پوچھا۔

''مقدس باپ! یہ کیا ہے؟''

قاسم نے اپنے چہرے سے کوئی پریشانی ظاہر نہ ہونے دی اور بڑی بے نیازی سے
بولا۔ ''یہ عظیم باپ پوپ کا عطا کردہ نشان ہے۔''

لیکن قاسم جواباً دستہ سالار کی بات سن کر حیران رہ گیا۔ اُس نے کہا تھا۔ ''دیکھئے جی!..
اب یہ وقت آ گیا ہے کہ رومن کیتھولک مذہب کے پادری یونانی کلیسا کے علاقے میں
گھومتے پھر رہے ہیں۔ یہ سب شہنشاہ کی کمزوری ہے۔ شہنشاہ تو چاہتا ہے کہ عیسائیوں کے
دونوں فرقے متحد ہو جائیں۔ لیکن دیکھنا ہم یونانی کبھی اس بات کو تسلیم نہیں کریں گے۔''

دراصل قاسم کی حیرت بجا تھی۔ کیونکہ اُسے شہنشاہ کی کوششوں کے بارے میں کچھ خبر نہ
تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ قیصر اُسی روز سے چوکنا ہو گیا تھا جب عثمانی فوج کے کچھ سپاہی
''آبنائے باسفورس'' کے یورپی ساحل پر آن اُترے تھے اور شہنشاہ نے اُسی روز سے
شہر کی حفاظت کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگانا شروع کر دیا تھا۔ اُس نے شہر کی
فصیلوں کی مرمت شروع کروا دی تھی اور شہر میں زیادہ سے زیادہ رسد جمع کرنے کا اعلان

کر دیا تھا۔ اس کے بعد اُس نے مغربی یورپ کے فرمانرواؤں سے مدد کی درخواست
تھی۔ اور پوپ کی پوری اعانت حاصل کرنے کے لئے کلیسائے روما کے تمام مطالبہ
منظور کر لئے تھے۔ اور یونانی کلیسا کو رومی کلیسا کے ماتحت لانے کے بارے میں سوچ
تھا۔ شہنشاہ کی کوششوں سے اب قسطنطنیہ کے چرچوں میں بھی رومن کیتھوک فرقے
راہب نظر آنے لگے تھے۔ یہ درحقیقت قیصر کی دانشمندی تھی۔ اُس نے عیسائیوں
بڑے گروہوں میں اتفاق پیدا کرنا ضروری سمجھا۔ اُس زمانے تک عیسائیوں کا
''پروٹسٹنٹ'' پیدا نہ ہوا تھا۔ عیسائیوں کا ایک گروہ ''روما کے چرچ'' کو پیشوا مانتا تھا
دوسرا گروہ قسطنطنیہ کے ''یونانی کلیسا'' کو ہدایت پر تسلیم کرتا تھا۔ ''رومن کیتھولک'' کا پیشوا
پوپ یا پاپائے روم کہلاتا تھا اور قسطنطنیہ کے مذہبی مرکز ''آیا صوفیا'' کا بشپ اعظم ''بطریق
اعظم'' (Batriarch) کہلاتا تھا۔

''سلطان محمد خان'' کے حملے کی تیاریوں کا سن کر قسطنطین نے ''روما'' کے پوپ کو لکھا
کہ..... اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنے مذہبی اختلافات کو مٹا دیں اور سب متحد و متفق ہو کر
مسلمانوں کا مقابلہ کریں۔ میں بخوشی آپ کے عقائد کو تسلیم کرتا ہوں اور آپ ہی کو ''
صوفیا'' کا پیشوا ماننے کو تیار ہوں..... یہی وجہ تھی کہ دونوں فرقوں کے درمیان تھوڑی بہ
آمد و رفت شروع ہو گئی تھی۔

قاسم کو ان باتوں کا علم نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ یونانی دستے کے سالار کی بات سن
حیران ہو رہا تھا۔ اُس نے تعجب سے پوچھا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا شہنشاہ دونو
کلیساؤں کو متحد کرنا چاہتا ہے؟ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ میں تو کہتا ہوں سب انسانوں
متحد ہو جانا چاہئے۔''

قاسم نے جھوٹ بولا تھا۔ حالانکہ وہ دونوں کلیساؤں کے اتحاد سے بالکل خوش نہ
تھا۔ اُس نے رومن کیتھولک کے راہب کا بھیس ہی اس لئے اختیار کیا تھا کہ وہ کافر
کے بیچ میں حائل نفاق کو اور ہوا دے سکے تاکہ کفار کے دونوں دھڑے حملے کے وقت
دوسرے کی مدد کو نہ آ سکیں۔ لیکن دستہ سالار نے تو عجیب ہی بات سنائی تھی۔ اس کا مطلب
تھا کہ ''قسطنطین'' مدافعت کی پوری تیاریاں کر رہا تھا۔ قاسم نے سوچا کہ یہ اطلاع
ہے۔ اور ضروری ہے کہ سلطان کو مغربی یورپ کی جانب سے بروقت خبردار کیا جائے۔
یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ سالار بولا۔

''مقدس باپ! آپ تو جانتے ہیں کہ یونانی مر سکتے ہیں لیکن اپنا مذہب نہیں

چھوڑ سکتے۔ اس لئے آپ دیکھئے گا کہ یہ اتحاد کامیاب نہیں ہو گا۔ ابھی تو آپ ہمارے مہمان
ہیں۔ کیونکہ قسطنطین نے آپ کو ہمارے ملک میں دعوت دی ہے۔ لیکن بہت جلد رومن
کیتھولک کے پادری ہمارے مہمان نہیں رہیں گے۔ اس لئے بہتر ہے آپ بارش آنے
سے پہلے چھت کا کوئی اور انتظام کر لیں۔''

یونانی دستے کا سالار اتنا کہہ کر اپنے دستے سمیت واپس چل دیا۔ جبکہ مچھیروں کی بستی
کے تمام چھوٹے بڑے جو اب فادر کے ساتھ مانوس ہو چکے تھے، اپنے لٹکے ہوئے اور
اداس چہرے لئے قاسم کے اِردگرد کھڑے تھے۔

یہ آج صبح کا واقعہ تھا۔ اور اب باقی دن معمول کے مطابق گزرا تھا۔ وہ دن بھر یہی
سوچتا رہا تھا کہ کسی طرح تعمیر ہوتے ہوئے ''رومیلی حصار'' تک جا کر ''مصلح الدین آغا''
کے توسط سے ''سلطان محمد خان'' کو عیسائیوں کے عنقریب ہونے والے اتحاد کی خبر بھیج
سکے۔ وہ آج مغرب کے بعد ''رومیلی حصار'' کی طرف جانا چاہتا تھا۔ وہ انہی خیالوں میں
گم تھا کہ بڑی بڑی آنکھوں والی مچھیرن ''روزی'' اُس کے نزدیک آ کر کھڑی ہو گئی۔
روزی بہت دل گرفتہ تھی۔ کیونکہ آج صبح یونانی سپاہیوں نے سارے لوگوں کے سامنے
نوجوان راہب سے پوچھ گچھ کی تھی۔ اُسے سپاہیوں کا رویہ توہین آمیز محسوس ہوا۔ اور پھر
یونانیوں کے اُس دستہ سالار سے تو روزی کو اور بھی نفرت تھی۔ کیونکہ وہی شخص تو تھا جس
نے جنگل میں روزی کی کلائی پکڑ لی تھی۔ اگر اُس کی سہیلیاں شور نہ مچاتیں تو یونانی دستہ
سالار کے ہاتھوں اس کی آبرو تار تار ہو چکی ہوتی۔ روزی اس شخص کو گزشتہ ایک سال سے
اس علاقے میں گشت کرتا دیکھ رہی تھی۔ اس کا نام ''مقرون'' تھا۔ اور یہ قسطنطین کی ساحلی
چوکیوں کا نگران تھا۔

مقرون آج صبح بھی جب مچھیروں کی بستی میں داخل ہوا تو اُس کی نیت اسی حسین
مچھیرن کو اپنے دامِ فریب میں جکڑنے کی تھی۔ لیکن بستی میں داخل ہوتے ہی ''باقو
مچھیرے'' نے اُسے نوجوان راہب کے بارے میں بتا کر چونکا دیا۔ باقو نے اُسے یہ بھی
بتایا کہ سردار کی لڑکی اُس نوجوان راہب کے آگے پیچھے گھومتی ہے۔ باقو مچھیرا خود روزی پر
بھی نظر رکھتا تھا۔ لیکن سردار کے سامنے اُس کی بالکل دال نہ گلتی تھی۔ خود روزی بھی اُس
کے پُرغرور بدن سے نفرت کرتی تھی۔ اُس کے لمبے لمبے بال، جن کے ساتھ کئی کئی ماہ کی
مچھلی چپکی ہوتی، اُس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے رہتے۔ اور اُس کی بائیں آنکھ سے ہمہ
وقت پانی بہتا رہتا۔ بائیں آنکھ کے سامنے لہرانے والے بالوں نے اُسے آشوبِ چشم کا

دائمی مریض بنا دیا تھا۔ اس پر مستزاد یہ تھا کہ وہ ایک ٹانگ سے کسی قدر لنگڑا کر بھی چلتا تھا۔ گویا اُس کی شخصیت ہی روزی کے لئے کراہیت انگیز تھی۔ ''باقو'' سردار کے ڈر سے روزی کو کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔ ورنہ اُس کا بس چلتا تو وہ اُسے زبردستی اٹھا لیتا۔ نوجوان راہب بستی میں آیا اور روزی راہب میں دلچسپی لینے لگی تو باقو کے پیٹ میں بھی مروڑ اُٹھنے لگے ہو گئے۔ وہ پانچ روز سانپ کی طرح بل کھاتا رہا۔ لیکن کل بالآخر اُس کے ذہن میں ترکیب آئی اور اُس نے یونانی سپہ سالار مقرون کو جا کر نئے راہب کے بارے میں بتا دیا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ آج علی الصبح سپاہیوں کے ایک دستے کے ہمراہ مچھیروں کی بستی میں آ تھا۔ ''مقرون'' گزشتہ ایک سال سے سردار کی بیٹی روزی پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ روزی کافی دیر کی خاموشی کے بعد ہولے سے قاسم کو مخاطب کیا۔

''آج جو کچھ ہوا ہم سب بستی والے اس کے لئے شرمندہ ہیں۔ دراصل یہ شخص یونانی دستے کا سالار تھا، بہت بدطینت شخص ہے۔ آج آپ کے ساتھ اس نے جو بدکلا کی وہ آپ کی وجہ سے نہیں بلکہ میری وجہ سے تھی۔''

قاسم نے پہلی بار روزی کی جانب چونک کر دیکھا اور کسی قدر حیرت سے کہا۔

''کیا مطلب؟..... آپ کی وجہ سے کیسے؟ کیا آپ اسے پہلے سے جانتی ہیں؟''

''ہاں!..... یہ مقرون ہے۔ اس طرف کی مضافاتی چوکیوں کا نگران۔ اس نے جنگل میں میری کلائی پکڑ لی تھی۔ وہ تو خداوند کا شکر ہوا کہ میری سہیلیوں نے شور مچا دیا۔ دن انہی جنگلوں میں گھومتا رہتا ہے۔ بابا بتا رہا تھا کہ آج کل کچھ مسلمان سپاہی آ ہوئے ہیں۔ اسی لئے ''مقرون'' حواس باختہ اور پاگل ہوا پھر رہا ہے۔''

قاسم نے روزی کی بات نہایت غور سے سنی۔ اب روزی اُس کے ساتھ جب با کرتی تو فادر کا لفظ بہت کم استعمال کرتی۔ قاسم اُس کی آنکھوں میں لکھا پیغام محبت پڑھ تھا۔ لیکن وہ یہاں محبت کرنے نہیں آیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس نے خود کو روزی کی بڑی آنکھوں میں ڈوبنے سے بچائے رکھا۔

شام ہونے والی تھی اور وہ اندھیرا ہوتے ہی ''رومیلی حصار'' کی جانب نکل جانا تھا۔ مچھیروں نے قاسم کو پہلے روز ہی ایک صحت مند گھوڑا فراہم کر دیا تھا تاکہ وہ مقدس کی تعلیم کے لئے اِردگرد کے دیہاتوں اور بستیوں میں جا سکے۔ قاسم نے ہونے سے پہلے بڑے عجیب انداز میں روزی سے کہا۔

''روزی!..... میں سب کے لئے مقدس باپ ہوں۔ لیکن تمہارے لئے نہیں۔ میں

دل میں تمہاری عزت ایک دوست کی طرح سے ہے۔ میں پاس کی بستی میں کسی ضروری کام سے جا رہا ہوں اور مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت ہے۔''

روزی کے لئے نوجوان راہب کا یہ اندازِ تخاطب بالکل نیا اور اچانک تھا۔ وہ یکلخت ہی ہواؤں میں اُڑنے لگی۔ قاسم کی آواز نے اُس کے کانوں میں نہ جانے کیا گھول کے ڈال دیا کہ اُس کا چہرہ شرم سے گلنار ہونے لگا۔ اُس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ لیکن پھر بھی زور زور سے سر ہلا کر قاسم کو اپنے تعاون کا یقین دلانے لگی۔ پھر اُس نے پوچھا۔

''میری جان بھی آپ کے لئے حاضر ہے۔ آپ حکم کیجئے، مجھے کرنا کیا ہے؟''

''آپ صرف اتنا کیجئے کہ میرے کہیں جانے، واپس آنے یا یہاں سے غیر حاضر رہنے کا کسی کو پتہ نہ چلے۔''

روزی نے ایک لمحے کے لئے کچھ سوچا اور پھر فوراً تیار ہو گئی۔ ''آپ بے فکر ہو کر جائیے۔ پیچھے کسی کو کچھ پتہ نہیں چلے گا کہ آپ کہاں ہیں۔ میں سب سنبھال لوں گی۔''

''لیکن کیسے؟ آپ کیا کریں گی؟''

''یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیجئے۔ آپ بے فکر ہو کر اپنا کام نمٹائیے۔''

سائے ذرا گہرے ہوئے تو قاسم گھوڑے کی پشت پر سوار ہو کر انجیر کے درختوں کی اوٹ میں غائب ہو گیا۔ اُس نے اپنے گھوڑے کو ''آبنائے باسفورس'' کے ساحل کے نزدیک رکھا اور ''رومیلی حصار'' کی جانب رُخ کر کے گھوڑے کو سرپٹ چھوڑ دیا۔ اگلے گھوڑا ہوا میں اُڑ رہا تھا۔ ''رومیلی حصار'' یہاں سے کافی فاصلے پر تعمیر ہو رہا تھا۔ جبکہ کم سے کم وقت میں ''مصلح الدین آغا'' تک اپنی بات پہنچا کر واپس بستی میں آنا چاہتا اُس نے اس طرف روانہ ہونے سے پہلے روزی سے اس طرف کا راستہ معلوم کر لیا اُسے معلوم تھا کہ راستے میں یونانی سپاہیوں کے ساتھ مڈبھیڑ ہونے کا اندیشہ بھی ہے۔ پوری طرح تیار ہو کر نکلا تھا اور اب گھوڑے کی گردن پر جھکا تیز ہوا کا سامنا کر رہا تھا جو گھوڑے کے سرپٹ دوڑانے سے اُسے لگ رہی تھی۔ اپنے اندازے کے مطابق جب وہ رعایت ''رومیلی حصار'' کے علاقے میں پہنچ گیا تو اُس نے گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں۔ یقین تھا کہ یہیں کہیں عثمانی فوج کے ترک سپاہی کسی ہوشیار چیتے کی طرح چوکنے ہوئے رہے ہوں گے۔ اب وہ گھوڑے کی دُلکی چال سے آگے بڑھنے لگا۔ اُسے اندازہ کہ یہیں کہیں جنگی قلعہ ''رومیلی حصار'' کی تعمیر ہو رہی ہے۔ لیکن رات کی تاریکی میں وہ کو ملاحظہ نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ وہ محتاط انداز میں آگے بڑھنے لگا۔ دن کی روشنی میں وہ

جب ایک مرتبہ ''رومیلی حصار'' کی جانب آیا تھا تو اُس وقت اُس نے عام شاہراہ کا
راستہ اختیار کیا تھا۔ آج وہ کم وقت میں اور خفیہ طریقے سے اس طرف آنا چاہتا تھا۔
وجہ تھی کہ اُس نے ساحل کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے انجیر کے گھنے درختوں کا راستہ
ابھی وہ کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ اُسے اپنے سامنے آہٹ سنائی دی۔ اور پھر اگلے لمحے
مسلمان سپاہیوں کا ایک پورا دستہ نظر آ گیا جو ایک ساعت پہلے درختوں اور جھاڑیوں
اوٹ میں تھا۔ ترک سپاہیوں نے قاسم کو اپنے نرغے میں لے لیا۔ اُن کے ہاتھوں میں
تلواریں تھیں اور وہ گھیرا تنگ کرتے ہوئے قاسم کے نزدیک آ گئے۔ قاسم نے اپنا ہا
ایک رومال سے چھپا رکھا تھا اور اپنی تلوار نکالے بغیر ترک سپاہیوں کے سردار کو دیکھ رہا تھ
کچھ دیر بعد قاسم نے بولنے میں پہل کی۔

''السلام علیکم و رحمتہ اللہ وبرکاتہ!..... الحمد للہ! میں مسلمان سپاہیوں میں ہوں..... آپ
لوگ مجھے انجینئر ''مصلح الدین آغا'' سے ملوا دیجئے۔''

قاسم کے الفاظ سے دستے کے سوار چونکے..... اور پھر سردار نے آگے بڑھ کر قا
سے سوال کیا۔ ''تم کون ہو؟ اور ''مصلح الدین آغا'' سے تمہیں کیا کام ہے؟''

قاسم کو ایسے لگا جیسے وہ شخص خود ''مصلح الدین آغا'' ہی ہے۔ قاسم ''اورنہ'' میں
سے مل چکا تھا اور سلطان کے دربار میں بھی وہ دونوں اکٹھے ہوتے رہتے تھے۔ قاسم
پھر بھی اپنے چہرے سے کپڑا نہ ہٹایا بلکہ ''مصلح الدین آغا'' سے کہا۔

''میں آپ کا دوست ہوں۔ اور ایک اہم پیغام آپ تک پہنچانے کے لئے آیا ہوں
آپ مجھے پہچانتے ہیں۔ لیکن میں اپنا چہرہ آپ کو علیحدگی میں دکھاؤں گا۔''

مصلح الدین کے کانوں کو قاسم کی آواز مانوس محسوس ہوئی۔ لیکن وہ اُسے پہچان نہ سکا
اُس نے اپنے سپاہیوں کو ایک طرف ہو جانے کا اشارہ کیا اور ترک سپاہی ایک طرف ہٹ
کر کھڑے ہو گئے۔ قاسم نے مصلح الدین کے سامنے اپنے چہرے سے رومال ہٹاتے
ہوئے کہا۔

''اچھا ہوا آپ مجھے یہیں مل گئے۔ سلطان تک ایک پیغام پہنچانا بہت ضروری تھا
میرے پاس آپ کے سوا کوئی ذریعہ نہ تھا۔''

مصلح الدین قاسم کو پہچان چکا تھا۔ اُس نے خوشی سے چیختے ہوئے قاسم کا نام لینا چا
لیکن قاسم نے اپنے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور کہا۔

''میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ آپ میرے کام کی نوعیت سمجھتے ہیں۔ میں ابھی

اسی وقت یہاں سے لوٹ جاؤں گا۔ آپ سلطان تک یہ پیغام پہنچا دیجئے کہ عیسائیوں کے دونوں بڑے فرقوں میں اتحاد ہو چکا ہے۔ اور ''پاپائے روم'' قسطنطنیہ کی امداد کرنے پر آمادہ دکھائی دیتا ہے۔ لہٰذا مغربی یورپ کی جانب سے چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔''

مصلح الدین آغا نے قاسم کا پیغام غور سے سنا اور سلطان تک پہنچانے کا وعدہ بھی کیا۔

اب قاسم کے لئے مزید وہاں رُکنا غیر ضروری تھا۔ وہ فی الفور واپس جانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے مصلح الدین سے اجازت لی اور جس طرف سے آیا تھا اُسی طرف کی تاریکیوں میں روپوش ہوتا چلا گیا۔ مصلح الدین اور اُس کے سپاہی اپنی اپنی جگہ ششدر کھڑے اندھیری رات کے اس مسافر کو اپنے سنسان راستوں پر جاتا ہوا دیکھتے رہے۔

قاسم جس رفتار سے آیا تھا، اُسی رفتار سے واپس اُڑا چلا جا رہا تھا کہ اُسے ایک دم اپنے گھوڑے کی باگیں کھینچنی پڑ گئیں۔ اُس کے سامنے اچانک یونانی سپاہیوں کا ایک دستہ صرف پانچ افراد پر مشتمل تھا، اُس کا راستہ روکے کھڑا تھا۔ یونانی سپاہیوں کے ہاتھوں میں تیز دھار ننگی تلواریں چمک رہی تھیں اور وہ قاسم کے راستے میں صف باندھے کھڑے تھے۔ اب قاسم کے لئے بھاگنے کی کوئی سبیل نہ تھی۔ چنانچہ اُس نے ایک طویل سانس لی اپنی تلوار نیام سے باہر نکال لی۔ اُن پانچ سواروں میں سے بائیں طرف کھڑے لمبے تڑنگے یونانی سپاہی نے گرجدار آواز میں قاسم سے پوچھا۔

''کون ہو تم؟ اور اس وقت کہاں سے آ رہے ہو؟''

قاسم ایک راہب کی حیثیت سے ان لوگوں کے سامنے اپنا آپ ظاہر نہ کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اُس نے مچھیروں جیسا لہجہ اختیار کرتے ہوئے جواب دیا۔

''مچھیرا ہوں جناب! اپنا ایک خنجر ڈھونڈنے کے لئے گیا تھا۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے دیر ہو گئی لیکن وہ ملا نہیں۔ اب واپس اپنی بستی میں جا رہا ہوں۔''

اس جھوٹ سے قاسم کی بات نہ بنی۔ کیونکہ ایک یونانی سپاہی اُسے پہچان چکا تھا۔ اُس نے آسانی سے پہچان لینے کی وجہ تو یہ تھی کہ اُس نے آج صبح ہی ''مقرون'' کے ہمراہ اس لباس والے راہب کو دیکھا تھا۔ چنانچہ اُس سپاہی نے تلوار لہراتے ہوئے انتہائی غصے سے کہا۔ ''تم جھوٹ بکتے ہو۔ میں تمہیں پہچان چکا ہوں۔ تم مچھیرے نہیں۔ وہی رومی راہب ہو جسے آج ہمارے سالار نے خبردار کیا تھا..... تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہو گا۔ تم اپنے آپ کو حراست میں سمجھو۔''

یہ سن کر قاسم نے خود کو چوہے دان میں پھنسا ہوا محسوس کیا۔ اُس کا پول کھل چکا تھا اور

مقرون کے پاس پہنچ کر اُس کے مارے جانے کے سو فیصد مواقع تھے۔ چنانچہ قاسم نے
تلوار لہرائی اور ان پانچوں پر بیک وقت حملہ کر دیا۔ بہت دن ہو گئے تھے اُسے اپنے
بازوؤں کی قوت آزمانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اُس نے بھوکے شیر کی طرح یونانی سپاہیوں
پر حملہ کیا اور تعداد کی پرواہ کئے بغیر پے درپے تابڑ توڑ وار کرتا چلا گیا۔ اُس کی تلوار رعد
صاعقہ کی طرح دشمن کی تلواروں پر برس رہی تھی۔ رات کی تاریکی میں تلواریں آپس میں
ٹکراتیں تو ننھی ننھی چنگاریاں فضا میں بکھر جاتیں۔

قاسم کے دو چار ہاتھ دیکھتے ہی یونانی سپاہیوں کو اُس کی مہارت اور قوتِ بازو کا اندازہ
ہو گیا۔ وہ اُسے گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہے تھے لیکن انہیں مسلسل شرمناک ناکامی کا
سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اور پھر قاسم کی تلوار سے بیک وقت دو سپاہی کٹ کر گرے تو اُن کے
گھوڑے بدک کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اپنے دو سپاہی گرتے دیکھ کر باقی تین بھی ہمت
ہار گئے۔ لیکن اب قاسم اُن میں کسی کو بھی زندہ نہ چھوڑنا چاہتا تھا۔ یہ لوگ قاسم کی اصلیت
جان چکے تھے اور اس لئے اُس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ ان سب کو واصل جہنم کر کے ہی
میں لوٹے گا۔ قاسم کی تلوار ایک تیسرے سپاہی کے سر پر ایسی پڑی کہ اُس کے وجود کو
برابر حصوں میں کاٹ دیا۔ یہ ہیبت ناک منظر باقی دو سپاہیوں کے لئے ناقابل برداشت
تھا۔ چنانچہ اُنہوں نے راہِ فرار اختیار کی اور لڑائی چھوڑ کر اپنے گھوڑوں کو ایڑھ لگا دی۔ اُن
کا رُخ ''رومیلی حصار'' کی طرف تھا۔ قاسم نے بھی اپنا گھوڑا اُن کے پیچھے چھوڑ دیا۔
دوڑتے ہوئے گھوڑے کی لگامیں چھوڑ کر زین کے ساتھ لٹکی اپنی کمان اتار لی۔ اگلے
قاسم کا ایک سنسناتا ہوا تیر کمان سے نکل کر ایک سپاہی کے عقب میں لپکا۔ لیکن رات
تاریکی میں دوڑتے ہوئے گھوڑے سے چلایا گیا تیر مفرور یونانی سپاہی کو لگنے کی بجا
اُس کے گھوڑے کی پشت میں پیوست ہو گیا۔ گھوڑا بدک کر بری طرح اُچھلا اور پھر
سوار کو اپنی پیٹھ پر سے گرانے کے لئے بری طرح کودنے لگا۔ یونانی سپاہی موت کے خ
سے گھوڑے کی پیٹھ پر اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور گر پڑا۔ لیکن بدقسمتی سے اُس کا
پاؤں گھوڑے کی رکاب میں پھنسا رہ گیا۔ دوڑتے ہوئے زخمی گھوڑے نے اپنے سوا
مطلق پرواہ نہ کی اور اُسے لئے ہوئے جنگل کے اندر دوڑتا چلا گیا۔ گرے ہوئے سپا
سر پتھریلی زمین کے ساتھ مسلسل ٹکریں کھاتا جا رہا تھا۔ قاسم نے سوچا کہ اس سپا
بچنے کی کوئی اُمید نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ اُس نے ایک لمحے کے لئے بھی رُکنے کی کو
کی اور آخری یونانی سپاہی کے خاتمے کے لئے برابر تیز رفتاری سے بڑھتا رہا۔

اب مفرور صرف ایک تھا اور وہ جس طرف بھی جاتا قاسم اُس کے پیچھے تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ قاسم اُس کو جا لیتا، ''رومیلی حصار'' کے قریب پہنچ جانے کی وجہ سے ترک پہریداروں نے اُسے دیکھ لیا تھا۔ پہریداروں کا ایک پورا دستہ اُس کے راستے میں حائل ہو چکا تھا۔ یونانی سپاہی نے اپنے آپ کو چاروں طرف سے گھرے ہوئے دیکھا تو فوراً اپنی تلوار پھینک دی اور زندگی کی بھیک مانگنے کے لئے گڑگڑانے لگا۔ اب قاسم جیسے غیرت مند مجاہد کے لئے ضروری تھا کہ اُسے زندہ چھوڑ دیتا۔ لیکن وہ قاسم کے راز سے واقف ہو چکا تھا اور یہ بات اُس کے بڑے مقصد کے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی۔ اس لئے قاسم نے اُسے قتل کرنے کی بجائے مسلمان سپاہیوں کو باآواز بلند پکارا اور کہا۔

''یہ یونانی سپاہی ہے..... اسے گرفتار کر لو۔''

مصلح الدین آغا کے پہریدار آگے بڑھے اور یونانی سپاہی کو حراست میں لے لیا۔ قاسم بھی نہ چاہتا تھا کہ مچھیروں کی بستی میں اُس کی موجودگی کا راز مسلمان سپاہیوں پر آشکار ہو۔ یہی وجہ تھی کہ اُس نے کچھ سوچ کر مصلح الدین آغا کا نام پکارا۔ لیکن مسلمان پہریداروں نے اُسے بتایا کہ اُن کا سردار اس وقت اُن کے ساتھ نہیں۔ مسلمان پہریدار قاسم کو دوسری بار دیکھ رہے تھے۔ لیکن وہ اُسے پہچان چکے تھے۔ قاسم نے مسلمان پہریداروں کو حکم دیا کہ وہ اس قیدی کو اُن کے حوالے کر دیں یا اسی وقت افشائے راز کے خوف سے ہلاک کر دیں، کیونکہ وہ ایک اہم راز جان چکا ہے۔ قاسم کی بات مکمل ہوتے ہی دماغ ترک سپاہی آگے بڑھا اور ایک لمحے کی دیر کئے بغیر یونانی فوجی کے پیٹ میں لمبا نیزہ اتار دیا۔ فضا ایک بزدلانہ چیخ سے گونجی اور یونانی سپاہی تڑپ کر ڈھیر ہو گیا۔

اب قاسم ایک بار پھر بستی کی جانب اُڑا جا رہا تھا۔ وہ جلد سے جلد اپنے ٹھکانے پر پہنچنا چاہتا تھا۔ اور پھر اپنی روانگی سے ٹھیک ایک گھنٹے بعد قاسم اپنی جھونپڑی کے عقب میں نمودار ہوا۔ وہ چند لمحے پہلے ہی اپنے گھوڑے سے اُتر کر پیدل اپنی رہائش گاہ کی طرف آ رہا تھا۔ اُسے اپنی جھونپڑی کے روزنوں سے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی لو نظر آئی۔ اُس نے جھونپڑی کے عقب میں ہی ایک جھاڑی کے ساتھ گھوڑا باندھا اور خود سامنے کی طرف سے جھونپڑی کے دروازے پر نمودار ہوا۔ لیکن دروازے سے باہر اندھیرے میں کسی کو بیٹھا دیکھ کر وہ ٹھٹکا..... دوسرے لمحے وہ روزی کو پہچان چکا تھا۔

قاسم بے دھڑک روزی کے نزدیک پہنچا تو روزی نے مسکراتے ہوئے اُس کا استقبال کیا اور کمر کی قدرے شوخی سے کہا۔

''جھونپڑی کے اندر مقدس باپ خصوصی عبادت میں مصروف ہیں۔ انہوں نے مجھے یہاں بیٹھنے کا حکم دیا ہے تاکہ میں کسی کو اندر نہ جانے دوں۔ لہٰذا آپ اندر نہیں جا سکتے۔''

قاسم روزی کی بات سے ہنس دیا اور اُس نے روزی کو اُس کی حکمت عملی پر داد دی۔ پھر اُس نے روزی کو بتایا کہ عقب میں گھوڑا بندھا ہے جسے فوراً بستی کے اصطبل میں باندھنا ضروری ہے..... روزی فوراً حکم کی تعمیل کے لئے چلی گئی اور قاسم نے روزی کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھانے کے لئے فی الفور جھونپڑی میں لباس بدلنا شروع کر دیا۔ کیونکہ لڑائی کے دوران اس کا لباس پھٹ بھی چکا تھا اور اس پر جگہ جگہ خون کے قطرے بھی نظر آتے تھے۔ کچھ دیر بعد قاسم لباس بدل چکا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ چہرے پر لگے سپاہیوں کے خون کے قطرے صاف کرتا، روزی ایک دم جھونپڑی میں داخل ہوئی اور قاسم سے کہنے لگی۔

''آپ کے پیچھے ایک بار بابا نے آپ کے بارے میں پوچھا اور ایک بار وہ بذات ''باقو'' آپ سے ملنے کے لئے آیا۔ لیکن میں نے دونوں کو مطمئن کر کے ٹال دیا۔''

''باقو؟..... کون باقو؟''

لیکن روزی قاسم کی بات کا جواب دینے کی بجائے بھنوئیں سکیڑے اور ماتھے پر شکنیں ڈالے قاسم کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔

''یہ..... یہ کیا؟..... آپ کے چہرے پر خون لگا ہے..... کیوں؟ کیا ہوا؟..... کہیں آپ زخمی تو نہیں؟''

قاسم سٹپٹا گیا اور تیزی کے ساتھ اپنی آستین سے چہرہ صاف کرنے لگا۔ اُس نے کہا ''نہیں، مجھے کوئی زخم نہیں۔ بس راستے میں کچھ ڈاکوؤں نے مجھ پر حملہ کر دیا تھا اور اُن کے ساتھ تھوڑی سی مڈبھیڑ ہو گئی۔''

قاسم کوئی اور بہانا نہیں بنانا چاہتا تھا۔ کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ صبح ہوتے ہی یونانی سپاہیوں کے قتل کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے علاقے میں پھیل جائے گی۔ ''روزی متحیر نگاہوں کے ساتھ قاسم کو ایک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔ قاسم روزی کے انداز سے گھبرا اور اُس نے عجلت میں روزی کی کمزوری کا فائدہ حاصل کرنے کے لئے اُس سے کہا۔

''روزی! تم اس قدر حسین ہو کہ تمہیں دیکھ کر مجھے اپنی راہبانہ زندگی پر پچھتاوا ہوتا ہے۔ کاش! میں راہب نہ ہوتا، ایک عام انسان ہوتا۔''

قاسم کے لہجے کی حسرت ناکی دیکھ کر روزی کو سب کچھ بھول گیا اور وہ اُس نوجوان

عرب کی گہری آنکھوں میں ڈوبتی چلی گئی۔ قاسم کا تیر نشانے پر بیٹھا تھا اور روزی مزید کچھ سوال کرنے سے باز آ گئی تھی۔ اب قاسم نے روزی کو جانے کی اجازت دے دی تاکہ وہ اپنے خود آلود لباس کو دھو سکے۔

روزی چلی گئی اور قاسم لڑائی سے تمام نشانات مٹا کر سو گیا۔ لیکن اگلی صبح پورے علاقے کے لئے قیامت خیز تھی۔ پانچ یونانی سپاہیوں کے قتل کی خبر آبنائے باسفورس سے لے کر پھر قسطنطنیہ تک پھیل چکی تھی۔ آج ''مقرون'' کسی پاگل کتے کی طرح جگہ جگہ دوڑتا پھر رہا تھا۔ اُس نے ہر چوکی کا چکر لگایا۔ بہت سی بستیوں اور دیہاتوں کے باشندوں کو اُلٹی سیدھی دھمکیاں دیں۔ شہنشاہ کو اطلاع بھیجنے کے لئے کچھ خاص لوگ روانہ کئے اور خود چار سو افراد پر ایک مسلح دستے کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ وہ ''رومیلی حصار'' پر کام کرنے والے مسلمانوں کو ختم کرنا چاہتا تھا۔

اُدھر انجینئر مصلح الدین کو پل پل کی خبریں مل رہی تھیں۔ چنانچہ اس نے بھی اپنے سپاہیوں اور معماروں کو جمع کر کے کچھ ہدایات دیں۔ مچھیروں کی بستی میں بھی آج بے چینی تھی۔ ہر شخص کے دل میں یونانی سپاہیوں کے قتل کی دہشت بیٹھی ہوئی تھی۔ صرف روزی تھی جو دہشت زدہ نہ تھی بلکہ حیرت زدہ تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اُس کے خوابوں کا شہزادہ صرف جوان اور خوبرو ہی نہیں، جنگجو اور بہادر بھی ہے۔ اُسے حیرت اس بات پر تھی کہ کلیسا کا ایک راہب اس قدر جنگجو کیسے ہو سکتا ہے؟ یہی سوچ کر اُس کی نظروں میں قاسم کی ظاہری شخصیت مشکوک ہو گئی۔ اس نوجوان راہب نے رات کے اندھیرے میں چار یونانی سپاہیوں کو اکیلے قتل کر دیا۔ وہ سوچنے لگی کہ کہیں اس نوجوان نے راہبانیت کا لبادہ ہی نہ بدل رکھا ہو۔ لیکن یہ سوچ کر اُسے پریشانی ہونے کی بجائے خوشی ہو رہی تھی۔ وہ چاہتی ہی یہی تھی کہ قاسم راہبانیت چھوڑ کر عام انسانوں جیسی زندگی اختیار کر لے تاکہ اُس سے شادی کر سکے۔ اب جوں جوں روزی کو قاسم کے ایک راہب نہ ہونے کا یقین آتا جا رہا تھا، اُس کے دل میں خوشی کی لہر دوڑ رہی تھی۔ ساری بستی دہشت زدہ تھی۔ ایک روزی ہی صرف حیرت زدہ تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس نوجوان راہب نے یونانی سپاہیوں کو کیوں کیا ہو گا؟ وہ چاہتی تھی کہ راہب سے جا کر پوچھے۔ لیکن وہ ڈرتی تھی کہ کہیں یہ سب کچھ اُس سے چھپا کر اُس کا دل نہ توڑ دے۔

یونہی اور وقت اسی طرح گزر گیا۔ قصرِ قسطنطنیہ سے یہ حکم آیا کہ مسلمان سپاہیوں کو شہر میں داخل نہ آنے دیا جائے اور نہ ہی اُن سے چھیڑ چھاڑ کی جائے۔ لیکن مقرون اپنے

سپاہیوں کے قتل پر بے حد برافروختہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جس طرح بھی ہو اُن پانچ یونانیوں کے قتل کا بدلہ لیا جائے۔ وہ تو انتظار کر رہا تھا کہ شہنشاہ کے دربار سے حکم آئے اور وہ پھر بھر مسلمانوں کا قلع قمع کر دے۔ اُس کے چار سو سوار ہر دم اُس کے ہمرکاب رہتے ''مقرون'' اپنی مرکزی چوکی میں بے چین بیٹھا تھا کہ اُس کی نظر باقو پر پڑی جو لنگڑاتا ہوا اُسی سے ملنے کے لئے آ رہا تھا۔ مقرون نہ جانے کیوں چونک سا گیا۔ اُسے باقو سے کوئی اچھی لیکن اچانک خبر ملنے کی توقع تھی۔ اُس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے باقو سے ہاتھ ملایا اور اُسے اپنے قریب بٹھا لیا۔

''کہو! کیسے آنا ہوا؟..... لگتا ہے کوئی اہم بات بتانا چاہتے ہو۔'' مقرون نے بے صبری سے کہا اور باقو کی طرف دیکھنے لگا۔ باقو بولا۔

''جی ہاں، میں آپ کو یہ اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ کل شام اندھیرا پھیلنے کے بعد ہماری بستی کا راہب گھوڑے پر سوار ہو کر ''رومیلی حصار'' کی جانب گیا تھا اور پھر ایک گھنٹے بعد واپس لوٹا۔''

مقرون کے بھیجے میں اس اطلاع کی اہمیت نہ آئی اور اُس نے کسی قدر برہمی سے کہا۔

''تو پھر کیا ہوا؟..... کیا ایک راہب کا کہیں آنا جانا بھی منع ہے۔ وہ ساتھ کی بستی میں گیا ہوگا۔''

''نہیں، ہماری بستی کا راہب ساتھ کی بستی میں نہیں گیا، وہ کہیں اور گیا تھا۔ میں پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں..... میں پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ اسی راہب نے ہمارے سپاہیوں کو قتل کیا ہے۔''

باقو کی بات سے مقرون سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور اشتیاق سے بھرپور لہجے میں کہنے لگا۔

''تمہارے اس قدر پختہ یقین کی کیا وجہ ہے؟''

''وجہ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ آپ میری بات غور سے سنیں۔ کل صبح آپ ہماری بستی میں آئے اور آپ نے راہب کو متبع کیا۔ اس کا ردِعمل دیکھنے کے لئے میری آنکھیں سارا دن راہب پر ہی جمی رہیں۔ پھر جب شام ہوئی تو میں نے دیکھا کہ راہب دیر تک راہب کے ساتھ گہری باتیں کر رہا تھا۔ میرے کان کھڑے ہو گئے۔ پھر شام کے بعد راہب کوٹھڑی میں چلا گیا اور کوٹھڑی کا چراغ جل اُٹھا۔ تھوڑی دیر بعد روزی آئی اور کوٹھڑی کے باہر پیڑھی ڈال کر بیٹھ گئی۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ کیونکہ اُن دونوں کی یہ حرکت خلافِ معمول تھی میں جان بوجھ کر ایسے ہی ٹہلتے ہوئے راہب کی کوٹھڑی کی طرف جا نکلا اور میں نے

پوچھا کہ مقدس باپ کہاں ہے؟ تو روزی نے جواب دیا کہ مقدس باپ کوٹھڑی میں عبادت کر رہا ہے اور کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں۔ روزی کی بات سے میرے شک میں مزید اضافہ ہوا۔ اب میں سوچنے لگا کہ کسی طرح کوٹھڑی کے اندر جھانک کر دیکھوں۔ لیکن کوٹھڑی کا دروازہ اُسی جانب تھا جس طرف روزی بیٹھی تھی۔ تب میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی اور میں نے سوچا کہ اصطبل میں جا کر راہب کا گھوڑا دیکھتا ہوں۔ اور اُس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ اصطبل میں راہب کا گھوڑا نہ تھا۔ میں اصطبل سے نکل کر قریب ہی ایک جگہ چھپ کر بیٹھ گیا۔ لگ بھگ ایک گھنٹے کے بعد روزی آئی اور اُس کے ہاتھ میں راہب کے گھوڑے کی لگام تھی۔ اُس نے اصطبل میں گھوڑے کو باندھ دیا اور چلی گئی۔ اُس کے جانے کے بعد میں اصطبل کی مشعل لے کر گھوڑے کے نزدیک گیا تو یہ دیکھ کر میں ششدر رہ گیا کہ گھوڑا پسینے سے شرابور ہو رہا ہے۔ اور اُس کی زین اور جسم پر لہو کے نشانات تھے۔ تب مجھے یقین ہو گیا کہ راہب کوئی خونی واردات کر کے لوٹا تھا۔ آج سارا دن میں یہ بات بتانے کے لئے آپ کو ڈھونڈتا رہا۔ لیکن آپ مجھے کہیں نہ ملے۔ سالار صاحب! وہی راہب آپ کے سپاہیوں کا قاتل ہے، مجھے یقین ہے۔''

باقو کی بات مکمل ہوتے ہی مقرون تیزی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنی تلوار کے دستے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''اگر وہ قاتل ہے تو میں ابھی اور اسی وقت اس کی گردن کاٹ کر لوٹوں گا۔''

مقرون کا لہجہ اس قدر مضبوط تھا کہ باقو کی مکروہ باچھیں کھل اُٹھیں۔ مقرون آندھی اور طوفان کی طرح باہر نکلا اور اپنے ساتھ پچاس سواروں کے ایک دستے کو چلنے کا حکم دیا۔ کچھ ہی دیر بعد یہ لوگ مچھیروں کی بستی کی جانب اُڑے چلے جا رہے تھے۔

ادھر بستی میں قاسم اور روزی بستی سے چند قدم دُور انجیر کے درختوں کے درمیان بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ روزی آج بہت خوش تھی۔ آج اُسے اپنے خوابوں کا حقیقی شہزادہ مل گیا تھا۔ ایک بہادر جنگجو اور خوبرو نوجوان اُس سے محبت کرنے لگا تھا۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ قاسم روزی سے کیسے محبت کر سکتا تھا؟ وہ تو پہلے ہی یہاں اپنی گم شدہ محبت کے قاتل ابوجعفر سے ''ماریہ'' کی بابت پوچھنے آیا تھا۔ لیکن اُسے اس محبت سے زیادہ اپنا مقصد عزیز تھا۔ اور اس کا مقصد تھا قسطنطنیہ کے دفاعی انتظامات کی جاسوسی کرنا۔ اُس نے تو روزی کو دوست کہہ کر مچھیروں کی بستی میں کچھ دن بسر کرنے چاہے تھے..... اُس نے روزی کے ساتھ کوئی جھوٹا وعدہ بھی نہیں کیا تھا۔ لیکن اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ روزی اُس کی

طرف سے غلط فہمی میں مبتلا ہو چکی تھی۔ وہ یہاں روزی کے قریب بیٹھا یہی سوچ رہا تھا کہ روزی کی چھوٹی بہن جو گیارہ بارہ سال کی بچی تھی، پوری قوت سے دوڑتی ہوئی اُن کے پاس آئی اور اپنی پھولی ہوئی سانس درست کئے بغیر کہنے لگی۔

''مقدس باپ!..... وہی کل والا یونانی سالار اپنے ساتھ بہت زیادہ گھڑ سوار لئے ننگی تلوار لہراتا ہوا ہماری بستی کی جانب آ رہا ہے۔ ہم اُس چٹان پر کھیل رہے تھے اور میں نے اوپر سے انہیں دیکھا ہے۔''

قاسم ایک دم کھڑا ہو گیا اور دوڑ کر ایک اُونچی جگہ پر چڑھ گیا۔ اُس نے اپنے ماتھے پر ہتھیلی کا سایہ کرتے ہوئے مغرب کی جانب دیکھا۔ سورج غروب ہونے میں ابھی بہت دیر تھی۔ روزی کی بہن سچ کہہ رہی تھی۔ مقرون کے گھڑ سوار تو اب بستی میں پہنچنے والے تھے۔ یہ تو شکر ہوا کہ قاسم، روزی کے ساتھ بستی سے باہر آ کر بیٹھا ہوا تھا۔ روزی نے دُور سے بستی میں داخل ہوتے ہوئے برہنہ شمشیر یونانیوں کو دیکھا تو اُس کا چہرہ زرد ہو گیا۔ اُس نے قاسم کو فوراً بھاگ جانے کا مشورہ دیا۔ قاسم کے لئے بھی یہی کچھ کرنا مناسب تھا۔ لیکن وہ پیدل کیسے بھاگ سکتا تھا۔ چنانچہ روزی نے قاسم کو بستی سے کچھ اور دُور ایک چٹانی سلسلے میں چھپنے کی ہدایت کی اور خود کسی طریقے سے گھوڑا لانے کے لئے بستی کی طرف چل دی۔

مقرون پاگل کتے کی طرح بستی میں داخل ہوا اور اندھا دُھند بستی کے اکلوتے چرچ جو ایک کوٹھڑی پر مشتمل تھا، میں گھس گیا۔ چرچ کے ساتھ ہی قاسم کی کوٹھڑی تھی۔ راہب اُسے چرچ میں نہ ملا تو وہ ساتھ کی کوٹھڑی میں دندناتا ہوا داخل ہو گیا۔ لیکن قاسم تو یہاں بھی نہیں تھا۔ وہ آگ بگولہ ہو کر باہر لپکا۔ اتنے میں بستی کا سردار اور سب چھوٹے بڑے چرچ کے سامنے جمع ہو چکے تھے۔ پچاس سواروں کا مسلح دستہ بھی اسی جگہ کھڑا تھا۔ مقرون غصے سے پاگل ہوتا ہوا باہر نکلا اور بستی کے سردار کو آواز دی۔ روزی کا باپ جو کسی قدر غصے میں تھا، مقرون کے سامنے آ گیا۔ مقرون نے اُسے دیکھتے ہی تلوار لہرائی اور اُس کے سینے پر رکھ دی۔

''کہاں ہے تمہارا مقدس باپ؟ مجھے ابھی اور اسی وقت اُس کا سر چاہئے۔''

روزی کا باپ جو پہلے ہی غصے میں تھا، مقرون کے لہجے سے آگ بگولہ ہو گیا۔ اُس نے اپنے سینے پر رکھی تلوار کی کوئی پرواہ نہ کی اور غصے سے کہا۔

''سپہ سالار! تم حد سے بڑھ چکے ہو۔ میں کل ہی قیصر کے دربار میں پیش ہو کر تمہاری شکایت کروں گا..... تم نے پہلے بھی ہمارے مہمان کی توہین کی ہے۔ ہم سب بستی والے متفق ہو کر تمہیں کہتے ہیں کہ معمولی سی مذہبی تفرقہ بازی کی بناء پر تم ہمارے معزز راہب کو تنگ کرنا چھوڑ دو۔ ورنہ تمہارے لئے اچھا نہیں ہو گا۔''

لیکن روزی کے باپ کو یہ معلوم نہ تھا کہ راہب کا معاملہ اتنا معمولی نہیں جتنا وہ سمجھ رہا ہے۔ کیونکہ اُس نے بات ختم ہی کی تھی کہ مکروہ صورت مقرون نے اپنی تلوار ہوا میں لہرائی اور اگلے لمحے بوڑھے کا سر کاٹ کر پھینک دیا..... سردار کا سر کاٹنے کے بعد مقرون نے بآواز بلند کہا۔

''بستی والو! تم میں سے کوئی بھی اس سردار یا اُس راہب کا ساتھی ہے تو سامنے آ جائے۔ میں آج تمہارے راہب کا سر کاٹنے آیا ہوں۔''

لیکن بستی میں کوئی شخص بھی آگے نہ بڑھا۔ بوڑھے سردار کے قتل نے سب کو دہشت زدہ کر دیا تھا۔ مقرون نے ایک بار پھر باآواز بلند اپنی بات دہرائی۔ اُس کی بلند آواز ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی بستی کے دوسرے کنارے روزی کے کانوں تک جا پہنچی۔ روزی تو راہب کے لئے گھوڑا حاصل کرنے آئی تھی۔ لیکن اپنے باپ کی موت کا سن کر اُسے ایک دم سب کچھ بھول گیا۔ وہ دیوانہ وار ہجوم کی طرف دوڑی اور چرچ کے سامنے گری اپنے باپ کی لاش کے قریب جانا چاہا۔ وہ پاگلوں کی طرح چیختی ہوئی دوڑ رہی تھی۔ اُس کا باپ اُسے ہر چیز سے زیادہ پیارا تھا۔ اُس کی ماں بچپن میں ہی اُس کا ساتھ چھوڑ گئی تھی اور باپ نے ہی اُس کو اور اُس کی بہن کو ایک ماں کی طرح پالا تھا۔ اُسے خود معلوم نہ تھا کہ راہب کی گرفتاری کا معاملہ مقرون کی نظر میں کس قدر سنگین ہے۔ وہ دوڑتی ہوئی اپنے باپ کی لاش پر آ گری اور زور زور سے چلانے لگی۔ مقرون نے اُسے دیکھ لیا تھا۔ وہ اپنا خود آلود تلوار لئے اُس کے قریب آیا اور انتہائی درشت لہجے میں اُس سے مخاطب ہوا۔

''لڑکی!..... کہاں ہے وہ تمہارا مقدس باپ جس کے ساتھ تم رنگ رلیاں مناتی ہو؟ فوراً بتاؤ! ورنہ تمہیں بھی اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔''

لیکن روزی کا جواب مقرون کے لئے غیر متوقع تھا۔ روزی نے کہا۔

''ہاں ہاں!..... تم مجھے بھی مار دو۔ اب میرے جینے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میرا باپ مر گیا ہے۔ میں اب اس دنیا میں نہیں رہنا چاہتی۔''

وہ بری طرح رو رہی تھی اور پوری طرح سے اپنے حواس میں بھی نہ تھی کہ مقرون کی بات کا ہوشمندی سے جواب دیتی۔ چنانچہ مقرون نے اُس کی حالت کو دیکھتے ہوئے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ روزی کو اٹھا لیں اور مرکزی چوکی میں لے چلیں۔ اور بستی

والوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ وہ ان کے سردار کی بیٹی کو گرفتار کر کے لے جا رہا ہے۔ مقرون کے سپاہی تیزی سے آگے بڑھے اور نازک اندام روزی کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیا۔ باقی سپاہیوں کو مقرون نے حکم دیا کہ وہ بستی کے چاروں طرف دُور دُور تک جنگل اور چٹانوں میں نوجوان راہب کو تلاش کریں۔

مقرون کے سپاہی روزی کو اٹھا کر چلے گئے اور باقو بستی میں کھڑا روزی کو جاتے ہوئے دیکھتا رہ گیا۔ قاسم ابھی تک نزدیکی چٹانوں ہی میں روپوش تھا۔ وہ سورج غروب ہونے سے پہلے گھوڑا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ روزی کے لوٹنے کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ سورج غروب ہونے سے تھوڑی دیر پہلے تک جب روزی نہ لوٹی تو وہ بے چین ہو گیا۔ اُس کے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ ضرور کوئی بڑی بات ہو گئی تھی۔ ابھی وہ یہی سوچ ہی رہا تھا کہ اُسے تھوڑے فاصلے پر کسی گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز سنائی دی۔ وہ سمجھا کہ روزی گھوڑا لے کر آ پہنچی ہے۔ اور وہ چٹان کی اوٹ سے باہر نکل آیا۔ لیکن اُس کے سامنے ایک یونانی سپاہی برہنہ شمشیر لئے گھوڑے پر سوار کھڑا تھا۔ قاسم نے اپنے راہبانہ لباس کے اندر چھپی تلوار نکالنے میں دیر نہ کی۔ یونانی بھی قاسم کو ایک راہب کے طور پر پہچان چکا تھا۔ قاسم پیدل تھا اور یونانی گھوڑے پر سوار۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف بڑھے..... اور پھر غروب ہوتے ہوئے سورج نے آخری منظر یہ دیکھا کہ قاسم یونانی سپاہی کو قتل کر کے اور اُس کے گھوڑے پر سوار ہو کر ''رومیلی حصار'' کی جانب بڑھ چکا تھا.....!

مصلح الدین آغا نے علیحدہ خیمے میں قاسم کی تمام روداد سنی۔ اور قاسم کی درخواست پر بستی کے حالات معلوم کرنے کے لئے دو تجربہ کار ساتھیوں کو بھیجنے پر آمادہ ہوا۔ وہ سپاہی واپس بھیج کر لوٹا تو اُس کے ہاتھ میں کھانے کی طشتری بھی تھی۔ اُس نے خیمے میں داخل ہوتے ہی قاسم سے کہا۔

''قاسم بن ہشام! آپ کی پہلی اطلاع میں نے کل ہی سلطان کی جانب روانہ کر دی تھی..... لیجئے! آپ کا کھانا بھی آ گیا۔''

آغا نے دسترخوان بچھا کر کھانا چننا شروع کر دیا۔ ''آبنائے باسفورس'' کی مچھلی تو قاسم گزشتہ کئی دنوں سے کھا رہا تھا۔ لیکن اس طرح زیتون کے تیل میں تلے ہوئے تازہ مچھلی تو اُسے اپنے وطن کی یاد آ گئی۔ وہ اگرچہ روزی کی طرف سے پریشان تھا لیکن اس نے کھانے کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا۔ کھانے کے دوران اُس نے ''مصلح الدین

سے پوچھا۔

''آپ کا قلعہ کہاں تک پہنچا؟ سلطان کو اس قلعے کی تعمیر کا بے چینی سے انتظار ہے۔''

مصلح الدین آغا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''ہم نے 24 اپریل کو اس قلعہ کا آغاز کیا تھا۔ اور آج 18 مئی کے روز ہم اس کا ایک چوتھائی کام مکمل کر چکے ہیں۔ اگر اسی رفتار رہی تو ہم اگست تک اسے مکمل کر لیں گے..... قلعے کا رقبہ تین ہزار مربع میٹر رکھا گیا ہے اور اس میں سترہ عدد بڑے بڑے برج بنائے جائیں گے۔ جن پر تمہارے دوست ''اُربان'' کی بنائی ہوئی توپیں نصب کی جائیں گی۔ میں نے اس قلعے کا نقشہ اس طرح بنایا ہے کہ اگر فضا سے قلعہ کو دیکھا جائے تو ''محمدؐ''..... کا لفظ لکھا ہوا نظر آئے گا۔ اس کے تین برج بہت زیادہ بلند بنائے جائیں گے۔ جن کی اونچائی 90 فٹ تک ہو گی۔ میں نے فصیل کی دیوار کے نچلے حصے کو 9 میٹر چوڑا بنا کر اس کو بے حد مضبوط کرنا چاہتا ہوں۔''

''لیکن اس قدر موٹی دیوار کی بلندی تو یقیناً کم رکھنی پڑے گی۔''

''ہاں! دیوار کا چوڑا حصہ پانچ میٹر اور تنگ حصہ پندرہ میٹر تک بلند ہو گا۔''

قاسم بڑی دلچسپی سے رومیلی حصار کی تعمیر کا تذکرہ سن رہا تھا۔ وہ دیر تک اس قلعے سے متعلق باتیں کرتے رہے۔ یہاں تک کہ خبر لانے والے پہنچ گئے۔ مچھیروں کی بستی سے ہو کر آنے والے مصلح الدین آغا کے سپاہیوں نے بتایا کہ یونانی سالار مقرون نے بستی کے سردار کو قتل کر کے اُس کی نوجوان بیٹی کو اغواء کر لیا ہے..... یہ خبر قاسم کے لئے ایک دھچکے کی طرح تھی۔ اُسے اندازہ تھا کہ بوڑھے سردار پر یہ مصیبت اُسی کی وجہ سے لائی گئی تھی۔ پھر سپاہیوں نے یہ بھی تو بتایا کہ یونانی فوج کو رومن کیتھولک فرقے کے ایک راہب کی تلاش ہے جو اُن کے چھ سپاہیوں کو قتل کر کے فرار ہو گیا ہے۔ سپاہی اطلاع دے کر چلے گئے تو مصلح الدین آغا نے قاسم سے کہا۔

''اب کیا کرنا ہے؟..... مقدس باپ!''

مصلح الدین آغا کا مذاق قاسم کو نہ ہنسا سکا۔ البتہ قاسم نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ''ہمیں سردار کی بے گناہ بیٹی کو چھڑوانا ہو گا۔ کیونکہ یہ مصیبت اُن کے سر میری وجہ سے آئی ہے۔''

اس کے بعد وہ لوگ رات گئے تک روزی کو رہا کروانے کی منصوبہ بندی کرتے رہے۔ پھر انہوں نے ایک عجیب حکمت عملی وضع کر لی جس پر اگلی صبح نمازِ فجر کے بعد عمل کیا گیا۔

اگلی صبح مصلح الدین آغا اور قاسم نے پچاس بہترین لڑاکا سپاہیوں کا ایک دستہ منتخب
اور مقرون کی مرکزی چوکی جو ''باسفورس'' کے کنارے واقع تھی، کی جانب چل دیئے۔ ان
کے گھوڑے سرپٹ دوڑ رہے تھے اور وہ بجلی کی رفتار سے مرکزی چوکی کی جانب اُڑے چلے
جا رہے تھے۔ ابھی سورج کی پہلی کرن ہی نظر آئی تھی کہ مصلح الدین آغا کا برق رفتار دستہ
''مقرون'' کی مرکزی چوکی پر پہنچ چکا تھا۔ یہ چوکی ایک چھوٹی سی عمارت تھی جس کے
چاروں طرف قد آدم فصیل تھی اور درمیان میں چار پانچ کمرے گارے اور مٹی سے بنے
ہوئے تھے۔ عمارت کے ایک کونے میں کسی قدر اونچا ایک برج تھا جس میں موجود مقرون
کے دونوں تیز انداز رات بھر شراب پینے کے باعث بے سدھ سو رہے تھے۔ مصلح الدین
آغا کے سپاہیوں نے آن کی آن میں چوکی پر دھاوا بول دیا اور کمروں میں گھس کر خواب
خرگوش کے مزے لیتے ہوئے یونانی سپاہیوں کو تہہ تیغ کر دیا۔ برج پر موجود تیر انداز بھی
مارے گئے اور چوکی میں موجود ایک یونانی سپاہی بھی زندہ نہ رہا۔ لیکن مقرون اور روز
اُن کے ہاتھ نہ آئے۔

وہ اُن کے ہاتھ کیسے آتے؟ وہ تو گزشتہ رات سے ہی یہاں نہیں تھے۔ مقرون
زنجیروں میں جکڑی روزی کو لے کر ''برجِ غلاطہ'' کی جانب نکل گیا تھا جہاں وہ روزی کے
شباب سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکتا تھا۔ ''برجِ غلاطہ'' یہاں سے کافی فاصلے پر تھا۔
یہ ایک نہایت قدیم کئی منزلہ مینار تھا جس کی چوڑائی اس قدر تھی کہ اُسے ایک باقاعدہ
عمارت سمجھا جا سکتا تھا۔ اس برج میں اوپر نیچے کئی کمرے تھے۔ اور یہ برج بھی یونانی
سپاہیوں کے قبضے میں تھا۔ مقرون کا صدر دفتر یہیں تھا۔ اور مقرون ہی یہاں کا نگران تھا
تھا۔ یہ برج فی الحقیقت قسطنطنیہ شہر کے بالکل نزدیک ''گولڈن ہارن'' کے کنارے پر وا
تھا۔ ''برجِ غلاطہ'' کو 507ء میں بازنطینی شہنشاہوں نے جہازوں کی رہنمائی کے
''روشنی گھر'' (لائٹ ہاؤس) کے طور پر تعمیر کیا تھا۔ یہ بہت بلند ٹاور تھا اور اس میں خا
وسیع و عریض و بلند و بالا دس منزلیں تھیں۔ یہ رات مقرون نے روزی کے ہمراہ برجِ غلا
میں ہی گزاری تھی۔ وہ رات بھر شراب پی کر روزی کی عزت پر حملہ آور ہوتا رہا۔
روزی نے اُسے کسی خونخوار بلی کی طرح نزدیک نہ آنے دیا۔ وہ پوری طرح ہوش میں
تو روزی کی آبرو یقیناً لٹ چکی ہوتی۔ لیکن بہت زیادہ شراب پی لینے کے باعث وہ
طرح لڑکھڑا رہا تھا۔ بالآخر صبح کے قریب اُس کی آنکھ لگ گئی۔ اور اس وقت کہیں

مقرون کی آنکھ دن چڑھے ایک بری خبر کے ساتھ کھلی..... کسی نے اُس کی مرکزی چوکی
پر شب خون مار کر تمام سپاہیوں کو تہہ تیغ کر دیا تھا۔ یہ مقرون کے لئے بے حد بری خبر تھی۔
کیونکہ وہ قیصرِ قسطنطنیہ کے سامنے مرکزی چوکی سے اپنے غائب رہنے کا کوئی جواز پیش نہ کر
سکتا تھا۔ وہ بری طرح گھبرا گیا اور اُسے پہلی مرتبہ ایسے لگا کہ جس مفرور کو رومی راہب سمجھ
رہا تھا وہ سرے سے عیسائی ہی نہ تھا۔ کیونکہ مرکزی چوکی پر حملہ کسی اکیلے شخص کی بات نہ
تھی۔ اور مقرون جانتا تھا کہ یہاں زیادہ تعداد میں موجود دشمن صرف مسلمان ہی ہیں۔
جونہی اُس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ حملہ مسلمانوں نے کیا ہے، وہ اور زیادہ پریشان ہو
گیا۔ اب اُس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ شہنشاہ کے پاس خبر پہنچنے سے
پہلے پہلے وہ ''رومیلی حصار'' میں موجود مسلمانوں سے بدلہ لے لے۔ ''رومیلی حصار'' یہاں
سے پانچ میل کے فاصلے پر تعمیر ہو رہا تھا اور مقرون کے پاس یہاں چار سو مسلح سوار
دستیاب تھے۔ مقرون نے ''برجِ غلاطہ'' کی ساتویں منزل سے اُتر کر فی الفور ایک کشتی
پکڑی اور ''گولڈن ہارن'' کی خلیج کو عبور کرتا ہوا واپس اُسی ساحل پر آن اترا جہاں سے وہ
''برجِ غلاطہ'' کے لئے گزشتہ شب کشتی میں سوار ہوا تھا۔

اس ساحل پر اُس کے سپاہی خیمہ زن تھے۔ مقرون نے انتہائی احتیاط کے ساتھ اپنے
سپاہیوں کو ہمراہ لیا۔ اُسے ڈر تھا کہ کہیں فصیل سے باہر کے حالات فصیل کے اندر شہنشاہ
کے کانوں تک نہ پہنچ جائیں۔ شہر سے تھوڑی دُور پہنچ کر مقرون نے گھوڑے کو ایڑھ لگا دی۔
اب چار سو سواروں کا یہ مختصر لشکر دُھول کے بادل اُڑاتا ہوا ''رومیلی حصار'' کی جانب بڑھ
رہا تھا۔

مصلح الدین آغا کے تیز رفتار جاسوسوں نے اُسے وقت سے پہلے خبردار کر دیا تھا۔
چنانچہ مقرون کا یونانی لشکر ''رومیلی حصار'' کے نزدیک پہنچا تو اُسے رُکنا پڑا۔ سامنے رومیلی
حصار کے سپاہی صفیں باندھے پہلے سے تیار کھڑے تھے۔ مصلح الدین آغا نے مقرون کا
استقبال ایک لشکر کی طرح کیا اور باقاعدہ طبل جنگ بجا کر مقرون پر حملہ کر دیا۔ مسلمان
تعداد میں کم تھے۔ اُن کے سواروں کی تعداد اسی کے قریب تھی اور پیدل لڑنے والے سو
سے بھی کم تھے۔ لیکن جس منظم طریقے سے مصلح الدین آغا نے جنگ کا آغاز کیا تھا، اس کی
توقع ''مقرون'' کے سپاہیوں کو نہ تھی۔ صبح 9 بجے کے قریب اس لڑائی کا آغاز ہوا اور صرف
آدھے گھنٹے میں ہی یہ جنگ اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔ اور مقرون اپنے پیچھے بہت سی لاشیں
چھوڑ کر ''برجِ غلاطہ'' کی جانب فرار ہو گیا۔

آج کا دن مقرون کے لئے ایک عذاب کی شکل میں نازل ہوا تھا۔ کیونکہ وہ جونہی برجِ غلاطہ پہنچا، شہنشاہ کے پیغام بردار اُس کے منتظر تھے۔ اب مقرون کا خون خشک ہونے لگا۔ اُسے قیصر کی طرف سے اپنے لئے سزائے موت یا سزائے قید کا حکم صاف دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن شہنشاہ کی طرف روانہ ہونے سے پہلے اُس نے ایک عجیب کام کیا۔ اور وہ یہ کہ برجِ غلاطہ کی ساتویں منزل میں قید روزی کو بغیر کچھ کہے آزاد کر دیا۔ شاید یہی وہ نیکی تھی جو آخری وقت میں اُس کے کام آئی اور شہنشاہ نے تمام حالات سننے کے باوجود اُسے صرف اتنی سزا دی کہ اُسے مضافاتی چوکیوں کی نگرانی کے عہدے سے ہٹا کر ایک عام سپاہی بنا دیا۔ شہنشاہ نے مضافاتی چوکیوں کا نگران ''ڈیلارس'' کو مقرر کیا اور ایک ہنگامی حکم کے تحت شہر قسطنطنیہ کے تمام دروازے بند کر دیئے۔ یہ گویا عوام کے سامنے ہنگامی حالت کا اعلان تھا۔ اب اہل قسطنطنیہ پوری طرح سمجھ گئے کہ شہر پر کوئی سنگین حملہ ہونے والا ہے۔

قیصرِ قسطنطین کو اس اقدام کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ قسطنطنیہ کے شہریوں نے جن کی تعداد اُس وقت ایک لاکھ سے بھی زیادہ تھی، شہنشاہ کو دفاعی اخراجات کے لئے چندہ دینا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی لوگوں نے سلطان کے مذہبی اقدامات کے خلاف بولنا بھی ترک کر دیا اور عیسائیت کے دونوں فرقوں کے اتحاد کی بات کرنے لگے۔ شہنشاہ نے لوگوں کا ردِ عمل دیکھا تو فوراً ''سینٹ صوفیاء'' کے چرچ میں جو مشرقی کلیسا اور بطریق اعظم کا مرکز تھا، دونوں عیسائی فرقوں کی ایک متحدہ مجلس منعقد کرنے کا اعلان کر دیا اور اس کی صدارت کے لئے رومی کلیسا کے ''پوپ جان نیکلسن پنجم'' کے خصوصی نمائندہ ''کارڈنیل اسیڈور'' کو دعوت دی گئی جو اس وقت ''قسطنطنیہ'' میں موجود تھا۔

فصیل سے باہر یونانی کاشتکاروں اور سپاہیوں کے ساتھ ہونے والی چھیڑ چھاڑ کے بعد شہنشاہ نے ایک کام یہ بھی کیا کہ تجربہ کار سفیروں پر مشتمل ایک وفد ''سلطان محمد خان'' کی خدمت میں بھی بھیجا جس میں مسلمان سپاہیوں کے طرزِ عمل کی شکایت کی گئی۔ سلطان محمد خان نے اس شکایت کا جواب اعلانِ جنگ سے دیا اور شہنشاہ کے سفیروں کو روانہ کرتے وقت یہ کہا۔

''قیصر قسطنطین سے کہنا کہ سلطان محمد خان، فاتح بن کر قسطنطنیہ میں آ رہا ہے۔ اور اُسے چاہئے کہ وہ عثمانی افواج کا استقبال کھلے دروازوں کے ساتھ کرے۔ ورنہ ترکوں کے گھوڑے شہنشاہ کے شہر کو عبرت کا نشان بنا دیں گے۔''

سلطان کے الفاظ شہنشاہ کے کانوں پر توپ کا گولہ بن کر گرے اور وہ بری طرح دہل

اُس نے فوری طور پر اپنے سفیر مختلف عیسائی مملکتوں کی طرف روانہ کئے اور پوری عیسائی دنیا سے اس مشکل وقت میں مدد کی درخواست کی۔

قاسم ابھی ''رومیلی حصار'' میں ہی تھا کہ اُسے شہنشاہِ قسطنطنیہ کے اقدامات کی خبر ملی تو اس نے مصلح الدین آغا سے اجازت لی اور قسطنطنیہ جانا چاہا۔ لیکن اُس کے دل میں روزی کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا دُکھ تھا۔ اُس نے دل میں فیصلہ کیا کہ وہ قسطنطنیہ روانہ ہونے سے پہلے ایک مرتبہ روزی کی بابت معلومات ضرور حاصل کرے گا تاکہ اس معصوم لڑکی کو مصیبت سے چھٹکارا دلائے۔ یہی سوچ کر وہ سب سے پہلے مچھیروں کی بستی کی طرف روانہ ہوا۔ اب اُس کے جسم پر عام شہریوں جیسا لباس تھا اور اُس نے سر پر قسطنطنیہ کے مخصوص ٹوپی پہن رکھی تھی۔ وہ ''رومیلی حصار'' سے ایک صحت مند گھوڑے سے روانہ ہوا مچھیروں کی بستی کے قریب پہنچ کر رُک گیا۔ اُسے کسی ایسے شخص کی تلاش تھی جو اُسے روزی کے بارے میں بتا سکتا۔ اسی اثناء میں اُس کی نظر ایک نو دس سالہ لڑکے پر پڑی اور اس نے اپنے چہرے کو اپنے مفلر سے چھپاتے ہوئے اُس لڑکے کو آواز دی۔ لڑکا قاسم کے پاس دوڑا چلا آیا۔ قاسم نے اُسے پہچان لیا۔ وہ بستی کا ہی ایک بچہ تھا جو قاسم سے اچھی طرح مانوس تھا۔ یہی وجہ تھی کہ قاسم نے اپنا چہرہ چھپائے رکھا اور اُس سے پوچھا۔

''بیٹا! تمہارے سردار کی بیٹی کو یونانی سپاہی لے گئے تھے..... اُس کا کیا ہوا؟''

بچے نے انتہائی تعجب سے قاسم کی آنکھوں میں دیکھا اور اُسے پہچاننے کی کوشش کی۔ پھر اس نے اپنا سوال پھر دہرایا تو بچہ بولا۔

''ہمارے سردار کی بیٹی ٹھیک ٹھاک ہے اور واپس آ چکی ہے..... لیکن وہ بے حد غمزدہ رہتی ہے۔''

قاسم کے دل کو دھچکا لگا۔ لیکن اُس نے خود کو سمجھایا اور بچے کو شاباش دے کر رخصت کیا۔ اب قاسم کی اگلی منزل قسطنطنیہ تھی۔ لیکن وہ سوچ رہا تھا کہ وہ قسطنطنیہ میں داخل کس طرح ہو گا؟ کیونکہ شہر کے سارے دروازے تو بند تھے اور دروازوں کی کھڑکیاں بے شک کھلی تھیں لیکن شہر میں داخل ہونے والے ہر شخص کی اچھی طرح چھان بین کی جاتی تھی۔ اور دوسری اہم بات یہ تھی کہ قاسم شہر کی جنوبی سمت میں ''آبنائے باسفورس'' کے کنارے پر موجود ہونے کی وجہ سے شہر کے اصل دروازے سے بہت دُور تھا۔ یہ دروازہ خشکی کی طرف سے تھا اور مغربی ممالک کی جانب کھلتا تھا۔ قاسم کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ شہر کے بڑے دروازے ''سینٹ رومانس'' تک طویل فاصلہ طے کرے، یا آبنائے

باسفورس کی شاخ ''گولڈن ہارن'' کو کشتی کے ذریعے عبور کر کے پرلی طرف شہر کی بندرگاہ پر جا اترے۔

قسطنطنیہ کا نقشہ بڑا عجیب تھا۔ یہ براعظم یورپ کے کنارے پر ایشیا کے بالکل سامنے واقع تھا۔ براعظم یورپ اور براعظم ایشیا کے درمیان آبنائے باسفورس کا نیلا پانی حدِ فاصل تھا۔ آج سے چھ لاکھ سال پہلے جب خشکی کے یہ دونوں بڑے ٹکڑے یعنی براعظم ایشیا اور براعظم یورپ جب سمندر میں تیرتے ہوئے ایک دوسرے کے قریب آئے تو دونوں اپنے درمیان ایک سے تین میل کا فاصلہ رکھ کر اپنی اپنی جگہ رُک گئے۔ یہی درمیانی فاصلہ ''آبنائے باسفورس'' ہے۔ اور قسطنطنیہ ہی وہ مقام ہے جہاں کھڑے ہو کر ایشیا سے یورپ اور یورپ سے ایشیا کو صاف دیکھا جا سکتا ہے۔ اور پھر قسطنطنیہ کا محلِ وقوع آبنائے باسفورس کے پرلے ساحل یعنی یورپی ساحل پر بھی نہایت عجیب ہے۔ فضا سے دیکھا جائے تو دونوں براعظموں کے درمیان لیٹی یہ آبنائے ایک بیل کی گردن اور سر سے مشابہ ہے جس کا صرف ایک سینگ ہے جو بائیں طرف سے زمین میں دراڑ ڈالتا ہوا ایک چھوٹی خلیج کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اسی کو سنہری سینگ کہتے ہیں۔ سنہری سینگ یعنی ''گولڈن ہارن'' ایسے ہے جیسے باسفورس کے دیوتا نے اپنا ایک بازو فضا میں پھیلا رکھا ہو۔ باسفورس کی اسی شاخ کو ''شاخِ زریں'' کہتے ہیں۔ اب قسطنطنیہ کا محلِ وقوع ایسے ہے کہ باسفورس سے ایک طرف نکلتی ہوئی خلیج کی وجہ سے اس مقام پر واقع خشکی کے ٹکڑے نے ایک تکونی دار اور مثلث نما شکل اختیار کر لی ہے۔ اسی مثلث پر قسطنطنیہ کا شہر آباد تھا اور اُس وقت اس کی فصیل بھی ساحل کے ساتھ ساتھ گھومتی چلی گئی تھی۔ شہر کے ایک پہلو پر وسیع آبنائے اور دوسرے پر ''گولڈن ہارن'' کا پانی تھا۔ اسی گولڈن ہارن کے دہانے پر ایک آہنی زنجیر باندھی گئی تھی جسے بوقت ضرورت کھینچ کر گولڈن ہارن میں جہازوں اور کشتیوں کا داخلہ روک دیا جاتا۔ اس مثلث شہر کی یہ دونوں اطراف سمندر کی وجہ سے محفوظ تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ ان اطراف کی فصیلیں بہت زیادہ مضبوط اور بلند نہ بنائی گئی تھیں۔ شہر کی باقی سمت جو خشکی کی جانب تھی ایک مضبوط اور بلند فصیل کے ذریعے محفوظ کر دی گئی تھی۔ ''برجِ غلاطہ''، گولڈن ہارن کے کنارے شہر کی فصیل کے نزدیک واقع تھا۔

قاسم نے بندرگاہ کی جانب سے شہر میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا۔ فی الحقیقت ''گولڈن ہارن'' میں لگی اُس آہنی زنجیر کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ ''برجِ غلاطہ'' کو اچھی طرح دیکھنا چاہتا تھا۔ اس طرف آتے ہوئے قاسم کو پہچان لئے جانے کا ڈر بھی

کیونکہ ''برجِ غلاطہ'' یونانی سپاہیوں کے قبضے میں تھا اور ان سپاہیوں میں سے چند ایک نے قاسم کو دیکھ رکھا تھا۔ لیکن قاسم نے اسی جانب سے شہر میں داخل ہونا ضروری سمجھا۔ ''گولڈن ہارن'' کے اس کنارے پر جہاں اس وقت قاسم پہنچنے والا تھا، یونانی سپاہیوں کا مستقل کیمپ بھی لگا رہتا تھا۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں سے ''مقرون'' نے چار سو سواروں کا لشکر لیا تھا۔ لیکن قاسم تو اُس راستے پر جا رہا تھا جو عام لوگوں کے استعمال کا راستہ تھا۔ اسی راستے سے بعض ممالک کا سامان اور بہت سے قافلے قسطنطنیہ کی طرف جایا کرتے تھے۔ شہر کے دروازے بند ہونے کی وجہ سے اگرچہ اس شاہراہ پر عام مسافروں کی آمد و رفت تو کم تھی لیکن بڑی بڑی بیل گاڑیوں پر بہت زیادہ سامانِ رسد لایا جا رہا تھا۔ یہ وہ سامان تھا جو آبنائے باسفورس کی مختلف گودیوں پر اتارا اور ساحل کے راستے شہر میں جمع کیا جاتا تھا۔ قاسم نے سامان سے لدی بیل گاڑیوں کو دیکھا تو سوچا..... قیصر، قسطنطنیہ کے محاصرے کی بے پناہ تیاریاں کر رہا ہے۔ وہ شہر میں اتنا سامانِ رسد اکٹھا کر رہا ہے کہ شاید کئی ماہ تک ناکہ بندی کے ساتھ محصور رہ سکے۔ ''گولڈن ہارن'' درحقیقت اس عظیم شہر کی بندرگاہ تھی۔ یہاں ''بحرِ اسود'' اور ''بحرِ مارمورا'' سے آنے والا تمام ساز و سامان اور مسافر اترتے تھے۔ آبنائے باسفورس کے ساحل پر اور بھی بہت سی گودیاں تھیں جنہیں چھوٹی چھوٹی بندرگاہیں کہا جا سکتا ہے۔ اگر سلطان محمد خان کا ''رومیلی حصار'' کامیابی کے ساتھ تعمیر کر لیا جاتا تو آبنائے باسفورس'' کی پوری ایک سمت یعنی ''بحرِ اسود'' سے آبنائے میں داخل ہونے والا راستہ عیسائی جہازوں کے لئے بند ہو سکتا تھا۔ اگرچہ قیصر کے پاس آبنائے میں داخل ہونے کے لئے مندر کی طرف سے ابھی ''بحرِ مارمورا'' کا راستہ کھلا تھا۔ درِ دانیال بھی اسی وقت تھا۔ چنانچہ اب بھی مغربی یورپ کے جہاز اسی راستے سے آبنائے میں داخل ہو کر ''گولڈن ہارن'' میں داخل ہو سکتے تھے۔ ''رومیلی حصار'' تو گولڈن ہارن سے پانچ میل ''بحرِ اسود'' کی جانب دُور تھا۔ لہٰذا گولڈن ہارن کو سلطانی کشتیوں کے گشت پر فوری طور پر نہ کر سکتے تھے۔ لیکن یہ بھی ایک بہت بڑی بات تھی کہ آبنائے میں داخل ہونے کے ''بحرِ اسود'' کا راستہ بند کر دیا جائے۔

قاسم اپنے گھوڑے پر سوار گولڈن ہارن کے ساحل پر آ پہنچا۔ اب اُس کے سامنے ''خلیج گولڈن ہارن'' کا پانی تھا اور خلیج کے پار شہر قسطنطنیہ کی فصیل اور بندرگاہ کا دروازہ تھا۔ قاسم شاہراہ کے ذریعے یہاں آیا تھا اس لئے وہ شہر کے دروازے کے سامنے آ پہنچا۔ یہ جگہ ہموار تھی۔ تاحدِ نگاہ قسطنطنیہ کے لئے رسد کا سامان بیل گاڑیوں سے اُترا پڑا تھا۔

سامنے گولڈن ہارن کے پاس شہر کا دروازہ محض رسمی طور پر بند تھا۔ جبکہ فی الحقیقت اُس کا ایک کواڑ کھلا تھا۔ عام لوگوں کی آمد و رفت پر پابندی تھی اور قسطنطنیہ کے سپاہی دروازے میں کھڑے آنے جانے والوں کی تلاشی لے رہے تھے۔ بڑی بڑی کشتیاں اس طرف کا سامان ڈھو ڈھو کر اس طرف منتقل کر رہی تھیں۔ پورے ماحول میں عجلت اور سنسنی کا اثر موجود تھا۔ دروازے کے اندر، دروازے کے دائیں بائیں، دروازے کے سامنے گولڈن ہارن میں موجود ہر کشتی اور جہاز پر اور اسی ساحل پر جہاں قاسم کھڑا تھا، ہر طرف قیصر کی باوردی سپاہی بہت زیادہ تعداد میں دکھائی دے رہے تھے۔ قاسم ایک عام شہری کی حیثیت سے یہاں آیا تھا اور عام شہری اس پورے ماحول میں اِکا دُکا ہی دکھائی دے رہے تھے۔

قاسم بندرگاہ کے ساتھ لگے ان جہازوں کو دیکھنے لگا جو اس ساحل اور سامنے کے ساحل پر دونوں طرف ڈھیروں سامان اتار رہے تھے۔ اس سامان میں زیادہ تر غلّہ، اجناس ملبوسات اور ادویات وغیرہ شامل تھیں۔ دونوں طرف کی گودیاں لکڑی کے بڑے بڑے تختے سمندر میں آگے کی طرف بڑھا کر بنائی گئی تھیں۔ یہ تختے بے حد موٹے اور مضبوط تھے جن کے ساتھ گولڈن ہارن میں چلنے والے جہاز اور کشتیاں آ کر لگتے اور یوں سمندر کا سامان خشکی پر اتار لیا جاتا۔ قاسم کو اس بندرگاہ پر مختلف ملکوں کے لوگ نظر آئے جو غالباً قسطنطنیہ کے لئے اپنے اپنے ملکوں کی امداد لا رہے تھے۔ سامنے کا ساحل بھی شہر اور فصیل کے دروازے کے سامنے کئی گز تک پھیلا ہوا تھا اور اس طرح پانی اور فصیل کے درمیان ایک چوڑی سی پٹی شہر کی سمندری اطراف میں گھوم رہی تھی۔ لیکن یہ پٹی اتنی چوڑی بھی نہ تھی کہ یہاں کسی لشکر کو اتارا جاتا۔ فصیل کے ساتھ ساتھ خشکی کی یہ پٹی فصیل پر موجود محافظوں کی زد میں تھی۔

قاسم سوچنے لگا کہ وہ کس طرح شہر میں داخل ہو۔ اُس کی نظریں گولڈن ہارن میں گشت کرتی سپاہیوں کی کشتیوں پر تھیں۔ اسی اثناء میں اُسے ایک چھوٹی کشتی دکھائی دی جس میں ایک اکیلا نوجوان سپاہی چلاتا ہوا اس طرف آ رہا تھا۔ قاسم اُس سپاہی کو غور سے دیکھنے لگا۔ یہ بھی کوئی یونانی نوجوان تھا۔ لیکن اُس کے خدوخال اور قد و قامت اُس کے بہادر اور جری ہونے کا پتہ دیتے تھے۔ سپاہی اپنی کشتی کھیتا ہوا اس طرف کے ساحل سے آ لگا۔ اُس نے کشتی کا رسہ گودی کے چوبی تختوں پر لگے لوہے کے کنڈے کے ساتھ باندھ دیا اور پھر اُچھل کر ساحل پر اُتر گیا۔ قاسم کے ذہن میں معاً ایک عجیب و غریب ترکیب آئی اور وہ تیز قدم اٹھاتا ہوا اُس نوجوان کی طرف بڑھ گیا۔ قاسم کے ہاتھ میں گھوڑے کی لگام تھی

بدن پر عام شہریوں جیسا لباس تھا۔ چند قدم مزید اٹھانے کے بعد قاسم اُس کے سامنے ہو گیا اور اُس کا راستہ روک کر ایک دم اُسے چونکا دیا اور کہا۔

"معلوم ہوتا ہے آپ بازنطینی سلطنت کے سپاہی ہیں..... میں آپ کو تکلیف دینے کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ لیکن میں بے بس ہوں اس لئے آپ کو تکلیف دی۔ دراصل میں قسطنطنیہ شہر میں داخل ہونا چاہتا ہوں۔ لیکن یہاں کوئی مجھے اُس طرف لے جانے کے لئے تیار نہیں۔ اگر آپ میری کچھ مدد فرما دیں تو نوازش ہو گی۔"

باوردی سپاہی قاسم کو گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ اُس نے کہا۔ "آپ کے لہجے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ قسطنطنیہ کے شہری نہیں ہیں..... آپ کہاں سے آئے ہیں؟ اور قسطنطنیہ میں کیوں داخل ہونا چاہتے ہیں؟"

سپاہی کا اندازِ تخاطب مہذب تھا۔ قاسم نے سوچا کہ یا تو وہ کسی بڑے خاندان کا چشم و چراغ ہے یا اُس کے ہاتھ میں قیمتی گھوڑے کی لگام دیکھ کر اُسے کوئی امیر اور مہذب شخص سمجھتا ہے۔ قاسم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"جی ہاں! میں بوسنیا سے آیا ہوں۔ میں قسطنطنیہ میں ایک شخص کے سوا کسی اور کو نہیں جانتا۔ اور مجھے نہیں معلوم کہ وہ شخص مجھے کہاں ملے گا۔ میں نے سنا ہے کہ قسطنطنیہ پر فرانوں کا حملہ ہونے والا ہے۔ اور میں قسطنطنیہ کی فوج میں ایک رضا کار کی حیثیت سے شامل ہونے کے لئے آیا ہوں۔"

قاسم نے کوئی نئی بات نہ کی تھی۔ پوری عیسائی دنیا کے بہترین رضا کار اپنے مرکزِ ملت قسطنطنیہ کو بچانے کے لئے قیصر کی فوج میں شامل ہونے کے لئے آ رہے تھے۔ بعض فنکار اپنے اپنے طور پر اور بعض اپنی حکومتوں کے جھنڈے تلے جتھوں اور دستوں کی شکل میں شریک ہو رہے تھے۔ بوسنیا سے ابھی تک کوئی دستہ شامل نہ ہوا تھا۔ قاسم کا جذبہ دیکھ کر قسطنطنیہ کے سپاہی کی آنکھوں میں تحسین کے جذبات اُمڈ آئے۔ کچھ اثر قاسم کے بات کرنے کے انداز کا بھی تھا۔ قاسم نے انتہائی سادہ اور سیدھے لہجے میں اپنا مدعا بیان کر دیا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ یونانی سپاہی جو یقیناً اپنی فوج میں کوئی افسر رہا ہو گا نے قاسم کو شک کی نظر سے دیکھنے کا خیال ترک کر دیا اور کسی قدر نرم لہجے میں پوچھا۔

"وہ کون سا شخص ہے قسطنطنیہ میں؟ جسے آپ جانتے ہیں؟"

"ڈیمونان!..... ڈیمونان نام ہے اُس کا۔ وہ آٹھ سال پہلے ایک مرتبہ بوسنیا آیا تھا تو میری اُس سے شناسائی ہوئی تھی۔"

قاسم نے جواب دیا اور یونانی سپاہی حیرت سے اُچھل کھڑا ہوا۔ ''ڈیمونان؟؟... ارے یہ تو ''آیا صوفیا'' کے بطریق ہیں۔ قسطنطنیہ کے ''دی ہولی آرتھوڈکس چرچ آ صوفیا'' کے بطریق۔'' سپاہی نے استعجاب سے بھرپور لہجے میں کہا۔ اور پھر قاسم کا ہاتھ پکڑ کر کسی قدر احترام کے ساتھ کہنے لگا۔ ''آپ تو بہت بڑے آدمی کے مہمان ہیں۔ آیئے میرے ساتھ..... مجھے یہاں تھوڑی دیر کا کام ہے۔ یہاں سے فارغ ہو کر میں واپس جاؤں گا تو آپ کو اپنی کشتی میں ساتھ لے کر جاؤں گا۔''

قاسم کو اور کیا چاہئے تھا..... یہی کہ وہ کسی محفوظ طریقے سے قسطنطنیہ میں داخل ہو جائے۔ اُس کی ترکیب کارگر رہی۔ لیکن اُس نے کہا۔

''تو پھر یہ گھوڑا جو میں اپنے ساتھ عیسائی فوج کے لئے لایا ہوں؟... اس کا کیا ہوگا؟''

یونانی سپاہی نے تحسین آمیز نظروں سے گھوڑے کی جانب دیکھا اور کہنے لگا۔ ''یہ گھ ہم بندرگاہ کے اصطبل میں باندھ دیتے ہیں۔ مال بردار جہاز کے ذریعے پرلے ساحل چلا جائے گا۔ کل تک ہم اسے وصول کر لیں گے۔''

قاسم یونانی سپاہی کے ساتھ اُس کا کام نمٹنے کے بعد اُس کی کشتی میں سوار ہو کر شہر کی جانب چل دیا۔ راستے میں قاسم نے سپاہی سے سوال کیا۔

''اگر آپ برا نہ مانیں..... تو میں آپ کا نام پوچھنا چاہوں گا۔ کم از کم اپنے محسن کا نام تو معلوم ہو۔''

''ارے! آپ کا نام پوچھنا میں بھی تو بھول گیا ہوں..... ہاں! میرا نام ''کلاڈیوس'' ہے۔ اب آپ اپنا نام بھی بتا دیجئے۔''

قاسم کو اسی سوال کی توقع تھی۔ اُس نے کلاڈیوس کو اپنا فرضی نام بتایا۔

''مورگن..... مورگن نام ہے میرا۔ دُور پار سے بوسنیا کے شاہی خاندان کا رشتہ ہوں۔ وہ شاہی خاندان جسے مسلمانوں کے سلطان نے تباہ و برباد کر دیا تھا۔''

قاسم نے نام کے علاوہ اپنا باقی تعارف حقیقی کروا دیا۔ وہ بوسنیا کی شہزادی حمیرا کا تھا اور اس لحاظ سے وہ شاہی خاندان کا دور پار کا رشتہ دار تو تھا ہی۔ قاسم کا تعارف سپاہی مرعوب ہو گیا اور اُس نے بات آگے بڑھانے کے لئے رسمی طور پر کہا۔

''ہمارے ساتھ ایک بہت پرانا سپاہی ہے جو بوسنیا کا رہنے والا ہے۔ وہ پہلے ہنگری کی فوج میں تھا۔ پھر اُس نے مذہب تبدیل کر لیا اور رومی کلیسا کو چھوڑ کر ہمارے کلیسا کے ساتھ شامل ہو گیا۔ ہنگری کی فوج میں وہ مشہور سالار ''ہونیاڈے'' کے پرچم تلے بھی

میں آپ کو یہ اس لئے بتا رہا ہوں کہ آپ بھی بوسنیا کے رہنے والے ہیں اور ہمارا ''رومیل'' بھی بوسنیا کا رہنے والا ہے۔ آپ کا اپنے ایک ہم وطن سپاہی کو دیکھ کر دل بہل جائے گا۔''

قاسم کو رومیل نامی کس بوسنیائی سپاہی کے ساتھ کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ تو کسی اور ہی سے قسطنطنیہ جا رہا تھا۔ لیکن اُس نے کلاڈیوس کی بات کا بھرم رکھنے کے لئے کہا۔

''ہاں ہاں! یہ تو بہت اچھا ہوا۔ اپنے ایک ہم وطن کو دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہو گی۔ لیکن وہ کہاں؟ اُسے ہم کہاں ملیں گے؟'' قاسم نے اس ڈر سے کہ اُسے کلاڈیوس سچ مچ کہیں سے نہ ملوا دے، رومیل کی بابت پوچھا اور کلاڈیوس کا جواب سن کر اُس کا دل دھک سے رہ گیا۔ کیونکہ کلاڈیوس کہہ رہا تھا۔

''رومیل ہمیں یہیں مل جائے گا۔ شہر کے دروازے پر۔ آج کل تمام تجربہ کار سپاہی وہ جھیلنے کی تیاریوں میں ہوں..... یہ آپ دیکھ رہے ہیں ناں، یہ ہر طرف آپ کو نظر آ رہے ہیں۔''

قاسم سوچنے لگا۔ یہ ایک اور مصیبت گلے آ پڑی ہے۔ وہ کسی رومیل سے نہیں ملنا چاہتا اور پھر اُس نے خود کو بوسنیائی ظاہر کر کے اور بھی مسئلہ کھڑا کر دیا تھا۔ کیونکہ رومیل سچ مچ بوسنیائی تھا۔ اور عین ممکن تھا کہ وہ اُلٹے سیدھے سوالات کر کے قاسم کا پول کھول دیتا۔ پریشانی کو لئے قاسم شہر کے سامنے جا اُترا۔ یہ بندرگاہ کا سب سے بڑا حصہ تھا۔ یہاں کی کشتی کنارے لگی اور اُس نے قاسم کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ اُس کا رُخ شہر کے دروازے کی جانب ہی تھا جس کے سامنے آنے جانے والوں کی بھیڑ لگی تھی۔ یہ دروازہ ''گولڈن ہارن'' میں کھلتا تھا۔ اسی لئے یہاں زیادہ تر ملاح دکھائی دیا کرتے تھے۔ لیکن آج تو سپاہیوں کی تعداد ملاحوں اور کشتی رانوں سے زیادہ تھی۔ سلطان کے اعلانِ جنگ نے قسطنطنیہ کی شہری زندگی کو بری طرح متاثر کیا تھا اور قصرِ شاہی کو بھی ہلا دیا تھا۔

کلاڈیوس کے ہمراہ چلتا ہوا اس عظیم شہر کے دروازے پر پہنچا اور دل ہی دل میں کو سلطانی لشکر کا پہلا سپاہی تصور کر کے مزے لینے لگا۔ لیکن اُس کے دل میں خدشات بھی تھے۔ وہ اگر شہر میں داخل ہوتے ہی پکڑا جاتا تو باقی کا کام ٹھپ کلاڈیوس کے ہمراہ ہونے کی وجہ سے قاسم کو شہر کے دروازے سے باہر کسی نے نہ روکا۔ وہ دونوں تیزی سے چلتے ہوئے اس تاریخی شہر کے بلند و بالا دیو قامت

دروازے میں جا پہنچے۔ دروازے کی چھت کے نیچے سے گزرتے ہوئے قاسم کی حیرت بے حد عجیب تھی۔ دروازے کی بناوٹ سے ظاہر ہوتا تھا کہ بازنطینی سلطنت کبھی بڑی پُرشکوہ اور عظیم رہی ہو گی۔ حالانکہ یہ قسطنطنیہ کا ایک چھوٹا دروازہ تھا۔ سب سے بڑا دروازہ ''سینٹ رومانس'' تھا جو خشکی کی جانب تھا۔ اور وہی شہر کی سامنے کی سمت سمجھی جاتی تھی۔ دروازے کے نیچے سے گزرتے ہوئے قاسم کو ایسے لگا جیسے وہ کسی بلند و بالا اور وسیع عریض کمرے میں سے گزر رہا ہو۔ قدموں کی آواز سے پیدا ہونے والی گونج اس قدر کے دیو مالائی تصور کو قاسم کے ذہن میں مزید اُجاگر کر رہی تھی۔ دروازے کے اندر بائیں فوجی افسروں اور محصول چونگی کے دفاتر تھے۔ کلاڈیوس بے دھڑک تیسرے کمرے داخل ہو گیا۔ قاسم کی نبضیں تیز ہونے لگیں۔ وہ دل ہی دل میں حمیرا سے سنی ہوئی معلومات دہرانے لگا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس نے دیکھا، ایک لحیم شحیم اور ادھیڑ عمر فوجی افسر اپنے سامنے شہر کا نقشہ پھیلائے چند سپاہیوں سے باتیں کر رہا تھا۔ کلاڈیوس نے افسر کو پُرجوش انداز میں سلام کیا اور فوری طور پر قاسم کا تعارف کروا دیا۔

''یہ ہے مورگن!..... بوسنیا کے سابق شاہی خاندان کا فرد۔ قسطنطنیہ کی فوج میں بھرتی ہونے آیا ہے۔''

قاسم نے اندازہ کر لیا کہ یہ پختہ عمر فوجی افسر رومیل ہی تھا۔ قاسم نے بھی آگے بڑھ کر مؤدبانہ انداز میں سلام کیا۔ رومیل، قاسم کو دیکھ کر اپنی نشست سے اُٹھ کھڑا ہوا اور نے پُرتپاک انداز میں آگے بڑھ کر اپنے ہم وطن کو گلے سے لگا لیا۔ قاسم کے لئے مشکل صورتحال تھی۔ اُس نے خود کو بوسنیائی کہہ تو دیا تھا لیکن اب اُسے کوشش کرنی تھی رومیل کو اُس پر کوئی شک نہ پڑے۔ رومیل نے قاسم کو اپنے قریب بٹھاتے ہوئے کہا

''آپ کی مہمان نوازی میرے لئے کسی سعادت سے کم نہ ہو گی۔ میں تو اپنے بوسنیا کے شاہی خاندان کا دل سے معتقد ہوں۔ کلاڈیوس نے اچھا کیا جو آپ کو میرے لے آیا۔''

اب بولنے کی باری قاسم کی تھی۔ اُس نے کسی قدر سنبھلتے ہوئے کہا۔ ''جی! یہ آپ کی مہربانی ہے۔ ورنہ اب شاہی خاندان کہاں باقی رہ گیا ہے۔ ہمارے شاہی خاندان سلطان مراد خان ثانی کی شمشیرِ آبدار نے پارہ پارہ کر دیا ہے۔''

''دیکھئے!..... آپ سلطان مراد خان ثانی کو کچھ مت کہئے۔ میں مسلمانوں کے سلطان کا مداح ہوں۔ آپ کو حیرت ہو گی..... یہ سن کر کہ میرے سات سالہ بیٹے کا نام

''سلطان مراد'' ہے۔''

رومیل کی بات قاسم کے لئے بجلی کا جھٹکا ثابت ہوئی۔ وہ رومیل کی بات کا اُلٹا مطلب سمجھا۔ اُس کا دل بیٹھنے لگا۔ اُسے یوں لگا جیسے رومیل کی گہری آنکھیں قاسم کو پہچان چکی ہوں اور اسی لئے رومیل قاسم کے سامنے سلطان مراد کا نام بار بار لے رہا ہے تاکہ قاسم کے دل کا چور پکڑ سکے۔ وہ بری طرح سٹپٹا گیا کہ اب رومیل سے کیا کہے اور کیا نہ کہے۔

رومیل قاسم کے چہرے پر ہونے والی تبدیلیوں کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ یہ بات قاسم کی مزید گھبراہٹ کا باعث ہوئی اور عثمانی سلطنت کا یہ تجربہ کار جاسوس زندگی میں پہلی بار اپنے آپ کو چوہے دان میں پھنسا ہوا محسوس کرنے لگا۔ رومیل، قاسم کی حیرت بھانپ چکا تھا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ پھر بولا۔

''ارے! آپ تو گھبرا گئے میری بات سن کر۔ آپ فکر مت کیجئے! میں مسلمانوں کا جاسوس نہیں ہوں، خداوند یسوع مسیح کا ایک سچا خادم ہوں۔''

اب قاسم کو مکمل یقین ہو چلا تھا کہ رومیل اُسے پہچان چکا ہے۔ وہ خود کو قیصر کی قید میں تصور کرنے لگا اور قید ہونے سے پہلے ہی فرار ہونے کے منصوبے سوچنے لگا۔ لیکن اچانک رومیل کی ایک اور بات سن کر اُس کا ذہن پھر بھٹک گیا اور وہ گومگو کے عالم میں گرفتار ہو گیا کہ رومیل کے بارے میں کس زاویئے سے سوچے۔ رومیل نے کہا تھا۔

''آپ مجھے غلط مت سمجھئے! میں نے اپنے بیٹے کا نام سلطان مراد کسی اور وجہ سے رکھا ہے۔ آپ کی طرح دوسرے لوگ بھی میری اس حرکت کو پسند نہیں کرتے اسی لئے میں اب اپنے بیٹے کو ''سولٹن'' کہہ کر پکارتا ہوں۔ زیادہ تر لوگوں کو میں وجہ نہیں بتاتا۔ لیکن آپ کو بتاؤں گا۔ کیونکہ آپ تو میرے ہم وطن بھائی ہیں۔ ابھی کچھ دیر بعد میں آپ کو اپنے گھر لے جاؤں گا۔ وہاں آپ میری بیوی اور بچے سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔''

قاسم نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔ ''کیا آپ کی بیوی بھی بوسنیائی ہیں؟''

''جی ہاں! ہمیں اپنے بوسنیائی ہونے پر فخر ہے۔''

اب قاسم کا ڈر کم ہو رہا تھا۔ اُسے رومیل کی شخصیت کچھ عجیب ہی لگی تھی۔ کچھ دیر بعد کلاڈیوس نے رومیل سے اجازت لی اور قاسم سے مل کر چلا گیا۔ رومیل نے باقی ماتحتوں کو بھی جانے کی اجازت دے دی۔ کمرے میں تنہائی ہوتے ہی قاسم نے پھر سوال کیا۔

''کیا یہ سچ ہے کہ قسطنطنیہ پر بہت بڑا حملہ ہونے والا ہے؟ میں دراصل یہی سن کر جہاد کی نیت سے ادھر آیا ہوں۔''

قاسم نے ذومعنی انداز میں اپنی اصل نیت بتا دی۔ واقعی! وہ جہاد کے لئے ہی تو آیا تھا۔ رومیل، قاسم کی بات پر زیرلب مسکراتا ہوا قاسم کو پراسرار سا لگا۔ لیکن اب سلطان عمر خان کا یہ جاسوس پوری طرح سنبھل چکا تھا۔ رومیل نے جواب دیا۔

''ہاں! یہ سچ ہے۔ آپ دیکھ نہیں رہے شہر میں کس قدر رسد جمع کی جا رہی ہے..... آپ کا جذبہ قابل ستائش ہے۔ اگر آپ جیسے نوجوان شاہی پرچم تلے جمع ہوتے رہے تو قسطنطنیہ کو کوئی سلطان بھی گزند نہیں پہنچا سکتا۔''

نہ جانے کیوں قاسم کے دل سے رومیل کے بارے میں پیدا ہونے والا شک کیوں دُور نہ ہو رہا تھا۔ آج قاسم خود کو مردم شناسی میں طفل مکتب سمجھ رہا تھا۔ وہ ابھی یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ رومیل نے اچانک سوال کر دیا۔

''آپ پہلے کبھی کسی جنگ میں شریک ہوئے ہیں؟..... آپ نے کبھی مسلمانوں کو میدانِ جنگ میں لڑتے دیکھا ہے؟''

قاسم نے فوری طور پر کوئی جواب نہ بن پڑا اور اُس نے کہہ دیا۔ ''نن..... نہیں۔ اس سے پہلے میرا زیادہ تر وقت مغربی یورپ میں گزرا ہے۔''

رومیل کو زیادہ حیرت نہ ہوئی۔ اُس نے خاموشی سے سر ہلا دیا اور خود کہنے لگا۔ ''لیکن میں نے مسلمانوں کو میدانِ جنگ میں لڑتے ہوئے دیکھا ہے۔ اُن کی ہلالی تلواریں برق آسمانی کی طرح لپکتی ہیں اور میدانِ جنگ میں اُن کے قدم پارے کی طرح تھرکتے ہیں۔ میں نے مسلمانوں کے خلاف کئی جنگوں میں حصہ لیا ہے۔ میں مشہور سپہ سالار ہونیاڈے کی اس فوج میں بھی رہا ہوں جس نے سلطان مراد خان ثانی سے ''وارنہ'' کے مقام پر شکست کھائی تھی۔''

اب قاسم کا دل ایک مرتبہ پھر بیٹھنے لگا۔ وہ دل ہی دل میں کہنے لگا کہ رومیل اُسے پہچان چکا ہے۔ کیونکہ یہی جنگ تو تھی جس میں قاسم نے خوب دادِ شجاعت دی تھی اور پاپائے روم کے خصوصی نمائندہ ''کارڈنیل جولین'' کو دو ٹکڑوں میں کاٹ دیا تھا۔ رومیل بھی اسی جنگ کا ذکر کر رہا تھا۔ یقیناً اُس نے قاسم کو وہاں دیکھا ہوگا اور اب اس لئے وہ داؤ داؤ کھیل رہا تھا..... قاسم یہی باتیں سوچتا رہا۔ یہاں تک کہ رومیل نے اپنا کام نمٹا لیا اور قاسم سے گھر چلنے کے لئے کہا۔

قاسم ابھی تک وسوسوں کی دنیا سے نہیں نکل سکا تھا۔ لیکن پھر بھی مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اُسے رومیل کے ساتھ جانا تو تھا ہی..... لیکن قاسم کو اُس وقت حیرت ہوئی جب

رومیل سچ مچ قاسم کو لے کر اپنے گھر آ گیا۔

اُس نے قاسم کو باہر دروازے پر کھڑا نہ کیا بلکہ ہم وطن بھائی ہونے کے ناطے اندر لے چلا گیا۔ رومیل نے گھر میں داخل ہوتے ہی اپنی بیوی کو پکارنا شروع کر دیا۔

''بریٹا! بریٹا!..... بریٹا کہاں ہو تم؟ ارے دیکھو ہمارے گھر کون آیا ہے۔''

یہ ایک چھوٹا سا گھر تھا جس کی چار دیواری میں تین چار کمروں کی ایک سادہ سی عمارت تھی۔ ایک کمرے میں سے چھ سات سال کا ایک بچہ نکل کر باہر کی طرف دوڑا۔ یہ رومیل کا بیٹا تھا جس کا نام رومیل نے سلطان مراد بتا کر قاسم کو حیران کر دیا تھا۔ اب لڑکا سامنے آیا تو قاسم کو رومیل کی بات پر یقین ہونے لگا۔ لڑکا دوڑتا ہوا اپنے باپ کے ساتھ آ کر چمٹ گیا۔ رومیل نے ہنستے ہوئے اپنے بیٹے کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور قاسم سے کہا۔

''یہی ہے میرا بیٹا جس کا نام میں نے سلطان مراد رکھا ہے۔ لیکن اب میں اسے سولٹن کہہ کر پکارتا ہوں.....''

رومیل نے ابھی بات مکمل نہ کی تھی کہ اُس کی بیوی کمرے سے نمودار ہوئی۔ یہ ایک حسین وجمیل کم عمر خاتون تھی۔ قاسم نے رومیل کی بیوی کو دیکھا تو اُس کے ذہن میں بریٹا کا لفظ گردش کرنے لگا جو ابھی کچھ دیر پہلے رومیل نے اپنی بیوی کے نام کے طور پر پکارا تھا۔ اُسے یہ لفظ جانا پہچانا سا محسوس ہوا۔ لیکن اُسے کچھ یاد نہ آیا..... رومیل کی بیوی نزدیک آئی اور اُس نے قاسم کو حیرت کے ساتھ دیکھتے ہوئے جھک کر سلام کیا۔ رومیل نے تعارف کرایا۔

''یہ ہے میری بیوی بریٹا!..... اور یہ ہیں مورگن صاحب۔ ہمارے مہمان۔ بوسنیا کے اعلیٰ شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔''

قاسم کا تعارف سن کر بریٹا کی مارے خوشی کے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ بہت خوش ہوئی۔ کچھ دیر تعارفی اور دُعائیہ کلمات ادا ہونے کے بعد رومیل اور بریٹا اپنے نئے مہمان کو لے کر اندر چلے گئے۔

کھانے کے دسترخوان پر بریٹا نے بہت سی چیزیں رکھ دیں۔ آبنائے باسفورس کی مچھلیوں کے بھنے ہوئے گوشت کے علاوہ بوسنیائی طرز پر بنائے گئے کباب بھی موجود تھے۔ قاسم کی بھوک بھی چمک اُٹھی۔ لیکن اُس نے کھانا شروع کرنے سے پہلے رومیل سے پوچھا۔

''آپ نے ابھی تک نہیں بتایا کہ آپ نے ایک راسخ العقیدہ عیسائی ہو کر بھی اپنے

بیٹے کا نام سلطان مراد کیوں رکھا؟..... مجھے آپ کی وضاحت کے ساتھ خاصی دلچسپی ہے۔"
قاسم نے مسکراتے ہوئے کہا تو بریٹا اور رومیل بھی ہنس دیئے۔ اور پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد رومیل نے بات شروع کی۔

لیکن اُس نے ابھی چند جملے ہی کہے تھے کہ قاسم کے ہاتھ سے کھانے کا نوالہ گرتے گرتے بچا..... رومیل نے کہا تھا۔

"دراصل میرا بچہ جس وقت پیدا ہوا، اُس وقت سلطان مراد کی فوج بوسنیا کو فتح کر چکی تھی اور شہر کے لوگ فاتح سپاہیوں کی دست درازیوں کے خوف سے اپنے اپنے گھروں میں چھپے بیٹھے تھے..... اُس وقت اچانک میرے گھر بچہ پیدا ہونے کی صورتحال بن گئی۔ میری بیوی بریٹا..... گھر میں اکیلی تکلیف میں مبتلا تھی اور شہر میں سلطان مراد کی فوج گشت کر رہی تھی۔ اسی اثناء میں عثمانی فوج کے کچھ سپاہی میرے گھر کے قریب سے گزرے اور انہوں نے بریٹا کی کراہیں سن کر اس کی بروقت مدد کی۔ اس طرح نہ صرف میری پیاری بیوی کی زندگی بچ گئی..... بلکہ میرا اکلوتا بچہ بھی صحیح سلامت اور زندہ رہا جو اس وقت تمہارے سامنے ہے..... بریٹا کو اس وقت اس سپاہی کا نام تو یاد نہیں تھا اس لئے اس نے مسلمانوں کے بادشاہ سلطان مراد کے نام پر "سولٹن" کا نام تجویز کیا۔ میں اس وقت ہونیاڈے کی فوج میں تھا۔"

رومیل کی کہانی قاسم کے لئے لرزہ انگیز تھی۔ کیونکہ یہ تو اُس کی اپنی کہانی تھی۔ وہی تھا جس نے بوسنیا میں ایک چلاتی ہوئی عورت کی مدد کی تھی اور وہیں تو اُس کی ملاقات حمیرا، مریم اور عباس سے ہوئی تھی۔ قاسم قدرت کے اس حسن اتفاق پر دنگ رہ گیا۔ اُس کے حلق میں پھنس رہا تھا اور مارے حیرت کے اُس کی بھنوئیں سکڑ چکی تھیں۔ اُسے احساس ہوا کہ رومیل نے دروازے میں سچ کہا تھا اور وہ بلاوجہ رومیل پر شک کرتا رہا تھا۔ اُس نے بریٹا کو غور سے دیکھا، یہی وہ عورت تھی جس کی قاسم نے بروقت مدد کی تھی۔ اُس دن تو قاسم اُسے دیکھ بھی نہ سکا تھا کیونکہ یہ تو بیمار تھی۔ اور پھر قاسم نے "سولٹن" کی جانب دیکھا..... وہ قدرت کے اس عجیب کرشمے پر بار بار حیران ہو رہا تھا۔ قدرت نے اُسے کس موڑ پر بریٹا اور اُس کے بچے سے ملوا دیا تھا۔ قاسم کی حیرت دیکھ کر رومیل پریشان ہونے لگا اور بولا۔

"مورگن..... گھبراؤ مت..... ہم نے صرف اپنے بچے کا نام رکھا ہے۔ تاکہ ایک مسلمان کا احسان چکایا جا سکے۔ ہم مسلمان تو نہیں ہوئے..... تم کیوں پریشان ہوتے ہو؟"

رومیل نے پہلی بار قاسم کو "تم" کہہ کر پکارا تھا۔ قاسم کو یوں لگا جیسے اُس کا بڑا بھائی طاہر بولا ہو..... کیونکہ رومیل کے لہجے میں "تلقین" کی جھلک تھی۔ قاسم نے رومیل کو غلط فہمی میں مبتلا ہوتے دیکھا تو فوراً کہا۔

"نہیں نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں..... مجھے تو خوشی ہوئی یہ سب سن کر..... آپ نے اپنے بچے کا نام سلطان مراد رکھ کر بہت اچھا کیا..... میں تو صرف حیران تھا عثمانی سپاہیوں کے کردار پر..... کہ وہ مسلمان ہو کر بھی اور فاتح ہو کر بھی..... اس قدر اعلیٰ اخلاق کے مالک تھے۔ مسلمانوں کو دیکھنے کا میرا شوق اور بڑھا دیا ہے آپ نے۔"

قاسم کو واقعتاً خوشی ہوئی تھی۔ اب وہ ان لوگوں میں اپنائیت محسوس کر رہا تھا۔ اُسے اپنی بیوی حمیرا یاد آنے لگی..... جو لازمی طور پر "بریٹا" کی شناسا رہی ہو گی۔ عباس اور مریم ہی تو بریٹا کے پڑوسی تھے۔ مریم اس وقت قاسم کے بڑے بھائی طاہر کی بیوی تھی۔

قاسم ان لوگوں کے ساتھ جلد گھل مل گیا۔ لیکن اُس نے اپنے دل کی بات دل میں ہی رکھی۔

آیا صوفیاء

قسطنطنیہ اپنے جغرافیائی محل وقوع اور اپنی تہہ در تہہ تاریخ کے لحاظ سے دنیا کا ایک منفرد شہر تھا۔ اس شہر کے نام بھی مختلف زمانوں میں بدلتے رہے۔ اس کا سب سے قدیم نام ''زارغراد'' تھا۔ پھر ''میکلہ غارڈ'' ہوا۔ یونانی اور رومی دور کے ابتداء میں اسے ''بیزنطہ'' کہا گیا۔ پھر جب تیسری صدی عیسوی میں رومی بادشاہ ''قسطنطین'' نے اس شہر کو اپنا پایۂ تخت بنایا تو اس کا نام رومی بادشاہ کے نام پر قسطنطنیہ ہوگیا۔ اس زمانے میں اسے ''روم جدید'' بھی کہا گیا۔ شروع زمانے کے بازنطینی لوگ اسے ''نیوپولس'' کہہ کر پکارتے تھے۔ عربوں نے اپنے دور میں اسے ''مدینۃ الروم'' کہہ کر پکارا۔

فی الحقیقت اسے رومی سلطنت کی ایک بڑی شاخ کہنا چاہئے۔ ''روم'' کا شہر جو ''اٹلی'' میں ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے ساڑھے سات سو سال پہلے آباد کیا گیا تھا۔ دراصل اٹلی میں ایک دریا ہے جس کا نام ہے ''ٹائبر'' جو شمال کی طرف سے آتا ہے اور ''روما'' سے گزرتا ہوا پچیس میل نیچے ''بحیرۂ روم'' میں جا گرتا ہے۔ یہ دریا کبھی شاہراہ تجارت تھا۔ اس دریا کے ذریعے بڑی بڑی اشیاء کو بہا کر اور چھوٹی اشیاء کو کشتیوں میں لاد کر ''فلورنس'' سے ''نیپلز'' اور بعض دیگر مقامات تک تجارت کی جاتی تھی۔ اس دریا کے کنارے ایک مقام سرسبزی اور دلکشی کی وجہ سے مشہور تھا۔ وہاں تاجر خیمے لگا کر راتوں کو ٹھہرتے اور صبح پھر دریا کے راستے روانہ ہو جاتے۔ ولادت مسیح سے ساڑھے سات سو سال پہلے ان تاجروں نے چندہ کر کے وہاں ایک سرائے بنا دی جہاں رفتہ رفتہ ایک شہر بن گیا۔ یہی شہر ''روم'' کہلایا۔ اس زمانے میں ہر خاندان کا سردار الگ تھا جو خاندانی جھگڑے چکاتا، شادیاں کراتا، ہر معاملے میں حکم چلاتا اور اپنے قبیلے کی بستیوں کو چھوٹے ڈاکوؤں اور بڑے حملہ آوروں سے بچاتا۔ چھٹی صدی قبل مسیح میں ایک ایشیائی قبیلہ وہاں جا نکلا۔ یہ لوگ ''طارقینز'' (Tarquins) یعنی ''تارکین'' کہلاتے تھے۔ 509 قبل مسیح میں یہ ''تارکین'' نے ایک بہترین حکومت قائم کی۔ یہ یورپ کی پہلی جمہوریہ تھی۔ اس جمہوریہ نے رفتہ رفتہ گرد و نواح کے تمام قبائل کو قابو کر لیا۔ یہاں تک کہ 265 قبل مسیح میں ''روما'' اچھی خاصی طاقت بن گیا۔ اب فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا۔ 1977 ق م میں ''سپین'' اور

سال بعد ''شمالی افریقہ'' اور ''مقدونیا''، 64 ق م ''شام''، 50 ق م میں ''فرانس'' اور ''بیلجیم''، 9 عیسوی میں ''جرمنی''، 44 عیسوی میں ''برطانیہ''، 105 عیسوی میں ''فلسطین''، 114 عیسوی میں ''آرمینیا'' اور 117 عیسوی میں ''عراق'' سلطنت روما کا حصہ بن گئے۔

''کارنیلیس سُلا'' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے 78 سال پہلے ''روما'' کا ایک قابل جرنیل تھا۔ یہ سیاستدانوں کی رقابت سے تنگ آ گیا اور اس نے 83ق م میں پارلیمنٹ کو معطل کر کے ''مارشل لاء'' نافذ کر دیا۔ اُس دور میں جمہوریت صرف خواص یا طبقۂ اشرافیہ کے لئے ہوتی تھی۔ جنرل ''کارنیلیس سلا'' کی آمریت کے خلاف اُس دور کی فلفی ''سسرو'' نے تحریک چلائی۔ چنانچہ 79 ق م میں ''سلا'' نے دوبارہ جمہوریت قائم کر دی اور خود سیاست سے کنارہ کش ہو گیا۔

''جولیس سیزر'' سینٹ کا ممبر تھا۔ اسے 58 ق م میں ''فرانس'' کا گورنر مقرر کیا گیا۔ اس نے پہلے اردگرد کے علاقے فتح کئے، پھر ''برطانیہ'' پر حملہ کر دیا اور ''دریائے ٹیمز'' تک چلا گیا۔ ''سیزر'' کی ان کامیابیوں کو دیکھ کر سینٹ کو ڈر پیدا ہوا کہ کہیں یہ آمر نہ بن جائے۔ چنانچہ 50ق م میں سینٹ نے حکم دیا کہ ''سیزر'' فوج کو منتشر کر دے۔ اس سے سیزر بگڑ گیا اور روم پر قبضہ کر کے ''آمر'' بن بیٹھا۔

جولیس سیزر سے رومی شہنشاہوں کا سلسلہ شروع ہو کر پانچ صدیوں تک اسی شہر میں جاری رہا۔ یہاں تک کہ 305 عیسوی میں ''روما'' کے شہنشاہ ''قسطنطین اول'' کی پیدائش ہوئی۔ اس نے 330 عیسوی میں ایک گاؤں بائیزینٹیم کو اپنا پایۂ تخت بنا لیا اور پھر یہ گاؤں ''بائیزینٹیم'' کی بجائے قسطنطین اول کے نام پر ''قسطنطنیہ'' کہلانے لگا۔ قسطنطین اول کی وفات کے بعد اس کے بیٹوں کے درمیان اختلاف پیدا ہوا اور سلطنت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک حصہ قسطنطنیہ کہلایا اور دوسرا حصہ جو ''روما'' میں تھا، ''روم'' کہلایا۔ بعد ازاں ان دونوں حصوں کے مذہبی اختلافات بھی پیدا ہو گئے۔ اور روما کے لوگوں نے رومن کیتھولک مذہب اختیار کر لیا۔ جبکہ قسطنطنیہ میں یونانی کلیسا کے ماتحت ''دی ہولی آرتھوڈکس'' مذہب رائج تھا۔ ''قسطنطین اول'' کے بعد ''قسطنطین دواز دہم'' (بارہ) تک اس سلطنت یعنی قسطنطنیہ میں بیاسی شہنشاہ گزرے جن میں صرف قسطنطین نام کے شہنشاہوں کی تعداد بارہ ہے۔ قسطنطنیہ کے ان شہنشاہوں کو ''قیاصرۂ روم'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ رومی سلطنت دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ غربی شاخ ''رومن ایمپائر'' اور مشرقی شاخ ''بازنطائن'' ایمپائر کے نام سے مشہور ہوئی۔

''ہرقل'' یا ''قسطنطین سوئم'' جو 610ء سے 641ء تک قسطنطنیہ کا شہنشاہ تھا، اس لئے مشہور ہے کہ اُس کی طرف نبی کریم ﷺ نے 630ء میں خط لکھا تھا اور اُسے دعوتِ اسلام دی تھی۔ ''سلطان محمد فاتح'' کے زمانے میں قسطنطنیہ پر قسطنطین نامی بارہویں شہنشاہ کی حکومت تھی۔ زمانۂ قدیم میں ''روم''، ''ایتھنز'' اور قسطنطنیہ کی عظمت کا بڑا شہرہ تھا اور یہ شہر گیارہ سو سال سے رومی سلطنت کا ایک بڑا مرکز تھا۔

قاسم بن ہشام قسطنطنیہ کے بارے میں یہ ساری معلومات پہلے سے جانتا تھا۔ اُسے تو عیسائی مذہب اور فرقوں کی بھی بہت سی معلومات تھیں اور وہ شہنشاہ کے حسب و نسب سے بھی خوب واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ قسطنطنیہ کے قیصر نے جب عیسوی مذہب قبول کیا تو عیسوی سلطنت اور ''ایران'' کی مجوسی سلطنت میں بار بار لڑائیاں ہوئیں۔ یہ ''قیصر و کسریٰ'' یا ''روم و فارس'' کی لڑائیاں تھیں۔ ان لڑائیوں کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ ''ملک عرب'' میں اسلامی سلطنت نے قائم ہو کر مجوسیوں اور عیسائیوں دونوں کو مبہوت کر دیا۔ مجوسی سلطنت مسلمانوں کے ہاتھوں پاش پاش ہو کر معدوم ہو گئی۔ لیکن قسطنطنیہ کی عیسائی سلطنت عرصہ دراز تک قائم رہی۔ لیکن آج قاسم اس عیسائی سلطنت کے خاتمے کا نقیب بن کر اس قدیم شہر میں داخل ہو چکا تھا۔ وہ رومیل کے گھر میں ایک رضا کار کی حیثیت سے رہ رہا تھا۔ رومیل نے اُس کا نام رضا کاروں میں لکھوا دیا تھا لیکن اُسے سرکاری بیرکوں میں بھیجنے کی بجائے اپنے پاس ہی رکھا۔ قاسم بھی یہیں رہنا چاہتا تھا۔ رومیل نے اڑوس پڑوس کے لوگوں کو بتا دیا تھا کہ مورگن اس کا بھائی ہے اور بوسنیا سے آیا ہے۔ رومیل نے قاسم کا گھوڑا بھی محصول چونگی سے چھڑوا لیا تھا۔ اب قاسم کے لئے اپنا کام کرنے کا کھلا موقع تھا۔ کیونکہ قسطنطنیہ میں اُسے اس کی توقع کے برعکس انتہائی محفوظ اور گھر جیسا ماحول میسر آ گیا تھا۔ اُسے سب سے زیادہ خوشی ''بریٹا'' سے مل کر ہوئی تھی۔ کیونکہ بوسنیا میں عباس اور مریم کی پڑوسن ہونے کے ناطے قاسم ''بریٹا'' سے قرابت دارانہ اُنس محسوس کرتا تھا۔

انہی خیالات میں گم اپنے گھوڑے پر سوار وہ ''آیا صوفیاء'' کے سامنے سے گزرا۔ اُس نے اپنے چہرے کو ایک چادر کے پلو کے ساتھ چھپا رکھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ''آیا صوفیاء'' میں ابوجعفر موجود تھا۔ وہ ابھی اُس کے سامنے نہ آنا چاہتا تھا۔ یہ ''دی ہولی آرتھوڈکس'' چرچ تھا۔ اور ''روما'' کے قدیم مرکز کی طرح یہ بھی عیسائی دنیا کا روحانی مرکز تھا۔ اگرچہ قسطنطنیہ، روم سے بعد میں قائم ہوا تھا لیکن مذہب کے لحاظ سے قسطنطنیہ قدیم فرقے کا ربند تھا۔ اس کے برعکس رومن چرچ، رومن کیتھولک مذہب والوں کے ماتحت تھا۔''

صوفیاء'' کی عمارت دیکھ کر قاسم دنگ رہ گیا۔ یہ عظیم الجثہ عمارت دیو مالائی دور کی یادگار لگتی تھی۔ لیکن اپنی قدامت کے باوجود اس میں بوسیدگی نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ کیونکہ یہ عیسائیوں کا روحانی مرکز تھا اور ہر شہنشاہ اسے سجانے اور خوبصورت بنانے میں کوئی کسر باقی نہ رہنے دیتا۔ عمارت کا دروازہ دو عدد بڑے بڑے برج نما ستونوں کے درمیان چمکدار پیل کا تھا۔ اس پر سونے سے بنی ایک بڑی صلیب نصب تھی۔ یہ کلیسا ''قسطنطین اول'' نے سب سے پہلے 360ء میں مکمل طور پر لکڑی سے تعمیر کیا تھا۔ چھٹی صدی عیسوی میں یہ کلیسا جل گیا تو اسی جگہ قیصر ''جسٹینین'' نے 532ء میں اسے پختہ تعمیر کرنا شروع کر دیا۔ اس کی تعمیر پانچ سال دس مہینے میں مکمل ہوئی۔ دس ہزار معمار اس کی تعمیر پر مامور رہے اور اس پر ''دس لاکھ پونڈ'' خرچ آیا۔ اس کی تعمیر میں قیصر نے دنیا کے متنوع سنگ مرمر استعمال کئے..... ''فریجیا'' کا سفید، ''لکونیا'' کا سبز، ''لیبیا'' کا نیلا، ''سلیک'' کا سیاہ اور ''ہاسورس'' کا سیاہ دھاری دار سنگ مرمر منگوایا گیا۔ ''مصر'' کے ''سنگ ستارا'' اور ''سنگ بتاق'' بھی منگوا کر اس میں استعمال کئے گئے۔ دنیا بھر کے کلیساؤں نے اس کی تعمیر میں سے نوادرات نذرانے کے طور پر بھیجے۔ اس کی تعمیر میں دنیا بھر کے خاص مسالے استعمال کئے گئے۔ چنانچہ جب ''جسٹینین'' اس کی تکمیل کے بعد پہلی بار اس میں داخل ہوا تو اس نے کہا تھا۔

''سلیمان! میں تم پر سبقت لے گیا۔''

حضرت سلیمان علیہ اسلام نے ''بیت المقدس'' تعمیر کیا تھا۔ ''جسٹینین'' کے گستاخانہ جملے کا اشارہ بھی اسی طرف تھا۔

قاسم ''آیا صوفیاء'' کے سامنے گھوڑے سے نہ اُترا۔ وہ ابھی تک اس شاندار عمارت کے اندر سے نہ نکل سکا تھا۔ قاسم نے اپنا گھوڑا اس عظیم چرچ کے باہر قدرے فاصلے پر روک رکھا اور اس عظیم عبادت گاہ کو دیکھتا رہا۔ اس کے سامنے چرچ میں جانے کے لئے پانچ دروازہ کھلا تھا..... گزشتہ ایک ہزار سال سے ''آیا صوفیاء'' کی عمارت عیسائیوں کے لئے اور روحانی مرکز کے طور پر استعمال ہوتی رہی۔ اس کی بیرونی دیوار پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ''پولس رسول'' کی بڑی بڑی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ قاسم نے ''آیا صوفیاء'' کے دروازے کے نزدیک جانا بھی مناسب نہ سمجھا حالانکہ اُس کے گلے میں صلیب لٹک رہی تھی۔ وہ ایک عیسائی عبادت گزار کی حیثیت سے ''آیا صوفیاء'' میں داخل ہو سکتا تھا۔ لیکن اس حال عبادت کرنے نہ آیا تھا۔ وہ تو ''آیا صوفیاء'' کو دیکھنے آیا تھا جہاں عنقریب رومی

اور بازنطینی کلیساؤں کے اتحاد کے لئے ایک بڑی مجلس منعقد ہونے والی تھی۔ قاسم چاہتا تھا کہ اس مجلس کی سن گن لے سکے اور جس طرح ممکن ہو سکے وہ کوشش کرے کہ اس موقع پر ان دونوں فریقوں کے مابین اتحاد نہ ہو۔

''دی ہولی آرتھوڈکس چرچ'' اور ''رومن کیتھولک چرچ'' کے اتحاد میں ''سلطان فاتح'' کا بہت نقصان تھا۔ کیونکہ ''رومہ'' کا بڑا روحانی پیشوا ''پاپائے روم'' یعنی ''پوپ جو نکلسن پنجم'' پورے مغربی یورپ پر بلا شرکت غیرے اختیار اور عبور رکھتا تھا۔ اور عین ممکن تھا کہ اس اتحاد کے بعد پوپ کے حکم سے قسطنطنیہ کو بچانے کے لئے جرمنی، فرانس، ہنگری، سپین اور برطانیہ کی افواج بھی آ جاتیں۔ کیونکہ آج سے چار سو سال پہلے اسی طرح ایک پوپ ''پطرس ہرکولیس'' کی درخواست پر مغربی یورپ کے ان تمام ممالک نے ''سلطان صلاح الدین ایوبی'' کے خلاف ایک بڑا اتحاد قائم کیا تھا اور بے شمار جنگی بیڑے لے کر آئے تھے۔ سلطان نے قاسم کو اسی لئے بھیجا تھا کہ وہ کسی طرح اس اتحاد کو ممکن نہ ہونے دے۔ ابھی دونوں کلیساؤں کی مشترکہ مجلس منعقد ہونے میں چند دن باقی تھے۔

قاسم کچھ دیر تک خاموشی سے کھڑا رہا۔ پھر اُس نے اپنے سر کو جھٹکا دیا اور گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ اب وہ اس چرچ میں داخل ہونے کے منصوبے تجویز دینے لگا تاکہ کسی ایسے طریقے میں داخل ہو جس میں اُسے ابوجعفر پہچان نہ سکے۔ وہ یہی کچھ سوچتا ہوا ''رومیل'' کے گھر لوٹ آیا۔

وہ جب سے قسطنطنیہ آیا تھا، اُس کے ذہن پر ''ابوجعفر'' سے زیادہ کوئی اور چیز سوار نہیں رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ابوجعفر ''آیا صوفیاء'' میں ہے اور اُس کا نام ''ڈیمونان'' ہے۔ وہ بغیر کسی حکمت عملی کے ڈیمونان پر ہاتھ نہ ڈالنا چاہتا تھا۔ وہ گھر میں آیا تو ''بریٹا'' اکیلی صحن میں بیٹھی نظر آئی۔ قاسم کو دیکھ کر وہ احتراماً اُٹھ کھڑی ہوئی۔ قاسم نے مسکراہٹ کے ساتھ بریٹا کو سلام کیا، پھر قاسم نے پوچھا۔ ''سولٹن نظر نہیں آ رہا؟''

وہ رومیل کے بیٹے کی بات کر رہا تھا۔ بریٹا نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''وہ ابھی مدرسے سے نہیں لوٹا..... لیکن آپ صبح صبح کہاں چلے گئے تھے؟ میں نے آپ کے لئے کھانا تیار کر رکھا ہے..... وہ کھا لیجئے!''

بریٹا کا انداز خالص بھابیوں جیسا تھا۔ قاسم بھی اُسے دیکھ کر مسکرا دیا۔ اُس نے قدر افسردہ لہجے میں کہا۔ ''میں صبح کی عبادت کے لئے آج ''آیا صوفیاء'' جانا چاہتا تھا لیکن چرچ کے سامنے پہنچ کر میرا ارادہ بدل گیا اور میں نے سوچا کہ میں اُس وقت تک

چرچ میں داخل نہیں ہوں گا جب تک اس کے سر سے مسلمانوں کی ہلالی تلوار کا خطرہ نہیں ٹل جاتا..... اسے ایک طرح سے میرا قول یا قسم سمجھ لیجئے!''

بریٹا حسرت سے قاسم کو دیکھ رہی تھی اور قاسم دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا کہ اُس نے دو تیر سے دو شکار کر لئے تھے۔ ایک تو یہ کہ بریٹا کے سوال کا جواب دے دیا تھا اور دوسرا کہ اپنی قسم کا حوالہ دے کر اب وہ اتوار کے روز ان لوگوں کے ہمراہ ''آیا صوفیاء'' جانے سے بچ گیا تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو داد دی۔ لیکن بریٹا نے اُسے ایک عجیب بات کہہ کر چونکا دیا۔

''مورگن! آپ کو دیکھ کر نہ جانے کیوں میرا دل یہ کہتا ہے کہ میں آپ کو جانتی ہوں۔''

قاسم فوراً محتاط ہو گیا اور اُس نے جلدی سے بہانہ بنایا۔ ''ہاں، تو یہ کون سی بڑی بات ہے۔ ہم دونوں ایک جگہ کے رہنے والے ہیں۔ آپ نے زندگی میں کہیں نہ کہیں مجھے دیکھا ہی ہو گا۔''

بریٹا گہری نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے جواب سن رہی تھی۔ معاً قاسم کے دل میں ایک خیال آیا اور وہ اُسی کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ''آیا صوفیا'' میں داخل ہونے کے لئے یا آیا صوفیا کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے کسی نہ کسی طرح بریٹا کو استعمال کرے۔ اور اسی خیال کے تحت اُس نے بریٹا سے پوچھا۔

''آپ تو جاتی رہتی ہوں گی..... آیا صوفیاء میں۔''

''جی ہاں! میں ہفتے میں ایک بار ''دی ہولی آرتھوڈکس چرچ'' ضرور جاتی ہوں۔''

قاسم نے پھر کہا۔ ''پھر تو آپ کا جاننے والا بھی کوئی ہو گا وہاں۔''

''جی ہاں! وہاں میں کئی راہبوں کو جانتی ہوں۔ بطریق ثانی معزز ''ڈیمونان'' بھی مجھ جانتے ہیں..... لیکن آپ کو سچ بتاؤں، یہ پادری اور راہب مجھے بالکل اچھے نہیں لگتے۔ میں خداوند یسوع مسیح کی عبادت کے لئے وہاں جاتی ہوں۔ ورنہ یہ مذہبی رہبر جنہیں ہم اپنا پیشوا سمجھتے ہیں، بہت غلط لوگ ہوتے ہیں۔ مجھے ان میں صرف معزز ڈیمونان اچھا لگا۔ میں اُن کا لیکچر بھی سنتی ہوں جو مہینے میں ایک بار ہوتا ہے۔''

قاسم کے لئے یہ خبر محتاط کر دینے والی تھی۔ بریٹا کے ڈیمونان کے ساتھ تعلقات تھے اور ڈیمونان قاسم کو بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ کیونکہ یہ وہی ابوجعفر ہی تو تھا جس نے ''مصر'' میں بیس سال بسر کئے تھے اور پھر قاسم کی محبت یعنی مارسی کو زخمی حالت میں لے کر اُس سے فرار ہوا تھا۔

مارسی کی یاد آتے ہی قاسم کے دل پر گھونسہ پڑا۔ اور وہ مارسی کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس دوران بریٹا کھانا لینے کے لئے چلی گئی اور قاسم اپنے کمرے میں بیٹھ کر بظاہر ایک کتاب کا مطالعہ کرنے لگا۔ لیکن درحقیقت وہ اپنے آئندہ لائحۂ عمل کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ بریٹا کھانا لائی تو اُس نے آتے ہی پوچھا۔

''لیکن آپ نے یہ تو بتایا نہیں کہ آپ آیا صوفیاء میں کسی شناسا کے بارے میں کیوں پوچھ رہے تھے؟''

قاسم نے اس کا جواب پہلے ہی سوچ رہا تھا۔ اُس نے کہا۔ ''میں دراصل اپنی ایک قیمتی چیز اس چرچ کو بطور نذرانہ دینا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا نذرانہ کسی ایسے ہاتھ میں پہنچے جو ایماندار اور خداوند یسوع مسیح کے دین کا سچا پیروکار ہو۔ لیکن آپ تو بتا رہی ہیں کہ یہاں سارے راہب بددیانت ہیں۔''

''نہیں نہیں!... میں نے یہ کب کہا ہے۔ میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ ان میں معزز ڈیمونان ایماندار اور صاف ستھرے انسان ہیں۔ میں نے خود اس مقدس جنگ کے لئے اپنا سب سے قیمتی لاکٹ چرچ کی نذر کر دیا ہے اور معزز ڈیمونان بطریق ثانی کے ہاتھ پر ہی کی ہے..... حالانکہ وہ لاکٹ مجھے جان سے زیادہ عزیز تھا۔ کیونکہ وہ مجھے میری ایک پیاری سہیلی نے دیا تھا۔'' بریٹا نے سہیلی کا ذکر کیا تو قاسم کے ذہن میں فوراً مریم کا خیال آیا۔ کیونکہ وہی بریٹا کے ساتھ والے گھر میں رہتی تھی۔ بوسنیا کی شہزادی ''حمیرا'' تو جنگ کے بعد عباس کے گھر رہنے لگی تھی۔ وہ دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ وہ نے سوال کیا۔

''لیکن آپ کیا نذرانہ دینا چاہتے ہیں جنگ کو..... آپ نے تو جنگ کا خطرہ ٹلنے تک وہاں نہ جانے کا فیصلہ کیا ہے..... لائیے! مجھے دیجئے، آپ کا نذرانہ میں دے آؤں گی میں خود مقدس باپ ڈیمونان کے ہاتھ پر رکھوں گی۔''

صورتحال نہایت دلچسپ ہو چکی تھی۔ قاسم کی منصوبہ بندی اپنی ٹھیک ٹھیک نہج پر چل پڑی تھی۔ اب قاسم نے مزید راہ ہموار کرنے کی کوشش کی۔ اُس نے کہا۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ آپ لے جائیں گی تو مجھے اور بھی زیادہ اچھا لگے گا کیونکہ ظاہر ہے آپ میرے نذرانے کو کسی ایماندار شخص کے ہاتھ پر ہی رکھیں گی۔''

لیکن قاسم چرچ کو نذرانہ کہاں سے دیتا؟ اُس کے پاس کوئی تحفہ ہوتا بھی..... تب وہ اسے چرچ کی نذر ہرگز نہ کرتا۔ وہ قسطنطنیہ کی حکومت کو کمزور کرنے کے لئے آیا

قوت دینے کے لئے نہیں۔

اُس روز قاسم نے بریٹا کے ساتھ صرف اتنی باتیں کیں۔ اور پھر اُسے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ وہ جلد ہی اُسے اپنا قیمتی تحفہ دکھا دے گا۔ ابھی قاسم کو اپنی منصوبہ بندی کے لئے بہت کچھ کرنا تھا۔ اسے دونوں کلیساؤں کی متحدہ مجلس کو سبوتاژ کرنے کے لئے ابھی بہت سے روپ بدلنے تھے۔ ابھی تو وہ یہاں آیا ہی تھا۔ چنانچہ اُس نے بریٹا کے ذہن میں کسی حد تک اپنی منصوبہ بندی ڈال دی۔ اب وہ بریٹا کو اپنے اعتماد میں لے کر مزید قدم اٹھانا چاہتا تھا۔ اُس نے رومیل، بریٹا اور اُن کے بچے کے ساتھ بہت زیادہ گھلنا ملنا شروع کر دیا۔ اب قاسم کو بھائی کہہ کر پکارنے لگی۔ قاسم جب بھی باہر سے آتا، بریٹا اور سولٹن کے لئے نئے کپڑے اور دوسری چیزیں خرید کر لاتا۔ رومیل اب قاسم کی پہلے سے بھی زیادہ عزت کرنے لگا تھا۔ اُس نے قاسم کا نام رضاکاروں میں تو لکھوا دیا تھا لیکن ابھی قاسم نے فوجی فرائض نہ سنبھالے تھے۔ قاسم نے خود کہا تھا کہ وہ کچھ دن قسطنطنیہ شہر اچھی طرح دیکھنا چاہتا ہے۔

''آیا صوفیاء'' کا ایک چکر لگانے کے بعد قاسم پھر اُس طرف نہ گیا۔ وہ ابھی اپنے آپ کو مضبوط کئے بغیر ڈیمونان سے ٹکر نہیں لینا چاہتا تھا۔ چنانچہ اپنی حکمت عملی پر عمل پیرا ہونے کے لئے اُس نے مزید معلومات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ آیا صوفیاء کے تمام انتظامی نظام کو سمجھنا چاہتا تھا۔ وہ بازنطینی افواج کے ''سپہ سالار نوٹاراس'' کی صلاحیتوں، کمزوریوں اور ارادوں سے اپنے سلطان کو باخبر رکھنا چاہتا تھا۔ وہ محاصرے سے پہلے فصیل ''سینٹ رومانس'' کا دروازہ، گولڈن ہارن کی بندرگاہ، اہل قسطنطنیہ کے رسد کے ذرائع اور گولڈن ہارن پر لگی وہ زنجیر دیکھنا چاہتا تھا جو گولڈن ہارن کا راستہ بند کر دیتی تھی۔ وہ ایک دو مرتبہ رومیل سے گولڈن ہارن کی عجوبۂ روزگار زنجیر دیکھنے کی خواہش کا اظہار کر چکا تھا۔ اور پھر ایک روز رومیل اُسے ایک فوجی کشتی میں بٹھا کر گولڈن ہارن کی سیر کرانے لے گیا۔ قاسم نے یہ دیوہیکل آہنی زنجیر دیکھی اور اس کے دونوں سروں کا بغور جائزہ لیا۔ اُسے یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ دورانِ محاصرہ اس زنجیر کو توڑنا ناممکن تھا۔ شاید ''اُربان'' کی توپ کا تیس اِنچ موٹا گولا اس کے ٹکڑے کر دیتا۔ لیکن اس بڑی توپ کو لانا یا نصب کرنا ہی سرے سے ناممکن تھا۔ کیونکہ اربان کی توپیں نقل و حمل کے حوالے سے زیادہ اچھی نہیں تھیں۔ لہٰذا انہیں دورانِ جنگ اِدھر سے اُدھر حرکت دینا ممکن نہ تھا۔ قاسم زنجیر توڑنے کا خیال دل سے نکال کر گھر واپس لوٹ آیا۔ لیکن اُس

نے فیصلہ کیا کہ وہ ایک دو دن میں اب تک حاصل ہونے والی تمام معلومات کی تفصیل
''سلطان محمد خان'' کی جانب روانہ کر دے گا۔ لیکن اس کے لئے اُس کا ''رومیلی حصار
جانا ضروری تھا۔

چنانچہ قاسم نے سلطان کے نام ایک تفصیلی خط لکھا اور انتہائی برق رفتاری سے ''رومیلی
حصار'' کے سفر پر روانہ ہوا۔ اب وہ ''قسطنطنیہ'' کی فوج کا ایک سپاہی تھا لہٰذا اُسے کوئی دِ
نہ تھی۔ وہ گولڈن ہارن کا راستہ چھوڑ کر شہر کے بڑے دروازے ''سینٹ رومانس'' سے خشکی
کے راستے رومیلی حصار کی جانب چلا۔ رومیلی حصار، قسطنطنیہ سے صرف پانچ میل دُور تھا
چنانچہ قاسم علی الصبح روانہ ہوا اور دوپہر سے پہلے واپس آ گیا۔ وہ تفصیلی خط کو ''مصلح الد
آغا'' کے سپرد کر آیا تھا۔

کچھ روز اسی طرح کی مصروفیات میں گزر گئے۔ اس دوران قاسم، بریٹا کے ساتھ ایک
بھائی کی حیثیت سے بہت زیادہ قربت پیدا کر چکا تھا۔ اب تو بریٹا اُٹھتے بیٹھتے قاسم کا
ذکر کیا کرتی تھی۔ اور پھر ایک روز مذاق ہی مذاق میں بریٹا نے قاسم سے کہہ دیا۔

''چھوڑو بھیا! تم تو ایسے بھائی ہو کہ ابھی تک مجھے وہ تحفہ بھی نہیں دکھایا جس کا تم
ذکر کیا تھا اور کہا تھا کہ تم اسے چرچ میں دینا چاہتے ہو۔''

قاسم کو غالباً اسی دن کا انتظار تھا۔ اُس نے فوراً کہا۔ ''ارے میری پیاری بہن!
تحفے کی کیا قیمت۔ میں تو تم پر اپنی جان بھی نثار کر سکتا ہوں۔ لیکن ایک بات ہے، مثلاً
تحفہ جب بھی چرچ کی نذر کروں گا، تو اپنے ہاتھ سے یہ فریضہ ادا کروں گا۔ کیا ایسا نہیں
سکتا کہ ہم لوگ آج کل میں فادر ڈیمونان کو کھانے کی دعوت دیں۔ اگر ایسا ہو جائے
میں اپنا تحفہ بدست خود ان کی نذر کروں گا۔ تم جانتی ہو کہ میں ''آیا صوفیاء'' نہ جانے کا
دے چکا ہوں۔ تم مقدس باپ کو اپنے گھر بلاؤ گی تو ہم اُن سے برکت بھی لے لیں گے
اور انہیں مقدس جنگ کے لئے تحائف بھی نذر کر دیں گے۔''

قاسم کو یہ بات کہتے ہوئے توقع نہ تھی کہ اس طرح ہو جائے گا۔ لیکن وہ بریٹا کا جواب
سن کر ششدر رہ گیا۔

''ارے!..... یہ تو آپ نے بڑے کام کی بات کہہ دی۔ میں خود بہت عرصے سے
سوچ رہی تھی کہ کسی دن مقدس باپ کو اپنی دعوت پر بلاؤں۔ میں نے رومیل کے ساتھ
بات کی تھی۔ لیکن وہ فوجی ہے نا!..... اُسے مذہبی لوگوں کے ساتھ زیادہ دلچسپی نہیں
مورگن! تم تو بہت زیادہ مذہبی آدمی ہو..... ہے نا!''

قاسم کا تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھ چکا تھا۔ وہ دل ہی دل میں بہت خوش ہوا۔ اب وہ
ڈیمونان کو اپنی چالاکی کے ذریعے اُس کے بل سے نکالنے میں کامیاب ہونے والا تھا۔ وہ
جانتا تھا کہ کسی طرح ڈیمونان سے مارسی کی کہانی اُگلوا سکے۔ لیکن یہ بڑا سمجھداری کا کام تھا
اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ پہلے بریٹا کو ذہنی طور پر اچھی طرح تیار کر لیتا۔ چنانچہ
اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ بریٹا کو مارسی کے بارے میں سب کچھ بتا دے گا۔ ظاہر ہے وہ بریٹا
مارسی کے بارے میں صرف یہی کچھ بتا سکتا تھا کہ مارسی نامی ایک لڑکی کبھی اُس کی محبت
تھی جسے ''ڈیمونان'' کسی طرح اُس سے چھین کر لے گیا تھا۔ وہ بریٹا کے سامنے ڈیمونان
کو برا بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اُس نے ایک جھوٹی موٹی کہانی بنانا شروع کر دی۔

دراصل قاسم ''ابوجعفر'' کو مارسی کا پتہ حاصل کرنے کے بعد اپنے انتقام کا نشانہ بنانا
چاہتا تھا۔ وہ آیا صوفیاء کے اس بطریق اعظم ثانی ابوجعفر یا ڈیمونان کو جان سے مار کر اس
کا الزام رومن کیتھولک چرچ والوں پر ڈالنا چاہتا تھا تاکہ دونوں کے درمیان نفرت کی خلیج
حائل ہو سکے۔ چنانچہ وہ سوچنے لگا کہ بریٹا کو کس طرح راستے پر لائے۔ اُس نے مارسی
کی ایک دردناک کہانی گھڑی اور ابھی وہ یہ کہانی بریٹا کو سنانے کے بارے میں سوچ
رہا تھا کہ بریٹا نے سوال کر دیا۔

''لیکن تم نے ابھی تک وہ تحفہ تو دکھایا ہی نہیں۔ آخر وہ ایسی کیا چیز ہے جو تم مجھ سے
چھپا رہے ہو؟''

قاسم کیا کہتا، اُس کے پاس تو کوئی تحفہ تھا ہی نہیں۔ اُس نے بریٹا کو یہ کہہ کر خاموش
کرا دیا۔ ''ہاں ہاں، ضرور دکھاؤں گا۔ لیکن اس سے پہلے میں تمہیں ایک دلچسپ کہانی سنانا
چاہتا ہوں۔ یہ کہانی میری اپنی زندگی کی کہانی ہے۔''

بریٹا ایک دم مسہری پر بیٹھ گئی۔ اور اُس کی آنکھیں دلچسپی سے چمکنے لگیں اور اُس نے
کہا۔ ''اور سناؤ۔ مجھے تمہاری کہانی سن کر بہت خوشی ہو گی۔''

قاسم اپنی گھڑی ہوئی کہانی سنانے سے پہلے ڈیمونان کی دعوت والی بات پکی کر
لینا چاہتا تھا۔ اُس نے بریٹا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''اپنی داستانِ دلپذیر میں تم
تمہیں سناؤں گا۔ آج تم مقدس باپ کو مدعو کرنے کا کام مکمل کر لو۔''

بریٹا اس بات پر راضی ہو گئی اور اُسی روز ''آیا صوفیاء'' جانے کا ارادہ کر لیا۔ جانے
لگی تو قاسم نے اُسے روکا اور کہا۔ ''دیکھو! تم ابھی فی الحال میرا ذکر مقدس باپ کے
سامنے نہ کرنا۔ میں چاہتا ہوں کہ اُن سے بغیر کسی تعارف کے ملوں۔''

بریٹا ایک دم رُک گئی اور حیرت سے قاسم کی جانب دیکھنے لگی۔ ''مورگن کیا بلا ہے؟..... تم آج بہت پراسرار قسم کی باتیں کر رہے ہو۔ پہلے تم نے مجھے تحفہ نہیں دکھایا، پھر مجھے اپنی کہانی سنانا چاہتے تھے وہ بھی نہیں سنائی۔ اور اب تم اپنا نام چھپانے کی بات کر رہے ہو۔ تم مجھے کھل کر بتاؤ! تمہارے دل میں کیا ہے؟ میں ہر طرح سے تمہارے ساتھ تعاون کرنے کے لئے تیار ہوں۔ تم جانتے نہیں کہ میرا کوئی بھائی نہیں ہے۔ میں تمہیں اپنے چھوٹے بھائی جیسا سمجھتی ہوں۔ تمہارے ذکر کے بغیر تو دعوت کی بات میں کشش ہی نہیں رہتی۔ تم چرچ کو قیمتی تحفہ نذر کرنا چاہتے ہو اور اسی بناء پر تو میں مقدس باپ کو دعوت دینے جا رہی ہوں۔''

قاسم بری طرح سٹپٹا گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ بریٹا، ڈیمونان کے ساتھ اُس کا ذکر کسی اجنبی مہمان کی حیثیت سے کرے۔ وہ ابوجعفر کے شاطر ذہن کو جانتا تھا۔ جنگ کے دوران میں کسی شہری کا اجنبی مہمان ابوجعفر جیسے شخص کو کھانے کی دعوت دے..... تو ابوجعفر کو دال میں کچھ کالا بھی نظر آ سکتا تھا۔ چنانچہ قاسم نے بریٹا سے پوچھا۔

''تو پھر..... تم کس حیثیت سے میرا تعارف کرواؤ گی؟''

''اپنے بھائی کی حیثیت سے..... البتہ میں تمہاری شان بڑھانے کے لئے یہ ضرور کہوں گی کہ تم بہت مالدار اور رئیس آدمی ہو۔''

قاسم بریٹا کے سادہ انداز پر مسکرا دیا اور اُسے جانے کی اجازت دے دی۔ اُس نے اپنے ذہن میں جو منصوبہ سوچ رکھا تھا اس پر عمل کا آغاز ہو چکا تھا۔

بریٹا کے آنے سے پہلے اُس کا بیٹا ''سلطان مراد'' آ گیا۔ قاسم بچے کے ساتھ کھیلنے گیا۔ ایک گھنٹے بعد بریٹا لوٹی تو وہ مسکرا رہی تھی۔ قاسم نے اُس کی مسکراہٹ کی وجہ پوچھی تو اُس نے کہا۔

''ہماری دعوت قبول کر لی گئی۔ اور رومیل سے تو میں نے پہلے ہی اجازت لے لی ہے۔ مقدس باپ ہماری دعوت پر کل رات کا کھانا کھانے ہمارے ہاں تشریف لائیں گے۔''

قاسم کو توقع نہ تھی کہ ڈیمونان اتنی جلدی آنے پر تیار ہو جائے گا۔ اُس کا خیال تھا وہ مصروفیات کی وجہ سے کئی دن بعد کا وقت دے گا۔ اب قاسم کو جو کچھ کرنا تھا، جلد کرنا تھا۔ چنانچہ اُس نے اپنے کمرے میں جا کر اپنے سامان میں سے کچھ قیمتی اشرفیاں نکالیں اور ایک تھیلی میں بھر کر بریٹا کے پاس لے آیا اور کہنے لگا۔

''یہ لو بہن!..... مقدس باپ کو دعوت میں نے دی ہے اور اس دعوت پر صرف

رقم بھی میں ہی فراہم کروں گا۔''

قاسم نے بہت کوشش کی کہ بریٹا وہ پیسے رکھ لے لیکن بریٹا نے صاف انکار کر دیا اور بولی۔ ''تم ہمیں شرمندہ نہ کرو۔ میں تمہیں گھر کا فرد اور اپنا بھائی سمجھتی ہوں۔ تم یہ رقم اپنے ہی رکھو۔''

قاسم نے رقم واپس لے لی اور محتاط لہجے میں بریٹا سے کہا۔ ''اب میں تمہیں اپنی کہانی سنانے کے لئے بھی تیار ہوں۔ اگر تم مناسب سمجھو تو میں اپنے دل کا مدعا بیان کروں۔ میری کہانی بے حد دلچسپ بھی ہے اور دردناک بھی.....''

قاسم نے جان بوجھ کر اس قدر تجسس پیدا کیا تھا۔ بریٹا کا بچہ باہر صحن میں کھیل رہا تھا قاسم مکان کے برآمدے میں بریٹا کے ساتھ ایک اونچی چوکی پر بیٹھا تھا۔ قاسم کے لہجے سے بریٹا کی دلچسپی اور بڑھ گئی۔ اُس کا دل دھڑکنے لگا۔ خدا جانے یہ مورگن قاسم کیا سنانے والا تھا۔ بریٹا نے سوچا..... اور اپنی تیوری پر بل چڑھا کر قاسم سے کہنے لگی۔

''ہاں ہاں!..... کیوں نہیں..... تم اتنے تکلف سے کیوں کام لے رہے ہو؟ میں پورے دل اور توجہ سے تمہاری بات سن رہی ہوں۔''

قاسم نے بریٹا کو محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بہن! دراصل بات ہی کچھ ایسی ہے کہ مجھے تمہارے سامنے دہراتے ہوئے لاج آتی ہے۔''

قاسم نے ابھی جھوٹی کہانی سنانے سے پہلے تھوڑا سا شرمانے کی اداکاری کی تو بریٹا کھلکھلا کر ہنس دی۔ ''ارے تم تو شرما رہے ہو۔ ایسی بھی کیا بات ہے؟..... لگتا ہے میرے بھائی کے دل میں کوئی ماہ جبین ڈیرہ جمائے بیٹھی ہے۔''

بریٹا نے قاسم کی توقع کے مطابق بات کی تھی۔ قاسم مزید شرمانے لگا اور لجاتے ہوئے بولا۔ ''تم ٹھیک سمجھی ہو..... واقعی مجھے ایک البانوی لڑکی ماری سے بے حد محبت ہے۔ وہ صرف حسین ہی نہیں، بے حد ذہین اور دانشمند بھی ہے۔ لیکن وہ مجھ سے بچھڑ چکی ہے..... اب تمہیں یہ جان کر حیرت کا جھٹکا لگے گا کہ تمہارے اسی مقدس باپ ڈیمونان نے ماری کو مجھ سے جدا کر دیا ہے۔''

قاسم بات کرتے کرتے رُک گیا۔ کیونکہ بریٹا حیرت سے اُچھل پڑی تھی۔ وہ قدرے اونچی آواز میں بولی۔

''کیا..... تو کیا تم مقدس باپ ڈیمونان کو جانتے ہو؟..... یہ تو غضب ہو گیا۔ میں

تمہیں اُن کے سامنے اپنا بھائی کہہ چکی ہوں۔ اب وہ تم سے ملیں گے اور تمہیں پہچان لیں گے تو میں تمہارے ساتھ کس حیثیت سے اپنا تعارف کراؤں گی؟''

لیکن قاسم نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''بریٹا بہن! گھبراؤ مت!..... تم تو میری کہانی سننے سے پہلے ہی گھبرا گئیں۔ پہلے سن تو لیتی..... ڈیمونان مجھے جانتے ہیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ میری کوئی بہن بھی ہے یا نہیں۔ جو رشتہ تم نے بتایا ہے اُس پر کوئی حرف نہیں آتا۔''

''لیکن اگر تم ڈیمونان کو جانتے تھے تو تم نے مجھے دعوت دینے سے پہلے تک بے خبر کیوں رکھا؟''

''یہی تو میں بتانے جا رہا ہوں۔ شاید تمہیں معلوم ہو کہ بطریق اعظم ثانی ڈیمونان آج سے سات سال پہلے ''ادرنہ''، ''البانیہ'' اور ''بوسنیا'' جیسے علاقوں میں رہ چکے ہیں۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب یہ ''البانیہ'' میں تھے اور میں بھی وہیں تھا۔ وہاں مجھے ایک شاہی کنیز ''مارتھا'' کی بیٹی مارسی سے محبت ہوگئی تھی۔ فادر ڈیمونان نے البانوی بادشاہ ''سکندر بیگ'' کے لئے اُس لڑکی کو مجھ سے حاصل کیا اور اُس کی بے چاری ماں کو قتل کروا دیا۔ لیکن مارسی ''سکندر بیگ'' کے پاس بھی نہ رہی اور لاپتہ ہوگئی۔ تب سے اب تک سات سال گزر گئے ہیں میں اُسے ڈھونڈ رہا ہوں۔ میں قسطنطنیہ بھی درحقیقت اسی لئے آیا ہوں۔ فادر ڈیمونان مجھے اچھی طرح جانتے ہیں اس لئے میں اُن کے سامنے نہیں آنا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے طور پر کسی طرح اُن سے پوچھ گچھ کرو۔ اور مارسی کا پتہ لگانے کی کوشش کرو..... بریٹا! تم میری بہن ہو۔ اور بہنیں بھائیوں کے لئے اس طرح کی قربانیاں تو دیتی ہی ہیں۔''

بریٹا غور سے قاسم کی بات سن رہی تھی۔ بات ختم ہوئی تو وہ چہک کر بولی۔ ''لو!..... کون سی مشکل بات ہے؟ تم تو ایسے ہی منصوبے بناتے رہتے ہو۔ میں سیدھی طرح فادر سے پوچھ لوں گی کہ مارسی کہاں ہے۔ اگر فادر کو پتہ ہوا تو ضرور بتا دیں گے۔''

قاسم، بریٹا کی سادگی پر مسکرا دیا۔ ڈیمونان کے دماغ سے کوئی بات نکلوانا آسان کام نہ تھا۔ چنانچہ قاسم نے بریٹا کو اپنی گھڑی ہوئی جھوٹی کہانی شروع سے لے کر آخر تک سنا دی۔ اُس کی کہانی میں کئی ایسے موڑ بھی تھے جہاں بریٹا کے آنسو نکل آئے۔ کہانی کا پلاٹ تو یہی تھا جو قاسم پہلے بتا چکا تھا۔ البتہ اُس کی جزئیات اور تفصیل بڑی دلچسپ تھی۔ بریٹا پوری توجہ کے ساتھ اُس کی کہانی سنتی رہی۔ قاسم نے اُسے ایسا تاثر دیا کہ اُسے ڈیمونان

کے کردار سے کسی حد تک مشکوک کر دیا۔ اور وہ سنجیدہ لہجے میں کہنے لگی۔

''ٹھیک ہے! میں تمہاری ساری بات سمجھ گئی ہوں۔ اور میں تمہارے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ میں فادر کے سامنے مارسی کا ذکر کس طرح چھیڑوں گی اور اُن سے حقیقت کیسے اُگلواؤں گی..... اور تمہارا کیا ہوگا؟ کیا تم دعوت میں شامل نہیں ہو گے؟ اس طرح تو گڑبڑ ہو جائے گی۔''

بریٹا کے سوالات معقول تھے۔ چنانچہ قاسم نے اُسے جواب دیا۔ ''بریٹا بہن! تم پریشان کیوں ہوتی ہو؟ میں ڈیمونان سے صرف اتنی دیر چھپا رہنا چاہتا ہوں جب تک تم اُن سے مارسی کی بابت اُگلوا نہیں لیتیں۔ جونہی وہ مارسی کے بارے میں بتا دیں گے، میں سامنے آجاؤں گا۔ اور پھر دعوت میں بھی شرکت کروں گا اور اپنا خاص تحفہ بھی چرچ کی نذر کروں گا۔ مجھے یقین ہے کہ اُس وقت تم سب لوگ میرا تحفہ دیکھ کر حیران رہ جاؤ گے۔ رہ گئی یہ بات کہ تم فادر ڈیمونان کے ساتھ مارسی کا ذکر کیسے چھیڑو گی..... تو یہ لو!''

گفتگو کا یہی وہ مقام تھا جس کا انتظار قاسم کافی دیر سے کر رہا تھا۔ اور اسی خیال کو ذہن میں رکھ کر اُس نے ڈیمونان کی دعوت کا سارا منصوبہ بنایا تھا۔ اب قاسم نے اپنے ہاتھ کے اندر ہاتھ ڈالا، اور جب نکالا تو اُس کے ہاتھ میں ایک خوبصورت انگوٹھی تھی جس کے سبز دھاری دار پتھر میں صلیب کا نشان کھدا ہوا تھا..... یہ وہ انگوٹھی تھی جو مارتھا نے اپنی بیٹی مارسی کو دی تھی اور مارسی نے اپنی ماں کی یہ نشانی آخری ملاقاتوں میں قاسم کے حوالے کر دی تھی۔ قاسم نے وہ انگوٹھی بریٹا کو تھمائی اور پُرتجسس لہجے میں کہا۔

''بریٹا بہن! یہ انگوٹھی مارسی نے مجھے دی تھی۔ یہ اُس کی ماں ''مارتھا'' کی انگوٹھی ہے۔ اسے تم پہن لو۔ کل جب تم فادر ڈیمونان کے سامنے جاؤ گی تو اس انگوٹھی کو دیکھ کر وہ ضرور چونکیں گے اور تم سے اس انگوٹھی کی بابت لازمی طور پر دریافت کریں گے۔ تم اچھی طرح اطمینان کر لو کہ تمہیں اس انگوٹھی کے بارے میں کیا بتانا ہے۔''

قاسم نے بات روک دی تو بریٹا نے پُرتجسس لہجے میں پوچھا۔ ''ہاں بتاؤ..... مجھے اس انگوٹھی سے متعلق فادر ڈیمونان کے سامنے کیا کہنا ہے؟''

اب قاسم نے بریٹا سے کہنا شروع کیا۔ ''تم نے فادر ڈیمونان سے کہنا ہے کہ تم نے یہ انگوٹھی قسطنطنیہ کے بازار سے خریدی ہے..... جب فادر کو یہ پتہ چلے گا کہ تمہاری نظر میں یہ انگوٹھی معمولی ہے اور تم اس کی کہانی سے بالکل بے خبر ہو تو مجھے یقین ہے کہ وہ تم سے انگوٹھی مانگ لیں گے..... تم بے شک انہیں انگوٹھی دے دینا۔ اس طرح اول تو وہ خود ہی

تمہیں ماری کے بارے میں بتا دیں گے۔ اور اگر انہوں نے نہ بھی بتایا تو بھی ہمارا کوئی نقصان نہیں۔ کیونکہ اگر ماری زندہ ہے اور فادر ڈیمونان اس کے بارے میں جانتے ہیں تو یہ انگوٹھی وہ ماری تک ضرور پہنچائیں گے۔ اس طرح ماری کو خود بخود پتہ چل جائے گا کہ انگوٹھی کہاں سے چل کر آئی ہے اور کس طرح اس تک پہنچی ہے..... اور اگر تم چاہو تو انگوٹھی دینے سے پہلے فادر پر یہ شرط عائد کر سکتی ہو کہ وہ تمہیں اس انگوٹھی کے بارے میں بتائیں۔ سیدھی سی بات ہے..... نہ زیادہ پیچیدہ اور نہ مشکل..... کیا تم اس طرح کر سکو گی؟ مجھے یقین ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ ضرور بتائیں گے۔ جسے میں ساتھ کے دریچے سے سننے کی کوشش کروں گا..... یا بعد میں تم سے پوچھ لوں گا۔''

قاسم جانتا تھا کہ ڈیمونان جو بچپن سے ماری کے گھر آتا جاتا تھا اور مارتھا کے ساتھ بہت گہرا تعلق رکھتا تھا، لازماً مارتھا کی انگوٹھی کو پہچان لے گا۔ اور جب بریٹا اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے سادہ سے انداز میں اُسے بتائے گی کہ اُس نے یہ انگوٹھی بازار سے خریدی ہے تو وہ حیران رہ جائے گا۔ اور اگر ابھی تک ماری کے ساتھ اُس کا تعلق قائم ہے تو یقیناً یہ انگوٹھی ماری کو دکھانے کی غرض سے حاصل کرنا چاہے گا۔ اور یہی وہ وقت ہوگا جب بریٹا اُس سے ماری کی حقیقت اُگلوا سکے گی۔ اب بریٹا اس قضیے میں گہری دلچسپی لے رہی تھی۔ وہ مکمل لائحۂ عمل سمجھ گئی اور قاسم کے ساتھ بھرپور تعاون کرنے کے لئے تیار ہو گئی۔

اگلے روز رات تک قاسم نے بڑی مشکل سے وقت کاٹا۔ رومیل آج اپنے گھر پر ہونے والی دعوت کی وجہ سے جلد گھر آ گیا تھا۔ ڈیمونان کے لئے بریٹا نے عمدہ سے عمدہ کھانے بنائے اور مقدس باپ کے استقبال میں اپنے گھر کو خوب سنوارا اور سجا سنورا کیا۔ اُس نے ڈیمونان کے بیٹھنے کا اہتمام اُس کمرے میں کیا جس کے ساتھ والے کمرے سے ڈیمونان کی باتیں سنی جا سکتی تھیں۔ کیونکہ درمیانی دیوار میں ایک چوبی دروازہ تھا۔ اُس نے قاسم کو اُس دروازے کے بارے میں بتا دیا۔ قاسم کو اطمینان ہوا کہ بریٹا اُس کے ساتھ بھرپور تعاون کر رہی ہے۔

سورج غروب ہونے سے کچھ دیر پہلے قاسم کسی کو کچھ بتائے بغیر رومیل کے گھر سے نکل گیا اور کسی قدر فاصلے پر گلی کی نکڑ پر لگے ''پام کھجور'' کے درخت کے نزدیک ہو کر گم ہو گیا۔ وہ یہاں بوقت ضرورت پام کے موٹے تنے کی اوٹ سے ڈیمونان کو آتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔ گلی کی نکڑ پر اُس کے کھڑے ہونے کا انداز بالکل عام سا تھا۔

گھر میں رومیل نے بریٹا سے پوچھا۔ ''ارے!..... یہ مورگن کہاں چلا گیا؟ ابھی تو

یہیں تھا۔''

''وہ کچھ ضروری سامان لینے کے لئے گیا ہے۔ ابھی آ جاتا ہے۔''

بریٹا جانتی تھی کہ قاسم کس لئے چلا گیا ہے۔ بریٹا نے خود بھی ڈیمونان کے آنے سے پہلے نہا دھو کر نیا لباس پہنا۔ اور دائیں ہاتھ کی اُنگلی میں ماری کی انگوٹھی بھی پہن لی۔ وہ تیار ہو کر کمرے میں آئی تو رومیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''زہے نصیب!..... آج تو مقدس باپ کی بدولت ہمیں بھی تمہارے جلوے دیکھنے کو مل رہے ہیں۔''

بریٹا کھلکھلا کر ہنس دی۔ لیکن رومیل نے اُس کی اُنگلی میں انگوٹھی دیکھ کر ایک بار پھر پوچھا۔ ''ارے یہ کیا؟ یہ اتنی خوبصورت انگوٹھی کہاں سے حاصل کی تم نے؟..... خریدی ہے کیا؟''

بریٹا نے فوراً اپنی انگوٹھی کو دوسرے ہاتھ سے ٹٹولتے ہوئے جواب دیا۔ ''جی ہاں! مناسب قیمت میں مل رہی تھی۔ میں نے اس کی خوبصورتی دیکھ کر خرید لیا۔''

آج بریٹا اور رومیل کا بیٹا سلطان مراد بھی پرستان کا ننھا سا شہزادہ دکھائی دے رہا تھا۔ بریٹا نے ڈیمونان کے لئے بہت سے کھانے بنائے تھے۔ ان میں بکری کی ران، مرغابی اور مارخور کے گوشت کے علاوہ اُبلے ہوئے چاول اور خمیری روٹی شامل تھی۔

سورج غروب ہونے سے کچھ دیر بعد ''آیا صوفیاء'' کی سفید پردوں والی مخصوص بگھی رومیل کے گھر کے سامنے آ کر رُکی۔ ابھی اندھیرا نہ چھایا تھا۔ قاسم نے پام کے پیچھے سے بگھی سے اُترنے والے مہمانوں کا جائزہ لیا۔ سب سے پہلے دو نوجوان راہبائیں بگھی سے باہر آئیں۔ اور اُن کے پیچھے جس شخص نے بگھی سے باہر قدم رکھا اُسے دیکھ کر قاسم کی تمام حسیات سمٹ گئیں۔ قاسم کے رگ و پے میں ایک دم سے غصے اور انتقام کی شدید لہر دوڑ گئی۔ اُس کے سامنے اُس کا پرانا دشمن ابوجعفر موجود تھا۔ وہ چاہتا تو آگے بڑھ کر ابوجعفر کی جان لے سکتا تھا۔ لیکن اُس نے صبر سے کام لیا۔

ابوجعفر بطریق کے بھاری بھرکم لباس میں تھا۔ یہ آیا صوفیاء کا مخصوص لباس تھا۔ ابوجعفر کے ساتھ آنے والی نوجوان راہبائیں بھی اپنے مخصوص سفید لباس میں تھیں۔ انہوں نے گلے میں سرخ رنگ کے سکارف باندھ رکھے تھے اور اُن کی چال ڈھال سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابوجعفر کے ساتھ کام کرنے والی اُس کی خاص الخاص راہبائیں ہیں۔ یہ لوگ اندر چلے گئے۔ چرچ کی مخصوص بگھی رومیل کے مکان کے سامنے کھڑی تھی، بگھی کے کوچوان

نے چند قدم آگے بڑھ کر ایک کھلی جگہ اس بگھی کو کھڑا کر دیا اور اپنی نشست کے پیچھے سے سبز چارا نکال کر گھوڑوں کے آگے ڈال دیا۔ بگھی میں دو صحت مند گھوڑے جتے ہوئے تھے۔

وہ لوگ اندر چلے گئے۔ اور انہیں گئے ہوئے جب خاصی دیر گزر گئی تو قاسم اس اطمینان کے ساتھ پام کے پیچھے سے نکلا کہ بگھی کا کوچوان اسے دیکھے تو ایک عام راہگیر سمجھے۔ قاسم بے پرواہی کے ساتھ چلتا ہوا رومیل کے دروازے کے سامنے آیا اور پھر تیزی سے ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔ ڈیوڑھی کی مشعل ابھی روشن نہ کی گئی تھی۔ قاسم ایک کونے میں سمٹ کر اندر کا جائزہ لینے لگا۔ تمام لوگ نشست کے کمرے میں تھے۔ قاسم بڑے آرام سے چلتا ہوا ساتھ کے کمرے میں آ کر دروازے کے نزدیک چھپ گیا۔ یہاں بھی مشعل روشن نہ تھی۔ البتہ مہمانوں کا کمرہ تین چار مشعلوں کی وجہ سے روشن کر دیا گیا تھا۔ یہاں سے مہمانوں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

قاسم دروازے کی ایک جھری سے انہیں دیکھ بھی سکتا تھا۔ نشست کے کمرے میں ڈیمونان، اُس کی راہبائیں، رومیل اور بریٹا موجود تھے۔ سولٹن کے ہاتھ میں پھولوں کا ایک چھوٹا سا گلدستہ تھا جسے تھوڑی دیر بعد اُس نے مقدس باپ کی خدمت میں پیش کر کے بہت سا پیار لے لیا۔ قاسم کو یہ دیکھ کر تسلی ہوئی کہ بریٹا بالکل پریشان نہ تھی۔ خصوصاً اُس وقت جب ڈیمونان نے پوچھا۔

"ارے بھائی! ہماری بچی بریٹا کے وہ دولت مند اور رئیس بھائی کہاں ہیں، جو مقدس جنگ کے لئے ہمارے چرچ کو تحفہ نذر کرنا چاہتے تھے اور جن کے لئے ہم نے آپ کی دعوت قبول کی۔"

رومیل نے جلدی سے جواب دیا۔ "مقدس باپ! مورگن بریٹا کا چھوٹا بھائی ہے۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ آپ کو آتے آتے کافی دیر ہو جائے گی۔ اسی لئے وہ تھوڑا سا سامان خریدنے کی غرض سے بازار کی جانب نکل گیا۔ لیکن آپ تو جلد آ گئے۔ اس لئے ہم اب مورگن کی عدم موجودگی پر شرمندہ ہو رہے ہیں۔"

"نہیں بچو!..... تمہیں شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں..... کوئی بات نہیں، ہم اُن کا انتظار کر لیتے ہیں۔"

ڈیمونان جس وقت یہ بات کر رہا تھا، بریٹا جان بوجھ کر اپنی اُنگلی میں مارسی کی انگوٹھی گھمانا شروع ہو گئی۔ وہ بظاہر یہ سب کچھ غیر ارادی طور پر کر رہی ہے۔ ڈیمونان کی نظر فوراً مارسی کی انگوٹھی پر جا پڑی۔ لیکن پہلے پہل اُسے کچھ محسوس نہ ہوا۔ بریٹا، ڈیمونان کے

احترام سے بیٹھی تھی اور ایک غیر ارادی حرکت کے طور پر اپنی اُنگلی میں انگوٹھی کو مسل گھما رہی تھی۔ قاسم نے دل ہی دل میں بریٹا کو داد دی۔ اور کچھ دیر بعد وہی ہوا۔

انگوٹھی کو بار بار دیکھنے کی وجہ سے ڈیمونان کے ذہن میں یادوں کے کیڑے رینگنے لگے..... پھر ایک دم اُس کے دماغ میں جھماکہ سا ہوا اور اُسے مارتھا کی انگوٹھی یاد آ گئی..... ارے یہ تو وہی انگوٹھی ہے جو البانوی کنیز مارتھا ہر وقت پہنے رکھتی تھی..... اُسے جیسے ہی عہد کی یہ بات یاد آئی، اُس کے دماغ میں چکی چلنے لگی۔ اور اُسے حیرت کے جھٹکے لگنے شروع ہو گئے۔ اُس نے سوچا مارتھا کی انگوٹھی بریٹا کے ہاتھ کیسے لگ گئی؟ اُس کا شاطر ذہن ایک دم چوکنا ہو گیا۔ وہ بریٹا کی اس پُرخلوص دعوت کو دُوہری نظر سے دیکھنے لگا۔ اور اُس سے رہا نہ گیا۔ اُس نے بالآخر بریٹا سے پوچھ ہی لیا۔

"عزیز بیٹی!..... ہم دیکھ رہے ہیں کہ تم اپنے ہاتھ کی انگوٹھی کے ساتھ مسلسل کھیل رہی ہو۔ ہمیں لگتا ہے تمہیں یہ انگوٹھی بہت عزیز ہے۔"

ڈیمونان کے پوچھنے کا انداز اُس کی عیار ذہنیت کا غماز تھا۔ بریٹا اپنی کوشش میں کامیاب رہی تھی۔ ڈیمونان، مارسی کی انگوٹھی کو پہچان چکا تھا۔ بریٹا نے ڈیمونان کی بات کا جواب بالکل عام سے اور معمولی انداز میں دیا۔

"مقدس باپ!..... مجھے یہ انگوٹھی خریدے ابھی چند دن ہی گزرے ہیں۔ میری اُنگلی ذرا سی تنگ ہے، اس لئے کسی کسی وقت بے دھیانی میں، میں اسے صحیح کرنے لگ جاتی ہوں..... میں اس حرکت پر معذرت خواہ ہوں۔"

اب بریٹا نے انگوٹھی کو گھمانا چھوڑ دیا اور ڈیمونان کے ساتھ آئی ہوئی راہباؤں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ لیکن ڈیمونان کا ذہن پوری شدت سے مارسی کی انگوٹھی میں اُلجھا ہوا تھا۔ بریٹا نے خریدنے کی بات کی تو ابوجعفر کے تمام غیر ضروری شکوک دُور ہو گئے۔ لیکن وہ سوچ رہا تھا کہ یہ انگوٹھی قسطنطنیہ کیسے پہنچ گئی؟ اور بریٹا کے ہاتھ کیسے لگ گئی؟ اُسے سب کچھ بھول گیا اور صرف سات سال پہلے کے واقعات یاد رہ گئے۔ بریٹا نوجوان راہباؤں کے ساتھ بات کر رہی تھی کہ ڈیمونان نے بریٹا سے پھر سوال کیا۔

"بیٹی، ہم اگر تم سے کچھ مانگیں..... تو کیا ہمیں عنایت کر دو گی؟"

رومیل، ڈیمونان کی بات سے بری طرح چونکا اور بریٹا کی انگوٹھی کو غور سے دیکھنے لگا۔ بریٹا نے بڑے سلیقے سے ڈیمونان کی بات کا جواب دیا۔

"کیوں نہیں! مقدس جنگ کے لئے تو میں اپنی جان بھی دے سکتی ہوں..... آپ حکم

کیجئے۔"

"ہمیں مقدس جنگ کے لئے نہیں، اپنے لئے کچھ درکار ہے۔"

رومیل کو اب پہلے سے بھی زیادہ حیرت ہوئی۔ وہ سوچنے لگا کہ آسمانی باپ کو تو دنیا کی کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی۔ پھر یہ بشپ کون سی چیز مانگ رہا ہے۔ اسی اثناء میں اس نے بھی وہی بات کی۔

"مقدس باپ!..... جو ہم انسانوں کے لئے آسمانی باپ ہوتا ہے۔ اپنے دنیاوی بھائی سے کیا طلب کر رہا ہے؟ یہ جاننے کے لئے میں بے تاب ہوں۔"

ڈیمونان ایک مرتبہ تو سٹپٹا گیا۔ بریٹا نے بات ہی ایسی کی تھی۔ یہ تو سچ تھا کہ ایک راہب جسے دنیاوی علائق سے کچھ غرض نہ تھی، وہ بریٹا سے کیا چاہتا تھا۔ وہ بریٹا سے انگوٹھی مانگتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ یہ نسوانی اُنگلی کے لئے بنائی گئی ایک چھوٹے قطر کی انگوٹھی تھی۔ سوچنے کی بات تھی کہ ایک مرد راہب کو اس کے ساتھ کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ حالانکہ راہب تو ایک طرف، چرچ کی راہبائیں بھی زیورات نہ پہنتی تھیں۔ اور پھر اُس کے لئے مارسی کی انگوٹھی مانگنے کا یہ جواز بھی تو نہیں تھا کہ وہ دفاعی خزانے کے لئے چندہ مانگ رہا ہے۔ کیونکہ ایک تو وہ خود کہہ چکا تھا کہ اُسے بریٹا سے کوئی چیز اپنے لئے چاہئے۔ دوسرے یہ انگوٹھی اتنی قیمتی نہ تھی کہ دفاعی چندے کے لئے مانگی جاتی۔ وہ سوچنے لگا انگوٹھی کی بات کس طرح کرے؟ اور کچھ دیر بعد اُس نے ایک لمبی سانس لے کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"دراصل آپ کی یہ انگوٹھی میرے لئے دلچسپی کا باعث ہے۔ پہلے آپ یہ بتائیے کہ آپ نے کہاں سے خریدی؟"

رومیل مسلسل حیرت کا شکار ہو رہا تھا۔ اُس نے بریٹا کی جانب استفہامی نظروں سے دیکھا تو بریٹا گھبرا گئی..... وہ کیا بتاتی کہ اُس نے یہ انگوٹھی کہاں سے خریدی ہے۔ لیکن اُس نے اپنی پریشانی ظاہر نہ ہونے دی اور فوراً کہا۔ "یہ انگوٹھی میں نے گزشتہ کرسمس پر فرانس کے سوداگروں کی ایک دُکان سے خریدی تھی۔ اس میں کیا راز ہے مقدس باپ؟"

"اس میں خاص بات یہ ہے کہ یہ انگوٹھی خداوند یسوع مسیح کی ایک سچی خادمہ کی تھی جو یسوع مسیح کے دین پر قربان ہو گئی..... یعنی شہید ہو گئی..... اُس کا نام مارتھا تھا۔ اُس کی ایک بیٹی بھی تھی۔"

ڈیمونان اتنا کہہ کر یکدم خاموش ہو گیا اور قاسم کی سانس سینے میں اٹکنے لگی۔

چاہتا تھا کہ ڈیمونان جلدی کے ساتھ مارسی کے بارے میں سب کچھ بتا دے۔ وہ بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔ اُدھر بریٹا بھی بے چین تھی۔ کیونکہ ڈیمونان، مارسی کے بارے میں بتاتے بتاتے رُک گیا تھا۔ بالآخر بریٹا کو خود ہی بولنا پڑا اور اُس نے کہا۔

"مقدس باپ!..... مجھے تو معلوم ہی نہ تھا کہ یہ انگوٹھی اتنی عظیم ہو سکتی ہے۔ مقدس باپ! میں یہ انگوٹھی آپ کی نذر کرنے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن آپ دین مسیح پر قربان ہونے والی "مارتھا" کے بارے میں بتاتے بتاتے رُک کیوں گئے ہیں؟ میں بھی یسوع کی داسی ہوں۔ آپ مجھے اُس عظیم خاتون "مارتھا" اور اُس کی بیٹی کی بابت ضرور بتایئے!"

ڈیمونان، بریٹا کی بات سنتے ہوئے گہری نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں مکارانہ چمک عود آئی تھی۔ نہ جانے وہ کیا سوچنے لگا تھا۔ لیکن پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد ڈیمونان نے ایک طویل سانس لی اور کہنے لگا۔

"اُس کی بیٹی مارسی اپنی ماں کی طرح دین عیسوی کی سچی خادمہ ہے۔ اور "آیا صوفیاء" کی مقدس راہبہ ہے۔ میں اسی راہبہ کو تحفہ دینے کے لئے آپ سے انگوٹھی لینا چاہتا ہوں۔"

ڈیمونان نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ اور اُس کی بات سن کر بریٹا کے ساتھ رومیل بھی چونک اُٹھا۔ بریٹا نے حیرت بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

"کیا؟؟ آیا صوفیاء کی مقدس راہبہ؟..... کیا نام ہے اُن کا؟..... مقدس باپ! میں اُس عظیم ماں کی عظیم بیٹی کی زیارت کرنا چاہتی ہوں۔"

"سسٹر میری!..... اُن کا نام سسٹر میری ہے۔ گزشتہ سات سال سے مارسی آیا صوفیاء میں راہبہ کے فرائض سرانجام دے رہی ہے۔ یہاں اُسے مارسی کے نام سے کوئی نہیں جانتا۔ یہاں سب اُسے "سسٹر" کہہ کر پکارتے ہیں..... صرف چند پرانے لوگوں کو اُس کا اصل نام معلوم ہے۔ چرچ کی دوسری راہبائیں اُسے "سسٹر میری" کہہ کر پکارتی ہیں۔ یہ اُس کا مذہبی نام ہے۔"

ڈیمونان کی بات ختم ہوتے ہی بریٹا نے جذبات سے لبریز لہجے میں کہا۔ "اوہ!..... بے چاری سسٹر میری!..... میں یہ انگوٹھی ضرور اُن کی خدمت کے لئے پیش کروں گی۔"

اب ڈیمونان کے ساتھ آئی ہوئی راہباؤں کے چہروں پر بھی حیرت و استعجاب کا نقش تھا۔ بریٹا نے اس گفتگو کے دوران اپنی انگلی سے مارسی کی انگوٹھی اتار لی تھی اور اب وہ اس کے ہاتھ میں تھی۔ بریٹا نے اُٹھ کر انتہائی احترام کے ساتھ مارسی کی انگوٹھی ڈیمونان کی خدمت میں پیش کر دی۔ ڈیمونان نے کسی قدر پُرجوش انداز میں مارتھا کی اس یادگار انگوٹھی

کو تھام لیا۔

کچھ دیر کے لئے کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ پھر ڈیمونان بولا اور اُس نے دھیرے دھیرے مارتھا اور مارسی کی کہانی بریٹا کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ سنانی شروع کر دی۔ یہی وہ نازک وقت تھا جب قاسم ساتھ والے کمرے میں موجود نہ تھا۔ وہ تو مارسی کا سرمیری کی حیثیت سے ذکر سنتے ہی وہاں سے اُٹھ گیا۔ اُس کے کانوں میں جونہی مارسی کے زندہ سلامت قسطنطنیہ میں داخل ہونے کی خبر پہنچی، اُس کے بدن پر جوش کی وجہ سے ہلکی سی کپکپی طاری ہوگئی۔

محبوب سے بچھڑنے کا دُکھ آج ایک دم سے جوان ہو گیا تھا۔ وہ مارسی سے والہانہ محبت کرتا تھا۔ اُس کے تو تصور میں بھی نہ تھا کہ مارسی قسطنطنیہ میں ہوگی۔ وہ تو یہ سمجھ رہا تھا کہ آج سے سات سال پہلے جب مارسی ''البانیہ'' لے جائی گئی تو وہیں کہیں گم ہوگئی۔ یہ سن کر کہ مارسی قسطنطنیہ کے چرچ آیا صوفیاء میں ہے قاسم کے بدن کا ایک ایک بال کھڑا ہو گیا..... وہ اپنی مارسی سے مل سکے گا۔ وہ اپنی مارسی کو دیکھ سکے گا..... مارسی اُس سے مل کر کیسا محسوس کرے گی۔ ان دردناک سوالات کی لذت نے اُسے سرشار کر دیا۔ اب اُسے ساتھ والے کمرے میں چھپنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ تیزی سے اٹھا اور انتہائی احتیاط کے ساتھ نہ صرف کمرے سے بلکہ مکان سے نکلتا چلا گیا۔ اب اُسے اپنا اگلا قدم اٹھانا تھا اور اُس کا اگلا قدم ابھی تھوڑی دیر میں ظاہر ہونے والا تھا۔

اُدھر کمرے میں وہ نازک لمحہ آ چکا تھا جس نے بریٹا کے سامنے قاسم کی ساری قلعی کھول کے رکھ دی۔ قاسم تو جا چکا تھا لیکن اب مارسی کی اصل کہانی سن کر بریٹا کے قدموں تلے سے زمین سرکتی جا رہی تھی۔ قاسم نے اتنی لمبی چوڑی منصوبہ بندی کے دوران یہ سامنے کی بات نظر انداز کر دی کہ ڈیمونان جب بریٹا کو مارسی کی اصل کہانی سنائے گا تو قاسم کا پول خود بخود کھل جائے گا۔ اور اب تو بریٹا کہانی سن چکی تھی۔ اتنے بڑے راز کا انکشاف ہونے پر اُس کا بدن لرزنے لگا اور اُس کا سر چکرانے لگا۔ وہ ڈیمونان کی زبانی سن چکی تھی کہ مارسی کس طرح قاسم بن ہشام نامی ایک مسلمان نوجوان کے دامِ فریب میں جکڑی گئی تھی۔ ڈیمونان نے یہ بھی بتایا تھا کہ پہلے پہل تو وہ مارسی کو اغواء کر کے لایا تھا۔ البتہ اُس نے بہت سی باتیں چھپا بھی لی تھیں۔ مثلاً اُس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ ''ادرنہ'' میں اُس وقت تک ابوجعفر بن کر رہ رہا تھا۔ اور نہ ہی اُس نے بتایا کہ ''مارتھا'' کو تو اُس نے خود قتل کر کے راستے سے ہٹا دیا تھا۔ ڈیمونان نے اپنے آپ کو ''ادرنہ'' میں ایک پادری کے طور

ظاہر کیا اور اُسے بتایا کہ وہ اس وقت ''ادرنہ'' میں موجود زمیوں یعنی باجگزار عیسائیوں کا پادری تھا۔

ابھی بریٹا یہ سوچ ہی رہی تھی کہ وہ ان لوگوں کے سامنے مورگن کا پول کھولے یا نہ کھولے، اسی اثناء میں مکان کے دروازے پر دستک ہوئی۔ کمرے میں موجود سب لوگ چونک اُٹھے۔ ڈیمونان نے حیرت سے کہا۔

''کیا آپ کے بھائی گھر میں دستک دے کر آتے ہیں؟''

اس سوال پر بریٹا اور رومیل دونوں سٹپٹا گئے۔ رومیل یکلخت اُٹھا اور مکان کے دروازے پر یہ دیکھنے کے لئے چلا گیا کہ کون آیا ہے؟ بریٹا ابھی تک مخمصے میں پھنسی ہوئی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ساتھ والے کمرے میں تو مورگن چھپا بیٹھا ہے اور ادھر اس کا سارا پول کھل چکا ہے۔ اس نے سوچا کہ کہیں ایسا نہ ہو..... مورگن پول کھل جانے کے ڈر سے نکل جائے۔ اُسے بے حد دُکھ بھی ہو رہا تھا کہ مورگن نے اُسے بہن بنا کر دھوکہ دیا تھا اور اُسے جھوٹ بول کر استعمال کیا تھا۔ بریٹا خون کے گھونٹ پی کے رہ گئی۔ لیکن اُسے منہ سے کچھ بولنے کی ہمت نہ ہوئی۔ کچھ دیر بعد رومیل لوٹ آیا جس کے ہاتھ میں ایک نیلے رنگ کا چرمی لفافہ تھا۔ یہ بازنطینی دربار کا مخصوص لفافہ تھا جو پیغامات کی ترسیل کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ ڈیمونان چرمی لفافہ دیکھ کر چونکا اور فی الفور رومیل سے سوال کیا۔

''یہ کیا ہے؟..... یہ تو شہنشاہی پیغام لگتا ہے..... کون لایا ہے؟''

ڈیمونان بے صبرا ہونے لگا۔ رومیل نے لفافہ ڈیمونان کی طرف بڑھا دیا اور کہا۔

''آپ کے کوچوان کو کوئی سپاہی دے گیا ہے۔''

ڈیمونان کے لئے اس طرح کا اتفاق پہلی مرتبہ ہو رہا تھا کہ شہنشاہ نے اُسے قسطنطنیہ سے شاہی مخصوص چرمی لفافہ بھیجا تھا۔ اُسے بے حد حیرت ہو رہی تھی۔ کیونکہ اس طرح کے لفافے تو قسطنطنیہ کے دربار سے آج سے سات سال پہلے اُس کے پاس ''ادرنہ'' آیا کرتے تھے۔ اُس نے عجلت سے لفافہ کھولا اور اُس میں تہہ کئے رکھا ہوا چرمی کاغذ نکال کر اُسی سے پڑھنے لگا۔ یہ واقعی شہنشاہی پیغام تھا۔ مُہر اگرچہ قدرے پرانی تھی لیکن خط کے آخر پر اصل مُہر بھی لگائی گئی تھی۔ کاغذ حیوانی جھلی سے بنا تھا اور اُس پر سیاہ روشنائی سے سطریں تحریر کی گئی تھیں۔ ڈیمونان تیزی کے ساتھ پڑھنے لگا۔ لکھا تھا۔

''مقدس باپ ڈیمونان!

یہ شہنشاہی پیغام ہے کہ آپ ابھی اور اسی وقت شہنشاہِ قسطنطنیہ

قیصرِ قسطنطین کی خدمت میں حاضر ہوں۔ انتہائی اہم اور خفیہ مسئلے پر آپ کو طلب کیا جا رہا ہے۔ فقط..... شہنشاہ قسطنطین۔"

ڈیمونان کا دماغ حیرت کی شدت سے سنسنا رہا تھا..... آج تک ایسا نہ ہوا تھا۔ اول شہنشاہ کا قاصد ڈیمونان سے ملے بغیر واپس نہ لوٹتا تھا۔ اور پھر اس طرح شہنشاہ نے اسے پہلے کبھی بلایا بھی تو نہ تھا۔ لیکن چرمی لفافہ اور شہنشاہ کی مُہر بتا رہی تھی کہ مکتوب سچا ہے۔ ڈیمونان نے ایک لمحے کی دیر مناسب نہ سمجھی اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے کھانے کے لئے رومیل اور بریٹا سے معذرت کی اور شہنشاہی پیغام کا عذر پیش کر کے اُن دونوں سے اجازت لی اور اپنی راہباؤں کو ساتھ لئے شہنشاہ کے محل کی جانب چل کھڑا ہوا۔

شام کب کی ڈھل چکی تھی۔ رات کب کی شروع ہو چکی تھی، جب ڈیمونان اپنی راہباؤں سمیت رومیل کے گھر سے نکلا تو گلی میں مکمل اندھیرا تھا۔ کوچوان کلیسا کی بگھی کو دروازے کے سامنے لئے تیار کھڑا تھا۔ ڈیمونان نے کوچوان کی مستعدی کی داد دل ہی دل میں داد دی اور کوچوان سے کچھ کہے بغیر بگھی کا عقبی پردہ اٹھا کر بگھی میں سوار ہو گیا۔ راہبائیں بھی اُس کے ساتھ ہی سوار ہوئیں۔ ڈیمونان نے بیٹھتے ہی کوچوان کو بآواز بلند ہدایت کی۔

"قصرِ شہنشاہی کی جانب چلو!"

بگھی قسطنطنیہ کی سڑکوں پر دوڑنے لگی۔ ڈیمونان آج ضرورت سے زیادہ بے چین تھا۔ اُس کی چھٹی حس آج شروع ہی سے اُسے خبردار کر رہی تھی کہ کچھ ہونے والا ہے اور اب مارسی کی انگوٹھی اور شہنشاہ کے خط کے بعد تو وہ اور بھی زیادہ بے چین ہو گیا تھا۔ اُسے کچھ سمجھ نہ آ رہی تھی کہ اُس کی چھٹی حس کس قسم کے خدشات کی نشاندہی کر رہی تھی۔

اچانک اُسے محسوس ہوا کہ اُس کی با پردہ بگھی کسی سنسان سڑک پر دوڑ رہی ہے۔ یکلخت اُس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ کیا؟..... کوچوان اُسے کہاں لے آیا تھا۔ یہ سڑک شاہی محل کی طرف تو نہ جاتی تھی۔ یہ سڑک تو شہر کی ایشیائی سمت جس طرف آباد باسفورس کا تنگ ساحل تھا، کی جانب جاتی تھی۔ اس طرف سے قسطنطنیہ کو کوئی خطرہ نہ تھا۔ اسے شہر کی عقبی سمت بھی کہا جا سکتا تھا۔ کیونکہ اس طرف کی فصیل میں کوئی دروازہ نہ تھا۔ فصیل بھی کمزور اور چھوٹے قد کی تھی۔ عقبی فصیل بعض جگہ سے تو سمندر کے اس قدر نزدیک تھی کہ سمندر کا پانی دیوار کو چھونے لگتا تھا۔

ڈیمونان کی بگھی ہوا سے باتیں کرتی ہوئی اسی سمت میں جا رہی تھی۔ ڈیمونان

بہت خطا ہو گئے۔ اور اب اُسے محسوس ہونے لگا کہ اُس کی چھٹی حس کس قسم کے خدشات کی نشاندہی کر رہی تھی۔ اُس نے مضطرب ہو کر بگھی کے کوچوان کو آوازیں دینا شروع کر دیں..... کوچوان!..... کوچوان!..... کوچوان!"

لیکن کوچوان ہوتا تو سنتا۔ کوچوان تو اس وقت دنیا میں ہی نہیں تھا۔ اُس کی لاش نئے کوچوان کے قدموں میں پڑی تھی۔

اب ڈیمونان نے کوچوان کو پکارنا بند کر دیا اور اپنا خنجر نکال لیا۔ اُس کے پاس تلوار تو نہ تھی۔ وہ خنجر سے نئے کوچوان کا کام تمام کرنا چاہتا تھا۔ وہ چلتی بگھی میں اپنی نشست سے اٹھا اور بگھی کے اگلے پردے کو چاک کر دیا۔ دونوں راہباؤں کے رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو گئے تھے اور رونے لگیں۔ ڈیمونان، بگھی کا پردہ چاک کر کے کوچوان کی نشست تک پہنچنا چاہتا تھا۔ وہ کوچوان کو قتل کرنے کے لئے عقب سے اُس پر جھپٹا۔ لیکن کوچوان جو کہ قاسم تھا..... اس سے بے خبر نہیں تھا۔ جونہی ڈیمونان نے عقب سے قاسم پر خنجر کا وار کیا، قاسم نے ایک طرف جھکائی دی اور ڈیمونان کا وار خالی چلا گیا۔ لیکن ڈیمونان، قاسم کے اوپر میں آ گرا اور قاسم نے اپنا دایاں بازو اُس کی گردن کے گرد حمائل کر دیا۔ اب بگھی پل کے بالکل نزدیک پہنچ چکی تھی۔ قاسم نے بائیں ہاتھ سے دونوں گھوڑوں کی لگامیں پوری قوت سے کھینچیں اور تھوڑی دیر کے بعد بگھی رُک گئی۔ ڈیمونان کی گردن پر قاسم کی گرفت اس قدر سخت تھی کہ وہ اپنے ہاتھ میں پکڑے خنجر سے قاسم پر حملہ نہ کر سکتا تھا۔ قاسم کے چہرے پر سیاہ رنگ کا نقاب چڑھا تھا۔ چنانچہ ڈیمونان قاسم کو پہچان نہ سکا۔ بگھی رُکی تو قاسم نے ڈیمونان کے خنجر والے بازو کو پکڑ کر مروڑ دیا۔ ڈیمونان کا خنجر بگھی کے فرش سے ٹکراتا ہوا نیچے جا گرا..... راہبائیں اتنی خوفزدہ تھیں کہ اُس کے جسموں میں یہاں سے نکل بھاگنے کی بھی سکت نہ رہی تھی۔ اور سب کچھ ہوا بھی تو آناً فاناً تھا۔

قاسم اپنا بازو ڈیمونان کی گردن کے گرد حمائل کئے بگھی سے نیچے اُتر آیا اور اُسے فصیل کی جانب دھکا دے کر پھینک دیا۔ ڈیمونان پتھریلی فصیل کے ساتھ بری طرح ٹکرایا اور نیچے گر گیا۔ اب وہ اپنی تلوار نکال چکا تھا۔ قاسم کی تلوار جو نہ جانے کتنے سالوں سے عثمانوں کے خون کی پیاسی تھی۔ وہ ڈیمونان جس نے ابوجعفر بن کر بیس سال تک مسلمانوں کو دھوکہ دیا تھا اور سلطنت عثمانیہ میں بغاوت پھیلانے کی کوشش کی تھی۔ قاسم کا باپ اور اُس کی پہلی بھابھی سکینہ بھی اسی بغاوت کا لقمہ بنے تھے۔ قاسم کے دماغ میں تمام مناظر ایک ایک کر کے گردش کرنے لگے۔ لیکن ڈیمونان کو ختم کرنے سے پہلے قاسم نے

دونوں راہباؤں کو بگھی سے نکالا اور ڈیمونان کے ساتھ فصیل شہر کے نزدیک کھڑا کر
اب وہ ابوجعفر کی سزائے موت پر عمل کرنے والا تھا۔ اُس نے ڈیمونان پر فیصلہ کن
کرنے سے پہلے اپنے چہرے سے نقاب کھینچ کر اتار دیا۔

اب قاسم ڈیمونان کے سامنے تھا..... دونوں پرانے شناسا سات سال بعد مل ر
تھے۔ ڈیمونان نے فوراً قاسم کو پہچان لیا۔ تب قاسم نے کہا۔

''ابوجعفر!..... تم نے یقیناً مجھے پہچان لیا ہوگا۔ میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ تمہا
موت میں اپنی تلوار سے لکھوں گا۔ آج دیکھو! میں اپنا وعدہ پورا کرنے کے لئے تمہار
شہر اور تمہارے گھر میں..... تمہارے سامنے آ چکا ہوں۔ آخری بار اپنے گناہوں کی تو
لو۔ کیونکہ تمہارے گناہ بہت زیادہ ہیں۔ شاید اس توبہ سے ایک دو معاف ہو جائیں۔''

ڈیمونان کا پورا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔ آج اُسے اپنی موت کا سو فیصد یقین ہو
تھا۔ اُس نے قاسم سے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

''قاسم بن ہشام!..... خدا کے لئے مجھے مت مارو..... مجھے معاف کر دو۔ تم مجھ
جتنی رقم اور دولت چاہو لے لو، لیکن مجھے معاف کر دو۔''

قاسم یہاں ذاتی انتقام لینے کے لئے تو آیا نہیں تھا کہ اُس کی فریاد پر اُسے معاف
دیتا۔ وہ تو ایک بہت بڑا مقصد لے کر آیا تھا جو ڈیمونان کی جان لے کر ہی پورا ہو سکتا
چنانچہ قاسم نے ڈیمونان کی فریادوں کی مطلق پرواہ نہ کی اور ایک بھرپور وار سے ڈیمونا
کام تمام کر دیا۔ ڈیمونان کا سر تن سے جدا ہو کر راہباؤں کے سامنے آ گرا اور بے ا
اُن کی چیخیں نکل گئیں۔ اب قاسم کو ایک ناپسندیدہ کام کرنا تھا۔ اُسے دونوں راہباؤں کو
ختم کرنا تھا تاکہ اُس کا راز فاش نہ ہو..... اور اُس کا ''بڑا مقصد'' بھی اچھی طرح سے
ہو سکے۔ چنانچہ اُس نے جی کڑا کر کے دونوں راہباؤں کا بھی خاتمہ کر دیا۔ اور پھر
سے واپس لوٹنے سے پہلے قاسم نے ڈیمونان کے لباس کی تلاشی لے کر ماری کی
واپس نکال لی۔ اس کے بعد قاسم نے ایک انتہائی عجیب کام کیا۔ اُس نے اپنی جیب
''رومن کیتھولک چرچ'' کی مخصوص صلیب نکالی، جو سونے سے بنی ہوئی تھی اور چھوٹی
زنجیر کے ذریعے گلے میں لٹکائی جانے والی صلیب تھی۔ قاسم نے صلیب نکال کر
ڈیمونان کے مُردہ ہاتھ میں اس طرح تھما دی جیسے مرنے سے پہلے ڈیمونان نے قاتل
گردن پر ہاتھ ڈالا ہو۔ اور پھر کچھ سوچ کر اُس نے ڈیمونان کے ہاتھ سے صلیب
نکال لی اور دو راہباؤں میں سے ایک راہبہ کے ہاتھ میں تھما دی..... دراصل اس

ش ایسے زاویئے پر گری تھی کہ قاتل پر حملہ کرنے کا شک صحیح معنوں میں پیدا ہوتا تھا۔
ب قاسم اپنے کام سے فارغ ہو چکا تھا۔ اُس نے اپنی تلوار نیام میں ڈالی اور اپنے لباس
کو اتارنا شروع کر دیا۔ اس لباس پر خون کے چھینٹے تھے۔ اس لباس کے نیچے قاسم نے
یک اور لباس پہن رکھا تھا۔ قاسم نے اپنا خون آلود لباس اتارا اور اُسے ایک گٹھڑی میں
باندھ کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔

اب قاسم نے بگھی کا ایک گھوڑا کھولا اور اُس پر سوار ہو گیا۔ اگلے لمحے وہ واپس شہر کی
جانب جا رہا تھا۔ شہر کے درمیان سے گزرتے ہوئے قاسم نے اپنے ہاتھ میں پکڑے
ہوئے لباس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بارے میں سوچا۔ کچھ دیر بعد وہ شہر کے گندے
نالے پر سے گزر رہا تھا، جس میں شہر بھر کا گندا پانی ہر وقت بھرا رہتا تھا..... قاسم نے
نالے کے اوپر سے گزرتے ہوئے ہاتھ گھما کر گٹھڑی کو نالے میں پھینک دیا۔ کچھ دیر بعد
بگھی کا گھوڑا بھی اُس نے ایک تاریک گلی میں آوارہ چھوڑ دیا۔ اب ماسوائے اُس خون
آلود تلوار کے جو قاسم کے نیام میں تھی، قاسم کے خلاف کوئی نشان نہ تھا۔ قاسم نے سوچا کہ
تلوار کو گھر جا کر صاف کر لے گا۔

قاسم کو معلوم نہ تھا کہ بریٹا کے دل پر کیسا انقلاب گزر چکا ہے۔ بریٹا تو اُس کی
اصلیت جان چکی تھی۔ لیکن قاسم بے خبری کے عالم میں گھر کی جانب ہی چل کھڑا ہوا۔ آج
قاسم نے اپنے پیچیدہ منصوبے کے پہلے حصے کو پوری طرح سرانجام دے دیا تھا۔ قاسم نے
آج حقیقی پھرتی تو اُس وقت دکھائی تھی جب وہ ماری کا ذکر سننے کے بعد گھر سے نکل آیا
تھا۔ سب سے پہلے اُس نے شہنشاہ کا جعلی خط کوچوان کو دے کر کہا کہ وہ اسے فادر
ڈیمونان تک پہنچا دے۔ اور پھر یہ جعلی خط بھی حقیقت میں شہنشاہ کا ہی ایک پرانا خط تھا جو
آج سے سات سال پہلے شہنشاہ نے ڈیمونان کو اورنہ ارسال کیا تھا۔ اُس وقت قاسم
''اورنہ'' میں شاہی سراغ رساں تھا اور یہ خط اُس وقت اُس کے ہاتھ لگا تھا جب ڈیمونان
''اورنہ'' سے فرار ہو چکا تھا۔ قاسم نے کل ہی یہ خط اپنے سامان سے نکالا اور ایک تیز دھار
چاقو کی مدد سے اس پر لگی ہوئی سطریں کھرچ دیں۔ اس کے بعد قاسم نے سیاہ روشنائی
سے لاطینی زبان میں نئی سطریں لکھیں۔ اور اس طرح قاسم نے شہنشاہ کے سات سال
پرانے خط سے بہت اہم کام نکال لیا تھا۔

قاسم نے خط کوچوان کے حوالے کیا اور خود بگھی کے پاس ہی چھپ کر کوچوان کو دیکھنے
لگا۔ کوچوان نے سیدھا جا کے رومیل کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا..... اور پھر کچھ دیر بعد

جب کوچوان خط دے کر واپس لوٹا تو قاسم نے اُسے بھوکے چیتے کی طرح دبوچ لیا۔ اگلے لمحے قاسم اُس کی گردن دبوچ چکا تھا۔

یہ سب تو ٹھیک تھا۔ لیکن قاسم بریٹا کے دل سے بے خبر تھا۔ بریٹا اس وقت بھی اپنے بستر پر اُداس لیٹی اپنے دُکھی دل کا درد بھلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ آنسو بہا رہی تھی۔ بریٹا کی دونوں آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرتے دیکھ کر اُس کے پاس کھڑا رومیل بے چین ہو گیا۔ اُسے حقیقت حال کی خبر نہ تھی۔ چنانچہ اُس نے کسی قدر ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''بریٹا! اب بس بھی کرو۔ تم نے مقدس باپ کی دعوت کرنی تھی کر دی۔ کیا ہوا اگر مجبوری کی وجہ سے کھانا نہیں کھا سکے..... اور مورگن کا غم بھی نہ کرو۔ وہ تو ہے ہی آوارہ گرد۔ صبح سے شام تک شہر کی خاک چھانتا رہتا ہے..... آ لینے دو اُسے۔ آج میں اُس کی اچھی خبر لیتا ہوں۔''

رومیل کے آخری جملے بریٹا کے دل میں نشتر کی طرح اُتر گئے۔ وہ جانتی تھی کہ مورگن اب نہیں آئے گا۔ کیونکہ وہ مورگن نہیں بلکہ ایک مسلمان جاسوس قاسم تھا۔ وہ فادر ڈیوڈ سے قاسم کی اصل کہانی سن چکی تھی اور اُسے صاف اندازہ ہو گیا تھا کہ یہی مورگن عرف مسلمان جاسوس ہے۔ وہ سوچنے لگی کہ اگر مورگن آ جائے تو وہ اُس کے ساتھ کس طرح پیش آئے گی۔ اُس کے دل نے جواب دیا کہ وہ اسے قتل کر دے گی۔ کیونکہ مورگن نے اُسے بہن بنا کر دھوکہ دیا۔

اور پھر رومیل کی بات سچ ہوئی۔ کچھ ہی دیر بعد بریٹا نے اپنے گھر کے دروازے پر وہی مخصوص دستک سنی جو قاسم دیا کرتا تھا۔ وہ ایک دم اُچھل کر بیٹھ گئی اور اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا..... وہ پھر سوچنے لگی کیا وہ اس مسلمان جاسوس کو قتل کر پائے گی۔ لیکن وہ رومیل سے چھپانا چاہتی تھی۔ وہ اسی گومگو کے عالم میں تھی کہ رومیل، قاسم کو لئے کمرے میں داخل ہوا..... قاسم پر بریٹا کی نظر پڑی اور وہ بستر سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

''سولٹن'' اسی بستر پر ماں کے پہلو میں گہری نیند سو رہا تھا۔ رات ہو چکی تھی..... اب قاسم کو ایک ٹک گھورے جا رہی تھی۔ قاسم نے بریٹا کی نظروں میں اپنے لئے عجیب تاثر دیکھی تو بوکھلا گیا اور گھبرا کر کہنے لگا۔

''بریٹا بہن!..... خیریت تو ہے؟..... لگتا ہے مقدس باپ کی دعوت جلد ختم ہو گئی۔ کیا کرتا۔ یہاں سے گیا تو تھوڑی دیر کے لئے تھا، لیکن باہر نکلا تو یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ ''رومن کیتھولک چرچ'' کے پادری شہر میں کھلم کھلا اپنے مذہب کی دعوت دینے پھر

رہے۔ مجھے یہ صورتحال دیکھ کر بہت دُکھ ہوا اور میں ان میں سے بعض پادریوں کے ساتھ بحث کرنے لگا۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے دیر ہو گئی۔ لیکن یہاں آ کر معلوم ہوا کہ دیر ضرورت سے زیادہ ہو گئی۔ کیونکہ یہاں تو سرے سے دعوت ہی ختم ہو گئی ہے۔''

قاسم کی باتیں سن کر رومیل تو مسکرا رہا تھا لیکن بریٹا کے چہرے پر کوئی تبدیلی دکھائی نہ دی۔ دکھائی بھی کیسے دیتی۔ وہ تو حقیقت حال سے واقف ہو چکی تھی۔ بریٹا ابھی تک انتہائی سنجیدہ چہرہ لئے قاسم کو گھورے جا رہی تھی..... قاسم شرمندہ ہو کر بغلیں جھانکنے لگا۔ اُس نے بالآخر کہا۔ ''بریٹا بہن..... لگتا ہے تم مجھ سے بے حد ناراض ہو۔ میں دل سے معافی مانگتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ تمہیں ناراض نہیں کروں گا۔''

لیکن بریٹا پھر بھی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اب قاسم کا ماتھا ٹھنکا۔ ضرور کوئی اور بات تھی۔ اُس نے گھوم کر رومیل کی جانب دیکھا۔ لیکن رومیل تو اپنے مخصوص انداز میں سادگی کے ساتھ مسکرا دیا..... قاسم دو قدم آگے بڑھا اور بریٹا کے نزدیک آ کر ٹھہر گیا۔ اب وہ بریٹا کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ یہاں خاموشی نہ تھی۔ بریٹا کے صرف ہونٹوں پر خاموشی تھی۔ آنکھیں؟..... آنکھیں تو درد، کرب، دُکھ اور اذیت کی بڑی کربناک کہانی سنا رہی تھیں۔ اب قاسم کو پہلی بار احساس ہوا کہ بریٹا کی مہر سکوت بلاوجہ نہیں۔ ضرور کوئی غیر متوقع بات ہو گئی ہے۔ کیونکہ بریٹا ایک ہی انداز میں شروع سے کھڑی تھی۔ اب تو رومیل بھی کسی حد تک سنجیدہ دکھائی دینے لگا۔ قاسم ایک قدم اور آگے بڑھا..... اور اپنا ہاتھ بڑھا کر بریٹا کے کندھے پر رکھنا چاہا تاکہ اُسے منائے۔ لیکن اگلے لمحے بریٹا نے ایک ایسی حرکت کی کہ رومیل اور قاسم دونوں حیران رہ گئے۔ بریٹا نے غم و غصے کی شدت سے ہاتھ بڑھا کر قاسم کا گریبان پکڑ لیا اور بری طرح جھنجھوڑتے ہوئے چیخنے لگی۔ وہ زور زور سے رو بھی رہی تھی اور ساتھ کے ساتھ قاسم کو جھنجھوڑتی بھی جا رہی تھی۔

''جھوٹے، مکار، فریبی، دغا باز..... تم نے ایک بہن کے اعتماد کو دھوکہ دیا..... اور سچی بات کو..... میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی..... میری نظروں سے دُور ہو جاؤ۔''

بریٹا بہت غصے میں تھی۔ وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔ قاسم بار بار رومیل کی طرف دیکھ رہا تھا کہ وہ اصل ماجرا بتا دے۔ لیکن رومیل کو بھی تو اصل ماجرا معلوم نہیں تھا۔ بھلا قاسم کو کیا بتاتا۔ وہ خود اپنی بیوی کی اس حرکت پر بوکھلا گیا اور تیزی سے آگے بڑھ کر اُس نے بریٹا کو سنبھال لیا۔ اب وہ تسلی دے رہا تھا۔

''بریٹا!..... بریٹا..... اپنے آپ کو سنبھالو..... تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ کیا بات ہے؟ تم

"مورگن" کو اس قدر کیوں ڈانٹ رہی ہو۔ مجھے بھی تو بتاؤ۔ بریٹا..... بریٹا....."

لیکن بریٹا تو جیسے کچھ سن ہی نہیں رہی تھی۔ اُس نے رومیل کے سنبھالنے پر اُس کا گریبان تو چھوڑ دیا لیکن اب وہ خود بلند ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ اور پھر وہ وہیں بستر پر بیٹھ گئی۔ رومیل بھی اُس کے نزدیک بیٹھ گیا۔ اتنے میں قاسم نے کہا۔

"لگتا ہے، بریٹا بہن کی طبیعت ناساز ہے۔ انہیں اپنے دل کی بھڑاس مجھ پر نکال لینے دیں۔ انہیں مجھ پر غصہ ہے۔ آپ انہیں غصہ اتارنے دیں۔"

رومیل نے ایک بے نام سی نظر کے ساتھ قاسم کو دیکھا۔ قاسم کو بہت عجیب سا لگا۔ بریٹا کی ہچکیاں رُک گئی تھیں اور وہ سسکیاں لے رہی تھی۔ قاسم نے اپنے آپ کو وہاں سے ضروری محسوس کیا اور وہاں سے نکل آیا۔ وہ اپنے کمرے میں آیا اور اُس نے سب سے پہلے اپنی تلوار نیام سے نکالی اور اُسے سب کی نظر بچا کر اچھی طرح دھو لیا۔ اب وہ بالکل صاف تھا۔ اُس نے ابوجعفر کے قتل کا آخری نشان بھی مٹا دیا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اُس نے تلوار نیام سمیت دیوار پر لٹکائی اور خود بڑی فکرمندی کے ساتھ بستر پر دراز ہو گیا۔ وہ گھر واپس آ کر اور بریٹا کا رویہ دیکھ کر بے حد پریشان ہو گیا تھا..... یا الٰہی! یہ کیا ماجرا ہے؟..... وہ سوچنے لگا۔ آخر بریٹا کو ہو کیا گیا تھا؟ لیکن اُسے کوئی جواب سجھائی نہ دیا۔ اسی فکرمندی کے عالم میں دیر تک اُسے نیند نہ آئی۔ اور پھر جب اُسے نیند آئی تو وہ سب کچھ بھلا کر نیند کی حسین وادی میں چلا گیا۔

بریٹا نے بہت زیادہ رو لیا تھا اور اُس کے من کی بہت سی بھڑاس آنسوؤں کے ذریعہ نکل چکی تھی۔ وہ دیر تک روتی رہی۔ رومیل اُس کا سر اپنے زانو پر ٹکائے اُس سے پوچھ رہا کہ آخر اس قدر رونے اور مورگن پر غصہ کرنے کی کوئی وجہ تو ہو گی۔ لیکن بریٹا نے رومیل کو کچھ نہ بتایا۔ صرف اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی۔

"رومیل..... بس مجھے لیٹنے دو..... میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔"

رومیل نے بریٹا کو آرام سے بستر پر لٹا دیا..... اور پیار سے اُس کا سر دبانے لگا۔ تھوڑی ہی دیر بعد بریٹا سو چکی تھی۔

لیکن رومیل کو نیند نہ آ رہی تھی۔ وہ بار بار کروٹیں بدل رہا تھا۔ اُس کے ذہن میں بریٹا کے الفاظ گونج رہے تھے..... جھوٹے، مکار، فریبی، دھوکے باز، تم نے ایک بہن کو دھوکا دیا ہے..... وہ سوچ رہا تھا کہ آخر مورگن نے بریٹا کو کیا دھوکہ دیا ہے؟ وہ دیر تک کروٹیں بدلتا رہا اور پھر وہ بھی خواب خرگوش میں کھو گیا۔

لیکن آدھی رات کے قریب رومیل کی آنکھ کھل گئی..... اُس نے کروٹ بدلی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اُس کی بیوی اپنے بستر پر نہیں تھی۔ بریٹا کہاں گئی؟..... اُس نے سوچا۔ اور پھر نہ جانے اُس کے دل میں کیسا وسوسہ پیدا ہوا کہ اُٹھ کر بیٹھ گیا اور انتہائی احتیاط سے آواز پیدا کیے بغیر اپنے کمرے سے نکل گیا۔ وہ بریٹا کو دیکھنا چاہتا تھا اور اُس کا دل اسے بتا رہا تھا کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ وہ سب سے پہلے سیدھا "مورگن" کے کمرے کی جانب بڑھا..... اور یہ دیکھ کر اُس کا دل دھک سے رہ گیا کہ بریٹا سچ مچ مورگن کے کمرے میں موجود تھی۔ رومیل کے دل میں طرح طرح کے وسوسے جنم لینے لگے۔ اُس نے انتہائی احتیاط سے نپے تلے قدم اٹھانا شروع کر دیئے تاکہ آواز پیدا نہ ہو۔ کچھ دیر بعد وہ قاسم کے کمرے کی کھڑکی سے باہر موجود تھا۔ یہاں سے وہ کمرے کے اندر دیکھ سکتا تھا۔ کمرے میں مشعل روشن تھی۔ رومیل نے دیکھا کہ بریٹا، قاسم کے بستر کے نزدیک کھڑی تھی اور قاسم ابھی تک بستر پر ہی لیٹا ہوا تھا۔ رومیل کا دل یہ منظر دیکھ کر بہت تیزی کے ساتھ دھڑکنے لگا۔ اُس کی سانسیں اپنے سینے میں اٹکتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ وہ مشعل کی روشنی میں اندرونی منظر پر غور کرنے لگا..... اُس نے دیکھا..... کہ بریٹا..... اب قاسم پر جھک رہی تھی..... اور پھر وہ قاسم کے سینے کی جانب جھکی ہوئی دکھائی دینے لگی۔

رومیل کے ہونٹ اور حلق خشک ہو گیا..... بریٹا، قاسم کے سینے پر جھک کر نہ جانے کیا کر رہی تھی..... اور پھر اچانک بریٹا سیدھی ہوئی..... اُس کا دایاں ہاتھ فضا میں بلند ہوا۔ رومیل کو بریٹا کے ہاتھ میں ایک چمکدار خنجر کی جھلک نظر آئی۔ لیکن اگلے لمحے وہ کچھ نہ کر سکتا تھا..... کیونکہ بریٹا خنجر کا وار..... کر چکی تھی۔ بریٹا اپنے منہ بولے بھائی قاسم کے سینے پر خنجر کا وار کر چکی تھی۔ رومیل نے آنکھیں بند کر لیں۔ اُس سے دیکھا نہ گیا کہ مورگن جیسے بہترین سپاہی کو یوں ایک عورت بے خبری میں قتل کر دے۔ لیکن اب وہ کچھ نہ کر سکتا تھا۔ وہ تو کچھ اور جان کر یہ سب کچھ دیکھنے آیا تھا..... لیکن یہاں تو کہانی ہی کچھ اور تھی۔ بریٹا نے مورگن کو قتل کر دیا تھا..... لیکن یہ کیا؟؟..... رومیل کو ایک اور منظر دکھائی دیا..... قاسم فنا ہو گیا تھا۔ جس وقت بریٹا ایک بہن کی حیثیت سے قاسم کا ماتھا چومنے لگی تھی..... اُسی وقت قاسم کی آنکھ کھل گئی تھی۔ لیکن مکر کر کے پڑا رہا۔ اور جس وقت بریٹا..... ایک "عیسائن" بن کر مسلمان جاسوس کو قتل کرنے جا رہی تھی..... قاسم نے پوری طرح آنکھیں کھول دیں اور بریٹا کا خنجر والا ہاتھ پکڑ لیا۔ بریٹا قاسم پر جھکی تو اس لئے تھی کہ اُس نے دنیا میں اُس کا ایک بھائی بنایا تھا اور وہ اس بھائی کو آخری وقت میں پیار دینا چاہتی تھی۔ لیکن بریٹا

قاسم کا ماتھا چومنے سے پہلے رُک گئی تھی۔ اُسے خیال آیا کہ چالاک قاسم جاگ نہ رہا ہو..... اُس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور دل پر پتھر رکھ کر دین مسیح کے اس دشمن کا کام تمام کرنے کے لئے وار کر دیا۔ لیکن قاسم تو پہلے ہی جاگ چکا تھا۔ چنانچہ قاسم نے بروقت اُس کا ہاتھ روک لیا..... اور مسکراتا ہوا اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

''کیا بات ہے بہن!..... مجھ سے کیا قصور ہو گیا ہے..... جس کے لئے تم میری جان لینا چاہتی ہو؟''

''تم..... تم..... تم دغا باز ہو..... تم نے ایک بہن کے اعتماد کو دھوکہ دیا ہے۔ تم نے اپنی محبت کی جھوٹی کہانی سنا کر مجھے دین مسیح کے خلاف استعمال کیا ہے۔ میں تمہاری جان لے کر اپنا قرض چکانا چاہتی ہوں۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔''

بریٹا بہت غصے میں تھی۔ قاسم بھی حیران تھا کہ آخر بریٹا کے سامنے اس کا راز کیسے افشاء ہو گیا..... وہ یہی سوچ رہا تھا کہ بریٹا نے پھر کہا۔

''تم نے مارسی کو ورغلایا اور اُسے دین مسیح کے خلاف استعمال کیا..... اور پھر مجھے دھوکہ کر تم دوبارہ اپنے مذموم مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے..... میں تمہاری حقیقت جان چکی ہوں۔ تم مورگن نہیں..... قاسم بن ہشام ہو۔''

اب قاسم کے لئے مزید چھپے رہنا ممکن نہ تھا۔ اُس کا پول کھل چکا تھا۔ اُس نے کچھ سوچ کے لئے سر جھکا لیا۔ بریٹا اُسے کینہ توز نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ یکلخت وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی اور اُس نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔

''مجھے تم سے یہ اُمید نہ تھی۔ تم مجھے پہلے روز بھی بتا دیتے کہ تم مسلمان ہو۔ تب بھی تمہیں اپنا بھائی بنا لیتی۔ میں تو مسلمانوں کو برا سمجھتی ہی نہ تھی... ہائے... ایک وہ مسلمان تھا جس نے دورانِ جنگ با اختیار فاتح ہو کر بھی میری اُس وقت مدد کی جب درد زچگی میں جان دینے والی تھی۔ اور ایک تم مسلمان ہو جس نے میری سادگی کا ناجائز فائدہ اُٹھایا اور مجھے بہن بنا کر دھوکا دیا ہے.....''

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ قاسم اُس کے سامنے سر جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ اُس نے پہلی بار سر اٹھایا..... اُس کی آنکھوں میں بھی ننھی ننھی بوندیں چمک رہی تھیں اور وہ حسرت بریٹا کے چہرے پر ڈال کر بریٹا سے مخاطب ہوا۔

''میں نے تمہیں کوئی دھوکا نہیں دیا بریٹا بہن! میں اب بھی تمہارا بھائی ہوں۔ ڈیوک کے ساتھ میرا کچھ پرانا حساب کتاب تھا۔ وہ میرے باپ اور بھابھی کا قاتل ہی نہ تھا

''اورنہ'' میں 20 سال تک ''ابوجعفر'' بن کر رہ رہا تھا..... اور سینکڑوں بے گناہ مسلمانوں کا قاتل تھا..... اس نے کلیسا کی پرانی خدمت گار ''مارتھا بیگم'' کو اپنے ہاتھوں سے قتل کیا۔ اور تمہاری کو اغواء کر کے لے گیا۔ لیکن یہ باتیں اگر میں تمہیں پہلے بتا دیتا تو بات نہ بنتی۔ میرے کردار کی وجہ سے مسلمانوں کو کچھ مت کہو..... میں وہی مسلمان ہوں جو بوسنیا کی گلی میں تمہاری کراہیں سن کر بروقت تمہاری مدد کو پہنچا تھا..... ہاں میں وہی شخص ہوں..... اور میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ اس وقت تمہاری سہیلی ''ماریا'' میرے بھائی کی بیوی ہے..... اور اس کا نام مریم ہے..... اور تمہاری بوسنیائی شہزادی میری بیوی ہے اور اس کا نام حمیرا ہے... تمہارے ''بارٹا کوزین'' کا نام اب عباس ہے... میں تو تمہیں اسی روز سے بہن بنا چکا ہوں جبکہ تم نے چند دن پہلے مجھے بھائی کہا ہے۔ اب تم بتاؤ... کیا میں نے تمہیں دھوکا دیا ہے؟''

بریٹا پر سکتہ طاری ہو چکا تھا۔ وہ ہکا بکا کھڑی تھی۔ اُس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔ قاسم نے مریم، عباس اور شہزادی حمیرا کا حوالہ دے کر بریٹا کو سچ مچ استعجاب کے سمندر میں غرق کر دیا تھا۔ جس مسلمان نوجوان کو وہ گزشتہ سات سال سے سوتے جاگتے، اُٹھتے بیٹھتے دُعائیں دیتی آئی تھی، وہ یہی تو تھا۔ قاسم اگر اُس دن نہ ہوتا تو بریٹا کی زندگی بچتی نہ اُس کے بچے کی۔ خود بریٹا اور رومیل نے اپنے بیٹے کا نام اسی واقعہ کی نسبت سے رکھا ہوا تھا۔ وہ سلطان مراد کی بجائے اب اپنے بیٹے کو سولٹن کہہ کر پکارتے تھے۔ یہ بھی تو سلطان کا ہی بگڑا ہوا لفظ تھا۔ بریٹا کی آنکھیں آخری حد تک کھلی ہوئی تھیں اور وہ پلکیں جھپکنا بھول چکی تھی۔ قاسم گزشتہ کئی روز سے اُس کے ساتھ تھا لیکن وہ اسے پہچان نہ سکی تھی۔ وہ اسے پہچانتی بھی کیسے۔ زچگی کے وقت اُس نے قاسم کو دیکھا تو نہ تھا۔ وہ تو صرف یہ جانتی تھی کہ ایک مسلمان نوجوان نے مشکل وقت میں اُس کی مدد کی تھی۔

کمرے سے باہر کھٹکا سنائی دیا۔ یکلخت قاسم اور بریٹا دونوں اُچھل پڑے..... یہ کون ہو سکتا تھا؟ قاسم نے پھرتی سے اپنی شمشیر بے نیام کر لی۔ لیکن بریٹا اندازہ لگا چکی تھی۔ قاسم نے برہنہ شمشیر لئے باہر نکلنا چاہا تو بریٹا نے اُس کا دامن تھام لیا۔

''بھیا! باہر مت جاؤ۔ لگتا ہے رومیل نے ہماری باتیں سن لی ہیں۔ تلوار واپس نیام میں ڈالو۔ رومیل تمہارا دشمن نہیں۔''

قاسم نے رومیل کا سنا تو اُس کے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ بریٹا نے پھر اُس سے کہا۔

''بھیا! مجھے معاف کر دو۔ تم نے پہلے روز ہی مجھے بتا دیا ہوتا۔ میں تو پچھلے سات سال سے اٹھتے بیٹھتے تمہارے لئے دُعائیں کرتی آئی ہوں۔ تم ملے بھی تو ان حالات میں..... آج اگر

میں نے کچھ کر دیا ہوتا تو میں حشر کے روز تمہیں کیا منہ دکھاتی۔"

لیکن اس سے پہلے کہ قاسم کوئی جواب دیتا، رومیل آندھی اور طوفان کی طرح کمرے میں داخل ہوا۔ اُس کے ہاتھ میں ننگی تلوار تھی اور چہرہ غیض وغضب سے انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوا اور گرجدار آواز میں بولا۔

"دغا باز مہمان!..... میں تمہیں قتل کرنے کے لئے نہیں آیا..... میں تمہیں صرف یہ کہنے کے لئے آیا ہوں کہ تم علی الصبح قسطنطنیہ سے نکل جاؤ۔ ہم نے تمہارے احسان کا بدلہ چکا دینا تھا اس سے کئی گنا زیادہ تم ہم سے وصول کر چکے ہو۔ لیکن پھر بھی میں اپنی بیوی اور بیٹے کے صدقے تمہاری جان بخشی کرتا ہوں..... ہاں، اگر سورج نکلنے کے بعد تم قسطنطنیہ میں دکھائی دیئے تو میں سارے شہر کی پولیس تمہارے پیچھے لگا دوں گا اور تمہاری جان لے کر رہوں گا۔"

قاسم کے ہاتھ میں بھی تلوار برہنہ تھی۔ لیکن قاسم نے اپنی تلوار کا رُخ زمین کی طرف کر دیا اور حسرت ناک نگاہوں سے بریٹا کی جانب دیکھا۔ بریٹا کے چہرے پر بلا کی اُداسی تھی۔ آج قدرت نے اُسے بے پناہ دردناک منظر کا حصہ بنا دیا تھا۔ وہ ہر دونوں صورت میں تکلیف جھیل رہی تھی۔ رومیل، قاسم کو رُسوا کر کے نکال رہا تھا۔ لیکن بریٹا تو درحقیقت اپنے بھائی کو آج ملی تھی۔ یہ معلوم ہونے کے بعد کہ قاسم وہی شخص ہے جس نے بوسنیا میں بریٹا کی جان بچائی تھی..... بریٹا کی قاسم کے ساتھ تمام ناراضگی جاتی رہی۔ لیکن اب وہ کرتی۔ ایک طرف خاوند تھا اور دوسری طرف محسن۔ بریٹا نے انتہائی عاجزانہ انداز میں اپنے خاوند کی جانب دیکھا اور دوڑ کر اُس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

"رومیل! خدا کے لئے قاسم کو کچھ مت کہنا۔ یہ چلا جائے گا۔ میں وعدہ کرتی ہوں چلا جائے گا۔"

لیکن اس سے پہلے کہ وہ بات مکمل کرتی، قاسم بول اُٹھا۔ "آپ لوگ پریشان نہ ہوں میں چلا جاتا ہوں۔ میں صبح کا انتظار بھی نہیں کرتا۔ میں ابھی جاتا ہوں۔ لیکن جاتے ہوئے میں اتنا ضرور کہوں گا کہ میں نے آپ لوگوں کو کوئی دھوکا نہیں دیا۔ میرا مقصد عظیم ہے آپ کو بہت جلد نظر آ جائے گا۔ میں آپ کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ اور اگر قسطنطنیہ میں ہم کا ب کر آئے تو میں سب سے پہلے آپ سے ملنے کے لئے آؤں گا۔"

قاسم کے لئے اب یہاں سے چلا جانا ہی بہتر تھا۔ کیونکہ ابھی تو رومیل اُسے جانے اجازت دے رہا تھا۔ لیکن صبح جب رومیل کو ڈیمونان اور راہباؤں کے قتل کی خبر ملے گی

اس وقت وہ قاسم کو جانے کی مہلت بھی نہ دے۔ قاسم کو یہ تسلی تھی کہ رومیل، ڈیمونان کے قتل کی خبر سن کر بھی اس کا راز فاش نہیں کرے گا۔ کیونکہ اس طرح رومیل خود پھنستا تھا۔ شہنشاہ یقیناً اُسے قتل کرا دے گا۔ کیونکہ اُس نے سلطان کے ایک خطرناک جاسوس کو اپنے گھر میں پناہ دے کر سنگین جرم کیا تھا۔ قاسم کو یقین تھا کہ رومیل اس واقعے کو ہمیشہ خفیہ رکھنے کی کوشش کرے گا۔ چنانچہ قاسم نے اپنا سامان اٹھایا اور رومیل کے اصطبل سے اپنا گھوڑا لے کر رات کی تاریکی میں روانہ ہونے لگا۔ بریٹا اور رومیل اُسے درد بھری نظروں سے دیکھتے رہے..... ہائے! مذہب کتنی بڑی دیوار بن گیا تھا۔ دونوں طرف کے انسان ایک دوسرے کو چاہتے تھے، لیکن مذہب کی سیسہ پلائی ہوئی دیواریں اُن کے درمیان حائل تھیں۔ بریٹا سے قاسم کی روانگی کا منظر دیکھا نہ گیا اور وہ ہچکیاں لیتی ہوئی کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ قاسم نے رومیل پر آخری نظر ڈالی اور دروازے سے نکل گیا۔

اگلی صبح ڈیمونان کے قتل کی خبر پر لگا کر اُڑی اور آناً فاناً پورے شہر میں پھیل گئی۔ آج صبح سے ہی ہر طرف یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ رومن کیتھولک چرچ کے جاسوسوں نے "آیا صوفیاء" کے بطریق اعظم ثانی کو وحشیانہ انداز میں قتل کر دیا ہے۔ بطریق اعظم ثانی کے ہمراہ چرچ کی دو راہبائیں اور ایک کوچوان بھی مارا گیا۔ شہر کے چھوٹے چھوٹے کلیساؤں کے پادریوں نے لوگوں کو مشتعل کرنے میں دیر نہ لگائی۔ اور دوپہر کے قریب یونانی کلیسا کے پچانوے فیصد پادری ہزاروں لوگوں کو لئے قصرِ شاہی کے سامنے موجود تھے۔ شہنشاہ کا محافظ دستہ لوگوں کو محل کے قریب آنے سے روک رہا تھا۔ لوگ پورے جذبے کے ساتھ رومن کیتھولک چرچ کے خلاف نعرے لگا رہے تھے اور پاپائے روم کو گالیاں دے رہے تھے۔ آج قسطنطنیہ میں موجود رومن کیتھولک چرچ کے تمام پادری اور راہب جو حال ہی میں شہنشاہ کی دعوت پر قسطنطنیہ وارد ہوئے تھے، لوگوں کے غیض وغضب سے چھپتے پھر رہے تھے۔ "رومہ" کے پوپ کا خصوصی نمائندہ "کارڈنیل اسیڈور" خود اپنی جان بچانے کے لئے شہنشاہ کے پاس بیٹھا تھا۔ شہر کی پولیس ہنگاموں پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن جذبات کا طوفان تھمنے کو نہ آتا تھا۔ وزیر اعظم نے شہنشاہ کو مشورہ دیا تھا کہ "رومہ" کے پادریوں کو فی الفور واپس بھیج دیا جائے۔ لیکن "قسطنطین" ایسا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ تو قسطنطین دونوں کلیساؤں کی صلح چاہتا تھا۔ وہ چند دن بعد "آیا صوفیاء" میں دونوں کلیساؤں کی ایک بڑی مجلس منعقد کرنے والا تھا جس کی صدارت "کارڈنیل اسیڈور" کر رہا تھا۔ لیکن اب تو شہنشاہ کو اپنی تمام کوششیں ضائع ہوتی ہوئی دکھائی دیں۔ بالآخر شہنشاہ مجبور ہو

کر سہ پہر کے قریب خود لوگوں کے سامنے آیا اور اُس نے اپنے محل کی بالکونی میں کھڑا ہو کر با آواز بلند لوگوں کو مخاطب کیا۔

''قسطنطنیہ کے عوام!

میری بات غور سے سنو! میں کہتا ہوں یہ سب کچھ جو ہوا، یہ عثمانیوں کی سازش تھی۔

اسی قسم کے مضمون پر مشتمل ایک طویل تقریر کر کے شہنشاہ نے لوگوں کو گھروں کو واپس بھیج دیا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ شہنشاہ کی تقریر سے بہت کم لوگ مطمئن ہوئے تھے۔

بریٹا اور رومیل ڈیمونان کے قتل کی خبر سن کر سکتے میں آ گئے اور دونوں بے بسی سے ایک دوسرے کا چہرہ تکنے لگے۔ رومیل کو مذہب سے کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اُس نے ڈیمونان کے قتل کو اتنا زیادہ محسوس نہ کیا تھا۔ لیکن بریٹا کو تو جیسے چپ لگ گئی۔ ایک طرف مذہب تھا اور دوسری طرف جذبات۔ رومیل کے دل میں البتہ اتنا خدشہ ضرور تھا کہ قتل کی تفتیش کا رُخ اگر ان کے گھر کی طرف مڑ آیا تو وہ کیا جواب دے گا۔ کیونکہ صوفیاء کی سفید بگھی اُس کے گھر کے سامنے تقریباً نصف گھنٹہ کھڑی رہی تھی..... لیکن یہ بھی حسن اتفاق تھا کہ تفتیش کا رُخ رومیل کے گھر کی جانب نہ مڑا۔ خود آیا صوفیاء کے بطریق اعظم نے یہ کہہ دیا کہ ڈیمونان آخری وقت کسی پادری کی دعوت پر گیا تھا۔ بطریق اعظم نہ بتا سکا کہ ڈیمونان کس پادری کی دعوت پر گیا تھا۔ قاسم کی منصوبہ بندی ہی ایسی تھی کہ ڈیمونان کے قتل کا سراغ نہ لگایا جا سکا۔ قسطنطنیہ کی خفیہ پولیس نے اپنا ایڑی چوٹی کا زور لگا لیا تھا۔ لیکن انہیں قاتل کا سراغ نہ مل سکا۔ حتیٰ کہ کئی روز گزر گئے اور کلیساؤں کی مجلس کا دن سر پر آ گیا۔

کلیساؤں کی مجلس سے صرف تین دن پہلے قاسم ایک بار پھر ''آیا صوفیاء'' کے سامنے نمودار ہوا۔ اس دوران وہ ایک سرائے میں مقیم رہا تھا اور اُس نے اپنے کام کو بدستور جاری رکھا تھا۔ ان دنوں میں وہ قسطنطنیہ میں مقیم بعض مسلمان تاجروں کے ساتھ روابط پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ اُس نے کچھ خفیہ سرگرمیاں بھی سرانجام دی تھیں جن کا نتیجہ بہت جلد سامنے آنے والا تھا۔ اُس کا سامان ابھی تک سرائے میں ہی رکھا تھا۔ آج قاسم نے ''آیا صوفیاء'' میں داخل ہونے کی نیت سے اِدھر کا رُخ کیا تھا۔ آج وہ گھوڑے پر بھی سوار نہ تھا۔ لیکن ایک عجیب بات تھی۔ آج ایک بار پھر قاسم نے اپنی گردن میں پادریوں کا صلیب لٹکا رکھی تھی اور زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ اس مرتبہ یہ صلیب رومن کیتھولک چرچ کی نہ تھی، بلکہ ''آیا صوفیاء'' کے یونانی کلیسا کی ہی تھی۔ قاسم صاف ستھرے اور سادہ لباس میں

اور اُس کے سر پر کلغی والی نیلے رنگ کی قیمتی ٹوپی بھی رکھی تھی۔ قاسم چرچ کے سامنے موجود خوبصورت باغ میں سے گزرتا ہوا چرچ کے مرکزی دروازے پر پہنچا۔ دروازے کے دونوں طرف دو پتھر نصب تھے جہاں باوردی پہرے دار لمبے لمبے نیزے لئے کھڑے تھے۔ پچھلے ایک ہزار سال سے انہی پتھروں پر آیا صوفیاء کے پہریدار کھڑے رہا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ دونوں پتھروں پر دو دو گڑھے پڑ چکے تھے جو دراصل پہریداروں کے پیروں کے نشانات تھے۔

قاسم بڑی لاپرواہی سے چلتا ہوا چرچ میں داخل ہو گیا۔ اُس کے سامنے سب سے پہلے ایک وسیع و عریض ہال تھا جو تقریباً مربع شکل میں تھا اور جس کی وسعت شمالاً جنوباً 231 فٹ تھی۔ بیچ کے گنبد کا قطر 107 فٹ اور چھت کی اونچائی 185 فٹ تھی۔ پوری عمارت میں 170 دیوہیکل ستون تھے۔ اپنے سر پر اس قدر اونچی چھت دیکھ کر قاسم کے دل پر چرچ کا رعب طاری ہونے لگا۔ چاروں طرف کی دیواروں میں غلام گردشیں اور بلکونیاں محراب بنے ہوئے تھے۔ (''جہانِ دیدہ'' از مفتی تقی عثمانی)

قاسم کے سامنے ہال کے 170 ستون ''ابوالہول'' کے مجسموں کی مانند کھڑے تھے۔ ہال میں عبادت کرنے والوں کے لئے قیمتی کرسیاں بچھی تھیں جن کا رُخ مشرق کی جانب تھا۔ کرسیاں دونوں طرف بچھی تھیں اور درمیان میں ایک دبیز قالین بچھا کر چلنے کے لئے روش بنائی گئی تھی۔ قاسم اس روش پر چلنے لگا۔ اس ہال کے علاوہ ''آیا صوفیاء'' کی عمارت اور دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ ہال کے چاروں طرف اعلیٰ قسم کے سنگ مرمر سے بنی راہداریاں تھیں جن میں بشپوں، پادریوں اور راہبوں کے کمرے اور دفاتر تھے۔ ان کمروں کی دوسری منزل پر چرچ کے بڑے عہدیدار مقیم تھے اور بطریق اعظم ثانی کا خاص کمرہ بھی یہیں تھا۔ چرچ کی تمام راہباؤں کے کمرے بھی دوسری منزل پر تھے۔ یہ راہبائیں ''نن'' یا ''سسٹرز'' کہلاتی تھیں۔ ان کا لباس سفید تھا اور ان کی قمیضوں کے کالر سرخ ہوا کرتے تھے۔ جو لڑکی راہبہ بن جاتی، وہ عمر بھر دنیاوی آلائشوں سے بظاہر دُور رہتی۔ لیکن کون جانتا تھا کہ سفید لباسوں میں ملبوس یہ ''ننیں'' کب چرچ کے تاریک کمروں میں اپنے لباس سرخ کر لیتی ہیں۔

قاسم روش پر چلتا ہوا اگلی نشستوں پر جا بیٹھا۔ اُس کے سامنے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کے فرضی مجسمے نصب تھے۔ یونانی کلیساؤں میں مسیح کے مجسموں کو نصب کیا جاتا تھا۔ قاسم بظاہر عبادت میں مشغول ہو گیا۔ وہ دیر تک ایک ہی حالت میں

آنکھیں بند کئے اور سر جھکائے بیٹھا رہا۔ وہ بظاہر مناجات پڑھ رہا تھا۔ لیکن درحقیقت
مارسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ مارسی اس چرچ میں راہبہ تھی۔ وہ جب سے چرچ
داخل ہوا تھا، اُس کے خون کی گردش میں تبدیلی آ چکی تھی..... نہ جانے کس قدم پر
سامنے آ جائے۔ وہ ایک گھنٹے تک سر جھکا کر اسی طرح بیٹھا رہا۔ وہ ابھی اور بھی بیٹھا
کہ اچانک اُسے اپنے بائیں شانے پر کسی کے ہاتھ کا نرم دباؤ محسوس ہوا۔ قاسم کے تن
میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ اُسے اپنی ریڑھ کی ہڈی سنسناتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اگلے لمحے
نے آنکھیں کھول دیں۔

یہ ایک بوڑھے فادر کا ہاتھ تھا جس کے چہرے پر باپ جیسی شفقت اور آنکھوں
ماں جیسی محبت تھی۔ یہ ''آیا صوفیاء'' کا ایک پرانا پادری تھا۔ قاسم کو اپنا باپ ''ہشام'' یا
گیا اور قاسم نے اپنے دل میں بوڑھے پادری کے لئے پُرخلوص جذبات محسوس کئے۔
قاسم مسکرا دیا۔ بوڑھا پادری بھی مسکرا دیا۔

''مجھے فادر بروس کہتے ہیں۔ میری عمر 70 سال ہے..... آپ شاید مہمان ہیں۔ کہاں
سے تشریف لائے ہیں؟''

بوڑھے پادری نے انتہائی شفیق لہجے میں قاسم سے کہا تو قاسم عاجزی سے مسکرا دیا
بولا۔ ''معزز فادر! میں تھریس کے چرچ سے آیا ہوں۔ خداوند یسوع مسیح کے خادموں
شامل ہوں اور اپنے مرکز کی بقاء کے لئے دُعا گو ہوں۔''

''تھریس کا چرچ..... وہ..... وہ جس کا بشپ لیمارک ہے؟''

قاسم نے فوراً جواب دیا۔ ''جی ہاں! معزز لیمارک کی خصوصی اجازت سے قسطنطنیہ
سفر کیا ہے میں نے۔ انہوں نے مجھے روانہ کرنے سے پہلے بطریق اعظم کے نام ایک
بھی دیا ہے۔''

تھریس کا کلیسا عثمانی عملداری میں تھا۔ حکومت ''سلطان'' کی تھی۔ لیکن تھریس کی
زیادہ تر عیسائی تھی۔ قاسم نے تھریس کا نام اس لئے لیا تھا کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا
''تھریس'' کے کلیسا میں تعینات ''بشپ لیمارک'' کے ساتھ ڈیمونان کے براہ راست
تعلقات تھے۔ قاسم نے لیمارک کی طرف سے خط بھی خود ہی لکھا تھا۔ قاسم کی بات سن
بوڑھا ''فادر بروس'' بہت خوش ہوا اور قاسم کو اُٹھ کر اپنے ساتھ بغلگیر ہونے کے لئے کہا
کچھ دیر بعد بوڑھا بروس قاسم کو لئے بطریق اعظم کے کمرے کی جانب جا رہا تھا۔
بطریق اعظم کی رہائش گاہ دیکھ کر قاسم دنگ رہ گیا۔ یہ کسی بادشاہ کی خوابگاہ سے کم

نہیں۔ کمرے کے دروازے پر باوردی دربان مستعد کھڑے تھے۔ بطریق اعظم کا کمرہ
حقیقت ایک بڑا ہال تھا جس میں ایک دبیز ایرانی قالین بچھا تھا اور اطلس و کمخواب کے
بھاری بھرکم پردوں کے ذریعے اس کمرے کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ چھت
کے درمیان میں ایک سنہری فانوس لٹک رہا تھا جس میں قیمتی یاقوت جڑے ہوئے تھے۔
پردوں کے آگے پیچھے بطریق اعظم کی خاص خادمائیں اپنے اپنے کاموں میں مصروف
تھیں۔ ایک حسین خادمہ جس نے ننوں کا لباس پہن رکھا تھا، بوڑھے بروس اور قاسم کو لے
کر بطریق اعظم کے کمرۂ ملاقات میں پہنچی۔ وہ بروس اور قاسم کو منقش دروازے کے
سامنے چھوڑ کر واپس چلی گئی۔ بروس نے دروازے کو دھکیلا اور اندر داخل ہوا۔

کمرے کی مغربی دیوار کے ساتھ ایک خوبصورت تخت بچھا تھا جس کے دائیں بائیں
بطریق اعظم کی حسین خادمائیں کھڑی تھیں۔ اور تخت پر بوڑھا بطریق اعظم کھدر کا انتہائی
سادہ لباس پہنے جلوہ افروز تھا۔ بطریق اعظم کے جسم پر سادہ لباس راہبانہ فقر کو ظاہر کرتا
تھا۔ بطریق اعظم نے قاسم اور بروس کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ قاسم اور بروس بطریق اعظم کے
سامنے بچھی آرام دہ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ تب بطریق اعظم نے بروس سے سوال کیا۔

''کیا بات ہے بروس! کیسے آنا ہوا؟ اور یہ تمہارے ساتھ مہمان کون ہیں؟''

بوڑھا بطریق اعظم بھی بروس کا ہم عمر تھا۔ اُس نے سوال کیا تو بروس بولا۔

''آسمانی باپ! یہ نوجوان، بشپ لیمارک کے چرچ سے آیا ہے۔ اس کا نام فادر
ایرون'' ہے۔ اور یہ آپ کے نام بشپ لیمارک کا خط بھی لایا ہے۔''

بطریق اعظم نے کسی قدر چونک کر قاسم کی جانب دیکھا اور قدرے سخت لہجے میں کہا۔

''بشپ لیمارک کا خط؟..... کہاں ہے وہ خط؟''

بطریق اعظم جانتا تھا کہ بشپ لیمارک بطریق اعظم ثانی ڈیمونان کو خط لکھا کرتا تھا۔
لیکن بدقسمتی سے بوڑھے بطریق اعظم نے خود کبھی لیمارک کی تحریر نہ دیکھی تھی۔ دراصل غیر
ملکی جاسوسوں کے ساتھ تمام تر رابطہ ڈیمونان خود رکھتا تھا۔ بطریق اعظم اگرچہ اسلام دشمنی
اور سرکاری میں ڈیمونان سے دو ہاتھ آگے تھا لیکن عثمانی سلطنت کے زیر سایہ چلنے والے
تمام چرچ ڈیمونان ہی سنبھالا کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ لیمارک کا خط دیکھ کر وہ کسی قدر
پریشان ہوا۔ اور وہ سوچنے لگا کہ اب تو باقی تمام علاقوں سے آنے والے پیغامات اور
مراسلوں کے ساتھ بھی اُسے ہی ملنا پڑے گا۔ کیونکہ ڈیمونان تو مر چکا تھا۔ بطریق اعظم کو
کچھ کام مشکل محسوس ہوا۔ بہرحال اُس نے بشپ لیمارک کا خط کھولا اور پڑھنے لگا۔ لکھا تھا۔

''عزت مآب مقدس باپ، جناب سربراہِ کلیسا ہائے قسطنطنیہ، بطریق اعظم آیا صوفیاء کے نام!..... بشپ لیمارک خادم دین یسوع مسیح بشپ برائے کلیسا ہائے تھریس و گرد و نواح کی جانب سے..... ہولی فادر! یہ نوجوان فادر ایرون آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ معزز بطریق ڈیمونان کی شہادت کے بعد میں نے پورے غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس نوجوان ایرون کی آیا صوفیاء کو شدید ضرورت ہے۔

ایرون میرے ہاتھوں میں پل کر جوان ہوا ہے اور میں اس کی طرف سے ہر طرح کی ذمہ داری اٹھانے کے لئے تیار ہوں۔ فادر ایرون گوناگوں صلاحیتوں کا مالک نوجوان ہے۔ جو آپ کے زیر سایہ رہ کر دی ہولی چرچ کے لئے توقع سے زیادہ مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

مناجات میں دُعاؤں کی درخواست!

فقط

بشپ کلیسا ہائے تھریس..... لیمارک۔''

بطریق اعظم جوں جوں خط پڑھتا گیا، اُس کے چہرے کی لکیروں میں اضافہ ہوتا گیا اور خط پڑھ کر اُس نے خط کے اختتام پر لگی مُہر کو بڑے غور سے دیکھا۔ یہ مُہر چند دن پہلے قاسم نے قسطنطنیہ کے ایک سادہ لوح زرگر کو بھاری رقم دے کر بنوائی تھی..... مُہر دیکھ کر بطریق اعظم کے چہرے پر کسی قدر اطمینان کی جھلک نظر آئی۔ لیکن اُس کی پوری تسلی نہ ہوئی۔ اُس نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو قاسم کی آنکھوں میں پیوست کرتے ہوئے پوچھا۔

''دیکھو نوجوان! آج کل قسطنطنیہ میں پرانے شناساؤں کو بھی شک کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔ ہم صرف لیمارک کا خط دیکھ کر تمہاری بات کا یقین نہیں کر سکتے۔ تمہارے پاس کوئی ثبوت ہے کہ تم تھریس کے کلیسا سے آئے ہو؟''

قاسم نے کھڑے ہو کر اور تعظیم کی حالت میں آگے کی طرف جھک کر بطریق اعظم کی خدمت میں عرض کی۔ ''مقدس باپ! آپ نے بجا فرمایا..... میرے پاس اس پریشانی کا حل یہ ہے کہ آپ مجھے آیا صوفیاء کے تہہ خانے میں قید کر لیں اور اس دوران اپنا ایلچی بھیج کر تھریس کے چرچ سے تصدیق کروا لیں۔ میں حرفِ شکایت زبان پر نہ لاؤں گا۔''

بطریق اعظم نے قاسم کو تحسین آمیز نظروں سے دیکھا۔ لیکن اُس مکار بوڑھے کی تسلی

ہونے میں ابھی بھی گنجائش باقی تھی۔ چنانچہ اُس نے فوراً کہا۔

''بالکل ٹھیک ہے..... یہی طریقہ بالکل ٹھیک ہے۔ ہم تمہیں لیمارک سے تصدیق تک آیا صوفیاء کے قید خانے میں پابند سلاسل رکھیں گے۔''

وہ قاسم کا ردِعمل دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن قاسم کوئی معمولی جاسوس تو نہ تھا کہ بطریق اعظم کی چال میں آ جائے۔ قاسم نے اپنے چہرے کو سپاٹ رکھا۔ بطریق اعظم نے تو یہاں تک کہا کہ مسلح دربانوں کو قاسم کی گرفتاری کے لئے اندر بھی بلا لیا۔ لیکن جب قاسم ٹس سے مس نہ ہوا تو بوڑھا بطریق اعظم پہلی مرتبہ ہنس دیا اور دربانوں کو واپس جانے کا اشارہ کیا۔ اب وہ قاسم سے مخاطب ہوا تو اُس کا لہجہ نرم تھا۔

''نہیں، ہم تمہیں گرفتار نہیں کرتے۔ تمہیں اگر لیمارک نے بھیجا ہے تو یقیناً قسطنطنیہ کی بہتری کے لئے بھیجا ہو گا..... اچھا ہوا تم آ گئے۔ عثمانی سلطنت میں موجود ہمارے سینکڑوں شناساؤں کا انچارج ڈیمونان تھا۔ اب ہمارے لئے یہ مشکل ہے کہ ہم عثمانی سلطنتوں میں اپنا جاسوسی کے نظام کو سنبھال سکیں..... تم اگرچہ ابھی صرف فادر ہو۔ اور ڈیمونان کا عہدہ نہیں سنبھال سکتے۔ لیکن تم ہمارے براہِ راست ماتحت رہ کر عثمانی سلطنت میں موجود شناساؤں کا کام نمٹانے میں ہماری مدد تو کر سکتے ہو..... چنانچہ میں تمہیں اپنا مشیر برائے کلیسا ہائے خارجہ مقرر کرتا ہوں۔ تین روز بعد یہاں دونوں کلیساؤں کی مجلس منعقد ہونے جا رہی ہے۔ ایسے موقع پر اگر مشرقی کلیساؤں کی بات چل نکلی تو مجھے تمہارے مشورے کی ضرورت پڑے گی۔ کیا تم اپنے آپ کو اس کام کے لئے تیار پاتے ہو؟''

قاسم کے دل میں خوشی سے لڈو پھوٹ رہے تھے۔ اُسے بالکل بھی توقع نہ تھی کہ اُسے اتنے اہم کام پر مامور کیا جائے گا۔ وہ تو چاہتا ہی یہی تھا کہ کسی طرح دونوں فرقوں کی مجلس کو تاڑ کر سکے۔ چنانچہ قاسم نے فوراً جواب دیا۔

''جی مقدس باپ! میں آپ کو ابھی بتا سکتا ہوں کہ ایڈریانوپل، تھریس، سربیا، بوسنیا، ہنگری اور البانیا کے علاوہ ساحل اناطولیہ کے ساتھ ساتھ دی ہولی آرتھوڈکس کے ماتحت چار سے زیادہ چرچ ہیں۔ جن کا براہِ راست تمام نظام آیا صوفیاء کے ماتحت چلتا ہے۔ اور ہمارے علاقے کو صرف چار یونانی الاصل بشپ سنبھالتے ہیں..... مزید ایک چرچ کا سے کر تمام معلومات میں آپ کے گوش گزار کر سکتا ہوں۔ اس کے علاوہ سلطان محمد اور مسلمانوں کے بارے میں بھی میرے پاس خاطر خواہ معلومات ہیں۔ جہاں تک عیسوی کی تعلیمات جاننے کا تعلق ہے تو خداوند کے کرم سے میں ان میں بھی کسی سے

پیچھے نہیں رہوں گا۔"

قاسم نے بڑی تفصیل کے ساتھ بطریق اعظم کو جواب دیا۔ اور پہلی بار بطریق کے چہرے پر مکمل اطمینان کی جھلک نظر آئی۔ یہ قاسم کی خوش نصیبی تھی کہ مجلس کے تین روز قبل قاسم اتنی بڑی مہم سر کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب اُسے پورے اعتماد احتیاط کے ساتھ اپنا منصب نبھانا تھا۔ اُس کے دل میں صرف ایک ہی خلش تھی کہ تک اُس کی بیتاب آنکھوں کے سامنے ماریا کا چہرہ نہ آ سکا تھا۔ لیکن اُس نے بے مہری کی، اور اُس وقت کا انتظار کرنے لگا جب سات سال کی جدائی کے بعد وہ اپنی ماریا موٹی موٹی آنکھوں کو پھر دیکھ سکے گا۔

قاسم خیالات میں گم تھا کہ بطریق اعظم کی آواز سنائی دی۔ "ٹھیک ہے میرے ایرون! ہم اپنی رہائش کے نزدیک ہی تمہارے لئے کمرے کا بندوبست کرتے ہیں۔ تم سے تمام پیغامات کے نگران ہو۔ تم فوری طور پر اپنا کام شروع کر دو۔ تاکہ ہم رومن کیتھو فرقہ والوں کے سامنے بھرپور معلومات اور پوری شان و شوکت سے مجلس میں بیٹھ سکیں۔"

اچانک بوڑھے بروس نے بطریق اعظم سے سوال کیا۔ "مقدس باپ!..... کیا اس میں شہنشاہ قسطنطنیہ بھی شریک ہوں گے؟"

"ہاں، شہنشاہ تین روز بعد آیا صوفیاء آئے گا۔ لیکن مجھے رومی کارڈنیل کی زیر صدارت بیٹھنے میں اپنی توہین محسوس ہوتی ہے اس لئے میں نے سوچا ہے کہ میں شہنشاہ سے صدارت کے مسئلے پر بات کروں گا۔"

قاسم کے دل میں خوشی کا دیا جلا۔ گویا نفرت کی زمین تو پہلے سے تیار تھی۔ قاسم صرف فصل کاٹنا تھی۔ قاسم نے بڑے افسوس کے ساتھ کہا۔

"اوہو! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں مقدس باپ! کیا قسطنطین نے کارڈنیل اسیڈور کو صدارت بخش دی ہے؟ اس طرح تو رومی کلیسا والے بغلیں بجائیں گے۔ مقدس باپ آپ تو جانتے ہیں کہ فادر ڈیمونان کی شہادت کے ذمہ دار یہی لوگ ہیں۔ ایسی صورت میں ہم کیسے برداشت کر سکتے ہیں کہ کارڈنیل ہمارے اجلاس کی صدارت کرے۔ ضرور اس سلسلے میں کچھ کیجئے۔"

بطریق اعظم کو قاسم کی باتیں بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ درحقیقت وہ خود اس اجلاس کی صدارت چاہتا تھا۔ وہ آیا صوفیاء کا سربراہ تھا اور کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ رومی کلیسا کا معمولی کارڈنیل اُس کے ہوتے ہوئے اجلاس کی صدارت کرے۔ وہ تو رومی کلیسا

جان نکلسن پنجم کو بھی اپنے سے کم تر سمجھتا تھا۔ پھر ایک کارڈنیل کی کیا حیثیت تھی۔ ہم کی بات سے اُسے محسوس ہوا کہ ڈیمونان کے قتل کے بعد صدارت کے لئے شہنشاہ پر رویا اب پہلے کی نسبت آسان ہے۔ چنانچہ اُس نے قاسم کو شاباش دی اور کہا۔

"میرے بچے ایرون! میرے دل میں تمہارے لئے بہت سی اُمیدیں پیدا ہونے لگی ہیں۔ خداوند کرے کہ تم ان اُمیدوں پر پورے اُترو۔ تم سب سے پہلے یہ کام کرو کہ آج ہی میرا نمائندہ بن کر قسطنطنیہ کی افواج کے سپہ سالار "گرانڈ ڈیوک نوٹاراس" سے ملو۔ اُسے آیا صوفیاء کے مؤقف سے آگاہ کرو۔ اُسے بتاؤ کہ بطریق اعظم کے ہوتے ہوئے ں میں کارڈنیل اسیڈور کی صدارت آیا صوفیاء کے لئے توہین آمیز ہے۔ مجھے اُمید ہے سپہ سالار ہماری حمایت کرے گا۔ کیونکہ نوٹا راس ایک کٹر مذہبی انسان ہے اور یونانی ما کا سچا پیروکار ہے۔"

قاسم کی تو گویا لاٹری کھل گئی تھی۔ اُس نے دل ہی دل میں سوچا کہ اب واقعتاً نطنیہ کے خاتمے اور قیصر کی ہلاکت کا وقت آ گیا ہے۔ اُسے رسالت مآب صلی اللہ علیہ کی حدیث مبارکہ یاد آئی..... "اذا ھلک قیصراً، فلا قیصر بعدہ"..... جب قیصر ہلاک یا تو اس کے بعد کوئی قیصر نہ ہو گا"..... وہ سوچ رہا تھا تائید ایزدی اس کے ساتھ قدم م چل رہی ہے۔ اُس نے بطریق اعظم کے پہلے حکم پر لبیک کہا اور سپہ سالار نوٹاراس کر جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ بعد ازاں کافی دیر تک بطریق اعظم اور قاسم کے یان بہت سی باتیں ہوئیں۔ لگ بھگ ایک گھنٹہ بطریق قاسم کو آئندہ حکمت عملی سے ق ہدایات دیتا رہا۔ اور پھر بطریق اعظم نے قاسم کو جانے کی اجازت دے دی۔

واپسی پر بھی قاسم کی نظریں آیا صوفیاء کے در و دیوار پر تیرتی رہیں۔ وہ جس نئے موڑ گزرتا اُس کا دل دھک سے رہ جاتا..... وہ سوچتا کہ ابھی اگلے قدم پر ماریا کھڑی ہو ..... لیکن ماریا اُسے نظر نہ آئی۔ بطریق اعظم کی خادمائیں قاسم کو اُس کی رہائش گاہ لے کے لئے لے چلیں۔ قاسم کو ایک کھلا اور ہوا دار کمرہ دکھایا گیا جس میں گزر بسر کی کوتیں موجود تھیں۔ یہ قاسم کا کمرہ تھا..... تھریس کے پادری "ایرون" کا۔ یا بطریق کے مشیر فادر ایرون کا۔ آج قاسم بہت خوش تھا۔ بطریق اعظم کی خادمائیں اُسے رے میں چھوڑ کر چلی گئیں۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ بوڑھا بروس ایک خادم اور ایک ر کے ہمراہ حاضر ہوا اور قاسم سے کہنے لگا۔

"ان دونوں کو بطریق اعظم نے آپ کی خدمت کے لئے بھیجا ہے..... یہ ہر وقت

آپ کی خدمت میں حاضر رہیں گے۔"

بوڑھا بروس چلا گیا۔ اور قاسم نے دونوں کے نام پوچھے۔ لڑکی کا نام "سونیا" لڑ
کا نام "ڈیوڈ" تھا۔ سونیا، والیشیا کی رہنے والی تھی اور ماں باپ کے مرنے کے بعد
اکیلی رہ گئی تھی۔ چنانچہ حوادثاتِ زمانہ سے بچنے کے لئے اُس کے دل میں یہی تر
کہ وہ کسی محفوظ چرچ کی خادمہ بن جائے۔ چنانچہ وہ "آیا صوفیاء" چلی آئی۔ اور ڈیوڈ
کا رہنے والا تھا جو اپنی گزشتہ زندگی میں ایک ظالم یہودی کی غلامی میں پل کر جوا
تھا۔ آیا صوفیاء کا ایک بشپ جرمنی کے دورے پر گیا تو اُس نے ڈیوڈ کو دین کا
کرنے کی دعوت دی۔ ڈیوڈ غلامی سے تنگ تھا۔ چنانچہ اُس نے یہ دعوت فوراً قبول کر
بشپ نے ظالم یہودی تاجر کو کلیسا کے خزانے سے رقم ادا کر کے آیا صوفیاء کی خدمت
لئے خرید لیا۔ اور یوں ڈیوڈ یہودی تاجر کی غلامی سے نکل کر آیا صوفیاء کی غلامی میں آ

سونیا کے نین تیکھے تھے اور چہرہ کھلتا ہوا تھا۔ وہ مسکراتی تو اُس کے سامنے کے
موتیوں کی طرح جگمگانے لگتے۔ قاسم نے دونوں خادموں کو کمرے میں ضروری اش
فراہمی پر مامور کیا اور خود اُنہیں کچھ بتائے بغیر کمرے سے نکلتا چلا گیا۔ وہ سرائے
ضروری سامان لینے جا رہا تھا۔

شام تک قاسم "آیا صوفیاء" میں پوری طرح مقیم ہو چکا تھا۔ اُس نے ایک ایک
دیکھ لیا لیکن اُسے ماری کہیں نظر نہ آئی۔ اب اُس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے والا تھ
یہاں تھریس کا پادری بن کر آیا تھا۔ اسی لئے وہ کسی سے ماری کے بارے میں پوچھ
نہیں سکتا تھا۔ خصوصاً اپنے دونوں خادموں پر تو اُسے ذرا بھر اعتماد نہیں تھا۔ اُسے یقین
کہ یہ دونوں اُس کے ایک ایک پل کی خبر بطریق اعظم تک پہنچائیں گے۔ ایسی حالت
وہ کیا کرتا..... وہ بے چینی کے عالم میں اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ وہ اپنے فرض کو
طرح سے نبھا رہا تھا لیکن اپنی محبت کا قرض ابھی اُس کے ذمہ تھا۔ اُسے جس قدر بے
بے صبری سے ماری کا انتظار تھا، ماری کے ملنے میں اتنی ہی دیر ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن
مقصد کے لئے قاسم نے ایک بار پھر صبر کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ شام کی مناجات پڑھنے
بہانے سے اپنے کمرے سے نکلا اور دوسری منزل کی اس گیلری میں چلنے لگا۔ یہاں
ایک بیش قیمت قالین بچھا تھا۔ گیلری کی چھت میں جگہ جگہ ہوا کے لئے گول گول
بنائے گئے تھے جن کے اوپر بارش کا پانی روکنے کے لئے محراب نما چھجے بنے ہوئے
گیلری دونوں دیواروں میں لگی مشعلوں کی وجہ سے جگمگا رہی تھی۔ یہ ایک طویل

تھی۔ قاسم اس کے آخری کونے میں پہنچ کر بائیں طرف مڑا اور ٹھٹھک کر رُک گیا۔ یہاں
ایک بڑی محراب تھی۔ گیلری میں جن کمروں کے سامنے اس طرح بڑی برآمدہ نما محرابیں
تھیں وہ خاص خاص لوگوں کی رہائش گاہیں تھیں۔ قاسم یہاں اس لئے ٹھٹھک کر رُکا تھا کہ
اُسے اس بڑی محراب کے فرش پر بہت سی عورتیں بیٹھی ہوئی نظر آئیں جو ایک عمدہ قالین پر
بیٹھی کسی خاص قسم کی عبادت میں مشغول تھیں۔ ان عورتوں نے ایک جیسے لباس پہن رکھے
تھے جن کا رنگ خاکستری تھا۔ قاسم ان تمام عورتوں کی پشت پر کھڑا تھا۔ محرابی برآمدے کے
فرش پر تو یہ عورتیں بیٹھی تھیں لیکن اُس برآمدے میں کھلنے والا کمرے کا دروازہ اندر سے بند
تھا۔ قاسم نے سوچا یہ کسی عبادت گزار راہب کا کمرہ ہو گا جس کی مرید عورتیں باہر خاموش
بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ قاسم تھوڑی دیر رُک کر پھر اپنے دھیان میں چل دیا۔

وہ مناجات سے فارغ ہو کر واپس آیا تو پھر اُسی راستے سے گزرا۔ اب بھی وہ عورتیں
ویسی کی ویسی ہی بیٹھی تھیں۔ قاسم کو عبادت کا یہ انداز دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی۔ وہ اپنے
کمرے میں آیا تو سونیا اُس کے کمرے میں موجود تھی۔ قاسم نے سرسری سے انداز میں
سونیا سے پوچھا۔

"سونیا! یہ اس طرف..... گیلری کے بائیں کونے میں بہت سی عورتیں ایک برآمدے
میں اجتماعی عبادت کر رہی ہیں۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہ کون عورتیں ہیں؟"

قاسم نے پہلی بار سونیا کو نام لے کر پکارا تھا۔ اُس کے چہرے پر ایک میٹھی سی
مسکراہٹ پھیل گئی اور اُس نے انتہائی معصوم نگاہوں کے ساتھ قاسم کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی وہ!..... وہ عورتیں "سسٹر میری" کی مرید ہیں۔ وہ عورتیں "آیا صوفیاء" کی نئیں
بلکہ راہبائیں نہیں، قسطنطنیہ کی معزز خواتین ہیں جو سسٹر میری کے نام کا دم بھرتی ہیں۔"

قاسم تو اور کچھ سن ہی نہ رہا تھا۔ اُس کے لئے "سسٹر میری" کا لفظ ہی حرفِ آخر ثابت
ہوا اور اُس کی شریانوں میں خون کی گردش بڑھ گئی۔ وہ "ڈیمونان" کے منہ سے سن چکا تھا
کہ "آیا صوفیاء" میں ماری کو سب لوگ "سسٹر میری" کے نام سے پکارتے تھے۔ قاسم کی
آنکھوں میں چمک بڑھنے لگی اور اُس کے دونوں ہاتھ اضطراری طور پر حرکت میں آ گئے۔
وہ اپنے دونوں ہاتھوں کی اُنگلیاں ایک دوسرے میں پیوست کرتا اور نکال دیتا..... پھر
پیوست کرتا اور نکال دیتا۔ وہ اسی طرح مضطرب رہا۔ اور پھر کچھ دیر بعد اُس نے نہ جانے
کیوں سونیا کی خوشامد شروع کر دی۔

"سونیا! تم اتنی حسین ہو کہ تمہیں کسی مشرقی ملک کی شہزادی ہونا چاہئے تھا۔ تمہاری

آنکھوں میں لعل بدخشانی جیسی چمک اور ہونٹوں میں گلاب کے پھولوں جیسا گداز
میں تمہیں دیکھتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں کہ خداوند کو تمہیں بنانے کے لئے کتنی روشنیاں
جمع کرنی پڑی ہوں گی۔''

یہ کسی مرد کا آخری حربہ ہو سکتا تھا۔ یعنی کسی عورت کو دامِ فریب میں جکڑنے کا آخری
حربہ تھا۔ یہ واقعی آخری حربہ تھا۔ دنیا میں ایک بھی عورت ایسی نہیں جو اپنی تعریف پر خوش
نہ ہوتی ہو۔ تعریف چاہے جھوٹی، غیر متوقع اور بے موقع ہی کیوں نہ ہو، بہرطور عورت کی
کمزوری ہے۔ چنانچہ قاسم نے بھی سونیا کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھایا۔ قاسم کی زبان
سے اس قدر اچانک اور بے ساختہ تعریف سن کر سونیا لذتِ پذیرائی کے نشے میں جھوم
گئی۔ اُس کی آنکھوں میں یکلخت سرخ سرخ ڈورے تیرنے لگے اور جس میں تعریفی الفاظ
نے سرشاری کا رس گھول دیا۔ اُس کا ایک ہاتھ بے ساختہ اپنے دل پر جا پڑا۔ وہ کچھ
چاہتی تھی لیکن اُس کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ وہ قاسم سے یہی کہنا چاہتی تھی..... کہ آپ
چپ کیوں کر گئے..... بولئے نا!! اور بولئے!..... بلکہ بولتے رہئے۔ قاسم جیسا وجیہہ
اور حسین مرد قسمت والیوں کی تعریف کر سکتا تھا۔ سونیا نے اپنی قسمت پر ناز کرنا شروع
دیا۔ قاسم نے اُس کی ہیجانی کیفیت دیکھی تو سمجھ گیا کہ تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا ہے۔ چنا
اپنے کارآمد حربے کا اثر دیکھنے کے لئے قاسم نے کہا۔

''سونیا! تم بہت حسین ہو۔ اور حسین چہرے جھوٹ بولتے اچھے نہیں لگتے۔ مجھے سچ
بتاؤ! میری خدمت کرنے سے پہلے بطریق اعظم نے تمہیں کیا ہدایات دیں؟''

اب سونیا موم کی طرح پگھل چکی تھی۔ وہ بھلا قاسم سے کیسے کچھ چھپا سکتی تھی۔ چنا
اُس نے فی الفور بتا دیا کہ واقعتاً بطریق اعظم نے اُسے قاسم کی جاسوسی کے لئے مقرر
تھا۔ قاسم دل ہی دل میں اپنے آپ کو داد دینے لگا۔ اب اُس نے سونیا کو مزید اعتماد
لینے کے لئے انتہائی غیر محسوس طریقے سے اپنی باتوں کے جال میں جکڑنا شروع کر دیا
لیکن قاسم ایک بات کا اچھی طرح دھیان رکھ رہا تھا۔ اُس نے پوری گفتگو میں ایک مرتبہ
بھی یہ نہ کہا کہ وہ سونیا پر فریفتہ ہے۔ وہ کوئی جھوٹی بات نہ کہنا چاہتا تھا۔ کچھ دیر بعد سو
پورے دل و جان کے ساتھ قاسم کی تابعدار بن چکی تھی۔ اور جب وہ جانے لگی تو قاسم نے
اُس سے سرسری انداز میں پوچھا۔

''اور ہاں..... یہ سسٹر میری کون ہے؟..... کیا کوئی راہبہ ہے؟''

''جی ہاں! وہ ایک البانوی راہبہ ہیں۔ لیکن تمام راہباؤں سے بالکل مختلف۔ وہ صرف

اتوار کے روز عبادت کرتی ہیں۔ باقی سارا وقت بند کمرے میں گزارتی ہیں۔
روحانیت کے کسی اونچے درجے پر بھی پہنچی ہوئی ہیں۔ کیونکہ جب وہ لیکچر دیتی ہیں تو
عورتیں رونے لگتی ہیں۔ شہر کی بڑی بڑی امیر کبیر خواتین سسٹر میری سے برکت حاصل
کرنے آتی ہیں۔ یقین جانئے! آیا صوفیاء میں اُن کی عزت اور احترام ''مدر سوزینا'' سے
بھی زیادہ ہے۔''

قاسم گہری دلچسپی سے سونیا کی باتیں سن رہا تھا۔ اُسے حیرت ہو رہی تھی کہ مارسی ان
چند سالوں میں کس قدر بدل گئی تھی۔ نہ جانے کیا سوچ کر قاسم نے پھر پوچھا۔

''کیا اُن کے لیکچر میں صرف عورتیں ہوتی ہیں، مرد نہیں ہوتے؟''

''جی بالکل نہیں۔ وہ عموماً مردوں کے سامنے تو آتی ہی نہیں۔ اکثر پردے میں رہتی
ہیں۔ ہاں!..... کبھی کبھی تہوار یا کرسمس کے موقع پر وہ جب اجتماعی عبادات میں شریک
ہوتی ہیں تو بغیر حجاب کے اُن کا چاند کی طرح روشن چہرہ دیکھ کر شرکاء محفل دیوانے ہو
جاتے ہیں۔'' سونیا نے آخری الفاظ شرارتاً مسکراتے ہوئے کہے۔ وہ اب قاسم کے ساتھ
خاصی بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ اُسے قاسم کے پاس رُکے ہوئے کافی دیر ہو
گئی تھی۔ لیکن پھر بھی اُس کا جی جانے کے لئے نہ چاہ رہا تھا۔ اب وہ طوعاً کرہاً دروازے
کی طرف مڑی اور مسرت سے بھرا ہوا دل لئے نکل گئی۔

قاسم کو مارسی کا سراغ مل چکا تھا۔ لیکن مارسی کے بارے میں یہ سن کر اُس کے دل میں
طرح طرح کے خدشات سر اٹھانے لگے۔ کبھی وہ سوچتا کہ یہ البانوی کنیز کی وہ بیٹی نہیں
ہے، جو ''لالہ شاہین'' کی یادگار میں اُس سے ملنے آیا کرتی تھی۔ اور کبھی وہ یہ سوچتا کہ
مارسی اب ایک مقدس اور باوقار راہبہ بن چکی ہے۔ لہٰذا اسے سسٹر میری سے دوبارہ ملنا
آسان نہ ہوگا۔ وہ تو یہ بھی سوچ رہا تھا کہ کیا مارسی دوبارہ اسلام چھوڑ کر عیسائیت میں
داخل ہو چکی ہوگی؟ حالانکہ وہ مسلمان ہو چکی تھی اور ابتدائی اسلامی تعلیمات بھی حاصل کر
چکی تھی۔ لیکن اُس کے دل نے جواب دیا کہ نہیں۔ مارسی نے اسلام کو نہیں چھوڑا ہوگا۔

سونیا کے جانے کے بعد دیر تک وہ اسی قسم کے خیالات میں گم رہا۔ وہ اسی ادھیڑ بن
میں تھا کہ اُس کے خادم ''ڈیوڈ'' نے اُسے بطریق اعظم کے بلاوے کا پیغام دیا۔ اور تب
قاسم کو یاد آیا کہ اُسے تو آج ہی سپہ سالار ''نوتاراس'' کے پاس جانا تھا۔ وہ اُچھل کر اُٹھا
اور بطریق اعظم کے کمرے کی جانب چل دیا۔

روٹیوں کا اختلاف

قسطنطنیہ میں جنگ کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ شہر کی تمام آبادی چیونٹیوں کی طر
رسد جمع کرنے پر لگی ہوئی تھی۔ شہنشاہ نے مغربی یورپ کے فرمانرواؤں کی جانب امداد
لئے تجربہ کار سفیر بھیج دیئے تھے۔ شہنشاہ "پوپ جان نکلسن" کی ہمدردی حاصل کرنے
لئے کلیسائے رومہ کے تمام مطالبات منظور کر کے یونانی کلیسا کو اُس سے منسلک کرنے
فیصلہ بھی کر چکا تھا۔ "وینس" اور "جنیوا" کے بحری بیڑے آبنائے باسفورس میں پہنچنے وا
تھے۔ قسطنطنیہ ایک لاکھ سے زیادہ کی آبادی کا شہر تھا۔ شہر بھر کے تمام معمار فصیل شہ
مرمت کرنے پر لگے ہوئے تھے۔ آہن گروں کا بازار شب و روز کھلا رہتا تھا اور چوبیس
گھنٹے سینکڑوں کاریگر جنگ کے لئے بھاری اسلحہ تیار کر رہے تھے۔ "گولڈن ہارن" میں
زنجیر کو نئے سرے سے مرمت کیا گیا۔ شہر کی فصیل چودہ میل قطاع دائرہ میں نہایت مضبو
اور ناقابل تسخیر تھی۔ فصیل شہر کے چاروں طرف ایک گہری خندق بھی کھدی ہوئی تھی جو
میں بوقت ضرورت سمندر کا پانی چھوڑ دیا جاتا۔ اور اس طرح شہر کی چاروں طرف پانی
پانی ہو جاتا۔ پرانی تعمیر کے برج اور دیوار کے وہ حصے جن پر توپیں چڑھائی جانی تھیں
ازسرنو مضبوط و مستحکم بنائے گئے۔

جنیوا کی افواج میں وہ مشہور و معروف سپہ سالار بھی تھا جس کا نام "کمانڈر جا
جسٹینانی" تھا۔ یہ یورپ کا ایک انتہائی مایہ ناز جرنیل تھا۔ شہنشاہ کو "جسٹینانی" کا شدت
انتظار تھا۔ جسٹینانی کے جہاز بہت جلد درِ دانیال عبور کرنے والے تھے۔

الغرض اہل قسطنطنیہ، "سلطان محمد خان" کے استقبال کی پوری تیاریاں کر چکے تھے۔

اُدھر سلطان محمد خان بھی قسطنطنیہ پر حملہ کرنے کے لئے اپنی تیاریوں کے آخری مرا
میں تھا۔ اس غرض سے کہ قسطنطنیہ کے محاصرہ کے دوران اُسے کسی دوسری جانب متوجہ
ہونا پڑے، اُس نے "امیر کرمانیا" سے پہلے ہی صلح کر لی تھی۔ اور اُس کی بیٹی کے ساتھ
شادی کر کے اس فتنے کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اس کے بعد اُس نے ہونیاڈے، شاہ ہنگری
ساتھ تین سال کی صلح کا معاہدہ کر لیا۔ ہونیاڈے رومن کیتھولک مذہب کا پیروکار تھا
قسطنطنیہ سے اختلافات کی وجہ سے اُس نے بھی سلطان کے ساتھ صلح غنیمت سمجھی اور

طرح سلطان نے اپنی پشت پر شمالی یورپ کے خطرے کو بھی ٹال دیا تھا۔ البتہ "موریا" کے
لانے میں قسطنطین کے دوسرے بھائیوں کی حکومت تھی۔ چنانچہ سلطان نے تجربہ کار
پاہیوں کا ایک لشکر "موریا" والوں کا راستہ روکنے کے لئے بھیج دیا۔

آبنائے باسفورس کے یورپی ساحل پر "رومیلی حصار" تعمیر ہونے کے قریب تھا۔
سلطان نے "ادرنہ" میں اسی ہزار سے زیادہ بہترین سپاہی اکٹھے کر لئے تھے۔ اور ابھی تک
رید بھرتی کا سلسلہ جاری تھا۔ سلطان جانتا تھا کہ قسطنطنیہ کی فتح کے لئے محض سپاہیوں کی
تعداد ہی کافی نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ سلطان کا انجینئر "اربان" شب و روز ایک بڑی اور تباہ
کن توپ تیار کرنے میں مصروف تھا۔ اُدھر سلطان کا بحری بیڑا بھی تیزی کے ساتھ اپنی
تکمیل کے مراحل طے کر رہا تھا۔

"ادرنہ" کے قصرِ سلطانی میں ننھے شہزادے کے قتل کے بعد "ملکہ سروین" کی شامیں
نہایت اُداس گزرنے لگیں۔ سلطان نے خود ملکہ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس واقعے پر
افسوس کا اظہار کیا اور ملکہ کو ہر طرح سے یقین دلایا تھا کہ ننھے شہزادے کے قتل میں اُس کا
ہاتھ نہیں۔ سلطانی لشکر کے مشہور سپہ سالار "احمد کدک پاشا" اور "محمود پاشا" ایک دوسرے
سے بڑھ چڑھ کر حملے کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔ جبکہ "آغا حسن" ہمہ وقت "ینی
چری" کے میدانِ حوائج میں ایک مصنوعی فصیل کو عبور کرنے کی مشق میں مصروف رہتا تھا۔
اس مشق میں آغا حسن کے ہمراہ پانچ سالار اور دو سو سے زیادہ سپاہی حصہ لے رہے تھے۔
آغا حسن کی باقی فوج بھی تیر اندازی، شمشیر زنی اور پیش قدمی کی مشقوں میں مصروف تھی۔
جس طرح ادرنہ میں ہر شخص کے چہرے پر جوش اور ولولے کی کیفیت تھی، اس کے بالکل
برعکس قسطنطنیہ میں خوف، دہشت اور کسی حد تک غصے کا سماں تھا۔

قاسم سپہ سالار "نوٹاراس" کے مہمان خانے میں داخل ہوا تو اُس کے نتھنے سے شراب
کی بو ٹکرائی۔ دربان نے قاسم کو ایک اُونچی نشست پیش کی اور خود قسطنطینوی افواج کے سپہ
سالار گرانڈ ڈیوک نوٹاراس کو بلانے کے لئے چلا گیا..... لحیم شحیم ڈیوس نوٹاراس کمرے میں
داخل ہوا تو قاسم نے اُٹھ کر اُس کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ شراب کے نشے سے نوٹا راس کی
آنکھیں کسی قدر بوجھل ہو رہی تھیں۔ نوٹاراس قاسم کے نزدیک بیٹھ گیا اور بھاری بھرکم
آواز میں مخاطب ہوا۔

"آپ بطریق اعظم کے خصوصی نمائندہ ہیں، اس لئے میں دوبارہ مہمان خانے میں آ
گیا۔ ورنہ کچھ دیر پہلے یہاں شہنشاہ کے دو نمائندوں کے ساتھ میں اپنا کافی وقت گزارا

ہے۔"

سپہ سالار نے اتنا کہا اور پھر ہاتھ بڑھا کر اپنے لئے شراب کا ایک اور جام بھرنے لگا۔ اُس نے چاندی کا جام ہاتھ میں پکڑا اور پھر کہا۔ "برا مت مانئے گا! میں بہت پیتا ہوں۔ جب سے سلطان محمد خان کے حملے کا سنا ہے، ذہن پر دباؤ رہتا ہے..... اس لئے پیتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے دل میں نوعمر سلطان کا خوف پیدا ہو..... میں بہت تجربہ کار ہوں، آپ تو جانتے ہی ہوں گے۔"

نوٹاراس کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ضرورت سے زیادہ نشہ کرتا ہے۔ قاسم نے موقع غنیمت سمجھا اور جلدی سے کہا۔ "محترم سپہ سالار! آپ بے شک پی لیجئے! شراب سے آپ کی شجاعت دوبالا ہو جائے گی..... ویسے بھی آپ بہت بہادر ہیں۔ آپ کے ہوتے ہوئے کس کی مجال ہے کہ قسطنطنیہ کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے۔ لیکن آپ کچھ پریشان کر رہے تھے، شہنشاہ کے نمائندوں کی۔ آپ نے بات ادھوری چھوڑ دی۔"

قاسم نے جب دیکھا کہ نوٹاراس نئے گلاس میں سے بھی تین چار گھونٹ لے چکا ہے تو اپنے مطلب کی بات کر دی۔ اب تو نوٹاراس کا نشہ اور بھی بڑھ چکا تھا۔ وہ قاسم کی بات سے بہت خوش ہوا۔ یہاں تک کہ خوشی سے جھومنے لگا اور اپنی تعریف پر واہ واہ کرنے لگا۔ قاسم کی بات سن کر نوٹاراس نشیلے لہجے میں مخاطب ہوا۔

"شہنشاہ کے نمائندے؟..... ہاں! وہ بیوقوف مجھے یہ بتانے آئے تھے کہ جنرل جسٹینانی کا استقبال کس طرح کرنا ہے..... آپ بتائیں! کیا میں ایک چھوٹی سی بستی کے کمانڈر کے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو سکتا ہوں؟" نوٹاراس نے قاسم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ قاسم فوراً بول اُٹھا۔

"بالکل نہیں۔ یہ تو بازنطینی سلطنت کے لئے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ایک چھوٹی سی ریاست جنیوا کا فوجی سالار آپ جیسے عظیم سپہ سالار کی ماتحتی کرے یہ ہی اچھا لگتا ہے..... آپ نے شہنشاہ کے جاسوسوں کو کیا جواب دیا؟"

قاسم ہر موقع سے بھرپور فائدہ اٹھا رہا تھا۔ اُس نے نوٹاراس کی خواہش کے مطابق گفتگو شروع کر دی۔ اب تو نوٹاراس مکمل طور پر لہر میں آ گیا۔

"واہ!..... واہ!..... فادر! آپ بہت اچھے ہیں۔ آپ میرے درد کو سمجھتے ہیں۔ یہ سے جان جسٹینانی نے قسطنطنیہ کا رُخ کیا ہے، شہنشاہ کی نظروں میں میری قدر ہی رہی۔ لیکن میں اس جنگ میں شہنشاہ پر ثابت کر دوں گا کہ میں کتنا بڑا سالار ہوں.....

وہ جو آج کل ہمارے سروں پر مسلط ہے..... وہ..... تم تو اُسے جانتے ہو گے..... میں کارڈنیل کی بات کر رہا ہوں..... کارڈنیل اسیڈور، گھٹیا انسان....." سپہ سالار نوٹاراس شراب کے نشے میں خود بخود اُس طرف نکل آیا جدھر قاسم اُسے لانا چاہتا تھا۔ سپہ سالار نے کارڈنیل کی بات خود چھیڑ دی تھی۔ چنانچہ قاسم نے اُسے کہا۔

"آپ کارڈنیل اسیڈور کی بات کرتے ہیں، میں خود اسی سلسلے میں آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔ آپ تو اپنے دُکھ درد کو شراب کی مدد سے بھلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن بطریق اعظم تو ایسا نہیں کر سکتے..... خداوند خیر کرے، شہنشاہ کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے جو وہ قسطنطنیہ کے تمام امرائے سلطنت کی تذلیل کرنے پر تلا ہوا ہے۔ ادھر آپ کو حکم ملا کہ ایک معمولی جنرل جان جسٹینانی کے آگے جھک جائیں اور اُدھر شہنشاہ نے "آیا صوفیاء" میں دونوں کلیساؤں کو ملانے کے لئے جس مجلس کو منعقد کرنے کا اعلان کیا ہے اس کی صدارت کارڈنیل اسیڈور کو سونپ دی ہے۔ آپ تو جانتے ہیں کارڈنیل کلیسائے رومہ کا ایک معمولی عہدہ ہے۔ جبکہ بطریق اعظم کا عہدہ عیسائی دنیا کا سب سے بڑا عہدہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بطریق اعظم بہت پریشان ہیں۔ انہوں نے مجھے آپ کی خدمت میں اسی لئے بھیجا ہے تاکہ میں آپ کو بطریق اعظم کے جذبات سے آگاہ کر سکوں۔ اُن کا فرمان ہے کہ کارڈنیل اسیڈور کی صدارت یونانی کلیسا کے لئے توہین کا باعث ہے۔"

قاسم اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ وہ اپنی بات کے دوران نوٹاراس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ ملاحظہ کر رہا تھا۔ نوٹاراس خود یونانی تھا اور پھر کٹر مذہبی تھا۔ چنانچہ وہ یونانی کلیسا کی توہین سنتے ہی مشتعل ہو گیا اور بھنا کر بولا۔

"ہرگز نہیں۔ میں دی ہولی آرتھوڈکس چرچ کی یہ ذلت کبھی گوارا نہیں کروں گا۔ آپ بطریق اعظم کو میرا پیغام پہنچا دیجئے کہ وہ بالکل فکرمند نہ ہوں۔ بلکہ انہیں میری طرف سے یہ مشورہ بھی دیجئے کہ وہ کل ہی شہر میں موجود تمام پادریوں اور راہبوں کی ایک ہنگامی مجلس کا انعقاد کریں جس میں تمام چرچوں کو یہ حکم دیا جائے کہ وہ عوام میں شہنشاہ کے ان اقدامات کے خلاف تحریک چلائیں۔ اور لوگوں کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ کارڈنیل کی صدارت اور رومن کیتھولک چرچ کی بالادستی کسی صورت گوارا نہ کریں گے۔"

قاسم تو سمجھ رہا تھا کہ سپہ سالار نشے میں بہک چکا ہے۔ لیکن سپہ سالار کا مشورہ سن کر قاسم نے سوچا کہ نوٹاراس پوری طرح ہوش میں ہے۔ نوٹاراس بلا کا مے نوش تھا۔ اُسے بہت کم نشہ چڑھتا تھا۔ قاسم نوٹاراس کے مشورے پر بہت مسرور ہوا۔ اُس نے نوٹاراس کو

داد دی اور وعدہ کیا کہ وہ بطریق اعظم کو مشترکہ اجلاس سے پہلے یونانی کلیسا کا ایک خ اجلاس بلانے کے لئے قائل کرے گا۔

معاً قاسم کے ذہن میں خیال آیا اور اُس نے انتہائی سلیقے سے نوٹاراس سے ایک اہ سوال کر دیا۔ ''محترم سپہ سالار! اگر آپ برا نہ مانیں تو میں صرف اپنی تسلی کے لئے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں..... اور وہ یہ کہ کیا ہم اکیلے رومی کلیسا کی امداد کے بغیر سلطان خان کی طاقتور فوج کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں؟..... میرا مطلب ہے ہمارے پاس کتنی جنگی صلاحیت ہے؟''

قاسم کا سوال سن کر نوٹاراس کا چہرہ فق ہو گیا۔ کسی نے گویا اُس کے جسم کا خون نچوڑ لیا تھا۔ دراصل یہ سلطان محمد خان کے نام کی دہشت تھی۔ نوٹاراس عثمانی سلاطین کے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا۔ لیکن پھر بھی اُس نے کسی قدر سنبھل کر قاسم کو جواب دیا۔

''ہمارے پاس اپنی فوج پچاس ہزار سے کچھ زیادہ ہے۔ جس میں آدھے سے زیادہ سوار دستے ہیں۔ اس کے علاوہ قسطنطنیہ کے گرد و نواح سے اور یونان کے بعض علاقوں سے ہمارے پاس اتنی فوجی امداد پہنچ جائے گی کہ ہماری تعداد سلطانی فوج کے برابر ہو گی۔ ایک چیز میں ہم سلطان پر حاوی ہیں، اور وہ ہے بحری طاقت۔ عثمانیوں کے پاس نہ بحری قوت ہے نہ مہارت۔ اُن کے مقابلے میں ہم تو رہتے ہی سمندر کے بیچوں بیچ ہیں۔ اور پھر سب سے بڑی بات کہ ہماری فصیل اتنی مضبوط ہے جسے آج تک کوئی فاتح بھی عبور نہیں کر سکا۔''

قاسم نے انتہائی نازک معلومات اُگلوانی شروع کر دی تھیں۔ اور یہی قسطنطنیہ میں اُس کا فریضہ تھا۔ نوٹاراس فصیل کی بات پر پہنچا تو قاسم نے جھٹ سے کہا۔

''لیکن میں نے تو سنا ہے کہ فصیل شہر بعض جگہوں سے ناکارہ ہو چکی ہے..... کیا یہ درست ہے؟''

''ہاں یہ سچ ہے۔ لیکن اب تو نہایت تیزی سے ان مقامات کی مرمت کا کام جاری ہے..... ہم مسلمانوں سے مار نہیں کھائیں گے۔ کیونکہ قسطنطنیہ پر یسوع مسیح کا سایہ ہے۔ آپ تو فادر ہیں، مجھ سے بہتر جانتے ہوں گے۔'' نوٹاراس نے اپنے دل کو تسلی دینے کے لئے مذہبی برکات کا سہارا لیا۔ قاسم یہ موقع ہاتھ سے کہاں جانے دیتا تھا۔ فوراً بولا۔

''کیوں نہیں! جس شہر میں آیا صوفیاء جیسا مرکز ہو اُس شہر کو آنچ کیسے آ سکتی ہے۔ میں آپ کو پورے یقین کے ساتھ یہ بتاتا ہوں کہ یہ شہر رہتی دنیا تک اسی طرح ہنستا بستا آباد رہے گا۔''

''شاباش نوجوان فادر!..... آپ کے حوصلے بہت بلند ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہم رومن بنوک چرچ کے سامنے ذلیل ہونے سے بچ جائیں گے۔''

اس طرح کی باتوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا اور بہت سا وقت گزر گیا۔ قاسم نے نوٹاراس سے بہت سی اہم اور خفیہ معلومات حاصل کر لی تھیں اور اب قاسم سوچ رہا تھا کہ اُسے آج رات ہی سلطان کے نام ایک طویل خط تحریر کرنا پڑے گا۔

قاسم نوٹاراس کے گھر سے لوٹا تو سونیا اُس کے کمرے میں موجود تھی۔ اُس نے نہا دھو کر نیا لباس پہن رکھا تھا اور پلکوں کو کالا کرنے کے لئے خصوصی مسالہ لگا رکھا تھا۔ اُس کے چہرے پر ایک لٹ کسی سانپ کی طرح کنڈل مارے بیٹھی تھی اور اُس کے گالوں میں دبی دبی سی کی وجہ سے بھنور پیدا ہو رہے تھے۔ سونیا راہبہ تو نہ تھی، صرف خادمہ تھی۔ لیکن پھر بھی آیا صوفیاء جیسے چرچ میں اُس کا اس طرح بن سنور کر رہنا قاسم کو عجیب سا لگا۔ لیکن قاسم اپنے تیر بہ ہدف نشانے پر دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ سونیا محض اس لئے بن ٹھن کر آئی تھی کہ قاسم جیسے وجیہہ نوجوان نے اُس کی بہت زیادہ تعریف کر دی تھی۔ لیکن پھر بھی قاسم کو سونیا کی موجودگی پر حیرت ہوئی اور اُس نے اپنے پچھلے رویئے کو برقرار رکھتے ہوئے سونیا سے پوچھا۔

''سونیا! اس قدر بن سنور کر رہو گی تو کسی دیوانے کی نظروں میں آ جاؤ گی۔ میں تو کہتا ہوں اپنا خیال رکھا کرو..... اور ہاں، اس وقت میرے کمرے میں تمہارا آنا کیسے ہوا؟''

قاسم کی بات کے پہلے حصے نے سونیا پر سرشاری کی کیفیت طاری کر دی۔ لیکن پھر ایک دم اُسے اپنا فرض یاد آیا اور اُس نے قاسم سے کہا۔ ''میں بطریق اعظم کے حکم سے یہاں آئی ہوں۔ انہوں نے کہا ہے کہ آپ جس وقت بھی تشریف لائیں اُن سے مل لیں۔''

قاسم ایک لمحے کے لئے چونکا اور پھر کچھ سوچ کر بطریق اعظم کے پاس جانے کے لئے مڑا۔ پیچھے سے سونیا کی آواز سنائی دی۔

''بطریق اعظم نے مجھے آپ کے بارے میں بھی پوچھا تھا۔''

قاسم ایک دم رُک گیا۔ اور پھر سونیا کی طرف متوجہ ہو کر دریافت کیا۔

''تو پھر تم نے کیا بتایا؟''

''میں نے یہ بتایا کہ آپ دین یسوع مسیح کے سچے خادم اور مخلص عیسائی ہیں۔ آپ کے دل میں قسطنطنیہ کو بچانے کا بے پناہ جوش ہے۔ اور آپ ایک بالکل سچے اور کھرے انسان ہیں..... کیا میں نے صحیح بتایا؟''

اب قاسم حیران ہو رہا تھا۔ اُسے توقع نہ تھی کہ تھوڑی سی تعریف پر سونیا اس قدر
جائے گی۔ وہ پریشان ہونے لگا۔ یہ لڑکی کہیں اُس پر فریفتہ تو نہیں ہو گئی۔ اسی خیال
تحت اُس نے سونیا کو پہلی بار قدرے روکھا سا جواب دیا۔

''سونیا! تمہارا بہت بہت شکریہ کہ تم نے سچ سچ بات بطریق اعظم کو بتا دی۔''

قاسم کمرے سے نکل آیا اور سونیا اُس کو پشت کی جانب سے میٹھی میٹھی نظروں
ساتھ دیکھتی رہ گئی۔

اگلا دن قاسم کے لئے اور زیادہ مصروفیت کا تھا۔ بطریق اعظم نے نوٹارس کا
مشورے پر یونانی کلیسا کی میٹنگ طلب کر لی تھی۔ قاسم، بطریق اعظم کے کہنے پر فرما
دستاویزات تیار کرنے میں مصروف ہو گیا۔ بطریق اعظم یونانی کلیسا کے تمام پادریوں
شہنشاہ کی ہر زیادتی کا ثبوت دکھانا چاہتا تھا۔ بطریق اعظم کا اثر و رسوخ چھوٹے چھو
پادریوں کی وساطت سے تمام علاقوں کے عوام میں دُور دُور تک تھا۔ یہی دور تھا
''رومہ'' میں وہاں کے شہنشاہ سے زیادہ پوپ کی قوت تھی۔ اور قسطنطنیہ میں شہنشاہ
زیادہ بطریق اعظم کی شہرت اور قدر و قیمت تھی۔ اسی دور کو یورپ کے زوال کا آغاز
کہا جاتا ہے۔

مذہبی منافرت عروج پر تھی۔ اور ابھی ''مارٹن لوتھر'' کا پروٹسٹنٹ فرقہ پیدا نہ ہوا
''رومہ'' کا پوپ پوری مغربی عیسائی دنیا کا صرف روحانی پیشوا ہی نہ تھا بلکہ تمام سیاہ و
کا مالک تھا۔ اسی زمانے میں ''رومہ'' میں کلیسا کی مذہبی عدالت نے لاچار عوام پر
درپے مظالم ڈھائے۔ عیسائیت ہوس پرست مذہبی پیشواؤں کی لونڈی بن چکی تھی اور
کے تمام مذہبی پیشوا بری طرح بے راہ روی کا شکار ہو چکے تھے۔ نشاۃِ ثانیہ کے دور
پہلے پہلے تک وسطی زمانے میں یورپ کے زوال کی آخری ایک دو صدیاں عیسائی پادر
کی سفاکی اور مظالم کی گواہ ہیں۔

تیرھویں صدی عیسوی میں سسلی اور جرمنی کے بادشاہ ''فریڈرک ثانی'' پر پاپائے
نے کفر کا فتویٰ لگایا تو فہرست الزامات میں یہ بھی درج تھا کہ ہر روز مسلمانوں کی طر
غسل کرتا ہے۔ غلیظ جسم اور میلے لباس کی وجہ سے جوؤں کی یہ کثرت تھی کہ ''کنٹربری''
لاٹ پادری باہر نکلتا تو اُس کی قباء پر سینکڑوں جوئیں چلتی پھرتی نظر آتیں۔ 1020ء
لندن کے بازاروں میں انسانی گوشت بکتا تھا۔ فرانس کے ایک دریا ''ساؤن'' کے کنارے
انسانی گوشت کی کتنی ہی دُکانیں تھیں۔ پاپائے روم کی عدالت نے اپنے قیام کے

یہاں دو ہزار اشخاص کو زندہ جلایا اور دس برس میں ستر ہزار افراد کو آگ میں پھینکا۔ فرانس
کی مشہورِ زمانہ حریت پسند خاتون ''جون آف آرک'' بھی 1431ء میں اسی سزا کا شکار
ہوئی۔ یہ پاپائے روم کے بلا شرکت غیرے اختیار کا زمانہ تھا۔ اخلاقی گراوٹ کا یہ عالم تھا
کہ روما کے اوّلین بادشاہوں میں سے پندرہ ہم جنس پرست تھے۔

قاسم اپنے کمرے میں آج شام ہونے والی میٹنگ کے لئے تیاری میں مصروف تھا کہ
شعلہ جوالا سونیا پھر کمرے میں داخل ہوئی۔ سونیا نے کمرے میں داخل ہوتے ہی دروازہ
اندر سے بند کر دیا۔ وہ دوڑتی ہوئی قاسم کے قریب آئی اور اُس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔
اور پھر یہ دیکھ کر قاسم کے چھکے چھوٹ گئے کہ سونیا رو رہی ہے۔ قاسم ششدر رہ گیا..... یہ
کیا ماجرا تھا؟..... سونیا روتی چلی جا رہی تھی اور قاسم ہونقوں کی طرح آنکھیں پٹپٹاتا ہوا
اسے دیکھے جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد قاسم کو ہوش آیا اور اُس نے سونیا سے پوچھا۔

''سونیا! کیا بات ہے؟ کیوں رو رہی ہو؟ کسی نے کچھ کہا ہے؟''

''نہیں معزز مہمان، نہیں! مجھے کسی نے کچھ نہیں کہا۔ مجھے جو کچھ کہا ہے آپ نے کہا
ہے..... میں پریشان ہوں۔ مجھے رات بھر نیند نہیں آئی۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا، میں کیا
کروں؟''

قاسم سونیا کا مرض سمجھ گیا تھا۔ وہ حالات کی ستائی ہوئی ایک غمزدہ لڑکی تھی۔ اُس کے
ان نرم لہجہ اور محبت کے دو الفاظ سننے کے لئے ترسے ہوئے تھے۔ اُسے جو بھی زندگی میں
اجنبی ہوس کا نشانہ بنانے کے لئے ملا تھا۔ وہ بڑے بڑے راہبوں اور بطریقوں کے
درونی رازوں سے باخبر تھی۔ حتیٰ کہ بوڑھا بطریق اعظم بھی سونیا کی دسترس سے باہر نہ
تھا۔ لیکن سونیا کا دل کھول کر کبھی کسی نے نہ دیکھا تھا کہ وہ کس قدر زخمی ہے۔ کل جب
قاسم نے جھوٹے منہ سونیا کے ساتھ دو چار نرمی کی باتیں کیں اور سونیا کی تعریف کی تو وہ
پگھل گئی۔ اُس کے دل پر کچھ ایسا ہیجان طاری ہوا کہ رات بھر ایک پل کے لئے بھی نہ سو
سکی۔ رات بھر قاسم کی تصویر اُس کی آنکھوں میں گھومتی رہی۔ وہ صبح سے اب تک کمرے
میں بیٹھی اپنے مقدر پر روتی رہی تھی۔ وہ اپنے آپ کو اُس وجیہہ نوجوان کے لائق نہ پاتی
تھی جو اُس کی جانب ملتفت ہوا تھا۔ وہ قاسم کے قریب بیٹھ کر روتی رہی۔ اور جب اُس
کے بہت سے آنسو بہہ گئے تو خود بخود مسکرا دی۔ یہ عجیب منظر تھا۔ اُس کی بری ہوئی
آنکھیں ابھی گیلی تھیں اور اُس کے نازک رخساروں پر آنسوؤں کی لکیریں ابھی چمک رہی
تھیں۔ جبکہ وہ کسی معصوم بچے کی طرح مسکرا رہی تھی۔ اُس کے گلابی ہونٹوں کے عقب میں

موتیوں کی قطار جگمگا رہی تھی اور قاسم سوچ رہا تھا کہ وہ ''آیا صوفیاء'' کی خادمہ نہیں آسمانوں کی کوئی فرشتہ ہے۔''

قاسم بھی پُرخلوص انداز میں مسکرا دیا اور بولا۔ ''تم بھی عجیب ہو سونیا! روتی بھی ہو ہنستی بھی ہو۔ جاؤ، دروازہ کھول کے آؤ۔ اس طرح دروازہ بند کر کے بیٹھنا اچھی بات نہیں۔''

سونیا کو قاسم کا اپنائیت بھرا لہجہ مزا دے گیا۔ وہ جھومتی ہوئی اُٹھی اور جا کر دروازہ کھول دیا۔ اُس نے صرف دروازے کی کنجی ہٹائی تھی، پٹ نہ کھولے تھے۔ وہ پھر قاسم کے نزدیک آئی اور شرارت زدہ لہجے میں بولی۔

''کیا آپ کو سسٹر میری بہت اچھی لگتی ہیں؟ میں آپ کو بتاؤں، مجھے خود سسٹر میری بہت اچھی لگتی ہیں۔ میں دن میں ایک آدھ مرتبہ اُن کے پاس ضرور جاتی ہوں..... اور آپ کو پتہ ہے، میرا دل جب بھی اُداس ہوتا ہے میں سسٹر میری کے پاس چلی جاتی ہوں۔ وہ میرے ساتھ ایک بہن کی طرح پیش آتی ہیں اور میری اُداسی لمحوں میں دُور ہو جاتی ہے۔''

مارسی کے ذکر سے قاسم کا دل ڈولنے لگا۔ سونیا کی یہ بات کہ وہ مارسی کے پاس روزانہ جاتی ہے، قاسم کو چونکا دینے کے لئے کافی تھی۔ یکلخت قاسم کے دل میں ایک عجیب و غریب خیال آیا۔ قاسم کچھ دیر تک اپنے خیال پر غور کرتا رہا اور پھر کسی فیصلے پر پہنچ کر خود بخود مسکرا دیا۔ اگلے لمحے وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور اپنے سامان میں سے مارسی کی انگوٹھی نکال لایا۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ اُس کے اس اقدام سے بے چاری سونیا اور زیادہ غلط فہمی میں مبتلا ہو جائے گی۔ وہ ایک لمحے کے لئے جھجکا بھی، لیکن پھر اپنا مقصد دل میں سوچ کر مطمئن ہو گیا۔ وہ دو قدم سونیا کی جانب بڑھا اور مارسی کی انگوٹھی سونیا کی جانب بڑھاتے ہوئے انتہائی اپنائیت سے کہنے لگا۔

''سونیا! میں ایک راہب ہوں..... تمہیں جسمانی محبت تو دے نہیں سکتا۔ البتہ اپنا روحانی محبت کا تحفہ تمہیں دیتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ تم مجھ سے زیادہ اُمیدیں وابستہ مت کرو۔ کیونکہ تم جانتی ہو کہ ایک راہب محبت تو کر سکتا ہے لیکن شادی کبھی نہیں..... یہ لو یہ انگوٹھی پہن لو۔''

سونیا کی حالت دیکھنے والی تھی۔ قاسم کے الفاظ سونیا کے کانوں میں کسی رسیلی شراب کی طرح اُترے اور وہ وارفتہ ہو گئی۔ اُس کی آنکھیں عقیدت کے نشے سے بھر گئیں اور ہونٹ فرطِ جذبات سے کانپنے لگے۔ اُسے اپنے نصیب سے خوف آنے لگا۔ آج تو قاسم نے انگوٹھی کا تحفہ دے کر اُسے مار ہی دیا تھا۔ اُس نے اپنا داہنا ہاتھ آگے بڑھایا اور انگوٹھی پہننے

کے لئے اُنگلی الگ کر لی۔ قاسم کے ہاتھ نے اُس کی نرم و نازک اُنگلی کو چھوا تو جسم میں بجلی دوڑنے کی بجائے سونیا کے کانپتے ہوئے جسم کو قرار آ گیا۔ اُسے یوں لگا کہ یہ انگلی پکڑ کر قاسم نے جیسے اُسے دنیا کے جہنم سے باہر کھینچ لیا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے یکے بعد دیگرے ٹپ ٹپ فرش پر گرے اور سونیا کو یوں لگا جیسے ایک دم دنیا جہان کے سارے دُکھ اُس کے کندھوں سے اتر گئے ہوں۔

عین اُس وقت جب قاسم سونیا کو انگوٹھی پہنا چکا، قاسم کے کمرے کا دروازہ ''چراک'' کی آواز کے ساتھ کھلا اور ایک اجنبی چہرے کو دیکھ کر قاسم کے اوسان خطا ہو گئے۔ سونیا بھی بری طرح سہم کر ایک جانب سمٹ گئی۔ کیونکہ دروازے میں نظر آنے والا اجنبی کینہ توز نظروں سے قاسم اور سونیا کو گھور رہا تھا۔ یہ پچاس سال کے پیٹے کا ایک ادھیڑ عمر لیکن توانا شخص تھا۔ اس کا قد لمبا اور جسم بھرا ہوا اور مضبوط تھا۔ اس کی آنکھوں میں سب سے زیادہ نفرت تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اُس کی آنکھیں دو سرخ انگاروں کی طرح دہک رہی ہوں۔ اُس کے جسم پر بطریقوں جیسا لباس تھا اور اُس نے ہاتھ میں ایک لمبا عصا پکڑ رکھا تھا۔ اُس کی سانپ جیسی پھنکارتی ہوئی آنکھوں کے اُوپر اُس کی بھنویں اتنی گھنی تھیں کہ اجنبی کی آنکھ بھنوؤں کے سائے میں نیم تاریک دکھائی دیتی تھی۔ یہ ''شاگال'' تھا..... ''آیا صوفیاء'' کا جن..... سونیا اسے ''آیا صوفیاء'' کا جن کہا کرتی تھی۔ بلکہ سونیا کسی حد تک سچ مچ اُسے جن پریت ہی مانتی تھی۔ کیونکہ یہ جب کئی کئی دن کے لئے غائب ہو جاتا تو پوری دنیا میں اس کی کوئی خبر نہ ہوتی کہ ''شاگال'' کہاں ہے؟ اور پھر یہ کبھی کبھی اچانک ''آیا صوفیاء'' میں لوگوں کو دکھائی دیتا تو سب سہم جاتے۔ ایک بات یہ بھی مشہور تھی کہ کوئی شخص شاگال کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں دیکھ سکتا۔ حتیٰ کہ بطریق اعظم تک سب ہی شاگال سے آنکھیں چراتے تھے۔ لوگوں میں تو یہاں تک خیال پایا جاتا تھا کہ ''شاگال'' کی آنکھوں میں ایک منٹ سے زیادہ دیر تک دیکھنے والا زندہ نہیں رہتا۔ وہ چوبیس گھنٹے کے اندر مر جاتا ہے۔ یہ بات کچھ اتنی زیادہ غلط نہ تھی۔ سونیا کی آنکھوں کے سامنے شاگال ایک دو لوگوں کو اسی طرح ہلاک کیا تھا۔ شاگال زیادہ تر خاموش رہتا۔ اُس کا چہرہ اس قدر پُراسرار تھا کہ اسے غور سے دیکھنے والا دہشت زدہ ہو جاتا۔ چرچ میں اور لوگوں کا بھی خیال تھا کہ شاگال انسان نہیں بلکہ ''قسطنطین'' کا جن ہے جس کی عمر تین سو سال سے زائد ہے اور جو قسطنطنیہ کی نگرانی کے لئے خداوند یسوع مسیح نے مقرر کیا ہے۔ اُسے طویل عمر کہنے والوں کی دلیل یہ تھی کہ وہ شاگال کو پچھلے کئی سالوں سے ایک ہی شکل وصورت اور

ایک ہی رنگ روپ میں دیکھتے آئے تھے۔ بطریق اعظم سمیت بعض بڑے لوگوں کو
بات پر تو یقین نہ تھا کہ شاگال جن ہے، لیکن وہ سب یہ ضرور مانتے تھے کہ شاگال پرا
قوتوں کا مالک ہے اور کالا علم بھی جانتا ہے۔

شاگال نے عین اُس وقت قاسم کے کمرے کا دروازہ دھکیلا تھا جب قاسم سونیا کو ا
پہنا رہا تھا۔ لیکن یہ تو بچت ہوگئی تھی کہ دروازہ کھلنے کی آواز سنتے ہی قاسم اور سونیا نے ا
ہاتھ کھینچ لئے تھے۔ قاسم کو شاگال کے عقب میں اپنا خادم ''ڈیوڈ'' بھی نظر آیا۔ قاسم کو
لمحے ڈیوڈ بھی بہت پراسرار لگا۔ سونیا تو شاگال کو پہچانتی تھی، جبکہ قاسم اُسے پہلی بار دیکھ
تھا۔ شاگال قاسم سے اجازت لئے بغیر کمرے میں داخل ہوگیا۔ اُس کے قدم اٹھانے
انداز ہندوستان کے سوامیوں جیسا تھا۔ وہ اپنے ہاتھ میں تھامے قد آدم عصا کو فرش پر
ہوا کمرے کے وسط میں آ گیا۔ اُس کی آنکھوں سے نکلنے والی تپش خیال ہی خیال میں
کو اپنے چہرے پر محسوس ہونے لگی۔ وہ قاسم کے بالکل سامنے آیا اور قاسم کے سامنے
کھڑا ہوگیا۔ اگلے لمحے اُس نے قاسم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ قاسم کو شا
کے آنے کا یہ انداز سخت برا لگا تھا۔ چنانچہ قاسم نے بھی اپنی غصے سے بھری آنکھیں شا
کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔ لیکن اگلے لمحے قاسم کو یوں لگا جیسے سامنے انسان نہیں
شیطان کھڑا ہو۔ قاسم کو اُس کی آنکھوں سے نکلنے والی تپش بے قرار کرنے لگی اور اُس
جسم اپنے وزن سے کئی گنا بھاری محسوس ہونے لگا۔

اس سے پہلے کہ قاسم اُس کی آنکھوں کی تاب نہ لا کر اپنی آنکھیں ہٹانے کی کو
کرتا، پریشان حال سونیا دوڑتی ہوئی قاسم کے پاس آئی اور قاسم کو ایک جھٹکے کے
شاگال کے سامنے سے ہٹا دیا۔ اور ساتھ ہی کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

''یہ بطریق شاگال ہیں..... ان کی آنکھوں میں دیکھنے والا زندہ نہیں رہتا۔ ان
طاقت ہزار جنوں سے زیادہ ہے۔''

سونیا اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی، کیونکہ شاگال کی گھورتی ہوئی نظریں اُس پر جا
نہ جانے قاسم کو کیوں لگا جیسے شاگال کے عقب میں کھڑا ڈیوڈ مسکرا رہا تھا۔ لیکن قاسم
اپنے غصے کو کچھ زیادہ چھپانے کی کوشش نہ کی اور شاگال سے مخاطب ہوا۔

''محترم بطریق! آپ مجھے حکم کرتے، میں حاضر ہو جاتا۔ اس طرح بغیر اجازت
کے کمرے میں داخل ہونا نازیبا بات ہے۔''

''ہوں ں ں!..... تم ٹھیک کہتے ہو..... میں نے تم دونوں کو خوامخواہ پریشان کیا

مجھے حیرت ہے کہ قسطنطنیہ پر موت کے خطرات منڈلا رہے ہیں اور تم دونوں ''آیا
'' کے مقدس ہجروں میں رومانس کر رہے ہو..... میں نے سنا ہے کہ تم تھریس سے
ے ہو۔ کیا یہ سچ ہے؟''

اب قاسم کا غصہ ایک دم ہوا ہوگیا اور اُس کے پیروں تلے زمین ہلنے لگی۔ شاگال کے
میں لومڑیوں کی سی مکاری تھی۔ قاسم کو یہ لہجہ بہت پراسرار لگا۔ لیکن قاسم نے خود کو
لتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں!..... یہ سچ ہے۔''

''بہت اچھی بات ہے۔ مجھے تھریس بہت پسند ہے۔ میں اکثر تھریس کے کلیساؤں میں
ا رہتا ہوں..... حیرت ہے تم سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔''

اب قاسم کیا کہتا۔ اُس نے جان چھڑانے کے لئے بات کو نظر انداز کرنے کی کوشش
''جی دراصل میں زیادہ تک تنہائی کی عبادت میں مصروف رہتا ہوں۔ اس لئے کئی
ں سے مل نہیں پاتا۔ میری بدقسمتی ہے کہ آپ سے ملاقات نہیں ہوئی۔''

''ہوں ں ں!..... یہ تو واقعی تمہاری بدقسمتی ہے۔ خیر!..... اب جو ہوگئی ہے ملاقات۔
تو تم بدقسمت نہیں رہے..... میں تم سے پھر ملوں گا۔ کچھ ضروری باتوں کے لئے۔
ے منتظر رہنا۔''

قاسم کو ایسے لگا جیسے شاگال دھمکی دے رہا ہو۔ لیکن پھر بھی قاسم نے مسکراتے ہوئے
''ضرور ضرور..... میں آپ کا منتظر رہوں گا۔''

شاگال جس طرح آیا تھا ویسے ہی کمرے سے نکل گیا۔ لیکن ڈیوڈ اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔
نے ڈیوڈ کو مخاطب کر کے سوال کیا۔ ''کیا بطریق اس طرح ہوتے ہیں؟ انسانیت کو
کا درس دینے والے یسوع مسیح کے راہب اس طرح نہیں ہوتے۔ ان موصوف کا
''صوفیاء'' کے ساتھ کتنا پرانا تعلق ہے؟''

''یہ تو کوئی نہیں جانتا۔ جس سے پوچھو وہ یہی کہتا ہے کہ بطریق شاگال کو اُس نے
اول سے ہی اسی طرح دیکھا ہے۔''

نہ جانے کیوں قاسم کو ایسے لگا کہ ڈیوڈ اُسے شاگال سے ڈرانے کی کوشش کر رہا ہے۔
ڈیوڈ کی بات پر تمسخر اڑانے کے انداز میں ہنس دیا اور بولا۔ ''اچھا ٹھیک ہے، تم لوگ
مجھے آج کی مجلس کے لئے کچھ ضروری کام نمٹانے ہیں۔''

سونیا ابھی رُکنا چاہتی تھی۔ لیکن قاسم نے دونوں کو جانے کے لئے کہا تو اُسے بھی مجبوراً

جانا پڑا۔ وہ دونوں چلے گئے تو قاسم نے اُٹھ کر کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا
سے اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ وہ سر نیچے کئے کچھ لکھ رہا تھا کہ ایک دم بری طرح
اُسے یوں لگا جیسے شاگال اُس کے سامنے کھڑا تیز نظروں سے اسے گھور رہا ہو۔
نے بجلی کی سی تیزی سے سر اٹھا کر سامنے دیکھا، لیکن کوئی نہ تھا۔ یہ قاسم کا واہمہ تھا
قاسم نے اپنے آپ کو ڈانٹا کہ وہ ایک مومن ہو کر شیطان سے خوفزدہ ہو رہا ہے۔ اور
دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

سونیا اپنے چھوٹے سے رہائشی کمرے میں آئی تو اُس کے پاؤں زمین پر نہ ٹک
تھے۔ اُسے قاسم کی طرف سے انگوٹھی ملنے کی خوشی چین نہ لینے دیتی تھی۔ اُس نے کمر
میں داخل ہو کر جلدی کے ساتھ دروازہ بند کر دیا۔ اب وہ قاسم کی انگوٹھی ہاتھ میں پکڑ
انتہائی پیار سے دیکھ رہی تھی۔ وہ بار بار اس انگوٹھی کو چومتی اور بار بار اُس کی آنکھیں
سابقہ دُکھوں کو یاد کر کے تر ہو جاتیں۔ وہ تو چرچ میں پناہ لینے آئی تھی۔ لیکن یہاں
ایک ایک راہب نے الگ الگ اس کی آبرو ریزی کی۔ لوگوں کے سامنے لمبی لمبی تقر
کرنے والے خداوند یسوع مسیح کے نام نہاد راہب پاکباز دوشیزاؤں کے برہنہ
بوٹیاں کیسے نوچتے ہیں، یہ سونیا کو یہاں آ کر معلوم ہوا۔ وہ جن دُکھوں کو پیچھے چھوڑ آئی
اُن سے زیادہ دُکھ ''آیا صوفیاء'' میں اس کے منتظر تھے۔ اُس نے جب آیا صوفیاء
اپنا لباس اُترتے دیکھا تو اُسے یقین ہو گیا کہ دنیا میں کوئی جائے پناہ نہیں جہاں حوا
محفوظ رہ سکے۔ چنانچہ اُس نے خود کو ''آیا صوفیاء'' کے مطابق ڈھالنا شروع کر دیا۔

لیکن آج قاسم نے اُسے محبت کی نشانی انگوٹھی تحفے میں دے کر ایک بار پھر زندہ
تھا۔ اب اُسے ''آیا صوفیاء'' میں گزرے ہوئے اپنے ماضی پر پچھتاوا ہونے لگا۔ کاش
نے اپنی آبرو محفوظ رکھی ہوتی تو آج وہ ایرون کے قدموں میں فخر کے ساتھ س
نچھاور کر دیتی۔ یہ پچھتاوا پارے کی طرح اُس کے دل و دماغ میں گردش کرنے لگا
بے حد مضطرب ہو گئی۔ ادھر وہ قاسم کی انگوٹھی کو دیکھ کر خوش ہوتی تو ساتھ ہی اپنے
ناپاکی کا خیال کر کے پریشان ہو جاتی۔ وہ جس قدر بیتاب آج ہوئی تھی، اس سے پہلے
اس قدر بے قراری اُس پر نہ چھائی تھی۔ معاً اُس کے ذہن میں ''سسٹر میری'' کا
گردش کرنے لگا۔ ایسے موقع پر ایک سسٹر میری ہی تھی جو اُسے حوصلہ دے سکتی تھی
سونیا نے اپنی پلکیں صاف کیں اور سسٹر میری کے پاس جانے کے لئے تیار ہو گئی۔
آج سسٹر میری کے دروازے پر اُن کی مرید خواتین موجود نہ تھیں۔ اُن خواتین

لئے صرف ہفتہ اور اتوار کا دن مقرر تھا۔ آج پیر کا دن تھا۔ سونیا نے آہستہ سے سسٹر میری
کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا اور پھر جوابی اشارہ پا کر اندر داخل ہو گئی۔

سسٹر میری کمرے میں موجود تھی اور حسب عادت کسی عجیب و غریب کتاب کے
مطالعے میں مصروف تھی۔ سونیا کو دیکھ کر اُس نے فوراً کتاب بند کر دی اور ایک صندوق
میں رکھ کر سونیا سے ملنے کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ سسٹر میری سفید لباس میں ملبوس تھی۔
اُس کے چہرے پر بلا کا وقار اور رعب حسن تھا۔ یہ ''آیا صوفیاء'' کی واحد راہبہ تھی جو اب
تک کسی مرد کے نزدیک نہ گئی تھی۔ اُس نے شروع دن سے ہی ایک عبادت گزار راہبہ
کے طور اطوار اختیار کر لئے..... یہ مارسی تھی۔

مارسی کے چہرے پر نظر نہ ٹکتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے خداوند خدا کے فرشتوں نے مارسی
کے حسین چہرے کو عرش کے سنہرے پانیوں سے غسل دیا ہو۔ مارسی کی آنکھیں جنہیں قاسم
کوڑے کہا کرتا تھا اب کہکشاؤں کی طرح روشن تھیں۔ اُس کی آنکھوں میں دانائی اور
دانشمندی کا نور تھا۔ سر تا پا اُجلے اور دُھلے ہوئے سفید لباس میں مارسی پربت کی وادیوں
سے آئی ہوئی اپسراء معلوم ہو رہی تھی۔ مارسی نے سونیا کو انتہائی محبت کے ساتھ سینے سے
لگایا اور اپنے پاس مسہری پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

''کیا بات ہے سونیا! آج تمہارے چہرے پر اضطراب کی پرچھائیاں ہیں۔ مجھے بتاؤ!
میں تمہارا غم غلط کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔''

لیکن اگلے لمحے سونیا تو پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ اُس کا سر مارسی کے سینے سے جا لگا
اور مارسی نے اپنا بازو اُس کی پشت پر رکھ کر اُسے سہلانا شروع کر دیا..... سونیا رو رہی تھی
لیکن مارسی خاموش تھی۔ جیسے وہ سونیا کو رونے کا موقع دینا چاہتی ہو..... اسی اثناء میں سونیا
کا انگوٹھی والا ہاتھ جو اُس نے اپنے جسم کے نیچے دبا رکھا تھا، غیر اختیاری طور پر باہر نکلا
اور مارسی کی نظر اُس پر پڑی..... مارسی کی آنکھ پہلی مرتبہ سرسری سے انداز میں سونیا کی
انگوٹھی پر ٹھہری اور پھر ہٹ گئی۔ لیکن اگلے لمحے ایک جھٹکے کے ساتھ مارسی کی نظر سونیا کی
انگوٹھی پر دوبارہ پڑی۔ اور اب مارسی اپنی بھنویں سکیڑے بری طرح سونیا کی انگوٹھی کو گھور
رہی تھی۔ اُس کے دماغ میں ایک دم چکی چلنی شروع ہو گئی۔ ماضی کی چکی..... اُس کے
سامنے مارتھا کی وہ یادگار انگوٹھی تھی جو مارسی نے قاسم کو بخش دی تھی۔ وہ اس خیال سے کہ
کہیں اُسے دھوکہ نہ ہوا ہو، انگوٹھی کی بناوٹ پر غور کرنے لگی۔ لیکن یہ تو وہی انگوٹھی تھی۔
مارسی کا پورا جسم زلزلے کی زد میں آنے لگا۔ اُس نے سونیا کو احتیاط کے ساتھ سیدھا کیا اور

اپنی ہیجانی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے انتہائی ملائم لہجے میں سونیا سے کہا۔

''دیکھو سونیا!..... اس طرح رونے سے کام نہیں چلے گا۔ اب چپ کرو شاباش! اور مجھے بتاؤ کیا بات ہے؟''

مارسی نے اپنی پاکیزہ اُنگلیاں سونیا کے چہرے پر پھیریں۔ اب سونیا کافی سنبھل چکی تھی۔ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور اپنی اُنگلی میں پہنی انگوٹھی سامنے کرتے ہوئے سسٹر مریم سے کہا۔

''یہ انگوٹھی آپ دیکھ رہی ہیں نا! یہ مجھے اُس نوجوان نے دی ہے جو فرشتوں کی طرح پاک سیرت ہے۔ وہ قسطنطنیہ کا رہنے والا نہیں ہے۔ باہر سے آیا ہے۔ لیکن سسٹر..... میں کیا کروں؟ میں اُس سے محبت کرنے لگی ہوں۔ میرے بس میں نہیں، میرے اختیار میں نہیں کہ میں اُسے اپنا سکوں۔ کیونکہ وہ ایک راہب ہے اور میں چرچ کی خادمہ..... سسٹر! میں خود کو اُس کے لائق ہی نہیں سمجھتی۔ میں اُسے کیسے بتاؤں کہ میں اچھی نہیں ہوں..... وہ بہت اچھا ہے۔''

لیکن مارسی کو کچھ سنائی نہ دے رہا تھا۔ وہ کسی مجسمے کی طرح اپنی جگہ ساکت و جامد بیٹھی تھی۔ اُسے اپنی آنکھوں اور کانوں پر بالکل یقین نہ آ رہا تھا۔ گزشتہ سات سال کے عرصہ میں وہ بہت روئی تھی، اُس نے بہت سجدے کئے تھے، بہت نمازیں پڑھی تھیں۔ وہ چھپ چھپ کر گزشتہ سات سال سے اپنے اللہ کے حضور گڑگڑاتی رہی تھی۔ لیکن کبھی اُسے اپنی فریادوں کا جواب سنائی نہ دیا تھا۔ اور آج ایک دم اُس کے سامنے قاسم کو دی ہوئی انگوٹھی آ گئی تھی۔ سونیا بتا رہی تھی کہ وہ نوجوان بھی یہیں ہے۔ مارسی کے لئے یہ بڑے عجیب لمحات تھے۔ قاسم اُس کے بالکل نزدیک آ پہنچا تھا۔ اُس کے دل کی دھڑکن کا انداز ہی بدل گیا۔ یہ دھڑکن پہلے ایک راہبہ کی دھڑکن تھی جو پوری دنیا کے ہر مرد سے کٹ کر گوشہ نشینی میں اپنے پروردگار سے اپنی محبت مانگتی تھی۔ لیکن اب اُس کا دل ایک اور انداز سے دھڑک رہا تھا۔ یہ ایک نوجوان لڑکی کے دل کی دھڑکن تھی جو برسوں بعد اپنے محبوب کا دیدار کرنے والی تھی۔ لیکن اُسے یقین نہ آ رہا تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ یہ انگوٹھی کسی اور آدمی کے ہاتھ لگ کر یہاں تک پہنچی ہو گی۔ اُس نے بیتابی سے سونیا سے سوال کیا۔

''اُس نوجوان راہب کا حلیہ کیسا ہے؟..... کیا تم مجھے بتا سکتی ہو؟''

سونیا پہلے تو چونکی۔ لیکن پھر قاسم کے چہرے کو یاد کر کے انتہائی نفاست کے ساتھ اُس کا حلیہ، قد کاٹھ بتانے لگی۔ اب مارسی کو یقین ہونے لگا تھا کہ نوجوان راہب قاسم بن

ہشام ہی ہے۔ مارسی کی کیفیت عجیب ہو گئی۔ وہ چاہتی تھی کہ ابھی اور اسی وقت اٹھے اور دوڑتی ہوئی قاسم کے پاس چلی جائے۔ وہ قاسم کے بازوؤں میں سر چھپا کے زور زور سے روئے اور اُسے کہے کہ..... ''چلو! سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مجھے اس تکلیف دہ دنیا سے لے چلو''..... لیکن وہ ایسا نہ کر سکتی تھی۔ وہ سونیا کو بھول گئی اور سات سال پہلے کی اپنی محبت میں کھو گئی۔ وہ ایک ایک بات یاد کر رہی تھی۔ ''لالہ شاہین'' کی یادگار، قاسم کا گھر، قاسم کی خوش مزاج بھابھی سکینہ، قاسم کے بھتیجے عمر اور علی..... پھر اُسے اپنی ماں یاد آئی۔ سکندر بیگ اور ابوجعفر بھی یاد آئے۔ اور پھر ایک دم اُس کے ذہن میں جھماکہ ہوا..... کہیں ڈیمونان کو قاسم نے تو قتل نہیں کیا؟ اور پھر نہ جانے کیوں اُس کے دل میں یہی خیال گھر کرنے لگا کہ ڈیمونان کو قاسم نے قسطنطنیہ پہنچ کر قتل کیا ہو گا۔ دراصل جب سے اُس نے یہ سنا تھا کہ سلطان مراد خان ثانی کا بیٹا سلطان محمد خان قسطنطنیہ پر ایک بھرپور حملہ کرنے والا ہے اُس کی دُعاؤں کی رفتار کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ وہ شب و روز اپنے مالک کے حضور یہی ایک دعا کرتی کہ جلدی سے وہ دن آئے جب سلطان محمد خان قسطنطنیہ پر حملہ کر دے۔ اُسے یقین تھا کہ سلطان کے لشکر میں قاسم بن ہشام ضرور شامل ہو گا۔ گزشتہ سات سالوں میں مارسی کو اکثر اس بات پر حیرت ہوا کرتی تھی کہ قاسم نے اسے ڈھونڈنے کی کوشش کیوں نہ کی؟ وہ سمجھتی تھی کہ اگر قاسم اُسے ڈھونڈتا تو کچھ مشکل نہ تھا کہ وہ اسے مل جاتی۔ لیکن آج اُسے یقین ہو رہا تھا کہ قاسم تو اُسے ڈھونڈتا رہا ہے۔ وہ قاسم سے ملنے کے لئے بے چین ہو گئی۔ لیکن اُس نے صبر کا دامن نہ چھوڑا اور اپنے وقار کو برقرار رکھتے ہوئے سونیا سے پوچھا۔

''اچھا..... تو تم اُس سے محبت کرنے لگی ہو۔ لیکن یہ تو بتاؤ! کہ کیا وہ بھی تم سے محبت کرتا ہے؟''

''ہاں، کرتا ہے۔ بہت کرتا ہے۔ مگر وہ مجبور ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں تمہیں جسمانی محبت نہیں دے سکتا۔ کیونکہ میں ایک راہب ہوں۔ میں تمہیں روحانی محبت دے سکتا ہوں۔ اُس نے مجھے روحانی محبت عطا کی ہی۔ یہ انگوٹھی اُسی محبت کی نشانی ہے۔ لیکن سسٹر مریم! مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ روحانی محبت کیا ہوتی ہے۔ آپ کو تو معلوم ہو گا۔ مجھے بتائیے نا۔''

مارسی ایک دانشمند لڑکی تھی۔ وہ آسانی سے بات کی تہہ تک پہنچنے لگی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ قاسم نے جان بوجھ کر یہ انگوٹھی سونیا کو پہنائی ہو گی تاکہ وہ مارسی کے پاس جائے تو

مارسی انگوٹھی پہچان لے۔ یہ گویا ایک طرح کا پیغام تھا۔ مارسی، قاسم کے پیغام کا سوچ سرشار ہوگئی۔ لیکن اُسے دُکھ ہوا اور وہ یہ کہ نادان سونیا خوامخواہ قاسم کی محبت میں گرفتار چلی تھی۔ اچانک مارسی کے ذہن میں ایک خیال آیا اور اُس نے سونیا سے کہا۔

''بہت خوب!..... تو وہ راہب تم سے روحانی محبت کرتا ہے۔ میں تمہیں ایک بات سکھاتی ہوں۔ تم اُس سے کہنا..... تو وہ تم پر اور زیادہ مہربان ہو جائے گا..... لیکن پہلے میری ایک بات غور سے سن لو۔ اپنے آپ کو اُس کی محبت میں اتنا دیوانہ مت کرو کہ اُسے جب نہ پا سکو تو جدائی کا صدمہ برداشت ہی نہ کر پاؤ۔''

سونیا مسکرا دی اور بے صبری سے بولی۔ ''آپ مجھے وہ بات سکھائیے جو سکھانے جا تھیں۔ آپ تو خود یسوع مسیح کی راہبہ ہیں۔ آپ کو بھلا محبت کے بارے میں کیا معلوم؟''

نہ جانے کیوں مارسی کے ہونٹوں پر ایک عارفانہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس نے ایک طویل ٹھنڈی سانس لی اور دھیرے سے دوہرایا۔

''ہاں! تم ٹھیک کہتی ہو، مجھے محبت کے بارے میں کیا معلوم؟''

سونیا نے سمجھا کہ سسٹر کا دل دُکھ گیا ہے۔ وہ معافیاں مانگنے لگی اور منت بھرے لہ میں کہنے لگی۔ ''سسٹر! اگر مجھے معاف کر دیا ہے تو پھر بتائیے نا! کہ آپ مجھے کیا سکھا والی تھیں؟''

مارسی نے ایک لمحے کے لئے سونیا کے چہرے کی جانب دیکھا اور پھر کہا۔ ''تم اُ سے کہنا..... لالہ شاہین کے کبوتر اُڑ گئے ہیں۔ جب نیلا پانی سرخ ہو جائے گا تو اپ گھروں میں واپس آ جائیں گے۔''

سونیا نے انتہائی حیرت سے سسٹر میری کے الفاظ سنے۔ اُس نے ایک مرتبہ یہ الفاظ لب دہرائے اور ان کو سمجھنے کی کوشش کی۔ لیکن پھر اپنی بھنویں سکیڑ کر استعجاب سے بھرے لہجے میں کہا۔

''یہ کیا بات ہے سسٹر!..... مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ لالہ شاہین کے کبوتر ہماری محبت سے کیا تعلق؟''

''تم اس جملے کے مطلب کو چھوڑو۔ اسے ایک طرح کا روحانی منتر سمجھ لو۔ میں نے تمہیں محبت کا ایک یادگار پیغام سکھایا ہے۔ یہ کسی کی محبت کا ایک یادگار پیغام ہے..... اس میں بہت اثر ہے۔''

سونیا پھر بھی سمجھ تو کچھ نہ سکی۔ لیکن اُس نے سسٹر میری کا پیغام زبانی یاد کر لیا۔

آیا صوفیاء کے پادریوں کی مجلس سہ پہر سے شروع ہو کر رات تک جاری رہی۔ مجلس قسطنطنیہ کے تمام پادری شریک ہوئے اور سب کے سب اس بات پر غم و غصے کا اظہار کرتے رہے کہ شہنشاہ نے دونوں کلیساؤں کی متحدہ مجلس کا صدر ''کارڈنیل اسیڈور'' کو بنا کر ''آیا صوفیاء'' کے بطریق اعظم کی توہین کی ہے۔ اور قسطنطنیہ کے تمام مذہبی پیشواؤں نے مل کر متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ وہ مجلس کے روز شہنشاہ کے سامنے احتجاج کریں گے اور دونوں کلیساؤں کی متحدہ مجلس کو ٹھیک اُس وقت جب وہ عروج پر ہو گی، بائیکاٹ کر کے ناکام بنا دیں گے۔ یہ حقیقت تھی کہ شہر کی ساری عوام کے دل و دماغ پر مذہبی پیشواؤں کا قبضہ تھا۔ لوگ بدعقیدگی اور طرح طرح کے توہمات کا شکار ہو کر مذہبی پیشواؤں کے سامنے لاچار اور بے دست و پا ہو چکے تھے۔ مذہبی پیشوا لوگوں کو پیسے اور زر و جواہر کے عوض جنت کی راہداریوں کے ٹکٹ دیا کرتے تھے۔ یہ بات یقینی تھی کہ اگر تمام پادری مل کر لوگوں کو شہنشاہ اور کارڈنیل کے خلاف اُکساتے تو لوگ بھڑک اُٹھتے۔ چنانچہ بطریق اعظم کی سازش کامیاب ہوئی اور تمام پادریوں نے متفقہ طور پر اُس کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔

رات کو اجلاس ختم ہوا تو قاسم بطریق اعظم سے اجازت لے کر خوشی خوشی اپنے کمرے کی جانب چل دیا۔ راہداری سنسان پڑی تھی اور زیادہ تر لوگ سو چکے تھے۔ راہداری میں دونوں طرف جلتی ہوئی مشعلوں نے سنسان راہداری کے ماحول کو دیومالائی بنا دیا تھا۔

قاسم سیڑھیاں چڑھ کر دوسری منزل پر پہنچا تو اُسے دوسری منزل نہ جانے کیوں ویران ویران دکھائی دی۔ یہاں بھی مشعلوں سے در و دیوار پر جہنم کی پریاں رقص کر رہی تھیں۔ قاسم راہداری کا پہلا موڑ مڑا تو اُسے پلک جھپکتے میں ایک سایہ سا دائیں سے بائیں حرکت کرتا ہوا نظر آیا..... یوں جیسے کوئی شخص ایک دم سے کسی کمرے میں داخل ہوا ہو۔ قاسم چوکنا ہو گیا۔

دراصل قاسم اجلاس ختم ہونے کے بعد بھی کافی دیر تک شہر کے پادریوں کو اس عظیم مقصد کے لئے متحد رہنے کی تبلیغ کرتا رہا تھا۔ اس دوران بطریق اعظم اور باقی سب لوگ اپنی اپنی رہائش گاہوں میں چلے گئے تھے۔ جب شہر کے چھوٹے کلیساؤں سے آئے ہوئے پادری رخصت ہوئے تو رات کا پہلا پہر گزر چکا تھا اور اس وقت ''آیا صوفیاء'' کی یہ راہداری کسی قبرستان کی طرح خاموش پڑی تھی۔

قاسم چیتے کی طرح اپنے جسم کے بال کھڑے کئے راہداری میں چلتا ہوا اپنے کمرے کے باہر پہنچا تو یہ دیکھ کر اُس کا دل دھک سے رہ گیا کہ اُس کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔

قاسم احتیاط سے کمرے میں داخل ہوا۔ لیکن اندر کوئی نہ تھا۔ البتہ اُس نے مشعل کی روشنی میں دیکھا کہ اُس کا تمام سامان بکھرا پڑا تھا۔ اور کوئی چور اُس کے سامان کی بری طرح تلاشی لیتا رہا تھا۔ قاسم کا ذہن اچانک ''بطریق شاگال'' کی طرف چلا گیا۔ آج صبح کے بعد اُسے شاگال کہیں نظر نہ آیا تھا۔ قاسم نے اپنے سامان کو سمیٹا اور سونے کے لئے لیٹ گیا۔ لیکن نیند اُس کی آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔ اُسے عجیب قسم کے حالات کا سامنا تھا۔ جہاں تک فرض کا تعلق تھا تو قاسم کی کارکردگی اطمینان بخش تھی۔ لیکن جہاں تک محبت کا تعلق تھا، ابھی تک قاسم کی کوئی کوشش بار آور نہ ہوئی تھی۔ قاسم اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے دیر تک اپنے بستر پر لیٹا رہا۔ اور پھر نہ جانے کس وقت اُس کی آنکھ لگ گئی۔ قاسم کی آنکھ لگی تو قاسم کے کمرے میں موجود لکڑی کی کھڑکی میں حرکت ہوئی۔ یہ ایک بڑی اور بھاری بھرکم کھڑکی تھی۔ قاسم گہری نیند سو رہا تھا جب ہلکی سی آواز کے ساتھ کمرے کی کھڑکی کھلی۔

مشعل کے حرکت کرتے ہوئے شعلے کی وجہ سے کمرے میں پڑی ہر چیز کا سایہ بھی حرکت تھا۔ کھڑکی کھلی تو مشعل کی روشنی کا ایک دھارا کھڑکی سے باہر کی طرف لپکا اور سامنے کھڑا سایہ ایک دم روشن ہو گیا۔ اگلے لمحے یہ سایہ آواز پیدا کئے بغیر قاسم کے کمرے میں داخل ہوا اور کھڑکی بند کر دی۔ رات کا دوسرا پہر گزر رہا تھا۔ ''آیا صوفیاء'' کی پوری عمارت نیند کی وادیوں میں غرق تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا اور سوئی کے گرنے کی آواز بھی سنی جا سکتی تھی۔ لیکن قاسم کے کمرے میں موجود سایہ کوئی آواز پیدا نہ کر رہا تھا۔ وہ سایہ مشعل کی روشنی میں چلتا ہوا قاسم کے پیروں کی جانب بڑھا۔ یہ قاسم کے بستر کی پائنتی تھی۔ سایہ قاسم کے پیروں کے نزدیک پہنچ کر رُک گیا۔ مشعل کی روشنی سائے پر پڑ رہی تھی۔ اس لئے اب وہ سایہ نہ تھا بلکہ ایک جیتی جاگتی زندگی تھا۔ اور پھر اگلے لمحے کمرے میں داخل ہونے والے نے اپنے چہرے سے کپڑا ہٹایا تو مشعل کا شعلہ حیرت سے بھڑک اُٹھا۔

ارے! یہ تو سونیا تھی، ''آیا صوفیاء'' کی جذباتی کنیز۔

سونیا قاسم کے قدموں میں بیٹھ گئی اور اُس کے ننگے پیروں کو دیوانوں جیسی نظروں سے دیکھنے لگی۔ قاسم کی وجاہت، مردانگی اور قد کاٹھ دیکھ کر سونیا کے چہرے پر تحسین کے جذبات نظر آئے۔ سونیا چاہتی تھی کہ وہ چل کر قاسم کے پہلو میں لیٹ جائے۔ لیکن کوئی ان دیکھی طاقت اُسے روک رہی تھی۔ وہ دیر تک قاسم کے قدموں میں بیٹھی رہی۔ اور پھر وہ اُٹھی اور جھک کر قاسم کے پیروں کا بوسہ لیا..... آنِ واحد میں قاسم کی آنکھ کھل گئی۔ اُس

نے ایک جھٹکے سے اپنے پاؤں کھینچے اور اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

''یہ کیا حرکت ہے؟..... سونیا! تم..... اس وقت؟..... میرے کمرے میں؟''

سونیا نے اپنے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر قاسم کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور سرگوشیانہ لہجے میں یوں بولی جیسے کوئی منتر پڑھ رہی ہو۔

''لالہ شاہین کے کبوتر اُڑ گئے ہیں..... جب نیلا پانی سرخ ہو جائے گا تو وہ اپنے گھروں کو لوٹ آئیں گے۔''

قاسم ایک دم اپنی جگہ پر سن ہو کر رہ گیا۔ یہ سیدھا سیدھا مارسی کا پیغام تھا۔ اُس کے جسم کا رواں رواں خوشی سے جھومنے لگ گیا۔ اُسے یہ بھول گیا کہ رات کا دوسرا پہر ہے اور سونیا اُس کے کمرے میں اکیلی ہے۔ وہ اُچھلا اور اپنے بستر پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اُس نے بے تابی کے ساتھ سونیا سے پوچھا۔

''کک..... کیا..... تم..... کیا کہہ رہی ہو؟ ایک بار پھر کہو!''

سونیا نے پھر کہا۔ ''لالہ شاہین کے کبوتر اُڑ گئے ہیں۔ جب نیلا پانی سرخ ہو جائے گا تو وہ اپنے گھروں کو لوٹ آئیں گے۔''

قاسم مارسی کا پیغام سمجھ گیا۔ مارسی یہی کہہ رہی تھی کہ آبنائے باسفورس میں عیسائی فوجوں کا خون بہے گا تو اس سفید لباس راہبہ کو بھی چھٹکارا ملے گا.....

مارسی کے پیغام نے قاسم کی زندگی میں نئے رنگ بھر دیئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اُسے محبت میں کامیابی ہو رہی تھی۔ وہ خوشی کے مارے جذباتی ہو گیا اور آگے بڑھ کر سونیا کے شانے پر ہاتھ رکھ دیئے۔ سونیا گلنار ہو گئی۔ قاسم نے سونیا سے کہا۔

''سونیا! آج تم نے میرا دل مسرت سے بھر دیا۔ آج تم مجھ سے جو مانگو گی اگر میرے بس میں ہوا تو تمہیں ضرور دوں گا۔''

سونیا دل ہی دل میں سسٹر میری کو دُعائیں دینے لگی۔ جس نے اُسے قاسم کو رام کرنے کا منتر سکھایا تھا۔ سونیا کا دل مسرت سے پھڑکنے لگا۔ وہ اپنی قسمت پر ناز کرنے لگی۔ سونیا نے قاسم کی بات سن کر شرارت سے کہا۔

''سچ؟..... کیا سچ مچ میں جو مانگوں گی آپ دیں گے؟''

''ہاں بے شک! میں نے جو قول دیا ہے وہ پورا کروں گا۔''

''تو پھر مجھے اپنا ساتھ دے دیجئے!''

قاسم سٹپٹا گیا۔ سونیا کا جملہ ذومعنی تھا۔ قاسم کو یقین تھا کہ وہ اُس سے محبت نہیں مانگے

گی۔ کیونکہ قاسم ایک راہب تھا اور وہ جانتی تھی۔ لیکن اُس نے تو ساتھ مانگ لیا تھا۔ قاسم نے گھبرا کر سونیا کی جانب دیکھا اور کہا۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟..... تم جانتی ہو کہ میں ایک راہب ہوں۔''

''تو کیا ہوا؟ راہب ہیں، شادی نہیں کر سکتے۔ اپنا قرب تو مجھے بخش سکتے ہیں۔ میں آپ کے قدموں میں سر رکھ کر ساری دنیا سے بے خبر ہو جانا چاہتی ہوں۔''

قاسم کی حالت دیکھنے والی تھی۔ وہ اپنے ہی دام میں پھنس چکا تھا۔ اُس نے وقتی طور پر سونیا کو ٹالنے کے لئے جن الفاظ کا سہارا لیا، وہ سونیا کے لئے زندگی کا سب سے بڑا سہارا بن گئے۔ قاسم نے کہا۔

''ٹھیک ہے! تو پھر تم قسطنطنیہ کی جنگ تک انتظار کرو۔ اگر مسلمان جنگ جیت گئے تو میں تمہیں سہارا دوں گا۔ اور اگر ہار گئے تو میں تمہیں یہاں سے نکال لے جاؤں گا۔''

اپنی سوچ کے حساب سے قاسم کا جملہ ٹھیک تھا۔ اور قاسم نے دل میں فیصلہ بھی کچھ ایسا ہی کر لیا تھا کہ وہ ہر دونوں صورتوں میں اس دُکھی لڑکی کو سہارا ضرور دے گا..... سونیا ایک دم مستقبل کے خوابوں میں گم ہو گئی۔ قاسم نے اُسے کہا۔

''دیوانی لڑکی! اب تم جاؤ۔ بہت رات ہو گئی ہے۔ اور تمہارا دیر تک میرے کمرے میں رہنا ٹھیک نہیں۔''

''کیوں ٹھیک نہیں؟ یہاں کون سا راہب ہے، جس کے کمرے میں رات کو سیج نہیں سجتی؟''

''میں تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔ اور تم پوچھ رہی ہو یہاں کون سا راہب ہے، جو پاکدامن ہے..... مجھے دیکھو! میں پاکدامن ہوں۔ اس لئے اب تم اپنے کمرے میں جاؤ۔''

سونیا کا دل جانے کو تو نہ چاہ رہا تھا، لیکن طوعاً و کرہاً وہ قاسم کی جانب حسرت بھری نظروں سے دیکھتی ہوئی چلی گئی۔ سونیا چلی گئی تو کچھ دیر بعد قاسم نے اپنے کمرے کے دروازے سے باہر نکل کر باہر سنسان راہداری میں نگاہ ڈالی۔ اُس نے ایک جانب دیکھا اور پھر اُدھر سے نظر ہٹا کر دوسری جانب لمبی راہداری میں نگاہ دوڑائی۔ اور یہ دیکھ کر وہ تن سا ہو گیا کہ راہداری کے آخری کونے پر..... قاسم سے کافی دُور بطریق شاگال کھڑا تھا۔ مشعل کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی میں اُس کا سرخ چہرہ بھیانک دکھائی دے رہا تھا۔ قاسم کو اُس کی دونوں آنکھیں کسی انگارے کی طرح دُور سے دہکتی ہوئی نظر آئیں۔ اُس کا رُخ قاسم کی جانب ہی تھا اور وہ تن کر کھڑا کینہ توز نظروں سے قاسم کو گھور رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ قاسم

کچھ سوچتا، شاگال ایک طرف مڑا اور دوسرے قدم پر وہ قاسم کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ قاسم کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی کی ایک تیز لہر دوڑ گئی۔ وہ اُلٹے قدموں اپنے کمرے میں آیا اور اُس نے کمرے کا دروازہ اندر سے اچھی طرح بند کر دیا۔ قاسم بستر پر آ کے لیٹ تو گیا لیکن شاگال کی آنکھیں تو جیسے اُس کے دماغ میں گڑ گئی تھیں۔ دو سرخ انگارے قاسم کو ہر طرف دکھائی دینے لگے۔ بالآخر قاسم نے اپنے سر کو زور سے جھٹکا اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کی۔ لیکن اب نیند اُس سے کوسوں دُور جا چکی تھی۔

اگلا روز آخری روز تھا..... کیونکہ اس سے اگلے روز کلیسا میں بہت بڑی مجلس منعقد ہونے والی تھی۔ آج ہی کلیسا کے ہال میں کانفرنس کے لئے نئے طریقے سے کرسیاں بچھائی جا رہی تھیں۔ عبادت کے چبوترے کو چھوڑ کر باقی سارے ہال میں دائرے کی صورت میں اوپر سے زیادہ کرسیاں بچھا دی گئیں۔ چبوترے پر مجلس کے صدر اور شہنشاہ کے لئے شاہی کرسی رکھ دی گئی۔ ہال کے وسط میں ایک کسی قدر وسیع میدان سا بن گیا تھا۔ چاروں طرف شاہی غلام گردشوں اور محرابوں میں فوجی افسروں اور معززین شہر کے لئے نشستیں رکھ دی گئیں۔ آج ''آیا صوفیاء'' کی صفائی کی جا رہی تھی۔ کیونکہ کل یہاں کلیسائے رومہ اور یونانی کلیسا کا اتحاد ہونے والا تھا۔ قاسم اس اتحاد کو تباہ کرنا چاہتا تھا۔ آج صبح سورج طلوع ہوتے ہی قاسم بطریق اعظم کے کہنے پر ایک مرتبہ پھر سپہ سالار گرانڈ ڈیوک نوٹاراس سے ملنے گیا تھا۔ قاسم نے سپہ سالار کو میٹنگ میں شدت پسند رویہ اختیار کرنے پر آمادہ کر لیا۔

وہاں سے واپسی پر قاسم انتہائی غیر محسوس طریقے سے اپنے بعض خفیہ ساتھیوں سے ملنے کے لئے بھی گیا جس کی کانوں کان کسی کو خبر نہ ہو سکی۔ لیکن جس وقت قاسم اپنے ساتھیوں سے مل کر واپس آ رہا تھا اُسے بازار کی بھیڑ میں ڈیوڈ دکھائی دیا۔ قاسم کا ماتھا ٹھنکا۔ کہیں ڈیوڈ اُس کا تعاقب تو نہیں کر رہا؟ اسی سوچ نے قاسم کو بے چین کر دیا۔ لیکن وہ اپنے دھیان میں چلتا رہا اور دوپہر سے پہلے ''آیا صوفیاء'' پہنچ گیا۔ ''آیا صوفیاء'' میں کانفرنس کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں اور اس وقت ہال کے ہر ستون کے ساتھ کئی مشعلیں جلائی جا رہی تھیں۔

قاسم تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچا..... ڈیوڈ ابھی تک اُس کے ذہن سے نہیں اُترا تھا۔ قاسم کے آنے سے کچھ دیر بعد دیوانی لڑکی پھر ٹپک پڑی۔ قاسم نے آتے ہی اُس سے پوچھا۔

''ڈیوڈ کہاں ہے؟''

''معلوم نہیں۔ صبح ایک بار میں نے اُسے بطریق شاگال کے ساتھ دیکھا تھا۔ دونوں آیا صوفیاء سے باہر جا رہے تھے۔''

قاسم کے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہونا شروع ہو گئے۔ وہ کسی خطرے سے ڈرتا نہیں تھا۔ اُسے تو صرف یہ بات پریشان کر رہی تھی کہ کہیں کام مکمل ہونے سے پہلے ہی بھانڈا نہ پھوٹ جائے۔ قاسم نے سونیا کو جانے کی اجازت دی اور خود بطریق اعظم کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ اُس نے بوڑھے بطریق اعظم کو نوٹاراس کے تعاون کا یقین دلایا تھا۔ لیکن اُس نے بطریق کو بے حد فکرمند اور پریشان دیکھ کر احتیاط کے ساتھ سوال کیا۔

''مقدس باپ! آپ متفکر ہیں۔ میں آپ کی فکر دُور کرنے کے لئے ہر خدمت بجا لانے کو حاضر ہوں۔''

بوڑھے بطریق اعظم نے قاسم کی جانب غور سے دیکھا۔ اور پھر کسی قدر پریشان لہجے میں کہا۔ ''ہاں! سچ مچ میں پریشان ہوں۔ کل دونوں کلیساؤں کی مجلس منعقد ہونے والی ہے۔ اور شہنشاہ نے تہیہ کر رکھا ہے کہ وہ ہر صورت میں رومی کلیسا کے ساتھ اتحاد کر کے رہے گا۔ میں سوچتا ہوں کہ رومی کلیسا کے اقتدار کے بعد میں ملک کے کس کونے میں منہ چھپاؤں گا؟''

قاسم نے ذرا سی دیر کے بعد عرض کی۔ ''مقدس باپ! آپ بالکل فکرمند نہ ہوں۔ قسطنطنیہ کی تمام افواج کے سپہ سالار نوٹاراس نے یقین دلایا ہے کہ وہ کسی قیمت پر شہنشاہ کو یہ اتحاد نہ کرنے دیں گے۔''

قاسم کے تسلی دلانے سے بطریق کو کچھ حوصلہ ہوا اور اُس نے قاسم کو اپنے پاس بٹھا کر دیر تک بہت سی باتیں کیں۔ آج بطریق اعظم بہت مضطرب تھا۔ اُس نے قاسم کو قسطنطنیہ اور آیا صوفیاء سے متعلق بہت سی راز کی باتیں بتائیں جنہیں سلطان کے پاس بھیجنا قاسم کے لئے بہت ضروری تھا۔

سہ پہر کے قریب سسٹر میری نے اپنی ایک خادمہ کے ذریعے سونیا کو بلوا بھیجا۔ سونیا سسٹر میری کے کمرے میں آئی تو سسٹر میری نے مسکرا کر اُس کا استقبال کیا اور مصنوعی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''سونیا! تم بڑی مطلب پرست ہو..... کل میں نے تمہیں جو نسخہ بتایا تھا، اُس کا نتیجہ بتانے کے لئے تم نہ آئیں۔''

سونیا کو کسی قدر سسٹر میری جیسی عابدہ اور زاہدہ عورت کے رویئے پر حیرت ہوئی۔ وہ سسٹر میری کے چہرے پر ایک نیا رنگ دیکھ رہی تھی۔ یہ فرشتوں جیسی پاکیزگی سے مختلف کوئی اور رنگ تھا۔ لیکن سسٹر میری کی بات پر سونیا شرمندہ سی ہو گئی اور ہنستے ہوئے کہا۔

''سسٹر!..... آپ کا نسخہ بڑا کامیاب رہا۔ نوجوان راہب اب مکمل طور پر میری مٹھی میں ہے۔ میں جب چاہوں آیا صوفیاء سے اُسے لے کر پھر ہو جاؤں۔'' سونیا نے اپنی مٹھی ہوا میں کھولتے ہوئے کہا۔ مارسی کسی قدر خفیف سی ہو گئی۔ وہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ سونیا پھر بول اٹھی۔ ''لیکن سسٹر! آج تو مجھے آپ کو دیکھ کر بھی ایسے لگ رہا ہے جیسے آپ میں خشک مناجات اور عبادت کے علاوہ بھی کچھ ہے۔ سسٹر! آج آپ ایک راہبہ کی بجائے ایک عورت لگ رہی ہیں۔''

سونیا شرارت بھرے لہجے میں بہت بڑی بات کہہ گئی تھی۔ اب مارسی کو اپنی جذباتی کیفیات کا خیال آیا اور اُس نے خود پر قابو پاتے ہوئے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔ ''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ میں تو تمہیں خوش دیکھنے کے لئے یہ سب باتیں کر رہی تھی۔''

ابھی شاید مارسی اور سونیا کے درمیان اور بھی باتیں ہوتیں کہ اتنے میں ڈیوڈ، سونیا کو ڈھونڈتا ہوا مارسی کے دروازے پر آ پہنچا اور مارسی اپنی ملاقات ادھوری چھوڑ کر ڈیوڈ کے ہمراہ چلی گئی۔

قاسم رات دیر تک بطریق اعظم کے پاس مختلف معاملات پر بات چیت میں مصروف رہا۔ اور بالآخر تمام معاملات طے کرنے کے بعد اپنے کمرے میں آ کر سو گیا۔

دوسرے دن کا سورج طلوع ہوا تو ''آیا صوفیاء'' کے سامنے قسطنطنیہ کے امراء، وزراء، حاکمین سلطنت، شاہی خاندان کے افراد، فوجی افسروں اور کلیسائے رومہ کے مذہبی پیشواؤں کی بگھیاں رُکنا شروع ہو گئیں۔ کانفرنس دوپہر کے بعد شروع ہونے والی تھی۔ جو شرکاء آتے گئے، اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھتے گئے۔ دوپہر سے پہلے ''آیا صوفیاء'' کا ہال کانفرنس کے شرکاء سے بھر چکا تھا۔ اور پھر چوبدار نے ہال کے دروازے پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کیا کہ کچھ دیر میں ہی شہنشاہِ معظم کی سواری پہنچنے والی ہے۔ ''آیا صوفیاء'' کا بطریق اعظم اور سلطنت کے دوسرے بہت سے عہدے دار قسطنطین کے استقبال کے لئے اپنی نشستوں سے اُٹھ کر ہال سے باہر نکل آئے۔ قاسم بھی بطریق اعظم کے ہمراہ تھا۔ شہنشاہ کے محافظ دستے کے ایک نمائندے نے ''آیا صوفیاء'' کے سامنے استقبال کے لئے موجود حاکمین سلطنت کو شاہی سواری کے لئے دو رویہ کھڑے ہونے کی ہدایت کی۔

سب سے پہلے قاسم کو سو سواروں کا ایک دستہ نظر آیا جو انتہائی نظم و ضبط کے ساتھ بڑھ رہا تھا۔ سواروں کے گھوڑے اپنی گردنیں اکڑائے اور ہنہناتے ہوئے گویا شاہی کی آمد کا اعلان کر رہے تھے۔ ان سواروں کے عقب میں ایک اکیلا گھڑ سوار جس گھوڑے کی پشت پر بازنطینی سلطنت کا علم تھا، زرنگار لباس میں ملبوس اپنی برہنہ شمشیر ہوا میں لہراتا، اٹھلاتا آ رہا تھا۔ اس سوار کے عقب میں ''قسطنطین'' کی شاہی بگھی تھی۔ بگھی کی اس بگھی پر سونے کی پتریاں چڑھی ہوئی تھیں۔ یکے کے بانس یوں دکھائی دیتے تھے گویا سونے سے بنے ہوئے ہوں۔ سونے کی ان پتریوں پر دونوں طرف بیش قیمت یاقوت جڑے ہوئے تھے۔ بگھی کا عقبی حصہ جہاں شہنشاہ کے بیٹھنے کے لئے اکلوتی نشست تھی، حریر و کمخواب کے گراں قیمت پردوں سے آراستہ تھا۔ دونوں طرف کے پردے لپیٹ کر اوپر اٹھا دیئے گئے تھے اور شہنشاہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ قاسم کی نظر قسطنطین کے چہرے پر پڑی تو اُسے پھر بے ساختہ حدیث رسول ﷺ یاد آ گئی..... اذا ھلک قیصر فلا قیصر بعدہٗ..... جب قیصر ہلاک ہو جائے گا۔ تو پھر اور کوئی قیصر نہیں آئے گا..... وہ قیصر جا رہا تھا، یہی وہ آخری قیصر ہے جس کے ہلاک ہونے کے بعد پھر کوئی قیصر پیدا نہ ہو گا۔ قاسم کی نظریں قیصر کے چہرے پر ٹک گئیں۔ یہ ایک نوجوان لڑکا تھا۔ اس کی آنکھیں شیروں کی طرح بھرپور اور آنکھوں میں چیتے جیسی پھرتی تھی۔

شہنشاہ بگھی سے اترا تو قاسم اُس کا تنومند جسم دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ یہ یقیناً کسی آرام پسند شہنشاہ کا جسم نہ تھا۔ قسطنطین کے سر پر بازنطینی سلطنت کا گیارہ سو سال پرانا تاج رکھا تھا۔ یہی تاج پہن کر بازنطینی سلطنت کا بانی قسطنطین اول تخت نشین ہوا تھا۔ اور اب ''قسطنطین'' نام کے بارھویں نوجوان شہنشاہ کے سر پر بھی اسلاف کی وراثت رکھی جا رہی تھی۔ قسطنطین تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا ''آیا صوفیاء'' میں داخل ہو گیا۔ شاہی سوار اس کے عقب میں برابر چلتی ہوئی تین بگھیاں تھیں جن میں شاہی خاندان کی خواتین سوار تھیں۔ درمیان کی بگھی سے ملکہ اور دائیں بائیں کی بگھیوں سے شہزادیاں اُتر کر ''آیا صوفیاء'' کی جانب بڑھیں۔ شاہی خاندان کے مرد وقت سے پہلے ہی ''آیا صوفیاء'' پہنچ چکے تھے۔

شہنشاہ کے پہنچتے ہی مجلس شروع کر دی گئی۔ ''آیا صوفیاء'' کے بطریق اعظم نے اس میزبان کی حیثیت سے مجلس کا آغاز کیا۔

ہال میں تمام نشستیں دائرے کی صورت بچھی تھیں۔ جگہ جگہ کرسیوں کے بیچ میں سے گزرنے کے لئے راستے بنے ہوئے تھے۔ اس طرح خود بخود دو سو افراد کا یہ دائرہ

تقسیم ہو گیا تھا۔ اس تقسیم کا ایک لحاظ اس طرح رکھا گیا کہ دونوں کلیساؤں کے مذہبی پیشواؤں کو الگ الگ حصوں میں بٹھایا گیا۔ راہباؤں اور ننوں کے لئے دائرے کے ایک حصے پر ایک حصہ مخصوص تھا۔ شہنشاہ بطریق اعظم اور کارڈنیل اسیڈور کی اُونچی پشت والی کرسیاں چبوترے پر بچھی تھیں۔ شاہی خاندان کی خواتین بھی راہباؤں اور ننوں کے حصے کی پہلی رو کے اندر بیٹھی اجلاس کی کارروائی دیکھ رہی تھیں۔ دائرے میں موجود تمام ننوں پر زیادہ تک راہب اور پادری براجمان تھے۔ چاروں طرف کی غلام گردشوں اور راہداریوں میں بھی بعض امراء اور فوجی افسران اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھے تھے۔ کلیساؤں کی تقسیم کی وجہ سے دائرے کا ایک ایک بازو ایک ایک فرقے میں بٹ گیا تھا۔ چبوترے کے عین سامنے اور دائرے کے بالکل وسط میں سب سے اگلی نشست پر تمام افواج کا سپہ سالار گرانڈ ڈیوک نوٹاراس موجود تھا۔ اس دائرے کے بیچوں بیچ فرش کا ایک چھوٹا سا گول حصہ کسی شفاف تالاب کی مانند دکھائی دیتا تھا۔

سب سے پہلے بطریق اعظم نے کھڑے ہو کر ''کتابِ مقدس انجیل'' کی تلاوت کی۔ پھر اپنی افتتاحی تقریر سے مجلس کا آغاز کر دیا۔ بطریق نے اپنی تقریر میں کہا۔

''شہنشاہِ معظم و شرکائے مجلس!

آپ پر خداوند اپنی رحمت کا سایہ کرے۔

آج یہ مجلس شہنشاہِ قسطنطنیہ، وارثِ تختِ بازنطینی، بہادر، شاہ قسطنطین یاذ دہم موسوم و لقب بہ قیصرِ روم..... کے حکم پر یہاں طلب کی گئی ہے۔

اس میٹنگ کا مرکزی نقطہ ہے، رومن کیتھولک چرچ اور دی ہولی آرتھوڈکس چرچ کے مابین اتحاد۔ شہنشاہِ معظم کی یہ آرزو ہے کہ دونوں کلیساؤں کے درمیان اتحاد ہو جائے تاکہ صدیوں کی منافرت اور تفرقہ بازی کا خاتمہ ہو سکے۔ جہاں تک اس اختلاف کا تعلق ہے تو دونوں کلیساؤں کے درمیان یہ تصادم گزشتہ نو سو سال سے موجود ہے۔ شہنشاہِ معظم کے عالی نسب اجداد دی ہولی آرتھوڈکس چرچ کے راسخ العقیدہ پیروکار تھے۔ عظیم قیصر آنجہانی ''قسطنطین'' نے ایک خطیر رقم صرف کر کے ''آیا صوفیاء'' کی عمارت تعمیر کی تھی، جس میں اس وقت ہم سب موجود ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ قسطنطنیہ نے خداوند یسوع مسیح کی دعوت پر ''رومہ'' سے پہلے لبیک کہا تھا۔ اور اس بنیاد پر قسطنطنیہ کا چرچ خداوند یسوع مسیح کے اوّلین ماننے والوں میں سے ہے۔ تاریخ اس بات کی بھی شاہد ہے کہ گیارھویں صدی کی صلیبی جنگوں میں قسطنطنیہ

نے اپنے لاکھوں مجاہد شہید کروا کے اپنے سچے عیسائی ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ تاریخ
بات کی بھی شاہد ہے کہ یسوع کا سب سے پہلا کلیسا جو یورپ میں بنا، وہ یہیں تھا
شہنشاہ قسطنطین اوّل نے اعلیٰ قسم کی لکڑی سے تعمیر کروایا تھا۔ اور پھر صدیوں پہلے
صوفیاء'' کے ایک عظیم بطریق اور ہمارے مقدس باپ نے قسطنطنیہ کو ایک بشارت دی
جسے آپ سب لوگ جانتے ہیں۔ لیکن میں پھر بھی اس بات کو دوہرانا ضروری سمجھتا ہوں۔

ہمارے مقدس باپ نے بشارت دی تھی کہ ایک دن ترک قوم کے لوگ قسطنطنیہ
داخل ہو جائیں گے۔ اور رومیوں کا تعاقب کرتے کرتے سینٹ صوفیاء کے گرجا کے سامنے
اُس ستون تک پہنچ جائیں گے جو شاہِ قسطنطین کے نام سے منسوب ہے۔ لیکن بس
ترکوں کی مصیبتوں کا نقطۂ آغاز ہوگا۔ کیونکہ اس موقع پر آسمان سے ایک فرشتہ ہاتھ
تلوار لئے نازل ہوگا۔ (گبن)

معزز مہمانانِ گرامی! اس آسمانی الہام کا مطلب صاف ظاہر ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ
صوفیاء'' کا کلیسا ہی اس شہر کی بقاء کا واحد محافظ ہے۔ آج مشرق و مغرب کے تمام عیسائی
پیشوا ''آیا صوفیاء'' میں موجود ہیں۔ ہمیں سلطان محمد خان کے خلاف دونوں فرقوں کے
پر کوئی اعتراض نہیں۔ ہمیں خوشی ہے اگر ہمارے قدیم بھائی اہل رومہ بدعات کو ترک
کے ہمارے ساتھ مل جائیں.....

دی ہولی آرتھوڈکس چرچ حقیقی عیسائیت کا نمائندہ ہے۔ اس کے علاوہ میں شہنشاہ
کی خدمت میں اس میٹنگ کے آغاز پر ہی یہ درخواست کروں گا کہ اجلاس کی صدارت
باقاعدہ اعلان فرماتے ہوئے یونانی کلیسا اور ''آیا صوفیاء'' کی حرمت اور تقدس کو بھی
مبارک نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیں۔ اس کے ساتھ ہی میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں
شکریہ۔''

بطریق اعظم اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ اب شہنشاہ نے مجلس کی صدارت کا اعلان کیا
بطریق اعظم کی درخواست کو نظر انداز کرتے ہوئے کارڈنیل اسیڈور کو دونوں کلیساؤں کا
متحدہ مجلس کا صدر بنا دیا۔ شہنشاہ کے اس حکم پر یونانی کلیساؤں کے پادری اپنی کرسیوں
جز بز ہو کر رہ گئے۔ اب اجلاس باقاعدہ شروع ہو چکا تھا۔ سب سے پہلے شہنشاہ نے اجلاس
کے مقصد پر روشنی ڈالی اور تمام شرکاء کو اس نقطے پر اعتماد میں لینے کے لئے ایک لمبی تقریر کی
کہ کس طرح دونوں کلیساؤں کا اتحاد دفاعِ قسطنطنیہ کے لئے ضروری ہے۔ شہنشاہ نے اپنی
تقریر میں آیا صوفیاء کے پادریوں اور بطریقوں کو ٹھنڈا رہنے کی ہدایت کی اور اُن کو

یقوں سے سمجھانے کی کوشش کی کہ پاپائے روم اور مغربی یورپ کی امداد قسطنطنیہ
لئے ناگزیر ہے۔ شہنشاہ کو مذہبی اتحاد سے زیادہ مغربی یورپ کی امداد سے دلچسپی تھی۔
لئے وہ دونوں فرقوں کے درمیان ہر اختلاف کو نظر انداز کر کے تمام عیسائیوں کو یکجا کرنا
تھا۔ درحقیقت قسطنطین کی سوچ معقول تھی۔ یہ عیسائی دنیا کی بدنصیبی تھی کہ ان کے
ملت پر حملہ ہونے والا تھا اور وہ ابھی تک تفرقہ بازی کے قصرِ مذلت میں گرے ہوئے
تاریخ شاہد ہے، وہ قومیں کبھی زندہ نہیں رہتیں جو اپنے مرکز کو بھول کر بھانت بھانت
فرقے بنا لیں۔ رسول کریم ﷺ نے مدینہ میں بننے والی ''مسجد ضرار'' کو صرف اس
گرا دیا تھا کہ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے اسے فرقہ بندی قرار دیا تھا۔

قسطنطنیہ پر ایک بہت طاقتور دشمن حملہ آور ہونے والا تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ
کہ قسطنطنیہ، یورپ میں عیسائیت کا رومہ سے بھی بڑا مرکز تھا۔ لیکن پھر بھی عیسائیوں کی
تہ بازی عین ایامِ جنگ میں عروج پر تھی۔ بطریق نے اپنی تقریر میں صاف کہہ دیا تھا
..... رومن کیتھولک چرچ والے اپنی بدعات ترک کر دیں تو وہ ان کے ساتھ اتحاد
نے کے لئے تیار ہیں..... شہنشاہ نے اس کے برخلاف سب کو مشترکہ دشمن کے خطرے
احساس دلانے کی کوشش کی۔ شہنشاہ کے اس خیال پر تمام افواج کا سپہ سالار گرانڈ
ک نوٹاراس سب سے زیادہ برہم ہوا اور اُس نے اپنی نشست پر کھڑے ہو کر ایک لحاظ
شہنشاہ کی گستاخی کی تھی اور بھری مجلس میں ڈنکے کی چوٹ پر کہا۔

''اگر شہنشاہِ معظم کو یہ خطرہ ہے کہ قسطنطنیہ پر مسلمان قابض ہو جائیں گے۔ تو میری
ت میں یہ کوئی بڑا خطرہ نہیں۔ اس سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ قسطنطنیہ پر روم کے ظالم
پ کا قبضہ ہو جائے..... مجھے قسطنطنیہ میں کارڈنیل کی ''ٹوپی'' کے مقابلہ میں ترکوں کے
لے'' دیکھنا زیادہ گوارہ ہے۔'' (دولت عثمانیہ)

نوٹاراس کے الفاظ ایوانِ مجلس پر برق کی طرح گرے۔ ایک لمحے کے لئے تو سارا ہال
گیا۔ سب کی نظریں یکلخت قسطنطین کے چہرے پر اُٹھیں۔ شہنشاہ کا چہرہ انگارے کی
سرخ ہو رہا تھا۔ نوٹاراس نے گستاخی کی حد کر دی تھی۔ لیکن شہنشاہ اپنی کرسی پر پیچ و
کھا کر رہ گیا۔ یہ اُس کا دربار نہ تھا کہ جلاد کو حکم دے کر نوٹاراس کا سر قلم کروا دیتا۔ یہ
کلیسا تھا اور یہاں کسی کا خون بہانا حرام تھا۔ ویسے بھی شہنشاہ جنگ کے اس نازک
پر نوٹاراس جیسے جرنیل کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے شہنشاہ نے کچھ نہ کہا۔ نوٹاراس
گستاخی سے جہاں شہنشاہ اور بعض دیگر لوگوں کے علاوہ رومن کیتھولک پادریوں کو غصہ آیا

وہاں یونانی کلیسا کے پادری بہت مسرور ہوئے۔

نوٹاراس اب بھی شراب پیے ہوئے تھا اور نشے کی حالت میں اُس کے منہ سے الفاظ نکل رہے تھے جو قاسم نے محنت کر کے اُس کے ذہن میں اتارے تھے۔ قاسم نشست پر مسکرا دیا۔

نوٹاراس بیٹھ گیا تو کارڈنیل اسیڈور نے پہلی مرتبہ کھڑے ہو کر کچھ کہنا چاہا۔

''معزز حاضرین مجلس! میں پوپ جان نکلسن کا نمائندہ خصوصی ہوں۔ قسطنطنیہ آپ کے لئے اہم نہیں، ہمارے لئے بھی بہت مقدس ہے۔ بطریق اعظم نے اپنی میں جس بشارت کا حوالہ دیا ہے وہ بشارت مقدس بطریق نے نامکمل سنائی ہے۔ آپ سے بہت سے لوگ اس قدیمی بشارت کے بارے میں پوری طرح جانتے ہوں گے پھر بھی میں ایک مرتبہ پھر اُس مقدس باپ کی بشارت کو دُہراتا ہوں۔

بشارت یہ تھی..... ایک دن ترک قوم کے لوگ قسطنطنیہ میں داخل ہو جائیں گے رومیوں کا تعاقب کرتے کرتے ''سینٹ صوفیاء'' کے گرجا کے سامنے اُس ستون تک جائیں گے جو شاہِ قسطنطین کے نام سے منسوب ہے۔ لیکن بس یہیں اُن کے مصائب نقطۂ آغاز ہو گا۔ کیونکہ اس موقع پر آسمان سے ایک فرشتہ ہاتھ میں تلوار لئے نازل ہوا اُس آسمانی ہتھیار کے ذریعے قسطنطنیہ کی سلطنت ایک ایسے غریب آدمی کے حوالے کر گا، جو اُس وقت اُس ستون کے پاس بیٹھا ہو گا۔ فرشتہ اُس شخص سے کہے گا..... پکڑو۔ اور اس سے خداوند یسوع مسیح کا انتقام لو۔ بس اس حیات آفریں جملے کو ترک فوراً بھاگ کھڑے ہوں گے اور رومی فتح یاب ہو کر ترکوں کو مغرب اور اناطولیہ ایران کی سرحدوں تک بھگا دیں گے.....

(The Decline and fell of the Roman Empire)

چنانچہ اس بشارت کی روشنی میں بطریق اعظم سے پوچھتا ہوں کہ کیا وہ غریب آدمی ستون کے پاس بیٹھا ہو گا، قسطنطین کے خاندان سے نہ ہو گا؟ میں پوچھتا ہوں کہ خداوند نہ کرے ہمارے شہنشاہِ معظم اُس وقت نہ ہوں گے؟ بطریق اعظم اپنے بیان کی وضاحت کریں۔ وہ شہنشاہِ معظم کی موجودگی میں اپنے قدیم پیشواؤں کی ایک کمزور کہانی پیش کر کے شہنشاہِ معظم کی توہین کر رہے ہیں۔

اس کے بعد میں سپہ سالار ڈیوک نوٹاراس کو خبردار کرنا چاہتا ہوں..... وہ جان لیں مسلمان اگر قسطنطنیہ پر قابض ہو گئے تو تمہارے وطن کو پھر عیسائیوں کا مرکز کوئی نہ کہے

سلمان ہمارے کلیساؤں میں اپنے عربی نسل کے گھوڑے باندھ کر ہماری عبادت گاہوں کی توہین کریں گے۔ وہ قسطنطنیہ میں کسی عیسائی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے اور ہماری عورتوں کو بے آبرو کریں گے۔ لیکن اس کے برعکس کارڈنیل کی وہ ٹوپی جس سے آپ کو نفرت ہے، قسطنطنیہ کے عیسائیوں کے لئے جائے پناہ ثابت ہو گی۔ اور اُس وقت یونانی کلیسا کے پادری پچھتائیں گے کہ انہوں نے اپنے رومی بھائیوں پر اعتماد کیوں نہ کیا۔''

قاسم اس اجلاس میں موجود تھا۔ اُس کی کرسی ''آیا صوفیاء'' کے خاص راہبوں اور طریقوں کے ساتھ بچھی ہوئی تھی۔ وہ اجلاس کی ساری کارروائی بڑے غور سے سن رہا تھا۔ جس جگہ قاسم بیٹھا تھا یہ جگہ شرکاء کے دائرے کے دائیں بازو کا آخری سرا تھا۔ اس کے بالکل سامنے والا بازو جس میں ''آیا صوفیاء'' کی راہبائیں اور شہزادیاں بیٹھی تھیں، ایوان کے دائرے کا دوسرا سرا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ قاسم کی نشست خواتین کی نشستوں کے بالکل سامنے آ گئی۔ درمیان میں صرف چند قدم کا وہی فاصلہ تھا جو چبوترے کی چوڑائی تھی۔ چبوترے پر شہنشاہ، بطریق اعظم اور کارڈنیل براجمان تھے۔ قاسم نے اس نشست پر بیٹھتے وقت انتہائی بے تابی کے ساتھ ایک ایک راہبہ کا چہرہ دیکھا تھا کہ شاید ماریا بھی اس اجلاس میں شریک ہو۔ لیکن اُسے ماریا کہیں نظر نہ آئی۔ سامنے کی نشستوں پر شاہی خاندان کی لڑکیاں اور زیادہ مقدس راہبائیں براجمان تھیں۔ کارڈنیل جس وقت مسلمانوں کے مظالم کا ذکر کر رہا تھا، قاسم کا خون کھول اُٹھا۔

اس اجلاس کا ناظم (سٹیج سیکرٹری) ایک نوجوان بطریق تھا۔ جو قاسم کے دائیں پہلو میں ضروری کاغذات کا پلندہ اپنی جھولی میں رکھے اجلاس کی کارروائی دیکھ رہا تھا۔ پہلی مرتبہ اجلاس کے ناظم نے کھڑے ہو کر ایک عجیب اعلان کیا۔

''معزز شرکائے مجلس! آج کے اس اجلاس میں ہمارے درمیان خداوند یسوع مسیح کی جائے پیدائش ''یروشلم'' کے ایک مقدس بشپ بھی موجود ہیں۔ یہ گزشتہ شب تک شہنشاہِ معظم کے مہمان تھے۔ میں اُن سے درخواست کرتا ہوں کہ تعلیماتِ مسیح کی روشنی میں قسطنطنیہ کے نازک حالات پر دونوں کلیساؤں کے اتحاد سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں۔''

یہ اعلان سن کر قاسم چونکا۔ اُسے اس مہمان کے بارے میں کوئی علم نہ تھا۔ غالباً بطریق اعظم بھی ''بیت المقدس'' کے بشپ کی آمد سے بے خبر تھا۔ گو کہ ''بیت المقدس'' بھی سلطنت عثمانیہ کا حصہ تھا۔ لیکن وہاں کے پادریوں اور بشپوں کی ابھی تک پوری عیسائی دنیا

میں بڑی عزت تھی۔ یہ شہنشاہ کی چال تھی۔ جو عین دورانِ اجلاس سامنے آئی تھی۔ بیت المقدس کے مقدس بشپ نے اُٹھ کر دونوں کلیساؤں کے اتحاد پر ایک پُر اثر تقریر کی۔ قریب تھا کہ بہت سے مخلص عیسائی راہب اس اتحاد پر آمادہ ہو جاتے..... کہ اسی اثناء میں ایک باوردی دربان نے شہنشاہ کے قریب جا کر اُس کے کان میں کچھ کہا۔ اور شہنشاہ نے اپنے چہرے سے کسی قدر حیرت کا اظہار کیا۔ شہنشاہ کچھ دیر تک دربان کی بات سنتا رہا۔ اور پھر آخر میں شہنشاہ نے کچھ ایسے انداز میں سر ہلایا جیسے کسی کام کی اجازت دے رہا ہو۔ اگلے لمحے شہنشاہ سے فارغ ہو کر آنے والے دربان نے مجلس کے ناظم کو جو قاسم کے نزدیک بیٹھا تھا، آ کر کچھ ہدایات دیں۔ اگلے لمحے مجلس کے ناظم نے اپنی نشست پر کھڑے ہو کر دونوں کلیساؤں کے اجلاس کو تھوڑی دیر کے لئے برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔ قاسم کا ماتھا ٹھنکا۔ یہ برخاستگی اچانک اور غیر متوقع تھی۔ قاسم سوچ میں ڈوب گیا۔ اعلان کے بعد شہنشاہ اپنی نشست سے اٹھا اور کچھ دیر کے لئے کہیں چلا گیا۔ جبکہ باقی شرکائے اجلاس میں سے چند لوگ جن میں شاہی خواتین بھی شامل تھیں، اُٹھ کر چلے گئے۔ اور جو پیچھے بچ گئے وہ اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے کھسر پھسر کرنے لگے۔

یہ کھسر پھسر تھوڑی ہی دیر بعد بحث میں تبدیل ہو گئی اور دونوں کلیساؤں کے پادری باآواز بلند ایک دوسرے سے تکرار کرنے لگے۔ قسطنطنیہ کے ایک عام سے پادری نے اپنی کرسی پر کھڑے ہو کر کہا۔

''یہ جو تم لوگ ہو..... تم شراب کے ساتھ فطیری روٹی استعمال کرتے ہو۔ یہ کون سی کتاب میں لکھا ہے؟ ہم شراب کے ساتھ فطیری روٹی کھانے والے کو حرام خور اور دینِ عیسوی سے خارج سمجھتے ہیں۔ ہم شراب کے ساتھ خمیری روٹی کھانے کے قائل ہیں۔ جو خمیری روٹی نہیں کھاتا اور فطیری روٹی کھاتا ہے ہم اُس کے کھانے کو حرام سمجھتے ہیں۔ تم نے بدعتیں ایجاد کی ہیں۔ تم حرام کار ہو، حرام خور ہو اور دینِ عیسوی سے خارج ہو، کافر ہو۔''

اسی دوران ''آیا صوفیاء'' کا ایک منچلا پادری اٹھا اور بولا۔ ''شرم کرو شرم!..... اگر خمیری روٹی سے نفرت کرتے ہو تو خمیری شراب کیوں پیتے ہو۔ تم تو ہو ہی کافر۔''

تاریخ کے اوراق نے ''روٹیوں کے اس اختلاف'' کو اپنے نمایاں صفحوں میں جگہ دی۔ ''آیا صوفیاء'' کی عمارت پادریوں کی چیخ و پکار سے گونجنے لگی۔ ہال میں جس قدر راہبائیں بیٹھی تھیں، اُن میں سے کچھ اس لڑائی کو دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں اور کچھ نے پادریوں کے رویئے پر منہ بسور رکھے تھے۔ ہال میں اس وقت کارڈنیل اور بطریق اعظم بھی موجود نہ

تھے۔ نوتاراس اور بعض دیگر اہم لوگ بھی ہال سے اُٹھ گئے تھے۔ جاتے وقت بطریق اعظم نے قاسم کو بھی اپنے ہمراہ بلا لیا تھا۔ قاسم جس وقت آدھے گھنٹے بعد بطریق سے فارغ ہو کر دوبارہ ہال میں داخل ہوا تو اُس نے ایک عجیب سماں دیکھا۔ ہال میں دونوں طرف کے پادری ایک دوسرے کو خوب برا بھلا کہہ رہے تھے۔ دوسو کے قریب پادریوں نے مل کر ''آیا صوفیاء'' میں دھینگا مشتی کا سا سماں پیدا کر رکھا تھا۔ قاسم پادریوں کی حالت دیکھ کر زیرِ لب مسکرا دیا۔ کچھ ہی دیر بعد اجلاس دوبارہ شروع ہونے والا تھا۔ قاسم آ کر اپنی نشست پر بیٹھا اور ہنگامے کا منظر دیکھنے لگا۔ لیکن ہنگامہ اُس وقت اچانک ختم ہو گیا جب چوبدار نے باآواز بلند شہنشاہِ معظم کے آنے کا اعلان کیا۔ پادری پھرتی کے ساتھ اپنی اپنی کرسیاں درست کرنے لگے۔ شہنشاہ کے آنے سے پہلے ہی بطریق اعظم اور دیگر اہم لوگ اپنی اپنی نشستوں پر آ کر بیٹھ گئے۔

کچھ دیر بعد شہنشاہ قسطنطین ہال میں داخل ہوا۔ وہ اپنی نشست پر پہنچا، لیکن بیٹھنے کی بجائے کھڑا رہا۔ وہ سخت غصے میں دکھائی دے رہا تھا۔ اور پھر قسطنطین آتش ناک لہجے میں بولا۔ ''بدبخت قوم! میں تم لوگوں کی تباہی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ دشمن سر پر آ پہنچا ہے اور تم ابھی تک فطیری اور خمیری روٹیوں پر جھگڑ رہے ہو..... ایک بات جو میں تم لوگوں کو نہیں بتانا چاہتا تھا، اب بتانے لگا ہوں۔

اے تفرقہ باز مذہبی پیشواؤ! غور سے سنو! میں نے گزشتہ شب ایک بھیانک خواب دیکھا ہے۔ میں نے ایک بہت بڑی دیوار پر ہزاروں کوے شور مچاتے ہوئے دیکھے ہیں۔ کوئیں کائیں کرتے ہوئے آسمان سر پر اٹھائے ہوئے ہیں۔ پھر میں دیکھتا ہوں کہ مغرب کی طرف سے گدھوں کا ایک بہت بڑا غول اُڑتا ہوا آتا ہے اور اُسی دیوار پر آ کر بیٹھ جاتا ہے۔ پھر میں دیکھتا ہوں کہ کوے اور گدھ آپس میں لڑ رہے ہیں کہ اسی اثناء میں وہ دیوار گر پڑتی ہے۔

اور پھر میں دیکھتا ہوں کہ آسمان کی جانب سے بہت سے شاہین دیوار پر بیٹھے پرندوں کی طرف لپکتے ہیں اور پلک جھپکتے میں انہیں کھا جاتے ہیں۔

پھر میں دریا میں ایک کشتی دیکھتا ہوں جس میں چھید ہو چکا ہے۔ اور بہت سا پانی اُس کشتی میں بھر رہا ہے۔

اور آخر میں ایک بدصورت دیو کو دیکھتا ہوں جس کی آنکھیں سرخ انگاروں کی مانند دہک رہی ہیں۔ یہ دیو مجھے اپنے دامن میں چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن میں چھپنے کی بجائے

اپنی شمشیر نکال کر اُس دیو کا سر قلم کر دیتا ہوں.....

میں نے یہ خواب دیکھا۔ لیکن کسی کو نہ سنایا۔ اے بد بخت مذہبی پیشواؤ! میں نہیں جانتا کہ اس خواب کی تعبیر کیا ہے۔ لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اس خواب کی تعبیر قسطنطین کے حق میں اچھی نہیں۔ میں تمہیں آخری بار نصیحت کرتا ہوں کہ تم لوگ متحد ہو جاؤ۔ ورنہ مسلمان تمہارا نام و نشان مٹا دیں گے۔''

قسطنطین کی تقریر جوشیلی اور زوردار تھی۔ تمام حاضرین پر سناٹا چھا گیا۔ پھر کچھ دیر بعد ''آیا صوفیاء'' کی ایک بوڑھی راہبہ نے اُٹھ کر بات کرنے کی اجازت چاہی اور پھر کہنے لگی۔ ''شہنشاہِ معظم! اس خواب کو نظر انداز کر دینا دانشمندی نہیں۔ سب سے پہلے اس خواب کی صحیح صحیح تعبیر حاصل کی جائے تاکہ اس کی روشنی میں قسطنطنیہ کے لئے آئندہ کا لائحہ عمل تیار کیا جا سکے۔''

بوڑھا فادر بروس بھی راہبہ کی ہاں میں ہاں ملانے کے لئے اُٹھا۔ اور بھی کئی لوگوں نے شہنشاہ کو یہ مشورہ دیا کہ پہلے اس اہم خواب کی تعبیر کسی سے پوچھی جائے۔ شہنشاہ نے لوگوں کے کہنے پر بطریق اعظم اور کارڈنیل کو تعبیر بتانے کے لئے کہا۔ لیکن وہ دونوں بغلیں جھانکنے لگے۔ اسی اثناء میں ایک نوجوان راہبہ نے بات کرنے کی اجازت چاہی اور عرض کی۔

''شہنشاہِ معظم! خوابوں کی تعبیر بتانے کے سلسلے میں ''آیا صوفیاء'' میں صرف ایک ہستی ہی معتبر ہے۔ اور وہ ہے عبادت گزار سسٹر میری..... بہتر ہو گا کہ سسٹر میری کو اجلاس میں بلوا لیا جائے اور اُس خواب کی تعبیر دریافت کی جائے۔''

شہنشاہ کے حکم سے بطریق اعظم نے سسٹر میری کو فی الفور حاضر ہونے کا پیغام بھیج دیا۔

قاسم کے دل کی دھڑکن سسٹر میری یعنی مارسی کا ذکر سنتے ہی بے ترتیب ہو چکی تھی اور پھر جب اُس نے سنا کہ سسٹر میری اجلاس میں شریک ہونے والی ہے، اُس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ وہ بچوں کی طرح جذباتی ہو رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں جدائی کی کسک تھی اور سات سال سے دیدارِ محبوب کی تشنگی تھی۔ اُس کی بے تاب آنکھیں قطرۂ سیماب کی طرح اُس دروازے کی طرف اُٹھنے لگیں جہاں سے مارسی داخل ہونے والی تھی۔ چرچ کے ہال میں موجود ہر شخص تجسس کے مارے اُسی جانب دیکھ رہا تھا۔ شہنشاہ کو بھی بے تابی کے ساتھ اپنے خواب کی تعبیر کا انتظار تھا۔ اور پھر وہ لمحہ بھی آ گیا جب مارسی ہال میں داخل ہوئی۔ قاسم کی نظر اُس سفید پری پر پڑی تو وہ اپنی جگہ پتھر کا ہو گیا۔

مارسی قدم قدم چلتی ہوئی راہباؤں کی نشستوں کی جانب بڑھی۔ پہلی قطار میں ہی اُس

کے لئے ایک کرسی خالی کر دی گئی۔ وہ اپنی نشست پر پہنچ کر ایک مرتبہ شہنشاہ اور پھر ایک مرتبہ حاضرین مجلس کے سامنے احتراماً ذرا سا جھکی..... اور بیٹھ گئی۔

شہنشاہ نے مارسی کو مخاطب کیا۔ ''سسٹر میری! کیا آپ کو دونوں کلیساؤں کی مشترکہ مجلس میں شمولیت کی دعوت نہیں دی گئی؟ آپ ''آیا صوفیاء'' کی ایک پرانی راہبہ ہیں۔ آپ کو آج ہماری مجلس سے غیر حاضر نہیں رہنا چاہئے تھا۔''

قسطنطین کے سوال پر مارسی نے اطمینان کے ساتھ جواب دیا۔ ''شہنشاہِ معظم! یہ اختلافی نوعیت کی مجلسیں نمٹانے کے لئے ہمارے بشپ اور بطریق ہی کافی ہیں۔ میں بحیثیت ایک معمولی خادمہ ہوں۔ اور کلیساؤں کے اختلافی مسائل سے اجتناب کرتی ہوں۔ لیکن پھر بھی میں اپنی غیر حاضری پر معذرت خواہ ہوں۔''

اپنی بات کے دوران مارسی کی نظر قاسم پر پڑ گئی اور اُس کے دل کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ قاسم نے بھی مارسی کے چہرے پر نظریں مرکوز کر رکھی تھیں۔ دونوں کی نگاہیں آپس میں ٹکرائیں تو دونوں کے وجود میں ہزارہا بجلیاں کڑکنے لگیں۔ سات سال کی جدائی نے مارسی کو نیم جان کر رکھا تھا۔ اُس کی نگاہوں نے قاسم کا وجیہہ چہرہ دیکھا تو جیسے مارسی کے مضمحل وجود میں جان سی پڑ گئی۔ کچھ دیر کے لئے تو مارسی کو یہ بھول ہی گیا کہ وہ کہاں کھڑی ہے اور کیا کہہ رہی ہے۔ اُس کی نگاہوں کے سامنے یکے بعد دیگرے ماضی کے اوراق کھلنے لگے۔ اور وہ فی الحقیقت ایک بار پھر ہال سے غیر حاضر ہو گئی۔ اُسے ''ادرنہ'' کی یاد آئی جہاں کے گلی کوچوں میں اُس کا بچپن گزرا تھا۔ اُس قصرِ سلطانی کی ایک ایک راہداری یاد آنے لگی۔ ملکہ سروین کا محبت بھرا چہرہ، شہزادہ محمد کا پُرتکلف مزاج، سلطان مراد خان کی شہزانہ شفقت..... اُسے اپنی ماں مارتھا بھی یاد آئی۔ اور پھر اُسے وہ یادگار دن کیسے بھول سکتا تھا جس روز بھرے سٹیڈیم میں قاسم بن ہشام کو اُس نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ آج پھر قاسم اُس کے سامنے تھا..... ایک بھرے ہال میں۔ لیکن آج نوعیت کچھ اور تھی۔ آج قاسم مارسی کے زد میں تھا۔ جب سے وہ یہاں آیا تھا، مارسی کی جان سولی پر لٹکی ہوئی تھی۔ نہ جانے کس وقت وہ پکڑا جائے۔ وہ تیسرے روز سے ایک ایک لمحہ اسی ذہنی دباؤ میں گزار رہی تھی کہ اُس کا قاسم اُس کے اتنے قریب ہو کر بھی اُس سے دور تھا۔ اُس نے شہنشاہ کی بات کا جواب تو دیا لیکن وہ اس کے بعد اپنے حواس میں نہ رہی۔ اُس کی نظر قاسم پر پڑ رہی تھی۔ پھر نہ جانے کیوں اُس کے سینے میں درد کا ایک شرارہ سا پھوٹا اور شفاف زمرد سے دو قطرے مارسی کی حسین آنکھوں سے جھانکنے لگے۔ اس سے پہلے کہ مارسی کے آنسو

نکلتے، شہنشاہ کی آواز سنائی دی۔

''ہم آپ کی معذرت قبول کرتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ آپ ہمیں ہمارے خواب کی تعبیر بتائیں۔''

اس کے بعد شہنشاہ نے اپنا خواب سنایا۔ جسے سن کر ماری کچھ دیر کے لئے سکتے کے عالم میں کھڑی رہی۔ تمام لوگوں کی توجہ ''آیا صوفیاء'' کی پرانی راہبہ عبادت گزار سسٹر ماری کی جانب مبذول تھی۔ کسے معلوم کہ ماری کی موٹی موٹی آنکھوں سے ٹپکنے والے دو قطرے اچانک کہاں سے آ گئے تھے۔ ہال کا ہر شخص ماری کے آنسو دیکھ کر دم بخود رہ گیا تھا۔ خود شہنشاہ بھی اس خیال سے چونک اُٹھا کہ خواب کی تعبیر یقیناً دردناک ہے۔ اسی لئے سسٹر ماری رو رہی ہے۔ لیکن صرف قاسم جانتا تھا کہ ماری کی آنکھوں سے چرچ کے شفاف فرش پر ٹپکنے والے دونوں آنسو کس قدر قیمتی تھے۔ وہ ان دو آنسوؤں کے لئے قسطنطنیہ جیسے کئی شہر فتح کر سکتا تھا۔ یہ بچھڑے ہوئے محبوب کے آنسو تھے جن سے فردوس کے فرشتے غسل کرتے تھے۔ اور پھر..... قاسم کی آنکھوں میں چمکنے والی ننھی بوندیں کسی کو نہ دکھائی دیں۔

اچانک جب شہنشاہ نے دوسری مرتبہ ماری کو مخاطب کیا تو وہ جیسے کسی گہرے خواب سے جاگ گئی۔ اُس نے ایک طائرانہ نظر حاضرین پر ڈالی اور کسی قدر بھرائی ہوئی آواز میں گویا ہوئی۔

''شہنشاہِ معظم! آپ نے جو خواب دیکھا ہے اُس کی تعبیر بہت بھیانک ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ قدرت نے قسطنطنیہ کا نوشتہ دیوار لکھ دیا ہے۔ دیوار پر بیٹھے ہوئے کوے قسطنطنیہ کے مذہبی پیشوا اور آپس میں لڑنے والے فرقہ پرست عوام ہیں۔ مغرب سے آنے والے گدھ رومہ کا کارڈنیل اور اُس کے ساتھی ہیں۔ اور جس دیوار پر وہ بیٹھے ہیں وہ قسطنطنیہ کی فصیل ہے۔ آسمان کی جانب سے جھپٹنے والے شاہین عثمانی فوج کے بہادر ترک سپاہی ہیں۔ اور جیسا آپ نے بتایا کہ شاہین دیوار پر بیٹھے پرندوں کو کھا جاتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ فتح مسلمانوں کے حصے میں جائے گی۔

آپ نے دریا میں تیرتی ہوئی جو کشتی دیکھی ہے یہ سمندر کے بیچوں بیچ رکھا ہوا شہر قسطنطنیہ ہے۔ اور کشتی میں چھید سے مراد ہے، قسطنطنیہ کے اندرونی اختلافات..... اور آخر میں آپ نے جو دیکھا ہے کہ ایک دہکتی ہوئی آنکھوں والا دیو آپ کو پنا دینا چاہتا ہے..... یہ دیو فی الحقیقت آپ کا دشمن ہے جو آپ کو شکست سے دوچار کر کے دین عیسوی کو زک کرنا چاہتا ہے۔

شہنشاہِ معظم! یہ سارا خواب ہمارے لئے اچھا شگون نہیں۔ لیکن اس کے آخر میں صرف ایک اچھا شگون ہے جو آپ کی ذات سے وابستہ ہے اور اسی کو میں اُمید کی آخری کرن سمجھتی ہوں۔ آپ نے خواب کے آخر میں چونکہ دیو کا سر قلم کر دیا ہے اس لئے صرف ایک صورت میں آپ شاہین صفت مسلمانوں کا بہادری کے ساتھ مقابلہ کر سکتے ہیں۔''

اتنا کہہ کر ماری خاموش ہو گئی۔ شہنشاہ جو ماری کی گستاخانہ تعبیر سے آگ بگولہ ہوا بیٹھا تھا..... تعبیر کا آخری حصہ سن کر یکلخت نرم ہو گیا اور بے صبری سے پوچھنے لگا۔

''مقدس راہبہ!..... آپ نے ہمارے خواب کی تعبیر بتا کر ہمیں اور حاضرین مجلس کو اگرچہ بہت مایوس کیا ہے۔ لیکن ہم شاہین صفت مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کی صورت جاننے کے لئے بے تاب ہیں۔ آپ جلدی سے بتایئے کہ ہمیں کیا کرنا ہو گا؟''

ماری نے کچھ اس انداز سے تعبیر بتائی تھی کہ شہنشاہ سمیت تمام لوگ پہلے تو غصے سے بھر گئے لیکن پھر ایک دم سب لوگ ٹھنڈے ہو گئے۔ قاسم نے دل ہی دل میں ماری کو بے پناہ داد دی۔ اب ماری بولی۔ ''شہنشاہِ معظم! سرخ آنکھوں والا منحوس دیو آپ کے آس پاس ہی کہیں موجود ہے۔ اُسے تلاش کیجئے اور اپنے ہاتھوں سے قتل کر دیجئے۔ تب میدانِ جنگ میں کامیابی آپ کی ہو گی۔''

شہنشاہ کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔ سرخ آنکھوں والا دیو وہ کہاں ڈھونڈتا؟ وہ بے حد مضطرب ہوا اور اُس نے ماری سے کہا۔ ''مقدس راہبہ! ہم سرخ آنکھوں والا دیو کہاں ڈھونڈیں گے؟ کیا ہمیں اس سلسلے میں کوئی رہنمائی مل سکتی ہے؟''

''نہیں شہنشاہِ معظم! میری نظر اس قدر گہرائی میں دیکھنے سے معذور ہے..... لیکن میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ یہ شخص آپ کے آس پاس ہی کہیں موجود ہے۔''

ماری نے اس مرتبہ کچھ اس انداز سے کہا کہ قسطنطین بے چینی سے اپنے آس پاس نظر دوڑانے لگا۔ ماری اپنی نشست پر بیٹھ چکی تھی۔ اجلاس کے تمام شرکاء پتھر کی طرح گم صم اور خاموش بیٹھے تھے۔ بطریق اعظم اپنی جگہ بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ البتہ کارڈنیل اسیڈور زیر لب مسکرا رہا تھا۔ رومن کلیسا کے دیگر پادری بھی خوفزدہ نہ تھے۔ البتہ یونانی کلیسا کے راہبوں کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ شہنشاہ کا خواب بھی بھیانک تھا اور اس کی تعبیر بھی۔ لیکن یکلخت قسطنطین نے مجلس کا رُکا ہوا سلسلہ دوبارہ شروع کرنے کا حکم دے دیا۔

ماری کی بتائی ہوئی تعبیر نے درحقیقت شہنشاہ کا فائدہ ہی کیا تھا۔ اس طرح قاسم کے کئے کرائے پر پانی پھر سکتا تھا۔ کیونکہ قاسم تو دونوں کلیساؤں کا اتحاد نہ چاہتا تھا۔ جبکہ ماری

قاسم کے عزائم سے بے خبر تھی۔ وہ تو اب تک یہ سمجھ رہی تھی کہ قاسم صرف اُسی کو لینے کے لئے یہاں آیا ہے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ ماری نے اپنے علم کے مطابق شہنشاہ کے خواب کی یہ تعبیر بتائی تھی اور اُس نے کوئی بد دیانتی نہ کی تھی۔ شہنشاہ کا فائدہ یہ ہوا کہ اب ماری کی تعبیر سے یونانی کلیسا کے جو پادری خوفزدہ ہو چکے تھے وہ کلیساؤں کے اتحاد پر آمادہ ہوتے دکھائی دیتے تھے۔ شہنشاہ کو اپنے خواب کی تعبیر کے اس فائدہ کا ادراک ہوا تو وہ دل ہی دل میں خوش ہوا اور کہنے لگا..... اچھا ہوا، ایک خواب ہی تو تھا۔ اس کی تعبیر سن کر تمام پادری خوفزدہ ہو گئے ہیں۔ اُمید ہے کہ اب کلیسائے رومہ کے ساتھ اتحاد بھی ممکن ہو سکے گا..... شہنشاہ نے دوبارہ مجلس کا آغاز کیا اور سپہ سالار نوٹاراس سے مخاطب ہو کر کہا۔

''نوٹاراس! یہ وقت آپس میں لڑنے کا نہیں۔ میں ایک شہنشاہ کی حیثیت سے تمہیں حکم نہیں دیتا، قسطنطنیہ کے ایک سپاہی کی حیثیت سے تمہیں اس مقدس اتحاد میں شمولیت کی دعوت دیتا ہوں۔''

نوٹاراس ابھی تک اپنی بات پر بضد تھا۔ لیکن اب اُس کا نشہ اُتر چکا تھا۔ چنانچہ اُس نے مؤدبانہ لہجے میں شہنشاہ سے کہا۔ ''شہنشاہِ معظم! نوٹاراس ہر قیمت پر مسلمانوں سے لڑے گا اور آخر دم تک لڑے گا۔ چاہے کلیساؤں کا اتحاد ہو یا ہونے سے رہ جائے۔ میں شہنشاہِ معظم کے مقدس لشکر میں ایک سپاہی کی حیثیت سے لڑنے پر بھی فخر کروں گا۔''

سپہ سالار نے گول مول بات کی اور خاموش ہو گیا۔

قاسم اور ماری ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھ رہے تھے..... میٹنگ ہوتی رہی۔ شہنشاہ، وزرائے سلطنت، آیا صوفیاء کے بطریق، کارڈنیل کے بشپ سب بولتے رہے اور ہال میں دیر تک مختلف آوازیں گدش کرتی رہیں۔ لیکن قاسم اور ماری کے لئے مجلس کب کی ختم ہو چکی تھی۔ ہال میں موجود ہر شخص میٹنگ کی جانب متوجہ تھا، لیکن ماری اور قاسم ایک دوسرے کی جانب متوجہ تھے۔ نہ جانے کتنا وقت گزر گیا..... آیا صوفیاء کی سب سے بڑی اور تاریخی مجلس جاری تھی۔ قاسم اپنے فرض کو بھلا چکا تھا۔ وہ اُٹھ کر ماری کے پاس جانا چاہتا تھا لیکن وہ ایسا نہ کر سکتا تھا۔ ماری بھی ایسا نہ کر سکتی تھی.....

مجلس جاری رہی۔ یہاں تک کہ آیا صوفیاء کے بیس میں سے چار بطریق اور سو میں سے تیرہ پادری کلیسائے رومہ کی بالادستی تسلیم کرنے پر تیار ہو گئے۔ بوڑھا ''فادر برونو'' بھی ان میں شامل تھا۔ لیکن بطریق اعظم ابھی تک کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا۔ اور پھر وہ وقت بھی آیا کہ شہنشاہ نے صلح کا معاہدہ تیار کرنے کا حکم دے دیا۔ کلیسائے قسطنطنیہ پر کلیسائے

رومہ کی بالادستی تسلیم کر لی گئی تھی اور شہنشاہ نے اپنے طور پر یونانی کلیسا کو رومی کلیسا میں ضم کرنے کا باضابطہ اعلان کر دیا تھا۔ گویا اتحاد ہو تو گیا تھا لیکن اسے صحیح معنوں میں اتحاد نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کیونکہ زیادہ تر پادری ابھی تک برافروختہ تھے۔

شہنشاہ کے اعلان کے بعد کسی جانب سے کسی راہب نے بطریق اعظم ثانی ڈیمونان کے قتل کا ذکر چھیڑا تو قاسم ایک دم چونکا۔ اور اب پہلی بار اُس کی توجہ مجلس کی جانب مبذول ہوئی۔ مجلس میں ڈیمونان کا ذکر کر کے یہ کہا گیا کہ ابھی تک اُس کے قاتل کی گرفتاری عمل میں نہیں لائی جا سکی جبکہ اس بات کے واضح ثبوت ملے ہیں کہ یہ قتل کلیسائے رومہ کے کسی پادری نے کیا ہے۔

قسطنطین کو معاہدہ ہو جانے کے بعد یہ بات ناگوار لگی اور اُس نے حاضرین دربار کو ڈانٹ دیا۔

لیکن عین اُس وقت جب ڈیمونان کا قاتل نہ ملنے کی بات ہو رہی تھی، پراسرار شاگال مجلس کے ہال میں داخل ہو چکا تھا۔ وہ اپنے عصا کو فرش پر ٹیکتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اور اُس کے عصا کی ٹھک ٹھک سن کر تمام حاضرین مجلس اُس کی جانب دیکھنے لگے تھے۔ قاسم کی نظریں اُس کی جانب اُٹھیں تو اُس کا دل دھک سے رہ گیا۔ قاسم کی چھٹی حس خطرے کا الارم بجانے لگی تھی۔ شاگال کو دیکھتے ہی اُسے اپنی نشست پر گھٹن محسوس ہونے لگی۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ اُٹھ کر شاگال کا سر قلم کر دے یا یہاں سے بھاگ جائے۔ شہنشاہ بھی شاگال کی جانب دیکھ رہا تھا۔ شاگال اپنے عصا کو ٹیکتا ہوا اکڑ کر چلتا ہوا حاضرین مجلس کے درمیان سے گزرنے لگا۔ وہ اگرچہ ایک بطریق تھا، لیکن اُس کے طور اطوار مصر کے قدیم جادوگروں جیسے تھے۔ وہ لوگوں کو چیرتا ہوا تمام کرسیوں سے آگے نکل آیا اور شہنشاہ کے بالکل سامنے دائرے کے درمیانی صحن میں کھڑا ہو گیا۔ اُس کی نظریں شہنشاہ کی جانب اُٹھی ہوئی تھیں اور وہ اپنی بھیانک سرخ آنکھوں سے شہنشاہ کو گھور رہا تھا۔

یکلخت شہنشاہ کو سرخ آنکھوں والا دیو یاد آ گیا۔ اور جب شہنشاہ نے شاگال کی شکل پر غور کیا تو اُسے ایسے لگا کہ جیسے یہ واقعتاً وہی دیو ہو جو اُس نے رات خواب میں دیکھا تھا۔ شہنشاہ کو سسٹر میری کی بتائی ہوئی تعبیر یاد آئی اور اُس نے ساری دنیا کی پرواہ کئے بغیر اپنی شمشیر کے قبضے پر ہاتھ رکھا تاکہ آگے بڑھ کر اس سرخ آنکھوں والے دیو کا سر اپنے ہاتھ سے قلم کر دے۔ ابھی وہ اٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ شاگال کے چہرے پر ایک مکروہ مسکراہٹ دیکھ کر رُک گیا۔ شاگال، شہنشاہ کی جانب اُنگلی کا اشارہ کر کے جب مخاطب ہوا

تو اُس کی آواز سن کر قاسم کو ایسے لگا جیسے اُس کے گلے سے بیک وقت دو انسانوں کی آواز نکل رہی ہو۔ شاگال کی آواز کسی کانٹے دار جھاڑی کی طرح کھردری تھی۔ اُس نے کہا۔

''شہنشاہِ معظم! اپنی شمشیر کے قبضے سے ہاتھ ہٹا لیجئے۔ ابھی تو میں آپ کو اپنے دامن میں پناہ دینے آیا ہوں۔ ورنہ ہمارے اسلاف کا تاریخی شہر فنا ہو جائے گا۔''

شہنشاہ نے رات خواب میں دیکھا تھا کہ سرخ آنکھوں والا دیو اُسے اپنے دامن میں چھپانا چاہتا ہے۔ اور اب شاگال اُسے اپنے دامن میں پناہ دینے کی بات کر رہا تھا۔ شہنشاہ کو یقین ہو گیا کہ یہی وہ شخص ہے جسے قتل کر کے قسطنطین کو جنگ میں کامیابی ہو سکتی ہے لیکن شاگال کی آنکھوں میں کچھ ایسی طاقت تھی کہ شہنشاہ اپنی جگہ سے ایک قدم بھی نہ اُٹھا پایا۔ شاگال پھر کہنے لگا۔

''شہنشاہِ معظم! میں آپ کو ایک ایسی خبر بتانے آیا ہوں کہ آپ اسے سن کر بے اختیار مجھے قسطنطنیہ کا نجات دہندہ قرار دیں گے۔''

لیکن شہنشاہ کے ذہن میں ایک ہی چکی چل رہی تھی۔ اور وہ یہ تھی کہ شاگال ہی سرخ آنکھوں والا دیو ہے۔ شاگال نے اپنی بات جاری رکھی۔ اُس نے کہا۔

''شہنشاہِ معظم! میں نے بطریق ڈیمونان کے قاتل کو تلاش کر لیا ہے۔''

شاگال کے منہ سے یہ الفاظ نکلنے کی دیر تھی کہ قاسم اپنی جگہ پر دہل کر رہ گیا۔ صرف قاسم ہی نہیں، مارسی بھی بری طرح گھبرا گئی تھی۔ کیونکہ اُسے بھی شک تھا کہ ڈیمونان کو قاسم نے قتل کیا ہے۔ اور شہنشاہ اپنی جگہ انتہائی حیرت سے اپنی دونوں آنکھیں پٹپٹا رہا تھا۔ پوچھ رہا تھا۔

''محترم بطریق! کون ہے وہ بدبخت قاتل جس نے دونوں کلیساؤں کے اتحاد کو نقصان پہنچانے کے لئے یہ مذموم حرکت کی؟''

شہنشاہ کی بات مکمل ہوئی تو بطریق کا سر دھیرے دھیرے گھومتے ہوئے قاتل کی جانب جا رُکا۔ اب اُس کی سرخ انگارہ آنکھیں قاسم کی آنکھوں میں پیوست ہو چکی تھیں۔ اُس نے ایک دم اپنا دایاں بازو اُٹھا کر قاسم کی جانب اُنگلی کا اشارہ کیا اور شہنشاہ سے کہا۔

''یہ ہے بطریق اعظم ثانی کا قاتل! جو اس وقت آپ کے سامنے بیٹھا ہے۔ اسی نے شمشیر نے ڈیمونان کا سر اس کے تن سے جدا کیا۔''

مارسی کو محسوس ہوا کہ اُس کی دنیا جو دو روز قبل روشن ہوئی تھی، یکلخت تاریک ہو گئی۔ قاسم نے دل میں کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے خود کو سزائے موت کے لئے تیار کر لیا۔

اچانک قاسم کے دل سے تمام خوف دُور ہو گئے اور اُسے پہچان لئے جانے پر یک گونہ اطمینان ہوا۔ کچھ ایسا اطمینان جیسا مسافر کو منزل مل جانے پر ہوتا ہے۔ پورے ہال کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ بطریق اعظم جس نے قاسم کو اپنا مشیر مقرر کیا تھا، تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اور شہنشاہ قاسم کو ٹکٹکی باندھ کر مسلسل گھور رہا تھا۔ شہنشاہ نے یکلخت بجلی کی طرح کڑکتے ہوئے کہا۔

''کون ہے یہ شخص؟..... اور تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہی ڈیمونان کا قاتل ہے؟''

''میرے پاس یہ ثبوت ہے.....'' شاگال نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کچھ کاغذات آگے بڑھ کر شہنشاہ کو تھما دیئے۔ اور کہا۔ ''شہنشاہِ معظم! یہ تین تحریریں ہیں۔ ان میں سے پہلا وہ جعلی خط ہے جو ڈیمونان کی لاش سے ملا۔ یہ نیلے رنگ کے شاہی لفافے میں تھا اور اس خط پر جو الفاظ تحریر کئے گئے وہ آپ کے سامنے ہیں۔ دوسرا خط تھریس کے بشپ لیمارک کی طرف سے لکھا گیا۔ اور وہ بھی جعلی ہے۔ جو اس نوجوان نے بطریق اعظم کو یہ کہہ کر دیا کہ لیمارک نے لکھا ہے۔ لیکن جب مجھے معلوم ہوا تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ کیونکہ میں تھریس کے چرچ میں اکثر جاتا ہوں، میں نے اس شخص کو وہاں کبھی نہ دیکھا تھا۔ اور تیسری تحریر میں نے اس کے کمرے میں موجود اُن دستاویزات میں سے حاصل کی ہے جو اس نے حال ہی میں اپنے ہاتھ سے تحریر کیں۔

شہنشاہِ معظم! ان تینوں تحریروں پر نظر ڈالی جائے تو یقین ہو جاتا ہے کہ یہ کسی ایک ہی ہاتھ کا رسم الخط ہے۔ میں پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ یہ شخص مسلمان ہے اور سلطان محمد خان کا جاسوس ہے۔''

حاضرین مجلس کے چہروں سے ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ بطریق اعظم حیرت کے سمندر میں غوطے کھا رہا تھا اور شہنشاہ کا چہرہ غصے سے لال بھبھوکا ہو چکا تھا۔ شہنشاہ نے انتہائی اونچی آواز میں دھاڑتے ہوئے کہا۔

''جلاد! اس نابکار کا سر اتار کر ہمارے قدموں میں ڈال دو۔''

قاسم یہ حکم سنتے ہی اپنی نشست پر اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ظاہری طور پر ایک راہب بنا ہوا تھا، چنانچہ اُس کے پاس کوئی ہتھیار تو نہیں تھا۔ لیکن اُس نے دل میں تہیہ کر لیا کہ شہید ہونے سے پہلے خالی ہاتھ ہی کئی عیسائیوں کا خاتمہ کر کے رہے گا۔ شہنشاہ نے جلاد کو پکار کر حکم تو دے دیا لیکن کوئی جلاد آگے نہ بڑھا۔ کیونکہ یہ مقدس چرچ تھا اور یہاں جلاد موجود نہ

تھے۔ ایک دم شہنشاہ کو اپنی حماقت کا احساس ہوا اور اُس نے فوراً کہا۔

''سپاہیو!..... اس مسلمان کو گرفتار کر لو۔ ہم اسے سرِ عام عبرتناک سزائے موت دے کر دوچار کریں گے۔''

قاسم نے شہنشاہ کا دوسرا حکم سنا تو لڑنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اُس نے سوچا کہ اس کے لئے گرفتار ہو جانا ہی بہتر ہے۔ وہ ایک جاسوس ہے اور قید خانے سے فرار ہونے کی ہمت رکھتا ہے۔ محافظ دستے کے سپاہی آگے بڑھے اور قاسم کے ہاتھوں اور پیروں میں زنجیریں ڈال دیں۔

مجلس غروبِ آفتاب کے بعد جلد ہی ختم ہو گئی اور قاسم کی گرفتاری کی بدولت کلیساؤں کے اتحاد میں چند لوگ مزید کھلے دل کے ساتھ شامل ہو گئے۔ شہنشاہ نے شاگال کو انعامات دینا چاہے لیکن شاگال نے کچھ بھی لینے سے انکار کر دیا۔ وہ جس طرح آیا تھا اُسی طرح مڑا اور ''آیا صوفیاء'' کے ہال سے نکل گیا۔ مجلس ختم ہوئی اور سب لوگ آج کے سنگین واقعہ کا تاثر لے کر یہاں سے جانے لگے۔ لیکن بطریق اعظم اور سپہ سالار نوٹاراس کی حالت دیکھنے والی تھی۔ وہ دونوں قاسم کے دام میں پھنسے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ شرمندہ دکھائی دے رہے تھے۔ سب سے زیادہ خراب حالت مارسی کی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں جانے کے لئے قدم تو اٹھا رہی تھی لیکن اُسے یوں لگتا تھا جیسے اُس کا ایک ایک قدم ایک ایک من کا ہو چکا ہو۔ وہ اپنی قسمت پر حیران ہو رہی تھی جس نے سات سال کے بعد قاسم سے ملوایا۔ لیکن وہ اُس سے دو باتیں بھی نہ کر سکی۔ مارسی کو اتنا دُکھ کبھی نہ ہوا تھا جتنا اب ہوا تھا۔ اب اُسے قاسم کی زندگی سے زیادہ کسی چیز کی فکر نہ تھی۔ وہ سر جھکائے ڈھیلے ڈھالے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھتی رہی۔

قیصرِ روم

قاسم بن ہشام کو گرفتار کر کے شاہی محل کے تاریک تہہ خانے میں پھینک دیا گیا تھا۔ سلطان محمد خان کے پاسم قاسم کا آخری مکتوب یہی پہنچا تھا کہ دونوں کلیساؤں کا اتحاد سبوتاژ کر دیا گیا ہے۔ اور سپہ سالار ''نوٹاراس'' رومی کلیسا کے خلاف سخت برہم ہے۔ قاسم نے سلطان کو یہ بھی لکھا تھا کہ ''جان جسٹینانی'' عنقریب آبنائے باسفورس میں پہنچنے والا ہے۔ اور شہر میں کئی سال تک محصور رہنے کی صورت میں لاکھوں ٹن رسد جمع کی جا چکی ہے۔ گزشتہ کئی ماہ سے سلطان، قاسم کے متعدد خط وصول کر چکا تھا جن میں سب سے اہم خط فصیل شہر اور ''گولڈن ہارن'' سے متعلق تھا۔ لیکن اب آج سلطان کو خبر ملی تھی کہ قاسم بن ہشام کو بطریق ڈیمونان کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا ہے اور جلد ہی شہنشاہ اُسے سزائے موت دے دے گا۔ سلطان نے با آوازِ بلند..... مرحبا کہہ کر قاسم بن ہشام کو خراجِ تحسین پیش کیا اور قاسم کی رہائی کے سلسلے میں اپنے سالاروں سے بات چیت کرنے لگا۔

قاسم کی سزائے موت پر ابھی عملدرآمد نہ ہوا تھا۔ شہنشاہ نے خود محل میں آنے کے بعد قاسم کی سزا رُکوا دی تھی اور اُسے تاریک قید خانے میں ڈال دیا۔ قسطنطین کا خیال تھا کہ وہ قاسم سے سلطان محمد خان کی افواج کے بارے میں بہت کچھ اُگلوا سکتا ہے۔ ادھر قاسم کے دو شناسا مسلمان جو اِکا دُکا قسطنطنیہ میں موجود تھے، قاسم کی گرفتاری کے ساتھ ہی روپوش ہو گئے۔ یہ خبر اُڑتی اُڑتی رومیل کے گھر تک جا پہنچی۔ اور بریٹا نے بھی سن لیا کہ فادر ڈیمونان کا قاتل جو ایک مسلمان جاسوس تھا..... ''آیا صوفیاء'' سے گرفتار کر لیا گیا ہے۔

مارسی ابھی تک نڈھال تھی۔ وہ اپنے آپ کو کسی بے بس پرندے کی طرح محسوس کرتی تھی جو ایک آہنی پنجرے میں جکڑ لیا گیا ہو۔ وہ اُٹھتے بیٹھتے قاسم کی رہائی کے لئے ترکیبیں سوچنے لگی۔ لیکن اُسے کوئی ممکن راستہ نظر نہ آیا۔ یہ تو مارسی کی حالت تھی۔ لیکن سب سے زیادہ قابلِ دید کیفیت ''سونیا'' کی تھی جسے قاسم دیوانی لڑکی کہہ کر مخاطب کیا کرتا تھا۔ سونیا کل سے اپنے چھوٹے سے کمرے میں بے سدھ پڑی تھی۔ اُس کے لئے قاسم کا مسلمان ہونا ہی ایک بہت بڑا جھٹکا تھا۔ وہ اگرچہ کوئی سنجیدہ مذہب پرست تو نہ تھی لیکن پھر بھی وہ اس خوف میں مبتلا تھی کہ بھلا ایک مسلمان جاسوس ایک عیسائی خادمہ کے ساتھ

کیونکر مخلص ہوسکتا ہے۔ دن تیزی کے ساتھ گزرنے لگے۔

''ادرنہ'' کے قصرِ سلطانی میں آج گہما گہمی تھی۔ آج ''سلطان محمد خان'' اپنے بحری بیڑے کا معائنہ کرنے کے لئے ''بحر اسود'' کی جانب روانہ ہونے والا تھا۔ اُس کے پسندیدہ سالار آغا حسن، احمد کدک پاشا اور محمود پاشا بھی اُس کے ہمراہ جانے والے تھے۔ سلطان کی سواری تیار تھی کہ اسی اثناء میں سلطان کا ایک قاصد آ نکلا۔ قاصد نے پیغام دیا کہ..... ''رومیلی حصار'' پایۂ تکمیل تک پہنچ چکا ہے۔ صرف ایک ماہ کی معمولی تعمیر باقی ہے اور جلد ہی حصار کے بُرج پر توپیں چڑھائے جانے کے قابل ہو جائیں گی۔

سلطان کے لئے یہ بہت اچھی خبر تھی۔ ادھر اُس کا بحری بیڑا بھی اپنی تیاری کے آخری مراحل میں تھا۔ بڑے بڑے تمام جہاز تیار ہو چکے تھے اور انہی جہازوں کا معائنہ کرنے کے لئے سلطان آج بحرہ اسود کی جانب جا رہا تھا۔ سلطان شہنشاہوں کی طرح بگھیوں اور رتھوں میں سفر کرنے کا عادی نہ تھا۔ اُس کی سواری تو صرف ایک عربی نسل کا ''ابلق'' گھوڑا تھا۔ سلطان اپنے ساتھیوں کے ہمراہ سورج نکلنے کے ساتھ ہی روانہ ہوگیا۔ یہ عثمانی سلطنت کا پہلا سلطان تھا جس کی شخصیت میں ادبی رنگا رنگی اور فنونِ لطیفہ سے بے پناہ دلچسپی کا بہت زیادہ رجحان تھا۔ ''محمود پاشا'' بھی شاعر تھا۔ چنانچہ جب کبھی سلطان محمد خان اور محمود پاشا ایک ساتھ کہیں روانہ ہوتے تو راستے بھر محفل زعفران رہتی۔ سلطان محمد خان کو فارسی کے ہزاروں شعر زبانی یاد تھے۔ فارسی اور ترکی زبان میں سلطان خود بہت اچھے شعر کہہ لیتا تھا۔ چنانچہ بحر اسود تک کا سفر ہنستے کھیلتے کٹ گیا۔ اور سلطان عثمانی فوج کے بحری بیڑے کے نزدیک پہنچ آیا۔ یہاں کھلا ساحل تھا اور براعظمی ترائی دو سو فٹ تک چلی گئی تھی۔ سلطانی بیڑے کے جہاز اور کشتیاں بحر اسود میں کھڑے جھول رہے تھے۔ ساحل پہ بہت سے سپاہی اور ملاح چلتے پھرتے نظر آئے۔ ایک ملاح نے سلطانی دستے کو آتے دیکھا تو دوڑتا ہوا امیر البحر کے پاس پہنچا۔ امیر البحر ''بلوط اغلن'' ایک بحری جہاز کے عرشے پر کھڑا سمندر کی جانب دیکھ رہا تھا۔ بلوط اغلن کو جیسے ہی معلوم ہوا کہ سلطان دو سو سواروں کے محفوظ رفتار دستے کے ہمراہ خود آ پہنچا ہے تو اُس کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ دیوانوں کی طرح نیچے کی طرف بھاگا۔ امیر البحر نے ساحل پر پہنچ کر دیکھا کہ سلطان ایک بوڑھے ملاح کے ساتھ محوِ گفتگو ہے۔ اُس نے دیکھا کہ سپاہیوں اور بہت سے ملاحوں نے سلطان محمد خان کا والہانہ استقبال کیا۔ امیر البحر سلطان کے پاس پہنچا اور مؤدبانہ سلام کہنے کے بعد بحرِ اسود کے ساحل پر خوش آمدید کہا۔

بوڑھا کپتان ''عباس'' سلطان کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ساحلی ہوا کے جھونکے سلطان محمد خان کے سیاہ عمامے کو لہرا رہے تھے۔ یہ بوڑھا ملاح یونانی جہازوں کا سابق کپتان ''بارٹا کوزین'' تھا جو مسلمان ہونے کے بعد ادرنہ چلا آیا تھا اور سلطان نے اُسے بحر اسود میں اپنے بیڑے کی تیاری کا نگران مقرر کیا۔ اصل ذمہ داری تو امیر البحر کی تھی۔ بوڑھا ملاح محض اُس کا معاون تھا۔ سلطان اپنے سالاروں اور میزبانوں کے ہمراہ سب سے بڑے جہاز کے عرشے پر چڑھ آیا۔ یہ بحری بیڑے کا علمبردار جہاز تھا۔ اسی طرح علمبردار جہاز میمنہ، میسرہ، قلب اور ہراول کے لحاظ سے چار تھے۔ سلطان نے جہاز کے عرشے سے بحر اسود میں پھیلے اپنے بحری بیڑے پر نگاہ دوڑائی اور سلطان کا سینہ خوشی سے پھول گیا۔ موجوں کے ساتھ اٹکھیلیاں کرتی ہوئی ہوا نے سلطان کے کانوں میں کوئی ایسی سرگوشی کی کہ وہ مسکرا دیا۔ اور محمود پاشا کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''محمود پاشا! آپ دیکھ رہے ہیں، دیر دانیال کی ہوائیں ہمیں بلانے کے لئے آ پہنچی ہیں۔ باسفورس کا نیلا پانی ہمارے جہازوں کا استقبال کرنے کے لئے بے تاب ہے..... محمود پاشا! آج ہم آپ کو ایک خاص بات بتاتے ہیں۔''

سب لوگ سلطان کی جانب متوجہ ہو گئے۔ سلطان نے جنوب مغربی ساحل کے ساتھ نگاہ دوڑائی اور اُسی جانب منہ کر کے کہا جدھر قسطنطنیہ تھا۔

''محمود پاشا! ہم بہت چھوٹے سے تھے جب ہم نے قسطنطنیہ کے بارے میں سنا۔ پھر جب ہم قیصرِ روم شہنشاہِ قسطنطنیہ کی سازشوں کے بارے میں سنتے تھے تو ہمارے دل سے بس یہی آواز نکلتی تھی کہ جب ہم سلطان بنیں گے تو کفر کے اس قدیمی مرکز قسطنطنیہ کو عثمانی سلطنت کا حصہ ضرور بنائیں گے۔''

سلطان نے اتنا کہنے کے بعد عربی زبان کا ایک شعر پڑھا، جس کا مفہوم تھا.....

''اے قسطنطنیہ کی اُونچی فصیلو! تم دیوانوں کا راستہ نہیں روک سکتیں۔ ہم تو دیوانے ہیں اپنے محبوب کے عشق میں دیوانے۔''

محمود پاشا نے سلطانی ذوق کی داد دی اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ''سلطانِ معظم! آپ کا لہجہ دیکھ کر یہ پیشگوئی کرنے کے لئے کسی بصیرت کی ضرورت نہیں کہ قسطنطنیہ کے دن گنے جا چکے ہیں۔ اور بہت جلد یہ شہر قسطنطنیہ نہیں بلکہ ''اسلام بول'' بن جائے گا۔''

سلطان نے محمود پاشا کے منہ سے قسطنطنیہ کا نیا نام سنا اور بہت پسند کیا۔ سلطان نے فیصلہ کیا کہ وہ ''رومیلی حصار'' اور ''اناضول حصار'' کی جانب چند جہازوں اور کشتیوں کا

ایک دستہ بھیجے گا۔ چنانچہ سلطان نے بوڑھے کپتان عباس کو چار جہازوں کے مختصر دستے کا سالار مقرر کیا اور اُسے آبنائے باسفورس میں داخل ہو کر آبنائے کا راستہ ''بحر مارمورا'' کے ساتھ کاٹ دینے کی ہدایت کی۔ چاروں جہازوں کے ساتھ دس دس کشتیاں باندھی گئیں۔ سلطان نے سالار عباس کو ہدایت کی کہ وہ اس کے سامنے اس مبارک جہاد پر ایک ہراول دستے کی حیثیت سے روانہ ہو۔ چنانچہ عباس کی روانگی کا وقت اگلے روز کے لئے طے کیا گیا۔ اور سلطان اپنی قیام گاہ میں جو ساحل پر ہی بنائی گئی تھی، لوٹ آیا۔ آج کی رات سلطانی بیڑے کے ملاحوں اور سپاہیوں کے لئے ایک با رونق رات تھی۔ سلطان نے ہراول دستے کی روانگی کا جشن منانے کی ہدایت کی۔ ترک سپاہیوں نے نئے لباس بدلے، مشعلیں جلائیں، چراغاں کیا۔ جگہ جگہ الاؤ روشن کئے۔ بعض سپاہیوں نے طبل جنگ اور نقارے کی چوٹ پر کرتب دکھائے۔ شمشیر زنی، اکھاڑے کی کشتی اور تاریکی کی تیر اندازی کے مقابلے ہوئے۔ سلطان کی طرف سے بے شمار بلغی دُنبے اور بھیڑیں ذبح کی گئیں جو کا سالم گوشت لکڑیاں اکٹھی کر کے بھونا گیا۔ سلطان نے سارے عملے میں انعامات تقسیم کئے۔ اور یوں عثمانی بحریہ کے اولین دستے کی روانگی کا جشن منایا گیا۔

اگلی صبح سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی عباس کے جہازوں نے بحر اسود کا ساحل چھوڑ دیا۔ بوڑھا عباس اپنے جہاز کے عرشے پر کھڑا تھا۔ تمام جہازوں پر سلطنت عثمانیہ کا پرچم لہرا رہا تھا۔ سلطان، امیر البحر، محمود پاشا، احمد کدک پاشا اور آغا حسن ساحل پر کھڑے ''عباس'' کے جہازوں کو ہاتھ ہلا ہلا کر الوداع کر رہے تھے۔ ساحل کا تمام عملہ، تمام سپاہی اور ملاح الوداع کہنے والوں میں شامل تھے۔ اور یوں بحر اسود کا لاکھوں سال پرانا ساحل جولائی 1452ء کی ایک صبح ''اللہ اکبر'' کے نعروں سے گونج اُٹھا۔ بوڑھے کی رگوں میں ایک مرتبہ پھر جوان خون دوڑنے لگا۔ اُس کے تن بدن میں جوش و خروش بڑھ گیا اور اُس نے صرف چودہ دن میں بحر اسود عور کر کے اپنے جہازوں کو آبنائے باسفورس کے دہانے پر ڈال دیا۔

مصلح الدین آغا رومیلی حصار کے ایک برج پر کھڑا آبنائے باسفورس میں داخل ہونے والے چھوٹے چھوٹے جہازوں کو دیکھ رہا تھا۔ اُسے یہ جہاز دُور سے چھوٹے چھوٹے نقطوں کی مانند دکھائی دے رہے تھے۔ یہ جہاز بحر اسود کی جانب سے آبنائے میں داخل ہوئے تھے۔ لہٰذا مصلح الدین کو خدشہ تھا کہ ان جہازوں میں قسطنطنیہ کے لئے شمالی یورپ کی کمک آ رہی ہو گی۔ مصلح الدین آغا کے اعصاب تن گئے۔ کیونکہ ان جہازوں کو روکنا

حصار کے پاس ہی سے گزرنا تھا۔ مصلح الدین آغا نے فی الفور اپنے تمام سپاہیوں کو اکٹھا کر کے مستعد رہنے کی ہدایات دیں اور قلعے کے دروازے بند کرا دیئے۔ اس وقت آغا برج پر کھڑا انہی جہازوں کو دیکھ رہا تھا۔ اور پھر اُس وقت مصلح الدین آغا کے نعرہ تکبیر نے قلعے کے در و دیوار کو ہلا دیا جب اُس کی نظر عثمانی پرچموں پر پڑی۔ اُس نے قلعے کے دروازے کھول دینے کا حکم دیا اور اپنے سپاہیوں سے کہا وہ آگے بڑھ کر عثمانی بحریہ کے ہراول دستے کا استقبال کریں۔

عباس کے جہاز رومیلی حصار کے سامنے آ کر لنگر انداز ہو گئے۔ مصلح الدین آغا نے بوڑھے کپتان عباس کا والہانہ استقبال کیا۔ عباس نے آغا کو بتایا کہ سلطان نے آبنائے باسفورس کی ناکہ بندی کا حکم دے دیا ہے۔ آج سے باسفورس کی گزرگاہ تمام عیسائی جہازوں اور کشتیوں کے لئے بند ہو چکی ہے۔ یہ گویا ہماری طرف سے جنگ کا آغاز ہے۔ ہمارے پاس چار بڑے جہازوں اور چالیس کشتیوں پر مشتمل ایک مختصر بیڑا ہے۔ اور اب ہم آبنائے باسفورس کے تنہا محافظ اور نگران ہیں۔

عثمانی بیڑے کے ہراول دستے نے آبنائے باسفورس کے سب سے بڑے حصے پر جو بحر اسود کا دہانہ تھا، اپنی حکمرانی قائم کر دی۔ شروع شروع میں بعض عیسائی جہاز اس طرف آ نکلے لیکن عباس کے بہادر سپاہیوں نے اُنہیں آبنائے میں داخل نہ ہونے دیا اور آتش و آہن برسا کر واپس جانے پر مجبور کر دیا۔ پھر ''گولڈن ہارن'' کی کچھ کشتیاں بے دھیانی میں اس طرف نکل آئیں اور عباس کی شاہین صفت کشتیوں نے انہیں گھیر کر گرفتار کر لیا۔ اب عثمانی جہاز آبنائے میں دن رات دندناتے پھرتے تھے۔ آبنائے جو دو سمندروں کو ملانے والی آبی گزرگاہ تھی، اب جنوب کی طرف سے آدھی سے زیادہ مسلمانوں کے قبضے میں تھی۔ البتہ شمال کی جانب سے آبنائے میں داخل ہونے کے لئے درِ دانیال کا راستہ ابھی کھلا تھا اور درِ دانیال کے راستے سے ''بحیرہ روم'' کے عیسائی جہاز آسانی کے ساتھ قسطنطنیہ تک اپنی امداد پہنچا رہے تھے۔ وینس، اسپین، جنیوا اور روم کی جانب سے آنے والی کمک ''درِ دانیال'' کے راستے سے قسطنطنیہ تک پہنچ سکتی تھی۔

آبنائے باسفورس پر قبضے کی خبر شہنشاہ تک پہنچی تو اُس کے چھکے چھوٹ گئے۔ اُس نے فی الفور اپنے وزیر خاص کو بلایا اور کسی قدر برہم لہجے میں پوچھا۔

''وزیر خاص! عثمانی بحریہ کا ہراول دستہ ہماری آبنائے میں دندناتا پھر رہا ہے۔ اور جان جیوانی ابھی تک نہیں پہنچا..... کیا جنیوی بحری بیڑے کے ملاحوں کے بازوؤں میں چپو

چلانے کی بھی ہمت نہیں رہی؟ یہ لوگ آبنائے باسفورس کی حفاظت کے لئے آنے والے تھے۔ لیکن آبنائے کا ایک حصہ تو اب تک مسلمانوں کے قبضے میں جا بھی چکا ہے..... اگر گولڈن ہارن اور قسطنطنیہ کے ساحل پر ہمارے اپنے جہاز متعین نہ ہوتے تو اب تک جنگی بحریہ کا ہراوّل ہماری فصیلوں کو چھو چکا ہوتا۔ وزیر خاص! ہم بہت پریشان ہیں۔ ہمیں بتاؤ یہ کیا ہو رہا ہے؟''

شہنشاہ کا لہجہ دیکھ کر وزیر خاص سہم گیا اور کمر تک جھک کر ادب سے بولا۔ ''ہمارے قاصد یہ خبر لائے ہیں کہ جان جسٹینانی کے بحری جہاز ایک دو دن میں درِ دانیال کی جانب سے آبنائے میں داخل ہو جائیں گے۔ شہنشاہِ معظم! آپ فکر مند نہ ہوں۔ جان جسٹینانی کی بحری طاقت ہمارے ساتھ ملتے ہی ہم عثمانی جہازوں کو آبنائے کے علاقے سے نکال باہر کریں گے۔''

لیکن شہنشاہ کی تسلی نہ ہوئی۔ شہنشاہ نے سپہ سالار نوٹاراس کو پیغام بھیجا کہ وہ شہر کے تمام دروازوں اور فصیلوں کی ذمہ داری اب براہِ راست اپنے ہاتھ میں لے لے۔ جوں جوں دن گزرتے جا رہے تھے، قسطنطین کا خوف بڑھتا جا رہا تھا۔ اُسے ایک دم اپنا خواب یاد آیا اور اُسے سسٹر میری کی بتائی ہوئی تعبیر بھی یاد آئی۔ وہ کانفرنس کے روز سرخ آنکھوں والے دیو شاگال کو پہچان چکا تھا۔ لیکن شاگال نے تو بھری مجلس میں کام ہی ایسا دکھایا تھا کہ شہنشاہ اب اُسے کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔ یہ گویا ایک طرح سے شاگال نے شہنشاہ کو اپنے دامن میں پناہ دی تھی۔ بالفاظ دیگر شہنشاہ کا خواب پورا ہوا تھا۔ سسٹر میری نے کہا تھا کہ سرخ آنکھوں والے دیو کو دیکھتے ہی قتل کر دے۔ لیکن شہنشاہ ایسا نہ کر سکا تھا۔

قسطنطین آج کل بہت مضطرب تھا۔ اُس کی نیندیں حرام ہو چکی تھیں۔ وہ ہر وقت کسی نہ کسی جنگی مصروفیت میں ڈوبا رہتا۔ اور جب اکیلا ہوتا تو شراب پینے لگتا۔

جان جسٹینانی کی بحریہ جو کئی جہازوں اور سینکڑوں کشتیوں پر مشتمل تھی ایک کثیر فوج لے کر آبنائے کے شمالی دہانے میں داخل ہوئی۔ بحریہ کے سب سے اگلے جہاز پر صلیبی پرچم نصب تھا۔ جہازوں میں سوار سپاہی اپنے اپنے جہازوں کے عرشے پر آ گئے اور دُور سے قسطنطنیہ کا نظارہ کرنے لگے۔ اُن سے تین میل کی مسافت پر قسطنطنیہ تھا۔ اور قسطنطنیہ کے ایک پہلو میں گولڈن ہارن تھی۔ آبنائے باسفورس کا دوسرا یعنی جنوبی سرا مسلمانوں کے قبضے میں تھا جو قسطنطنیہ سے پانچ میل دُور تھا۔ البتہ عثمانی کشتیاں کبھی کبھی گشت کرتی ہوئی شہر کے بالکل نزدیک آ نکلتیں۔ لیکن عثمانی بحریہ کو کچھ دیر تنگ کرنے کے بعد واپس بھاگ

جاتیں۔ جان جسٹینانی کے جہاز فصیل شہر کے ساتھ گھومتے ہوئے گولڈن ہارن کی جانب نکل آئے۔ گولڈن ہارن کی آہنی زنجیر ڈھیلی کر دی گئی اور بہت سے اہم جہاز اور کشتیاں گولڈن ہارن کے اندر داخل ہو کر شہر کی گودیوں سے آ لگیں۔ جسٹینانی کے باقی جہاز گولڈن ہارن سے باہر ہی آبنائے کے ساحل پر لنگر انداز ہو گئے۔ جس جگہ کو جسٹینانی کے باقی جہازوں نے لنگر انداز ہونے کے لئے منتخب کیا تھا، یہ دراصل مچھیروں کی چھوٹی چھوٹی گودیاں تھیں جہاں دن بھر مچھلیوں کا شکار کرنے کے بعد باسفورس کے مچھیرے اپنی کشتیاں کھڑی کرتے۔ مچھیروں کے بچے ساحل پر ہی کھیل رہے تھے۔ جنگی جہازوں کو دیکھ کر سہم گئے اور بستی کی جانب بھاگ کھڑے ہوئے۔

''نارمن'' جو عیسائی بحریہ کے اس حصے کا کپتان تھا، اپنے جہاز کے عرشے سے مچھیروں کی ایک چھوٹی سی بستی کو بغور دیکھ رہا تھا۔ نارمن جنیوا کا ایک ماہر بحری سپہ سالار تھا۔ یہ درحقیقت ایک بحری قزاق تھا جسے جسٹینانی نے بھاری رشوت دے کر اپنے لشکر میں شامل کیا۔ اُس کی زندگی کے چالیس سال سمندر کے پانیوں میں گزرے تھے اور اُس کے چہرے پر موجود زخموں کے نشان اس بات کے گواہ تھے کہ نارمن کئی جنگیں لڑ چکا ہے۔ یہ جب بحری قزاق تھا تو اس کی سفاکی دُور دُور تک مشہور تھی۔ نارمن جس قدر اپنی بہادری اور شمشیر بازی میں مشہور تھا، اس سے کہیں زیادہ اپنی وحشت اور درندگی کے حوالے سے جانا جاتا تھا۔ نارمن کی سب سے بری عادت یہ تھی کہ وہ بہت زیادہ شراب پیتا اور آئے روز نئی سے نئی لڑکی اپنے بستر پر طلب کرتا۔ نارمن نے مچھیروں کی بستی کو دیکھا تو جہازوں کو لنگر انداز کر کے ساحل پر خیمے لگانے کا حکم جاری کر دیا۔

یہاں سے چار میل کے فاصلے پر مسلمانوں کا علاقہ تھا اور مسلمانوں کی کشتیاں دن میں کئی مرتبہ اس طرف آ کر مچھیروں کی بستی تک چکر لگا جاتی تھیں۔ آج جب نارمن کے جہاز یہاں لنگر انداز ہوئے تو گشت پر موجود مسلمانوں کی دو کشتیاں تیزی سے اپنے سالار کو اطلاع دینے کے لئے اُلٹے قدموں بھاگیں۔ یہ اگست کا مہینہ تھا۔ رومیلی حصار کے برجوں پر اُربان کی بنائی ہوئی توپیں چڑھائی جا چکی تھیں۔ کپتان عباس رومیلی حصار میں ہی موجود تھا۔ اُسے جب خبر ملی کہ جنیوا کے جہاز نزدیک پہنچ چکے ہیں تو اُس نے ان جہازوں کو مزید آگے آنے سے روکنے کے لئے اپنی بحریہ کو پیش قدمی کا حکم دے دیا۔ ادھر قلعے پر موجود توپوں کے رُخ بھی شمال کی جانب کر دیئے گئے تھے۔ اب کپتان عباس کی شریانوں میں ولولہ اور جوش و جذبہ خون بن کر دوڑنے لگا تھا۔ عباس نے اپنی گشت والی کشتیوں کو حکم دیا

کہ وہ عیسائی جہازوں کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھیں۔

جسٹینانی کا استقبال کرنے کے لئے شہنشاہ خود گولڈن ہارن کی بندرگاہ تک آیا تھا۔ جسٹینانی کی کمک دیکھ کر ساحل پر موجود یونانی سپاہیوں کے حوصلے بڑھے اور انہوں نے خوشی کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ لیکن شہنشاہ کچھ زیادہ خوش نہیں تھا۔ جسٹینانی آ تو گیا تھا لیکن جنگی کمک شہنشاہ کی توقع سے بہت کم تھی۔ پھر بھی شہنشاہ نے پُر تپاک انداز میں جنیوی فوج کا استقبال کیا اور اُن کے اعزاز میں شاہل محل کے اندر رات کا جشن منعقد کیا۔

شاہی محل میں رات گئے تک شراب کے جام لڑھائے گئے اور شباب و کباب کا اہتمام کیا گیا۔ جسٹینانی کی کم فوج دیکھ کر قسطنطین اس قدر مضطرب ہوا کہ اگلے روز اُن تمام ممالک کی طرف دوہرے قاصد دوڑا دیئے جہاں جہاں اُس کے سفیر امداد کی درخواست لے کر پہلے سے گئے ہوئے تھے۔ ان میں اسپین کے شمالی صوبے ''اراگون'' اور ''قسطلہ'' کے علاوہ مغربی یورپ کے دیگر کئی ایک ممالک تھے۔ جب سے عثمانی بحریہ نے بحر اسود کا راستہ بند کیا تھا، شہنشاہ کا تمام تر رابطہ شمالی یورپ کے ساتھ کٹ چکا تھا۔ شمالی یورپ میں بلغاریہ، یوکرائن، چیکوسلواکیہ اور جرمنی کے بعض علاقے شامل تھے۔ شہنشاہ کو رہ رہ کر یہی خیال ستاتا تھا کہ قسطنطنیہ اُس کے ہاتھوں سے نکل ہی نہ جائے۔

وہ اپنے آپ کو قسطنطنیہ کا سب سے بدنصیب شہنشاہ تصور کرتا تھا۔ اُسے ڈر تھا کہ گیارہ سو سال سے قائم اُس کے آباؤ اجداد کی اس عظیم سلطنت کے خاتمے کا وقت آ پہنچا ہے۔ وہ قسطنطنیہ کو کسی صورت کھونا نہ چاہتا تھا۔ وہ آخر دم تک قسطنطنیہ کو بچانا چاہتا تھا۔ اُسے اپنے آباؤ اجداد کی تاریخ معلوم تھی جنہوں نے گزشتہ سات سو سال میں ایک بار بھی مسلمانوں کو قسطنطنیہ کے نزدیک نہ پھٹکنے دیا تھا..... شہنشاہ جشن کے ہنگامے میں بہت تھوڑی دیر کے لئے مشغول رہا۔ آج کل اُس کا دل کسی بھی چیز میں نہ لگتا تھا۔ قسطنطین کو صرف ایک ہی فکر تھی اور وہ یہ تھی کہ وہ کسی طرح اپنے آبائی پایۂ تخت قسطنطنیہ کو سلطان محمد خان کے حملے سے بچا لے۔ وہ عثمانیوں کو اچھی طرح جانتا تھا۔ ابھی چند سال پہلے جب وہ ''موریا'' کے تخت پر متمکن تھا تو اُسے سلطان محمد خان کے والد سلطان مراد خان نے عثمانی شمشیروں کا ذائقہ چکھا کر اپنے خوفناک طریقۂ جنگ سے مرعوب کر دیا تھا۔ قسطنطین جب ''موریا'' کا حکمران تھا تو اُس نے اپنے مقبوضات کے تحفظ کے لئے ''خاکنائے کورنتھ'' کی قلعہ بندی کی اور ادھر سے اطمینان کر لینے کے بعد ''تھیبس'' کے شہر پر جو اُس کی سرحد سے قریب سلطنت عثمانیہ کا مقبوضہ تھا، دفعتہً حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ قسطنطین کو یاد تھا کہ واقعے کی اطلاع

پا کے مراد فوراً ''موریا'' کی جانب روانہ ہوا تھا۔ راستے میں کورنتھ کا مضبوط قلعہ اُس کے سامنے حائل ہوا۔ اور پھر اُس وقت قسطنطین کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب عثمانی توپوں کی گولہ باری کے سامنے کورنتھ کا مضبوط قلعہ خس و خاشاک کا ڈھیر بن گیا۔ عثمانی فوج میں توپوں کے استعمال کا یہ پہلا موقع تھا۔ قسطنطین کو پورے موریا میں کہیں بھی جائے پناہ نہ دکھائی دی تو قسطنطین اور اُس کے بھائی تھامس نے سلطان مراد خان ثانی کے ساتھ صلح کر لی۔ انہوں نے خراج دینا منظور کیا اور موریا بھی دولت عثمانیہ کی باجگزار ریاستوں میں شامل ہو گیا۔ قسطنطین کو یہ سب کچھ کیسے بھول سکتا تھا۔ یہ تو اُس کی اپنی کہانی تھی۔ اُس کی نظروں سے تو اپنے آباؤ اجداد کی کہانی بھی پوشیدہ نہ تھی۔

سلطنت بازنطینی جو کبھی یورپ میں ''دریائے ڈینوب'' اور ایشیا میں ''اناطولیہ'' اور ''شام'' تک پھیلی ہوئی تھی آج صرف قسطنطنیہ شہر تک محدود ہو کے رہ گئی تھی۔ یہ سلطنت بازنطینی کے زوال کی انتہا تھی۔ شہنشاہ سوچنے لگا کہ اُس کے آباؤ اجداد نے خود مسلمانوں کو یورپ میں قدم جمانے کا موقع دیا تھا۔ شہنشاہ کو معلوم تھا کہ 1338ء میں جب ''شہنشاہ اینڈرونیکس سوئم'' کے انتقال پر اُس کا بیٹا ''جان پلیولوگس'' کم عمر بچہ رہ گیا تھا تو ''ملکہ اینا'' گرینڈ چانسلر کنٹا کوزین کو نہتے شہزادے جان پلیولوگس کا نگران اور مدار المہام مقرر کیا گیا۔ شہزادے کا نگران ''کنٹا کوزین'' جلد ہی اس لالچ میں آ گیا کہ قسطنطنیہ کے تخت کو خود ہتھیا لے اور شہزادے کو راستے سے ہٹا دے۔ کنٹا کوزین کی یہی بد دیانتی یورپ میں مسلمانوں کی آمد کا باعث ہوئی۔ کیونکہ کنٹا کوزین نے مدار المہام مقرر ہونے کے صرف چند سال بعد یعنی 1343ء میں اپنے شہنشاہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ اُس وقت کنٹا کوزین، ''نیکوٹیکا'' میں تھا۔ ملکہ کو یہ بات سخت ناگوار گزری اور اُس نے اس کی مخالفت کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں میں لڑائی چھڑ گئی اور دونوں نے عثمانی فرمانروا اور عثمان کے بیٹے ''اُور خان'' سے مدد کی درخواست کی۔ اس سے پہلے بھی ترک امیروں نے تخت قسطنطنیہ کے مختلف دعویداروں میں سے کسی نہ کسی فریق کا ساتھ دیا تھا۔

کنٹا کوزین نے ''اُور خان'' سے چھ ہزار سپاہی مانگے اور اس حمایت کے عوض اپنی لڑکی تھیوڈورا کو اُس کی شریک زندگی بنانے کے لئے پیش کیا۔ اُور خان نے یہ شرط منظور کر لی۔ اور 1345ء میں چھ ہزار سپاہی کنٹا کوزین کی مدد کے لئے یورپ بھیجے۔ کنٹا کوزین نے ان سپاہیوں کی مدد سے قسطنطنیہ کا محاصرہ کر لیا جو ملکہ کے قبضے میں تھا۔ ملکہ کو مجبوراً صلح کے لئے راضی ہونا پڑا اور صلح اس عجیب بات پر ہوئی کہ کنٹا کوزین اور اُس کی بیوی نیز ''ملکہ

اینا'' اور شہزادہ جان پلیولوگس.... چاروں کے چاروں بیک وقت تخت نشین کر دیئے جائیں۔ چنانچہ چاروں کی رسم تاج پوشی ادا کی گئی۔ اس اتحاد کو اور زیادہ مضبوط کرنے کے لئے کنٹا کوزین نے اپنی چھوٹی لڑکی کی شادی نوجوان شہنشاہ جان پلیولوگس سے کر دی۔ ''اُور خان'' کا نکاح بھی شہزادی تھیوڈورا سے ہو گیا۔ اُور خان نے تھیوڈورا کو اُس کے آبائی مذہب مسیحیت پر قائم رہنے کی اجازت دے دی۔

لیکن اتحاد زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا اور کنٹا کوزین ایک مرتبہ پھر تاج و تخت کی ہوس میں دیوانہ ہو کر عثمانی فوج کی مدد مانگنے پر مجبور ہو گیا۔ 1353ء میں اُس نے حکومت کے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لینے چاہے۔ اُس وقت تک شہزادہ جان پلیولوگس جوان ہو چکا تھا۔ شہزادے نے کنٹا کوزین کی مخالفت کی اور خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ کنٹا کوزین کو عثمانی امیر ''اُور خان'' نے اس مرتبہ بیس ہزار سپاہیوں سے مدد دی جن کا سپہ سالار ''اُور خان'' کا لڑکا سلمان پاشا تھا۔ اس مرتبہ مدد کے بدلے میں کنٹا کوزین نے اُور خان کو اپنے یورپین ساحل کا ایک قلعہ معاوضے کے طور پر پیش کیا۔ یہی وہ دن تھا جسے یورپ میں مسلمانوں کے پہلے قبضے کا دن کہا جا سکتا ہے۔ کنٹا کوزین نے عثمانی سپاہیوں کی مدد سے جان پلیولوگس کو شکست دے کر قسطنطنیہ کے تخت پر قبضہ کر لیا۔ سلیمان پاشا نے حسب معاہدہ یورپی ساحل کے قلعہ ''زنپ'' پر قبضہ کر کے اُس میں عثمانی دستے متعین کر دیئے۔ اس سے چند دن بعد تھریس کے علاقے میں زلزلہ آیا اور بہت سے شہروں کی فصیلیں منہدم ہو گئیں۔ انہی میں ''گیلی پولی'' بھی تھا۔ جو درِ دانیال کے مغربی ساحل پر سب سے زیادہ اہم قلعہ تھا۔ یہ قلعہ زنپ کے قلعہ سے تھوڑے فاصلے پر واقع تھا۔ سلیمان پاشا نے اسے تائید غیبی خیال کیا اور گیلی پولی پر فوراً قبضہ کر لیا۔ قلعہ کے یونانی دستوں نے یہ سمجھا کہ خدا کی مرضی یونہی تھی۔ چنانچہ انہوں نے کوئی مزاحمت نہ کی۔

گیلی پولی کی فتح سے ترکوں کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ ان واقعات سے کنٹا کوزین کے خلاف قسطنطنیہ میں سخت برہمی پھیلی جس نے بغاوت اور انقلاب کی شکل اختیار کر لی۔ ہر شخص کنٹا کوزین پر غداریٔ وطن کا الزام عائد کرتا تھا اور اُسی کو ترکوں کے یورپ میں لانے کا ذمہ دار قرار دیتا تھا۔ آخر کنٹا کوزین کو رائے عامہ سے مجبور ہو کر تاج و تخت سے دستبردار ہونا پڑا اور اُس نے اپنی زندگی کے بقیہ تیس سال ایک خانقاہ میں گزار دیئے۔ اس مدت میں کنٹا کوزین نے اپنے عہد کی ایک تاریخ لکھ ڈالی۔ یہی وہ کتاب تھی جسے قسطنطین اچھی طرح پڑھ چکا تھا۔ جان پلیولوگس تخت پر بیٹھا تو اُسے مسلمانوں کے ساتھ

صلح کرنی پڑی اور مجبور ہو کر ''اُور خان'' کا قبضہ یورپی قلعوں پر تسلیم کرنا پڑا۔ یوں گویا سلطنت بازنطینی دولت عثمانیہ کی باجگذار بن گئی۔ کچھ دنوں تک تو شہنشاہِ قسطنطنیہ خاموشی کے ساتھ خراج ادا کرتا رہا۔ لیکن پھر اُسے اپنی محکومی ناقابل برداشت محسوس ہونے لگی۔ چنانچہ 1369ء میں شہنشاہ نے خود ''روم'' کا سفر کیا اور پوپ کی خدمت میں حاضر ہو کر یورپ کی مسیحی حکومتوں کو دولت عثمانیہ کے خلاف اُبھارنے کی درخواست پیش کی۔ اُس نے پوپ کی حمایت حاصل کرنے کے لئے طرح طرح کی ذلت گوارا کی اور یونانی کلیسا کے ان تمام عقائد سے اپنے آپ کو منحرف ظاہر کیا جو رومن کیتھولک چرچ سے مختلف تھے۔ ان مذہبی معاملات میں اُس نے ''کلیسائے رومہ'' کی برتری تسلیم کر لی۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود اُس کا مقصد حاصل نہ ہوا اور مسیحی حکومتیں ترکوں کے خلاف اعلانِ جنگ کے لئے آمادہ نہ ہوئیں۔ چنانچہ شہنشاہ ناکام و نامراد قسطنطنیہ کو واپس ہوا۔ واپسی میں جب وہ وینس سے گزر رہا تھا تو ''دیان'' کے بعض ساہوکاروں نے جن سے رومہ کے سفر کے لئے اُس نے روپیہ قرض لیا تھا، اُسے گرفتار کر لیا۔ اُس کے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ قرض ادا کر سکتا۔ اُس کا بڑا لڑکا ایڈرونیکس جسے وہ قسطنطنیہ میں اپنا جانشین بنا گیا تھا، حکومت کی لذت سے آشنا ہو کر باپ کی رہائی کا خواہشمند نہ تھا۔ اس لئے اُس نے بھی قرض ادا کرنے کی کوشش نہ کی۔ لیکن چھوٹے لڑکے ''مینوئیل'' نے اپنی املاک فروخت کر کے باپ کے قرض کی رقم فراہم کی اور شہنشاہ کو آزاد کرایا۔ قسطنطنیہ پہنچنے کے بعد شہنشاہ نے ایڈرونیکس کو حکومت سے الگ کر دیا اور اُس کی جگہ مینوئیل کو اپنا ولی عہد مقرر کیا۔

ایڈرونیکس کا ایک لڑکا تھا جو اپنے باپ کی حق تلفی پر سخت برافروختہ ہوا۔ اُس نے کسی طرح عثمانی امیر مراد اوّل کے بیٹے ''شہزادہ صادو جی'' کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ دونوں مل کر شہنشاہ اور ''مراد'' کو تخت سے اتار دیں اور ان کی جگہ خود فرمانروا بن جائیں۔ مراد اس وقت ایشیائے کوچک میں تھا اور ''صادو جی'' یورپ میں ترکی سپاہ کا افسر اعلیٰ تھا۔ اُس نے مراد کی غیر موجودگی سے فائدہ اُٹھا کر فوراً بغاوت کا اعلان کر دیا۔ ادھر ایڈرونیکس کے لڑکے نے بھی نوعمر بازنطینی امراء کی ایک جماعت اپنے ساتھ لے کر اپنے دادا شہنشاہ کے خلاف جنگ کی تیاری شروع کر دی۔ ان شہزادوں کی متحدہ بغاوت نے ایک خطرناک صورت اختیار کر لی۔ مراد اول اس خبر کو سنتے ہی یورپ پہنچا۔ شہنشاہ نے اپنے پوتے کے جرم پر انتہا برأت پیش کی اور اس فتنہ کو فرو کرنے کے لئے پوری آمادگی ظاہر کی۔ اُس نے مراد کی یہ تجویز بھی منظور کر لی کہ گرفتاری کے بعد دونوں شہزادے اپنی آنکھوں سے محروم کر دیئے

جائیں۔ ''صادو جی'' کی فوج نے اپنے سلطان کی زبان سے معافی کا وعدہ سن کر ہائی شہزادے کا ساتھ چھوڑ دیا۔ صادو جی، ایڈرونیکس کا بیٹا اور نوجوان بازنطینی امراء گرفتار کر کے سامنے لائے گئے۔ مراد نے سب سے پہلے اپنے بیٹے صادو جی کی آنکھوں میں گرم سیسہ ڈال کر اُسے اندھا کر دیا اور پھر اُس کے قتل کا حکم دے دیا۔ بازنطینی امراء ''دریائے مارٹیزا'' میں غرق کر دیئے گئے جبکہ اینڈرونیکس کے بیٹے کو شہنشاہ کے پاس بھیج دیا گیا۔ شہنشاہ نے حسب وعدہ اپنے پوتے کی آنکھوں میں سیسہ ڈلوایا لیکن اس طرح کہ اُس کی بینائی ضائع نہ ہوئی۔

''قسطنطین'' آج اپنے آباؤ اجداد کی تاریخ یاد کر کر کے اپنے اسلاف کی کوتاہیوں پر رو رہا تھا۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ عثمانی سلطان ''بایزید یلدرم'' کے دور میں بایزید یلدرم نے شہنشاہ کو دھمکی دی تھی کہ وہ اُس کے بڑے بیٹے اینڈرونیکس کو بزورِ شمشیر تخت پر بٹھادے گا۔ چنانچہ ''پلیولوگس'' ایک جدید صلح نامے پر مجبور ہوا۔ جس نے بازنطینی سلطنت کی رہی سہی ساکھ خاک میں ملا دی۔ جان پلیولوگس اور اُس کے چھوٹے لڑکے مینوئیل نے جو تخت سلطنت میں اپنے باپ کا شریک تھا، معاہدہ کیا کہ تیس ہزار طلائی سکے بطور خراج وہ ہر سال ادا کریں گے اور بارہ ہزار کا ایک فوجی دستہ شہنشاہ کی طرف سے ہر وقت بایزید کی خدمت میں حاضر رہے گا۔ ایشیائے کوچک میں بازنطینی سلطنت کے مقبوضات میں سے اب صرف ایک قلعہ ''فلاڈلفیا'' اور باقی رہ گیا تھا۔ اس صلح نامے میں وہ بھی ''بایزید'' نے اپنے نام لکھوا لیا۔ لیکن اس قلعہ کے یونانی افسر نے شہنشاہ کے حکم کے باوجود قلعہ خالی کرنے سے انکار کر دیا۔ بایزید نے شہنشاہ کو مجبور کیا کہ وہ خود اپنی فوج کے ذریعے سے قلعہ خالی کرا دے۔ چنانچہ دولت بازنطینہ کے انتہائی زوال کا یہ عبرتناک واقعہ بھی ظہور میں آیا کہ یونانی سپاہیوں نے ''فلاڈلفیا'' پر حملہ کیا اور اسے فتح کر کے بایزید کے حوالے کر دیا۔ یہ گویا قسطنطنیہ کے انجام کی نشاندہی تھی۔

جان پلیولوگس کی وفات کے بعد اُس کا چھوٹا بیٹا مینوئیل تخت نشین ہوا جو اُس وقت شہنشاہ کی طرف سے بایزید کے دربار میں حاضر رہنے کا پابند تھا۔ اس طرح وہ گویا نظر بند تھا۔ باپ کی وفات کا سن کر وہ سلطانی دربار سے فرار ہوا اور قسطنطنیہ پہنچ کر تخت سنبھال لیا۔ بایزید کو اُس کی یہ حرکت سخت ناگوار گزری۔ چنانچہ غصے میں آ کر بایزید نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کر لیا۔ سات مہینے تک محاصرہ جاری رہا۔ اور پھر اُس نے دس سال کے لئے صلح کر کے محاصرہ اٹھا لیا۔ اس محاصرہ کی شرائط صلح بہت سخت تھیں۔ سالانہ خراج کی رقم تیس ہزار

طلائی کراؤن مقرر ہوئی۔ مسلمانوں کے لئے قسطنطنیہ میں ایک شرعی عدالت قائم کی گئی جس میں بایزید نے ایک ترکی قاضی مقرر کیا۔ اور کلیسائے مشرق کے اس مرکز یعنی قسطنطنیہ میں ایک عالیشان مسجد بھی تعمیر کی گئی جس کے میناروں سے توحید اسلامی کا اعلان ہونے لگا۔

(گبن جلد 4 صفحہ 392)

مینوئیل نے شہر کے سات سو مکانات بھی مسلمانوں کو دے دیئے۔ ''غلطہ'' کا نصف حصہ بایزید کے حوالے کر دیا جس میں اُس نے چھ ہزار عثمانی فوج متعین کر دی۔ شہر کے باہر انگور کے باغات اور ترکاریوں کے کھیت تھے۔ ان پیداوار کا عشر بھی عثمانی خزانہ کو دیا گیا۔ اُسی وقت سے عثمانیوں نے قسطنطنیہ کو ''اسلام بول'' کہنا شروع کر دیا تھا۔

شہنشاہ قسطنطین اپنے دو بھائیوں کے بعد ہی قسطنطنیہ کا شہنشاہ بنا تھا۔ قسطنطین سے پہلے قیصر جان پلیولوگس نامی ایک شہنشاہ اور بھی گزرا تھا۔ اس دوسرے ''پلیولوگس'' کی وفات کے بعد قیصر قسطنطین دواز دہم تخت نشین ہوا۔ قسطنطین اگرچہ اپنے سابق حکمرانوں سے بہتر تھا۔ بہادر، جنگجو اور کلیساؤں کے اتحاد کا حامی تھا۔ لیکن اُسے صرف دکھائی دے رہا تھا کہ وہ سلطان محمد خان کا مقابلہ نہ کر پائے گا۔ پھر بھی شہنشاہ نے تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ اپنے خون کے آخری قطرے تک قسطنطنیہ کی حفاظت کرے گا۔

''جان جسٹینانی'' کے جشن سے فارغ ہونے کے بعد شہنشاہ نے فصیل شہر کا طوفانی دورہ کیا اور فصیل کے مختلف مقامات کی از خود اپنی نگرانی میں تعمیر شروع کروائی۔

روم ایک الگ شہر تھا۔ لیکن قدیمی ربط کی وجہ سے مسلمان اب بھی قسطنطنیہ کے بادشاہ کو قیصرِ روم ہی کہا کرتے تھے۔ قیاصرۂ روم کی یہ سلطنت چوتھی صدی عیسوی میں قائم ہوئی تھی اور وقت وہ بھی تھا جب قیصرِ روم کی حکومت مشرق و مغرب میں دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ شہنشاہ قسطنطین بھی قیصرِ روم ہی تھا..... شاید آخری قیصرِ روم۔

قیصر نے کلیساؤں کی صلح تو کروا دی تھی لیکن فی الحقیقت اُس کی یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ رومی اور یونانی کلیسا کے مابین اس قدر اختلافات تھے کہ اُن کا اتحاد اب ممکن نہ رہا تھا۔ مجلس کے روز دونوں کلیساؤں کے پادری آپس میں بری طرح لڑ پڑے تھے۔ سپہ سالار گرینڈ ڈیوک نوٹاراس'' نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ وہ کارڈینل کی ٹوپی کے مقابلہ میں یہاں ترکوں کے عمامے دیکھنا زیادہ پسند کرتا ہے۔ مجلس کے روز خود یونانی کلیسا کے مذہبی پیشوا دو جماعتوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک جماعت شہنشاہ کی طرفدار تھی جو چاہتے تھے کہ کلیسائے روما کے ساتھ اتحاد ہو جائے اور پوپ انہیں مدد فراہم کرے۔ دوسری وہ

جماعت تھی جو ان سنگین حالات میں بھی کلیسائے رومہ سے اتحاد کرنے پر کسی طرح راضی نہ تھی۔ دوسری جماعت پہلی جماعت سے بڑی تھی چنانچہ اس جماعت کے گرجاؤں نے شہنشاہ کو مالی امداد دینے سے انکار کر دیا اور اس میں سے جو لوگ جنگ میں شریک ہو گئے تھے، اُن کی ایک بہت قلیل تعداد نے شہر کی محافظت کے لئے آمادگی ظاہر کی۔ قسطنطنیہ کی آبادی بہت زیادہ تھی لیکن متعصب یونانی کلیسا کے صرف چھ ہزار سپاہیوں نے بادلِ نخواستہ اپنی خدمات پیش کیں۔ ''سپہ سالار نوٹاراس'' بھی انہی لوگوں میں شامل تھا۔ قیصر کو قسطنطنیہ اپنے ہاتھ سے جاتا ہوا دکھائی دیا۔ لیکن وہ ہمت ہارنے والا نہ تھا۔

جلد ہی اُسے ایک خوشخبری ملی کہ اٹلی اور اسپین کے بہادر دستے ''قسطنطین'' کی مدد کو پہنچنے والے ہیں۔ اور پھر جس روز ''کٹالونیا'' اور ''اراگن'' کے فوجی دستے ''گولڈن ہارن'' کے ساحل سے آ لگے تو قیصرِ روم کے تمام حوصلے جوان ہو گئے۔ اُس کے بدن میں پارہ بھر گیا اور وہ سلطان محمد خان کو سبق سکھانے کے منصوبے بنانے لگا۔ مشرقی اور مغربی یورپ کے عیسائی عوام مذہبی جوش و خروش کے ساتھ ''قسطنطنیہ'' میں اکٹھے ہو گئے۔ لیکن عیسائی حکومتیں خصوصاً فرانس، جرمنی، ہنگری اور پولینڈ نے اس موقع پر قیصر کی کوئی مدد نہ کی اور ایسی بے حسی اور بے پرواہی کا مظاہرہ کیا کہ پوری مسیحی تاریخ حیرت زدہ رہ گئی۔ دراصل گزشتہ دو چار صدیوں میں مسلمانوں نے بڑے بڑے صلیبی اتحادوں کو دندان شکن شکست دے کر کچھ ایسا خوفزدہ کر دیا تھا کہ اب یورپی حکمران مسلمانوں کے خلاف کسی بھی اتحاد میں شامل ہونے سے پہلے ہزار بار سوچتے۔ گزشتہ پینسٹھ سال کے اندر اندر ترکوں کو یورپ سے خارج کر دینے کی غرض سے انہوں نے چار مرتبہ مذہبی اتحاد کیا..... کسووہ (1389ء)، بائیکوپولس (1396ء)، وارنہ (1444ء) اور پھر کسووہ (1448ء) کی جاہ کن شکستیں ابھی تازہ تھیں۔ وہ ہر بار متحد ہو کر آئے تھے اور ہر بار انہیں ہزیمت اٹھانی پڑی تھی۔ ہر بار یہ اتحاد کا شیرازہ بندھ بندھ کر منتشر ہوا تھا۔ چنانچہ اس مرتبہ یورپی حکومتیں اس قسم کے مزید کسی تجربے کے لئے تیار نہ تھیں۔ قیصر نے کلیساؤں کا اتحاد بھی کر کے دیکھ لیا تھا لیکن پھر بھی وہ ماضی جیسا صلیبی اتحاد تشکیل دینے میں ناکام ہوئے۔

وقت تیزی کے ساتھ گزرتا چلا جا رہا تھا۔ 24 اپریل 1452ء کے روز شروع ہونے والا ''رومیلی حصار'' 28 اگست 1452ء کو مکمل بھی ہو گیا۔ شہنشاہ کے جاسوس جب اُس کے پاس ''رومیلی حصار'' کے مکمل ہونے کی اطلاع لے کر پہنچے تو وہ مسلمان معماروں کی تیزی دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اب گویا جنگ باقاعدہ شروع ہو چکی تھی۔ درندہ صفت ''نارمن'' کے

جہاز آبنائے باسفورس کے شمالی حصے میں اور عثمانی بحریہ کے جہاز جنوبی حصے میں دندناتے پھر رہے تھے۔ کبھی کبھار یہ آمنے سامنے بھی آ جاتے۔ اور ایک دوسرے پر جلتے ہوئے تیر اور چھوٹی توپوں کی مدد سے گولہ باری بھی کرتے۔ ''نارمن'' کا ذاتی پڑاؤ مچھیروں کی بستی کے نزدیک ہی تھا۔ مچھیرے جو خود بھی یونانی عیسائی تھے اپنے لشکر کی خدمت بجا لانے میں کوئی کوتاہی نہ کرتے تھے۔ ''باقو'' کا تو سارا دن ہی اس بحری چھاؤنی میں گزرتا تھا۔ اُس کے لمبے لمبے بال اب بھی اُس کے ماتھے پر گرے رہتے۔ وہ لنگڑاتا ہوا چلتا اور رومی سپاہیوں سے عمدہ شراب ملنے کے لالچ میں دن بھر اُس کے چھوٹے چھوٹے کام کرتا رہتا۔ اب تو نارمن کے ساتھ بھی اُس کی اچھی خاصی شناسائی پیدا ہو چکی تھی۔

دو ماہ اسی طرح گزر گئے۔ سردیوں کا آغاز ہوا تو نارمن کی کارروائیوں میں کمی آ گئی۔ یہ پہاڑی علاقہ تھا۔ اور کوہِ بلقان کی ٹھنڈی ہوائیں جن میں تیر کی سی تیزی تھی، رومی سپاہیوں کا خون سرد کرنے لگیں۔ بحیرۂ روم میں شب و روز گزارنے والے یہ سپاہی ''بحرِ اسود'' کی سرد ہواؤں سے نا آشنا تھے۔ نارمن کا زیادہ تر وقت ساحل پر ہی گزرنے لگا۔ ایک شام غروبِ آفتاب سے کافی دیر پہلے آسمان پر کالی کالی گھٹائیں جمع ہونی شروع ہو گئیں۔ شمالی پہاڑیوں کی چوٹیوں کو بھی ٹھٹھرائے دیئے جا رہی تھیں۔ آسمان سیاہ بالوں سے ڈھک گیا۔ تھوڑی دیر بعد بوندا باندی شروع ہوئی تو نارمن اپنے خیمے کی طرف بھاگا۔ آج اُس کا من پسند موسم تھا اور شراب خیمے میں پڑی تھی۔ اُس نے سر اٹھا کر آسمان پر کڑکتے ہوئے بادلوں کو دیکھا اور فلک شگاف انداز میں ہنس دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ شباب سے لطف اندوز ہوئے کافی دن گزر چکے ہیں۔ خیمے میں پہنچ کر نارمن نے عمدہ شراب کی بوتل کھول کر منہ سے لگا لی۔ کچھ ہی لمحوں میں موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔

نارمن کا ذہن مسلسل کسی جوان جسم کے لمس پر لگا ہوا تھا۔ اُس کا ایک سپاہی طشتری میں بھیڑ کی بھنی ہوئی ران لے کر حاضر ہوا تو نارمن نے اُس سے کہا۔

''ارے!..... یہ باقو مچھیرا کہاں مر گیا؟..... یہ بھنی ہوئی ران یہاں رکھ دو اور باقو مچھیرے کو ہمارے سامنے حاضر کرو۔''

نارمن شرابیوں جیسے لہجے میں بولا۔ سپاہی اُلٹے قدموں خیمے سے باہر کی طرف بھاگا اور نارمن نے بھیڑ کی بھنی ہوئی ران اُٹھا لی۔ اُس کے منہ سے شراب کے بھبکے آ رہے تھے۔ باہر زمستان کی سرد ہوا اور باسفورس کے ساحل کو جل تھل کرتی بارش ماحول کو ہیبت ناک بنانے کے لئے کافی تھی۔ کیونکہ رات شروع ہو چکی تھی۔ اور ان مشعلوں کے سوا جو

خیموں کے اندر روشن تھیں، ہر طرف تیزی سے اندھیرا چھا رہا تھا۔ باقو مچھیرا آج جلد گھر لوٹ گیا تھا۔ لیکن نارمن کے سپاہیوں نے اُسے اُس کی تاریک کوٹھڑی سے اس خ کی سردی میں باہر نکالا اور شراب میں بدمست نارمن کے سامنے حاضر کر دیا۔ باقو سے کانپ رہا تھا یا نارمن کے خوف سے، یہ اندازہ لگانا مشکل تھا۔ نارمن نے باقو کو اور اپنے پاس رکھی بوتل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''لو!..... اسے اٹھاؤ اور منہ سے لگا لو۔ تمہاری سردی ابھی دُور ہو جائے گی۔ یار تم جیسے گھٹیا آدمی کو نارمن اپنی بوتل پیش کر رہا ہے۔ دیر مت کرو۔ ورنہ ہم غصے جائیں گے۔''

نارمن کی دھمکی تو اپنی جگہ پر تھی، باقو کے لئے عمدہ شراب کی ایک بوتل کا مل جانا قیمتی خزانے کا مل جانا تھا۔ باقو بھوکے گدھ کی طرح جھپٹا اور جرمن کی اس عمدہ شراب تیزی کے ساتھ اپنے حلق میں انڈیلنا شروع کر دیا۔ آن کی آن میں باقو کی پلکیں بھاری گئیں اور وہ ہر پریشانی کو بھول کر جل تھل کرتے موسم سے لطف اندوز ہونے لگا۔ میں اُسے نارمن کی آواز سنائی دی۔

''کیا تمہاری بستی میں کوئی لڑ..... کی..... نہیں ہے؟ جو ہمارے کام آ سکے۔ جو ہ خدمت کر سکے۔ ہم مچھلی نہیں کھائیں گے۔ مچھلی پکڑنے والی مچھیرن کو کھائیں گے۔ ہمارے سپاہیوں کو اپنے ساتھ لے جاؤ اور اپنی بستی کی کسی جوانی کو اُٹھا کر ہمارے خیمے لے آؤ۔ اتنی یخ بستہ اور لمبی رات..... اور گھر سے دُوری..... تم جانتے ہو..... سب جانتے ہو..... تم بے فکر ہو جاؤ۔ ہمارے ہوتے ہوئے تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ جسٹینانی کی فوج کے سالار ہیں..... سپہ سالار نارمن.....''

باقو کی آنکھیں شراب سے بوجھل تھیں اور دماغ ماؤف تھا۔ اُس نے شراب کے میں بدمست ہو کر نوجوان لڑکی کا ذکر سنا تو اُس کے تن بدن میں لذت کی لہر دوڑ گئی۔ یکلخت اُس کا ذہن نوجوان راہب کی محبوبہ روزی پر جا کر اٹک گیا۔ وہ شیطنیت سے بھرا لہجے میں مسکرایا اور نارمن کی خدمت میں عرض کی۔

''عظیم سالار! آپ بے فکر ہو جائیں۔ میں مچھیروں کی بستی کا ایک ایسا نگینہ آپ خدمت میں پیش کروں گا جسے دیکھ کر آپ کو گزشتہ زندگی کی ہر حسین لڑکی بھول جائے گی محترم سالار! وہ ہماری بستی کی سب سے حسین لڑکی ہے۔ جس کی بھرپور جوانی شاید آ کے لئے ہی اب تک محفوظ رہی۔ آپ میرے ہمراہ چند سپاہی بھیج دیجئے! میں ابھی

ر حاضر ہوتا ہوں۔''

آسمان پر بجلیاں کڑک رہی تھیں۔ اور زمستان کی یخ بستہ ہوائیں پتے پتے کا کلیجہ لرزا تھیں جس وقت جنیوی سپاہیوں کا شیطانی دستہ باقو کے ہمراہ روزی کے مقدر پر بجلی انے کے لئے روانہ ہو رہا تھا..... بارش پہلے سے بھی زیادہ تیز ہو چکی تھی اور چھوٹے ے ندی نالے پُرشور آواز کے ساتھ بہنے لگے تھے۔

بوڑھا عباس ''رومیلی حصار'' میں ایک نئی مہم پر روانہ ہونے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ اُس جانبازوں نے اُسے اطلاع دی تھی کہ آج عیسائی بحریہ کے سپاہی آبنائے باسفورس سے تھے اور برفیلی ہواؤں کی شدت نے اُنہیں ساحل پر خیمہ زن ہونے کے لئے مجبور کر تھا۔ اُن کے جہاز سمندر میں موجود تو تھے لیکن لنگر انداز تھے۔ نارمن کے کئی جہازوں سے سات اس وقت ترک بحریہ کی زد میں تھے۔ دو جہاز کھلی جگہ موجود تھے جبکہ باقی ساحل کے نزدیک لنگر انداز تھے۔ نارمن کے سپاہی آگ جلائے گپ شپ میں ف تھے۔ عباس کے لئے یہ موقع شاندار تھا اور وہ اس سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتا عباس نے ارادہ کیا کہ وہ رات کے پہلے پہر مسیحی جہازوں پر حملہ آور ہو کر اُنہیں نذرِ ل کر دے گا۔ نارمن کے سات سے زیادہ بحری جہاز براہِ راست عباس کے حملے کی زد آ سکتے تھے۔ اس قدر ٹھٹھرتی ہوئی رات میں نارمن اور اُس کے ساتھی سوچ بھی نہ سکتے کہ شمع توحید کے پروانے یخ بستہ ہواؤں کی پرواہ کئے بغیر یوں اُن کے جہازوں پر حملہ ر ہو جائیں گے۔ ٹھیک اُس وقت جب نارمن کے شیطانی ارادوں کی تکمیل کے لئے چند یوں کا دستہ ایک شیطانی مقصد کی خاطر بستی کی جانب روانہ ہوا تھا..... بوڑھے عباس کا جہاز اور چند بادبانی کشتیاں..... مسیحی بیڑے کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ بوڑھے عباس اُس کے جانباز سپاہیوں نے بڑھاپے کی وجہ سے بہت منع کیا کہ وہ اس سردی میں باہر نکلے۔ لیکن..... وہ بوڑھا کہاں تھا..... وہ تو جوان تھا..... کیونکہ اُس کا جذبہ ابھی جوان تھا۔ عباس کا ارادہ تھا کہ وہ مسیحی جہازوں کو گرفتار کرنے کی کوشش کرے گا تاکہ مسلمانوں بحری قوت میں اضافہ ہو سکے۔ لیکن لڑائی کی صورت میں اُس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ جہازوں کو آگ لگا دے گا۔ عباس مسیحی جہازوں کو بے خبری میں جا لینا چاہتا تھا۔ اور ایک گھنٹے بعد آبنائے باسفورس کے نیلے پانیوں میں عباس کے جنگجو جہاز سرکتے نظر سے۔ مسیحی ملاح اور سپاہی جہاز کے تہہ خانوں میں بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ جونہی کو کوندتی ہوئی بجلی کی روشنی میں مسیحی جہازوں کے ہیولے دکھائی دیئے، اُس نے اپنے

ساتھیوں کو رُکنے کا اشارہ کیا اور حکم دیا کہ جہازوں کے ساتھ بندھی کشتیاں کھول دی جائیں۔ اور ہر کشتی میں سات سات شمشیر بکف سپاہی سوار ہو کر مسیحی جہازوں کی طرف بڑھیں۔ اُس نے حکم دیا کہ انتہائی بے آواز اور خفیہ طریقے سے دشمن کے جہازوں پر نیزہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ اگلے لمحے بیس سے زیادہ عثمانی کشتیاں باسفورس کے پانی کو رینگتی ہوئی دشمن کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ طوفانِ بادوباراں پورے زوروں کے ساتھ جاری تھا۔ آسمان پر بادل گرج اور بجلیاں چمک رہی تھیں اور تیز ہوا کے جھونکے سمندر کی لہروں کو اٹھا اٹھا کر پٹخ رہے تھے۔ لیکن عثمانی کشتیوں کے سوار کھلے آسمان تلے سرد ہوا کے تھپیڑے کھاتے ہوئے نارمن کے جہازوں کو گھیرنے جا رہے تھے۔ بوڑھا عباس نوعمر لڑکوں کی طرح اِدھر سے اُدھر دوڑتا پھر رہا تھا اور کشتیوں کے اس چھوٹے سے لشکر کو پوری مہارت سے لئے جا رہا تھا۔

جلد ہی درمیانی فاصلہ طے ہو گیا اور عباس کی کشتی پہلے مسیحی جہاز کے ساتھ آ لگی۔ جہاز پر بے خبری کا عالم تھا۔ بادبان گرے ہوئے تھے اور لنگر سمندر میں لٹک رہے تھے۔ عباس نے اپنے ساتھ پانچ کشتیوں کے سواروں کو جہاز پر چڑھنے کا حکم دیا۔ باقی کشتیاں دوسرے مسیحی جہاز کی طرف بڑھیں جو تین سو گز کے فاصلے پر اس جہاز سے قدرے دُور کھڑا تھا۔ عباس اور اُس کے ساتھی بغیر کسی مزاحمت کا سامنا کئے اپنی کشتیوں سے دشمن کے جہاز منتقل ہو گئے۔ یہ پینتیس افراد تھے۔ سب بارش کے پانی سے سرتاپا بھیگے ہوئے تھے۔ لیکن چرمی لباس نے اُن کے جسموں کو گیلا ہونے سے بچا رکھا تھا۔ اُن کے سروں پر آہنی خود اور جسموں پر زرہیں تھیں۔ اور وہ پورے ساز و سامان کے ساتھ حملہ آور ہو رہے تھے۔ وہ کلا پیدا کئے بغیر رینگتے ہوئے جہاز کے عرشے پر آئے اور پھر باری باری نیچے اُترنے لگے سب سے آگے عباس خود تھا۔ اور پھر اُس کے تمام جانباز ایک ایک کر کے جہاز کے اندرونی احاطے میں گھس آئے۔ یہاں فرش پر چٹائیاں بچھا کر دو غلام ایک کونے میں سر سے سکڑے پڑے تھے۔ یہ جہاز کو کھینے والے چپو بردار غلام تھے۔ شاید اپنی باری بھگتا بے سدھ پڑے سو رہے تھے۔ عباس نے ایک سپاہی کو اُن کے سر پر کھڑے ہونے کا دیا اور خود تہہ خانے کی جانب بڑھا۔ لیکن اُس وقت تک عثمانی سپاہیوں کے بھاری جوتوں کی دھمک نے تہہ خانے میں شراب پی کر غل غپاڑہ مچاتے ملاحوں اور سپاہیوں چوکنا کر دیا۔ عباس کا دستہ برق رفتاری سے نیچے اُترا تو مسیحی سپاہی بھی مسلح ہو چکے چنانچہ چند لمحے کے لئے لوہے سے لوہا ٹکرانے کی آوازیں طوفانِ بادوباراں کے شور

ہوگئیں۔ شراب کے نشے میں دُھت سپاہی عباس کے ساتھیوں کا مقابلہ نہ کر سکے اور چرمولی کی طرح کٹ کٹ کر گرتے چلے گئے۔

اب جہاز پر عثمانی بحریہ کا قبضہ ہو چکا تھا۔ عباس نے لنگر اُٹھانے کا حکم دیا اور جہاز کے بادبان کھلنے لگے۔ عباس تیزی سے عرشے پر آیا اور یہ دیکھ کر اُسے اور زیادہ خوشی ہوئی کہ اُس کے جانباز ساتھی مسیحی بیڑے کے دوسرے جہاز پر بھی قبضہ کر چکے تھے۔ عباس خوشی سے پھولے نہ سما رہا تھا۔ اب اُس کی نظر آسمانی بجلی کی مدد سے نارمن کے ساحل پر کھڑے باقی ماندہ پانچ جہازوں پر تھی۔ عباس کے بحری عقاب اپنے بوڑھے سالار کے حکم کا انتظار کر رہے تھے۔ دونوں مقبوضہ جہازوں کے بادبان کھل چکے تھے اور تیز ہوائیں اُنہیں ایک دوسرے کے نزدیک لا رہی تھیں۔ دونوں جہاز قریب ہوئے تو بوڑھے عباس نے کشتیوں اور جہازوں پر سوار اپنے جانباز سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ مسیحی بیڑے سے نظر بچاتے ہوئے ایک لمبا موڑ کاٹ کر مچھیروں کی بستی کے ساحل پر لنگر انداز ہونے کی کوشش کریں۔ عباس کا خیال تھا کہ وہ ساحل پر لنگر انداز مسیحی جہازوں کو زمینی راستے سے تسخیر کرنے کی کوشش کرے گا۔ اُسے یقین تھا کہ دونوں مقبوضہ جہازوں کے عملہ کی طرح نارمن کے باقی جہاز بھی بے خبری کے عالم میں فتح کر لئے جائیں گے۔ عباس کے اس خیال کی سب سے بڑی وجہ طوفانی رات تھی۔ آسمان آج عثمانی سپاہیوں پر رحمت بن کر برس رہا تھا اور آسمانی بجلیاں نارمن کے مقدر پر قہر بن کر کڑک رہی تھیں۔

مقبوضہ جہاز اور عثمانی کشتیاں مچھیروں کی بستی کے بالکل نزدیک مچھیروں کی کوٹیوں پر آ لگیں۔ یہاں مچھلیاں پکڑنے والی بہت سی کشتیاں پہلے سے لنگر انداز تھیں۔ سردی عروج پر تھی لیکن بوڑھے عباس کی شریانوں میں گرم خون شعلوں کی طرح لپک رہا تھا۔ وہ کود کر کوٹی پر اُترا اور 30 سپاہیوں کو اپنے جہازوں اور کشتیوں کی حفاظت پر مامور کرنے کے بعد ایک کوس کے فاصلے پر موجود بے خبر مسیحی جہازوں کی جانب بڑھا۔ وہ ساحل کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اُس کے ہمراہ 90 سے زیادہ جانباز ساتھیوں کا ایک دستہ تھا جو سب کے سب بارش میں بھیگتے مسیحی جہازوں کے عقب سے اُن کی جانب بڑھ رہے تھے۔ کبھی کبھی رعد و صاعقہ کوندتی تو سارا ماحول روشن ہو جاتا اور وہ صاف دکھائی دینے لگتے۔ احتیاط کے تقاضوں کو نبھاتے ہوئے عباس کے تجربہ کار دماغ نے یہ فیصلہ کیا کہ کھلے ساحل پر چلنے کی بجائے ایک کوس کا فاصلہ پتھریلی چٹانوں اور جھاڑیوں میں چھپ چھپ کر عبور کیا جائے۔ چنانچہ سلطانی فوج کے بحری عقاب عام راستے سے ہٹ کر گھنی جھاڑیوں میں چھپ چھپ

کر چلنے لگے۔ رات اپنے پہلے پہر کے آخری حصے میں تھی۔ باسفورس کی پوری وادی طوفان باد وباراں کی ہیبت سے خوفزدہ ہو کر سہمی ہوئی تھی اور 90 سے زیادہ شمشیر بکف مجاہد اپنی چیتے جیسی آنکھیں چمکاتے دھیرے دھیرے مسیحی جہازوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔

نارمن کے بحری دستے میں صرف سات جہاز نہ تھے، اُس کے باقی جہاز بحر مارمورا اور گولڈن ہارن کے نزدیک لنگر انداز تھے۔ مچھیروں کی بستی سے ایک کوس کے فاصلے پر نارمن کے خصوصی جہازوں کا پڑاؤ تھا۔ نارمن خود ساحلی چٹانوں میں عالیشان خیمے نصب کئے اپنے دوسو سے زیادہ سپاہیوں کے ہمراہ مقیم تھا۔ آج کی موسلادھار بارش نے نارمن کی حسِ جنسیت کو مشتعل کر دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس کے سپاہی باقو کے ہمراہ مچھیروں کی بستی سے قاسم کی پہلی محسنہ ''روزی'' کو اٹھانے کے لئے گئے ہوئے تھے۔

ٹھیک اُس وقت جب مکروہ باقو درندہ صفت سپاہیوں کے ساتھ روزی کی جھونپڑی میں داخل ہو چکا تھا، عباس کے شہباز مسیحی جہازوں کے نزدیک پہنچ چکے تھے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ ساحل سے تیر کر چند قدم کے فاصلے پر لنگر انداز جہازوں کی طرف بڑھتے، اُنہیں سمندر میں کوئی چیز حرکت کرتی ہوئی نظر آئی۔ عباس نے آسمانی بجلی کی چمک میں دیکھ لیا کہ سمندر میں حرکت کرنے والی چیز دراصل دو کشتیاں تھیں جو تیزی سے ساحل پر لنگر انداز جہازوں کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ عباس نے سوچا کہ یہ کشتیاں یا تو اُن مچھیروں کی ہو سکتی ہیں جن کی گودیوں پر ابھی کچھ دیر پہلے عثمانی سپاہی آ کر اُترے تھے۔ اور یا پھر مفتوحہ جہازوں سے بچ کر نکلنے والے کچھ عیسائی سپاہی ہو سکتے ہیں۔ عباس نے فیصلہ کیا کہ وہ ان کشتیوں کے جہاز تک پہنچنے سے پہلے تیر کر خود اُن جہازوں تک پہنچنے کی کوشش کرے گا۔ لیکن وہ اپنے اس فیصلے پر عمل نہ کر سکا۔ کیونکہ سامنے سے آنے والی کشتیوں پر موجود دشمن کے فوجیوں نے جہاز کے عملہ کو سنکھ پھونک کر خبردار کرنا شروع کر دیا تھا۔ لمحوں کے سنکھ کی آواز طوفانی بارش کے شور کو چیرتی ہوئی سامنے کھڑے جہازوں تک پہنچ گئی اور لنگر انداز جہازوں میں ہلچل کے آثار دکھائی دینے لگے۔ اب حماقت ہوتی اگر عباس کا دستہ تیر کر دشمن تک پہنچنے کی کوشش کرتا۔ کیونکہ وہ دیکھ لئے گئے تھے اور دشمن کے ساحل پر پیادہ موجود تھے۔ اب تو یہی بہتر تھا کہ وہ اُلٹے قدموں فرار ہوتے اور پیچھے مچھیروں کی بستی میں کھڑے اپنے مفتوحہ جہازوں کو برق رفتاری سے لے کر نکل جاتے..... اسی خطرے کے پیش نظر عباس نے اپنے تیس بہترین سپاہیوں کو پہلے ہی اُن جہازوں کی حفاظت پر مامور کیا تھا اور اُنہیں حکم دیا تھا کہ خطرہ دیکھتے ہی وہ ان جہازوں کو لے کر

''رومیلی حصار'' کی جانب نکل جائیں۔ کیونکہ عباس اور اُس کے ساتھی ساحل پر تھے اور اُن کے لئے زمینی راستے سے واپس بھاگنا اور تین چار میل کے فاصلے پر موجود ''رومیلی حصار'' تک پہنچنا کچھ مشکل نہ تھا۔

سنکھ کی آواز سنتے ہی مسیحی جہاز چوکنے ہو گئے اور انہوں نے فی الفور لنگر اُٹھانے اور بادبان کھولنے شروع کر دیئے۔ نارمن اس بات سے بے خبر تھا کہ آبنائے باسفورس کی اس تین میل چوڑی آبی گزرگاہ میں اس وقت کیا کچھ ہو رہا ہے۔ اُس کے کانوں تک سنکھ کی شناسائی مدہم آواز پہنچی تو تھی لیکن اُسے اس قدر ہیبت ناک طوفانی رات میں کسی طرح بھی مسلمانوں کے حملے کا خیال تک نہیں تھا۔ اور پھر ایک نوجوان حسینہ کا انتظار اُس کے اعصاب پر سوار تھا۔ اس انتظار کی کوفت کو کم کرنے کے لئے وہ بار بار شراب کے جام اپنے حلق میں انڈیل رہا تھا۔

اور پھر طویل انتظار کے بعد نارمن کے سپاہی معصوم دوشیزہ..... مظلوم ''روزی'' کو اُٹھا کر نارمن کے خیمے میں لے آئے۔ روزی بارش میں بھیگی ہوئی تھی۔ اُس کا لباس کیچڑ سے لت پت تھا۔ غالباً درندہ صفت سپاہی اُس معصوم لڑکی کو اپنے ہمراہ لانے کے لئے گھسیٹتے رہے تھے۔ نارمن نے روزی کو دیکھا تو اُس کی رال ٹپکنے لگی۔ یہ حسین دوشیزہ واقعی لاکھوں میں ایک تھی۔ اُس نے حکم دیا کہ اس لڑکی کو فوراً گرم پانی سے غسل دلا کر اور نیا لباس پہنا کر اُس کے سامنے پیش کیا جائے۔ لیکن روزی ایسا کہاں ہونے دینے والی تھی۔ وہ نارمن کا حکم سنتے ہی بدک گئی اور زور زور سے چیختے ہوئے نارمن اور باقو کو گالیاں دینے لگی۔ سپاہیوں کے لئے مشکل ہو گیا کہ وہ اس ناتواں لڑکی کو سنبھالتے یا نارمن کی عیاشی کے لئے اُسے سنوارتے۔ صلیبی لشکروں کے ہمراہ جنسی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے لونڈیاں اور نوجوان لڑکیاں تو ہوا ہی کرتی تھیں۔ اور عین ممکن تھا کہ نارمن کے دستے میں موجود خواتین روزی کو نارمن کی ہوس کے لئے نہلا دُھلا کر سنوار بھی لیتیں۔ لیکن عین اُسی وقت ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ نارمن کی تمام ہوس آن کی آن میں ہوا ہو گئی۔ اُس کا نشہ یکلخت اتر گیا اور اُس نے سب کچھ بھول کر اپنا فوجی لباس پہننا شروع کر دیا۔

کیچڑ میں لت پت ایک نوجوان نارمن کے خیمے میں وارد ہوا۔ یہ اُن جہازوں کے عملے کا سپاہی تھا جو عباس کے جانباز ساتھی، صلیبیوں سے چھین چکے تھے اور یہ ان سپاہیوں میں سے تھا جو حملے کے دوران بچ نکلے تھے۔ جنہوں نے ''آبنائے باسفورس'' کے بپھرے ہوئے پانی کو ایک میل تک تیر کر عبور کیا تھا۔ یہ فوجی جب مچھیروں کے ساحل پر اُترے تو

انہیں مچھیروں کے ساحل پر اپنے مقبوضہ جہاز لنگر انداز نظر آئے۔ یہ تعداد میں چھ تھے۔ اور جونہی انہیں معلوم ہوا کہ مسلمانوں کا پیدل دستہ ساحل کے راستے باقی ماندہ جہازوں کی جانب بڑھ رہا ہے تو ان چھ فوجیوں نے مچھیروں کی کشتیاں اُڑائیں اور اپنے باقی ماندہ جہازوں کو خبردار کرنے کے لئے اُسی جانب چل دیئے۔ کیچڑ میں لت پت نوجوان نے نارمن کو یہ بھی بتایا کہ مسلمانوں کا پیدل دستہ اسی ساحل پر دیکھا گیا ہے جو کچھ دیر دکھائی دینے کے بعد چٹانی سلسلے میں روپوش ہو گئے۔ نارمن کے لئے یہ خبریں دھلا دینے والی تھیں۔ اُس کا نشہ ہرن ہو گیا اور وہ اپنے مقبوضہ جہازوں کو واپس چھیننے اور مسلمانوں کے پیدل دستے کو تلاش کرنے کے لئے نکلنے لگا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ سپاہیوں کو حکم دیتا ایک سنسناتا ہوا تیر نارمن کے خیمے کا پردہ چیر کر اندر داخل ہوا اور فرش میں پیوست ہو گیا۔

خیمے میں موجود نارمن اور دوسرے سپاہیوں کی سانسیں رُک گئیں۔ نارمن کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ لیکن روزی کی حالت دیکھنے والی تھی۔ وہ اپنی عزت بچ جانے کی خوشی میں پھولے نہ سما رہی تھی۔ اُسے یقین ہو چکا تھا کہ حملہ آوروں کا دستہ نارمن کی خیمہ گاہ تک پہنچ چکا تھا۔ نارمن بھی یہی سوچ رہا تھا۔ اُس نے خیمے سے باہر قدم نکالنے کا ارادہ ترک کیا اور سپاہیوں کو حکم دیا کہ تمام فوجیوں کو مسلح ہو کر مقابلہ کرنے کی اطلاع دیں۔ نارمن ننگی تلوار ہاتھ میں لئے اپنے خیمے کے اندر اَن دیکھے دشمن سے خوفزدہ تھا۔ روزی کو لانے والے چند سپاہی اور باقو بھی یہیں موجود تھے۔ اچانک خیمے کے دروازے پر آہٹ ہوئی اور پھر اگلے لمحے یکلخت کئی مسلح سپاہی نارمن کے خیمے میں گھس آئے۔

دراصل جب عباس عیسائی فوجیوں کی نظروں میں آ جانے کے بعد اُلٹے قدموں فرار ہونے کا ارادہ کر رہا تھا تو اُسے کسی مظلوم لڑکی کی چیخیں سنائی دیں۔ اُس نے چونک کر آواز کی سمت پر غور کیا تو بجلی کی چمک میں اُسے نارمن کا زمینی خیمہ نظر آیا۔ اُس سے رہا نہ گیا۔ یہ آواز ساحل پر نصب خیموں کی جانب سے آ رہی تھی۔ اُس نے مسیحی جہازوں کو ساحل سے فرار ہوتے دیکھ کر نارمن کے زمینی پڑاؤ پر حملہ آور ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ سب سے پہلے نارمن کے خیمے کی جانب لپکا۔ مسلمان سپاہی عیسائیوں پر قہر بن کر ٹوٹ پڑے اور دونوں طرف کی تلواریں چھچھنا اُٹھیں۔ نارمن خود ایک ماہر شمشیر زن تھا۔ اُس نے بوڑھے عباس کو دیکھا تو اُسے کمزور سمجھ کر اُس پر حملہ آور ہوا۔ لیکن نارمن کو اُس وقت اپنی غلطی کا احساس ہوا جب عباس کے تجربہ کارانہ داؤ نارمن کے لئے سمجھنے مشکل ہو گئے۔ مسلمان سپاہیوں نے اپنے بوڑھے سالار کو ایک وحشی کے ساتھ نبرد آزما دیکھا تو اُس کی مدد کے

لئے آگے بڑھے۔

باقو جو غیر مسلح تھا اور خیمے کے ایک کونے میں کھڑا تھا، حالات کی نزاکت کو بھانپ گیا اور اُس نے فرار ہونے کے لئے خیمے کا عقبی راستہ اختیار کرنے کی کوشش کی۔ وہ خیمے سے نکل بھی جاتا اگر روزی کی نظر اُس پر نہ پڑی۔ روزی نے چلا کر ایک مسلمان سپاہی کو باقو کی طرف متوجہ کیا اور کہا۔

''ارے! وہ بھاگ رہا ہے..... وہ لنگڑا شیطان جو مجھے اٹھا کر یہاں لایا، وہ بھاگ رہا ہے۔''

باقو کی قسمت ہار چکی تھی۔ وہ اپنی لنگڑاہٹ کی وجہ سے بھاگ تو سکتا نہ تھا، فوراً مُڑا اور اپنی طرف بڑھتے ہوئے سپاہی کے قدموں میں گر گیا۔

''خدا کے لئے مجھے مت مارو! میں نے کچھ نہیں کیا۔ خدا کے لئے مجھے مت مارو۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔''

اب ایک مسلمان سپاہی کے لئے ممکن نہ تھا کہ وہ کسی گڑگڑاتے ہوئے شخص کو قتل کرتا۔ چنانچہ مسلمان سپاہی نے باقو کو قتل کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اسی اثناء میں عباس میدانِ کارزار پر قابو پا چکا تھا۔ نارمن بری طرح زخمی ہو کر گر پڑا تھا اور اُس کے بچنے کی اُمید کم ہی تھی۔ اُس کے باقی ساتھی بھی تہہ تیغ ہو چکے تھے۔ نارمن کے خیمے میں تو عباس کے چند ساتھی ہی حملہ آور ہوئے تھے۔ جبکہ باقی دستہ بے خبر مسیحی سپاہیوں پر ٹوٹ پڑا تھا۔ اس ساحل پر نارمن کے دو سو سے زیادہ سپاہی خیمہ زن تھے اور عباس کے ہمراہ سو سے بھی کم جانباز تھے۔ لیکن شراب کے نشے میں بدمست مسیحی فوج کے سپاہی مقابلے کی سکت نہ رکھتے تھے۔ چنانچہ بہت قلیل وقت میں مسلمانوں نے نارمن کے پورے محافظ دستے کو زیر کر لیا۔ 70 سے زیادہ عیسائی مارے گئے اور باقی قسطنطنیہ کی سمت پر فرار ہو گئے۔ مسلمان سپاہیوں نے مال غنیمت اٹھایا اور تیزی سے واپسی کی تیاریاں کرنے لگے۔ اب روزی بوڑھے عباس کے ہمراہ تھی۔ عباس جب مچھیروں کی بستی کے نزدیک پہنچا تو اُس نے روزی سے کہا۔

''لو بیٹی!..... تمہاری بستی آ گئی..... اب تم اپنے گھر جا سکتی ہو۔''

''کون سا گھر؟..... میرا کوئی گھر نہیں بابا..... میرا اس دنیا میں اب کوئی نہیں رہا۔ مجھے اپنے ساتھ لے جایئے۔ میں آپ کی بیٹی بن کر آپ کی خدمت کروں گی۔''

عباس کے لئے روزی کا جواب غیر متوقع تھا۔ وہ خود گھر سے دُور محاذِ جنگ پر تھا۔ روزی کو کس طرح اپنے ساتھ رکھتا؟ پھر روزی عیسائی تھی اور مسلمانوں کے جنگی محاذ پر اُس

کا رہنا دفاعی نقطۂ نگاہ سے بھی درست نہ تھا۔ لیکن عباس مجبور ہو گیا۔ ایک بے سہارا اور مظلوم لڑکی اُس کا دامن تھامنا چاہتی تھی۔ وہ انکار نہ کر سکا۔

عثمانی بحریہ کے سرفروش مجاہد اپنی مہم سے کامیاب لوٹے۔ اُن کا پہلا شب خون صلیبی افواج کے لئے انتہائی حوصلہ شکن ثابت ہوا۔ جسٹینانی کے دو بڑے جہاز اور کئی کشتیاں مسلمانوں کے قبضے میں چلی گئی تھیں۔ نارمن کو آخری وقت میں بچا لیا گیا تھا اور وہ قسطنطنیہ میں زیر علاج تھا۔ عیسائی بحریہ کے سو سے زیادہ سپاہی مارے گئے تھے۔ باقو بھی بچ نکلا تھا۔ البتہ روزی اپنی بستی میں لوٹنے کی بجائے بوڑھے عباس کی بیٹی بن کر اُس کے ہمراہ ''رومیلی حصار'' کی جانب جا چکی تھی۔ شب خون میں مسیحی بحریہ کے پانچ جہاز جو ساحل پہ کھڑے تھے، بچ نکلے۔ لیکن پھر بھی یہ مہم سو فیصد کامیاب رہی تھی۔

شہنشاہ کے لئے یہ ایک بڑا صدمہ تھا۔ اُس نے جنیوی سپہ سالار جسٹینانی کو بلا کر نارمن کی کوتاہی کا ذکر کیا اور جسٹینانی سے کہا کہ وہ فی الفور عثمانی بحریہ کی اس کارروائی کا بدلہ لے۔ ورنہ قسطنطنیہ کے شہریوں کا اعتماد ہمارے دفاعی انتظامات سے اُٹھ جائے گا۔ شہنشاہ نے جسٹینانی کو حکم تو دے دیا لیکن نہ جانے کیوں اُسے توقع تھی کہ جسٹینانی، مسلمان سرفروشوں سے پنجہ نہ لڑا سکے گا۔ اس واقعہ کے بعد آبنائے باسفورس پر مسلمان بحریہ کی دھاک بیٹھ چکی تھی۔ مچھیروں کی بستی میں باقو ابھی تک سلامت تھا۔ لیکن باقی مچھیرے اب عیسائی فوجیوں کے ساتھ ہمدردی نہ رکھتے تھے۔

مسیحی جہازوں پر قبضے کی خبر ''ادرنہ'' پہنچی تو سلطان خوشی سے جھوم گیا۔ سلطان محمد خان نے فوری طور پر اپنے سپہ سالاروں کا اجلاس طلب کیا اور اُن سے کہا۔

''اسلام کے سرفروش مجاہدو!..... اب وقت آ گیا ہے کہ ہم ایک نئی تاریخ بنانے کے لئے چل پڑیں۔ ہماری خواہش ہے کہ موسم سرما کے اختتام پر ہم اپنی بہادر افواج کو لے کر قسطنطنیہ کا محاصرہ کر لیں۔''

سلطان محمد خان کے پُروقار چہرے پر پہاڑوں جیسا عزم نظر آ رہا تھا۔ ینی چری کی افواج کے سپہ سالار آغا حسن نے سلطان کی دعوت پر لبیک کہی اور اپنے لشکر کو قسطنطنیہ کی جانب لے جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ موسم سرما کا اختتام دُور نہ تھا۔ چند دنوں کی بات تھی۔ چنانچہ اجلاس میں اتفاقِ رائے سے یہ طے ہو گیا کہ جنوری 1453ء کے اختتام تک سلطانی لشکر کو کوچ کا حکم دے دیا جائے گا۔

قیصرِ روم قسطنطین دواز دہم کے لئے یہ خبر رُوح فرسا ثابت ہوئی۔ اور وہ قسطنطنیہ کو

عثمانی شاہیوں سے بچانے کے لئے دیوانہ وار تیاریاں کرنے لگا۔ قیصر کا زیادہ وقت اب دفاعی انتظامات میں گزرتا تھا۔ دن بھر جنگی سرگرمیوں اور فصیل شہر کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے کے کام سے فارغ ہوتا تو رات کو اپنے سپہ سالاروں اور خاص خاص مشیروں کی مجلس طلب کر لیتا۔

جنوری کے آغاز میں شہنشاہ نے آس پاس کی تمام فوج قسطنطنیہ میں جمع کر لی۔ اُس نے فوج کو نئے طریقے سے منظم کیا۔ یونان کے بہادر تلوار بازوں کو باقی فوج سے الگ کر کے پانچ پانچ سو جنگجوؤں کی کمان سونپی۔ ان یونانی سالاروں کو جنوبی اور مشرقی فصیل پر متعین کر دیا گیا۔ شہنشاہ نے تمام افواج میں سے ایک ہزار بہترین شمشیر زن مقرر کر کے محافظ شاہی دستے کو ازسرنو منظم کیا۔ اب محافظ شاہی دستے کا ہر سپاہی اپنی جگہ ایک معتبر سالار تھا۔ انہی یونانی سپاہیوں میں مضافاتی بستیوں میں متعین سابقہ کماندار مقرون بھی شامل تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس کے چار سو سواروں کو مصلح الدین آغا اور قاسم بن ہشام نے گاجر مولی کی طرح کاٹ دیا تھا۔ مقرون ایک بدطینت اور خودسر فوجی تھا۔ شاہی دستے میں شامل ہوا تو اُس کی رعونت دوچند ہو گئی۔

نئے سال کا آغاز ہوتے ہی قیصرِ روم کے قدیمی محل میں جنگی نوعیت کی سرگرمیاں بڑھ گئیں۔ شاہی محل کسی قلعہ سے کم نہ تھا۔ سرخ سنگ مرمر سے تعمیر کیا گیا قصرِ قسطنطنیہ کا بڑا دروازہ زمین سے چوبیس فٹ بلند اور اٹھارہ فٹ چوڑا ایک آہنی گیٹ تھا۔ اس دروازے کے دائیں بائیں فصیل شاہی پر دو دیوہیکل برج تھے جن کی بلندی چالیس فٹ سے بھی زیادہ تھی۔ بڑے دروازے سے گزر کر ایک وسیع و عریض کھلا میدان تھا جس میں ہر طرف دنیا کے مختلف پھلدار درخت اور بیل بوٹے اُگائے گئے تھے۔ فرش پر قالین نما گھاس کی بہتات تھی۔ فصیل کے بڑے دروازے سے داخل ہوتے ہی ایک لمبی چوڑی اور پختہ سڑک تھی جو محل کی بارہ دری تک چلی گئی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف مہندی کی گھنی باڑ تھی۔ محل کی اندرونی عمارت دُور سے ہی اپنی عظمت کا اعلان کرتی تھی۔ یہ کئی سو سال پرانی لیکن پُرشکوہ عمارت تھی۔ شاہی محل کی اندرونی عمارت پر پیتل کی ایک بہت بڑی صلیب نصب تھی اور اندرونی عمارت کے صدر دروازے پر ببر شیروں کے دو بڑے بڑے مجسمے تراشے گئے تھے جن کے جبڑے کھلے تھے اور وہ ہر داخل ہونے والے پر جھپٹ پڑنا چاہتے تھے۔ انہی مجسموں کے پہلو میں نیزہ بردار پہرے دار کھڑے تھے جن کے جسموں پر شاہی محل کا خصوصی لباس تھا۔ محل کی اندرونی عمارت کے پہلے حصے کو قسطنطین نے جنگی امور کے صدر

دفتر میں تبدیل کر دیا تھا۔ رسد و کمک کے افسرانِ اعلیٰ، فصیل اور محافظ شاہی دستے کے سالار اسی دفتر سے منسلک تھے۔

قیصرِ روم کا شاہی محل وسیع احاطے میں پھیلا ہوا تھا۔ محل کی جنوبی فصیل کے ساتھ داروغۂ شاہی کا صدر دفتر واقع تھا۔ محل کی کئی فٹ چوڑی فصیل زمین سے اس قدر بلند تھی کہ پورے قسطنطنیہ سے دکھائی دیتی تھی۔ اس فصیل پر جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے برج بنائے گئے تھے جن میں ہر وقت مشاق تیر انداز پہرے پر موجود رہتے۔ داروغۂ شاہی، شہنشاہ کی خفیہ پولیس کا سربراہ تھا اور اُس کے صدر دفتر کی عمارت کئی کمروں پر مشتمل تھی۔ اس وسیع عمارت کے نیچے شاہی زندان کے تہہ خانے تھے۔ داروغۂ شاہی کے دفتر میں ہر وقت پچاس سے زیادہ خطرناک سپاہی مقیم رہتے۔ یہی سپاہی بوقت ضرورت شہنشاہ کے شاہی دستے میں بھی خدمات سرانجام دیتے تھے۔

شاہی محل کے تہہ خانے میں جس روز سے قاسم کو لایا گیا تھا۔ داروغۂ شاہی پہلے سے زیادہ مستعد ہو چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ قیدی جاسوس سلطان محمد خان کے لشکر کا خاص آدمی ہے۔ قاسم کو جب یہاں لایا گیا تو شہنشاہ نے داروغۂ شاہی کو قاسم سے پوچھ گچھ پر مقرر کیا۔ قاسم نے خوب دانشمندی کا ثبوت دیا اور اُس نے سلطانی لشکر کی تیاری کے سلسلے میں شہنشاہ کے آدمیوں کو سب کچھ بتا دیا۔ اُس نے سوچا تھا کہ سلطانی لشکر کے عزائم اور تیاری کا سن کر شہنشاہ کے دل پر سلطان کی ہیبت اور زیادہ بیٹھ جائے گی۔ چنانچہ اُس نے عثمانی لشکر، افواج، اسلحہ اور بحری بیڑے کی تفصیلات بڑھا چڑھا کر بیان کر دیں۔ قاسم کو یہ سب کچھ بتا دینے سے دو فائدے ہوئے۔ ایک تو شہنشاہ نے اس تعاون پر قاسم کی سزائے موت مؤخر کر دی۔ اور دوسرے قاسم تفتیش کنندگان کی اذیت سے بچ گیا۔

داروغۂ شاہی جانتا تھا کہ قاسم ایک خطرناک جاسوس ہے۔ چنانچہ وہ جب بھی قاسم کے پاس کسی قسم کی پوچھ گچھ کے لئے آتا تو اُس کے ہمراہ دس خطرناک سپاہیوں کا ایک مسلح دستہ ہوتا۔ قاسم کے لئے اُن کا حصار توڑ کر فرار ہونا ممکن نہیں تھا۔ قاسم جس کوٹھڑی میں قید تھا اُس کے دائیں بائیں اور سامنے بھی آہنی سلاخوں والے قید خانے تھے۔ لیکن جب سے قاسم کو یہاں لایا گیا تھا، اُس نے اپنے علاوہ کسی اور قیدی کی آواز نہ سنی تھی۔ قاسم جس قید خانے میں نظر بند تھا، یہاں سے کسی قیدی کا فرار ممکن نہیں تھا۔

قاسم تاریک زندان میں قید تھا۔ یہ دراصل شاہی محل کا ایک تہہ خانہ تھا جسے جیل کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ اس تہہ خانے میں کوئی کھڑکی یا روشندان نہیں تھا۔ زمین پر خشک

گھاس پھونس بچھی تھی اور تہہ خانے کی چھت قاسم کے سر سے زیادہ بلند نہ تھی۔ قاسم چاہتا تو چھت کو ہاتھ بڑھا کر چھو سکتا تھا۔ اس چھوٹے سے کمرے کا دروازہ موٹی موٹی آہنی سلاخوں کا بنا ہوا تھا۔ یہ دروازہ ایک چھوٹی سی راہداری میں کھلتا تھا۔ اس راہداری میں چند کمرے اور بھی تھے جو قید خانے کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ راہداری کا اختتام زینوں پر ہو رہا تھا اور بیس سے زیادہ پختہ زینے اوپر شاہی محل کی عقبی عمارت میں کھل رہے تھے۔ یہ عمارت جس کے نیچے تہہ خانے تھے داروغۂ شاہی کا خاص دفتر تھی۔ اس عمارت میں ہمہ وقت داروغۂ شاہی کے خطرناک سپاہی موجود رہتے۔ قاسم جب سے اس کمرے میں بند کیا گیا تھا، مسلسل فرار کی ترکیبوں پر غور کرتا رہا تھا۔ سلاخیں توڑنا اُس کے بس کی بات نہ تھی۔ چنانچہ وہ کھانا لانے والے غلام سے راہ و رسم بڑھانے کی کوشش کرتا رہا تاکہ کسی طرح فرار کے وقت اُس کی مدد حاصل کی جا سکے۔ لیکن قاسم کی بدقسمتی سے کھانا لانے والا غلام قوتِ گویائی سے محروم تھا۔ قاسم کو شاہی محل کے قید خانے میں گزرنے والا ایک ایک دن، ایک ایک صدی کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ لیکن پھر بھی قاسم نے بے شمار دن یہاں گزار دیئے تھے۔ یہاں تک کہ اب موسم سرما کا بھی اختتام ہونے والا تھا۔

آغازِ جنوری کی ایک نہایت سرد رات زندان کے اندر قاسم کی زندگی کی ایک نہایت اہم رات ثابت ہوئی۔ تاریک تہہ خانے کی اکلوتی مشعل کسی ٹھٹھرے ہوئے ستارے کی طرح ٹمٹما رہی تھی۔ تہہ خانے کی گیلری اور باقی کوٹھیاں جو دن بھر ویران پڑی رہتی تھیں اس سرد رات میں پُر ہول دکھائی دے رہی تھیں۔ سردی کا یہ عالم تھا کہ تہہ خانے میں دن بھر دوڑنے پھرنے والے چوہے اپنی اپنی بلوں میں دبکے بیٹھے تھے۔ اوپر کی عمارت میں بھی پُر ہول سناٹا تھا۔ تمام پہریدار گرم بستروں میں بدمست پڑے سو رہے تھے۔ داروغۂ شاہی کی رہائش گاہ یہاں سے سو قدم کے فاصلے پر گھنے درختوں کے بیچوں بیچ تھی۔ قیصر کے پورے شاہی محل میں ہر طرف خاموشی کے پہرے تھے۔

لیکن تہہ خانے کے اندر قاسم جاگ رہا تھا۔ اُس کا میلا کچیلا کمبل تو سردی روکنے کے لئے ناکافی تھا البتہ خود تہہ خانے کا موسم باہر کی نسبت بہت بہتر تھا۔ قاسم اپنی کوٹھڑی کی عقبی دیوار سے پیٹھ لگائے عثمانی افواج کی آمد کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب تو سلطان محمد خان کے فاتحانہ داخلے کے بعد ہی اُس کو آزادی کا سورج نصیب ہو سکتا تھا۔ تہہ خانے کی لمبی راہداری میں ایک اکلوتی مشعل روشن تھی جس کی روشنی قاسم کی کوٹھڑی کے سامنے تک پہنچتے بہت کم ہو گئی تھی۔ قاسم جس دیوار کے ساتھ پیٹھ لگائے بیٹھا

تھا یہ عقبی دیوار تھی۔ اور اس طرح قاسم کی نظریں کوٹھڑی کے دروازے پر ٹکی ہوئی تھیں
تہہ خانے کی لمبی راہداری میں کھلتا تھا اور موٹی موٹی آہنی سلاخوں سے بنایا گیا تھا
قاسم کو خاموش بیٹھے بیٹھے کچھ عجیب سا احساس ہونے لگا۔ اُس کی چھٹی حس یکلخت بیدا
ہو گئی اور اُسے محسوس ہونے لگا کہ اُس کے علاوہ بھی تہہ خانے کے اندر کوئی اور موجو
ہے۔ قاسم کی تمام حسیات سمٹ کر اُس کے کانوں میں آ گئیں اور وہ پوری توجہ کے ساتھ
تہہ خانے کے اندر کسی قسم کی آہٹ سننے لگا۔ لیکن تہہ خانے کا ہولناک سناٹا اپنی تمام
ہیبت سمیت ویسے کا ویسا تھا۔ نہ جانے کیوں قاسم کے دل میں بھوت پریت کا خیال آنے
لگا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ تہہ خانے کا ایک ہی دروازہ ہے جو تمام کوٹھڑیوں کے آگے
سے گزرنے والی راہداری کے اختتام پر چند زینے طے کرنے کے بعد موجود ہے۔ جب
بھی کوئی تہہ خانے میں داخل ہوتا، اسی دروازے سے داخل ہوتا۔ دن میں دو بار جب گونگا
غلام تہہ خانے میں آتا تو پرانے کواڑوں کی چرچراہٹ سن کر قاسم کو خود بخود پتہ چل جاتا
کہ کوئی آیا ہے۔ لیکن آج تو یہ دروازہ بند تھا۔ پھر قاسم کو کیوں ایسا لگ رہا تھا جیسے اس
زندان کے اندر اُس کے علاوہ بھی کوئی ہے۔

وہ ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اُس کی نظریں کوٹھڑی کی سلاخوں پر لگی ہوئی تھیں۔
یکلخت اُسے ایسے لگا جیسے مشعل کی تھرکتی ہوئی لو خود بخود رُک گئی ہو۔ اور پھر قاسم کے کانوں
نے پہلی بار راہداری کے دوسرے سرے سے جو مضبوط پتھروں کی دیوار سے بند تھا..... ہلکی
سی گڑگڑاہٹ کی آواز سنی۔ اب تو قاسم کو پوری طرح یقین ہو چکا تھا کہ زندان کی تاریک
راہداری میں کوئی مافوق الفطرت ہستی موجود ہے۔ وہ توقع کرنے لگا کہ ابھی اُس کے
سامنے کوئی بھوت یا دیو نمودار ہو گا۔

اور پھر مشعل کی مدھم روشنی میں قاسم نے اپنی کوٹھڑی کے باہر سرخ انگارہ آنکھوں والا
ایک دیو دیکھ لیا..... یہ ''شاگال'' تھا۔ اُس کا بھاری بھرکم تنومند جسم اور گنجا سر اس تاریک
راہداری میں انتہائی ہیبت ناک دکھائی دے رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے تو قاسم کی سانسیں
رُکنے لگیں۔ اُسے سونیا کی باتوں پر یقین آنے لگا کہ شاگال سچ مچ میں بھوت پریت ہے
لیکن پھر قاسم نے فوراً دل ہی دل میں خود کو ڈانٹا اور اپنے سر کو زور سے جھٹکا دیا۔ وہ ایک
بہادر سپاہی تھا۔ چنانچہ ڈر یا خوف اُس کے نزدیک سے بھی نہ گزرتے تھے۔ قاسم کے دل
سے خوف کا بادل چھٹا تو آنِ واحد میں اُس کی جگہ غصے نے لے لی۔ اب اُسے یہ تو پروا
نہ تھی کہ شاگال تہہ خانے میں کہاں سے داخل ہوا۔ اب اُسے صرف یہ فکر تھی کہ کاش وہ کسی

طرح ان سلاخوں کو عبور کر کے شاگال پر حملہ کر سکتا۔

شاگال آہستہ قدموں سے چلتا ہوا سلاخوں کے بالکل نزدیک آ کر ٹھہر گیا۔ قاسم اُٹھ
کر بیٹھ گیا..... شاگال کے داہنے ہاتھ میں اُس کا وہی مخصوص عصاء تھا اور اُس کی شیش
ناگ جیسی چمکدار آنکھیں اس تاریکی میں بھی قاسم کو گھورتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ شاگال
کچھ دیر تک ایک ہی جگہ کھڑا رہا۔ یہ قدیم تہہ خانہ، کوٹھڑیوں کی موٹی موٹی آہنی سلاخیں،
مشعل کی روشنی میں زمین پر پھیلا ہوا شاگال کا دہشت ناک سایہ اور ان دیو مالائی
کوٹھڑیوں میں چھایا ہوا پُر ہول سناٹا۔ یہ سب پراسرار شاگال کی ہیبت میں مزید اضافہ کے
باعث تھے۔ قاسم کو شاگال کا سیاہ ہیولا اور چمکتی ہوئی انگارہ آنکھیں ہندوستان کی مہا کالی
دیوی کا تاثر دے رہی تھیں۔ شاگال کوٹھڑی کی سلاخوں کے بالکل نزدیک آیا اور اُس نے
اپنے عصاء کو آہنی سلاخوں کے ساتھ انتہائی مدھم ضرب مار کر قاسم سے کہا۔

''نوجوان! تم جانتے ہو، تمہاری طویل اور تکلیف دہ قید ہمارے ایک اشارے پر عمل
میں آئی ہے۔ اور اب ہمارا ایک اشارہ ہی تمہیں آزادی دلانے کے لئے کافی ہے۔ لیکن
اس کے لئے تمہیں عظیم شاگال کو صرف مقدس نقشے کے بارے میں بتانا ہو گا۔''

شاگال کے گلے میں عجیب طرح کی غراہٹ تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے دو شخص ایک ساتھ
بول رہے ہوں۔ درحقیقت یہ ایک خوفزدہ کر دینے والی آواز تھی قاسم کی نظر شاگال کے
عصاء پر پڑی۔ یہ قد آدم عصاء حقیقت میں ایک بھاری بھرکم اور موٹا سا ڈنڈا تھا۔ قاسم
نے دیکھا کہ شاگال کا عصاء زندان کی سلاخ سے پھسل کر ایک بالشت اندر کی جانب
کھسک آیا تھا۔ نہ جانے کیوں قاسم کی ذہنی رو شاگال کے عصاء پر اٹک گئی۔ لیکن قاسم
شاگال کو جواب دینے سے غافل نہ تھا۔ وہ مقدس نقشے کا ذکر سن چکا تھا اور اُسے یہ
احساس ہونے لگا تھا کہ مقدس نقشہ یقیناً قسطنطنیہ یا آیا صوفیاء سے متعلق کوئی اہم دستاویز
ہے۔ قاسم چاہتا تھا کہ شاگال کی زبان سے مقدس نقشے کے بارے میں مزید معلومات بھی
حاصل کر سکے۔ چنانچہ قاسم نے کہا۔

''شاگال! تم یسوع مسیح کے سچے راہب نہیں۔ سچ پوچھو تو ایک مکار جادوگر ہو۔ میں
مقدس نقشہ حاصل کر چکا ہوں، لیکن تمہیں نہیں دے سکتا۔ چاہے قید تو کیا مجھے جان سے
کیوں نہ ہاتھ دھونے پڑیں۔''

اتنا کہہ کر قاسم نے شاگال کے مکروہ چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ وہ شاگال کا ردِعمل
دیکھنا چاہتا تھا اور شاگال کا ردِعمل اُس کی توقع کے عین مطابق نکلا۔ کیونکہ شاگال کی

آنکھوں میں تجسس کی لہر نظر آئی۔ وہ ایک قدم مزید آگے بڑھ کر آہنی سلاخوں کے ساتھ لگ گیا۔ قاسم بھی کمبل لپیٹے لاغر قدموں کے ساتھ چلتا ہوا سلاخوں کے نزدیک آ کر ٹھہر گیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ قاسم آہنی سلاخوں کے نزدیک ایک قدم کے فاصلے پر پہنچتا شاگال نے عصاء سیدھا کرتے ہوئے اُسے رُکنے کا حکم دیا اور کہا۔

''نوجوان جاسوس! وہیں رُک جاؤ۔ یاد رکھو، میں تم سے ہر قیمت پر مقدس نقشہ حاصل کر کے رہوں گا۔ کیونکہ اس مقدس نقشے میں پورے قسطنطنیہ کی جان ہے۔''

حقیقت تو یہ تھی کہ قاسم مقدس نقشے کے بارے میں خود بھی کچھ نہ جانتا تھا۔ اُس نے مقدس نقشہ نہ دینے کی بات کر کے دراصل اندھیرے میں تیر چلایا تھا۔ لیکن اب اُسے مقدس نقشے کی اہمیت کا احساس ہو رہا تھا۔

اسی اثناء میں شاگال نے اپنا عصاء ایک مرتبہ پھر اٹھایا اور قاسم سے آخری بار کہا۔

''نوجوان! میں جانتا ہوں تم نے سپہ سالار نوٹاراس کی وساطت سے مقدس نقشے کو حاصل کر لیا ہے۔ اور بطریق اعظم کی ملازمت کے دنوں میں خود کسی جگہ چھپا دیا..... اگر تم نے نقشے کے بارے میں نہ بتایا تو تمہاری زندگی کو عثمانی لشکر کے لئے عبرت کا نشان بنا دیا جائے گا۔''

شاگال کا عصاء اُٹھا ہوا تھا۔ معاً قاسم کے ذہن میں ایک حیران کن ترکیب آئی اور اُس نے جھپٹ کر شاگال کے عصاء پر ہاتھ ڈال دیا۔ قاسم کی یہ حرکت اُس مکار بطریق کے لئے یکسر غیر متوقع تھی۔ شاگال نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن قاسم نے اُس کے عصاء کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر پورے زور کے ساتھ اپنی جانب جھٹکا..... شاگال تو سلاخوں کی پرلی جانب تھا، چنانچہ اُس کا بھاری بھرکم وجود اپنے پیروں پر سنبھل نہ سکا اور وہ ایک جھٹکے کے ساتھ کوٹھڑی کی آہنی سلاخوں سے آ ٹکرایا۔ قاسم کا جھٹکا بہت زوردار تھا۔ شاگال کا سر اور ماتھا آہنی سلاخوں کے ساتھ ٹکرائے تو اُس کی پیشانی پھٹ گئی۔ عصاء اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور آہنی سلاخوں پر شاگال کا تازہ خون قطروں کی صورت جم گیا۔ قاسم کے ہاتھ شاگال کا قد آدم عصاء آ چکا تھا۔ لیکن شاگال پیشانی پر ضرب کھانے کے بعد کسی بھوت پریت یا چھلاوے کی طرح آنِ واحد میں غائب ہو چکا تھا۔ قاسم نے سلاخوں کو پکڑ کر عجلت کے ساتھ دائیں بائیں جھانکا۔ وہ شاگال کو دیکھنا چاہتا تھا کہ شاگال آخر ایک لمحے میں کہاں غائب ہو گیا۔ اُس کے ہاتھ میں شاگال کا مضبوط عصاء تھا۔ معاً اُسے راہداری کے بائیں کونے میں سے گڑگڑاہٹ کی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔

اب قاسم کے ذہن میں ایک زبردست جھماکہ ہوا..... اچھا!..... تو گویا اس طرف سے کوئی خفیہ راستہ ہے۔ کیونکہ دیوار کی گڑگڑاہٹ سے صاف پتہ چلتا تھا کہ راہداری کے بائیں کونے میں دیوار اپنی جگہ سے سرک رہی ہے۔ اب قاسم کو پہلی بار احساس ہوا کہ وہ کسی طرح ان سلاخوں والی کوٹھڑی سے نکل جائے تو خفیہ راستے کے ذریعے آسانی سے فرار ہو سکتا ہے۔ قاسم سوچ رہا تھا کہ شاگال یقیناً یہی راستہ استعمال کر کے تہہ خانے میں آیا اور گیا تھا۔ قاسم کا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا۔ وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ ہو سکتا ہے داروغۂ شاہی بھی اس راستے سے بے خبر ہو۔ لیکن قاسم کا یہ خیال غلط نکلا۔ داروغۂ شاہی تہہ خانے کے خفیہ راستے کو جانتا تھا۔

ہوا یوں..... کہ شاگال کے چلے جانے کے کچھ ہی دیر بعد قاسم کو راہداری کا دروازہ کھلنے کی چرچراہٹ سنائی دی..... تو اب گویا سیدھے راستے سے کوئی آ رہا تھا۔ سیدھے راستے سے تو کوئی سپاہی ہی آ سکتا تھا۔ یا پھر داروغۂ شاہی خود۔ قاسم کو خیال آیا کہ راہداری میں تھوڑی دیر پہلے پیدا ہونے والی زوردار آواز جو شاگال کا سر سلاخوں سے ٹکرانے کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی، یقیناً بیرونی عمارت میں سنی گئی ہو گی۔ اور اسی آواز کو سن کر کوئی سپاہی تہہ خانے میں بغرضِ تفتیش آ رہا ہو گا۔ یہ سوچ کر قاسم نے انتہائی تیزی کے ساتھ شاگال کا مضبوط اور لمبا عصاء کوٹھڑی میں بچھی گھاس پھونس میں چھپا دیا۔ قاسم کا خیال درست نکلا۔ یکایک دو تین سپاہی برہنہ شمشیریں ہاتھوں میں لئے زینوں سے اتر کر تہہ خانے میں آئے۔ اُن کے دوسرے ہاتھ میں الگ الگ مشعلیں تھیں۔ سپاہی احتیاط کے ساتھ چلتے ہوئے قاسم کی کوٹھڑی کے پاس آئے اور اُن میں سے ایک نے آتے ہی قاسم سے سوال کیا۔

''یہ آواز کیسی تھی؟''

''کون سی آواز؟''

''دھماکے کی آواز جو ابھی کچھ دیر پہلے تہہ خانے میں اُبھری۔''

سپاہیوں اور قاسم کے درمیان مکالمہ ہونے لگا۔ قاسم نے کہا۔

''دراصل ایک بھوت تہہ خانے میں آ گیا تھا۔''

قاسم نے کسی قدر طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا تو وہی سپاہی بولا۔

''بھوت؟..... تم سچ کہہ رہے ہو؟''

شاید تینوں سپاہی توہم پرست تھے۔ بھوت کا ذکر سنتے ہی کسی قدر خوفزدہ ہو گئے۔ اب قاسم نے مزہ لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں بھوت۔ ایک سرخ انگارہ آنکھوں والا دیو ہیکل گنجا بھوت..... درحقیقت
دیو تھا۔" قاسم سچ مچ سپاہیوں کو ڈرانے لگا.....

اب تینوں سپاہی مزید یہاں نہ رُکنا چاہتے تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں مشعلیں
اُنہیں تہہ خانے میں شاگال کے آنے کا ایک ایک ثبوت دکھائی دے سکتا تھا۔ لیکن
ذکر سن کر وہ اُلٹے قدموں دوڑے۔ اب قاسم نے آخری وار کیا۔

"ٹھہرو! بہادر سپاہیو ٹھہرو..... پہلے ان سلاخوں کو تو دیکھتے جاؤ....."

قاسم نے شاگال کو اس قدر زوردار جھٹکے سے سلاخوں پر ٹکر دی تھی کہ تہہ خانے
سلاخیں اُس جگہ سے کسی قدر ٹیڑھی ہو چکی تھیں۔ قاسم کے کہنے پر پہریدار سپاہیوں نے
کر سلاخوں کا معائنہ کیا۔ اور جب اُنہیں ٹیڑھی سلاخوں پر خون کے دھبے دکھائی دیے
مارے خوف کے اُن کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ اب اُنہیں یقین ہو گیا کہ یہاں سچ مچ
بھوت آیا تھا۔ وہ کوئی بات کئے بغیر تیز قدموں سے چلتے ہوئے واپس نکل گئے۔

سپاہیوں کے چلے جانے کے کچھ دیر بعد داروغۂ شاہی تہہ خانے میں داخل ہوا۔
کے ہاتھ میں بھی مشعل تھی اور دو سپاہی اُس کے عقب میں چل رہے تھے۔ یوں لگتا تھا
آدھی رات کے اس سمے سپاہیوں نے داروغۂ شاہی کو جا کر جگایا ہو اور بھوت کے
میں بتایا ہو۔ داروغۂ شاہی توہم پرست شخص نہ تھا۔ وہ بے دھڑک تہہ خانے میں داخل
اور سیدھا قاسم کی کوٹھڑی کے پاس آ کر رُکا۔ اُس نے خون آلود سلاخوں کا معائنہ کیا اور
راہداری کے فرش پر تفتیشی نگاہوں سے مشعل کی روشنی ڈال ڈال کر دیکھنے لگا۔ داروغہ
کو تہہ خانے میں کسی کے آنے کے آثار صاف دکھائی دے رہے تھے۔ راہداری میں
جانب کی خشک گھاس پھونس بھی بکھری پڑی تھی اور کسی کے قدموں کے نشانات چلتے ہو
شمالی دیوار تک چلے گئے تھے۔ داروغۂ شاہی ایک ایک چیز کا جائزہ لیتا ہوا راہداری کی
دیوار کے بالکل نزدیک آ کر رُک گیا۔ یہ پتھریلی دیوار راہداری کو بند کرتی تھی۔ یہ
خانے کی سب سے تاریک جگہ تھی اور اس طرف کی کوٹھڑیوں میں چوہوں اور سانپوں
راج تھا۔ داروغۂ شاہی پتھریلی دیوار کی جڑوں میں گہری نظر سے غور کرنے لگا۔ وہ
دیکھنا چاہتا تھا کہ کیا کوئی شخص تہہ خانے کے خفیہ راستے سے تو نہیں آیا؟ داروغۂ شاہی
راستے کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ یہ دیوار ایک خفیہ اینٹ ہلانے پر اپنی جگہ سے
گڑگڑاہٹ کے ساتھ سرکنے لگتی تھی۔ داروغۂ شاہی کو یہی معلوم ہوا کہ کوئی شخص یقیناً
راستے سے آیا ہوگا۔ یہ ایک سرنگ تھی جو محل سے باہر تک چلی گئی تھی۔

اس سرنگ کی حقیقت یہ تھی کہ اس کے بارے میں شہنشاہ یا داروغۂ شاہی کے علاوہ کسی
علم نہ تھا۔ شہنشاہ کے علم میں بھی یہ خفیہ راستہ داروغۂ شاہی کے بتانے پر ہی آیا تھا۔
روغۂ شاہی اس وجہ سے بے حد حیران تھا کہ آخر وہ تیسرا شخص کون ہو سکتا ہے جو خفیہ
ی کے بارے میں جانتا ہے۔ اُسے معلوم نہ تھا کہ وہ تیسرا شخص بطریق شاگال ہے۔
خیال کے تحت داروغہ نے اپنے ساتھ آئے دونوں سپاہیوں کو واپس جانے کا حکم دیا۔
سرنگ میں اکیلا داخل ہونا چاہتا تھا۔ چنانچہ جب سپاہی واپس چلے گئے تو داروغۂ شاہی
ی واپس جا کر تہہ خانے کا اکلوتا دروازہ بند کر دیا۔ اب کوئی شخص سیدھے راستے سے
اہداری میں داخل نہ ہو سکتا تھا۔ داروغہ نے اپنا ہاتھ تلوار کے دستے پر مضبوطی سے جما لیا۔
قاسم کی کوٹھڑی کے قریب سے گزرا تو کچھ سوچ کر رُک گیا اور بولا۔

"سنا ہے تمہیں کوئی بھوت نظر آیا ہے؟..... سرخ انگارہ آنکھوں والا دیو؟"

"ہاں! وہ گنجا بھی تھا..... وہ کسی بیل کی طرح ہٹا کٹا تھا۔"

قاسم کے لہجے کی سچائی سن کر داروغہ سوچ میں پڑ گیا۔ لیکن اگلے لمحے وہ خفیہ سرنگ میں
ہونے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ داروغۂ شاہی کے ذہن میں خیال آیا کہ قاسم کہیں خفیہ
کے راستے سے واقف ہی نہ ہو جائے۔ اسی ڈر کے تحت داروغہ نے احتیاط سے کام
شروع کیا۔ ویسے بھی راہداری کا دوسرا سرا قاسم کی نظروں سے کافی اوجھل تھا۔ لیکن
تو پہلے ہی یہ اندازہ کر چکا تھا کہ تہہ خانے میں کوئی خفیہ راستہ موجود ہے۔

داروغۂ شاہی شمالی دیوار کے پاس جا کر رُک گیا اور پھر اُس نے اپنے بائیں ہاتھ سے
سر پر نیچی چھت کی ایک اینٹ کو زور سے دبایا۔ اگلے لمحے راہداری کی دیوار میں
گڑگڑاہٹ کی آواز گونجی اور دیوار اپنی جگہ سے سرکنے لگی۔ یہ ایک تاریک سرنگ تھی۔ مشعل
روشنی سرنگ میں داخل ہوئی تو داروغۂ شاہی کو سرنگ کی حالت دیکھ کر ایسے لگا جیسے یہ
صدیوں سے اسی طرح ویران پڑی ہے۔ دیوار سرکتے ہی بہت سی چمگادڑیں اپنی
ان جنت میں بے تاب ہو گئیں۔ مکڑی کے بڑے بڑے جالے جگہ جگہ سرنگ میں
روکے کھڑے تھے۔ لیکن شاگال کے گزرنے سے ان دیوار نما جالوں میں محرابی
زے سے بن گئے تھے۔ سرنگ کے فرش پر بھربھری مٹی بکھری پڑی تھی اور شاگال کے
ں کے نشانات صاف دکھائی دے رہے تھے۔

نہ جانے کیوں داروغۂ شاہی کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ بھوت پریت پر یقین نہ
تھا۔ لیکن پھر بھی اُس کے دل پر آسیبوں کا قبضہ چھانے لگا۔ داروغۂ شاہی کے ہاتھ

میں مشعل کی لو رقص کر رہی تھی اور سرنگ میں بننے والے پُر ہیبت سائے منحوس بدروحوں کی طرح اُچھل کود کر رہے تھے۔ سرنگ بہت طویل تھی۔ جبکہ داروغہ کے ہاتھ میں پکڑی مشعل کی روشنی زیادہ دُور تک نہ جاتی تھی، بلکہ تھوڑا آگے جا کر روشنی اور تاریکی آپس میں اس طرح مدغم ہو رہے تھے کہ ہر سایہ خود ایک دیو دکھائی دیتا تھا۔ اور پھر سرنگ کے پُراسرار سناٹے میں داروغۂ شاہی کے بھاری بوٹوں کی ٹھک ٹھک دل دہلانے کے لئے کافی تھی۔ اب داروغۂ شاہی کے دل پر دہشت سی چھانے لگی تھی۔ داروغۂ شاہی نے ایک قدم اور آگے بڑھایا تو معاً اُسے دُور سرنگ میں دو سرخ آنکھیں اپنی جانب گھورتی ہوئی دکھائی دیں۔ جیسے رات کی تاریکی میں کالی بلی کی آنکھیں کسی انگارے کی طرح دکھائی دیتی ہیں بالکل اُسی طرح۔ داروغۂ شاہی کے قدم رُک گئے اور اُس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ اُسے یقین ہو گیا کہ سرنگ میں بھوت ہے۔ کچھ دیر کے لئے وہ سکتے میں آ گیا۔ لیکن پھر ایک دم اُسے ہوش آیا اور وہ اُلٹے قدموں بھاگا۔ اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر سرنگ کے دہانے عبور کیا اور راہداری میں آ گیا۔ داروغۂ شاہی نے پلک جھپکتے میں دہانے کی اینٹ ہلائی اور سرنگ بند ہو گئی۔ لیکن وہ ابھی تک خوفزدہ تھا۔ اُس کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں اور ذہن مسلسل دو سرخ انگارہ آنکھوں پر لگا ہوا تھا۔ داروغۂ شاہی شمالی دیوار سے واپس جانے کے لئے مڑا۔ اور جب چلتا ہوا قاسم کی کوٹھڑی کے سامنے پہنچا تو قاسم اپنے پہلے اور آخری منصوبہ کے لئے مستعد کھڑا تھا۔

قاسم سلاخوں کے ساتھ لگ کر راہداری کے بالکل نزدیک تاریکی کا ایک حصہ بن کر کھڑا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں شاگال کا مضبوط عصاء تھا۔ داروغۂ شاہی جونہی قاسم کی کوٹھڑی کے آگے سے گزرنے لگا اُس نے قاسم کی جانب مڑ کر دیکھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ قاسم کو کھڑے ہوئے دیکھ کر حیران ہوتا یا کچھ کہتا، قاسم کا ڈنڈا اپنا کام دکھا چکا تھا۔ یہ شاگال کا وہی عصاء تھا جو قاسم نے گھاس پھونس میں چھپا رکھا تھا۔ قاسم نے شاگال کا عصاء دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر داروغۂ شاہی کے سر پر دے مارا۔ ٹھس کی آواز آئی اور داروغۂ شاہی کی کھوپڑی پچک گئی۔ داروغۂ شاہی کا بھیجہ اُس کے کانوں کے راستے سے نکلتا ہوا اُڑ کر دیوار سے جا چپکا۔ وہ جہنم رسید ہو چکا تھا۔ داروغۂ شاہی اپنی جگہ لہرایا اور راہداری میں شرقاً غرباً لڑھک گیا۔ اُس کی مشعل گر کر بجھ گئی۔ قاسم تیزی کے ساتھ نیچے بیٹھا اور داروغۂ شاہی کی ٹانگ سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ اوپر کی منزل پر موجود سپاہی بے خبر تھے۔ قاسم نے داروغۂ شاہی کے لباس کو ٹٹولا تو کوٹھڑی کی چابیاں نکل آئیں۔ اب قاسم کے لئے یہاں

سے فرار ہونا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ وہ تیزی سے اٹھا اور آہنی دروازے کے تالے کو ایک چابی لگا کر کھول لیا۔ شاگال کا عصاء قاسم کے ہاتھ میں تھا جس کے ایک سرے پر داروغۂ شاہی کی پچکی ہوئی کھوپڑی کا مواد تھا۔ قاسم کئی ماہ بعد آہنی دروازہ دھکیل کر کوٹھڑی سے باہر نکلا تو آزادی ملنے کی خوشی میں یہ بھول گیا کہ چند لمحے پہلے شاگال جیسا خطرناک شخص یہاں آیا تھا۔ راہداری میں زینوں کی جانب اکلوتی مشعل جل رہی تھی۔ قاسم کو اگر سرنگ سے جانا تھا تو اس مشعل کا ساتھ ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ قاسم دبے قدموں کے ساتھ راہداری کے زینوں کی جانب بڑھا۔ قاسم نے راہداری کی اکلوتی مشعل اٹھائی اور اب وہ سرنگ کا خفیہ راستہ تلاش کرنے کے لئے شمالی دیوار کی جانب بڑھ رہا تھا۔ قاسم پتھریلی دیوار کے سامنے پہنچ کر رُک گیا اور دیوار پر چاروں طرف ہاتھ مار کر کوئی ایسی اینٹ ڈھونڈنے لگا جو خفیہ راستے کی کلید ہو سکتی تھی۔

اُدھر جب زینوں کے نزدیک سے مشعل ہٹی تو اوپر کی منزل پر بیٹھے سپاہیوں کو پتہ چل گیا کہ زینوں پر لگی مشعل کو ہٹا لیا گیا ہے۔ کیونکہ تہہ خانے کا بیرونی دروازہ جو اوپر کی منزل میں کھلتا تھا، اپنی چھوٹی چھوٹی جھریوں سے تہہ خانے کی روشنی ایک پیغام کے طور پر اوپر منتقل کرتا رہتا تھا۔ چنانچہ جونہی سپاہیوں کو تہہ خانے میں غیر معمولی حرکت کا احساس ہوا، وہ چونک گئے۔ انہوں نے اپنی تلواریں نکال لیں۔ لیکن بھوت پریت کا ڈر انہیں تہہ خانے میں داخل ہونے سے باز رکھے ہوئے تھا..... ایک سپاہی نے جرأت کر کے اپنے سالار داروغۂ شاہی کو پکارا۔ لیکن کوئی جواب نہ پا کر وہ تینوں بھوتوں کے خوف میں بری طرح مبتلا ہو گئے۔ ٹھس کی آواز تو اُنہوں نے پہلے سنی تھی۔ لیکن اُن کے وہم و گمان میں بھی یہ نہ تھا کہ جاسوس قیدی آزاد ہو جائے گا۔ قاسم راہداری میں ابھی تک دیوار ہٹانے کی کلید ڈھونڈ رہا تھا۔ اُسے سپاہیوں کے پکارنے کی آواز سنائی دی تو اُس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اب اُسے جو کچھ کرنا تھا جلدی کرنا تھا۔ قاسم کے بائیں ہاتھ میں مشعل اور شاگال کا عصاء تھا اور دائیں ہاتھ سے وہ اینٹوں کو ٹٹول رہا تھا۔ جبکہ داروغۂ شاہی کی وہ تلوار جو قاسم نے اٹھا لی تھی، قاسم کے پہلو میں لٹک رہی تھی۔ قاسم کافی دیر سے اینٹ تلاش کر رہا تھا۔ بالآخر اُس نے اپنے سر پر موجود چھت کی اینٹوں کو بھی ٹٹولنا شروع کر دیا۔ اور پھر یکلخت گڑگڑاہٹ کی آواز سن کر اُس کی باچھیں کھل گئیں۔

قاسم سرنگ میں داخل ہوا تو اُس نے اپنے پیچھے دروازہ بند کرنے پر مزید وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور مشعل کی روشنی میں تیزی سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ بڑھتے بڑھتے

اچانک اُسے خیال آیا کہ یہاں مکروہ شاگال بھی ہو سکتا ہے..... اور پھر یہی وقت تھا جب شاگال اُس کے سامنے تھا۔ وہ دراصل دو آنکھیں تھیں جو چند قدم کے فاصلے پر قاسم کو گھور رہی تھیں۔ انہی دو آنکھوں کی دہشت نے داروغۂ شاہی کو بھاگنے پر مجبور کیا تھا۔ گویا شاگال ابھی تک سرنگ میں ہی موجود تھا۔ قاسم کے اعصاب تن گئے اور اُس نے داروغۂ شاہی کی جو تلوار اُٹھائی تھی اُسے بے نیام کر لیا۔ جبکہ قاسم کے بائیں ہاتھ میں جلتی ہوئی مشعل بھی تھی اور بھاری بھرکم ڈنڈا بھی تھا۔ یہ دونوں اشیاء ایک ہاتھ سے پکڑنا قاسم کے لئے مشکل ہو رہا تھا۔ چنانچہ قاسم نے ڈنڈے اور مشعل میں سے صرف مشعل کا انتخاب کیا اور شاگال کے منحوس ڈنڈے کو ایک طرف پھینک دیا۔ قاسم نے ڈنڈا پھینکا، لیکن اگلے لمحے ایک منظر دیکھ کر اُس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہی دو سرخ آنکھیں جو کسی کالی بلی کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں ایک دم ڈنڈے کی جانب لپکیں اور پھر قاسم نے دیکھا کہ ایک بڑا سا سیاہ رنگ کا بندر جھپٹ کر شاگال کے عصاء تک پہنچا اور شاگال کے اعصاء کو اٹھا کر بجلی کی رفتار سے اُلٹے قدموں بھاگ گیا۔ اس تاریک اور بھیانک سرنگ میں سرخ آنکھوں والا بندر دیکھ کر قاسم کے پسینے چھوٹ گئے۔ قاسم نے اپنی تلوار ہوا میں لہرائی اور بندر پر حملہ کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ لیکن زندان کی سرنگ کا وہ پراسرار بندر پلک جھپکتے میں غائب ہو چکا تھا۔ قاسم دیر تک کسی چیتے کی طرح مستعد کھڑا رہا۔ لیکن اب سرنگ میں مکمل خاموشی تھی۔ وہ چمکتی ہوئی سرخ آنکھیں بھی اب اپنی جگہ موجود نہ تھیں۔

قاسم نے سوچا کہ شاگال کے اعصاء میں کوئی خاص بات تھی۔ تبھی تو اُس کا پراسرار بندر ڈنڈا واپس حاصل کرنے کے لئے سرنگ میں موجود تھا۔ ایک لمحے کے لئے تو قاسم کو ایسے لگا جیسے شاگال نے بندر کا رُوپ دھار لیا ہو۔ لیکن پھر اُس نے اپنے سر کو جھٹکا اور خود کو سمجھایا کہ یہ شاگال کا پالتو بندر تھا جو اُس کا عصاء لینے کے لئے موجود تھا۔ قاسم نے محسوس کیا جیسے اب سرنگ میں کوئی نہ تھا۔ وہ تیزی سے باہر کی طرف نکلتا چلا گیا.....

اور چند ساعت بعد وہ آزاد تھا۔

مقدس نقشہ

قاسم کے فرار کی خبر قیصر روم پر برق بن کر گری۔ پرانے اور تجربہ کار داروغہ شاہی کی موت نے ایوانِ سلطنت کو ہلا کر رکھ دیا۔ فرار کے واقعہ کی تفصیل معلوم ہوئی تو قیصرِ روم کی آنکھیں مارے حیرت کے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اور پھر جب اسے محافظ سپاہیوں نے یہ بتایا کہ سب سے پہلے تہہ خانے میں ایک سرخ آنکھوں والا دیو داخل ہوا تھا۔ تو قیصرِ روم کا گمان فوراً اپنے خواب کی طرف بٹ گیا تھا۔ مارسی قیصر کو یہ تعبیر بتا چکی تھی کہ جب تک سرخ آنکھوں والا دیو نما انسان شہنشاہ خود قتل نہیں کرے گا، قسطنطنیہ کی نجات ممکن نہیں۔ قیصر بھی شاگال کو ہی اپنے خواب والا دیو سمجھتا تھا۔ قاسم کی گرفتاری کے روز ''آیا صوفیاء'' میں قیصر شاگال کو دیکھتے ہی مارسی کی بتائی ہوئی تعبیر کے مطابق قتل کرنے کے لئے اٹھنا چاہتا تھا۔ لیکن شاگال کی خطرناک چمکدار آنکھوں نے اُس روز قیصر کو اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ اور آج خبر ملی تھی کہ سرخ آنکھوں والا دیو قاسم کے فرار سے پہلے تہہ خانے میں دیکھا گیا۔ اب قیصر کو مارسی کی تعبیر پر دل سے یقین آنے لگا۔ کیونکہ قاسم کا فرار اِن نازک ایام میں قیصرِ روم کے لئے بہت بُرا شگون تھا۔

قیصر کے قاصد اور جاسوس اسے سلطان محمد خان کے لشکر کی ایک ایک خبر پہنچا رہے تھے۔ سلطانی لشکر ''اورنہ'' سے چل پڑا تھا۔ سردیاں گزرنے والی تھیں۔ ادرنہ سے اِسلامی افواج روانہ ہوئیں۔ تو اہل شہر دور تک اپنے لشکر کو الوداع کہنے کے لئے آئے۔ اُن کا نوجوان اور محبوب سلطان محمد خان ثانی بن مراد خان ثانی ایک عظیم تاریخی مہم پر روانہ ہو رہا تھا۔ سلطان کے لشکر کا ہر سپاہی اپنے آپ کو اس مبارک لشکر کا حصہ سمجھ رہا تھا۔ جسے رسول کریم ﷺ نے سب سے اچھا لشکر قرار دیا تھا۔ لشکر نے پہلا پڑاؤ صرف پچاس کوس کے فاصلے پر کرنا تھا۔ سلطان کا ہراوّل دستہ جو ینی چری کے بہترین اور بہادر شہسواروں کا مجموعہ تھا۔ عجب شاہانہ انداز میں سب سے آگے آگے چل رہا تھا۔ جاگیرداروں کی فراہم کردہ فوج کو ملا کر سلطانی لشکر کی تعداد ایک لاکھ کے قریب تھی۔

اٹھلا اٹھلا کر چلتے ہوئے شہسواروں کے عقب میں بڑے اسلحے اور بھاری توپوں کی گاڑیاں رواں دواں تھیں۔ اُن کے پیچھے پیدل افواج کا زرہ پوش دستہ عجب سماں پیش کر

رہا تھا۔ ینی چری کے ہروال کی سپہ سالاری پر ''آغا حسن'' دائیں بازو پر ''احمد کدک پاشا'' اور بائیں بازو پر ''محمود پاشا'' تھے۔ قلب لشکر میں خود سلطان ایک قد آور سفید گھوڑے پر سوار تمام افواج کی کمان کر رہا تھا۔ لشکر کے پیچھے پیچھے سینکڑوں بیل گاڑیاں، گدھا گاڑیاں اور بے شمار اونٹ تھے جن پر لشکر کے لئے رسد کا سامان لدا تھا۔ زخمیوں کی مرہم پٹی کے لئے ''ادرنہ'' کی نوجوان مسلمان لڑکیوں کا ایک بڑا دستہ تھا۔ جس کی کمان بوسنیائی شہزادی ..... حمیرا کے ہاتھ میں تھی۔ اس تاریخی لشکر میں شامل ہونے کی سعادت سے قاسم بن ہشام کا بڑا بھائی ''طاہر'' بھی محروم نہ رہا۔ اور اس طرح قاسم کا پورا خاندان قسطنطنیہ کے فاتح لشکر میں شامل ہونے کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ طاہر کے دونوں بیٹے عمر اور علی اب بچے نہیں بلکہ نوعمر لڑکے تھے۔ جو ننھے مجاہدوں کے طور پر لشکر کے خدام میں شامل کر لئے گئے تھے۔ بوڑھے عباس کی بیٹی ''مریم'' بھی مرہم پٹی کرنے والی عورتوں میں شامل تھی۔

لشکر میں دیکھنے کے لائق سب سے حسین چیز پیتل کی چمکدار وہ توپ تھی جس کے پہلو میں ایک محفوظ نشست پر عظیم آہن گر ''اُربان'' براجمان تھا۔ یہ دیو ہیکل توپ جہاں سے گزرتی سلطان محمد خان کی فتح کا اعلان کرتی جاتی۔ اسلامی افواج تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر پڑاؤ کرتی ہوئی قسطنطنیہ کی جانب بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔

یہ لشکر تھا۔ وہی لشکر جو قسطنطنیہ پر فیصلہ کن حملہ کرنے جا رہا تھا۔ اسی لشکر کے بارے میں رسول کریم ﷺ نے بشارت دی تھی۔

"لتفتحن القسطنطنية" فلنعم الا ميرا ميرها و لنعم الجيش

ترجمہ: ''تم ضرور قسطنطنیہ فتح کر لو گے۔ پس بہتر امیر اُس کا امیر ہو گا۔ اور بہتر لشکر وہ لشکر ہو گا۔''

اِسی لشکر کا ایک بڑا حصہ عثمانی بحریہ پر مشتمل تھا۔ جس کا امیر البحر سلطان محمد خان نے ایک پرانے جنگجو ملاح سردار ''بلوط اغلن'' کو مقرر کیا۔ سلطان کے بیڑے میں زیادہ تر جہاز اور کشتیاں بالکل نئے نئے بنے ہوئے تھے۔ سلطانی بحریہ کا ہراول عباس کی قیادت میں پہلے ہی آبنائے باسفورس کی ناکہ بندی کر چکا تھا۔ عثمانی لشکر کی آمد کا سن کر اہل قسطنطنیہ خوف اور پریشانی کا بُری طرح شکار ہو چکے تھے۔ قسطنطنیوی افواج کا سپہ سالار نوٹاراس اپنا غم غلط کرنے کے لئے شراب و کباب کا سہارا لے رہا تھا۔ شہنشاہ دوسرے ممالک کی کمک کا منتظر تھا۔ جبکہ عام عوام شب و روز اس خطرے کو ٹالنے کے لئے اپنے خداوند کے حضور

گڑگڑا رہی تھی۔ ''آیا صوفیاء'' میں ان دنوں بھیڑ رہتی۔ خصوصاً اتوار کے روز چرچ میں عبادت کے لئے کوئی نشست خالی نہ ملتی۔

اور پھر اتوار کی ایک صبح جب قسطنطنیہ پر جنگ کے بادل منڈلا رہے تھے۔ آیا صوفیاء میں عبادت کے لئے آنے والوں کا خوب رش تھا۔ سونیا اپنے کمرے سے نکل کر چرچ کے ہال میں آئی۔ وہ بھی اپنے خداوند کے حضور گڑگڑانا چاہتی تھی۔ وہ اپنے محبوب کی رہائی کے لئے خداوند کی منتیں کرنے آئی تھی۔ اس کا دل چور چور تھا۔ جب سے قاسم گرفتار ہوا تھا۔ سونیا کی زندگی تاریک ہو گئی تھی۔ لیکن یہ تاریکی محض اداسی تھی۔ وگرنہ قاسم سے ملنے کے بعد سونیا کی تاریک زندگی میں روشنی آ چکی تھی۔ اُس روز سے لے کر اب تک اُس نے خود کو کسی کے بستر کی زینت نہ بننے دیا تھا۔ وہ قاسم کی دیوانی تھی۔ اور یہ ثابت ہو جانے کے بعد بھی کہ قاسم مسلمان جاسوس ہے اُس کی دیوانگی میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔ وہ شب و روز شاہی زندان کی تاریک کال کوٹھڑی سے قاسم کی رہائی کے بارے میں سوچتی رہتی۔ لیکن وہ کیا کر سکتی تھی۔ وہ ایک معمولی خادمہ تھی۔ اُس کے پاس صرف ایک ہی ہتھیار تھا۔ اور وہ تھی اُس کی حسین اور بھرپور جوانی ..... لیکن اپنا دل ایرون کو دینے کے بعد وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اب کبھی اپنے جسم کو آلودہ نہ ہونے دے گی۔ سونیا نے جب سے ہوش سنبھالا تھا۔ اُس کے سامنے صرف ہوس پرست مرد ہی آئے تھے۔ قاسم کی ملاقات اُس کے لئے نیا تجربہ تھی۔ قاسم نے اُس کے اندر کی نیک لڑکی کو جھنجھوڑا..... تو وہ ایک دم سے جیسے بیدار ہو گئی۔ وہ اب تک ''آیا صوفیاء'' کے بدبودار راہبوں کا نشانہ بنی رہی تھی لیکن اب وہ قاسم کے سوا کسی اور کے لئے نہ جینا چاہتی تھی۔ اُس کی انگلی میں قاسم کی پہنائی ہوئی انگوٹھی تھی۔ جسے ہر وقت وہ اپنے سینے سے لگائے رکھتی۔

آج اپنے خداوند کے حضور گڑگڑانے کے لئے وہ بھی آیا صوفیاء کے ہال میں داخل ہوئی۔ پورا ہال خوفزدہ شہریوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس عقیدے کی بنا پر کہ آیا صوفیاء کے ہوتے ہوئے قسطنطنیہ کو کوئی فتح نہیں کر سکتا..... لوگ جوق در جوق یہاں عبادت کے لئے آنے لگے تھے۔ درحقیقت لوگوں میں صدیوں سے ایک بشارت مشہور چلی آ رہی تھی۔ جس نے ایک راہب کو الہام کے ذریعے خداوند نے یہ بتایا تھا کہ قسطنطنیہ پر ترکوں کا حملہ ہو گا۔ اور ترک رومیوں کا تعاقب کرتے کرتے ''آیا صوفیاء'' کے اُس ستون تک پہنچ جائیں گے جسے شاہ قسطنطین کے نام سے منسوب کیا جاتا تھا۔ لیکن یہیں سے ترکوں کی واپسی اور شکست کا عمل شروع ہو گا۔ آج کل اِس بشارت کی وجہ سے آیا صوفیاء میں مذہبی لوگوں کی

آمدورفت بڑھ گئی تھی۔

آج بھی چرچ عبادت گزاروں سے بھرا ہوا تھا۔ سونیا عبادت گاہ کی نشستوں میں سے ایک نشست پر سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ اُس کا دل چور چور تھا۔ اور اُس کی آنکھیں رات بھر رونے کی وجہ سے سوجی ہوئی تھیں۔ سونیا نے اپنے دائیں اور بائیں بیٹھی خواتین کو ایک نظر بھی نہ دیکھا.....

چرچ کا بشپ چبوترے کے ممبر پر کھڑا باآواز بلند مناجات پڑھ رہا تھا۔ اور تمام حاضرین سرنہواڑے بشپ کی مناجات سن رہے تھے۔ ہر کوئی دل ہی دل میں عثمانی ترکوں کا قہر ٹالنے کے لئے دعائیں مانگ رہا تھا۔ لیکن سونیا کی آنکھوں سے گرنے والے آنسو صرف ایرون، ایرون پکار رہے تھے۔

قاسم کی محبت نے سونیا کی زندگی بدل دی تھی۔ اُس کی کایا پلٹ گئی تھی۔ اَب وہ پہلے والی سونیا نہ رہی تھی۔ لوگ سلطان محمد خان کے قہر سے بچاؤ کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ جبکہ سونیا اپنے قاسم کو دیکھنے کے لئے خداوند کے حضور رو رہی تھی۔ وہ قاسم کو ایرون کے نام سے جانتی تھی۔ اُسے قاسم ایک نوجوان پادری کے روپ میں ملا تھا۔ اور مسلمان کے روپ میں بچھڑ گیا تھا۔ لیکن سونیا کے لئے اپنی میٹھی میٹھی یادیں چھوڑ گیا تھا..... ایرون

قاسم کا جعلی نام تھا۔ جو اُس نے ''آیا صوفیاء'' کا راہب بننے کے لئے اختیار کیا تھا۔ سونیا ایرون کی رہائی کے لئے دعائیں مانگتی رہی۔ اُس کے دونوں ہاتھ سامنے کی طرف جڑے ہوئے تھے۔ اور داہنے ہاتھ کی ایک انگلی میں قاسم کی دی ہوئی انگوٹھی چمک رہی تھی۔

سونیا کے دائیں پہلو میں بیٹھی خاتون کافی دیر سے پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ سونیا کی انگلی میں پہنی انگوٹھی کو گھور رہی تھی۔ یہ ''برٹیا'' تھی۔ رومیل کی بیوی برٹیا۔ جو ہر اتوار عبادت کے لئے چرچ آیا کرتی تھی۔ اُس نے سونیا کو پہلے بھی کئی مرتبہ دیکھا تھا۔ لیکن آج سونیا کے ہاتھ میں انگوٹھی دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ یہ تو وہی انگوٹھی تھی جو اُس کے منہ بولے بھائی قاسم بن حشام نے ''ڈیمونان'' کی دعوت کے روز اُسے دی تھی۔ برٹیا کبھی انگوٹھی کو دیکھتی اور کبھی سونیا کی آنکھوں سے گرتے ٹپ ٹپ آنسوؤں کو برٹیا کا سر چکرانے لگا۔ اور اُس کا دماغ تیزی سے گھومنے لگا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیا یہی لڑکی قاسم کی پہلی محبت تھی۔ جسے حاصل کرنے کے لئے وہ ڈیمونان کے تعاقب میں یہاں آیا تھا۔ برٹیا کے دل میں جذبات کی بڑی بڑی موجیں اٹھتی اور بیٹھی رہیں۔ سونیا بدستور عبادت میں مصروف رہی۔ لیکن برٹیا مارے تجسس کے عبادت نہ کرسکی۔ اور جب بشپ اعظم نے دعا ختم ہونے کا

اعلان کیا تو برٹیا نے انتہائی بے صبری کے ساتھ سونیا کی کلائی پکڑ لی۔

''لڑکی!..... کیا تمہارا نام سسٹر میری ہے؟..... تم نے یہ انگوٹھی کہاں سے حاصل کی..... تم سسٹر میری نہیں ہوسکتیں..... ایک مقدس راہبہ انگوٹھیاں نہیں پہنتی لیکن یہ انگوٹھی تمہارے پاس پہنچی کس طرح؟

برٹیا نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔ وہ ایک عام گھریلو خاتون تھی۔ اُسے گہرے راز سنبھالنے کا فن نہیں آتا تھا۔ وہ انتہائی جذباتی انداز میں سونیا کی کلائی پکڑے ہوئے تھی اور سونیا پر سوالات کی بوچھاڑ کیے جا رہی تھی۔ لیکن سونیا..... وہاں موجود نہ تھی..... وہ تو کہیں کھو گئی تھی۔ سسٹر میری کا کیا چکر تھا اور اس انگوٹھی کا سسٹر میری کے ساتھ کیا تعلق تھا۔ اور اسے یہ بھی یاد آیا کہ سسٹر میری نے چند دن قبل سونیا سے انگوٹھی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے دماغ میں آندھیاں چلنے لگیں۔ اب اسے ایرون کی کہانی مزید پیچیدہ دکھائی دینے لگی۔ وہ بے چین تھی..... وہ جلد سے جلد جاننا چاہتی تھی۔ کہ ایرون کی دی ہوئی انگوٹھی کے پیچھے کیا راز تھا..... اور یہ عورت کون تھی۔ جس نے بھرے کلیسا میں سونیا کا ہاتھ پکڑ لیا تھا..... وہ ایک لمحے کے لئے کچھ سوچنے کے بعد تیزی سے اُٹھی اور برٹیا کو اپنے ساتھ لے کر..... اوپر گیلری کی جانب چل دی۔

سونیا نے اپنے کمرے میں پہنچ کر بھی برٹیا پر یہ ظاہر نہ ہونے دیا تھا کہ وہ کون ہے۔ بلکہ وہ خود برٹیا سے سوال کرنے لگی تھی۔

''بہن!..... تم پہلے یہ بتاؤ کہ تم..... اس انگوٹھی..... کو کیسے جانتی ہو۔ اور اِس کا سسٹر میری کیساتھ کیا تعلق ہے؟''

سونیا نے اپنی انگوٹھی سامنے کرتے ہوئے کہا۔ لیکن اب برٹیا اپنے جذبات پر قابو پا چکی تھی۔ اُس نے دل کی بات چھپاتے ہوئے مختصر جواب دیا۔

''یہ انگوٹھی سسٹر میری کی ہے۔ اِس سے زیادہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ لیکن تم پہلے یہ بتاؤ کہ تم کون ہو؟''

سونیا سمجھ چکی تھی کہ اب برٹیا اصل حقیقت نہیں بتائے گی۔ چنانچہ اُس نے ایک عجیب داؤ کھیلا۔ اور برٹیا سے کہا۔

''بہن!..... درحقیقت میں ہی سسٹر میری ہوں۔ میں ایک راہبہ ہو کر یہ انگوٹھی اِس لئے پہنتی ہوں کہ اِس انگوٹھی کے ساتھ میرا بہت جذباتی تعلق ہے۔''

برٹیا سونیا کے دام میں آ گئی۔ اور ایک خوشی سے بھرپور چیخ نما آواز نکالتے ہوئے سونیا

کو گلے سے لگالیا۔

''اوہ میری بہن!..... مارسی!..... تو بالآخر تمہیں اپنا بچھڑا ہوا پیارمل ہی گیا۔ میں مقدس ڈیمونان سے تمہاری ساری کہانی سن چکی ہوں۔ تم نے بہت دکھ سہے..... مورگن میرا بھائی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ مسلمان ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم اُسے بہت چاہتی ہو۔ میں تم سے ملنا چاہتی تھی۔ لیکن جب سے مورگن نے ڈیمونان کو قتل کیا، میں ڈر گئی۔ اور چرچ میں آنا کم کر دیا۔ شکر ہے تمہیں تمہاری محبت مل گئی۔ لیکن میں نے تو سنا ہے کہ مورگن کو آیا صوفیاء سے گرفتار کر لیا گیا ہے۔ وہ تمہیں کب ملا تھا؟ کچھ بتاؤ نا!''

بریٹا جذباتی ہو رہی تھی۔ لیکن سونیا پتھر کی طرح سن ہو چکی تھی۔ اُس کے دماغ میں ساری کھڑکیاں کھل چکی تھیں۔ وہ مورگن یا ایرون کی اصل حقیقت جان گئی تھی۔ اب اُسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ وہ مسلمان جاسوس فی الحقیقت سسٹر میری کا محبوب تھا۔ اُس کا دل ٹوٹ گیا۔ وہ دیوار کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی..... تو گویا اُس کے ساتھ دھوکہ ہوا تھا۔ ایک ہی شخص جس نے دنیا میں اُس کا دل جیتا تھا..... وہ بھی دھوکے باز نکلا۔ وہ تو مارسی کے چکر میں یہاں آیا تھا۔ بطریق ڈیمونان کو قتل کرنے والا مسلمان جاسوس ایک سات سالہ عبادت گزار راہبہ کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ایرون نے اُسے استعمال کیا تھا۔ محض ایک کھلونا سمجھ کر استعمال کیا تھا۔ اُس نے سونیا کو انگوٹھی اسی لئے پہنائی تھی کہ وہ یہ انگوٹھی لے جا کر سسٹر میری کو دکھائے۔ اور سسٹر میری نے بھی تو دھوکہ دیا تھا۔ سسٹر میری نے اُسے اصل حقیقت کیوں نہ بتائی؟ سونیا کا دل رنج و الم سے بھر گیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتی تھی لیکن نہ جانے کیوں اُس کی ہچکیاں سینے میں ہی رُک گئی تھیں۔ صرف آنسو تھے جو ٹپ ٹپ گرتے جا رہے تھے۔ چند روز پہلے تک یہ آنکھیں شوخ و شریر و چنچل ہوا کرتی تھیں۔ اب ان میں صدیوں کی اُداسی اُتر آئی تھی۔ اُس نے ابھی چند روز قبل ہی تو اپنی گناہ آلود زندگی کو ترک کرنے کا تہیہ کیا تھا۔ اور یہ تمام تر تبدیلی صرف قاسم کی بدولت وقوع پذیر ہوئی تھی۔ لیکن یہ کیا ماجرا نکلا..... وہ جس شخص کو اپنا سمجھتی رہی، وہ تو کسی اور کا نکلا۔ اُس نے جس کو خدا بنایا تھا..... وہ کسی اور کا پجاری تھا۔ سونیا کے لئے تمام دُکھوں سے بڑھ کر یہ صدمہ تھا۔ وہ بری طرح نڈھال ہو رہی تھی۔ اور بریٹا اُس کے نزدیک کھڑی اُس کی ہر لمحہ بدلتی ہوئی حالت پر غور کر رہی تھی۔ اُسے حیرت ہو رہی تھی کہ اس لڑکی کو کیا ہونے لگا ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ سونیا اب بھی قاسم سے متنفر نہ ہوئی تھی۔ وہ دل ہی دل میں اپنی حیثیت پر غور کرنے لگی۔ اجنبی نوجوان جو ایرون بن کر سونیا کی زندگی میں داخل ہوا تھا، وہ

سسٹر میری جیسی ایک پاکباز خاتون سے محبت کرتا تھا..... جبکہ سونیا، سسٹر میری کے مقابلے میں خود کو ایک بازاری لڑکی سمجھتی تھی۔ اُسے اپنی کم مائیگی کا احساس ہونے لگا۔ دیر تک وہ بریٹا کے ساتھ کوئی بات نہ کر سکی۔ بالآخر بریٹا خود ہی مخاطب ہوئی۔

''کیا بات ہے سسٹر میری! آپ تو پریشان ہونے لگی ہیں۔ آپ فکر مند نہ ہوں۔ مورگن مسلمان ہے تو کیا ہوا؟ میں یقین سے کہتی ہوں کہ وہ جب بھی قید سے رہا ہو گا تو سیدھا آپ ہی کے پاس آئے گا۔ میں جانتی ہوں مورگن آپ کے بغیر جینے کا تصور ہی نہیں کر سکتا۔ اُس نے مجھے آپ کی اور اپنی مکمل کہانی سنائی ہے۔''

سونیا کے لئے مزید کچھ سننا ممکن نہ تھا۔ اُس کا سر زور زور سے چکرانے لگا۔ چہرے کا رنگ فق ہو گیا اور ہونٹ خشک ہونے لگے۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی اپنے بستر پر جا بیٹھی۔ آج اُس نے اپنی زندگی کا سب سے زیادہ دُکھ بھرا دن دیکھ لیا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے تاریکی چھانے لگی۔

بریٹا تو چلی گئی۔ لیکن سونیا کے لئے ایک اندوہناک زندگی کا دروازہ کھول گئی۔ وہ جب تک نہ جانتی تھی کہ ایرون، سسٹر میری سے محبت کرتا ہے، اپنے آپ کو ایرون کی محبت کا تن تنہا مالک سمجھتی تھی۔ لیکن اُسے حقیقت معلوم ہوئی تو وہ کسی کانچ کے مرتبان کی طرح ٹوٹ کر بکھر گئی۔

اور پھر اُسی رات ''آیا صوفیاء'' کی بالائی منزل میں مقدس راہبہ سسٹر میری کے دروازے پر ایک نقاب پوش دکھائی دیا۔ ''آیا صوفیاء'' کی بالائی منزل میں رات کے اس وقت سنسانی کا پہرہ تھا۔ فرش پر سوئی گرنے کی آواز بھی سنائی دے سکتی تھی۔ گیلری کی دیواروں میں دائیں بائیں معمول کے مطابق مشعلیں جل رہی تھیں جن کی تھرتھراتی ہوئی لوئیں ''آیا صوفیاء'' کی بالائی منزل پر بنے مہیب ستونوں کو رقص کرتے ہوئے شیاطین کی صورت دکھا رہی تھیں۔ نقاب پوش، مارسی کے دروازے پر رُک گیا۔ اُس نے دائیں ہاتھ کی اُنگلی سے مارسی کا دروازہ کھٹکھٹایا اور کسی آہٹ کا انتظار کرنے لگا۔ اُسے انتظار نہ کرنا پڑا۔ کیونکہ جلد ہی مارسی نے اپنے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ لیکن اگلے لمحے وہ ایک نقاب پوش کو دیکھ کر بے حد بوکھلا گئی۔ وہ ایک دم سہم کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے نقاب پوش کو دیکھ رہی تھی۔ یہ کون شخص تھا جو آدھی رات کے وقت چہرے کو نقاب سے چھپائے مارسی کے کمرے میں آن ٹپکا تھا؟.....

اور پھر اگلے لمحے ہی مارسی کے ذہن میں ایک انتہائی زوردار جھماکہ ہوا۔

اُس کے سامنے قاسم کھڑا تھا..... قاسم بن ہشام۔ ''ادرنہ'' کا قاسم بن ہشام۔ سلطان مراد خان ثانی کا شاہی سراغ رساں، ''سکندر بیگ'' جیسے ماہر شمشیر زن کو بھرے سٹیڈیم میں شکست دینے والا عرب نوجوان جو وادیٔ حجاز کا رہنے والا تھا..... قاسم بن ہشام..... آج سے سات سال پہلے جس کی محبت نے ماریٰ کو مسلمان کر دیا تھا۔ وہی قاسم جو تہوار والے روز سکندر بیگ کو شکست دے کر ماریٰ کے دل کا راجہ بن گیا تھا۔ وہی قاسم جس کی محبت نے ماریٰ کو طرح طرح کے مصائب میں مبتلا کر دیا تھا۔ آج مدتوں بعد قاسم اُس کے سامنے تھا۔ اُس کا بچھڑا ہوا ساتھی، جس کے ساتھ اُس نے زندگی کے کٹھن راستے طے کرنے کے وعدے کئے تھے۔ قاسم کا سر اور چہرہ نقاب سے ڈھکا ہوا تھا۔ لیکن پھر بھی ماریٰ اُسے پہچان گئی۔ وہ اپنے ہمدرد اور غمگسار دلربا کی خوشبو پہچانتی تھی۔ اُس نے قاسم کو آنکھوں کی رنگت سے بھی پہچان لیا تھا۔ یہی آنکھیں تو تھیں جن میں جھانک کر اُس نے زندگی کے ہر دُکھ بانٹنے کے وعدے کئے تھے۔ ماریٰ کا جسم سن ہو چکا تھا اور اُس کا شعور سکتے کے عالم میں تھا۔ اُس کے ہونٹ کھلے تھے اور داہنا ہاتھ استعجاب بھرے انداز میں اٹھا ہوا تھا۔ ماریٰ کی زبان گنگ تھی۔ اور اُس کی آنکھیں ایک ٹک قاسم پر جمی ہوئی تھیں۔

قاسم آہستہ قدموں سے کمرے میں داخل ہوا۔ اُس نے کمرے میں داخل ہو کر ماریٰ کے حجرۂ خاص کا دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ اس مقدس حجرے میں آج پہلی مرتبہ کوئی مرد داخل ہوا تھا۔ قاسم نے دروازہ بند کر کے اپنے چہرے کو نقاب کی قید سے آزاد کر لیا۔ ماریٰ ابھی تک سکتے کے عالم میں تھی۔ قاسم منتظر تھا کہ ماریٰ کچھ کہے۔ لیکن..... ماریٰ تھی کہ اپنی بلاخیز آنکھیں پٹپٹائے بغیر کسی سنگی مجسمے کی طرح ساکت و جامد کھڑی تھی۔ سات سال کی جدائی اور پے در پے صدمات نے ماریٰ کو حالات سے سمجھوتہ کرنا سکھا دیا تھا اور وہ انہونی باتوں کی توقع کرنے سے باز رہتی تھی۔ لیکن آج انہونی ہو گئی تھی۔ چنانچہ ماریٰ حیرت سے پتھر بن گئی۔ قاسم نے ماریٰ کی حالت دیکھی تو دو قدم آگے بڑھا اور ماریٰ کے بالکل نزدیک پہنچ کر رُک گیا۔ اگلے لمحے اُس کے دونوں ہاتھ ماریٰ کے شانوں پر تھے اور وہ ماریٰ کو جھنجھوڑ کر کہہ رہا تھا۔

''ماریٰ!..... ماریٰ!..... ہوش میں آؤ..... ماریٰ! میں قاسم ہوں۔ تمہارا قاسم..... قاسم بن ہشام۔''

قاسم کے حلق سے تیز سرگوشی نکل رہی تھی۔ قاسم کی آواز سن کر ماریٰ کے بدن میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ ایک جھرجھری لے کر عالم استغراق سے بیدار ہوئی۔ اور فی الفور

پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ یہ وہ سیلاب تھا جس کے سامنے کئی سالوں سے حالات سے بندھ باندھ دیئے گئے تھے۔ آج تمام رُکاوٹوں کو توڑ کر آنکھوں کے راستے سے پوری طرح پھوٹ پڑا تھا۔ ماریٰ اپنے قاسم کے چوڑے چکلے سینے سے لگ چکی تھی۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے سے اُس کا پورا بدن بید مجنوں کی شاخ بن کر لرز رہا تھا۔ آج ماریٰ آنکھوں کے راستے سے دل کے سارے داغ دھو دینا چاہتی تھی۔ لیکن قاسم کے پاس اس جذباتی منظر سے مسرت کشید کرنے کا وقت نہ تھا۔ وہ تو ماریٰ کو لینے آیا تھا۔ اپنے ساتھ لے جانے کے لئے..... اُس نے ماریٰ کے شانوں کو اُنگلیوں کی نرم لمس سے کسی قدر دبایا اور کہا۔

''ماریٰ!..... میں آ گیا ہوں۔ میں تمہیں لینے کے لئے آ گیا ہوں۔ تم نے بہت دُکھ سہے۔ بہت صدمے جھیلے۔ لیکن اب تمہاری تمام دُعائیں قبول ہو چکی ہیں..... آؤ میرے ساتھ! اب میں تمہیں خود سے کبھی بھی جدا نہ ہونے دوں گا۔''

ماریٰ اب بھی آنسو بہا رہی تھی۔ ابھی تک وہ زبان سے کچھ نہ بولی تھی۔ ماریٰ کے خوبصورت جسم میں رعشے کی سی کیفیت تھی۔ قاسم نے مناسب سمجھا کہ ماریٰ کو فوری طور پر اپنے ساتھ لے جانے کی بجائے کچھ دیر کے لئے اُسے سنبھلنے کا موقع دیا جائے۔ وہ ماریٰ کو سہارا دے کر اُس کے بستر تک لایا۔ لیکن اب ماریٰ سنبھل چکی تھی۔ اُس نے مسہری پر بیٹھنے سے پہلے قاسم کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لئے اور پھر قاسم یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ماریٰ اُس کے دونوں ہاتھوں کو والہانہ انداز میں بوسے دینے لگی تھی۔ وہ قاسم کی انگلیوں کو اپنی گیلی آنکھوں کے ساتھ بار بار چھو رہی تھی۔ اب ماریٰ نے بولنا چاہا۔ لیکن الفاظ اُس کے حلق میں اٹک گئے۔ قاسم نے ماریٰ کی والہانہ محبت کو محسوس کیا تو دل ہی دل میں نادم ہوا۔ کیونکہ وہ تو شادی بھی کر چکا تھا اور اُس کی ایک انتہائی پیاری پیاری باتیں کرنے والی بیٹی بھی تھی..... یا الٰہی! یہ کیا ماجرا تھا؟ ماریٰ تو اُسے ٹوٹ کر چاہتی تھی۔ لیکن وہ تھا کہ اپنی رفیقۂ حیات کسی اور کو بنا بیٹھا تھا۔ لیکن اس میں قاسم کا بھلا کیا قصور تھا۔ اُسے تو آج سے سات سال پہلے یہی خبر ملی تھی کہ ماریٰ شہید ہو چکی ہے۔ پھر قاسم کی ملاقات بوسنیائی شہزادی سے ہو گئی۔ سچ تو یہ تھا کہ قاسم آج تک ماریٰ کو اُسی طرح چاہتا تھا۔

قاسم، ماریٰ کے پاس مسہری پر بیٹھ گیا۔ اب ماریٰ نے پہلی مرتبہ اپنے ہونٹوں کو حرکت دی۔ ''مجھے یقین تھا کہ آپ مجھے لینے کے لئے ضرور آئیں گے۔ آپ کے انتظار میں سات سال تو کیا، میں سات صدیاں بھی انتظار کر سکتی تھی۔ قاسم!..... آج آپ کو دیکھ کر نہ جانے مجھے کیا ہو رہا ہے؟..... کچھ سمجھ میں نہیں آتا..... آپ کئی ماہ پہلے یہاں ''آیا صوفیاء'' میں

پہنچ بھی گئے تھے۔ ہمارا آمنا سامنا بھی ہوا۔ لیکن.....''

ماری کے الفاظ اُس کا ساتھ نہ دے رہے تھے۔ وہ ہر بات ایک ساتھ ہی کہہ دینا چاہتی تھی۔ ''آیا صوفیاء'' پر سکوت طاری تھا۔ ماری کے کمرے میں چھوٹے شعلے کی مشعل روشن تھی۔ ماری کے رخسار آنسوؤں سے تر تھے۔ اور قاسم کے ہونٹوں پر ایک عارفانہ مسکراہٹ تیر رہی تھی۔ اُس نے ماری سے کہا۔

''ماری! اب بھول جاؤ..... جو وقت گزر گیا اُسے یاد کر کے رونا لا حاصل ہے۔ میں آ گیا ہوں۔ میں تمہیں لینے کے لئے آیا ہوں۔ مجھے معلوم ہے تم نے بہت دُکھ اٹھائے۔ ابھی ہمیں بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ ایک دوسرے کو بہت کچھ بتانا ہے اور بہت کچھ سننا ہے۔ لیکن یہ باتیں یہاں نہیں ہو سکتیں۔ شاگال ہمارا دشمن ہے۔ وہ میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ چکا ہے۔ اس لئے یہی مناسب ہے کہ ہم یہاں سے فی الفور نکل جائیں۔''

لیکن ماری تو قاسم کی خوشبو میں مست تھی۔ اُسے اپنی آنکھوں اور اپنے کانوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔ وہ گھڑی گھڑی عہد رفتہ کی یادوں میں کھو جاتی۔ قاسم کو اپنے قریب بیٹھے دیکھ کر اُسے سب کچھ بھول گیا۔ وہ بار بار جذباتی ہو جاتی اور قاسم کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر رونے لگتی۔ اُس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

''قاسم! اب میں آپ سے جدا نہیں ہونا چاہتی۔ میں نے سات سال سولی پر لٹک کر کاٹے ہیں۔ سکندر بیگ کی ہوس پرستانہ دست درازی سے بچنے کے لئے مجھے راہبہ بننا پڑا۔ اور سات سال تک بند کمرے میں چھپ کر نمازیں پڑھتی رہی۔ قاسم! میں مسلمان ہوں۔ میں اب بھی مسلمان ہوں۔''

اور پھر ماری پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ماری کا دل جذبات کی شدت سے لبریز تھا۔ وہ قاسم کے کندھے پر سر رکھ کر ہچکیاں لے رہی تھی۔ اس عرصہ میں نہ جانے کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ دنیا بدل گئی تھی۔ سلطان مراد خان ثانی فوت ہو گیا تھا۔ قاسم کے والدین اور بھابھی اب اس دنیا میں نہیں تھے۔ بوسنیائی شہزادی قاسم کی بیوی تھی اور ماری گزشتہ سات سال سے بظاہر عیسائی راہبہ بن کر درحقیقت شب و روز اسلامی عبادات میں مصروف رہی تھی۔ ماری کے لئے یہ ملاقات کسی معجزے سے کم نہ تھی۔ وہ روتی رہی، ہچکیاں اور سسکیاں لیتی رہی، آنسو بہاتی رہی اور بولتی رہی۔ وہ اپنے آپ ہی باتیں کر رہی تھی۔ اب قاسم پُرسکون تھا۔ وہ تمام خطرات کو نظر انداز کر کے ماری کے پہلو میں بیٹھا اُس کی باتیں سن رہا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب ماری نے قاسم کے بدن کو چھوا تھا۔ وہ ان پاکیزہ لمحات کو کھونا

نہیں چاہتا تھا۔ اب قاسم نے جانے کی بات چھوڑ دی اور خاموشی سے بیٹھا ماری کی قربت سے سرشار ہوتا رہا۔ ماری بول رہی تھی۔ لیکن اُس کے آنسو ابھی تک جاری تھے۔ وہ قاسم کو بتا رہی تھی۔

''ابوجعفر مجھے زخمی حالت میں ادرنہ سے لے کر البانیہ پہنچ گیا۔ البانیہ کے شاہی محل میں سکندر بیگ ہمارا منتظر تھا۔ پہلے پہل سکندر بیگ میرے ساتھ بہت شائستگی سے پیش آیا۔ میرے زخموں کا مناسب علاج کیا گیا، مجھے اعلیٰ سے اعلیٰ سہولت مہیا کی گئی۔ لیکن میں جانتی تھی کہ سکندر بیگ یہ سب کچھ مجھے حاصل کرنے کے لئے کر رہا ہے۔ وہ مجھے بچپن سے چاہتا تھا لیکن میں اُس کی مکروہ صورت دیکھنے کو تیار نہ تھی۔ ابوجعفر مجھے اغواء کر کے سکندر بیگ کی خدمت میں اسی لئے لایا تھا۔ وہ مجھے سکندر بیگ کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ میں نے بیماری کے دنوں میں بھی اندازہ کر لیا تھا کہ سکندر بیگ مجھے صحت یاب ہونے کے بعد ضرور حاصل کر لے گا چاہے اُسے زبردستی ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ میرے زخم اچھے ہونے لگے۔ لیکن میں دن رات یہی سوچتی رہتی کہ میں خود کو سکندر بیگ کی دست برد سے کیسے بچا سکتی ہوں؟ اور پھر بالآخر ایک روز میرے ذہن میں ایک عجیب خیال آیا۔ میں نے ابوجعفر کو بلوایا اور اُسے یہ بتایا کہ میں راہبہ بننا چاہتی ہوں، دین عیسوی کی خادمہ بننا چاہتی ہوں۔ ابوجعفر کے لئے یہ خبر چونکا دینے والی تھی۔ میرا حربہ کامیاب رہا۔ ایک راہبہ کو تو کوئی بادشاہ بھی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ اپنی آبرو اور آپ کی امانت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ رکھنے کا میرے پاس یہی ایک طریقہ تھا کہ میں راہبہ بن جاؤں۔ ابوجعفر جو درحقیقت بطریق ڈیمونان تھا، میرے اس فیصلے سے بہت مسرور ہوا۔ لیکن سکندر بیگ کے لئے میرا یہ فیصلہ کسی صورت قابل قبول نہ تھا۔ وہ میرے راہبہ بننے کا سن کر بہت برافروختہ ہوا۔ لیکن بطریق ڈیمونان، آرتھوڈکس کلیسا کا بہت بڑا پادری تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ میرے بچاؤ کے لئے سکندر بیگ سے ٹکر مول لے لے گا۔ اور پھر وہی ہوا۔ بطریق ڈیمونان نے بہت سے پادریوں کو اپنے ساتھ ملا کر سکندر بیگ کو خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔ بطریق ڈیمونان مجھے لے کر قسطنطنیہ چلا آیا اور میں یہاں ایک راہبہ بن کر رہنے لگی۔ یہاں ہر پادری اور راہب کی بری نظریں مجھ پر لگی ہوئی تھیں۔ میں نے ان نظروں اور بدکار ہاتھوں سے خود کو کس طرح بچایا یہ صرف میرا مالک ہی جانتا ہے۔ بطریق ڈیمونان مجھے یہاں لے تو آیا لیکن وہ خود بدنیت تھا۔ میں نے خود کو ڈیمونان کی ہوس سے بچانے کے لئے بوڑھے بطریق اعظم کے ساتھ منسلک کر لیا۔ بوڑھا بطریق اعظم میری عزت کو تو

کوئی نقصان نہ پہنچا سکا۔ لیکن اُس کی خوشامد اور چاپلوسی کر کے میں نے اپنی زندگی کے بہترین وقت کو ایک کمینہ فطرت شخص کے ساتھ ضائع کر دیا۔ آیا صوفیاء میں ہر شخص میرے حسن کا شکاری تھا۔ میں نے آپ کی امانت کو محفوظ رکھنے کے لئے کیا کچھ کیا، اس کا اندازہ آپ نہیں لگا سکتے۔ میں اس عرصہ میں اللہ تعالیٰ سے صرف ایک ہی دُعا کرتی رہی کہ وہ آپ کو مجھ سے ملا دے۔ آج اتنے طویل عرصے بعد میری یہ دُعا قبول ہو گئی..... قاسم اب آپ مجھے کبھی اکیلا نہ چھوڑیئے گا۔ میں آپ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔''

مارسی کی دردناک کہانی میں کھو کر قاسم کو تو یہ بھول ہی گیا کہ وہ ایک مفرور قاتل ہے اور آیا صوفیاء میں شاگال جیسے دشمن کی ناک تلے بیٹھا ہے۔ اچانک قاسم کو بہت زیادہ وقت گزر جانے کا احساس ہوا اور وہ چونکا۔ اُس نے ایک دم مارسی سے کہا۔

''مارسی! اب ہم مل چکے ہیں۔ کبھی جدا نہ ہونے کے لئے مل چکے ہیں۔ ہم بہت باتیں کریں گے۔ اس عرصہ میں ہم پر کیا بیتی سب باتیں کریں گے۔ لیکن اس وقت تم چلو۔ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی ہے اور ہم دشمن کے گھر میں موجود ہیں۔ میں داروغۂ شاگال کو قتل کر کے فرار ہوا ہوں۔ پورے شہر میں میری تلاش ہو رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم رات کی تاریکی میں یہاں سے نکل جائیں۔ ہم یہاں سے سیدھے ''ادرنہ'' جائیں گے۔ سلطانی لشکر قسطنطنیہ فتح کرنے کے لئے روانہ ہو چکا ہے۔ سلطانی لشکر ہمیں راستے میں ملے گا۔ ہمارے لئے یہاں سے فی الفور نکلنا ضروری ہے۔''

اب مارسی پوری طرح سنبھل چکی تھی۔ اُس کے دل کی بھڑاس آنسوؤں کے ساتھ نکل گئی تھی۔ مارسی نے حالات کی نزاکت کو بھانپ لیا۔ وہ فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی۔ مارسی نے اپنے کمرے سے کوئی چیز نہ اُٹھائی۔ صرف قرآنِ حکیم کا وہ نسخہ اپنے ساتھ لیا جسے گزشتہ سات سالوں سے وہ اپنے پاس چھپا کر رکھے ہوئے تھی۔ رہبانیت کی زندگی میں مارسی نے سب سے بڑا فائدہ یہی اٹھایا تھا کہ اُس نے قرآنِ حکیم کو ازبر کر لیا تھا۔ اب اس عظیم کتاب کا ایک ایک لفظ اُس کے ذہن میں محفوظ تھا۔ باالفاظِ دیگر اب وہ قاریہ تھی۔ نکلنے سے پہلے مارسی نے قاسم سے پوچھا۔

''قاسم! ہمیں کس طرف سے نکلنا ہے؟ سیدھے راستے سے باہر جانا تو ہمارے لئے ممکن نہیں۔ ہم عقبی سیڑھیوں سے اُتر کر پائیں باغ کے راستے سے باہر نکل سکتے ہیں۔ اس راستے سے فرار ہونے کے لئے ہمیں ''آیا صوفیاء'' کا عقبی دروازہ کھلوانا ہو گا یا پھر دیوار عبور کرنی ہو گی۔ لیکن دیوار بہت بلند ہے۔''

قاسم نے مارسی کی بات کو غور سے سنا۔ وہ خود بھی عقبی راستے سے جانا چاہتا تھا..... آیا تو وہ سیدھے راستے سے تھا۔ لیکن وہ جس وقت آیا صوفیاء میں داخل ہوا تھا اُس وقت چرچ کے دروازے کھلے تھے۔ قاسم نے رات کے پہلے پہر تک آیا صوفیاء کے اندر چھپ کر وقت گزارا تھا۔ لیکن اب تو سچ مچ اُسے عقبی راستے کی ضرورت تھی۔ قاسم اور مارسی اپنے چہروں کو چھپائے راہداری میں آ گئے۔ وہ انتہائی دبے قدموں چل رہے تھے۔ قاسم کو ہر قدم پر شاگال کے ساتھ ٹکرانے کا خطرہ تھا۔ یہ آیا صوفیاء کی عمارت تھی۔ عیسائیوں کا مذہبی مرکز۔ یہاں قدم قدم پر قاسم کے لئے موت منہ کھولے کھڑی تھی۔ اور اب تو مارسی کے لئے بھی واپسی کا کوئی راستہ نہ تھا۔ کیونکہ وہ ایک مسلمان جاسوس کے ساتھ فرار ہو رہی تھی۔ وہ دونوں پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے عقبی سیڑھیوں تک پہنچ آئے۔ قاسم ہر زینے پر یوں احتیاط کے ساتھ قدم رکھ رہا تھا جیسے بے احتیاطی ہوئی تو سانپ ڈس لے گا۔ اب قاسم نے اپنی تلوار ہاتھ میں لے لی تھی اور اُس کے اعصاب بری طرح تنے ہوئے تھے۔ وہ کامیابی کے ساتھ سیڑھیاں اُتر کر پائیں باغ میں آ گئے۔ یہ آیا صوفیاء کے پہلو میں کئی سو گز لمبا چوڑا ایک بڑا پائیں باغ تھا۔ زمین پر سبز گھاس کا فرش تھا اور گھنے درخت قطاروں کی صورت میں لگے ہوئے تھے۔ درختوں کے بیچوں بیچ ایک راستہ عقبی دیوار کی طرف چلا گیا تھا۔ قاسم اور مارسی اُسی راستے پر چلنے لگے۔ دونوں طرف گھنے سایہ دار درخت رات کی تاریکی میں ابوالہول کے مجسمے لگ رہے تھے۔ قاسم اور مارسی تیز قدموں کے ساتھ چلتے ہوئے گھنے درختوں کے نیچے آ گئے۔ لیکن پھر قاسم کو ایک دم رُک جانا پڑا۔

سامنے شاگال کھڑا تھا..... گنجا بطریق..... اُس کا ہٹا کٹا وجود ایک دیوار کی طرح قاسم اور مارسی کے راستے میں حائل تھا۔ قاسم نے مارسی کو فوراً اپنی پشت پر کر لیا اور خود تلوار لہراتا ہوا شاگال پر حملہ آور ہونے کے لئے آگے بڑھا۔ لیکن شاگال بے فکر کھڑا مسکراتا رہا۔ اُس کے چہرے پر مسکراہٹ بہت مکروہ دکھائی دیتی تھی۔ قاسم ابھی ایک قدم ہی آگے بڑھ پایا تھا کہ شاگال کی آواز اُس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''وہیں رُک جاؤ! تم یہاں سے اس غدار حسینہ کو لے کر فرار نہیں ہو سکتے۔ یہاں کا ہر ایک ذرہ تمہارے راستے میں دیوار کی طرح حائل ہو جائے گا۔ لیکن تم اگر چاہو تو اپنی زندگی بچا سکتے ہو۔ اس کے لئے تمہیں صرف مقدس نقشے کا پتہ بتانا ہو گا۔''

اب قاسم کو مقدس نقشہ یاد آیا۔ شاگال دوسری مرتبہ مقدس نقشے کی بابت پوچھ رہا تھا۔ آخر ایسی کون سی چیز تھی جس کے لئے شاگال قاسم کو زندگی بخش رہا تھا؟ قاسم کے دل میں

مقدس نقشے کے لئے بہت زیادہ تجسس پیدا ہو گیا اور اُس نے حملہ کرنے سے پہلے مقدس نقشے کے بارے میں کچھ اور جاننا چاہا۔ اُس نے شاگال سے سوال کیا۔

''مقدس نقشے میں کیا ہے؟..... کیا تم مجھے بتا سکتے ہو؟ کیونکہ میرے پاس اگر کوئی چیز ہے بھی تو میں اُس کے بارے میں نہیں جانتا۔''

''تم سب کچھ جانتے ہو۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ مقدس نقشہ تمہارے پاس ہے اور تم ہی نے نوٹاراس کو مقدس نقشہ چوری کرنے پر اُکسایا تھا۔ مقدس نقشہ اس وقت اپنی جگہ پر نہیں۔ لہٰذا صاف ظاہر ہے کہ وہ تمہارے پاس ہے۔ تم اگر مقدس نقشہ میرے حوالے کر دو تو میں تمہارے سارے گناہ معاف کر سکتا ہوں۔''

قاسم کا تجسس اب بہت زیادہ بڑھ گیا۔ کیونکہ جو کچھ شاگال کہہ رہا تھا قاسم کے لئے نیا تھا۔ قاسم نے سپہ سالار نوٹاراس کو ورغلانے کی کوشش ضرور کی تھی لیکن قاسم کسی مقدس نقشے کے بارے میں نہیں جانتا تھا۔ قاسم نے شاگال کو مخاطب کر کے سنجیدگی سے کہا۔

''شاگال! میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔ تمہارا نقشہ میرے پاس نہیں۔ اگر تم نے میرا راستہ روکنے کی کوشش کی تو میں بخوشی تمہارا قصہ پاک کر دوں گا۔''

قاسم نے یہ کہتے ہوئے تلوار لہرائی اور آگے بڑھنا چاہا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ آگے بڑھتا اُس کے دائیں بائیں اور پیچھے سے تین چھوٹی جسامت کے درخت اپنی جگہ سے حرکت کر کے آگے بڑھ آئے۔ قاسم اور ماری دہل گئے۔ گھنی جھاڑیاں خود بخود کیوں چلنے لگی تھیں؟..... ہاں، یہ جھاڑیاں ارنڈ کے چھوٹے چھوٹے درخت تھے۔ لیکن درحقیقت ان کے پیچھے شاگال کے پراسرار سپاہی چھپے ہوئے تھے۔ شاگال کے سپاہیوں نے اپنے ہاتھوں میں پکڑے انجیر کے تنے ایک طرف پھینکے اور تلواریں سونت کر قاسم پر حملہ آور ہو گئے۔ یہ نئے سپاہی تھے۔ تینوں کا لباس راہبوں جیسا تھا اور اُن کے سر گنجے تھے۔ اُن کے جسم شاگال کی طرح ہٹے کٹے اور مضبوط تھے۔ اور قاسم کو پہلے ہی حملے میں اندازہ ہو گیا کہ تینوں سپاہی تلوار چلانے کے فن میں مشاق تھے۔ قاسم نے تین تلواروں کو اپنی شمشیر پر روکا اور اُن کے ساتھ مبارزت میں مصروف ہو گیا۔ آیا صوفیاء کا عقبی ماحول تلواروں کی سنسناہٹ سے گونج اُٹھا۔ قاسم کئی ماہ کی قید سے نکلا تھا اور شمشیر زنی کی مشق سے دُور رہا تھا۔ جبکہ یہ تینوں بہت ماہر اور طاقتور تلوار باز تھے۔ چنانچہ قاسم کو تین مضبوط تلواروں کا سامنا کرتے دانتوں پسینہ آ گیا۔ دشمن کا ہر وار کاری اور قوت سے بھرپور تھا۔ قاسم اُچھل اُچھل کر خود کو بچا رہا تھا اور بری طرح مشکلات کا سامنا کر رہا تھا۔ آج زندگی میں پہلی بار قاسم کو احساس

ہوا کہ وہ شمشیر زنی کا یہ مقابلہ ہار جائے گا۔ لیکن پھر قاسم نے اپنے دل کو تسلی دی اور یہ سوچ کر کہ شہادت عظیم ہے..... بے پرواہ ہو کر لڑنے لگا۔ قاسم کی تلوار وار پہ وار روک رہی تھی اور قاسم خود ایک قدم سے دوسرے اور دوسرے قدم سے تیسرے قدم تک دشمن کے وار سے خود کو بچاتا پھر رہا تھا۔ طویل کشمکش کے بعد قاسم کا ایک مجازی داؤ چل گیا۔ وہ ایک دم پیروں کے مل زمین پر آ بیٹھا اور آنِ واحد میں ایک سپاہی کی ٹانگیں کاٹ دیں۔ اگلے لمحے وہ اُچھل کر باقی دو سپاہیوں کی تلواروں سے خود کو بچا چکا تھا۔ اب اُس کے سامنے دو دشمن تھے۔ اس قدر سرد رات میں قاسم کا پورا جسم پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ ایک دم قاسم کو یوں محسوس ہوا جیسے ماری اور شاگال اپنی جگہ پر موجود نہیں ہیں..... ماری کی عدم موجودگی محسوس کر کے قاسم کا دماغ غیض و غضب سے بھر گیا۔ وہ کسی وحشی کی طرح غرایا اور دیوانہ وار دونوں تلوار بازوں پر ٹوٹ پڑا۔ قاسم کا یہ انداز اُن کے لئے غیر متوقع تھا۔ چنانچہ وہ گھبرا گئے اور قاسم اُن پر چھاتا چلا گیا۔ قاسم نے ایک ایک کر کے دونوں سپاہیوں کی گردن کاٹ دی۔ لیکن ماری کو وہ پھر کھو چکا تھا۔

قاسم لڑائی سے فارغ ہوا تو بطریق شاگال اور ماری دونوں غائب تھے۔ یقیناً شاگال، ماری کو لے گیا تھا۔ قاسم کو خیال آیا کہ ماری کے پاس قرآنِ حکیم بھی ہے۔ گویا ماری کی سات سالہ تپسیا کا پول کھل جائے گا اور سب کو معلوم ہو جائے گا کہ ماری راہبہ نہیں بلکہ مسلمان جاسوسہ ہے۔ قاسم پریشان ہو گیا۔ اُسے خیال آیا کہ شاگال، ماری کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرے گا۔ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ تمام چرند پرند اپنے ٹھکانوں میں سردی سے ٹھٹھرے سو رہے تھے۔ لیکن آیا صوفیاء کے عقب میں قاسم اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھ رہا تھا۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے..... کہ اُسے آیا صوفیاء کی عمارت کی جانب سے کئی سپاہیوں کے آنے کی آوازیں سنائی دیں۔ اب قاسم کے لئے یہاں رُکنا حماقت ہی تھی۔ قاسم نے ایک لمحے میں فیصلہ کیا اور کسی چھلاوے کی طرح درختوں کے بیچوں و بیچ دوڑتا ہوا آیا صوفیاء کی بیرونی فصیل تک پہنچ گیا۔ قاسم نے ایک لمحے کی دیر بھی نہ کی اور فصیل کے ساتھ ساتھ اُگے انجیر کے درختوں میں سے ایک اُونچے درخت کا انتخاب کر کے اُس پر چڑھنے لگا۔ اب وہ ماری کے بغیر ہی آیا صوفیاء سے فرار ہو رہا تھا۔ ماری اُس سے مل کر پھر بچھڑ گئی تھی۔ لیکن اس وقت قاسم کا یہاں سے فرار ہونا بہت ضروری تھا۔ چنانچہ کچھ دیر بعد آیا صوفیاء کے محافظوں اور نگرانوں نے چرچ کا کونا کونا چھان مارا لیکن اب قاسم بن ہشام اُن کے ہاتھ آنے والا نہیں تھا۔

اور پھر اگلے روز قاسم ایک یونانی سپاہی کے لباس میں ''رومیل'' کے گھر کے سامنے نمودار ہوا۔ یہاں وہ بریٹا سے ملنے کے لئے آیا تھا۔ اُس کے جسم پر شاہی محافظ دستے کا سا لباس تھا جس کی وجہ سے وہ آسانی سے پہچانا نہ جا سکتا تھا۔ کیونکہ قاسم کے سر پر ایک بڑا آہنی خود تھا جس کے کناروں پر آہنی زنجیریں لٹک رہی تھیں۔ اور جھالر نما چیزوں نے قاسم کا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ قاسم کی کمر کے ساتھ صلیب نما شمشیر لٹک رہی تھی۔ اُس نے آگے بڑھ کر ''بریٹا'' کے گھر کے دروازے پر دستک دی۔ بریٹا گھر میں ہی موجود تھی۔ قاسم کی دستک پر دروازہ کھولنے کے لئے آئی اور دروازہ کھولتے ہی اپنی جگہ پر ہکا بکا کھڑی ہو گئی۔ اُس کا منہ بولا بھائی کئی ماہ کی قید کے بعد اُس کے سامنے تھا۔ بریٹا نے قاسم کو دیکھا اور جذبات سے لبریز لہجے میں کہا۔

''تم؟.....تم یہاں کیسے؟.....تم تو جیل میں تھے۔''

بریٹا کے چہرے پر خوشی، حیرت اور خوف کے ملے جلے جذبات تھے۔ وہ قاسم کو سپاہیانہ لباس میں دیکھ کر سمجھ گئی کہ قاسم نے بھیس بدل رکھا ہے۔ قاسم نے کسی قدر مسکراتے ہوئے کہا۔

''بریٹا بہن!.....کیا تم اپنے بھائی کو اندر آنے کے لئے نہیں کہو گی؟''

قاسم کے لہجے میں نہ جانے کیا بات تھی کہ بریٹا فوراً پسیج گئی اور تیزی سے قاسم کو دروازہ کھول کر اندر بلا لیا۔ رومیل گھر پر نہیں تھا اور یہی بات معلوم کر کے قاسم بریٹا سے ملنے کے لئے آیا تھا۔ قاسم اندر آیا تو اُس کے بولنے سے پہلے بریٹا خود بول اُٹھی۔

''بھیا! تمہیں یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ رومیل تم سے بہت ناراض ہیں۔ اگر انہیں پتہ چل گیا کہ تم یہاں آئے ہو تو وہ تمہیں بے دھڑک گرفتار کروا دیں گے۔''

قاسم، بریٹا کی بات سن کر مسکرایا اور بولا۔ ''مجھے معلوم ہے۔ اسی لئے تو میں تم سے ملنے کے لئے اس وقت آیا ہوں جب رومیل گھر پر نہیں ہے۔''

بریٹا قاسم کو پیار بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اُس نے قاسم کو بھائی بنایا تھا اور جس روز قاسم اُس کے گھر سے رخصت ہوا تھا، وہ بہت روئی تھی۔ آج قاسم کو اپنے سامنے دیکھ کر اُس کے آنسو پھر اُمڈ آئے۔ لیکن اُس نے تیزی سے آنکھیں پونچھتے اور مسکراتے ہوئے کہا۔

''بھیا! میں کل تمہاری ماری سے مل آئی ہوں۔ وہ تم سے بہت پیار کرتی ہے۔ میں جتنی دیر اُس کے پاس رہی وہ تمہیں یاد کر کے آنسو بہاتی رہی۔ میں نے اُس کو اُسی انگوٹھی سے پہچانا تھا جو ایک دن کے لئے تم نے مجھے پہنائی تھی۔ بھیا! ماری تمہیں بہت چاہتی ہے۔''

قاسم، بریٹا کی بات سن کر ششدر رہ گیا۔ یہ کیا ماجرا تھا؟ کیا بریٹا کسی اور کو ماری سمجھ رہی تھی؟ کیونکہ ماری کی انگوٹھی تو چرچ کی خادمہ سونیا کے ہاتھ میں تھی۔ ہاں، یقیناً بریٹا سونیا کو ہی سسٹر میری سمجھ بیٹھی تھی۔ قاسم بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔ لیکن سونیا کے بارے میں جان کر اُس کے دل کو صدمہ پہنچا۔ وہ نادانستگی میں سونیا کا دل دُکھا بیٹھا تھا۔ آج وہ بریٹا کو ملنے بھی اسی غرض سے آیا تھا کہ وہ ماری کا کھوج لگانے میں اُس کی مدد کر سکے۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ بریٹا تو چرچ کی خادمہ سونیا کو سسٹر میری سمجھ بیٹھی تھی۔ معاً قاسم کے ذہن میں ایک خیال آیا اور اُس نے بریٹا سے کہا۔

''بریٹا بہن! تم جس لڑکی سے ملی ہو کسی طرح مجھے بھی اُس سے ملوا دو۔ میں آیا صوفیاء نہیں جا سکتا، لیکن تم جا سکتی ہو۔ میں تمہارے پاس اسی غرض کے تحت آیا ہوں۔ میں اپنی ماری کو حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ تم نے جہاں مجھ پر اتنی مہربانیاں کی ہیں، ایک مہربانی اور کر دو اور مجھے اُس انگوٹھی والی لڑکی سے ملوا دو۔''

بریٹا تو پہلے ہی اپنے محسن اور منہ بولے بھائی پر قربان ہوئی جا رہی تھی۔ اُس نے فوراً ہامی بھر لی۔ لیکن قاسم سے یہ سوال کر دیا۔

''بھیا! تم اُس سے ملو گے کہاں؟ اس شہر میں تو تمہارے لئے ہر جگہ خطرہ ہے.....''

قاسم نے تیزی سے بریٹا کی بات کاٹ دی اور کہا۔ ''ملنے کی جگہ میں نے پہلے سے سوچ رکھی ہے.....تم اُسے قدیم بازنطینی کھنڈرات کا پتہ بتا کر کہو کہ میں سورج غروب ہونے سے ایک گھنٹہ پہلے انہی کھنڈرات میں اُس کا انتظار کروں گا۔''

یہ کھنڈرات اگرچہ شہر کے وسط میں تھے لیکن کوئی اُن کی طرف نہ جاتا تھا۔ قاسم نے اسی لئے قدیم بازنطینی کھنڈرات کا ذکر کیا تاکہ وہ سب کی نظروں سے بچ کر سونیا سے مل سکے۔ اُس نے دل میں سوچ رکھا تھا کہ وہ سونیا کو سب کچھ بتا دے گا اور سونیا کی غلط فہمی پر اُس سے معافی مانگے گا۔ اُس نے یہ بھی سوچ رکھا تھا کہ وہ ماری کے بارے میں بات بھی سونیا کے ساتھ ہی کرے گا۔ بریٹا اپنے منہ بولے بھائی قاسم سے بہت محبت کرتی تھی۔ وہ اس سے پہلے بھی قاسم کے لئے بات کر چکی تھی۔ اس مرتبہ بھی بریٹا نے قاسم کے لئے ہامی بھر لی اور فی الفور آیا صوفیاء جانے کے لئے تیار ہو گئی۔

غروبِ آفتاب سے پہلے قدیم بازنطینی کھنڈرات کی ٹوٹی پھوٹی دیواروں اور تاریک پیڑوں کے نیچے ساری دنیا سے دُور اور چھپ کر قاسم آیا صوفیاء کی خادمہ سونیا کے ساتھ ملاقات کر رہا تھا۔ سونیا کی اُنگلی میں ماری کی انگوٹھی تھی اور آنکھوں سے زمرد کے موتیوں کی

لڑی جاری تھی۔ وہ نہ سسکیاں لے رہی تھی نہ ہچکیاں۔ صرف آنسو بہا رہی تھی۔ اُسے گلہ تھا، شکوہ تھا اپنے محبوب سے جس نے اُس کا دل توڑا تھا۔ اور آج وہ اپنے محبوب کے سامنے بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ قاسم نے سونیا سے بار بار معافی مانگی۔ اُس نے سونیا کو شروع سے آخر تک اپنی زندگی کی تمام داستان سنائی اور سونیا کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اُسے پوری تاکید کے ساتھ کہا۔

''سونیا! تمہیں یاد ہے میں نے تم سے کہا تھا کہ میں تم سے روحانی محبت کر سکتا ہوں، جسمانی محبت نہیں۔ تم مجھے بہت عزیز ہو۔ میرے دل میں تمہارے لئے بہت جگہ ہے۔ میں تمہیں اپنے ساتھ لئے بغیر قسطنطنیہ سے نہیں جاؤں گا..... لیکن میں تم سے شادی نہیں کر سکتا..... ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔''

سونیا کو تو سب باتیں پہلے سے معلوم ہو چکی تھیں۔ وہ بریٹا کی زبانی حقیقت جان چکی تھی۔ اُس نے جس قدر رونا تھا، اب تک رو لیا تھا۔ آج تو وہ خوش تھی کہ اُس کا محبوب جسے وہ دیوانہ وار چاہتی تھی اُس کے سامنے بیٹھا تھا۔ سونیا نے مسکراتے ہوئے قاسم کی بات کا جواب دیا۔

''میرے جسم و جان کے مالک!..... مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں۔ تقدیر نے ہی میرے حصے میں یہ درد اور غم لکھ دیئے ہیں۔ آپ تو میرے محسن ہیں۔ میری زندگی بدل چکی ہے۔ اب میں کسی کی داشتہ نہیں۔ آپ کی محبت اور یہ انگوٹھی ہی اب میری زندگی کے سہارے ہیں۔ میں آپ کا انتظار کروں گی۔ آپ جب بھی مجھے لینے کے لئے آئیں گے، اپنا منتظر پائیں گے۔''

سونیا کی باتوں سے قاسم کے دل کو دھکا لگا۔ لیکن وہ کیا کر سکتا تھا؟ آنسو پی کر رہ گیا۔ سونیا کے ساتھ قاسم کی ملاقات خاصی طویل رہی۔ قاسم سے سونیا کو سسٹر میری کے اغوا کا علم ہوا تو وہ حیران رہ گئی اور اُس نے فوراً کہا کہ ماری کا کھوج چرچ کے خادم ڈیوڈ سے مل سکتا ہے۔ ڈیوڈ جو شاگال کے ساتھ اکثر لگا رہتا تھا یقیناً ماری کے بارے میں کچھ نہ کچھ بتا سکے گا۔ قاسم نے ڈیوڈ کے بارے میں سوچ کر کچھ فیصلہ کیا اور پھر سونیا سے کہا۔

''میں آج رات ایک بار پھر آیا صوفیاء میں داخل ہونا چاہتا ہوں۔ آج میں ڈیوڈ سے ملنے کے لئے وہاں آؤں گا۔ مجھے بوڑھے بطریق اعظم کے کمرے کی تلاشی بھی لینی ہے۔ سونیا! کیا تم اس سلسلے میں میری مدد کر سکتی ہو؟''

''بوڑھے بطریق اعظم کے کمرے کی تلاشی؟..... لیکن کیوں؟''

''مجھے ایک نقشے کی تلاش ہے..... مقدس نقشے کی۔''

''مقدس نقشہ؟..... لیکن وہ تو بطریق کے پاس نہیں۔ وہ تو کسی اور کے پاس ہے مقدس نقشے کے بارے میں آپ کو صرف میں بتا سکتی ہوں، بطریق اعظم کچھ نہیں بتا سکتا۔''

قاسم کی توقع کے بالکل برعکس سونیا جیسی معمولی خادمہ کے منہ سے مقدس نقشے کا ذکر سن کر قاسم کے دیدے پھٹنے لگے۔

''کیا؟..... کیا تم جانتی ہو مقدس نقشے کے بارے میں؟ لیکن کیسے؟ اتنی اہم چیز کے بارے میں تم کیسے جانتی ہو؟''

سونیا مسکرا رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر دُکھ اور حسرت کو صاف دیکھا جا سکتا تھا۔ سونیا نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مالک!..... میں سب اہم باتیں جانتی ہوں۔ مجھ سے زیادہ اہم باتیں کوئی نہیں بتا سکتا۔ کیونکہ میں سب اہم لوگوں کے بستروں پر راتیں گزار چکی ہوں..... آپ کی ملاقات سے پہلے میری ہر رات کسی بطریق یا حکومتی افسر کے بستر پر ہوتی تھی..... اسی طرح کی ایک رات جب میں نے اپنے باپ جیسے سپہ سالار نوٹاراس کے پاس گزاری تو اُس نے مجھے مقدس نقشے کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ وہ بہت شراب پیتا ہے۔ اُس نے نشے کی حالت میں مجھے بتا دیا کہ سلطنت بازنطینی کا مقدس نقشہ اُسی نے شاہی محل سے کسی طرح اڑایا۔ سپہ سالار نوٹاراس قسطنطین کا مخالف ہے۔ اُس نے مقدس نقشہ چوری کروا کے آرتھوڈکس کلیسا کے قدیم روحانی پیشوا ''مقدس بطلیموس'' کے سپرد کر دیا ہے۔ مقدس بطلیموس تارک الدنیا ہو چکے ہیں۔ اور گزشتہ بیس سال سے ''برج غلاطہ'' کی آٹھویں منزل پر تجرد کی زندگی گزار رہے ہیں۔ سپہ سالار نوٹاراس، مقدس بطلیموس کو آرتھوڈکس کلیسا کا محافظ سمجھتا ہے اور قسطنطین کو اپنے فرقے کا دشمن۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے مقدس نقشہ شاہی محل سے اُڑا کر برجِ غلاطہ پر مقدس بطلیموس کے حوالے کر دیا ہے اور دنیا میں یہ بات سپہ سالار نوٹاراس اور مقدس بطلیموس کے علاوہ صرف آپ کی اس خادمہ کو معلوم ہے۔ لیکن میں نے یہ پوچھنے میں کوئی دلچسپی نہ لی تھی کہ مقدس نقشہ درحقیقت ہے کیا چیز؟''

سونیا نے تفصیل کے ساتھ مقدس نقشے کے بارے میں بتایا تو قاسم حیرت سے ساکت و جامد رہ گیا۔ اُس کے دل میں خوشی کے لڈو پھوٹ رہے تھے اور وہ سوچ رہا تھا کہ چرچ کی معمولی خادمہ سونیا اُس کے لئے کتنی غیر معمولی اور اہم ثابت ہوئی۔ اب اُسے شاگال کی بات یاد آئی۔ شاگال نے کہا تھا کہ مقدس نقشہ سپہ سالار نوٹاراس نے چوری کیا ہے۔

شاگال کو شک تھا کہ سپہ سالار سے وہ نقشہ قاسم نے حاصل کر لیا ہوگا۔ قاسم کا جی چاہا کہ وہ اُٹھ کر سونیا کے ان خوبصورت ہونٹوں پر بوسہ دے جنہوں نے قاسم کی بہت بڑی مشکل آسان کر دی تھی۔ وہ کتنا خوش نصیب تھا کہ شاگال سے بھی پہلے اُس نے مقدس نقشے کے بارے میں معلومات حاصل کر لی تھیں۔ اور اب وہ سوچ رہا تھا کہ آج آنے والی ایک ہی رات میں وہ ڈیوڈ اور مقدس بطلیموس دونوں سے ملاقات کر لے۔ قاسم نے سورج غروب ہونے کے بعد سونیا کو رخصت کیا اور خود قدیم بازنطینی کھنڈرات سے نکل کر قسطنطنیہ شہر کے بازار میں پیدل چلنے لگا۔ اُس کے بدن پر ابھی تک یونانی سپاہی کا لباس تھا اور وہ بے پرواہانہ انداز میں چل رہا تھا۔ اب اُسے اپنے آئندہ مشن کے لئے تیاری کرنا تھی۔ چنانچہ وہ سیدھا قسطنطنیہ کے ایک قدیم محلے کی جانب بڑھتا چلا گیا۔ قسطنطنیہ کے اس محلے میں شیخ صلاح الدین کا گھر تھا اور شیخ صلاح الدین جو عرب تاجر کی حیثیت سے ''محمد اوّل'' کے زمانے سے قسطنطنیہ میں مقیم تھا، اندرونِ خانہ عثمانی سلطنت کا خیر خواہ اور مخبر تھا۔ اس سے پہلے بھی قاسم وقتاً فوقتاً شیخ صلاح الدین سے چھوٹے چھوٹے کام لیتا رہا تھا۔

قاسم شیخ صلاح الدین کے مہمان خانے میں بیٹھا اُس کا انتظار کر رہا تھا کہ شیخ صلاح الدین داخل ہوا۔ اُس نے قاسم کو دیکھا اور پُرتپاک انداز میں قاسم سے ملاقات کی۔ اُس نے قاسم کو نئے مشن کے لئے ضروری سامان فراہم کیا اور یہ بھی بتایا کہ اُس کے نام سلطان محمد خان کا ایک پیغام ہے۔

''پیغام؟'' قاسم نے انتہائی حیرت سے سوال کیا۔

''ہاں!..... وہ پیغام کئی روز پہلے مجھ تک پہنچا تھا۔ لیکن میں آپ کا سراغ کہیں نہ پا سکتا تھا..... سلطان کا پیغام یہ ہے کہ آپ کو جونہی موقع ملے سلطان محمد خان کی خدمت میں حاضر ہوں۔''

''بس! کیا اتنا سا پیغام ہے؟''

''ہاں!..... صرف اتنا سا پیغام ہے..... اور اب آپ زیادہ دیر یہاں مت رُکئے۔ کیونکہ شہر بھر کی پولیس آپ کو ڈھونڈنے پر لگی ہوئی ہے۔''

قاسم شیخ صلاح الدین کے گھر سے جلد ہی نکل آیا اور اپنے آئندہ منصوبہ پر عمل کرنے کے لئے ان دیکھی راہوں پر چل دیا۔

✪

آیا صوفیاء کے خادم ڈیوڈ کے خراٹے اُس کے کمرے میں گونج رہے تھے۔ قاسم نے

اپنی تلوار کی نوک اُس کے سینے میں چبھوئی تو وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ ابھی رات کا پہلا پہر ہی جاری تھا کہ قاسم، ڈیوڈ کے سر پر سوار ہو چکا تھا۔ ڈیوڈ نے قاسم کو دیکھا تو چلانے کی کوشش کی۔ لیکن اُس کی آواز گلے میں پھنس گئی۔ قاسم کی تیز دھار تلوار اُس کے سینے پر تھی۔ وہ گھگھیانے لگا۔ قاسم نے اپنی خونخوار نگاہیں ڈیوڈ کی آنکھوں میں گاڑ کر غراتے ہوئے کہا۔

''معافی چاہتے ہو تو سسٹر میری کے بارے میں بتاؤ! سچ سچ بتاؤ، شاگال سسٹر میری کو کہاں لے گیا ہے؟''

ڈیوڈ کی آنکھیں ضرورت سے زیادہ پھٹی ہوئی تھیں۔ موت کا خوف اُس کے سر پر سوار تھا۔ لیکن وہ مارسی کے بارے میں پھر بھی نہ بتانا چاہتا تھا..... ڈیوڈ، شاگال کا خاص آدمی تھا اور اتنی آسانی سے قاسم کے ہاتھ آنے والا نہیں تھا۔ قاسم نے ڈیوڈ کے سینے پر تلوار کی نوک کا دباؤ بڑھاتے ہوئے دوبارہ پوچھا۔

''بتاؤ! ورنہ ایسی موت ماروں گا کہ نہ جی سکو گے اور نہ مر سکو گے۔''

ڈیوڈ خوف سے کانپ رہا تھا، لیکن چپ تھا۔ اُس کا رنگ فق اور آنکھوں کے دیدے اوپر چڑھتے جا رہے تھے۔ قاسم نے ایک لمحے میں فیصلہ کیا اور پھر اگلے لمحے اُس کی شمشیر بجلی کی طرح ہوا میں چمکی اور ڈیوڈ کا بایاں کان اُس کے سر سے الگ ہو گیا۔ ڈیوڈ کا کان کٹ کر دُور جا گرا تھا اور تلوار پھر اپنی جگہ یعنی ڈیوڈ کے سینے پر آ چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ ڈیوڈ چیختا، قاسم کا بایاں ہاتھ اُس کے جبڑوں کو جکڑ چکا تھا۔ قاسم کے سر پر خون سوار تھا اور اُس کی آنکھوں میں ڈیوڈ کی موت صاف پڑھی جا سکتی تھی۔ اب قاسم نے کسی خونخوار بھیڑیئے کی طرح غراتے ہوئے کہا۔

''جلدی بتاؤ! شاگال، سسٹر میری کو کہاں لے گیا ہے؟ ورنہ ایک ایک کر کے تمہارے تمام اعضائے بدن کاٹ ڈالوں گا۔''

قاسم نے ڈیوڈ کے منہ سے ہاتھ ہٹا لیا۔ اب ڈیوڈ کی تمام ہمت جواب دے چکی تھی۔ اُس نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے قاسم سے زندگی کی بھیک مانگی۔

''خدا کے لئے مجھے کچھ مت کہو! میں بتاتا ہوں..... میں تمہیں بتاتا ہوں کہ بطریق شاگال، سسٹر میری کو کہاں لے گیا ہے..... بطریق شاگال، سسٹر میری کو کالے جہاز پر لے گیا ہے۔ ہاں وہ جہاز کالا ہے۔ اُس کی ساری لکڑی کالی ہے۔ یہ بطریق شاگال کا اپنا بحری جہاز ہے۔ بطریق شاگال کا جہاز زیادہ دُور نہیں ہوگا۔ درِ دانیال کے پانی میں یا ''بحر مارمورا'' کے اسی ساحل پر لنگر انداز ہوگا۔ بطریق شاگال کے سپاہی بہت خطرناک ہیں۔

وہ مجھے جان سے مار دیں گے..... اوہو! میں نے تمہیں راز بتا کر اپنی موت خرید لی ہے۔"

ڈیوڈ موت کے ڈر سے عجیب عجیب باتیں کرنے لگا تھا۔ قاسم کو ڈیوڈ کی بات پر یقین نہ آیا تو اُس نے سانپ کی طرح پھنکارتے ہوئے کہا۔

"تم جھوٹ بکتے ہو..... یہ جہاز والی بات جھوٹ ہے۔"

"نہیں نہیں، خداوند یسوع مسیح کی قسم! میں سچ کہہ رہا ہوں..... ہائے میرا کیا ہوگا؟ میرے لئے تو ہر طرف موت ہے۔"

ڈیوڈ بری طرح ڈر رہا تھا۔ قاسم نے سوچا کہ کیوں نہ ڈیوڈ کو اس تکلیف دہ زندگی سے آزادی دیدے۔ چنانچہ قاسم کی تلوار ایک بار پھر صاعقہ کی طرح کوندی اور ڈیوڈ کا سر اُس کے تن سے الگ ہوگیا۔ اب قاسم کے لئے مزید یہاں رُکنا غیر ضروری تھا۔ چنانچہ اُس نے اپنی تلوار نیام میں ڈالی اور ڈیوڈ کے کمرے کا دروازہ کھول کر دھیرے سے باہر نکل آیا۔ آج وہ آیا صوفیاء میں کسی چھلاوے کی طرح داخل ہوا تھا۔ ڈیوڈ کے کمرے سے نکل کر وہ دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے عقبی زینے تک پہنچا۔ لیکن یہاں پہنچ کر وہ رُک گیا۔

سونیا اُس کے سامنے کھڑی تھی۔ آج قاسم آیا صوفیاء سونیا سے ملنے کے لئے نہ آیا تھا۔ وہ تو آج ڈیوڈ پر قہر بن کر ٹوٹا تھا۔ اُس کے پاس وقت کی کمی تھی۔ وہ ایک رات میں برج غلاطہ کا کام بھی نمٹانا چاہتا تھا۔ سونیا کو دیکھ کر وہ ٹھٹھک گیا اور تیزی سے بولا۔

"سونیا!..... میں نے ڈیوڈ کو اس دنیا کی تکلیف دہ زندگی سے نجات دے دی ہے..... لیکن تم اس وقت یہاں کیوں آئی ہو؟ میرے ساتھ اگر کسی نے تمہیں دیکھ لیا تو تمہارے لئے بہت بڑی مشکل کھڑی ہوسکتی ہے۔"

لیکن سونیا پر قاسم کی بات کا کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑی رہی۔ قاسم آگے بڑھا اور سونیا کے بالکل نزدیک پہنچ کر قاسم نے سونیا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے انتہائی نرم لہجے میں کہا۔

"سونیا! میں نے تم سے وعدہ کیا ہے نا کہ میں آؤں گا۔ تم اپنے خداوند سے میرے لئے دُعا کرنا کہ مجھے اپنے مقصد میں کامیابی ملے۔ تم میرا یقین کرو۔ میں ضرور آؤں گا۔"

لیکن آج سونیا کی آنکھوں میں کچھ اور ہی بات تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ارض و سماوات کی تمام تر حسرت و یاس اُس کی نگاہوں میں سمٹ آئی ہو۔ سونیا کے چہرے پر کسی پہاڑ کی اُداس شام اُتر آئی تھی۔ اُس کی آنکھیں خشک تھیں اور لب خاموش۔ وہ دیر تک قاسم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہ جانے کیا دیکھتی رہی۔ اور پھر ایک دم راستے سے ہٹتے

ہوئے انتہائی سنجیدہ لہجے میں قاسم سے کہا۔

"آپ جائیے! آپ کو دیر ہو رہی ہے۔ میں آپ کا انتظار کروں گی۔ آپ جب بھی آئیں گے میری ان حسرت ناک نگاہوں کو اپنا منتظر پائیں گے۔ میں بھی چلتی ہوں..... شاید..... مجھے بھی دیر ہو رہی ہے۔"

سونیا کے لہجے میں نہ جانے کیا بات تھی کہ قاسم کو اپنا دل بیٹھتا ہوا محسوس ہوا۔ لیکن قاسم کے پاس حقیقی معنوں میں وقت کم تھا۔ وہ سونیا کی اندوہ ناک حالت پر غور کرنے کے لئے مزید یہاں نہ رُک سکتا تھا۔ چنانچہ قاسم نے سونیا کے کندھے پر ہلکی سی تھپکی دی اور کسی چھلاوے کی طرح زینے اُترتا چلا گیا۔

اب قاسم کو مارسی کا پتہ تو معلوم ہو چکا تھا۔ لیکن وہ محسوس کر رہا تھا کہ مارسی ایک بار پھر اُس سے دُور چلی گئی ہے۔ شاگال کا کالا جہاز کہاں تھا؟ کسی بحری جہاز کو سمندر میں ڈھونڈنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اُدھر سلطان محمد خان کا پیغام قاسم کو مل چکا تھا اور قاسم، مارسی سے زیادہ اپنے عظیم مقصد کو ترجیح دیتا تھا۔ چنانچہ قاسم نے فیصلہ کیا کہ وہ مقدس نقشہ حاصل کرتے ہی سب سے پہلے سلطان محمد خان کی خدمت میں حاضر ہوگا۔ اب قاسم شہر سے باہر جانے کے لئے تیزی کے ساتھ "گولڈن ہارن" کی سمت میں واقع فصیل شہر کے دروازے کی جانب جا رہا تھا۔ قاسم کے پاس شیخ صلاح الدین کا مہیا کیا ہوا گھوڑا تھا اور بدن پر ابھی تک قسطنطنیوی فوج کے یونانی سپاہی کا لباس تھا۔ قاسم کو معلوم تھا کہ شہر کے دروازے پر اُس سے سخت قسم کی پوچھ گچھ کی جائے گی۔ لیکن وہ ذہنی طور پر آج ہر صورت میں آخری حد تک جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اُسے سلطان محمد خان کے پاس پہنچنے کی جلدی تھی۔ وہ رات کی تاریکی میں قسطنطنیہ شہر کو تیزی کے ساتھ عبور کرتا ہوا فصیل کے دروازے تک جا پہنچا۔ فصیل کا دروازہ بند تھا۔ دروازے کی اندرونی طرف یونانی سپاہیوں کا ایک بہت بڑا دستہ موجود تھا۔ زیادہ تر فوجی ٹولیوں کی صورت میں آگ کے الاؤ جلائے بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے۔ اس عظیم الجثہ دوازے کی عمارت میں بنے دفاتر بند تھے۔ البتہ پہریدار دستے کا سپہ سالار دروازے کے نزدیک ہی ایک میز اور کرسی پر بیٹھا اکیلا شراب پی رہا تھا۔ قاسم جونہی دروازے کی برآمدہ نما عمارت کے احاطے میں داخل ہوا۔ اُس کے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سن کر تمام سپاہی چونک گئے۔ دستہ سالار بھی شراب کی بوتل ایک طرف رکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ یوں آدھی رات کے وقت کسی شہسوار سپاہی کا جنگ کے ان ایام میں اس طرف آنا اگرچہ معمولی بات تھی لیکن پھر بھی پہریدار دستے کے سپاہیوں کا چونکنا

قاسم کا دل دہلانے کے لئے کافی تھا۔ پہریدار دستے کا سالار قاسم کو دیکھتے ہی آگے بڑھا اور قاسم کے کچھ کہنے سے پہلے ہی بول اُٹھا۔

''آپ کے لباس کو دیکھ کر لگتا ہے کہ آپ محافظ شاہی دستے کے سپاہی ہیں۔ لیکن اس وقت آپ کا یہاں آنا ہمارے لئے حیرت کا باعث ہے۔''

قاسم نے پہلے ہی سے یہی سوچ رکھا تھا کہ وہ خود کو شاہی دستے کا سپاہی ظاہر کرے گا۔ اُس کا لباس اور آہنی خود بھی شاہی دستے کے سواروں جیسا تھا۔ لیکن اب تو پہریدار دستے کے سالار نے خود ہی قاسم کی مشکل آسان کر دی تھی۔ قاسم نے جواب دیا۔

''ہاں، میں شاہی دستے کا سپاہی ہوں۔ اور شہنشاہِ معظم کا ایک اہم پیغام لے کر ''برجِ غلاطہ'' کی آٹھویں منزل پر مقیم ''مقدس بطلیموس'' کی خدمت میں جا رہا ہوں۔''

قاسم نے جان بوجھ کر اپنے لہجے میں کرختگی کا عنصر نمایاں رکھا۔ کیونکہ شاہی دستے کے سوار عموماً اسی لہجے میں بات کرتے تھے۔ پہریدار دستے کا سالار قاسم کی بات سن کر شش و پنج میں مبتلا ہو گیا۔ اُسے حکم دیا گیا تھا کہ غروبِ آفتاب سے طلوعِ آفتاب تک کسی بھی شخص کو شہر میں داخل نہ ہونے دیا جائے اور نہ ہی شہر سے باہر جانے دیا جائے۔ چاہے کوئی کتنا بڑا افسر ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اب شاہی دستے کا ایک عام سا سپاہی سالار سے دروازہ کھولنے کی بات کر رہا تھا۔ اُس نے جھجکتے جھجکتے قاسم سے کہا۔

''دیکھئے جناب! ہم صبح سے پہلے کسی شخص کے لئے دروازہ کھولنے کے مجاز نہیں۔ صبح ہونے میں دو تین گھنٹے ہی باقی ہیں۔ آپ کچھ دیر ہمارے ساتھ رُک جائیے۔ طلوعِ آفتاب کے بعد ہم آپ کے لئے ذیلی کھڑکی کھول دیں گے۔''

قاسم کو اسی بات کی توقع تھی۔ اُس نے فوراً اپنی جیب سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نکالا جو دراصل ایک جعلی شاہی اجازت نامہ تھا۔ قاسم اس قسم کے کاموں میں بہت ماہر تھا۔ اُس نے شیخ صلاح الدین کے ساتھ مل کر اپنے مشن کے لئے ضروری ساز و سامان کا بندوبست پہلے سے کر رکھا تھا۔ چنانچہ اُس نے قسطنطین کی مُہر لگا اجازت نامہ پہریدار دستے کے سالار کو دکھایا تو سالار بری طرح گھبرا گیا۔ کیونکہ بڑے بڑے افسر بھی عموماً اس طرح کا اجازت نامہ لے کر نہ چلتے تھے۔ دستہ سالار نے فوراً سپاہیوں کو ذیلی کھڑکی کھولنے کا حکم دیا اور خود ایک طرف ہٹ گیا۔ قاسم نے شاہی اجازت نامہ تہہ کر کے جیب میں رکھا اور گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے ہی سر کو قدرے نیچے کی طرف جھکاتے ہوئے ذیلی کھڑکی سے پار ہو گیا۔ اب وہ قسطنطنیہ سے باہر تھا۔ طویل قامت ''برجِ غلاطہ'' اُس کے سامنے تھا جس کی

دسویں منزل پر بہت زیادہ مشعلیں روشن رہنے کی وجہ سے سمندر میں سینکڑوں میل دُور تک جہازوں کو رہنمائی دی جاتی تھی۔ ''برجِ غلاطہ'' قسطنطنیہ کا ایک قدیم ٹاور تھا۔ یہ 507ء میں رومی حکومت نے ''لائٹ ہاؤس'' کے طور پر تعمیر کیا تھا۔ برجِ غلاطہ کے آس پاس موجود آبادی کو ''غلطہ'' کی بستی کا نام دیا جاتا تھا۔ یہ بستی دراصل قسطنطنیہ میں آنے جانے والے تاجروں کے مسلسل پڑاؤ کرنے سے دھیرے دھیرے بنتی چلی گئی تھی۔ برجِ غلاطہ کی دس بڑی بڑی منزلیں تھیں۔ غلطہ کی بستی پر خاموشی چھائی ہوئی تھی اور ہر طرف سنسانی کے پہرے تھے۔ قاسم برجِ غلاطہ کے نزدیک پہنچ کر اپنے گھوڑے سے اُترا اور گہری نظر سے اردگرد کے ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ برجِ غلاطہ کی سب سے نچلی منزل کے سامنے چند خیمے نصب تھے۔ لیکن ان خیموں میں جو کوئی بھی تھا گہری نیند سو رہا تھا۔ قاسم نے کسی قدر اوٹ تلاش کر کے اپنے گھوڑے کو باندھ دیا۔ اُسے قسطنطنیہ کے محافظوں کی بدنصیبی پر افسوس ہونے لگا جو ہر خطرے سے بے خبر شراب کے نشے میں بدمست سو رہے تھے۔ قاسم نچلی منزل کے دروازے تک پہنچا تو اُس کی توقع کے مطابق دروازہ بند تھا۔ لیکن قاسم ذرا بھی پریشان نہ ہوا۔ اُس نے بے دھڑک برجِ غلاطہ کی نچلی منزل کا دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ اندرونی طرف موجود چوکیدار بھی شاید سو رہا تھا۔ قاسم نے با آوازِ بلند بار بار دستک دینا شروع کر دی۔ اور پھر کچھ دیر بعد اُسے اندر سے چلتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔

برجِ غلاطہ پر زیادہ پہرہ ضروری نہ سمجھا گیا تھا۔ کیونکہ برجِ غلاطہ صرف مینارۂ نور تھا۔ کوئی فوجی نوعیت کا اسلحہ بردار برج نہ تھا۔ یہ برج سمندری جہازوں کی رہنمائی کے لئے بنایا گیا تھا۔ چنانچہ یہاں قیصر کو زیادہ پہریدار یا محافظ متعین کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

چوکیدار نے بغیر پوچھے نچلی منزل کا دروازہ کھول دیا۔ کیونکہ اُسے کسی دشمن کے آنے کی توقع ہی نہ تھی۔ دروازہ کھلتے ہی چوکیدار کی نظر قاسم کے لباس پر پڑی۔ وہ ایک دم مستعد ہو گیا۔ قاسم نے تحکمانہ لہجے میں چوکیدار سے کہا۔

''کیا تم سو رہے تھے؟ تم اس طرح اپنا فرض ادا کرتے ہو؟''

چوکیدار ایک دم سہم گیا۔ اُس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور ٹانگیں کانپنے لگیں۔ وہ سمجھا کہ شاہی دستے کا افسر اُسے اپنے فرض سے غفلت برتنے پر سزا دے گا۔ وہ ہاتھ جوڑ کر گڑگڑایا۔

''صاحب جی!..... دراصل آج ویسے ہی کچھ آنکھ لگ گئی تھی۔ ورنہ میں پہلے تو جاگتا رہتا ہوں۔''

قاسم کے پاس وقت کم تھا۔ چنانچہ اُس نے نرم لہجے میں کہا۔

''پہلے جاگتے رہتے تھے..... اچھا، تو پھر ٹھیک ہے۔ تم یہاں بیٹھو، دروازہ اندر سے بند کرلو۔ اور جب تک میں واپس نہ آؤں کسی کو اندر نہ آنے دینا۔''

قاسم کا غیر متوقع رویہ دیکھ کر چوکیدار خوش ہوگیا اور فوراً اُس نے حکم کی تعمیل کے لئے زور زور سے سر ہلایا۔ قاسم اُسے چھوڑ کر آگے بڑھا اور اب وہ دس منزلہ بلند مینار پر چڑھ رہا تھا۔ اب اُس کے سامنے ایک مشکل اور صبر آزما چڑھائی تھی۔ برجِ غلاطہ کے چاروں طرف تقریباً 192 زینے کسی سانپ کی طرح بل کھاتے ہوئے اوپر آٹھویں منزل تک جا رہے تھے۔ قاسم کو اب مسلسل زینے چڑھنے تھے۔ رات کا تیسرا پہر شروع ہو چکا تھا۔ کچھ دیر چڑھنے کے بعد اُسے اپنے بھاری جوتوں کی ٹھک ٹھک کسی مشین کی مسلسل ٹھک ٹھک جیسی محسوس ہونے لگی۔ قاسم کی سانسیں بری طرح پھول چکی تھیں۔ لیکن وہ رُکنا نہیں چاہتا تھا۔ برجِ غلاطہ کے گرد سانپ کی طرح لپٹے زینے چڑھنے سے قاسم کو بار بار ایک دائرے کی صورت میں گھومنا پڑ رہا تھا جس سے اُس کو چکر آنے لگے۔ لیکن وہ کسی چیز کی پرواہ نہ کر رہا تھا۔

اور بالآخر 192 زینے طے کرنے کے بعد قاسم آٹھویں منزل تک پہنچ گیا۔ برجِ غلاطہ کی ہر منزل پر صرف ایک ہی کمرہ تھا۔ قاسم آٹھویں منزل کے کمرے کے سامنے پہنچا۔ اُس کا ارادہ تھا کہ وہ کمرے کے باہر پہنچ کر کچھ دیر کے لئے ستائے گا۔ لیکن جونہی وہ آخری زینہ طے کر کے کمرے کے سامنے آیا، بھونچکا رہ گیا۔ کیونکہ آٹھویں منزل کا دروازہ کھلا تھا اور ایک سفید ریش معمر بزرگ ہاتھ میں مشعل لئے دروازے کی دہلیز میں کھڑا قاسم کے لئے زینوں میں روشنی ڈال رہا تھا۔ قاسم کے لئے یہ صورتحال توقع کے بالکل ہی برعکس تھی۔ سفید ریش بزرگ نے مسکرا کر قاسم کا استقبال کیا اور انتہائی حلیم آواز میں قاسم سے کہا۔

''آؤ بیٹا آؤ!..... اندر آ جاؤ!..... تم بہت تیزی سے سیڑھیاں چڑھے ہو۔ اندر آ کر اپنی سانسیں درست کرلو۔ باہر سردی ہے۔''

قاسم کو سردی کا کیا احساس؟ اتنے زیادہ زینے چڑھنے سے اُس کا جسم پسینے میں غرق ہو چکا تھا۔ اُس نے بوڑھے شخص کی بات کو حیرت سے سنا لیکن اس پر مطلق اعتبار نہ کیا۔ یہ کسی جال میں پھانسنے کی چال بھی ہوسکتی تھی۔ قاسم کا ہاتھ فوراً اپنی تلوار کے دستے پر چلا گیا۔ وہ یہی سوچ کر آیا تھا کہ بوڑھے روحانی پیشوا بطلیموس کا خاتمہ کر کے مقدس نقشہ حاصل کر لے گا۔ لیکن یہاں تو صورتحال ہی یکسر مختلف تھی۔ آٹھویں منزل پر مقیم بوڑھا

بطلیموس قاسم سے کوئی سوال کئے بغیر اُسے اپنے کمرے میں آنے کی دعوت دے رہا تھا۔ حالانکہ قاسم کا رات کی تاریکی میں اس طرح برجِ غلاطہ میں داخل ہونا بجائے خود ایک پوچھنے کی بات تھی۔ بوڑھے بطلیموس نے قاسم کو تلوار نکالتے دیکھا تو مسکرا دیا۔

''نہیں بیٹا نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں..... میں تو تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ آج سے نہیں بیٹا! میں گزشتہ بیس سال سے تمہارا منتظر ہوں۔ ہر رات اسی طرح مشعل ہاتھ میں لے کر دروازہ کھولے تمہارا انتظار کرتا رہتا ہوں۔ مجھے معلوم تھا تم آؤ گے۔ ایک دن ضرور آؤ گے..... آؤ! اندر آ جاؤ۔''

یکایک قاسم کا سر چکرانے لگا۔ اُسے ایسے لگا جیسے مقدس بطلیموس نے اُس پر سحر کر دیا ہو۔ قاسم کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ وہ دیوار کا سہارا لے کر کھڑا تھا۔ بری طرح چکرایا اور اپنی جگہ پر بیٹھ گیا..... بوڑھا بطلیموس ایک دم گھبرایا۔ اُس نے تیزی سے مشعل دیوار میں اٹکائی اور آگے بڑھ کر قاسم کو سہارا دیا۔ بوڑھے بطلیموس نے قاسم کو اٹھانے کے لئے اپنے دونوں ہاتھ اُس کے شانوں پر رکھے تو یکلخت قاسم کی آنکھیں روشن ہوگئیں۔ اندھیرا چھٹ گیا اور وہ مستعد ہوگیا۔ قاسم تیزی سے اپنے سہارے پر اُٹھا اور بوڑھے بطلیموس کے ساتھ چلتا ہوا کمرے کے اندر داخل ہوگیا۔ کمرے کے اندر ایک بڑی چٹائی بچھی تھی جس کے ایک کونے میں تارک الدنیا بطلیموس کا بوریا بستر رکھا تھا۔ اور دوسرے کونے میں لکڑی کا ایک چھوٹا سا صندوق دھرا تھا۔ چٹائی پر پتھر کے ایک شمع دان میں شمع روشن تھی جس کے ساتھ کچھ مقدس کتابیں دھری تھیں۔ قاسم بطلیموس کے ساتھ چٹائی پر بیٹھ گیا۔ اب قاسم کے دل میں کوئی خوف نہ تھا۔ نہ جانے کیوں وہ اس سفید ریش شخص کو دیکھ کر اپنا اپنا محسوس کر رہا تھا۔ بوڑھے بطلیموس نے قاسم سے پھر کہا۔

''بیٹا! اچھا ہوا تم آ گئے۔ اب میں زیادہ ہی بوڑھا ہوگیا ہوں۔ میں نے طویل عرصہ تمہارا انتظار کیا ہے۔ میرے پاس تمہاری امانت ہے۔ اسے حفاظت کے ساتھ اپنے امیر کے پاس پہنچانا تمہارا کام ہے..... یہ قسطنطنیہ کی ہزار سال پرانی چابیاں ہیں۔ میرے لئے اب ان کی حفاظت مشکل تھی۔ شکر ہے کہ تم آ گئے۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارا سلطان قسطنطنیہ کو فتح کر لے گا۔ کیونکہ تمہارا امیر بہتر امیر ہے اور تمہارا لشکر سب سے بہتر لشکر ہے۔''

مقدس بطلیموس کی زبان سے آخری الفاظ سنتے ہی قاسم کے بدن کا ایک ایک رونگٹا کھڑا ہوگیا۔ یہ تو حدیث مبارکہ کے الفاظ تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا ..... ''تم ضرور قسطنطنیہ فتح کرلو گے۔ اور اس لشکر کا امیر بہتر امیر ہوگا اور وہ لشکر بہتر لشکر ہو

گا''..... قاسم پر وجد طاری ہونے لگا۔ وہ اس کرشماتی بوڑھے کی باتیں سن کر حیرت کے سمندر میں غوطے کھا رہا تھا۔ پُرنور چہرے کا مالک یہ بوڑھا شخص یقیناً کوئی پہنچا ہوا بزرگ تھا۔ یہ بزرگ سات سو سال پرانی چابیوں کی بات کر رہا تھا۔ قاسم کے لئے یہ سب کچھ ناقابل یقین تھا۔ وہ اپنے ذہن پر زور دینے لگا کہ کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا؟ وہ بولنا چاہتا تھا لیکن اُس کی زبان گنگ تھی۔ بوڑھا بطلیموس پھر بولا۔

''بیٹا! فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں..... قسطنطنیہ کا انجام آسمانوں میں لکھ دیا گیا ہے۔ اب اس شہر پر پروردگار کی رحمت برسنے والی ہے۔ تم اپنی امانت لے جاؤ گے تو میں پورے اطمینان کے ساتھ اپنے مالک کے پاس جا سکوں گا۔''

پہلی بار قاسم میں بولنے کی ہمت پیدا ہوئی۔ اب وہ سنبھل چکا تھا۔ وہ بولا۔

''مقدس بزرگ! آج یہ سب کچھ میرے لئے ناقابل یقین ہے۔ میرا دل کہتا ہے آپ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ انسان ہیں۔ میں آپ کی امانت اپنے سلطان تک پہنچانے میں ایک پل کی دیر بھی نہ کروں گا..... لیکن میں ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''ہاں ہاں بیٹا بے شک..... تم بات کرو..... تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''مقدس بزرگ! میں یہاں قدیم چابیاں لینے کے لئے نہیں، مقدس نقشہ حاصل کرنے کے لئے آیا تھا۔''

قاسم کی بات مکمل نہ ہوئی تھی کہ مقدس بزرگ مسکرا دیا اور بولا۔ ''مقدس نقشہ میرے پاس پہنچ چکا ہے۔ میں وہ بھی تمہارے حوالے کر دوں گا..... تم اب زیادہ دیر نہ کرو اور جانے کی تیاری کر لو۔ لیکن روانہ ہونے سے پہلے میں اپنے چند الفاظ کا تمہیں گواہ بنانا چاہتا ہوں۔''

قاسم کے لئے مقدس بزرگ کی ہر بات ششدر کر دینے والی ثابت ہو رہی تھی۔ وہ ہمہ تن گوش ہو گیا اور مقدس بزرگ کے مخصوص الفاظ سننے لگا۔ مقدس بطلیموس کہہ رہا تھا۔

''اے میرے پروردگار!..... میں گواہی دیتا ہوں کہ میں تیرے سوا کسی اور کو اللہ نہیں سمجھتا۔ اور محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تیرا بندہ اور رسول سمجھتا ہوں۔''

قاسم کی آنکھیں حیرت سے پھٹی جا رہی تھیں۔ مقدس بطلیموس ایک طرح سے کلمہ شہادت پڑھ رہا تھا۔ یہ اُس کے مسلمان ہونے کا ثبوت تھا۔ مقدس بزرگ گواہی کے الفاظ مکمل کرنے کے بعد منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا۔ اُس کا چہرہ قبلہ رُخ تھا اور آنکھیں بند تھیں۔ کئی لمحات گزر گئے۔ قاسم اپنی جگہ پر بیٹھا اُسے دیکھتا رہا۔ اور پھر کافی دیر بعد

مقدس بطلیموس نے آنکھیں کھولیں اور قاسم کو دیکھ کر مسکرا دیا۔ قاسم نے کچھ کہنا چاہا لیکن مقدس بطلیموس نے اُسے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اشارے سے منع کر دیا اور پھر اپنی جگہ سے اٹھا۔ بطلیموس نے لکڑی کا صندوق کھول کر اُس میں سے ایک بھاری بھرکم پوٹلی نکالی اور قاسم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ قسطنطنیہ کی چابیاں ہیں۔ گزشتہ ساڑھے آٹھ سو سال سے یہ چابیاں ایک حجازی عرب نوجوان کے انتظار میں اس صندوق کے اندر رکھی ہیں۔ انہیں قیصرِ روم ''ہرقل'' نے اپنی موت سے پہلے اس صندوق میں منتقل کیا تھا۔ اس بات سے سب بے خبر ہیں۔ یہاں تک کہ قسطنطنیہ کا کوئی شہنشاہ ان کا راز نہیں پا سکا۔ ان میں فصیل شہر کے قدیم تہہ خانوں کے علاوہ شاہی محل کے گمنام تہہ خانوں کی چابیاں بھی ہیں۔ ان مقامات پر قدیم روما کے دیومالائی خزانے رکھے ہیں جن کے اصل مالک تم اور تمہارا اصل لشکر ہے۔''

قاسم گم سم مقدس بطلیموس کی ایک ایک بات سن رہا تھا۔ قیصرِ روم ''ہرقل'' کا ذکر سن کر وہ چونکا۔ یہ روم کا وہی شہنشاہ تھا جسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مکتوبِ مبارک ارسال فرمایا تھا۔ ''ہرقل'' نے ایران کے شہنشاہ کسریٰ ''خسرو پرویز'' کے مقابلے میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوب اور ایلچی کا احترام کیا تھا۔ جبکہ خسرو پرویز نا ہنجار نے خبث باطن کا ثبوت دیا اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا مکتوب مبارک بے دردی سے چاک کر دیا تھا۔ بوڑھا بطلیموس اُس وقت ''ہرقل'' کی بات کر رہا تھا۔ قاسم وجد کے عالم میں مقدس بطلیموس کی باتیں سنتا رہا۔ مقدس بطلیموس نے قاسم کو شیر کی کھال پر بنا مقدس نقشہ بھی دے دیا۔ یہ نقشہ قدیم فصیل شہر کے مضبوط قلعوں اور خشکی کے راستے پر بنی تین قدیم فصیلوں کا نقشہ تھا۔ اس نقشے میں اُن برجوں اور دروازوں کی نشاندہی کی گئی تھی جو ہزار سال پرانے تھے۔ قدیم فصیل جو اب باہر سے پتھر کی بنی ہوئی دکھائی دیتی تھی بعض جگہوں سے ابھی تک ہزار سال پرانی تھی اور اندر سے کچی مٹی سے بنی ہوئی تھی۔ نقشے میں ''سینٹ رومانس'' کا دروازہ اور اُس کے برج بھی دکھائے گئے تھے۔ اس دروازے کے ایک برج کی عمر بھی پانچ سو سال سے زیادہ تھی۔

شہنشاہ قسطنطین نے اگرچہ فصیل کی مرمت کا کام خاصا تسلی بخش کر لیا تھا۔ لیکن بہت سی جگہیں ایسی تھیں جن کے خستہ ہونے کی اُسے خبر نہ تھی اور یہ وہی جگہیں تھیں جو باہر سے بھاری پتھروں لیکن اندر سے بھربھری مٹی کی بنی ہوئی تھیں۔ خشکی کی جانب جہاں ''سینٹ رومانس'' کا دروازہ تھا، شہر کی فصیل صرف ایک نہ تھی، بلکہ یکے بعد دیگرے تین

فصیلیں مختلف فاصلوں پر واقع تھیں۔ اندر کی دو فصیلیں بہت موٹی تھیں اور ان میں 170 فٹ کے فاصلے سے مضبوط برج بنے ہوئے تھے۔ ہر دو فصیلوں کے درمیان ساٹھ فٹ کا فاصلہ تھا۔ باہر کی جانب دوسری اور تیسری فصیل کے بیچوں و بیچ ساٹھ فٹ چوڑی ایک خندق تھی اور اس خندق کی گہرائی پورے سو فٹ تھی۔ اس قدر گہری خندق کو عبور کرنا کسی عام فاتح کے بس کا کام نہ تھا۔ یہ تینوں فصیلیں نو سو سال پہلے شہنشاہ ''تھیوڈوسیس ثانی'' نے تعمیر کروائی تھیں اور اب تک 21 محاصروں میں قسطنطنیہ کو دشمن کے قدموں سے محفوظ رکھ چکی تھیں۔ پورے قسطنطنیہ کے گرد مکمل فصیل کا قطاع دائرہ چودہ میل سے زیادہ لمبا تھا۔

مقدس نقشے میں قدیم بازنطینی زبان استعمال کی گئی تھی۔ لہٰذا بوڑھے بطلیموس نے قاسم کو مقدس نقشہ تفصیل کے ساتھ سمجھا دیا۔ قاسم نے چرمی نقشہ تہہ کر کے ایک مضبوط ڈوری کے ذریعے اپنے سینے کے ساتھ باندھ دیا اور اوپر اپنا بھاری فوجی لباس پہن لیا۔ خزانے کی چابیوں والی پوٹلی جسے مقدس بطلیموس نے قسطنطنیہ کی چابیاں قرار دیا تھا، قاسم نے اپنے لباس کے اندر..... کمر کے ساتھ مضبوطی سے باندھ لی۔ اب قاسم جانے کے لئے تیار تھا۔ بوڑھے بطلیموس نے اُسے انتہائی شفقت بھری دُعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔

قاسم تیزی سے غلاطہ کے مینار کی سیڑھیاں اُترنے لگا۔ جس وقت قاسم ''برجِ غلاطہ'' کی سب سے نچلی منزل سے باہر آیا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ قاسم کا گھوڑا قاسم کو دیکھ کر ہنہنانے لگا۔ یہ صبح کا وقت تھا اور پرندے بیدار ہو چکے تھے۔ اب قاسم کی منزل سلطانی لشکر تھا اور قاسم کے راستے کی کوئی رُکاوٹ، رُکاوٹ نہ تھی.....!

فاتح کی یلغار

بالآخر 6 اپریل 1453ء بمطابق 26 ربیع الاول 857ھ کے روز سلطان محمد خان اپنی بہادر افواج کے ہمراہ خشکی کی جانب سے قسطنطنیہ کی فصیل کے سامنے نمودار ہوا۔ شہر کے سب دروازے بند تھے اور قسطنطنیہ کا پورا شہر فصیل پر چڑھ کر دُور سے دُھول اُڑاتے ہوئے سلطانی لشکر کو دیکھ رہا تھا۔

قاسم گزشتہ پندرہ روز سے اسی لشکر کے ہمراہ تھا اور وہ اب اپنے عزیز دوست سپہ سالار ''آغا حسن'' کی ماتحتی میں اپنے سابقہ عہدے پر برقرار ہو چکا تھا۔ قاسم کے ماتحت لڑنے والے مسلمان سپاہیوں کو اپنے سابق سالار کے واپس آ جانے کی بے پناہ خوشی ہوئی اور وہ تمام قاسم کے ساتھ بغلگیر ہو کر ملے۔ اس مرتبہ عثمانی فوج کا ہر سپاہی فتح یا شہادت کے جذبے سے سرشار تھا۔ خصوصاً آغا حسن کے وجیہہ چہرے پر ولولہ جہاد کی دلفریب لہر دیکھی جا سکتی تھی۔

قاسم جب سلطان کے پاس پہنچا تو سلطان، قاسم کی آمد کا سن کر بیتابانہ اپنے خیمے سے باہر نکل آیا تھا اور اُس نے قاسم کو یوں والہانہ انداز میں گلے سے لگایا تھا جیسے مدتوں کے بچھڑے دوست اچانک سرِ راہ مل جائیں۔ قاسم نے سلطان کو اپنی تمام کارکردگی سنائی اور مقدس بطلیموس کی فراہم کردہ قسطنطنیہ کی چابیاں سلطان کے حوالے کیں۔ بعد ازاں قاسم نے سلطان کو مقدس نقشہ پیش کیا تو سلطان خوشی سے اُچھل کھڑا ہوا اور قاسم کو ایک بار پھر گلے لگا لیا۔ قاسم نے سلطان کو نقشے کی تفصیلات سمجھائیں۔ اور چودہ میل لمبی فصیل کے کمزور مقامات کی خصوصی طور پر نشاندہی کی۔ اُس روز قاسم سلطان کے ہمراہ رات بھر بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ لشکر کے مؤذن نے اللہ اکبر کی صدا بلند کی۔ اگلے روز قاسم اپنے اہل خانہ سے ملا۔ اُس کی بیوی شہزادی حمیرا رضا کار عورتوں کی سالار تھی۔ قاسم کو حمیرا کے اس اقدام سے بے حد خوشی ہوئی اور اُس نے حمیرا کو محبت سے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔ لشکر کے ننھے رضا کار عمر اور علی اپنے بچھڑے ہوئے چاچو کے ساتھ لپٹ گئے۔ قاسم نے بھتیجوں کو دیکھا تو ایک دم اُسے اپنی بچی غزالہ کا خیال آیا۔ وہ چونک کر حمیرا کی طرف متوجہ ہوا اور اپنی بیوی سے پوچھا۔

''اری حمیرا!..... غزالہ کو ''ادرنہ'' میں کس کے پاس چھوڑ آئی ہو؟''

حمیرا مسکرائی اور شرارت آمیز لہجے میں خاوند سے پوچھا۔ ''آپ کا کیا خیال ہے، بھلا اندازہ لگا کر بتائیے کہ ہماری بچی ''ادرنہ'' میں کس کے پاس ہوگی؟''

حمیرا کے تجسس آمیز لہجے سے قاسم سوچ میں پڑ گیا۔ وہ حیران ہو رہا تھا کہ آخر چھ سالہ معصوم غزالہ ''ادرنہ'' میں اکیلی کس کے پاس رہ سکے گی۔ قاسم کو سوچوں میں گم دیکھ کر حمیرا کھلکھلا کر ہنس دی اور کہنے لگی۔

''ارے! آپ تو پریشان ہو گئے۔ ہماری بچی بہت محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ وہ ہمارے ساتھ رہنے سے زیادہ وہاں خوش ہے۔ میں آپ کو بتاؤں غزالہ کہاں ہے؟..... وہ غمزدہ ملکہ اور سلطانِ معظم کی دوسری ماں ''ملکہ سروین'' کی خصوصی پرورش میں ہے۔''

قاسم کے سینے سے ایک طویل سانس نکلی اور اُسے یاد آیا کہ مرحوم سلطان مراد خان ثانی کی نوجوان بیوی ملکہ سروین جو اب تاجدار ملکہ تو نہ رہی تھی، لیکن قصرِ سلطانی میں مقیم تھی، واقعتاً ایک دُکھی دل خاتون تھی۔ کیونکہ عین اُس روز جس دن سلطان محمد خان کی تاجپوشی تھی، ملکہ سروین کے شیر خوار شہزادے کو ایک سالار نے قتل کر دیا تھا..... قاسم کو یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اُس کی بچی ملکہ سروین کی زیرِ تربیت تھی..... وہ مطمئن ہو گیا۔

قاسم اپنے بھائی طاہر سے بھی ملا اور دونوں بھائی دیر تک ایک دوسرے کو اپنا حال احوال سناتے رہے۔ بوڑھے عباس کی بیٹی مریم بھی جو اب قاسم کے بھائی طاہر کی بیوی تھی، رضا کار خواتین کے دستہ میں شامل تھی۔ قاسم آہن گر ''اربان'' سے بھی ملا۔ یہ وہی شخص تھا جسے ''ادرنہ'' میں سب سے پہلے قاسم ہی کے ساتھ واسطہ پڑا تھا۔ گزشتہ پندرہ روز سے قاسم لشکر کے ہمراہ چل رہا تھا اور آج 6 اپریل 1453ء کے دن قاسم عثمانی لشکر کے ہمراہ ایک بار پھر قسطنطنیہ کے سامنے پہنچ چکا تھا۔

اُدھر سلطان کے امیر البحر ''بلوط اغلن'' کے جنگی جہاز جب آبنائے باسفورس میں داخل ہوئے تو اُن کا استقبال کرنے کے لئے پُر جوش بوڑھا ''عباس'' اپنے جہازوں سمیت موجود تھا۔ ''بلوط اغلن'' نے آتے ہی ''نارمن'' کے بحری بیڑے کو دُور تک پیچھے دھکیل دیا اور پوری کی پوری آبنائے باسفورس پر مکمل قبضہ حاصل کر لیا۔ اب شہر کے عقبی سمندر پر بھی عثمانی بحریہ کا قبضہ ہو چکا تھا اور یورپی جہاز آبنائے باسفورس کو خالی کر کے بحر مارمورا کے وسط تک پیچھے ہٹ گئے تھے۔ رومیوں کے لئے صرف درِ دانیال کا راستہ کھلا تھا اور وہ بھی اسکی صورت میں جب عثمانی بحریہ کی کشتیاں درِ دانیال کے پانیوں میں گشت پر موجود نہ ہوتیں۔

البتہ گولڈن ہارن میں بھاری اسلحہ بردار مسیحی جہاز ابھی تک موجود تھے اور ''گولڈن ہارن'' کے دہانے پر لوہے کی بھری بھر کم زنجیر تنی ہوئی تھی۔ رومی بحریہ کے جہاز دن بھر ''بلوط اغلن'' کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے رہتے۔ وہ بحر مارمورا سے کبھی کبھار آبنائے میں داخل ہو جاتے اور عثمانی بحریہ کا اچھا خاصا نقصان کر کے واپس بھاگ جاتے۔

''گولڈن ہارن'' کے افسران بھی وقتاً فوقتاً ترکی بحریہ کے ساتھ پنجہ آزمائی کی کوشش کرتے رہتے تھے اور یوں گویا قسطنطنیہ کے دو اطراف میں ترکوں اور رومیوں کے درمیان باقاعدہ بحری جنگ شروع ہو چکی تھی۔ قسطنطنیہ کی تیسری سمت میں گولڈن ہارن واقع تھی جس کا راستہ فی الحال بند تھا۔

شہر کے سامنے پہنچ کر سلطان نے اپنا شاہی خیمہ ''سینٹ رومانس'' کے دروازے کے عین سامنے نصب کروایا تھا۔ سلطان نے لشکر کو پڑاؤ کا حکم دیا اور قسطنطنیہ کے محاصرے کا باقاعدہ آغاز کر دیا۔ سلطان نے سپاہیوں کو خیمے نصب کرنے کا حکم دیا اور خود اپنے سفید گھوڑے پر سوار ہو کر فصیل شہر کے سامنے تمام علاقے کا گشت کرنے لگا۔ سلطان کے نامور سپہ سالار اُس کے دائیں بائیں گھوڑوں پر سوار تھے۔ اور سلطان محمد خان آلِ عثمان کے مخصوص جاہ و جلال کے ساتھ محاصرے کے مختلف مقامات کا جائزہ لینے لگا۔ سلطان نے جابجا بہادر دستوں کو متعین کیا اور فصیل کی مختلف کمزوریوں کو ذہن نشین کر کے اپنی خطرناک توپیں نصب کرنے کا حکم دیا۔ سلطان نے بیلداروں کے سردار کو بلوا کر ساباط اور سرنگیں بنانے کی ہدایت کی۔ بیلدار سلطان کا حکم پاتے ہی دھڑا دھڑ انجیر کے درختوں کو گرا کر ساباط اور سرنگیں بنانے میں مصروف ہو گئے۔ یہ ساباط دراصل لکڑی کے قد آدم کیبن تھے جن کے نیچے پہیے لگائے گئے تاکہ سپاہی اُن کے عقب میں خود کو چھپا کر ان چھجوں کو آگے سے آگے دھکیلتے ہوئے شہر کی طرف بڑھ سکیں۔ لکڑی کے یہ ساباط تیر اندازی اور سنگ باری سے سپاہیوں کو محفوظ رکھ سکتے تھے اور سپاہی ان چھجوں کے رخنوں میں سے آسانی کے ساتھ فصیل شہر پر تیر اندازی کر سکتے تھے۔

سلطانی لشکر خیمہ زن ہو گیا۔ 6 اپریل کے روز صبح سے لے کر شام تک تمام عیسائی فصیل شہر پر کھڑے ہو کر عثمانی لشکر کی کارروائی دیکھتے رہے۔ شہر کے اندر قسطنطین کے جانباز سپاہی پوری طرح مستعد تھے۔ جنیوا کا سپہ سالار ''جان جسٹینانی'' اور قسطنطنیہ کا سپہ سالار ڈیوک نوٹاراس شہر کے بڑے دروازے سے نکل کر دُو بدو جنگ کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اور پھر اُسی روز سے ترکوں اور رومیوں کے درمیان آسمان کی آنکھوں نے ہلال

وصلیب کی ایک اور جنگ کا نظارہ کرنا شروع کیا۔ سلطان نے پڑاؤ کے وقت حیرت انگیز قابلیت کا ثبوت دیا اور محاصرین نے انتہائی تیزی کے ساتھ محاصرہ کے حلقہ کو تنگ یعنی فصیل شہر کے متصل پہنچنے کی کوشش کی۔ منجنیقوں اور توپوں کو مناسب موقعوں پر نصب کر کے جابجا بارود کے گولوں اور بھاری پتھروں کی بارش کا آغاز کر دیا گیا۔

قسطنطنیہ کے اندر ''پوپ جان نکلسن پنجم'' کا نائب ''کارڈنیل اسیڈور'' موجود تھا۔ محاصرہ شروع ہوتے ہی ''کارڈنیل اسیڈور'' اور بطریق اعظم نے ایک دوسرے سے بڑھ کر باشندگانِ شہر اور عیسائی فوجوں میں مذہبی جوش و جذبہ پیدا کرنا شروع کر دیا۔ لڑائی کی ترغیب دینے اور شہید ہونے کے فضائل بیان کرنے کے لئے بڑے بڑے پادری اور بشپ وعظ و نصیحت کرتے اور لوگوں کو بڑھ چڑھ کر جان دینے پر آمادہ کرنے لگے۔ قسطنطنیہ کی عوام میں بے پناہ ولولہ اور جوش و جذبہ محاصرے کے ابتدائی دنوں میں دکھائی دینے لگا۔ کارڈنیل اسیڈور خود سپاہیانہ لباس پہن کر بہت سے بہترین سواروں کی کمان اپنے ہاتھ میں لے چکا تھا۔ سپہ سالاروں اور تمام افوج کی مجموعی طور پر نگرانی کا کام قیصر قسطنطین نے براہِ راست سنبھالا ہوا تھا۔ 7 اپریل 1453ء کے روز ''سینٹ رومانس'' دروازے کے پیچھے ''جان جسٹینانی'' اپنے آہن پوش بہادر سواروں سمیت دروازے سے باہر نکلنے کے لئے تیار کھڑا تھا۔ اُس کے عقب میں سپہ سالار نوٹاراس اپنے سوار لئے کھڑا تھا۔ طلوعِ آفتاب کے کچھ دیر بعد لڑائی کے لئے بے تاب عیسائی سپاہی سینٹ رومانس کا دروازہ کھول کر آندھی اور طوفان کی طرح باہر نکلے اور باہر نکلتے ہی اُن کا تربیت یافتہ لشکر خود بخود ایک خاص نظم و ضبط میں آ گیا۔ جنیوی افواج کا سپہ سالار جان جسٹینانی اپنے سوار دستوں کو لے کر صف آرا ہونے لگا۔ اسی طرح سپہ سالار نوٹاراس نے اپنی صفیں درست کیں اور عیسائی فوجی مسلمان لشکر پر ٹوٹ پڑنے کے لئے بے حد بے تاب نظر آنے لگے۔ عیسائی لشکر کے عقب میں ''سینٹ رومانس'' کا دروازہ بند کر دیا گیا اور اب اُن کا لشکر سلطانی افواج کے سامنے دُو بدو مبارزت کے لئے طبل جنگ بجانے لگا۔ سلطان محمد خان نے بھی اپنے میمنہ، میسرہ اور قلب کو آراستہ کرنے کے بعد طبل کا جواب طبل سے دیا۔ اس سے پہلے کہ دونوں طرف کے سپاہی ایک دوسرے پر جھپٹتے، مسلمان افواج میں لاڈلی فوج ینی چری کا ایک سوار آگے بڑھا اور وسطی رزم گاہ میں پہنچ کر عیسائی فوجیوں کو مبارزت کی دعوت دی۔ اگلے لمحے ایک جوشیلا عیسائی نوجوان میدان میں اُترا۔ دونوں مبارزین ایک دوسرے کے سامنے اپنے گھوڑوں پر بیٹھے اِترا رہے تھے۔ مسلمان سپاہی ''عبداللہ'' تو گویا اپنے دشمن کا منتظر تھا۔

اُس نے آتے ہی اپنے مخالف کو آڑے ہاتھوں لیا۔ لوہے سے لوہا ٹکرانے کی آواز فضا میں گونجی اور پہلے چھناکے کے ساتھ ہی دونوں لشکروں کے سپاہیوں نے اپنے اپنے نعرے بلند کئے۔ فصیل شہر پر متعین سپاہیوں کے علاوہ ہزاروں کی تعداد میں عام شہری بھی جنگ کا نظارہ کرنے کے لئے آئے ہوئے تھے۔

دونوں مبارزین کافی دیر تک ایک دوسرے کے ساتھ اٹکھیلیاں کرتے رہے۔ داؤ پر داؤ کھیلتے رہے۔ اور بالآخر عبداللہ نے کھیل ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اُس نے یکایک اپنے حملے تیز کر دیئے۔ رومی سپاہی کے لئے عبداللہ کے کاری وار بچانا مشکل ہونے لگے تو وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ اُس کا گھوڑا اپنے لشکر کی جانب سرپٹ دوڑ رہا تھا۔ دعوتِ مبارزت کا کھیل اس سے زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا اور اچانک دونوں لشکروں کے سپاہی نعرے مارتے ہوئے ایک دوسرے پر پل پڑے۔ فصیل شہر سے عیسائیوں کا شور بلند ہوا۔ شہر کی نوجوان لڑکیاں فصیل شہر سے اپنے بہادروں کو ہلّہ شیری دے رہی تھیں۔ گھمسان کا رن پڑا اور عثمانی فوج نے جسٹینانی کے سپاہیوں کو کاٹنا شروع کر دیا۔ پہلے پہل عیسائیوں کے قدم اُکھڑے۔ لیکن پھر اچانک بہادر جسٹینانی نے خود سب سے آگے بڑھ کر اسلامی لشکر کے قلب پر ایک خطرناک حملہ کر دیا۔ وہ ینی چری کے بہادروں کو درہم برہم کرتا ہوا عثمانی پرچم کی جانب بڑھنے لگا۔ جسٹینانی کی تلوار بجلی کی طرح لپک رہی تھی اور اس کا ایک ایک وار عثمانی سپاہیوں کے لئے جرأت و شجاعت کی علامت بنتا جا رہا تھا۔ سلطان خود ایک ٹیلے پر کھڑا جسٹینانی کی شجاعت ملاحظہ کر رہا تھا۔ سلطان کے چہرے پر بے اختیار جسٹینانی کے لئے داد و تحسین کے جذبات اُبھر آئے۔

قلب کو کمزور ہوتے دیکھا تو سپہ سالار آغا حسن نے اپنے بکھرتے ہوئے ساتھیوں کو مجتمع کیا اور جسٹینانی کے سامنے جم گیا۔ دونوں لشکر دو گھنٹے تک آپس میں گتھم گتھا رہے۔ اور پھر عیسائی فوجی پہلے سے طے شدہ منصوبے کے تحت پیچھے کی طرف سمٹنے لگے۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے میدانِ کارزار عیسائیوں سے خالی ہو گیا۔ شہر کے دروازے اپنے سپاہیوں کے لئے کھول دیئے گئے اور شہریوں نے اپنے بہادروں کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے۔ تمام عیسائی فوجی قسطنطنیہ میں داخل ہو گئے تو سینٹ رومانس کا دروازہ بند کر دیا گیا اور رومی محصور ہو کر ترکوں کو اُن کے حملوں کا ترکی بہ ترکی جواب دینے لگے۔ قیصر قسطنطین خود فصیل شہر کے ایک بڑے برج پر موجود تھا۔ فصیل شہر کے آگے ایک چوڑی خندق کھدی تھی جس میں پانی چھوڑ کر اُسے بھر دیا گیا تھا۔

سلطان محمد خان کے سپاہیوں نے ''اربان'' کی بنائی ہوئی توپوں سے فصیل شہر پر گولہ باری شروع کروائی۔ ''اربان'' کی بڑی توپ جو اس جنگ کی رانی تھی، سینٹ رومانس کے عین سامنے نصب تھی۔ اس توپ کا ہر گولہ تیس اِنچ قطر موٹائی کا تھا۔ اربان خود اس توپ کو چلانے پر مامور تھا۔ جبکہ سلطانی فوج کے چھجہ بردار سپاہی اپنے اپنے ساباط دھکیلتے فصیل شہر کی جانب بڑھ رہے تھے۔ خندق کی وجہ سے عثمانی سپاہی فصیل شہر کے نزدیک پہنچنے سے معذور تھے۔ جبکہ فصیل پر موجود عیسائیوں کی توپیں عثمانی لشکر پر غضبناک گولے برسا رہی تھیں۔ سلطان محمد خان خود دن بھر اپنے لشکر کی کمان کرتا رہا۔ اور وہ صبح سے لے کر شام تک گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھا اِدھر سے اُدھر دوڑتا پھر رہا تھا۔

غروبِ آفتاب کے ساتھ ہی دونوں طرف سے جنگ بندی ہو گئی۔ دن بھر کے تھکے ہارے سپاہی اپنے پڑاؤ میں واپس آئے تو اپنے لباس سے اسلحہ الگ کئے بغیر اپنے اپنے خیموں میں لیٹ گئے۔ مسلمان سپاہیوں نے دن بھر کی لڑائی میں فصیل شہر کے نزدیک پہنچنے کی جتنی بھی کوششیں کی تھیں، وہ تمام ناکام رہی تھیں۔ چنانچہ سلطان محمد خان نے اپنے سالاروں کی مشاورت طلب کی اور فصیل شہر کی خندق کو پاٹنے کے مشورے مانگے۔ اگلے روز مسلمانوں نے علی الصبح خندق کو جگہ جگہ سے ملبے کے ذریعے بھرنا شروع کر دیا۔ یہ شہر سے بیرونی خندق تھی اور زیادہ گہری نہ تھی۔ دوپہر تک بڑی مشکل کے ساتھ خندق کو کئی جگہ سے پاٹ کر راستے بنائے گئے اور اس طرح عثمانی فوج فصیل شہر کے عین نیچے پہنچ گئی۔ لیکن فصیل کے اوپر اُن کا کوئی بس نہ چل سکا۔ اوپر سے عیسائیوں نے روغن نفط جلا جلا کر اُن پر پھینکنا شروع کر دیا۔ جلتی ہوئی تیل کی ہانڈیاں ترکوں کی ڈھالوں سے ٹکرا کر ٹوٹتیں تو خاصا جانی نقصان کرتیں۔ مجبوراً عثمانی فوج کو فصیل کے نیچے سے پسپا ہونا پڑا اور اس طرح یہ دن بھی بے نیل و مرام گزر گیا۔

اگلے روز بھی جوش و جذبے سے لبریز عیسائیوں نے ترکوں کی ایک نہ چلنے دی۔

اب سلطان نے ایک اور ترکیب سوچی۔ اُس نے لکڑی کے مضبوط تختے جڑوا کر اُونچے اُونچے چوبی مینار بنوائے جو فصیل شہر کے برابر بلند تھے۔ لکڑی کے ان میناروں کے نیچے پہیے لگائے گئے جن کی بدولت اُنہیں آسانی سے حرکت دی جا سکتی تھی۔ ان چوبی میناروں کے اوپری سرے کے ساتھ لکڑی کی لمبی لمبی سیڑھیاں باندھی گئیں اور پھر سلطان نے اپنے بہادر سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ ان میناروں کو خندق کے کنارے لے جا کر اور ان سیڑھیوں کو اوپر اُٹھا کر ان کا دوسرا سرا قلعے کی دیوار پر رکھ دیں۔ اس طرح خندق کے اوپر ایک پُل سا

بندھ جانے کی توقع تھی۔ ان چوبی میناروں کا سارا کام سپہ سالار آغا حسن نے اپنے ہاتھ لیا اور خود سب سے پہلے اپنے مینار کو خندق کے کنارے لے جا کر اُس کی سیڑھی کو قلعے کی دیوار پر رکھ دیا۔ ینی چری کے بہادر، سیڑھیوں کے ان پُلوں پر سے گزرتے ہوئے فصیل شہر پر پہنچنے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن محصورین نے نہایت مستعدی اور چابکدستی کے ساتھ ان میناروں پر رال کے جلتے ہوئے گولے پھینکنے شروع کر دیئے۔ لکڑی کی سیڑھیوں نے آگ پکڑ لی اور سلطانی فوج کے مینار جلنے لگے۔ سلطان کے سپاہی بڑی مشکل سے اچھا خاصا جانی نقصان کروانے کے بعد واپس لوٹ آئے۔ اور اس طرح ان میناروں اور سیڑھیوں کے جلنے کی وجہ سے قلعہ کشائی کی یہ تدبیر بھی کامیاب نہ ہو سکی۔

آج باقاعدہ جنگ شروع ہوئے ساتواں روز تھا۔ قاسم بن ہشام پچھلے چند دن سے سلطانی لشکر میں دکھائی نہ دے رہا تھا۔ آج دن بھر گھوڑے کی پیٹھ پر پورے میدانِ جنگ میں دوڑنے پھرنے کے بعد سلطان محمد خان جب اپنے خیمے میں لوٹا تو قاسم بن ہشام اُس کا منتظر تھا۔ قاسم کا چہرہ دُھول سے اٹا ہوا تھا اور اُس کے وجود میں تھکاوٹ کے آثار تھے۔ ایسے لگتا تھا کہ وہ کسی اہم مہم سے لوٹا ہے..... قاسم نے تھکے ہوئے سلطان کو ایک چونکا دینے والی خبر سنا کر مسرور کر دیا۔ قاسم نے سلطان کو بتایا۔

''سلطانِ معظم! میں پچھلے پانچ روز سے آپ کے حکم کے مطابق شہر میں موجود تھا۔ مجھے اپنے مصدقہ ذرائع سے یہ خبر ملی ہے کہ آج سے صرف دو روز بعد یعنی 15 اپریل کو جنیوا کے نو بڑے جہاز غلّہ اور گولہ بارود لے کر قسطنطنیہ پہنچنے والے ہیں۔ وہ آبنائے باسفورس کو لڑتے بھڑتے عبور کرتے ہوئے گولڈن ہارن کی بندرگاہ میں داخل ہونا چاہتے ہیں۔''

سلطان نے اپنے ماہر جاسوس قاسم بن ہشام کی اطلاع سنی تو خوشی سے پھولے نہ سمایا۔ سلطان نے اپنے امیر البحر کو فوری طور پر پیغام بھجوایا کہ وہ ان جہازوں کو صحیح سلامت گرفتار کرنے کی کوشش کرے۔ اور پھر 15 اپریل کے روز قاسم کی اطلاع درست ثابت ہوئی۔ جنیوا کے چار غلّے اور گولہ بارود سے لدے جہاز اچانک آبنائے باسفورس کے دہانے پر نمودار ہوئے۔ یہ جہاز عثمانی بحریہ کے جہازوں کی نسبت زیادہ بڑے اور مضبوط تھے۔ ترکی امیر البحر ''بلوط اغلن'' نے ان جہازوں کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ لیکن جنیوی ملاح جذبۂ شہادت سے سرشار تھے۔ وہ ترکی جہازوں کی صفوں کو چیرتے پھاڑتے ہوئے صاف بچ کر نکل گئے اور ''گولڈن ہارن'' میں داخل ہو کر شہر والوں کو یہ گراں قدر امداد پہنچانے میں کامیاب ہو گئے۔

سلطان کو اپنے امیر البحر ''بلوط اغلن'' کے ناکام ہونے کی اطلاع ملی تو وہ برافروختہ ہو گیا۔ سلطان غصے کی حالت میں اُٹھا اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر خود سمندر کے کنارے جا پہنچا۔ جنیوی جہازوں کے کامیابی سے ہمکنار ہونے کی خبر نے قسطنطنیہ کے شہریوں میں ایک نئی روح پھونک دی۔ عوام تک اُڑتی اُڑتی یہ خبر بھی جا پہنچی کہ ابھی جنیوی بیڑے کے مزید پانچ جہاز بھی ''بحر مارمورا'' میں موجود ہیں جو کچھ دیر بعد آبنائے باسفورس میں داخل ہونے والے ہیں۔ لوگ جوق در جوق عقبی فصیل کی جانب دوڑے اور آن کی آن میں قسطنطنیہ کے ہزاروں شہری ایک جم غفیر کی شکل میں فصیل شہر پر نظر آنے لگے۔ اُدھر عثمانی بری فوج کے ہزاروں سپاہی اس دلچسپ بحری جنگ کا ولولہ انگیز منظر دیکھنے کے لئے آ جمع ہوئے تھے۔ سلطان اپنے گھوڑے کی پیٹھ پر سوار نہایت بے چینی کے عالم میں اپنے امیر البحر کو انتہائی سخت احکامات بھیج رہا تھا کہ وہ ان پانچ جنیوی جہازوں کو کسی صورت آبنائے باسفورس عبور نہ کرنے دے۔

ہزاروں نگاہیں سمندر کی لہروں پر مرکوز تھیں۔ لوگوں نے دیکھا کہ جب جنیوی جہاز سمندر میں داخل ہوئے تو عثمانی بحریہ نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ ان جہازوں پر حملہ کر کے ان کی لمبی قطار کو توڑ دیا اور وہ ایک ہی جگہ آگے پیچھے اور پہلو بہ پہلو اکٹھے ہو گئے۔ عثمانی جہازوں نے چاروں طرف سے جنیوی بحریہ کے ان پانچوں جہازوں کو گھیر لیا اور ان پر آتش و آہن برسانے لگے۔ عثمانی جہاز جب پوری طرح مسیحی جہازوں پر غالب آ گئے تو بلوط اغلن نے اپنے جہازوں کو مسیحی جہازوں کے ساتھ لگا دیا۔ اسلامی بحریہ کے مجاہدوں کی یہ خواہش تھی کہ وہ کسی طرح مسیحی جہازوں پر سوار ہو جائیں اور اُن کے ملاحوں کو قتل کر کے ان کو گرفتار کر لیں۔ لیکن جنیوی جہاز اس قدر بڑے اور بلند تھے کہ عثمانی سپاہی اپنے چھوٹے اور پست جہازوں سے ان پر کسی طرح نہ چڑھ سکے۔

شروع شروع میں جب عثمانی جہازوں نے عیسائیوں کو گھیر لیا تو دیکھنے والی نگاہوں کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ پانچوں جہاز ضرور گرفتار ہو جائیں گے۔ لیکن پھر اچانک فصیل شہر کی جانب سے اُس وقت فلک شگاف شور بلند ہوا جب محصور عیسائی جہاز ترکوں کا محاصرہ توڑ کر بڑی تیزی سے ''گولڈن ہارن'' کے دروازے پر آ پہنچے۔ محصورین نے فوراً زنجیر نیچے کر دی اور جنیوی جہاز ''گولڈن ہارن'' میں داخل ہو گئے۔ سلطان محمد خان نے اپنی بحری فوج کی اس ناکامی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اُس کو سخت ملال ہوا۔ عیسائی جہاز ہاتھ سے نکلنے لگے تو سلطان سے ضبط نہ ہو سکا اور اُس نے بے اختیار ہو کر اپنا گھوڑا پانی میں ڈال دیا۔

فضا میں اہل قسطنطنیہ کے نعرہ ہائے مسرت گونج رہے تھے۔ جنیوی جہازوں کی اس شاندار فتح کا اخلاقی اثر محصورین پر بہت اچھا پڑا اور اُن میں جرأت و استقلال کی ایک نئی روح پیدا ہو گئی۔ سلطان نے غصے کے عالم میں اپنے امیر البحر کو بلوایا اور غم و غصے سے بے قابو ہو کر امیر البحر پر ہاتھ اٹھا دیا۔ لیکن امیر البحر کی اس میں کچھ خطا نہ تھی۔ اُس نے تو اپنے چھوٹے جہازوں کے ذریعے عیسائیوں کے دیوہیکل جہازوں کو محصور کر لیا تھا۔ لیکن مسلمانوں کے لئے اُن جہازوں پر سوار ہونا ممکن نہیں تھا۔ البتہ سلطان کی تنبیہ سے امیر البحر مستعد ہو گیا۔ اور اس کے بعد کسی اور جہاز کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ وہ درِ دانیال کو عبور کر کے بحر مارمورا میں داخل ہو سکے۔ ان پانچ جہازوں میں جو فوج سوار ہو کر آئی تھی یہ گویا قسطنطنیہ کے لئے آخری بیرونی امداد تھی۔ سلطان نے محاصرہ کے کام میں انتہائی درجہ کی مستعدی دکھائی۔ بار بار نقصان اٹھانا پڑا، بار بار حملے ناکام اور بے نتیجہ ثابت ہوئے۔ محصورین کی ہمتیں اپنی کامیابیوں کو دیکھ دیکھ کر اور بھی زیادہ بڑھتی رہیں۔ شہر کے اندر سامانِ رسد کی مطلق کمی نہ تھی۔ وہ برسوں محصور رہ کر مدافعت پر ثابت قدم رہنے کا ارادہ کر چکے تھے۔ اُن کو یہ بھی توقع تھی کہ ہنگری کا بادشاہ ''ہونیاڈے'' اپنے عہد نامۂ صلح کو توڑ کر ضرور شمال کی جانب سے حملہ آور ہو گا اور قسطنطنیہ کا محاصرہ اُٹھ جائے گا۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے سلطان محمد خان کی جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو یقیناً محاصرہ اٹھا کر چل دیتا اور اس کام کو کسی دوسرے وقت پر ٹال دیتا۔ مگر سلطان اپنے ارادے کا پکا اور ہمت کا دھنی تھا۔ اُس کے عزم و استقلال میں کوئی کمی نہ آئی اور اُس کے ارادے ہر ناکامی کو دیکھ کر اور زیادہ مضبوط ہوتے گئے۔

سلطان محمد خان جب ''ادرنہ'' سے چلا تھا تو اُس نے اپنے ہمراہ علماء، فضلاء، عابدوں اور زاہدوں کی ایک جماعت بھی رکھی تھی۔ ان برگزیدہ لوگوں کی صحبت سے مستفیض ہونے کا خیال اُس کو شروع ہی سے تھا۔ درویش صفت سلطان مراد خان ثانی نے اپنی زندگی کے آخری چھ سالوں میں سلطان محمد خان کو ''ایدین'' کے علماء و صوفیاء کی محفل میں بھیج دیا تھا۔ انہی نیک لوگوں کی صحبت سے اُس کے ارادوں میں استقلال اور حوصلوں میں بلندی پیدا ہوئی تھی۔ دورانِ محاصرہ بھی وہ ان لوگوں سے مشورے کرتا رہا۔ اپنی پہلی بحری شکست کے بعد محاصرہ میں مزید سختی پیدا کرنے کے لئے ایک روز سلطان محمد خان کو ایک ایسی تاریخی تدبیر سوجھی جس نے سلطان محمد خان ثانی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ''سلطان محمد فاتح'' بنا دیا۔

سلطان کو اندازہ ہو چکا تھا کہ آبنائے باسفورس کے اس حصہ میں جہاں پانی زیادہ گہرا

تھا، ترکی بیڑا عیسائیوں کے طاقتور جہازوں کے مقابلہ میں مشکل سے کامیاب ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اُس نے فیصلہ کیا کہ کشتیوں کی ایک بڑی تعداد اور بہت سے بحری جہاز جو عیسائی بحریہ سے نسبتاً چھوٹے تھے، بندرگاہ کے بالائی حصے میں منتقل کر دیئے جائیں جہاں پانی تنگ اور چھچھلا تھا۔ اور جس میں یونانی اور جنیوی جہاز اپنے قد و قامت کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکتے تھے۔ بندرگاہ کا بالائی حصہ ''گولڈن ہارن'' پر مشتمل تھا اور گولڈن ہارن پر کوئی زد نہ پڑ سکتی تھی۔ محاصرین کی تمام ہمت خشکی کی جانب صرف ہو رہی تھی۔ خاص کر ''سینٹ رومانس'' والے دروازے کی جانب آلاتِ قلعہ کشائی زیادہ کام میں لائے جا رہے تھے۔ لہٰذا اہل قسطنطنیہ بھی باقی اطراف سے بے فکر ہو کر اسی جانب اپنی پوری قوتِ مدافعت صرف کر رہے تھے۔

سلطان نے سوچا کہ گولڈن ہارن کی جانب یعنی سمندر کی طرف سے اگر شہر پر حملہ آور ہو سکے تو رومی افواج کی توجہ دو طرف تقسیم ہو جائے گی اور اس طرح فصیل شہر کو توڑ کر اس میں داخل ہونا ممکن ہو سکے گا۔ مگر سمندر کی جانب سے حملہ اُس وقت ہو سکتا تھا کہ گولڈن ہارن کے دہانہ پر آہنی زنجیر نہ ہوتی اور جہاز اُس میں داخل ہو سکتے۔ چنانچہ سلطان محمد خان نے اپنی ذہانت اور آہنی عزم و استقلال کی ایک غیر فانی مثال دی۔ سلطان کی تجویز سن کر آغا حسن، احمد کدک پاشا اور محمود پاشا جیسے سالار ہکا بکا رہ گئے۔ سلطان ایک ناممکن کام کو ممکن بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔

سلطان نے یہ کیا کہ آبنائے باسفورس کے گہرے پانی میں گشت کرنے والے اپنے جہازوں اور کشتیوں کو ''گولڈن ہارن'' میں داخل کرنے کے لئے جہازوں کو پانی کی بجائے خشکی پر چلانے کی عجیب و غریب تجویز پیش کی۔ سلطان محمد خان کا فیصلہ دنیا کی تاریخ میں ایک منفرد اور محیر العقول یادگار بننے والا تھا۔ اُس کا فیصلہ یہ تھا کہ جہازوں کو گولڈن ہارن میں پہنچانے کے لئے انہیں دس میل تک خشکی پر چلا کر لے جائے گا اور اس غرض کے لئے باسفورس کے مغربی ساحل سے جہاز خشکی پر چڑھا کر انہیں ایک ترچھے راستے سے گولڈن ہارن کے بالائی شمالی کنارے تک پہنچایا جائے گا اور وہاں سے انہیں ''گولڈن ہارن'' میں ڈال دیا جائے گا۔ خشکی کا یہ درمیانی علاقہ تقریباً دس میل لمبا، سخت ناہموار اور پہاڑی اتار چڑھاؤ سے بھرپور تھا۔ سلطان نے ماہ جمادی الاوّل کی چودہ تاریخ کو جب چاند کی چاندنی ساری رات پورے علاقے کو روشن رکھ سکتی تھی، باسفورس سے لے کر بندرگاہ گولڈن ہارن تک برابر لکڑی کے تختے بچھوا دیئے۔ یہ سلطان کی اولو العزمی کا ایک محیر العقول عجوبہ تھا۔

سلطان نے یہ کام ایک رات میں مکمل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اُس نے دس میل کے راستے پر تختے بچھوا کر اُن پر چربی ملوا دی اور چکناہٹ سے لکڑی کے وہ تمام تختے ایک خشک سمندر بن گئے۔

فصیل شہر سے دن بھر لوگ سلطانی سپاہیوں کو تختے بچھاتے اور چربی ملتے دیکھتے رہے۔ لیکن وہ حیران تھے کہ آخر مسلمان کیا کر رہے ہیں؟ رات ہوتے ہی سلطانی سپاہیوں نے اپنے بہترین 80 جہازوں کو کھینچ کر لکڑی کے تختوں پر چڑھا لیا۔ ان 80 جہازوں کی ٹرین جب خشکی پر چڑھ آئی تو اُن میں باقاعدہ ملاحوں اور بحری سپاہیوں کو سوار کر دیا گیا۔ اور پھر ہزارہا آدمیوں نے دونوں طرف سے ان جہازوں کو دھکیلنا شروع کر دیا۔ اس مقصد کے لئے ہوا کے جھونکوں نے بھی بھرپور تعاون کیا۔ چنانچہ سلطان نے اپنے جہازوں کے بادبان کھلوا دیئے۔ جہازوں کی اس ٹرین کو کھینچنے کے لئے انسانوں کے علاوہ بیلوں نے بھی اپنا پورا زور لگایا۔ راستہ طویل اور دُشوار گزار تھا۔ چاند کی چاندنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اور چاندنی رات میں ہزاروں آدمیوں کا شور وغل، خوشی کے نعرے اور فوجی گیت، فصیل شہر پر موجود عیسائی سنتے رہے۔ اور یہ سوچ سوچ کر حیران ہوتے رہے کہ آخر آج مسلمان کیا کر رہے ہیں۔

''قسطنطین'' نے خود فصیل پر پہنچ کر مسلمانوں کی نقل و حرکت کو ملاحظہ کیا۔ اُسے عثمانی فوج کے باجے سنائی دیئے، لیکن اس سے زیادہ وہ کچھ نہ سمجھ سکا کہ مسلمان خوشی منا رہے ہیں۔ رات بھر 80 جہازوں کا یہ جلوس سفر کرتا رہا اور قسطنطنیہ کے عیسائی آخر وقت تک کچھ نہ سمجھ سکے۔ بالآخر جب صبح کے اُجالے نے راز سے پردہ اٹھایا تو سلطانی لشکر کے 80 جہاز اور بھاری توپ خانہ ''گولڈن ہارن'' میں منتقل ہو چکا تھا۔

اہل قسطنطنیہ نے جب عثمانی بحریہ کے 80 اسلحہ بردار جہازوں کو گولڈن ہارن میں موجود دیکھا تو پورے شہر کی سانسیں رُکنے لگیں۔ یہ کیا ہو گیا تھا؟..... یہ تو ناممکن بات ممکن ہو گئی تھی۔ اہل قسطنطنیہ کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ انہوں نے دیکھا کہ عثمانی جہازوں نے فصیل شہر کے نیچے ایک پُل بنا دیا تھا اور اپنی توپوں کو مناسب مقامات پر رکھ کر اس طرف کی فصیل پر گولہ باری کرنے کی تیاری شروع کر دی تھی۔ یہ دیکھ کر عیسائیوں کے حواس جاتے رہے۔ قسطنطین کے جو جہاز گولڈن ہارن میں موجود تھے وہ سب کے سب گولڈن ہارن کے دہانہ کے قریب آہنی زنجیر کے متصل صف بستہ تھے تاکہ کسی کو اندر داخل نہ ہونے دیں۔ شہر کے قریب بندرگاہ کی نوک پر اُن کو رہنے کی ضرورت نہ تھی۔ قسطنطین کے

جہازوں نے عثمانی بحریہ کو گولڈن ہارن میں دیکھا تو اُن پر حملہ کرنے کے لئے آگے بڑھے۔ بندرگاہ کے دونوں کناروں پر سلطان محمد خان نے فی الفور اپنا توپ خانہ نصب کرا دیا تھا۔ عثمانی توپ خانے نے مسیحی جہازوں پر گولہ باری کی اور جو جہاز بھی آگے بڑھا اُسے بھاری گولوں کا نشانہ بنا کر گولڈن ہارن میں غرق کر دیا۔ اربان کی توپیں دھڑا دھڑ گولے پھینک رہی تھیں اور اس جنگ میں یہی وہ موقع تھا جب عثمانی توپخانے نے سب سے زیادہ خدمات انجام دیں۔ اس طرح یکایک سمندر کی طرف سے حملہ ہونے پر عیسائیوں کو اپنی طاقت تقسیم کرنی پڑی اور وہ مجبور ہو گئے کہ شہر کی اس جانب مدافعت اور حفاظت کے لئے زبردست فوج متعین کریں۔ گولڈن ہارن کا پانی زیادہ گہرا نہ تھا۔ چنانچہ عثمانی جہاز نہایت آسانی کے ساتھ اِدھر سے اُدھر دوڑتے پھر رہے تھے۔ سلطان نے گولڈن ہارن پر ایک پُل تعمیر کرنے کا حکم دیا اور یوں شہر کی یہ شمالی فصیل بھی خطرناک محاصرے اور یلغار کی زد میں آ گئی۔

یہ 24 مئی 1453ء کا دن تھا۔ اسی روز قسطنطین نے سلطان کے پاس پیغام بھیجا۔

''آپ جس قدر خراج مجھ پر مقرر کریں میں ادا کرنے کو تیار ہوں۔ مجھ کو اپنا باجگزار بنا کر قسطنطنیہ میرے ہی پاس رہنے دیجئے۔''

لیکن سلطان کو اس وقت اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ وہ شہر کو فتح کر لے گا۔ چنانچہ اُس نے قسطنطین کو جواب دیا۔

''اگر تم اطاعت قبول کرتے ہو تو تم کو یونان کا جنوبی حصہ دیا جا سکتا ہے۔ لیکن قسطنطنیہ کو میں اسلامی سلطنت میں شامل کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

سلطان جانتا تھا کہ قسطنطنیہ کی عیسائی سلطنت جو سلطنت عثمانیہ کے بیچوں بیچ واقع ہے جب تک قائم رہے گی، خطرات اور مصائب کا سد باب نہ ہو گا۔ وہ قسطنطین اور اُس کے پیش رو قیاصرہ کی مسلسل شرارتوں سے بخوبی واقف تھا۔ اور پھر اب تو قسطنطنیہ فتح ہونے میں بہت کم وقت رہ گیا تھا۔ چنانچہ قیصر کے ایلچی سلطانی خیمے سے بے نیل و مرام لوٹ گئے۔ اس دوران خشکی کی جانب سے برابر حملے جاری تھے۔ لیکن قسطنطنیہ کی ان زبردست دیواروں پر جو ایک ہزار سال سے دشمنوں کا مقابلہ کر رہی تھیں، ہنوز ان حملوں کا کوئی اثر ظاہر نہ ہوا تھا۔ اب عثمانی توپیں دو اطراف سے شہر کی فصیلوں پر زبردست گولہ باری کر رہی تھیں۔ اور بالآخر سات ہفتوں کی متواتر گولہ باری کے بعد قسطنطنیہ کی فصیلوں میں پہلی بار تین مختلف مقامات سے بڑے بڑے شگاف نمودار ہو گئے۔

''وہ فصیلیں جو صدیوں سے ہر دشمن کے تشدد کا مقابلہ کر رہی تھیں، عثمانی توپوں نے ان کا حلیہ بگاڑ دیا اور ان میں جگہ جگہ دراڑیں پڑ گئیں..... اور پھر ایک وقت وہ آیا کہ جب سینٹ رومانس کے دروازے کے قریب موجود چاروں برج 30 انچ قطر کے گولوں کا شکار ہو کر زمین پر آ گرے اور سطح کے برابر ہو گئے۔ اب سلطان محمد خان کو اپنے آخری حملے کی کامیابی کا یقین ہو چکا تھا۔'' (گبن)

سلطان نے قسطنطین کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر وہ شہر کو اُس کے حوالے کر دے تو رعایا کے جان و مال سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا اور ''موریا'' کی حکومت اُسے دے دی جائے گی۔ لیکن قسطنطین نے اسے منظور نہ کیا۔ چنانچہ سلطان محمد خان نے اپنے لشکر میں اعلان کروا دیا کہ 20 جمادی الاول یعنی 29 مئی کے روز آخری اور فیصلہ کن حملہ ہو گا۔ 19 جمادی الاول 857ھ بمطابق 28 مئی 1453ء کو سلطان محمد خان نے اپنی فوج میں پھر اعلان کروایا کہ کل علی الصبح شہر پر ہر طرف سے آخری حملہ ہو گا۔ فوج کو شہری تاخت و تاراج کی اجازت دی جائے گی۔ مگر اس شرط پر کہ وہ سرکاری عمارات کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں گے۔ اس کے علاوہ کوئی عثمانی سپاہی کسی نہتے، اسلحہ ڈالنے والے، امن طلب کرنے والے، ضعیف، بوڑھے اور بچوں وغیرہ کو ہاتھ نہ لگائیں گے۔ یہ خبر سنتے ہی کہ صبح کو فیصلہ کن حملہ ہو گا، مسلمانوں کے لشکر میں رات بھر خوشی کے نعرے بلند ہوتے رہے۔

اُدھر شہر کے اندر قصرِ شاہی میں قسطنطین نے اپنے سپہ سالاروں، عمائدین سلطنت اور اُمراء شہر کو مدعو کر کے ایک جلسہ منعقد کیا۔ اُس کو معلوم ہو چکا تھا کہ صبح فیصلہ کن حملہ ہونے والا ہے۔ چنانچہ اُس نے شہریوں کو آخری دم تک لڑنے اور مرنے مارنے کی ترغیب دی اور خود بھی بھرے مجمع میں خداوند یسوع مسیح کی قسم کھا کر کہا کہ وہ اپنے خون کے آخری قطرے تک ترکوں کا مقابلہ کرے گا۔ جلسہ ختم ہوا تو تمام سالار اپنی اپنی جگہوں پر زندگی کا آخری معرکہ لڑنے کے لئے پہنچ گئے۔ قیصر اس جلسے سے فارغ ہو کر سینٹ صوفیاء کے گرجے میں آیا اور اپنی آخری عبادت میں مصروف ہو گیا۔ آیا صوفیاء میں ہر پادری کے چہرے پر خوف اور پچھتاوے کی جھلک صاف دیکھی جا سکتی تھی۔ قیصر ''آیا صوفیاء'' میں عبادت سے فارغ ہو کر اپنے محل میں آیا جہاں یاس و ہراس چھایا ہوا نظر آتا تھا۔ وہاں چند لمحے آرام کرنے کے بعد وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور ''سینٹ رومانس'' کی طرف آیا جہاں محاصرین کے حملہ کا بہت زور تھا۔

عثمانی فوج رات بھر ذکر و تسبیح اور دُعاؤں میں مصروف رہی۔ خود سلطان محمد خان نماز

فجر سے فارغ ہو کر علماء اور درویشوں کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُن سے آخری حما
کامیابی کے لئے دُعا کی درخواست کی۔ اس مجمع علماء میں سلطان کے پیر و مرشد ''حضر
ایدنی رحمتہ اللہ علیہ'' بھی موجود تھے۔ سلطان کے پیر و مرشد نے آخری حملہ کے روز ا
لئے ایک الگ چھولداری نصب کروائی اور باہر ایک دربان کو بٹھا دیا کہ کسی شخص کو اند
آنے دیا جائے۔ اور اس طرح سلطان کے مرشد خود دُعا میں مصروف ہو گئے۔ سلطان
خان نے طلوعِ آفتاب سے کچھ دیر پہلے اپنے لشکر کو صف آراء کر کے اُن کے سامنے ایک
ولولہ انگیز تقریر کی جس میں یہ تاریخی جملہ بولا۔

''آج ہم ظہر کی نماز ''آیا صوفیاء'' میں ادا کریں گے۔''

سلطان نے تقریر ختم کر کے اپنے سالاروں کو بھرپور حملہ کرنے کا حکم دے دیا۔ آج 29
مئی 1453ء کا دن تھا۔ عثمانی فوج نے مختلف سمتوں سے حملہ کیا۔ توپوں اور منجنیقوں نے
جابجا شہر کی فصیل میں سوراخ کرنے شروع کر دیئے۔ حملہ ہر طرف سے ہو رہا تھا۔ لیکن
اس کا زیادہ زور سینٹ رومانس کے دروازے پر تھا۔ عثمانی فوج نے جگہ جگہ سے خندق کو
پاٹ دیا اور خندق کو اوپر سے عبور کرنے کے لئے سیڑھیاں اور کمندیں ڈال دیں۔ اور پھر
طلوعِ آفتاب کے ساتھ ہی آگ اور خون کا خوفناک کھیل شروع ہو گیا۔ ''سینٹ رومانس''
کی دیوار تو ترکی توپوں کی گولہ باری سے پہلے ہی مجروح ہو چکی تھی۔ چنانچہ مسلمان سپاہیوں
نے پورے جوش و خروش کے ساتھ ٹوٹی ہوئی دیوار کے رخنوں کو استعمال کیا اور شہر میں داخل
ہونے کی کوشش کی۔ مگر ہر مرتبہ اُن کی کوشش نہایت سختی سے ناکام بنا دی گئی۔ کئی مرتبہ عثمانی
لشکر کے بہادر شہر کے برجوں اور فصیل کے شکستہ حصوں پر چڑھ جانے میں کامیاب
ہوئے۔ مگر اندر سے ''جسٹینانی'' اور ''نوٹاراس'' کے سپاہی، قسطنطنیہ کے عام شہری حتیٰ کہ اُن
کی عورتیں اور بچے تک بھی لڑنے اور مدافعت کرنے میں مصروف ہو گئے۔ ہر طرف یہی
حالت تھی..... سمندر اور خشکی ہر دو اطراف سے جوش و خروش کے ساتھ حملہ جاری تھا۔ ایک
عجب ہنگامۂ رستخیز بپا تھا۔ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ مگر دونوں طرف سے کوئی فریق ذرا
بھر دبنے کے لئے تیار نہ تھا۔ قسطنطین خود گھوڑے پر بیٹھا صبح سے دوپہر تک بغیر کچھ کھائے
پیئے اِدھر سے اُدھر دوڑتا رہا۔ جان جسٹینانی نے تلوار بازی کے ایسے جوہر دکھائے کہ
سلطان محمد خان انگشت بدنداں رہ گیا اور بے اختیار ہو کر یہ خواہش کرنے لگا کہ
''کاش! یہ شخص میری فوج میں ہوتا۔'' (دولت عثمانیہ)..... دوپہر تک عثمانی فوج کا ایک سپاہی
بھی شہر میں داخل نہ ہو سکا۔ عیسائیوں نے اپنے مرکز ملت کو بچانے کے لئے حیرت انگیز

شجاعت کا ثبوت دیا اور ہر سپاہی جان مار کر لڑا۔ وہ ہر مرتبہ ترکوں کی باڑھ کو فصیل شہر پر
بے حد پامردی سے روکتے۔ تلواروں سے تلواریں ٹکراتیں اور ترک سپاہی عیسائیوں کا جانی
نقصان کرنے کے بعد یا شہید ہو جاتے..... اور یا فصیل سے گر جاتے۔

لیکن سلطان محمد خان اپنی ابتدائی ناکامیوں سے متاثر نہ ہوا۔ وہ ایک عزم کے ساتھ
اٹھا اور فصیل شہر کے نزدیک ایک مقام پر اُس نے دو رکعت نماز با جماعت ادا کرنے کا حکم
دیا۔ زمین کا وہ حصہ جہاں سلطان اور اُس کے ساتھیوں نے نماز ادا کی، ہمیشہ کے لئے
''فاتح نماز گاہی'' بن گئی۔ (جہانِ دیدہ)..... بالآخر سلطان نے اپنی لاڈلی فوج ینی چری کا
ایک بڑا دستہ اپنے ہمراہ لیا۔ جس کی صف اوّل میں آغا حسن، عبدالرحمٰن اور ریاض بیگ
جیسے سپاہی تھے۔ یونانی اور رومی اُس وقت تک بالکل خستہ ہو چکے تھے۔ اُن میں تازہ حملے
کی تاب نہ تھی۔ سلطان نے تازہ مہم پر روانہ ہونے سے پہلے اپنے ایک وزیر خاص کو اپنے
پیر و مرشد کی خدمت میں روانہ کیا اور عرض کی کہ یہ وقت خاص دُعا اور روحانی امداد کا ہے۔
محصورین کی ہمت اور سخت مدافعت دیکھ کر حملہ آوروں کے دل چھوٹے جاتے تھے اور
سلطان کو اندیشہ تھا کہ اگر آج قسطنطنیہ فتح نہ ہوا تو پھر کبھی نہ ہو سکے گا۔ کیونکہ آج حملہ آور
اپنی پوری ہمت اور طاقت صرف کر چکا تھا۔ سلطان کا فرستادہ جب اس مردِ خود آگاہ کی
چھولداری کے قریب پہنچا تو دربان نے اُسے اندر جانے سے منع کر دیا۔ لیکن عثمانی وزیر
نے دربان کو ڈانٹا اور کہا کہ وہ ضرور مرشد سلطانی کی خدمت میں حاضر ہو کر سلطان کا پیغام
پہنچائے گا۔

یہ کہہ کر سلطانی فرستادہ چھولداری میں داخل ہو گیا۔ اُس نے دیکھا کہ بزرگ سربسجود
اور دُعا میں مصروف ہیں۔ عثمانی وزیر کے داخل ہونے پر انہوں نے سر اٹھایا اور مسکراتے
ہوئے کہا۔ ''جاؤ!..... قسطنطنیہ فتح ہو چکا ہے۔'' (تاریخ اسلام)

عثمانی وزیر کو بزرگ کی بات پر یقین نہ آیا اور وہ واپس بھاگا۔ لیکن چھولداری سے نکل
کر اُس نے دیکھا کہ فصیل شہر پر اسلامی پرچم لہرا رہا تھا۔ دراصل جس وقت سلطان نے
اپنے فرستادہ کو اپنے پیر و مرشد کی طرف روانہ کیا تھا، وہ وقت بڑا نازک تھا۔ اور پھر ٹھیک
اُسی وقت فصیل شہر کا وہ حصہ جو سلطان کے سامنے تھا، یکایک خود بخود گر پڑا اور اس کے
گرنے سے خندق پُر ہو گئی۔ نتیجتاً شہر میں داخل ہونے کا راستہ صاف ہو گیا۔ ادھر فصیل کا
یہ حصہ گرا، اُدھر عین اُسی وقت بندرگاہ کی طرف سے بحری فوج نے ایک برج پر قبضہ کر
کے سلطانی علم نصب کر دیا۔ اس علم کو بلند اور سامنے کی دیوار کو منہدم دیکھ کر سلطان کا

ہمرکاب دستہ جس کا سالار آغا حسن تھا، بلا تامل شہر پر چڑھ دوڑا۔ لیکن عیسائی ابھی بھی ہار ماننے کو تیار نہ تھے۔ اور اسی دوران قسطنطین کو ایک اور گہری چوٹ یہ آئی کہ اُس کا بہادر سالار جان جسٹینانی جو گویا مدافعت کا رُوح تھا ایک گہرا زخم کھا کر کچھ ایسا خائف ہوا کہ جنگ سے بالکل ہی کنارہ کش ہو گیا۔ ایسے نازک وقت میں جب سلطان خود اپنی پوری قوت کے ساتھ حملہ کر رہا تھا، جسٹینانی اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر چلا گیا۔ اور یوں گویا اُس نے شہر دشمن کے سپرد کر دیا۔ قسطنطین نے جسٹینانی کو روکنے کے لئے شدید اصرار کیا، لیکن وہ اسلامی تلواروں سے ڈر چکا تھا۔ چنانچہ اُس نے ایک نہ سنی اور فوراً بندرگاہ کی جانب چلا گیا۔ اُس کے ہٹتے ہی عیسائیوں میں کمزوری کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ چنانچہ قسطنطین نے خود موقع پر پہنچ کر کمان اپنے ہاتھ میں لی۔ مگر ینی چری کا حملہ اتنا سخت تھا کہ عیسائیوں کی جانبازی زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ عیسائیوں نے خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا مگر وہ دست بدست لڑائی میں مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کے اہل نہ تھے۔

ینی چری کا سردار آغا حسن اپنے تیس بہترین ساتھیوں کے ہمراہ فصیل شہر پر کامیابی کے ساتھ چڑھ گیا..... قسطنطین اور اُس کا محافظ دستہ آغا حسن کو روکنے کے لئے خود آگے بڑھے۔ تیس مسلمان سپاہیوں کے مقابلے میں کئی سو عیسائی نکل آئے۔ نتیجہ صاف ظاہر تھا..... لیکن آغا حسن نتیجے سے بے پرواہ قسطنطین کے شاہی دستے پر اپنی تلوار کی بجلیاں گراتا ہوا آگے سے آگے بڑھنے لگا۔ آغا حسن کے جسم پر ہزاروں زخم آئے لیکن اُس کا ہاتھ کسی خود کار مشین کی طرح بدستور چلتا رہا۔ یہاں تک کہ آغا حسن زخموں سے چور چور ہو کر گرا اور کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے اپنی جان، جانِ آفریں کے سپرد کر دی..... ینی چری کے تیس سپاہیوں میں سے اٹھارہ شہید ہو کر گر گئے۔ تاہم باقی کامیاب رہے اور ان کے عقب میں مزید ترکی دستوں کی کمک پہنچ گئی۔ اب ہر طرف سے حملہ آور شہر میں داخل ہونے لگے اور دروازے توڑ توڑ کر اندر گھسنے لگے۔ شہر کے چاروں طرف فصیل کے ساتھ ساتھ اور فصیل کی اندرونی جانب عیسائیوں کی لاشوں کے انبار لگ گئے۔ اب شہر کی سب سے بڑی فصیل پر سرخ ہلالی پرچم لہرا رہا تھا۔

قسطنطین جو اب تک بے جگری کے ساتھ لڑ رہا تھا، اپنے انتہائی بہادر ساتھیوں کے حوصلہ چھوڑ دینے پر اُمید کا دامن چھوڑ بیٹھا اور اُس نے اپنے چاروں طرف دیکھتے ہوئے باآواز بلند پکارا۔

''کیا کوئی عیسائی نہیں ہے جو مجھے اپنے ہاتھوں سے قتل کر دے؟..... کیا کوئی عیسائی

نہیں ہے جو مجھے اپنے ہاتھوں سے قتل کر دے؟''

لیکن جب روم کے آخری قیصر کو کوئی جواب نہ ملا تو اُس نے قیاصرۂ روم کی خصوصی پوشاک اتار کر پھینک دی اور عثمانی فوج کے بڑھتے سیلاب میں گھس کر ایک سپاہی کی طرح بہادری سے لڑتا ہوا مارا گیا..... اور اس طرح اُس کی موت پر گیارہ سو سال سے قائم بازنطینی سلطنت رومہ کا خاتمہ ہو گیا۔ جس کی ابتداء بھی قسطنطین سے ہوئی تھی اور انتہا بھی قسطنطین پر ہوئی۔ اور اس کے بعد..... ''قیصر'' کا لقب ایک تاریخی داستان بن کر رہ گیا۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد پورا ہوا کہ..... ''اذا ھلک قیصراً، فلا قیصر بعدہ''.....

چند لمحوں کے اندر اندر قسطنطنیہ، فاتحین کے پے در پے دستوں سے بھر گیا۔ پہلے تو انہوں نے فتح کے ابتدائی جوش میں بچے کھچے سپاہیوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد جب یہ جوش ٹھنڈا ہوا اور اہل قسطنطنیہ کی طرف سے کوئی مزاحمت باقی نہ رہی تو عثمانیوں نے اپنی تلواریں نیاموں میں کر لیں۔ سلطان محمد خان اپنے بہادر سالاروں اور معتمد ساتھیوں کے ہمراہ گھوڑے پر سوار ہو کر اُسی منہدم فصیل کے راستے شہر میں داخل ہوا اور شہر کے بیچوں و بیچ سے گزرتا ہوا ''آیا صوفیاء'' کے چرچ کے پاس پہنچا۔ یہاں اُس ستون کے پاس جس کے ساتھ ترکوں کی شکست کی پیشگوئی منصوب تھی، ہزاروں عیسائی پناہ گزین تھے۔ دراصل عیسائیوں کے اعتقاد کی بنیاد.....

> ''ایک جوشیلے یا اختراع پرداز پادری کے الہام پر تھی۔ جس نے یہ بشارت دی تھی کہ ایک روز ترک قوم کے لوگ قسطنطنیہ میں داخل ہو جائیں گے۔ اور رومیوں کا تعاقب کرتے کرتے اُس ستون تک پہنچ جائیں گے جو شاہ قسطنطین کے نام سے منسوب ہے۔ لیکن بس یہی اُن کے مصائب کا نقطۂ آغاز ہو گا۔ کیونکہ اس موقع پر ایک فرشتہ ہاتھ میں تلوار لئے نازل ہو گا اور اپنے آسمانی کے ذریعے قسطنطنیہ کی سلطنت ایک ایسے غریب آدمی کے حوالے کر دے گا جو اُس وقت اُس ستون کے پاس بیٹھا ہو گا۔ فرشتہ اُس شخص سے کہے گا..... یہ تلوار پکڑو اور اس سے خداوند کا انتقام لو..... بس! اس حیات آفریں جملے کو سنتے ہی ترک فوراً بھاگ کھڑے ہوں گے اور رومی فتح یاب ہو کر ترکوں کو مغلوب کر دیں گے۔ وہ ترکوں کو مغرب اور اناطولیہ سے ایران کی سرحدوں تک بھگا دیں

گے۔'' (انگریز مؤرخ ایڈورڈ گبن)

سلطان کا گھوڑا جب اُس ستون کے پاس پہنچا تو قسطنطنیہ کے ہزاروں عیسائی سر اٹھا اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔ انہیں توقع تھی کہ آسمانی فرشتہ ہاتھ میں تلوار لئے ابھی نازل ہوگا اور ترک سلطان اپنے ساتھیوں سمیت بھاگ اُٹھے گا۔ لیکن سلطان محمد خان اُس ستون سے بھی آگے بڑھ کر ''سینٹ صوفیاء'' کے دروازے تک پہنچ گیا۔ نہ کوئی فرشتہ آسمان سے اُترا اور نہ رومیوں کی شکست فتح میں تبدیل ہوئی۔ کلیسا میں جمع عیسائیوں کا ہجوم آخر وقت تک کسی غیبی امداد کا منتظر رہا۔ یہاں تک کہ اس کلیسا کے بارے میں یہ طلسماتی یا اعتقادی توہمات سلطان کے ہاتھوں ہمیشہ کے لئے خاک میں مل گئے۔

آج وہ سلطان محمد خان نہیں..... بلکہ ''سلطان محمد فاتح'' بن چکا تھا۔

قاسم بن ہشام بھی سلطان محمد فاتح کے ہمراہ ''آیا صوفیاء'' کے دروازے پر اپنے گھوڑے پر سے اترا۔ وہ یہاں کئی مرتبہ آ چکا تھا۔ سلطان ابھی ''آیا صوفیاء'' کے دروازے پر ہی موجود تھا کہ قاسم بے صبری کے ساتھ آیا صوفیاء میں داخل ہو گیا۔ چرچ کے ہال میں اُس کے جانے پہچانے پادری اور راہبائیں جمع تھیں۔ اُن سب نے قاسم کو چونک کر دیکھا اور اُس کی فاتحانہ واپسی پر حیران رہ گئے۔ لیکن قاسم کو تو ''سونیا'' کے پاس پہنچنا تھا۔ اُسے سونیا ہال میں کہیں نظر نہ آئی تو وہ تیزی سے بالائی منزل کی طرف بھاگا۔ وہ دو دو زینے ایک ساتھ پھلانگتا ہوا راہداری میں پہنچا اور تیزی سے دوڑتے ہوئے سونیا کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔

قاسم نے جونہی سونیا کے کمرے کا دروازہ دھکیلا، اُس کے منہ سے بے ساختہ اوہو کی درد بھری آواز نکل گئی..... سونیا کمرے کے وسط میں فرش پر چاروں شانے چت پڑی تھی۔ اُس کے پیٹ میں ایک لمبی تلوار پیوست تھی جو صلیب کی شکل پر بنی ہوئی تھی۔ سونیا کا خون فرش سے بہہ بہہ کر دروازے کی طرف جا رہا تھا۔ سونیا خود لہو میں لت پت آنکھیں دروازے پر ٹکائے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے امر ہو چکی تھی.....!

قاسم دوڑ کر سونیا کے پاس پہنچا۔ لیکن وہ مر چکی تھی۔ اُس کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ وعدے کے مطابق اب بھی قاسم کی منتظر تھی۔ قاسم نے سونیا کی نبضیں ٹٹول کر دیکھیں اور پھر اُس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے با آوازِ بلند انا للہ و انا الیہ راجعون کہا۔ قاسم نے حالات کا جائزہ لے کر اندازہ لگایا کہ سونیا نے خودکشی نہ کی تھی بلکہ اُسے قتل کیا گیا تھا۔ قاسم کا ذہن فوراً شاگال کی طرف چلا گیا۔ یہ یقیناً اُسی مکروہ انسان کا مذموم فعل تھا۔ قاسم

کی آنکھوں میں شاگال کا تصور کر کے خون اترنے لگا۔

سلطان محمد فاتح نے اپنے سپاہیوں کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ وہ ظہر کی نماز آیا صوفیاء میں پڑھے گا۔ چنانچہ فوری طور پر ''آیا صوفیاء'' کے ہال سے عبادت کی نشستیں ہٹا دی گئیں اور آیا صوفیاء کے ہال میں سلطان محمد فاتح کے حکم پر اللہ اکبر کی صدائیں گونجنے لگیں۔ سلطان اور اُس کے ساتھی خدائے واحد کی تسبیح و تقدیس کے لئے سربسجود ہوئے تو آیا صوفیاء کے ہال میں ایک طرف کھڑے عیسائی پادریوں کی آہیں اور سسکیاں نکل گئیں۔ نماز سے فارغ ہو کر سلطان محمد فاتح نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ جا کر قسطنطین کی لاش کو تلاش کریں..... قسطنطین ''سینٹ رومانس'' کے دروازے کے نزدیک ہی لڑتا ہوا مارا گیا تھا۔ سب سے زیادہ کشت و خون سینٹ رومانس کے دروازے پر ہوا تھا جہاں اس وقت عیسائیوں کی لاشوں کے انبار پڑے تھے۔ اس جگہ بہت سی لاشوں کے درمیان قسطنطین کی لاش ملی جس کے جسم پر صرف دو زخم آئے تھے۔ سلطان کے سپاہی قسطنطین کا سر کاٹ کر سلطان محمد فاتح کی خدمت میں لے آئے۔ اور اس طرح فتح قسطنطنیہ تکمیل کو پہنچ گئی.....!

اگلے روز سلطان قیاصرۂ روم کے شاہی محل میں پہنچا۔ اُس نے دیکھا کہ اس وسیع و عریض محل میں ہو کا عالم تھا۔ سلطان نے اس ویرانی اور خاموشی کو دیکھا تو بے اختیار اُس کی زبان پر یہ شعر آ گیا۔

پردہ داری می کند برقصرِ کسریٰ عنکبوت
چغد نوبت فی زند برگنبد افراسیاب

(دولت عثمانیہ)

اس معرکے میں چالیس ہزار عیسائی مسلمانوں کے ہاتھوں مقتول ہوئے اور ساٹھ ہزار جنگجو عیسائیوں کو مسلمانوں نے گرفتار کر لیا۔ بہت تھوڑے ایسے تھے جو فتح قسطنطنیہ کے بعد کسی نہ کسی طرح خشکی یا سمندر کے راستے بچ کر نکل گئے۔ قیصر کے خاندان کا کوئی آدمی گرفتار نہ ہو سکا اور سب بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوئے۔ اکثر ''اٹلی'' میں اور بہت تھوڑے بعض دیگر مقامات پر جا کر پناہ گزین ہوئے۔ قیصر قسطنطین کا ایک پوتا چند روز کے بعد مسلمان ہو گیا اور قسطنطنیہ میں آ کر رہنے لگا۔ بالآخر بہت جلد اس خاندان کا نام و نشان مٹ گیا۔

شاہی محل سے فارغ ہو کر سلطان نے قسطنطنیہ کے مشہور گھڑ دوڑ کے میدان ''ہپوڈروم'' میں اپنے لشکر کو جمع کیا اور نمازِ شکرانہ ادا کی۔ ''ہپوڈروم'' صرف گھڑ دوڑ کا میدان ہی نہ تھا

بلکہ یہاں پر نئے بادشاہوں کی تاجپوشی کا اعلان ہوتا تھا۔ یہیں پر فتح مند جرنیل فتح کا جشن مناتے۔ یہیں پر مجرموں کو پھانسی دی جاتی اور منحرف عیسائی فرقوں کو زندہ جلایا جاتا۔ اسی میدان میں وحشی جانوروں کی نمائش اور جسمانی کرتب کے تماشے منعقد ہوتے۔ تاریخ میں کئی بار حکومت کے خلاف بغاوتیں اسی میدان سے شروع ہوئیں اور یہ میدان نہ جانے کتنی مرتبہ انسانوں کے خون سے لالہ زار ہوا تھا۔ آج سلطان محمد خان فاتح اسی میدان میں دربارِ عام لگا کر قسطنطنیہ کو اپنا پایۂ تخت قرار دینے والا تھا۔

''ہپوڈروم'' میں تین ستون نصب تھے۔ ایک ستون چوتھی صدی قبل مسیح میں، دوسرا پانچویں صدی عیسوی میں اور تیسرا دسویں صدی عیسوی میں تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ ستون تین مختلف بازنطینی بادشاہوں نے اپنی یادگار کے طور پر تعمیر کئے تھے۔ سلطان محمد فاتح سب سے چھوٹے ستون کے پہلو میں اپنی مسند لگا کر بیٹھا تو اُس کی نظر ہپوڈروم میدان کے ستون پر پڑی۔ اس چھوٹے ستون پر پتھر کے تراشے ہوئے تین اژدھے لپٹے ہوئے تھے۔ سلطان اژدھوں کو دیکھ کر اپنی جگہ سے اُٹھا اور اپنی بھاری جنگی تبر سے ان اژدھوں کے سر اُڑا دیئے۔

''ہپوڈروم'' میں ابھی سلطان کا دربار جاری تھا اور سلطان محمد فاتح اپنے نئے احکامات کا اعلان کر رہا تھا۔ سلطانی افواج اور مسلمانوں کے علاوہ اس وسیع میدان میں ہزاروں یونانی اور عیسائی باشندے بھی موجود تھے۔ اہل قسطنطنیہ آج اپنے نئے بادشاہ کو دیکھنے آئے تھے۔ عثمانی فوج نے کل ہی شہر میں امن و امان قائم کر دیا تھا۔ سلطان نے شہر بھر میں اعلان کروا دیئے کہ قسطنطنیہ کے ہر شہری کا جان و مال محفوظ رہے گا۔ یہی وجہ تھی کہ آج مفتوح قوم کے شہری ڈرتے ڈرتے یہاں چلے آئے تھے۔

قاسم بن ہشام دربارِ سلطانی میں شرکت کے لئے دیر سے آیا تھا۔ وہ دن بھر بندرگاہ پر گھومتا رہا تھا۔ اُسے شاگال کی تلاش میں نکلنے کے لئے ایک تیز رفتار بحری جہاز اور چند سپاہیوں کی ضرورت تھی۔ لیکن دوپہر تک قاسم کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ دراصل وہ فی الحال قسطنطنیہ سے نکل بھی نہیں سکتا تھا۔ سلطان محمد فاتح کسی بھی وقت قاسم کو طلب کر سکتا تھا۔ البتہ اب قاسم نے سوچ لیا تھا کہ وہ مارسی کی بازیابی کے لئے خود سلطان سے بات کرے گا اور اس مشن پر سلطان کی مرضی سے روانہ ہوگا۔ قاسم کے اہل خانہ بھی قسطنطنیہ میں ہی مقیم تھے۔ اہلیانِ قسطنطنیہ میں سے جو لوگ شہر چھوڑ کر چلے گئے تھے، اُن کے مکانات خالی پڑے تھے۔ اسی طرح کے مکانوں میں سلطان نے لشکر کی خواتین اور بعض زخمیوں کو منتقل

کر دیا۔ حمیرا بھی وہیں موجود تھی۔ قاسم جلد سے جلد مارسی کی تلاش میں نکلنا چاہتا تھا۔ قاسم ''ہپوڈروم'' کے میدان میں داخل ہوا..... اور سیدھا عمائدین سلطنت کی قطار کی جانب بڑھنے لگا۔ ابھی وہ بھیڑ کو چیرتا ہوا چند قدم ہی اٹھا پایا تھا کہ ایک دم ٹھٹھک کر رُک گیا۔

اُسے ایک جانی پہچانی شکل دکھائی دی تھی۔ یہ ''مقرون'' تھا۔ وہی یونانی سالار جس کے ساتھ قاسم کی پہلی ملاقات مچھیروں کی بستی میں ہوئی تھی۔ یہی مقرون ہی تو تھا جس نے معصوم مچھیرن روزی کو اغواء کر لیا تھا اور قاسم نے روزی کی بازیابی کے لئے یونانیوں پر دھاوا بول دیا تھا۔ قاسم نے مقرون کو دیکھا تو اُسے حیرت ہوئی۔ مقرون سادہ لباس میں تھا اور اُس نے عام دیہاتیوں کی طرح سر کے گرد کپڑا لپیٹ رکھا تھا۔ قاسم نہ جانے کیوں مقرون کو دیکھ کر رُک گیا۔ اُسے مقرن کے چہرے پر تجسّس اور سنسنی نظر آئی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی کو ڈھونڈ رہا ہو۔ مقرون سلطانی جلسے سے بے پرواہ قسطنطنیہ کے شہریوں میں گھوم رہا تھا۔ وہ ایک ایک شخص کا چہرہ غور سے دیکھتا پھر رہا تھا۔ قاسم کی چھٹی حس بیدار ہوگئی اور اُس کے اندر کا جاسوس چوکنا ہوگیا۔ وہ سلطانی دربار کی طرف بڑھنے کی بجائے مقرون کا تعاقب کرنے لگا۔

مقرون دیر تک بھیڑ میں کسی شخص کو تلاش کرتا رہا۔ اُس کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ بہت جلدی میں ہے۔ اور پھر مقرون جب اپنے مطلوبہ شخص کو تلاش کرنے میں ناکام رہا تو بھیڑ سے نکلنے لگا۔ قاسم اُس کے پیچھے تھا۔ مقرون پیدل چل رہا تھا اور قاسم دل ہی دل میں دُعا کر رہا تھا کہ مقرون پیدل ہی چلتا رہے۔ کیونکہ اگر مقرون گھوڑے پر سوار ہوتا تو قاسم کے لئے اُس کا تعاقب کرنا آسان نہ تھا۔ قاسم کی دُعا قبول ہوئی اور مقرون پیدل ہی چلتا رہا۔ مقرون مختلف گلیوں اور بازاروں سے گزرتا ہوا شہر کی مشرقی سمت میں جانے لگا۔ اس طرف بہت پرانی فصیل تھی۔ کئی فٹ چوڑی اور پانچ میل سے زیادہ لمبی یہ فصیل کھلے سمندر کی جانب تھی جس سمت میں آبنائے باسفورس کا چوڑا پاٹ تھا۔ شہر کی آبادی اس جانب زیادہ گنجان نہ تھی۔ کیونکہ فصیل میں کہیں کوئی بڑا دروازہ نہ تھا۔ یہ گویا قسطنطنیہ کی عقبی سمت تھی۔ مقرون ایک طویل سفر پیدل طے کر کے شمال مشرقی کھنڈرات کی جانب بڑھنے لگا۔ قاسم کی رگِ تجسّس پھڑکنے لگی۔ یقیناً..... کوئی راز کی بات تھی..... یقیناً کوئی خفیہ معاملہ تھا۔ مقرون ویران کھنڈرات تک جانے کے لئے گھنے درختوں اور آڑھے ترچھے راستوں پر چل رہا تھا۔ قاسم نے اپنے اور مقرون کے درمیان اتنا فاصلہ رہنے دیا تھا کہ مقرون کو تعاقب کا پتہ نہ چل سکے۔

بالآخر قاسم کو ایک شکستہ حال عمارت نظر آئی۔ یہ عمارت کسی قدیم چرچ کی تھی۔ عمارت کے دروازے پر لکڑی کی صلیب نصب تھی۔ مقرون اسی کھنڈر نما عمارت میں داخل ہو گیا تھا۔ قاسم نے مقرون کو اس تاریک کھنڈر میں داخل ہوتے دیکھا تو اپنے قدموں کی رفتار کو تیز کر دیا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ آخر مقرون اس ویرانے میں کس مقصد کے تحت آیا ہے اور چرچ کی عمارت میں کیا کرنے کے لئے گھسا ہے؟ قاسم چیتے کی طرح ہوشیاری کے ساتھ چلتا ہوا چرچ کی عمارت کے نزدیک جا پہنچا۔ چرچ کا بیرونی برآمدہ بے حد شکستہ تھا۔ برآمدے کے سال خوردہ ستون اندر کی طرف جھکے ہوئے تھے۔

قسطنطنیہ کا یہ علاقہ اُونچی نیچی چٹانوں کے ایک سلسلے پر مشتمل تھا۔ کھنڈر نما چرچ انہی چٹانوں میں واقع تھا۔ قاسم چرچ کی عمارت میں سامنے سے داخل ہونے کی بجائے پہلو کی طرف سے گھوم کر چرچ کے عقب میں نکل آیا۔ چرچ کی عقبی دیوار میں بھی دروازہ تھا، لیکن لکڑی کا یہ بھاری دروازہ بند تھا۔ قاسم دبے قدموں دروازے کے قریب آیا اور سال خوردہ دروازے کی جھریوں سے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔ قاسم کو چرچ کے اندر سوکھے سڑے پتوں کے علاوہ کچھ نظر نہ آیا..... ارے! یہ مقرون کہاں چلا گیا؟ قاسم نے سوچا۔ اور پھر قاسم تیزی سے واپس دوڑا اور وہ سیدھے راستے سے چرچ میں داخل ہونے جا رہا تھا۔ قاسم نے اپنی تلوار نکال لی تھی اور وہ ہر طرح کی صورتحال سے نمٹنے کے لئے پوری طرح تیار تھا۔

قاسم نہایت احتیاط کے ساتھ چرچ میں داخل ہوا۔ یہاں واقعی کوئی نہ تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا چرچ تھا۔ قاسم کڑکڑاتے ہوئے پتوں سے بچتا بچاتا اس اکلوتے دروازے کی طرف بڑھنے لگا جو چرچ کی داہنی دیوار میں تھا۔ اس طرح سے چرچ کی عمارت ایک اُونچی چٹان کے ساتھ منسلک تھی..... بالفاظ دیگر یہ دروازہ چرچ کے اندر سے چٹان میں کھلتا تھا۔ دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔ قاسم احتیاط سے دروازے میں داخل ہوا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہاں ایک چھوٹا سا حجرہ تھا اور وہ بھی خالی تھا۔ تو پھر مقرون کہاں چلا گیا تھا؟ اُسے زمین نگل گئی تھی یا آسمان نے اُٹھا لیا تھا۔ یہ چھوٹا سا محرابی طرز کا حجرہ دراصل بیرونی چٹان کو تراش کر بنایا گیا تھا جیسے کسی پادری کی رہائش گاہ کے طور پر استعمال کیا گیا ہو۔ لیکن اس وقت یہ کمرہ بھی خالی دیکھ کر قاسم کی چھٹی حس کسی بڑے خطرے کا اعلان کرنے لگی۔ قاسم نے مقرون کو خود اپنی آنکھوں سے چرچ میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور اب مقرون غائب تھا۔

معاً قاسم کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ ممکن ہے چرچ کے اس حجرے سے کوئی خفیہ راستہ کسی اور جانب نکلتا ہو۔ اسی خیال کے تحت قاسم حجرے کی دیواروں کو غور سے دیکھنے لگا۔ حجرے کے فرش پر ایک کونے میں گھاس پھونس کا ایک چھوٹا سا ڈھیر پڑا تھا۔ قاسم فوراً آگے بڑھا اور کونے میں پڑا گھاس پھونس ہٹانا شروع کر دیا..... یہاں تو واقعی راستہ تھا۔ اوپر کی سطح پر لکڑی کا ایک بڑا سا تختہ رکھا تھا۔ قاسم نے آواز پیدا کئے بغیر لکڑی کا پھٹا اُوپر اُٹھا دیا۔ نیچے سرنگ تھی۔ لیکن سرنگ کے فرش تک پہنچنے کے لئے قاسم کو آٹھ فٹ کی بلندی سے چھلانگ لگانا تھی۔ سرنگ میں اس قدر تاریکی تھی کہ قاسم بغیر کسی احتیاط کے اترتا تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اُسے کیا معلوم مقرون سرنگ کے اندر کس جگہ چھپا ہے۔ لیکن قاسم یہ خطرہ مول لئے بغیر رہ بھی تو نہ سکتا تھا۔ چنانچہ اُس نے چھلانگ لگانے کی بجائے لٹک کر نیچے سرنگ میں اُترنا مناسب خیال کیا۔ اور پھر قاسم نے فرش کے کناروں پر ہاتھ رکھ کر خود کو نیچے لٹکا لیا۔ اگلے لمحے وہ تاریک سرنگ میں تھا۔ پہلے پہل تو قاسم کو کچھ نہ دکھائی دیا۔ لیکن پھر تھوڑی دیر بعد اُس کی آنکھیں اندھیرے کی عادی ہونے لگیں اور اُسے اپنے سامنے ایک طویل سرنگ دکھائی دی۔ اس سرنگ کا رُخ مشرق کی جانب تھا اور یہ تقریباً آدھے کوس سے زیادہ لمبی تھی۔ قاسم نے اندازہ لگایا کہ یہ سرنگ یقیناً شہر کی مشرقی فصیل کے نیچے سے گزر رہی تھی۔ تو گویا یہ سرنگ قسطنطنیہ سے باہر باسفورس کے ساحل پر نکلتی تھی۔ کیونکہ پون کوس دُور قاسم کو تیز روشنی کا ایک چھوٹا سا ہالہ دکھائی دیا۔ یہ سرنگ کا بیرونی دہانہ تھا۔ اب قاسم سرنگ میں ہر چیز کو دیکھ سکتا تھا۔ قاسم کو مقرون یہاں بھی دکھائی نہ دیا۔ کچھ سوچ کر قاسم نے سرنگ سے باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ وہ مقرون کو باسفورس کے ساحل سے کسی کشتی میں سوار ہونے کا موقع نہ دینا چاہتا تھا۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ مقرون کو گرفتار کر کے اُس سے پوچھ گچھ کرے گا۔

تھوڑی دیر بعد قاسم سرنگ سے باہر تھا۔ یہ قسطنطنیہ کی عقبی سمت تھی۔ قاسم سرنگ کے دہانے سے جونہی باہر آیا، اُس کی نظریں باسفورس کے پانی میں لنگر انداز ایک چھوٹے سے جہاز پر پڑیں۔ جہاز کے بادبان کھلے ہوئے تھے اور وہ ساحل سے پچاس گز دُور گہرے پانی میں لنگر انداز تھا۔ سامنے کھڑے جہاز کے عرشے پر کوئی پرچم نصب نہ تھا جس سے قاسم اندازہ لگاتا کہ یہ جہاز کس کی ملکیت ہے۔ لیکن جہاز کا رنگ دیکھ کر قاسم کا ماتھا ٹھنکا۔ تمام جہاز پر سیاہ تیل مل کر جہاز کو کالا کر دیا گیا تھا۔ غالباً رات کی تاریکی میں جہاز کو چھپانے کی نیت سے ایسا کیا گیا تھا۔ قاسم کے دماغ میں ڈیوڈ کے الفاظ گھومنے لگے۔ ڈیوڈ

نے کہا تھا کہ شاگال کا جہاز کالا ہے۔ ایک دم قاسم کی تمام حسیں بیدار ہو گئیں۔ شروع سے اب تک وہ جس جہاز کو تلاش کرتا رہا تھا، وہ پراسرار جہاز خود بخود قاسم کے سامنے آ گیا تھا۔ گویا قدرت قاسم پر مہربان تھی۔ نہ جانے کیوں اس پراسرار جہاز کو دیکھ کر قاسم کا دماغ غصے سے سنسنانے لگا۔ اُسے غصہ کیوں نہ آتا؟ مکروہ شاگال کسی دیو کی طرح اُس کی ماری کو اٹھا کر لے گیا تھا۔ قاسم کو مقرون اب مکمل طور پر بھول چکا تھا۔ وہ تو صرف اور صرف شاگال کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ لیکن یکایک قاسم کو اپنے بائیں جانب ویران چٹانوں نے متوجہ کر لیا۔ قاسم نے کوئی آواز سنی تھی۔ بالکل ویسی آواز جیسی پانی میں کسی چیز کے گرنے سے پیدا ہوتی ہے..... یہ چھپاکے کی آواز تھی۔ قاسم ایک دم اپنی بائیں جانب دوڑا۔ برہنہ شمشیر قاسم کے ہاتھ میں تھی۔ وہ تیزی سے دوڑتا ہوا چٹان کے پاس پہنچا اور چٹان کی ایک طرف سے گھوم کر اُس چھوٹے سے کٹاؤ کے پاس آ گیا جس میں سے چھپاکے کی آواز پیدا ہوئی تھی۔

مقرون قاسم کے سامنے تھا..... چٹانوں کی اوٹ میں موجود ایک چھوٹے سے کٹاؤ کے اندر مقرون کی کشتی کھڑی تھی اور جس وقت قاسم وہاں پہنچا، مقرون کشتی میں سوار ہو چکا تھا۔ یقیناً مقرون اپنی کشتی لئے شاگال کی طرف جانے والا تھا۔ اور اگر یہ کشتی یہاں سے ہٹ جاتی تو پھر قاسم کے لئے شاگال کے جہاز تک پہنچنا ممکن نہ رہتا۔ مقرون ابھی تک قاسم کو نہ دیکھ پایا تھا۔ قاسم مقرون سے کئی فٹ بلند چٹان پر کھڑا اُسے جہاز کی جانب جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ قاسم نے ایک لمحے میں حتمی فیصلہ کیا اور پھر ذرا سی دیر کئے بغیر مقرون پر چھلانگ لگا دی..... وہ فضا میں اُچھلتا ہوا مقرون پر آ رہا۔ کشتی نے زور سے ہچکولا لیا اور وہ دونوں کشتی سے گرتے گرتے بچے۔ چھلانگ لگاتے وقت قاسم کی تلوار اُس کے ہاتھ میں تھی۔ اور جونہی وہ مقرون پر آیا اُس کے داہنے ہاتھ نے کام دکھایا اور تلوار کا دستہ مقرون کے سر کو پھاڑتا ہوا نکل گیا۔ لیکن مقرون ابھی تک زندہ تھا۔ چنانچہ قاسم نے اُسے تلوار نکالنے کا موقع نہ دیا اور اپنی ہلالی شمشیر مقرون کے دل میں گھسیڑ دی۔ مقرون کی چیخ اُس کے حلق میں پھنس کر رہ گئی اور وہ بری طرح تڑپنے لگا۔ آخری لمحات میں وہ قاسم کو پہچان چکا تھا اور مرنے سے پہلے اُس کی آنکھیں حیرت کی شدت کے باعث بہت زیادہ پھیل چکی تھیں..... مقرون مر گیا تو قاسم نے اپنی تلوار واپس کھینچ لی اور مقرون کو کشتی سے نیچے دھکا دے دیا۔ مقرون کی لاش چھپک کی آواز کے ساتھ پانی میں گری اور باسفورس کا نیلا پانی تیزی سے سرخ ہونے لگا۔

اب قاسم کی کشتی شاگال کے جہاز کی جانب بڑھ رہی تھی۔ اور قاسم کا دل یہ سوچ سوچ کر دھڑک رہا تھا کہ اگر یہ کالا جہاز فی الواقع شاگال کا جہاز ہوا تو اُسے اپنی ماری یہیں مل سکتی تھی۔ سورج باسفورس پر پوری طرح چمک رہا تھا اور قاسم اپنی کشتی کو دو چپوؤں کی مدد سے کھیتے ہوئے کالے جہاز کی طرف بڑھا رہا تھا۔ جہاز پچاس گز کے فاصلے پر موجود تھا اور جہاز پر سے قاسم کو صاف دیکھا جا سکتا تھا۔

اور پھر کچھ دیر بعد وہی ہوا جس کا خطرہ قاسم کو لاحق تھا۔ جہاز کے عرشے پر سے قاسم کو کسی نے دیکھ لیا۔ یہ مقرون کی طرح کا کوئی سپاہی ہی تھا جس نے قاسم کی کشتی کو جہاز کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔ اور پھر تیزی کے ساتھ دوڑتا ہوا عرشے سے نیچے چلا گیا۔ چند لمحے بعد قاسم نے پھر دیکھا کہ عرشے پر اُس سپاہی کے ساتھ قسطنطنیہ کا سب سے پراسرار شخص شاگال کالے جہاز کے عرشے پر پہنچ چکا تھا۔ قاسم کے جسم و جاں میں سنسنی کی تیز لہر دوڑ گئی..... تو گویا سچ مچ یہی شاگال کا جہاز تھا۔ لیکن اب قاسم کے لئے بہت بڑا خطرہ پیدا ہو چکا تھا۔ شاگال نے قاسم کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور یقیناً اب شاگال، قاسم کو اپنے جہاز پر سوار نہ ہونے دیتا۔ لیکن قاسم مسلسل چپو پہ چپو مارتا رہا۔ اُسے مارسی تک پہنچنا تھا۔ وہ ہر طرح کا خطرہ مول لے سکتا تھا۔ قاسم کی کشتی آگے بڑھتی رہی اور پھر جب وہ جہاز سے ابھی خاصا دُور ہی تھا کہ اُس نے شاگال کے جہاز کو لنگر اُٹھاتے ہوئے دیکھا۔ اس کا مطلب تھا کہ شاگال مقابلہ کرنے کی بجائے یہاں سے فرار ہو رہا تھا۔ اب قاسم کو خیال آیا کہ اگر جہاز کے بادبان کھول دیئے گئے تو جہاز کی رفتار قاسم کی کشتی کے مقابلے میں کئی گنا بڑھ جائے گی۔ ایسی صورت میں وہ کبھی بھی شاگال تک نہیں پہنچ پائے گا۔ قاسم نے اندھا دُھند چپو چلانا شروع کر دیئے اور اُس کی کشتی غیر معمولی تیزی سے حرکت کرنے لگی۔

جب قاسم کی کشتی اور جہاز کا درمیانی فاصلہ صرف بیس قدم رہ گیا تو جہاز کے بادبان ایک جھٹکے سے کھل گئے اور ہوا کے دباؤ کو برداشت کر کے جہاز نے سمندر میں ایک بڑا ہچکولا لیا۔ اور پھر اگلے لمحے قاسم کو اُس وقت چھٹی کا دودھ یاد آ گیا جب جہاز کے کنارے سے تیروں کی ایک خوفناک باڑھ قاسم کی جانب لپکی۔ قاسم نے چپوؤں کو تیزی سے حرکت دی اور خود ایک طرف جھک کر اپنے آپ کو تیروں سے بچایا۔ زیادہ تر تیر کشتی کے چوبی تختوں میں پیوست ہو گئے۔ لیکن اس سے پہلے کہ قاسم سنبھلتا، تیروں کی دوسری باڑھ اُس کی جانب لپکی۔ شاگال کے آدمی قاسم پر پوری قوت سے تیر پھینک رہے تھے۔ شاگال خود

جہاز کے عرشے پر کھڑا ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ دوسری باڑھ سے بچنے کے لئے قاسم نے ایک عجیب فیصلہ کیا۔ وہ یکلخت اور کسی خرگوش کی طرح اُچھل کر چھپاک سے پانی میں جا گرا۔ اب شاگال اور اُس کے سپاہیوں کے پریشان ہونے کی باری تھی۔ کیونکہ قاسم پانی میں غوطہ لگا کر غائب ہو چکا تھا۔

اور پھر جب قاسم دوبارہ نمودار ہوا تو وہ کالے جہاز کی ایک جانب سے اُس پر سوار ہونے کی کامیاب کوشش کر رہا تھا۔ قاسم کی تلوار اُس کے دانتوں میں دبی تھی اور اُس نے دونوں ہاتھوں سے جہاز کے جنگلے کو تھام رکھا تھا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ جہاز پر سوار ہو چکا تھا۔ شاگال کے آدمی بھی اسی توقع سے جہاز کے چاروں طرف دوڑ رہے تھے کہ اُن کا دشمن کسی نہ کسی جانب سے نمودار ہو گا۔ لیکن انہیں پتہ اُس وقت چلا جب قاسم شمشیر بدست اُن کے سامنے آیا اور پھر اگلے لمحے شاگال کے دو ہٹے کٹے سپاہی قاسم پر ٹوٹ پڑے۔ لیکن قاسم جیسے شمشیر زن کو تلوار کے زور پر شکست دینا اُن کے بس کی بات نہ تھی۔ قاسم برقِ آسمانی کی طرح دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں کود رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک سپاہی کا شمشیر والا ہاتھ کٹ کر سمندر میں جا گرا۔ لیکن ایک سپاہی کے کم ہو جانے سے قاسم کے لئے کوئی آسانی پیدا نہ ہوئی۔ کیونکہ اب جہاز پر موجود شاگال کے باقی آدمی بھی اس جگہ کا پتہ پا کر یہاں پہنچ چکے تھے۔ لیکن قاسم نے دل چھوٹا نہ کیا۔ اب وہ بیک وقت شاگال کے سات بہترین جنگجوؤں کے ساتھ لڑ رہا تھا۔ قاسم درمیان میں موجود تھا اور ساتوں سپاہی اُسے چاروں طرف سے اپنے گھیرے میں لئے ہوئے تھے۔ لیکن قاسم اُن سے سنبھالے نہ سنبھلتا تھا۔ وہ طاہر کا بھائی اور ہشام کا بیٹا تھا۔ عرب کے بہترین نوجوان اُس کی شمشیر زنی کا لوہا مانتے تھے۔ اور یہی تو موقع تھا کہ جب اُس کی تلوار بازی کے جوہر ملاحظہ کئے جا سکتے تھے۔ کچھ ہی دیر میں ساتوں سپاہی نڈھال ہو گئے۔ کیونکہ قاسم نے اُنہیں بھگا بھگا کر تھکا دیا تھا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ وہ سات جنگجو اس لڑائی میں قاسم پر وار کرتے ہوئے نظر آتے۔ لیکن یہاں تو معاملہ اُلٹ تھا۔ ایک اکیلا قاسم اُن سات ماہر شمشیر زنوں پر پے در پے وار کئے چلا جا رہا تھا۔ اسی اثناء میں قاسم نے ایک ایسا داؤ کھیلا کہ شاگال کے دو سپاہی بیک وقت ایک دوسرے کی تلواروں کا شکار ہو گئے۔ ابھی وہ دونوں فرش پر گر بھی نہ پائے تھے کہ قاسم نے ایک اور سپاہی کا پیٹ پھاڑ دیا۔

جہاز کے بادبان کھلے تھے اور وہ تیزی کے ساتھ تیر رہا تھا۔ معاً قاسم کے ذہن میں ایک خیال آیا اور وہ لڑائی کی جگہ کو چھوڑ کر جہاز کی اُس سمت میں دوڑا جہاں چوبی تختے

ڈھلوانی حالت میں لگے ہوئے تھے۔ باقی بچ رہنے والے پانچوں جنگجو اُس کے پیچھے لپکے۔ قاسم ایک خطرناک داؤ کھیلنے جا رہا تھا۔ وہ جہاز کے آخری کنارے کی طرف دوڑتا چلا گیا جو ڈھلوانی حالت میں نیچے کی جانب کسی قدر ترچھے رُخ پر موجود تھا۔ اس کنارے پر لکڑی کے کمزور جنگلے لگے ہوئے تھے۔ قاسم کے تعاقب میں آنے والے ہٹے کٹے سپاہی اپنے پورے زور میں ڈھلوانی تختوں پر بھاگتے چلے آئے۔ جونہی قاسم جہاز کے آخری سرے پر جنگلے کے نزدیک پہنچا، وہ پوری قوت سے رُکا اور ایک دم بائیں طرف ہٹ گیا۔ اُس کے تعاقب میں آنے والے بھاری بھرکم سپاہی قاسم کی طرح فوراً خود کو نہ روک سکے اور پوری قوت کے ساتھ لکڑی کے جنگلے کے ساتھ ٹکرا گئے۔ پانچوں حملہ آور یکے بعد دیگرے ایک دوسرے پر گرے۔ جنگلا ٹوٹ گیا اور شاگال کے سپاہی پھسلتے ہوئے سمندر میں جا گرے۔ آخری دو سپاہی ٹوٹے ہوئے جنگلے کو پکڑ کر لٹکنے لگے۔ اب قاسم نے آگے بڑھ کر ان دونوں لٹکتے ہوئے جنگجوؤں کا خاتمہ کر دیا۔

جہاز اپنی پوری رفتار سے بحر مارمورا کی جانب اڑا جا رہا تھا۔ قاسم کو خدشہ تھا کہ سمندر میں گرنے والے تینوں سپاہی بھی تیر کر واپس آنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن اُس نے کوئی پرواہ نہ کی اور جہاز کی اندرونی جانب بھاگا۔ قاسم نے اپنی پوری لڑائی کے دوران شاگال کو کہیں نہ دیکھا تھا۔ اُسے فکر تھی کہ پراسرار شاگال کہیں کشتی کے ذریعے فرار ہی نہ ہو چکا ہو۔ قاسم جہاز کے درمیانی کیبن میں آیا۔ یہاں آمنے سامنے تین تین کیبن بنے ہوئے تھے۔ قاسم اپنی خون آلود تلوار لئے ایک ایک کیبن میں جھانکنے لگا۔ اُسے شاگال کہیں دکھائی نہ دیا۔ نہ ہی اُسے مارسی کا کوئی سراغ ملا۔ اب قاسم کے پریشان ہونے کی باری تھی۔ قاسم بھاگ کر اندرونی احاطے سے باہر نکلا اور عرشے کی جانب بڑھا۔ جہاز کے عرشے پر پہنچ کر قاسم نے سمندر میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ اُسے دُور دُور تک شاگال یا کسی کشتی کے کوئی آثار دکھائی نہ دیئے..... تو کیا شاگال نے سمندر میں چھلانگ لگا دی تھی.....؟ قاسم سوچنے لگا۔

اب اچانک قاسم کو جہاز میں ممکنہ تہہ خانے کا خیال آیا۔ وہ دوبارہ تیزی کے ساتھ جہاز کے اندرونی احاطے میں گھسا اور جہاز کی نچلی منزل یعنی پیندے پر موجود کسی تہہ خانے کا راستہ تلاش کرنے لگا۔ اندرونی احاطے میں موجود کیبنوں کے اختتام پر قاسم کو لکڑی کے تختوں سے بنی ایک سیڑھی دکھائی دی۔ اب وہ کسی چیتے کی طرح چوکنا ہو چکا تھا۔ نچلی منزل میں اُترتے ہوئے قاسم کوشش کر رہا تھا کہ اُس کے قدموں کی آہٹ پیدا نہ ہو۔ لیکن

پھر بھی جونہی وہ نچلی منزل میں اُترا، ایک سنسناتا ہوا برچھا اُس کی جانب لپکا۔ بہت ممکن تھا کہ ہوا میں اُڑ کر آتے ہوئے اس برچھے سے قاسم کی گردن کٹ جاتی۔ لیکن اُس کی چھٹی حس نے بروقت کام دکھایا اور وہ ایک دم اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ برچھا ہوا میں زناٹے کی آواز کے ساتھ کسی پھرکی کی طرح گھومتا ہوا آیا اور قاسم کے ایک دم بیٹھ جانے کی وجہ سے اُس کے اوپر سے گزرتا ہوا عقبی دیوار میں جا کر کھب گیا۔

یہ برچھا خطرناک دشمن شاگال نے پھینکا تھا۔ قاسم کی نظر ایک دم شاگال پر پڑی۔ شاگال جہاز کے تہہ خانے میں موجود تھا۔ لیکن قاسم کی نظر یکایک شاگال پر پڑنے کے بعد اُس کے عقب میں کھڑی مارسی پر پڑی۔ قاسم کو ایک زوردار جھٹکا لگا اور وہ شاگال کو بھول کر مارسی کو دیکھنے میں ہی مصروف ہو گیا۔ مارسی کی حالت بہت خستہ تھی۔ وہ بے حد کمزور اور لاغر دکھائی دے رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پیدا ہو گئے تھے اور اُس کا لباس جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ مارسی کی حالت دیکھ کر قاسم کے دل کو دھکا لگا۔ قریب ہی فرش پر کٹی ہوئی رسّی کے وہ ٹکڑے پڑے تھے جن سے مارسی بندھی رہتی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے شاگال نے ایک برچھے کی مدد سے مارسی کی رسیاں کاٹی تھیں۔ وہ مارسی کو لے کر یہاں سے فرار ہونا چاہتا تھا۔ لیکن عین وقت پر قاسم پہنچ گیا۔ شاگال نے اپنا برچھا تو قاسم پر پھینک دیا تھا۔ چنانچہ اُس نے جونہی قاسم کو مارسی کی جانب متوجہ دیکھا، کسی چھلاوے کی طرح چھلانگ لگائی اور نزدیک کی دیوار پر لٹکا لوہے کا لکڑیاں کاٹنے والا بھاری تبر اُٹھا لیا۔ یہ جہاز میں استعمال ہونے والے اوزاروں میں سے ایک تھا۔ قاسم نے شاگال کے ہاتھ میں تبر دیکھا تو دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ یہ لکڑیاں کاٹنے والا کلہاڑا قاسم کی تلوار کا کہاں مقابلہ کر سکتا تھا؟ لیکن شاگال کے انداز سے یوں لگتا تھا جیسے وہ اس بھاری بھرکم کلہاڑے کو بھی کسی برچھے کی طرح آسانی کے ساتھ استعمال کر لے گا۔ اب قاسم نے شاگال پر حملہ آور ہونے کے لئے جونہی قدم آگے بڑھایا، شاگال کسی مینڈک کی طرح اُچھل کر مارسی کے نزدیک جا ٹپکا۔ اگلے لمحے اُس نے مارسی کی گردن دبوچ لی اور اپنی انگارہ آنکھوں سے شرارے برساتے ہوئے کہا۔

''تلوار پھینک دو قاسم بن ہشام! ورنہ میں تمہاری محبوبہ کا منکا توڑ دوں گا۔''

قاسم کی نظر مارسی پر پڑی اور وہ یہ دیکھ کر دہل گیا کہ مارسی کی آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر اُبل آئی تھیں اور وہ کسی چڑیا کی طرح سرخ آنکھوں والے دیو کے پنجے میں جکڑی گئی تک نکالنے سے بھی معذور تھی۔ قاسم سے یہ منظر دیکھا نہ گیا۔ اُس نے فوراً اپنی تلوار پھینک

دی۔ قاسم کے تلوار پھینکنے کی دیر تھی کہ شاگال، مارسی کو چھوڑ کر کسی پاگل ہاتھی کی طرح قاسم پر حملہ آور ہوا۔ قاسم شاگال کے وار سے بچنے کے لئے پوری طرح تیار تھا۔ شاگال نے اپنے کلہاڑے کے دستے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر پوری قوت کے ساتھ قاسم کے سر پر دے مارا۔ لیکن قاسم پلک جھپکتے میں نیچے سے ہٹ گیا۔ شاگال کا کلہاڑا پورے زور سے جہاز کے پیندے پر پڑا اور جہاز کے پیندے میں لگا۔ ایک بھاری بھرکم تختہ ٹوٹ گیا۔ شاگال کے بدن میں کسی سانڈ کی طرح طاقت تھی اور اُس کی ظاہری اُچھل کود بھی کسی چست نوجوان سے کم نہ تھی۔ اُس کا کلہاڑا جہاز کے پیندے میں پیوست ہوا۔ اُس نے اپنا کلہاڑا واپس کھینچنے اور قاسم پر دوسرا وار کرنے میں دو ثانئے سے زیادہ دیر نہ لگائی۔

قاسم کو توقع نہ تھی کہ شاگال اس قدر پھرتیلا ثابت ہوگا۔ چنانچہ قاسم کے لئے شاگال کے دوسرے داؤ سے بچنا پہلے کی نسبت زیادہ مشکل تھا۔ لیکن پھر بھی قاسم کی قسمت نے اُس کا ساتھ دیا اور شاگال کا وار خالی چلا گیا۔ کلہاڑا ایک مرتبہ پھر جہاز کے پیندے کو چیرتا ہوا نیچے تک چلا گیا۔ پیندے کے ٹوٹے ہوئے تختوں میں پیدا ہو جانے والے رخنوں کے راستے سمندر کا پانی جہاز میں بھرنا شروع ہو گیا۔ باسفورس کا نیلا پانی انتہائی تیزی کے ساتھ تہہ خانے میں داخل ہو رہا تھا۔

جبکہ شاگال قاسم کے خیال میں پاگل ہو چکا تھا۔ کیونکہ وہ پے در پے قاسم پر دیوانہ وار حملے کئے جا رہا تھا۔ قاسم نہتا تھا۔ وہ ہر وار بچانے کے لئے کسی نہ کسی طرف جھکائی دیتا اور پھر تہہ خانے میں بھر جانے والے پانی کی وجہ سے قاسم کا پاؤں پھسلا اور وہ تہہ خانے میں موجود پانی پر آ رہا۔ شاگال کا کلہاڑا قاسم کے گرتے ہی پہلے سے بھی زیادہ تیز ہو چکا تھا۔ وہ گرے ہوئے قاسم پر برقِ آسمانی بن کر گرا اور جہاز کے پیندے کو مزید پھاڑ دیا۔ اب تو سمندر کا پانی کسی نل کی طرح اندر آ رہا تھا اور جہاز غرق ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو چلا تھا۔ لیکن قاسم کے لئے ممکن نہ تھا کہ وہ خالی ہاتھ اس دیوہیکل کلہاڑا باز کا مقابلہ کر سکے۔ چنانچہ قاسم مسلسل شاگال کے واروں سے خود کو بچاتا رہا۔ اور ایک وقت وہ آیا جب تہہ خانے میں ایک فٹ سے زیادہ پانی بھر گیا اور قاسم کے لئے شاگال کے واروں سے خود کو بچانا مزید مشکل ہو گیا۔ قاسم خود کو بچاتا بچاتا ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں سے حملہ کرتے ہوئے شاگال کو مارسی نظر نہ آ سکتی تھی۔ چنانچہ مارسی نے سنہری موقع سے فائدہ اٹھایا اور تہہ خانے کے اندر موجود سمندر کے پانی میں جھلمل کرتی قاسم کی شمشیر اٹھا لی۔

شاگال مارسی کی کارروائی سے بالکل بے خبر تھا۔ مارسی کے لئے آواز پیدا کئے بغیر

شاگال تک پہنچنا ممکن نہیں تھا کیونکہ پانی میں چلتے ہوئے چھپ چھپ کی واضح آواز سے شاگال کا چونک جانا لازمی تھا۔

لیکن ادھر وقت بھی بہت کم تھا۔ جہاز کسی وقت بھی غرق ہو سکتا تھا۔ چنانچہ مارسی نے آواز کی پرواہ کئے بغیر شاگال کی طرف دوڑ لگا دی اور اس سے پہلے کہ شاگال قاسم پر آخری اور کامیاب وار کرتا..... کیونکہ قاسم اب ایک تنگ جگہ میں پھنس چکا تھا..... مارسی پہنچ گئی۔ شاگال کا کلہاڑا قاسم پر قہر بن کر گرنے کے لئے فضا میں اٹھا۔ لیکن فضا سے نیچے کی طرف واپس نہ آ سکا۔ کیونکہ مارسی کی تلوار شاگال کی کمر میں گھس کر اُس کے پیٹ کی جانب سے نکل گئی تھی۔ شاگال کے اُٹھے ہوئے ہاتھ اُٹھے کے اُٹھے رہ گئے اور نیچے سے قاسم تڑپ کر ایک طرف ہٹ گیا۔ تلوار شاگال کے پیٹ میں ترازو ہو چکی تھی اور وہ کسی ذبح ہوتے ہوئے بیل کی طرح ڈکرا رہا تھا۔

تہہ خانہ کمر تک پانی سے بھر چکا تھا۔ اب کسی لمحے جہاز غرق ہونے والا تھا۔ چنانچہ قاسم اور مارسی نے ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں تہہ خانے سے نکلنے کا اشارہ کیا اور ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ لئے۔ لیکن مارسی کے لئے پانی میں چلنا مشکل ہو رہا تھا۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح پاؤں گھسیٹتی ہوئی مارسی تہہ خانے کی سیڑھیوں تک قاسم کے ہمراہ پہنچ گئی۔ شاگال کے ڈکرانے کی آواز ابھی تک سنائی دے رہی تھی۔

قاسم اور مارسی دوڑتے ہوئے تہہ خانے کی سیڑھیاں چڑھ کر باہر آئے اور جہاز کے ساتھ بندھی ایک روایتی کشتی تک پہنچنے کے لئے تیزی سے جہاز کی عقبی سمت کی جانب بڑھنے لگے۔ اور ٹھیک اُس وقت جب قاسم اور مارسی کشتی تک پہنچے، جہاز کا پیندا مکمل طور پر پانی سے بھر گیا اور جہاز پانی میں بیٹھنے لگا۔ جہاز کے بادبان کھلے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہوا کے دباؤ نے جہاز کو تیزی کے ساتھ ڈوبنے میں مدد دی۔ کشتی کے نزدیک پہنچ کر قاسم نے احتیاط کے ساتھ پہلے مارسی کو کشتی میں سوار کروایا اور اس کے بعد خود کشتی میں بیٹھ کر جہاز کی چرخیوں کے ساتھ بندھی کشتی کی رسّی کاٹ دی۔ کشتی جہاز کے عقبی تختوں سے سرکتی ہوئی زور دار آواز کے ساتھ پانی میں جا گری۔ قاسم نے فوراً چپو مارنے شروع کر دیئے اور جلد ہی کشتی کو سنبھال لیا۔ اب مارسی اور قاسم اطمینان کے ساتھ باسفورس کے گہرے پانی میں شاگال کا جہاز غرق ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

اُدھر ہپوڈروم کے جلسے میں سلطان نے قسطنطنیہ کے تمام شہریوں کے لئے امن و امان کا عام اعلان کیا۔ جو لوگ اپنے مکانوں اور جائیدادوں پر قابض و آباد رہے اور جنہوں نے

بخوشی اطاعت قبول کر لی، اُن کو اور اُن کے اموال کو کسی قسم کا کوئی نقصان نہ پہنچایا گیا۔ عیسائیوں کے کلیساؤں کو ماسوائے آیا صوفیاء کے اُن کے حال پر قائم رہنے دیا اور عیسائیوں کے تصرف میں رکھا۔ قسطنطنیہ کے بطریق اعظم کو سلطان نے اپنی خدمت میں بلا کر خوشخبری سنائی کہ..... ''آپ بدستور یونانی چرچ کے پیشوا رہیں گے۔ اور آپ کے مذہبی اختیارات میں کسی قسم کی کوئی مداخلت نہ کی جائے گی۔'' سلطان محمد فاتح نے خود یونانی چرچ کی سرپرستی قبول کی اور بطریق اعظم کو وہ اختیارات دے دیئے جو عیسائی سلطنت میں بھی اُس کو میسر نہ تھے۔ عیسائیوں کو مکمل مذہبی آزادی عطا کی۔ کلیساؤں کے اخراجات پورے کرنے کے لئے بڑی بڑی جاگیریں بخشیں۔ جنگی قیدیوں کو جو فتح مند فوج نے گرفتار کئے تھے، سلطان فاتح نے خود اپنے سپاہیوں سے خرید کر آزاد کیا اور اُن کو شہر قسطنطنیہ کے ایک خاص محلے میں آباد کیا۔ اس فتح کے بعد سلطان فاتح نے دیکھا کہ قسطنطنیہ کے اکثر گھر ویران اور غیر آباد ہو گئے تھے۔ چنانچہ ان گھروں میں سلطان نے مسلمانوں کو آباد ہونے کی دعوت دی اور شہر کی رونق واپس لانے کے لئے ایشیائے کوچک سے پانچ ہزار مسلمان خاندانوں کو قسطنطنیہ میں آباد کرنے کا انتظام کیا۔ جو لوگ قسطنطنیہ سے بھاگ گئے تھے، سلطان نے انہیں واپس آنے کی دعوت دی اور انہیں آمادہ کیا کہ آ کر اپنے پیشوں اور کاروبار میں پھر مشغول ہو جائیں۔

قرونِ وسطیٰ کے دستورِ جنگ میں مفتوحین کی جان و مال تمام تر فاتح کی ملکیت ہوتی تھی جس پر اُسے ہر طرح کا اختیار حاصل ہوتا تھا۔ یورپ کی سلطنتوں نے اس اختیار کے استعمال میں کبھی کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا تھا اور ظلم و تعدی کی ایسی مثالیں پیش کیں جو تخیل میں بھی نہیں آ سکتیں۔ اس کے مقابلے میں ترکوں نے قسطنطنیہ میں داخل ہو کر امن و امان کی ایسی روشن مثال قائم کی کہ دوست دشمن سب دنگ رہ گئے۔

فتح کے پہلے روز سلطان نے عام اعلان کیا کہ جو شخص صحابی رسولؐ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا مزارِ مبارک تلاش کرے گا اُسے انعامات سے نوازا جائے گا۔ اور پھر فتح کے تیسرے روز ایک انتہائی بوڑھے بزرگ نے دو مسلمان سپاہیوں کو حضرت ابوایوب انصاریؓ کی قبر مبارک کی نشاندہی کی۔ مرقد مبارک کو تلاش کر لیا گیا لیکن وہ سفید ریش بزرگ دوبارہ کسی کو نظر نہ آیا۔ سلطان محمد فاتح نے حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مزارِ مبارک کے نزدیک ایک مسجد تعمیر کرنے کا حکم دیا جو تاریخ میں ''جامعہ ابو ایوبؓ'' کے نام سے پہچانی گئی۔ سلطان نے قسطنطنیہ کو اپنا دارالسلطنت بنا لیا اور اسی شہر سے باقی ماندہ

ممالک یونان، سربیا، بلغراد، بوسنیا، موریا، طرابزون، سینوپ، مجمع الجزائر، کریمیا، والیشیا، البانیا، ہرزیگوینیا، وینس، روڈس اور اوٹرانٹو وغیرہ فتح کر کے عثمانی سلطنت میں شامل کیے۔

قاسم اور اُس کے اہل خانے بھی قسطنطنیہ میں مقیم ہو گئے اور قسطنطنیہ میں اُن کا گھر بوڑھے عباس کے زیر سایہ ہرا بھرا نظر آنے لگا۔ اب قاسم کی دو بیویاں تھیں۔ ماری کو قاسم کی پہلی بیوی حمیرا نے بہ سروچشم قبول کیا تھا۔ ماری قاسم کی پوری داستان بھی سن چکی تھی اور اب وہ قاسم کے گھر میں اپنی زندگی کے مسرور ترین شب و روز گزار رہی تھی۔

فتح قسطنطنیہ سے پندرہ روز بعد قاسم کے لئے ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ قاسم اپنے اہل خانہ کے ساتھ رات کے کھانے سے فارغ ہو کر بیٹھا اپنے واقعات سنا رہا تھا کہ گھر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ قاسم کے بھتیجے عمر اور علی دوڑتے ہوئے بیرونی دروازے کی جانب لپکے۔

کچھ دیر بعد کمرے میں ایک باپردہ خاتون داخل ہوئی جو بوڑھے عباس سے ملنے آئی تھی۔ بوڑھا عباس باپردہ خاتون کو مل کر پُرجوش لہجے میں اپنے اہل خانہ سے مخاطب ہوا۔

''ارے اس سے ملو!..... جانتے ہو کون ہے یہ؟ یہ بھی میری بیٹی ہے۔''..... عباس ایک دم خاتون سے کہنے لگا۔ ''بیٹی! یہ نقاب ہٹا لو۔ یہ تمہارا اپنا گھر ہے..... ارے کیا تم اکیلی آئی ہو؟ عبداللہ کہاں ہے؟ میرا داماد..... لیکن تمہیں ہمارے گھر کا پتہ کیسے چلا؟''

عباس جوش کے عالم میں بولتا چلا گیا۔ گھر کے سب لوگ حیران تھے۔ عباس کی بیٹی مریم، ماری اور حمیرا آگے بڑھیں اور انہوں نے مہمان خاتون کو احترام کے ساتھ بیٹھنے کے لئے کہا۔ خاتون نے عباس کو بتایا کہ اُس کا خاوند عبداللہ بھی اُس کے ساتھ آیا ہے جو باہر بگھی کے پاس موجود ہے۔

عمر اور علی خاتون کے خاوند عبداللہ کو لینے چل دیئے۔ قاسم باپردہ خاتون کی آواز سن کر بری طرح چونکا۔ یہ آواز اُسے جانی پہچانی سی محسوس ہوئی۔ ابھی وہ یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ خاتون نے اپنے چہرے سے نقاب اُلٹ دی اور عین اُسی وقت بوڑھے عباس کی آواز سنائی دی۔

''یہ میری بیٹی روزی ہے۔ یہ ایک معصوم مچھیرن تھی۔ گزشتہ برس انہی دنوں میں جان جسٹینانی کے سپاہی اس بے چاری کو اٹھا کر لے گئے تھے۔ اتفاق سے ٹھیک اُسی وقت ہم لوگ موقع پر پہنچ گئے..... ہم نے عیسائی فوجوں کو سبق سکھایا اور میں روزی کو اپنے ہمراہ ''رومیلی حصار'' میں لے گیا۔ روزی نے رومیلی حصار میں تین چار ماہ کھانا پکانے اور دیگر

کاموں میں ہماری بہت خدمت کی۔ اس کی کہانی بہت دردناک ہے۔ سننے کے لائق۔''

قاسم کا دماغ سنسنا رہا تھا۔ اُسے اپنے بدن پر رعشہ طاری ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ یہ تو وہی روزی تھی جس نے مچھیروں کی بستی میں اُس کی بہت مدد کی تھی۔ اور قاسم کے لئے ہر خطرہ مول لیا تھا۔ سونیا کی طرح یہ بھی قاسم کو دل دے بیٹھی تھی اور اُس کے انتظار میں دن رات سہانے سپنے دیکھنے لگی۔

ہاں! یہ وہی روزی تھی۔ ''رومیلی حصار'' میں جب بوڑھے عباس نے مختلف قصے سنانے کے دوران اُسے شہزادی حمیرا کے شوہر قاسم بن ہشام کا قصہ سنایا تھا تو وہ قاسم کی باتیں سن کر پہچان گئی تھی کہ اُس کا محبوب جو ایک رومی پادری کے روپ میں اُسے ملا تھا، حمیرا کا شوہر قاسم بن ہشام ہی تھا۔ یہ جان کر کہ قاسم بن ہشام کسی اور کا ہو چکا ہے روزی نے اُس کے سپنے دیکھنے چھوڑ دیئے اور بوڑھے عباس کی بیٹی بن کر رومیلی حصار میں رہنے لگی۔ تین چار ماہ بعد عباس نے اپنے ایک ہونہار سپاہی عبداللہ کے ساتھ نوجوان مچھیرن روزی کی شادی کر دی اور یوں مسلمان ہونے کے بعد روزی کا گھر بس گیا۔

آج روزی اپنے خاوند کے ساتھ عباس سے ملنے آئی تو ایک دم اُس کا سامنا قاسم سے ہو گیا۔ روزی بھی اگرچہ کسی حد تک گھبرائی لیکن قاسم تو بری طرح سٹپٹا گیا۔ روزی کی نگاہوں نے چند لمحوں میں قاسم سے ہزاروں سوال پوچھ لئے جن میں سے کسی ایک کا جواب بھی قاسم کے پاس نہ تھا۔

حمیرا نے عباس کی زبانی روزی کی کہانی سنی تو شرارت آمیز نظروں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھنے لگی۔ کیونکہ وہ قاسم سے نوجوان مچھیرن کی دلچسپ داستان پہلے ہی سن چکی تھی۔

قاسم سے اور کچھ نہ بن پڑا تو سر کھجاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

اختتامیہ

''سلطان محمد فاتح'' کا دور 1481ء میں ختم ہوا۔ 1451ء سے 1481ء تک تیس سال کا عرصہ سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ پر حکومت کی۔ سلطان کے دور میں اسلامی سلطنت یورپ میں دُور دُور تک پھیل چکی تھی۔

سلطان فاتح کے بعد عثمانی فرمانرواؤں میں ''سلیمانِ اعظم قانونی'' (1550ء تا 1566ء) نے بہت شہرت پائی۔ مشہور امیر البحر ''خیر الدین باربروسا'' اسی سلطان کے عہد میں مشہور ہوا۔ خادم الحرمین وشریفین کا لقب سب سے پہلے ''سلیم اوّل عثمانی'' کے حصے میں آیا۔ مصر کے عباسی خلیفہ کی اجازت سے سلطان کا لقب سب سے پہلے ''بایزید'' نے اختیار کیا تھا۔ لیکن عثمانی فرمانرواؤں میں منصب خلافت بھی سب سے پہلے ''سلیم اوّل عثمانی'' کو نصیب ہوا۔

آخری عباسی خلیفہ ''المتوکل'' نے جو قاہرہ میں سلاطین مملوک کے زیر سایہ ظاہری شان وشوکت کے ساتھ مگر حقیقتاً بغیر کسی اقتدار و اختیار کے زندگی بسر کر رہا تھا..... دستارِ خلافت ''سلیم اول عثمانی'' کے سر پر رکھ دی۔ مقاماتِ مقدسہ وحرمین شریفین کی کنجیاں، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار مبارک، علم اور چادر بطور سند خلافت ''سلیم'' کے حوالے کر دی۔ تب سے عثمانی خلفاء کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔

عثمانی سلطنت تقریباً چھ سو سال قائم رہی اور خلافت عثمانیہ کا آخری بدنصیب خلیفہ ''سلطان عبدالحمید خان ثانی'' ثابت ہوا۔ جس کی حکومت پہلی جنگ عظیم کے نتیجے میں ختم ہوئی۔ اور خلیفہ نے 1918ء میں اپنی نظر بندی کے دوران وفات پائی۔

(ختم شد)